Presented by: Rana Jabir Abbas

اللہ اکبر

یہ ایک سجدہ

ڈاکٹر مہر عبدالحق

jabir.abbas@yahoo.com

قیام پبلی کیشنز لاہور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں۔

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۷۸۶

۹۲_۱۱۰

یا صاحب الزماں ادرکنی

یا عباس

DVD Version

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یہ ایک سجدہ

(ذاتِ انسانی کے ابدی رشتے ـــــ قرآن حکیم کی روشنی میں)

ڈاکٹر مہر عبد الحق

jabirabbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب ——— بس ایک سجدہ
نام مصنف مع پتہ ——— ڈاکٹر مہر عبدالحق ۲۵۲۶-بی
شاد مان کالونی بالمقابل ہائی کورٹ۔ ملتان
پبلشر ——— قیام پبلیکیشنز ۱۶ ارٹی گن روڈ لاہور
تاریخ اشاعت ——— اگست سنہ ۱۹۹۴ء
قیمت ———
کتابت ——— محمد حسین اسدی مرکز کتابت
بیرون بوہڑ گیٹ۔ ملتان

بار — اوّل

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

مشمولات

۱۔ تعارفِ موضوع ۹ تا ۲۲

قرآنِ حکیم اور انجیل مقدس کی ایک مشترک آیت "جس کا تو ان کو جن کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دے رکھا ہے" ـــــ میثاق کیا ہے؟ ـــــ علامہ شبیر احمد عثمانی، خلیفہ عبدالحکیم، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سلیم احمد کی وضاحتیں ـــــ انسان کا پہلا اور آخری رشتہ اپنے خالق سے ہے۔ اس رشتے کی پہچان سے جو اور رشتے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں: انسان کا اپنے آپ سے رشتہ، فرد کا فرد سے رشتہ، فرد کا معاشرے سے رشتہ، غیب سے رشتہ، وحیِ ربانی سے رشتہ، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے رشتہ، قرآنِ پاک سے رشتہ، الصلوٰۃ سے رشتہ۔ کائنات سے رشتہ، حسن اور خیر و خوبی سے رشتہ۔ قرآنِ حکیم کی روشنی میں ان رشتوں کی وضاحت بحوالۂ علومِ جدید اس کتاب کا مقصد ہے۔

۲۔ روح اور مادہ کی بحث ۲۳ تا ۳۰

مادہ شعور کی با مقصد حرکت و عمل کی خاصیت سے عاری ہے ـــــ کیا "روح" یا داخلی فعال رہنما مادے ہی کی صورت ہے یا اس سے ماورا ہے؟ یورپ کے فلاسفرز اور سائنسدانوں کے نظریات ـــــ عہدِ حاضر میں انسانی فکر کی پرواز طبیعات سے مابعد الطبیعات کی طرف ہے۔ سر اولیور لاج، سر جیمز جینز کے افکار ـــــ جرمن ماہرِ حیاتیات دریش کے تجربات ـــــ برگساں کا نظریہ ـــــ شعور سے متعلق چند حقائق ـــــ چونکہ شعور "خود آگاہ" ہے اس لئے یہ شخصیت ہے۔

۳۔ زندگی کی کہانی ـــــ تخلیق اور ارتقاء کے حوالے سے ۳۱ تا ۴۸

تمنائے زیست ـــــ تخلیقِ شعور کا فطری تقاضا ہے ـــــ مادہ اور زندگی دونوں شعور ہیں ـــــ مادہ بھی زندہ ہے ـــــ زندگی مزاحمتوں کو توڑ کر آگے بڑھتی ہے۔ تو یہ عمل ارتقاء ہے ـــــ خارجی کائنات کی ہر چیز کی "شاکلہ" متعین ہے لیکن "زندگی" کے امکانات بے حد وسیع ہیں ـــــ قوتِ اظہار و نمو ـــــ ڈارون اور لیمارک کی غلطی ـــــ تخلیقِ آدم زندگی کے ذوقِ ارتقاء کا عظیم ترین شاہکار ہے ـــــ شعور کے لئے علم "آزادی" اور آزادی علم ہے ـــــ اس کی منزلِ مقصود خود آگہی ہے۔ زندگی کے مستقبل کے ارتقاء کی صورت کیا ہوگی۔

۴۔ خود آگہی کے مسافر ۴۹ تا ۶۸

مطالعۂ انفس و آفاق ـــــ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں شعور کا درجہ بدرجہ ارتقاء ـــــ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ارتقا کا مقصد شعور کو منتہا سے کمال تک پہنچانا ہے ــــ انسانی صلاحیتیں ــــ اَلنفس کا مطالعہ، اہل تصوّف کا طریقہ ــــ امانت کا مفہوم ــــ انسان حیوان نہیں ــــ میں کون ہوں؟ کی مغربی تحقیقات ــــ فرائڈ کے نظریات ــــ کارل ژونگ

۵۔ انسانی ذات قرآن حکیم کی روشنی میں ۶۹ تا ۹۲

"ذات" سے معنے ــــ "انسانی ذات" کی خصوصیات ــــ تخلیق آدم قرآن حکیم کی روشنی میں ــــ اللہ نے "انسانی ذات" کو اپنی روح سے کیوں منسوب کیا ہے؟ ــــ یہ امانت ہے ــــ کیا جسم ہی انسان ہے؛ مادّی نظریۂ زندگی ــــ قرآن حکیم کا نظریۂ زندگی ــــ "کل" اپنے اجزاء کے مجموعے سے زائد ہوتا ہے ــــ قوتِ حافظہ کے بارے میں جدید تحقیقات ــــ نیند اور موت ــــ تخلیق حیات انسانی کے مقاصد ــــ جسم اور روح کا حسین امتزاج ــــ انسانی ذات" کی نشوونما کیسے کی جائے؟

۶۔ ذاتِ باری تعالیٰ ۹۳ تا ۱۴۸

خدا اور مذہب کا عقیدہ ــــ مذہب کے بارے تین نظریات ــــ مغربی مفکرین کی آراء ــــ ربط و ایجاب ہی خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے ــــ چند عقلی دلیلیں ــــ کائنات کی مقصدیت ــــ قدروں کی تخلیق، فوق الفطرت ــــ ماورائیت اور احاطت ــــ بالاتر سطح کے ذہن کے زیریں سطح کے ذہن پر تغلب ــــ ایمان بالغیب کے معنے اور اہمیت ــــ سائنس کے غیب اور مذہب کا غیب ــــ اسلام کے عقیدۂ غیب نے دنیا کو کیا دیا ہے ــــ اللہ کا قرآنی تصوّر ــــ اسماء الحسنیٰ ــــ مستقل قدروں کا سرچشمہ ــــ بعض اسماء الٰہی کی تشریح۔

۷۔ انسانی ذات کے عناصر ترکیبی ۱۴۹ تا ۱۷۰

سمع اور بصر علم محسوسات کے لئے اور قلب یا فؤاد جذبات اور اختیار و ارادے کیلئے عطا ہوئے ہیں ــــ علم صحیح صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو یقین کی منزل تک پہنچ جائے ــــ برتر یافتہ علم معروف سے مجرد تک بڑھتا ہے ــــ ادراک، خبر نبأ، درایت، عرفان، شعور، تدبّر، تفکّر اور تفقّہ کے معنے اور ان کی اہمیت ــــ علم کا مقام ــــ علم الاسماء، علم کی خرابیاں ــــ ظلوماً جہولاً کی تشریح ــــ انسان کی کمزوریاں ــــ عقل کی فضیلت اور خرابیاں ــــ علم اور عقل کی خرابیوں کا علاج۔

۸۔ وحیٔ ربانی ۱۷۱ تا ۱۹۴

حیوانیت اور انسانیت کے درمیان فرق صرف قدروں کی پہچان کی صلاحیت کا ہے ــــ غیر استدلالی علوم، ضمیر

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وجدان، باطنی علوم، عقل کی مکمل رہنمائی نہیں کر سکتے —— خارجی رہنمائی یعنی وحیٔ ربانی ناگزیر ہے —— وحی کی مختلف صورتیں —— جبلتیں —— انسان کی صفتِ تعلّم پذیری —— انسان، صاحبِ کردار مخلوق —— مقامِ نبوت —— وحیٔ ربانی کی خصوصیات —— وحی کا انکار متوازن اور ارتقا بدوش راہوں سے دور نکل جانے کے مترادف ہے۔

۹۔ وہ دانائے سُبُل، ختم الرُّسُل، مولائے کُل ۱۹۵ تا ۲۱۰

حق و صداقت کو قبول کر لینا انسانی سرشت کا جزو ہے —— ابلیس کا چیلنج —— انبیائے کرام کی وساطت سے دی گئی ہدایت اور ان کا عملی نمونہ اس چیلنج کا جواب ہے —— ذہنِ انسانی کے بلوغ تک پہنچنے کے ساتھ ختمِ نبوت کا اعلان —— دعائے ابراہیمی اور نوید مسیحی —— انسانِ کامل کے پرکھنے کے کچھ معیارات —— حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ مشعلِ راہ ہے —— نابغہ کی پہچان کے پیمانے جو علم نفسیات نے مقرر کر رکھے ہیں —— سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مختصر سا خاکہ —— جوہرِ انسانیت کی امکانی تکمیل و ارتقا کا دائمی نمونہ

۱۰۔ نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن ۲۱۱ تا ۲۶۴

ایمان لانے کی پانچ بنیادی حقیقتیں —— قرآن حکیم تمام سابقہ کتب کا "سچ کر دکھانے والا" —— کوئی بھی سابقہ کتاب اپنی اصلی صورت میں نہیں ہے —— تحریف شرک ہے —— سابقہ کتب کی حیثیت ابتدائی نصاب کی تھی —— صُحُف اور زُبُر کے معنے —— موجودہ توریت کی تاریخی حیثیت —— اناجیل کی تاریخی حیثیت —— ژند اور اوستا —— ہندوؤں کی کتابیں —— بدھ مت، جین مت، سکھ مت، کینفوشس ازم، تاؤ ازم، شنٹو ازم کی کتابیں —— قرآن حکیم کی صحت کا تحفظ —— اس کی وحیٔ ربانی ہونے کے ثبوت —— عظیم ترین کتب کی پہچان —— اعجاز القرآن —— نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن۔

۱۱۔ میسّر سجدہ ہائے جبینِ شوق ۲۶۵ تا ۲۸۴

"مذہب" کی آخری ارتقائی صورت "الدّین" ہے —— مذہب اور الدّین میں فرق —— اگر سب مذاہب ایک ہی سچائی کو پیش کرتے ہیں تو پھر دینِ اسلام ہی کیوں اختیار کیا جائے؟ —— نظامِ الصلوٰۃ —— عبادت کا مفہوم —— مومن کی صبح و شام —— زکوٰۃ —— روزہ —— حج —— جہاد —— صلوٰۃ پر تفصیلی بحث —— صلوٰۃ کے دنیاوی فائدے —— نظامِ صلوٰۃ اپنے مکمل ارکان سمیت پوری انسانیت کے عروج و ارتقا کی آرزو کی تکمیل کا یقینی ذریعہ ہے

۱۲۔ ہماری انفرادی دعائیں ۲۸۵ تا ۳۰۰

انفرادی دعاؤں کے قبول ہونے یا نہ ہونے بارے چند سوالات —— حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد کہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

مجھے خلافت کا فریضہ اس لئے سونپا گیا ہے کہ تمہاری انفرادی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ تک نہ پہنچنے دوں ـــ انفرادی دعائیں غیر قرآنی معاشرے میں مانگی جاتی ہیں جس میں لا قانونیت کا دور دورہ ہوتا ہے ـــ مومنین کی دعائیں سب اجتماعی ہیں ـــ ہر آرزو اور ہر طلب بہ رنگِ مشیئت ہونی چاہیئے ـــ فلسفۂ دعا۔

۱۳۔ زندگی کی عالمگیر، دوامی اور ناقابلِ تغیر قدریں ۲۹۱ تا ۳۲۲

اسلامی نظریۂ زندگی یا آئیڈیالوجی "کلمۂ طیبہ" کی تشریح ـــ جسم اور روح کو حسین بنانے اور ارتقا دینے کا طریقہ ـــ قرآنی نظامِ حکومت و معاشرت کے قیام کی شرائط ـــ قرآن حکیم کا موضوع "انسان" ہے۔ یہ انسانی ذات کے ارتقا کا نسخہ ہے تکریمِ انسانیت ـــ انفاق یا رزق کا مسلسل گردش میں رہنے کا حکم ـــ تعیّنِ مدارج ـــ کائنات کی تخلیق بالحق عملِ تخلیق ـــ زندگی کی نعمتیں ـــ علم اور عقل ـــ جذبات ـــ آزادی ـــ لا اکراہ فی الدین ـــ عدل و احسان ـــ وحدتِ امّت ـــ وحدتِ انسانیت ـــ اسلام کے معنے ـــ دین اسلام کی چند خصوصیات

۱۴۔ کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ ۳۲۳ تا ۳۳۸

عہدِ سحر کا شاقی قوتوں کی گرفت سے آزاد ہونے کا پہلا قدم تھا ـــ فکرِ افلاطون ـــ نو افلاطونی مکاتبِ فکر ـــ رہبانیت ـــ فطرتِ انسان کی دوست ہے دشمن نہیں ہے ـــ فراریت کے تصورات غیر قرآنی ہیں ـــ تخلیقِ کائنات کے مقصد کو آگے بڑھانا انسانی فریضہ ہے ـــ ہماری زمین ـــ حیوٰۃ الدنیا اور حیوٰۃ الآخرۃ ـــ مفاداتِ عاجلہ ـــ قانونِ مہلت ـــ بازآفرینی کی صلاحیت ـــ مستقبل کی اہمیت ـــ بلند تر قدر کی خاطر پست تر قدر کا چھوڑ دینا کیریکٹر ہے ـــ زندگی کا جمالیاتی پہلو ـــ معاشی زندگی میں بھی توحید ـــ زمین کی ملکیت ـــ رزق کی تقسیم

۱۵۔ فرد و ملت جوہر و آئینہ اند ۳۳۹ تا ۳۵۰

انسانی اور حیوانی سطحِ زندگی کا فرق ـــ جوہرِ انسانیت کے امین ہونے کا مطلب اعلیٰ صفات کو تعمیری خطوط پر ابھارنا ہے ـــ تربیت کا مفہوم ـــ حیاتِ انسانی کے مقاصد ـــ اجتماعی زندگی کی اہمیت ـــ اسلامی معاشرے میں ایک کی کمی دوسرے کی بیشی سے پوری کی جاتی ہے ـــ ذکر اور فکر کی تشریح ـــ عورت کا مقام ـــ چند احکام و اصول ـــ کفالت ـــ جرم و سزا اور انتقام ـــ فحشا و معاشرتی آدابِ قرآنی ـــ رزق اور اس کی تقسیم ـــ اسلام میں فرد بلا جماعت اور جماعت بالاتر از فرد کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نظامِ امّت کے بنیادی عناصر۔

۱۶۔ حسن ہے مضبوطیِ پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں ۳۵۱ تا ۳۷۶

نزولِ قرآن سے پہلے مذہب اور فلسفے کے تصوراتِ خیر و شر ـــ بدھ کا نروان ـــ جیو آتما اور پرم آتما ـــ

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یوگا ــــ آواگون ویدانت اور ہمہ اوست ــــ عیسائیت کا فلسفۂ گناہ آلودگی ــــ زرتشتی فلسفۂ ثنویت ۔ ہیگل کی جدلیت ــــ انسان کا خودساختہ معیار اور عقل کی تراشیدہ قدریں ہر دور میں تغیر آشنا رہتی ہیں اسی لئے باطل ہیں ــــ قرآن حکیم کا قانون حفظ و بقا کیا خیر اور شر محض اضافی ہیں ــــ نجات کا قرآنی مفہوم ۔ قرآنی قانونِ ارتقاء ــــ اسبابِ علل ــــ مکافاتِ عمل ۔ اختیار وارادہ ــــ تصادمات سے انسانی ذات ابھرتی ہے ــــ حسن وخوبی انسان کی فطرت کا بنیادی جزو ہے خیر و شر کا خارجی کائنات سے تعلق ــــ انسانی جسم کی پیدائشی نقائص ــــ درد ــــ خیر، اللہ کی طرف سے ۔ اور شر انسان کا خود پیدا کردہ ہے ــــ خیر اور شر کی بحث کے چند نکات ــــ افلاس کا شر ــــ انسان کے اپنے "اندر کی دنیا کا شر ــــ خارجی اور داخلی دنیا کے مقاصد کون متعین کرے؟ ــــ مستقل قدروں سے اغماض ــــ اخلاقیات کی تشریح ــــ کیریکٹر ــــ بالارادہ اعمال ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں ــــ ذمہ داری کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کی جاسکتی ــــ شیطان اور ابلیس ــــ جذبات انسان کا قیمتی اثاثہ ہے ــــ خیر مطلق اور شر مطلق ۔ موت بھی خیر ہے ــــ

۱۷۔ باہمی تادیب احتساب اور اصلاح کا صدقۂ جاریہ ۳۷۷ تا ۳۹۴

مولوی جلال الدین رومی کی ایک حکایت ــــ دوا سلام ــــ رومی سوداگر کے غلاموں کے بھاگ جانے کی کہانی ــــ نظام تادیب و احتساب کی ضرورت ــــ ایمان کے معنے ــــ مان لینے کے ساتھ عمل کی گواہی ــــ میکانکی اعمال ــــ عمل صالح کے ایجابی اور سلبی پہلو ــــ اقتدار کے مقاصد ــــ تادیبی پروگرام چلانے کی ذمہ داری ــــ ارکانِ دین ان کا باہمی ربط ــــ اصلاح معاشرہ ــــ اخلاق حسنہ ــــ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرآن حکیم کا مسلسل لازمی تعلیم کا پروگرام ہے ــــ کعب بن مالک کا واقعہ ــــ چند اوامر و نواہی

۱۸۔ ــــ وہ سلبی قوتیں جو انسانی ذات کی راہ میں حائل رہتی ہیں ۳۹۵ تا ۴۰۷

ابلیس اور شیطان ــــ کفر ــــ شرک ــــ ظلم ــــ معصیت ــــ عدوان ــــ اثم ــــ فساد فسق و فجور ــــ منافقت ــــ ذنب

کتابیات ــــــــ ۴۰۸

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

باسمہ تعالیٰ

دیباچہ

انسان کائنات اور خدا کا رشتہ ہر مذہب کا بنیادی مسئلہ رہا ہے مختلف ادوار کے مفکرین نے اس رشتے اور تعلق کو اپنے اپنے طریقے سے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس ضمن میں بعض مفکرین کسی مخصوص طرزِ فکر، ذاتی دلچسپیوں یا کسی قسم کے تعصب کے سبب اعتدال کے دامن کو چھوڑ کر انتہا پسندانہ رویہ اختیار کر بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اخذ کردہ نتائج نہ صرف یہ کہ ایک خاص گروہ تک محدود ہو کر رہ گئے بلکہ عقلی و منطقی میزان پر بھی پورا نہ اتر سکے۔ اس طرح اس گروہ کے تمام افراد سے بھی وہ مقبولیت کی سند حاصل نہ کر سکے۔ تنگ نظری اور جانبدارانہ رویہ کی وجہ سے وہ قبولِ عام نہ حاصل کر سکے۔ اور بالآخر گوشۂ خمول میں جا گرے قدرت کا اصول یہی ہے کہ قبولِ عام اور بقائے دوام اس کو ہی حاصل ہوتا ہے جو بنی نوع انسان کے لئے نفع بخش ہو وامّا ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۷ م الرعد ۱۳)

پروفیسر ڈاکٹر مہر عبدالحق صاحب کی تخلیقی کاوش "کائنات کے ازلی رشتے" کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی مخصوص طرزِ فکر اور دبستان فلسفہ کی ترجمانی نہیں کرتی۔ بلکہ یہ حکمت قرآنی کے خدوخال کو اجاگر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ مہر صاحب نے اس کتاب میں انسان، کائنات اور انسان کے تعلق کو نہایت ہی خوبصورت، اچھوتے اور منفرد انداز میں بیان کیا ہے اس میں کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بات کے اثبات کے لئے عقلی و منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ نقل و وحی کا بھی سہارا لیا ہے، اپنے مباحث میں انہوں نے ان ذرائعِ علم کو ایک دوسرے کی ضد قرار دینے کی بجائے ایک دوسرے کے ممد و معاون کے طور پر پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے حدود و قیود کا تعین بھی کیا ہے مثلاً "تعارفِ موضوع" میں وہ اپنی گفتگو کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "اسے زندۂ جاوید اعجاز کہیے یا کلامِ الٰہی کے ناطق بالفصاحت ہونے کا ثبوت سمجھیے کہ جونہی آپ قرآن حکیم کے حضور اپنی عقلِ ناقص کی نارسائی کا اعتراف

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کرتے ہوئے خلوص دل اور صفائے نیت کے ساتھ ہدایت یابی کے لئے حاضر ہونگے
تو ابد تک زندہ و پائندہ رہنے والی یہ کتاب علم و حکمت آپ کو مایوس و ناامید
نہیں کرے گی بلکہ آپ کے دامنِ طلب کو اذکارِ عالیہ کے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیگی

ان سطور میں جہاں انہوں نے عقل کی عاجزی اور وحی کی برتری کا اعلان کیا ہے وہاں عقل و وحی کی حدود بھی کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ عقل اور وحی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ وحی عقل میں نکھار پیدا کرتی ہے' وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں۔

"قرآن کریم کا انداز بیان ہمیشہ فکر انگیز ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی ہر آیت پر غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے"

زیر نظر کتاب میں انہوں نے عقل اور وحی میں اعتدال اور توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی نہج پر قائم رہتے ہوئے انہوں نے خدا، کائنات اور انسان کے تعلق کی تشریح کی ہے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ ان کے انداز میں ایک جامعیت پیدا ہو گئی ہے بلکہ یہ کتاب تحقیق و تبلیغ کا ایک نادر سنگم بن گئی ہے۔ جو ایک اعلیٰ دماغ سے لے کر عام فرد تک ہر ایک کے لئے یکساں طور پر باعث منفعت ہے۔

کائنات کے ان ازلی رشتوں (خدا، انسان اور کائنات) کی تشریح و تفسیر تفہیم و تعلیم اور ترسیل و تبلیغ اس وقت پوری نوع انسانی کا مسئلہ ہے۔ ایک طرف جدید دنیا نے "الہام و وحی" سے منہ موڑ کر خود کو عقل و حواس کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا ہے، دوسری طرف اسلامی دنیا بھی اس مسئلے کی اہمیت و ضرورت سے کما حقہٗ آگہی نہیں رکھتی۔ اسلامی دنیا کی غالب اکثریت سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی مسائل میں کچھ یوں الجھی ہوئی ہے کہ اسے اس طرف متوجہ ہونے کا خیال تک نہیں آتا۔ یہ مسائل بھی در حقیقت بلاد اسلامیہ کے سامراجی آقاؤں اور خود ان کی اپنی ہوس اقتدار کے پیدا کردہ ہیں۔ ایسے میں مہر صاحب کی یہ کاوش قابلِ صد تحسین ہے کہ انہوں نے فساد و انتشار اور نزاع و بدامنی کے طوفان میں گھری ہوئی انسانیت کو ایک ایسی راہ نجات دکھائی ہے جو عامی سے عالم تک سب کی ضرورت ہے۔

مہر صاحب نے اپنی کتاب میں توحید کو تمام رشتوں کی اساس قرار دیا ہے۔ توحید کی بنیادی حقیقت سے ہی انہوں نے مراتبِ انسان اور مراتبِ علم کے تہہ در تہہ رشتوں کو اخذ کیا ہے۔ شخصیت انسانی کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں۔

"آدمی کا تجسم آدم کے پورے وجود کو اس طرح اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جس طرح نباتاتی بیج پورے درخت کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے اور اس سے کبھی الگ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نہیں ہو سکتا ۔ آدم کا وجود اس کے روحانی ورثے کا امین ہے "

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک بنیادی نقطے سے مہر صاحب کی یہ قابل قدر تصنیف عنوی وحدت کی طرح ہی نمو پذیر ہوتی ہے اور مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے ۔ کتاب کا آغاز مہر صاحب نے " روز الست " انسان کے خدا کے ساتھ میثاق ازلی سے کیا ہے ، خدا نے تخلیق آدم سے قبل تمام بنی نوع انسان کو ایک دفعہ وجود پذیر کر کے اپنے روبرو کھڑا کیا اور گواہی لی " کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں " سب نے کہا " بے شک ، بے شک آپ ہمارے رب ہیں " اس کے بعد ساری مخلوقِ انسانی پھر کتم عدم میں چلی گئی اور آدم کی تخلیق کے بعد انہی کا نشو و ارتقا نسلاً بعد نسل شروع ہوا قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ میثاق ازلی ہر انسان کے لاشعور میں موجود ہے اور انبیا اور صالحین جب دعوت ایمان دیتے ہیں تو وہ انسان کو اسی میثاقِ ازلی کی تجدید کی دعوت دیتے ہیں ۔ انسان کے خدا کے ساتھ ازلی رشتہ کی استواری کے ساتھ ہی اس کی زندگی میں استحکام اور پائیداری آجاتی ہے ۔ اصل فساد کی جڑ اس رشتہ کے افتراق و انفصال ہے ۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے معاہدہ سے بے خبر ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تم سے یہ میثاق اس لئے لیا ہے کہ قیامت کے دن تم اپنی بے خبری کا عذر پیش نہ کر سکو اور نہ تم یہ کہہ سکو کہ ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے شرک کیا ، اور ہم تو ان کے بعد آنے والی ان کی اولاد ہیں ، تو کیا تم ہمیں ان باطل لوگوں کے اعمال کی وجہ سے ہلاک کر رہے ہو ؟

(۷ : ۱۷۲ - ۱۷۳)

یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو ہر شخص کے ذہن کی گہری تہوں میں انفرادی طور پر موجود ہے ' اور انبیاء کی تعلیمات اسی معاہدہ کی یاددہانی سے متعلق ہیں ۔ جدید نفسیات میں ژونگ (Jung) کا مقام بہت بلند ہے ، اس کا کہنا ہے کہ لاشعور کی گہری تہوں میں کچھ نخستیں مثالیں (Archetypes) پائی جاتی ہیں ان میں ایک نخستیں مثال خدا پر یقین بھی ہے اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میثاق الست انسان کی روحانی اور ذہنی زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے ۔ جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا ۔

مہر صاحب کی کتاب کے تمام مباحث انسانی وجود کے عناصر ترکیبی ، تخلیق و ارتقا ، نفسِ انسانی کی حقیقت ، توحید باری تعالیٰ ، مقام نبوت ، زندگی کی ناقابل تغیر اقدار ، حقیقت دعا و سجدہ اور تشکیل ملت ' دراصل اسی بنیادی نقطے کی تشریح و تفسیر ہیں ۔ اس ضمن میں انہوں نے مشرق و مغرب کے معروف مکاتب فکر اور نقطہائے نظر کا تقابلی جائزہ لیا ہے اور اپنی گفتگو کو ان الفاظ پر تمام کیا ہے ۔

" مسلم امّہ میں ہر فرد صرف اللہ کے " کاز " کو تقویت دینے اور اسی کے منصوبے اور مقصد کو آگے بڑھانے اور تکمیل تک پہنچانے کے لئے وقف رہتا ہے "

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بلاشبہ روزِ اول بندے کا خدا سے میثاق اور کائنات میں اپنے عمل سے اس میثاق کی تکمیل ہی اللہ کا "راز" ہے۔ اس کتاب کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں جہاں تمام مسائل کے منبع و مصدر اور تمام فساد و انتشار کی جڑ کی نشان دہی کی گئی ہے وہاں مسائل کی تفہیم اور مسائل کے حل کی راہ میں موجود رکاوٹوں کو رفع کرنے کے لئے لائحہ عمل بھی موجود ہے۔ گویا یہ ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جو مرض کی تشخیص بھی کرتا ہے اور مرض کو دفع بھی کرتا ہے

مجھے امید ہے کہ مہر صاحب کی یہ گرانقدر کاوش مہرِ تابندہ کی طرح مسائل کی تاریکیوں میں بھٹکتے ہوئے "انسان" کی راہوں کو ہمیشہ ضیا بار کرتی رہے گی۔

نعیم احمد

۲۶ دسمبر ۱۹۹۰

نیو کیمپس لاہور

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

۱۔ تعارفِ موضوع

اسے زندۂ جاویدِ اعجاز کہیے یا کلامِ ربانی کے ناطق بالفصاحت ہونے کا ثبوت سمجھئے کہ جونہی آپ قرآن حکیم کے حضور اپنی عقلِ ناقص کی نارسائی کا اعتراف کرتے ہوئے خلوصِ دل اور صفائے نیت کے ساتھ ہدایت پانے کے لئے حاضر ہوں گے۔ تو ابد تک زندہ و پائندہ رہنے والی یہ کتابِ علم و حکمت آپ کو مایوس و نا امید نہیں کرے گی۔ بلکہ آپکے دامن طلب کو افکارِ عالیہ کے گلہائے رنگا رنگ سے بھر دے گی۔ ان سطور کے لکھنے والا یہ بات محض عقیدۃً نہیں کہہ رہا۔ بلکہ اُس کیفیتِ جذب و سرور کی شدت کے تحت کہہ رہا ہے جو ذوقِ آگہی کے معراجِ یقین تک پہنچنے کا تجرباتی اور مشاہداتی نتیجہ ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن قرآن حکیم کی تلاوت کے دوران ایک آیت جلیلہ سامنے آئی جس سے ملحقہ ماسبق آیت کا لفظ ہے "فَاسِقِیْن" اس آیت میں فاسقین کے لفظ کی مزید تشریح کی گئی ہے ارشاد ہوا ہے کہ

"یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدے کو پکا کر دینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اُن (رشتوں کو) جن کو اللہ نے، اس میثاق کے ذریعے جوڑنے کا حکم دے رکھا ہے کاٹ ڈالتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہی ہیں جو خسارے میں رہیں گے" ۲ : ۲۷

اس آیت جلیلہ کے سامنے آتے ہی ذہن میں ایک تو یہ سوال اُبھرا کہ انسان نے اللہ کے ساتھ میثاق کی صورت میں جو عہد کر رکھا ہے وہ کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ وہ رشتے اور روابط کون کون سے ہیں جن کے قطع کر دینے والوں کو "فاسقین" قرار دیا جا کر خسارے میں رہ جانے کی وعید دی گئی ہے؟ خسارے میں رہ جانے والوں کا نقشہ ابھی ذہن میں دھندلے سے خطوط و زاویا کے ساتھ مرتب ہو رہا تھا کہ اسی مضمون کی ایک اور آیت نئے اسلوبِ نگارش کے ساتھ سامنے آگئی۔ اس آیت جلیلہ سے ملحقہ ماسبق آیت کا آخری لفظ ہے "اُوْلُوا الْاَلْبَاب" (یعنی اہلِ علم و دانش) اور اس آیت میں تفصیلاً بتایا گیا ہے۔ کہ یہ اہلِ علم و دانش کون ہیں۔

"یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو نہیں توڑتے بلکہ اس میثاق کے مطابق انہیں جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہ انہیں اور زیادہ مضبوط بناتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے نشو و ارتقا دینے والے (کے قانونِ جزا) سے ڈرتے اور بُرے حساب سے خائف رہتے ہیں"

اہلِ علم و دانش کے اوصاف کی مزید توضیح کے بعد پہلے والے مضمون کا اعادہ ہوتا ہے۔ اور نسبتہً زیادہ سخت الفاظ کے ساتھ) کہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

• فاسقین جو رشتوں کو کاٹ ڈالتے ہیں زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں
جن پر اللہ کی لعنت ہے۔ ان کے لئے بہت بُرا گھر ہے" ۱۳ : ۲۵

ان آیات نے قلب مضطر کے اندر زبردست ہیجان پیدا کر دیا۔ جذبہ اشتیاق و جستجو اور ذوقِ تحقیق و طلب بڑھ کر اٹھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم اپنی کم علمی اور بے خبری کی وجہ سے اُن رشتوں کو اہمیت نہیں دے رہے جن کے جوڑنے اور مضبوط رکھنے کا عہد ہم نے اپنے خالق اور نشوو ارتقا دینے والے سے کر رکھا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ان رشتوں کو کاٹ کاٹ کر اپنے لئے بہت بُرا ٹھکانہ بنا رہے ہیں؟ یا اگر توڑ نہیں رہے تو جوڑ بھی تو نہیں رہے! اس خدشے کو محسوس کرتے ہوئے دل نے فیصلہ کیا کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ میثاق کیا ہے، جو روزِ ازل خالقِ کائنات اور انفُسِ اولادِ آدم کے درمیان طے پایا تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ اس عہد کی رُو سے وہ کون سے رشتے اور روابط ہیں جنہیں کسی وقت اور کسی قیمت پر بھی اولادِ آدم کو قطع نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا کرنا اس کی اپنی تباہی اور بربادی کا باعث ہوگا۔ بلکہ اہلِ علم و دانش کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ اُن "فاسقین" کے خلاف بہم مصروفِ جہاد رہیں، جو میثاقِ آفرینش سے رُوگردانی کرکے ازلی اور ابدی رشتوں کو کاٹتے رہتے ہیں۔

جس عہد اور میثاق کا حوالہ مذکورہ آیات میں دیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

"جب تیرے نشوو ارتقا دینے والے (رب) نے آدم کی اولاد کو ان کی پیٹھوں سے نکالا
اور اُن سے انہی کے نفسوں پر یہ اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو ان سب نے
کہا: ہاں، تم ہو! ہم اقرار کرتے ہیں! (ہم نے تم سے یہ اقرار اس لئے لیا کہ) تم قیامت کے
دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔
یا تم یہ کہو کہ ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے شرک کیا اور ہم تو ان کے بعد آنے والے ان کی
اولاد ہیں تو کیا تم ہلاک کر رہے ہو، ہمیں اُن باطل لوگوں کے اعمال کی وجہ سے؟ ۷ : ۱۷۲، ۱۷۳

چونکہ انسان کی تخلیق ہی اعلیٰ معیار کی صلاحیتوں پر ہوئی ہے، اس لئے اپنے خالق اور نشوو ارتقا دینے والے کی پہچان اس کی فطرت اور طبعِ سلیم کا تقاضا ہے۔ یہی فطری تقاضا اُسے اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھاتا ہے اور اسی کی بدولت وہ اپنے آپ کو زندگی میں پیش آنے والے خطرات سے محفوظ و مامون رکھ سکتا ہے۔ ان صلاحیتوں کو بیدار اور فعال رکھنے کے لئے قرآن حکیم ہر انسان کے اندر کی خاموش اور مُطہّر "شخصیت" کو اس استعاراتی میثاق کے ذریعے آواز دیتا ہے۔ یہ سادہ، پاک صاف اور غیر ملوّث "شخصیت" اس آواز کو سن کر بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔ اس اقرار و اعلان پر اللہ ہی نفس کا خالق ہے اور اللہ ہی اس کو نشوو ارتقا کے مراحل سے گزارتا ہوا تخلیق تک لے جانے والا رب ہے۔ صداقت کا یہ اقرار گویا میثاق ہے عبد اور معبود کے درمیان جس کی رُو سے کوئی انسان اپنی انفرادی ذمہ داری سے بریّت کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی یہ بہانہ بنا سکتا ہے کہ وہ عبد اور معبود کے رشتے سے بے خبر تھا۔

قرآن حکیم کا اندازِ بیان ہمیشہ فکر انگیز ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی ہر آیت پر غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

لہٰذا آیاتِ جلیلہ کے تمثیلی معانی پر سے یونہی سرسری طور سے گزر جانا اپنے آپ کو جہالت کے اندھیروں میں رکھنے کے مترادف ہے۔ اس میثاق کے مفہوم کو واضح کرتے ہوتے علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں۔

"تمام عقائدِ حقہ اور ادیانِ سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے جب تک یہ اعتقاد نہ ہو مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی اور انبیاء و مرسلین کی ہدایت کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر پورے غور و تامل سے دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول و فروع بالآخر خدا کی ربوبیت عامہ کے اسی عقیدے پر منتہی ہوتے بلکہ اسی کی تہ میں لپٹے ہوتے ہیں۔ عقلِ سلیم اور وحی و الہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں پس ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبدء و منتہیٰ اور تمام ہدایت ربانیہ کا وجودِ مجمل کہنا چاہیے عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تاکہ ہر آدمی عقل و فہم اور وحی و الہام کی آبیاری سے اسی تخم کو شجرِ ایمان و توحید کے درجہ تک پہنچا سکے، اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداءً یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی جوہری عقیدہ کا حل ناخنِ عقل و فکر کے سپرد کر دیا جاتا۔ تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیوں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن کر رہ جاتا جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے۔ جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر و استدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلافِ آراء پر منتج ہوتی ہیں۔ اسی لئے قدرت نے جہاں غور و فکر کی قوت اور نورِ وحی و الہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی وہیں اس اساسی عقیدہ کی تسلیم سے ان کو فطرتاً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایت کی تفصیل منطوی و مندمج تھی اور جس کے بدون مذہب و ۔ ۔ ۔ ۔ ت کا کوئی ستون کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اسی ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالےٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے اور جن معدود افراد نے کسی عقلی و روحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوتے جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ اور بدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہر حال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیتِ کبریٰ پر عام اتفاق و اجماع اس کی زبردست دلیل ہے۔ کہ یہ عقیدہ عقول و افکار کی دوادوش سے پہلے ہی فاطرِ حقیقی کی طرف سے اولادِ آدم کو بلا واسطہ تلقین فرما دیا گیا

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ورنہ فکر و استدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہو جانا تقریباً ناممکن تھا...... ہے"

اس کارخانۂ قدرت میں ہر چیز اپنی ابتداء سے انتہاء اور آغاز سے انجام تک ربوبیتِ حق تعالیٰ کے عظیم ترین نظام کی عطا و بخشش کی محتاج رہتی ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظِ میثاق میں جو خطاب ہے وہ اولادِ آدم کے تمام جانشینوں یعنی پوری انسانیت سے ہے۔ اُس انسان سے بھی جو پیدا ہو چکا ہے اور اس سے بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اس میں زمان و مکان کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کیونکہ آدمی کا تخم آدم کے پورے وجود کو اسی طرح اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جس طرح نباتی بیج پورے درخت کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے اور اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکتا۔ آدم کا وجود اس کے روحانی ورثے کا امین ہے اور اسی اعتبار سے ارشادِ ربانی کی یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ پوری "نوعِ انسانی" "ایک نفسِ واحد کا سا وجود" رکھتی ہے۔ قدرت کاملہ نے انسان کو بحیثیتِ نوع بعض ایسی صلاحیتیں اور استعدادات عطا کر دی ہیں۔ جو اسے تمام دوسری انواعِ مخلوقات سے افضلیت کا امتیاز بھی دیتی ہیں اور اس پر یہ فریضہ بھی عائد کرتی ہیں کہ یہ اپنی "انسانی ذات" کی ذمہ داریوں کو باحسن طریق پورا کرے۔ قانونی نقطۂ نظر سے ہر انسان پابند ہے کہ وہ اس مضمر عہد کی شرائط کو پورا کرے جس کی رُو سے اسے اختیار اور ارادے کی جزوی آزادی اور اعمال کے نتائج کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔

یہ میثاق اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہم صدقِ دل سے قولاً اور فعلاً اس حقیقت پر ایمان رکھیں کہ اللہ ہی ہمارا نشو و ارتقا دینے والا پروردگار ہے اور ہم اس کے مربوب ہونے کے ناطے سے اُس کے دیئے ہوئے احکام و قوانین کی تعمیل کے پابند ہیں۔ جب ہم اس امر کا اعلان و اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا ہمارا اور کوئی پروردگار نہیں ہے تو گویا ہم اُس کی عبودیت کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی بجاآوری کو بھی قبول کرتے ہیں

علم، عقل، جذبات اور اختیار و ارادے کی قوتیں جو صرف "انسانی ذات" کو عطا ہوئی ہیں حقیقت و صداقت کو قبول کرنے کے لئے کافی ہیں۔ عقل کے اندر سچائی کے پرکھنے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی استعداد نہ ہوتی تو ہم بھی حیوانوں کی طرح کسی ذمہ داری کے اٹھانے پر مکلف نہ ہوتے۔ ہمارا انسانی شرف امتیاز یہی ہے کہ ہم اپنی عقل اور وحیٔ ربانی کی روشنی میں حق و باطل کو الگ الگ کر سکتے ہیں اور سچائی کو پہچان لینے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہیں، ہماری یہی صلاحیت اور استعداد استعارۃً "ہمارا میثاق" ہے جو ہم نے اپنے رَبّ سے کر رکھا ہے اور جس کے پورا کرنے کے لئے ہم بحیثیت انسان پابند اور ذمہ دار ہیں۔ اولوالالباب اپنی اپنی صلاحیتوں کے فیصلے کی مدد سے اپنے میثاق کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ ان کے برعکس "فاسقین" جن کا کام ہی سرکشی اور بغاوت کر کے، الگ ہو جانا ہے نہ تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پوری نوعِ انسانی نفسِ واحد کی طرح ہے اور نہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدوں کو نبھانا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ ان کی یہی عہد شکنی اور کج روی زمین کے اندر فساد اور عدمِ توازن کا سبب بن جاتی ہے۔

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے سوال کا نیازمندانہ جواب "قَالُوْا بَلٰى" توثیق کرتا ہے خالق اور مخلوق کے درمیان طے پانے والے عہد کی جس کی رُو سے خالق نے اپنے ذمے رحمت اور ربوبیت عامہ لے لی ہے اور مخلوق نے اپنے رَبّ کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حاکمیت میں کسی اور بری یا غیر بری حاکم کو شریک نہ کرنے کا عہد کر لیا ہے۔ میثاق یکجا ہوگیا اور اس حد تک بات واضح ہوگئی کہ اب اگر کوئی ناقص العقل انسان اس عہد کی خلاف ورزی کرے گا۔ تو نتائج کی ذمہ داری از روئے قانونِ مکافاتِ عمل اس کے اپنے اوپر ہوگی۔ اور اس ذمہ داری کا بوجھ کسی اور کے کندھے پر نہیں ڈالا جاسکے گا۔ تاہم عام آدمی کی تفہیم کے لئے ابھی یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔ کہ اس میثاق کی رُو سے وہ کون سے رشتے اور روابط ہیں جنہیں فاسقین تو کاٹ ڈالتے ہیں لیکن اہلِ علم و دانش انہیں مضبوط بناتے رہتے ہیں۔ کیونکہ خالق اکبر نے ان کے جڑے رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا مکمل اور واضح جواب ہر صاحب عقل و دانش کو معلوم ہونا چاہیئے۔ حکم غیر واضح ہو تو اس کی تعمیل بھی سرسری اور سطحی سی ہوتی ہے، جب تعمیل برائے نام یا محض نمائشی ہوگی۔ تو اس کے نتائج بھی کوئی واضح تعمیری شکل اختیار نہ کر سکیں گے، اپنے گرد و پیش نظر دوڑ لیئے آپ کو عالمی سطح پر ہی نہیں ملکی اور علاقائی، انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر فساد ہی فساد نظر آئے گا۔" فاسقین "یعنی SAPARATISTS ہر رشتے، ہر تعلق اور ہر رابطے کو کاٹ رہے ہیں اور اولوالالباب، جن کا کام اللہ کے بتلائے ہوئے رشتوں کو جوڑتے رہنا تھا، کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اگر کہیں ہیں بھی سہی تو وہ ان رشتوں کو فراموش کر چکے ہیں جن کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دے رکھا ہے اور اب یہ نئے رشتوں کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ عقل انسانی نے جب کبھی ہدایتِ ربّانی کا ہاتھ جھٹک کر تنہا زندگی کے متنوّع راستوں پر چل نکلنے کی کوشش کی ہے اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں اور انسانیت کو انتشار و تشتّت کے جہنم زار کے دہانے تک لاکھڑا کیا ہے۔

قرآن حکیم تمام سابقہ ہدایاتِ ربّانی کی جامع اور آخری مکمل رہنمائی ہے اس لئے آج کے اس دَورِ اضطراب میں اس کی طرف ایک بار پھر رجوع کرنا پوری انسانیت کے لئے ناگزیر ہے چنانچہ وقت کے اس اہم ترین سوال کے حل کرنے کیلئے کہ وہ کون سے رشتے اور روابط ہیں جنہیں کاٹ ڈالنے کی بجائے ہمیں مضبوطی سے جوڑے رہنا ہے۔ ہم نے مختلف علمی و ادبی شخصیّات اور مفکرین کی کتبِ فلسفہ و دانش اور علومِ قرآنی کے ماہرین کی نگارشات سے مستفید ہونے کی کوشش کی۔ لیکن کہیں سے وہ بات سامنے نہ آئی جو قلب و نظر کے لئے وجۂ اطمنان و سکون بن سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت کے مفاہیم و مطالب کی وسعتوں پر بالشیر و مفسرین و مفکرین نے بھی غور و فکر کیا ہے اور اپنی اپنی سوچ کے مطابق اس کی تشریحات پیش کی ہیں۔ چنانچہ ہمارے زمانے کے بہت بڑے دانشور اور مفکر خلیفہ عبدالحکیم صاحب لکھتے ہیں:

> "ہمیں انجیل مقدس اور قرآن حکیم دونوں میں ایک خوبصورت اور کثیر المعانی آیت ملتی ہے۔
> جس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس تعلق کو "نہ کاٹو جس کے جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے" انجیل کے
> شارحین اور قرآن حکیم کے مفسرین دونوں نے اس آیت کی تشریح بڑی تنگ نظری سے کی ہے' ان
> حضرات نے اس کی اہمیت اور اس کے معانی کی گہرائی کو سمجھا ہی نہیں چونکہ انجیل میں یہ آیت
> "طلاق" کے باب میں آئی ہے۔ اس لئے انجیل کے شارحین نے اس کی معانی کو طلاق کی
> ممانعت تک محدود کر دیا ہے۔ خدا کے نزدیک رشتۂ ازدواج ایسا مقدس رشتہ ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جس کے ذریعے میاں بیوی کے دو افراد کو باہم جوڑ کر ایک بنا دیا گیا ہے' اس لئے اس "جوڑ" کا قطع کر دینا گناہ ہے۔ مسلمان فقہائے بھی اس آیت کی تشریح میں اپنی سوچ کو چند قانونی امور تک محدود رکھا ہے۔ اور اس کے معانی کی وسعت کو نہیں سمجھا (حالانکہ اسلام طلاق کی مشروط طور پر اجازت دیتا ہے۔ اور ان آیات کا نزول بھی عائلی زندگی سے متعلق احکام کے سیاق سباق میں نہیں ہوا۔ مولف) میرے فہم کے مطابق اس آیت جلیلہ میں صحیح دین اور سچے اخلاق کی تعلیم کا نچوڑ دے دیا گیا ہے۔ اور اس کا اطلاق تمام معاشرتی سیاسی اور اقتصادی روابط پر ہوتا ہے" فطرت" ساری کی ساری ایک ہے کیونکہ اس کا خالق ایک ہے۔ اس فطرت کی ہر چیز تمام دوسری چیزوں کے ساتھ قریب یا دُور کے کسی نہ کسی رشتے کے ساتھ منسلک ہے اور اسے ان رشتوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی فکر کے ابتدائی مراحل کے دوران یعنی زمانۂ عتیق میں فطرت کو بلند اور پست یا اعلیٰ اور ادنیٰ دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور یہ باور کر لیا گیا تھا کہ ایک حصّہ خدا کو پسندیدہ ہے اور دوسرا حصہ اس کی نظروں سے گرا ہوا ہے۔ چنانچہ قدیم لوگوں کا عقیدہ تھا۔ کہ عالم بالا دیوتاؤں سے آباد ہے۔ اور سورج' چاند' ستارے وغیرہ سب دیوتا ہیں۔ لہٰذا ان کی پوجا کرنی چاہیئے۔ ہماری دنیا جو تحت القمر ہے یہ فنا اور تغیرات کی دنیا ہے اس لئے اس سے نفرت کرنی چاہیئے۔ اور صرف عالم بالا کی پرستش کرنی چاہیئے۔

اسلام نے اس فرضی تقسیم کو غلط قرار دیکر اعلان کر دیا کہ آسمانوں سے لے کر زمین تک کے تمام مظاہر فطرت بغیر کسی استثنا کے اللہ ہی کی قوت و قدرت اور اُسی ذات باری تعالیٰ کی رحمتِ بے پایاں کے آئینہ دار ہیں۔ ان مظاہر سے شعوری اور عاقلانہ نظم و ترتیب کا اظہار ہوتا ہے۔ جو قانون ستاروں کو اپنے اپنے دوائر میں توازن و تناسب کے ساتھ رواں دواں رکھتا ہے وہی گھاس کی پتی کو بھی نشوو ارتقا دے رہا ہے یہ دونوں مظاہر اپنی اپنی سطح پر معجزانہ بھی اور مقدس و الوہیاتی بھی ہیں۔ وہ بالغ نظر انسان جو فطرت کے مظاہر کی اصلیت کو جانتے اور پہچانتے ہیں اُن کے لئے کسی اور ثبوت یا اعجاز کی ضرورت نہیں ہے اس حقیقت پر ایمان لانے کی غرض سے کہ ان تمام مظاہر فطرت کا خالق ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ ایک خالق عاقل بھی ہے اور خیر و خوبی کی صفات سے متصف بھی ہے' تاہم وہ کم نظر لوگ جنہیں اس ایمان تک پہنچنے کے لئے حیرت زا معجزوں کی طلب یا مہیب اور ششدر کر دینے والے کرشموں کی ضرورت ہوتی ہے وہ معجزے اور کرشمے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے بلکہ تحیّر میں پھنس کر عقل و دانش سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اور مظاہر فطرت کی تہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہیں جو قوانین کام کر رہے ہیں انہیں بھی جادو اور فریب نظر کہہ دیتے ہیں۔ اسلام نے فطرت واحد کے ان حصوں کو گویا پھر سے جوڑ دیا جنہیں ناقص فکر انسانی نے کاٹ ڈالا تھا۔ حالانکہ اللہ کے ہاں یہ ایک وحدت میں مجتمع ہوا تھا۔

انسانوں کی دنیا میں آیئے تو آپ کو ایک طرف کچھ ایسے لوگ ملیں گے جو صرف فطرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسری وہ لوگ دکھائی دیں گے جو ماورائیت کے اتنی شدت سے قائل ہیں کہ ان کا خدا ایسا خدا ہے جس کا فطرت کے ساتھ گویا کوئی واسطہ اور تعلق ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اس دوسری قسم کے لوگوں کی کثرت تھی۔ یہ لوگ فطرت تو کیا اپنے ہی جسم کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا کی ہر چیز کے ساتھ شیطان چمٹا ہوا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے جوگیوں اور سادھوؤں کے ہاں، جو فطرت کے ہر جبلی تقاضے کو قابل نفرت سمجھتے ہیں۔ آج بھی یہی صورت حال ہے۔ اس انداز فکر نے خدا اور فطرت دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ تاہم اسلام نے رہبانیت کی نفی کر کے فطرت کی کھوئی ہوئی تقدیس کو پھر سے بحال کر دیا اور اسے ایک باشعور تخلیقی محبت کے رنگ میں پیش کر کے اسے ایک واضح شہادت و برہان کی حیثیت بخش دی۔

جس طرح خارجی فطرت کو کاٹ کر دو علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا تھا یعنی ایک آسمان اور دوسری زمین، ایک عالم نور دوسرا عالم ظلمت، ایک مملکت خداوندی، دوسری مملکت شیطانی، اسی طرح بعض لوگوں نے انسانی فطرت کو بھی "روح" اور "مادہ" کے دو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور یہ سمجھ لیا کہ ایک حصہ جوہر لطیف ہے اور دوسرا گوشت پوست کا حصہ، کثیف ہے، ایک عقل ہے اور دوسرا حصہ جبلت ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر قسم کی رہبانیت اسی قسم کی فرضی تقسیم سے پھوٹتی ہے۔ اگر جبلی تقاضوں کو شیطانی عمل متصور کر کے یہ باور کر لیا جائے کہ انسانی وجود خدا اور شیطان کا مقام اتصال ہے اس لئے جسم اور اس کے تمام تقاضوں کو سختی سے دبا دینا چاہیے تو پھر روح اور جسم کے درمیان جو نامیاتی وحدت کا رشتہ ہے اور جسے ہم انسان کہتے ہیں اسے بھی دو حصوں میں منقطع کر دینا پڑے گا۔ پھر اس طرح اس کے دونوں حصے مردہ ہو جائیں گے۔ اس انداز فکر کی غلامی کے خلاف بھی اسلام انسان کا نجات دہندہ بن کر آیا۔ اس دین توحید نے انسان کی تمام جبلتوں کو قدر و قیمت عطا کی اور ان کی تسکین کے لئے مناسب حد بندی قائم کر دی اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ جبلی خواہشوں کو اس دائرۂ عمل کے اندر فعال رکھا جائے یعنی نہ تو انہیں یکسر دبا دیا جائے اور نہ انہیں بے لگام ہونے دیا جائے۔ کیونکہ یہ نظم و ضبط

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں رہ جائیں۔ تو اعلیٰ تہذیبی قدروں کا سرچشمہ ہیں۔ چنانچہ اسلام نے وہ تمام سخت ریاضتیں اور مشقتیں ممنوع قرار دے دیں جن سے جسم کو دردناک اذیتوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اور اسے غیر ضروری تکلیفوں میں مبتلا رکھا جاتا تھا۔ قرآن حکیم نے جہاں عیسائی راہبوں کی تعریف کی ہے کہ یہ خدا سے محبت رکھتے ہیں اور دنیا کے مقابلے میں خدا کو ترجیح دیتے ہیں، وہاں یہ بھی ارشاد فرما دیا ہے کہ یہ غلط راستے پر چل نکلے ہیں۔ اور انہوں نے ترک دُنیا کے اصل مفہوم کو سمجھا ہی نہیں۔ ترک دنیا یہ ہے کہ زندگی کے عام معمولات میں بھی برابر کا شریک رہا جائے لیکن انتہائی سادگی سے زندگی بسر کی جائے یہ نہیں کہ دُنیا کی ہوس میں پھنس کر اعلیٰ قدروں کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لی جائیں۔ قرآن حکیم نے اخلاقی احکام و ضوابط کو حدود اللہ کا نام اسی لئے دیا گیا ہے کہ ان سے جبلتی تقاضوں کو نظم و ضبط کے دائرے میں لایا گیا ہے، حدبندی کا یہ عمل شخصی مفاد اور معاشرتی فلاح و بہبود دونوں کیلئے ضروری ہے۔ جبلی تقاضے انسانی زندگی کو متحرک اور فعال رکھتے ہیں۔ جبکہ روحانیت کا منصب ان فعال قوتوں کے رُخ کو صحت مند راہوں کی طرف موڑ دینا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کا لُب لباب بھی یہ ہے۔ کہ خدا نے کوئی چیز بے مقصد اور بے مصرف پیدا نہیں کی۔ لہٰذا ہمارے جذبات، ہماری خواہش اور ہمارے جبلی تقاضے بھی ہمیں خاص مقصد کے پورا کرنے کیلئے عطا کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک خاص مقام ہے اور ایک خاص دائرۂ عمل ہے۔ انسان ایک "نامیاتی کُل" ہے، جو الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا جس طرح جسم ایک نامیاتی وحدت ہے اسی طرح رُوح بھی بعض بلند پایہ قوتوں کی جامع وحدت ہے۔ انسان کے وجود میں جسم اور رُوح کی دونوں وحدتوں کا حسین ترین امتزاج ایک بلند تر وحدت کو وجود میں لاتا ہے جسے تجزیاتی مشاہدے سے نہیں سمجھا جا سکتا انسان بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوگا۔ اگر وہ اپنی عقل کو جبلی تقاضوں سے، یا اپنی رُوح کو اپنے جسم سے، منقطع کر لے۔ اب تو لیبارٹری کے تجربات سے بھی رُوح اور جسم کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہنے کی حقیقت کو ثابت کر دیا گیا ہے۔ خواہ ہماری عقل کے لئے جو صرف نظری مفروضات کی گرویدہ رہتی ہے یہ حقیقت کتنی ہی ناقابل فہم کیوں نہ لگے ہمارے جسم کا ہر وقوعہ ہمارے رُوحانی احوال کو متعین بھی کرتا ہے اور ان میں ترمیم و تنسیخ وغیرہ کا عمل بھی جاری رکھتا ہے۔ اسی طرح ذہن میں پیدا ہونے والا ہر خیال اور دل کے اندر اُٹھنے والی ہر جذباتی موج جسم کے سارے نظام کو تہ و بالا کر دیتی ہے خواہ اس کا ہمیں شعوری طور پر علم ہو یا نہ ہو۔ اسلام نے اس ضمن میں بھی صحت مند جسم اور صحت مند رُوح کی مستقل قدر کا اعلان

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کیا اور اس "قدر" پر سختی سے عمل پیرا رہنے کا حکم دیا۔ روح اور جسم کی صحتمندی کے اس اصول کو "بھٹکی ہوئی مذہبیت" نے اس حد تک بھلا دیا تھا کہ زمانۂ وسطیٰ کے راہب اور درویش غسل کرنے کو بھی گناہ سمجھنے لگ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ جسم اور لباس میں بالارادہ جوئیں پالتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تو خدا کے موتی ہیں۔ کتنے ہی راہب جوؤں سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے! بعض سالکانِ راہ فقر کھردرے اور سخت بالوں سے بنے ہوئے انگرکھے اور زیر جامے صرف اس وجہ سے پہنتے تھے کہ جسم بے آرام رہے اور اس بے آرامی سے روح کو ارتقا حاصل ہو۔ اسلام نے انسانیت کی عالمگیر سطح پر ایک بہت بڑی خدمت یہ بھی کی ہے کہ اس نے جسم اور لباس کو ہمہ وقت پاک صاف رکھنے کا واضح حکم دے کر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس کے بغیر تمہاری نماز تک نہ ہوگی، اس طرح اس پاک دین نے خود ساختہ روحانی مذہبوں کا بھی قلع قمع کر دیا ہے۔

انسانی سطح کی زندگی طبعی سطح کی زندگی سے بہت بلند ہے تاہم روح کی فعالیت صرف جسم ہی کے واسطے سے ممکن ہے کیونکہ انسانی اور اُخرویاتی قدروں کی عمارت طبعی بنیادوں پر ہی قائم کی جا سکتی ہے۔ طبعی تقاضوں کا ایک مخصوص دائرۂ عمل ہے تاہم ان تقاضوں کے ساتھ کچھ حقوق اور فرائض بھی وابستہ ہیں۔ لہٰذا ان تمام طبعی تقاضوں کو اپنے اپنے دوائر کے اندر رہ کر کام کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ تاکہ کوئی ایک تقاضا کسی دوسرے تقاضے کے واجبات میں دخل انداز نہ ہو سکے۔ پس جو چیز "ممنوع" ہے وہ یہی دخل اندازی ہے نہ کہ طبعی تقاضوں کی فعالیت! "اخلاقیات" انہی تقاضوں کے صحیح راستوں پر گامزن رہنے کا نام ہے۔

اسلام مکمل ایلاف و اتصال کا مذہب ہے۔ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ اس اصول کو دین کی حیثیت دے کر نافذ کیا گیا ہے کہ انسان کی من حیث الکل نشوونما صرف اس صورت میں ممکن ہے جب انسان اپنے جوہرِ انسانیت کے ساتھ کلی طور پر ہمکنار رہے، معاشرے کے روابط کو مضبوط رکھے اور فطرت کے ساتھ بھی رشتہ قائم رکھے۔ پھر ان تینوں رشتوں کے مکمل انضمام کی بنیاد خالق حقیقی کی وحدت کو سمجھے جو تمام کائنات میں واحد اور یکتا ہے۔

وجود یا ہستی کے بھی طبقات ہیں، تاہم ہر طبقہ اصل الاصول کی مقصدیت کے اعتبار سے اور نامیاتی طور پر ہر دوسرے طبقے کے ساتھ مربوط ہے۔ قرآن حکیم نوع انسانی کی وحدت کے عقیدے کو بار بار دہراتا ہے اور تاکیداً ارشاد کرتا ہے کہ:

اے انسانو! اپنے نشوو ارتقا دینے والے کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں نفس واحد سے تخلیق کیا (۴:۱)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نوعِ انسانی کی وحدت اور سالمیت کا دار و مدار صرف اسی عقیدے پر ہے۔ کہ قبائل اور اقوام کی تقسیم کا مقصد سوائے شناخت باہمی کے اور کچھ نہیں اس عقیدے نے قبائلیت اور قوم پرستی کے جاہلانہ تصور کو بھی تاریخ میں پہلی مرتبہ منسوخ قرار دے دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس غلط تصور سے اور زیادہ متنافرہ اور معاندانہ تقسیمیں جنم پاتی ہیں۔ "وحدتِ انسانی" کے عقیدے سے ساری مہذب دنیا کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ مشترکہ مقاصد کو پیش نظر رکھے اور انہی کو آگے بڑھانے کے لئے زندہ رہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ "نجات" یا قرآنی اصطلاح میں "فلاح" کو بھی، جو نجات کے مقابلے میں زیادہ وسیع المعنی ہے۔ پوری انسانیت پر پھیلا دیا گیا ہے۔ اور اسے نسلی امتیازات، قومی برتری، رسوم و رواجات کے اختلافات وغیرہ سے پاک کر دیا گیا ہے۔ تمام وہ لوگ جو ایک اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ عمل صالح کے لئے کوشاں رہتے ہیں (کیونکہ اللہ سب سے باخبر ہے) وہ بنیادی طور پر ایک قوم ہیں۔ اس لئے انہیں باہمی معاملات میں لڑنے جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسلام نے وحدت یعنی وحدتِ خلق اور وحدتِ خالق کا تصور پوری انسانیت کے سامنے ایک مشترکہ بنیاد کے طور پر پیش کیا ہے، پھر اس نے عروج و کمال اور ارتقا کے اصول بتائے تو ان میں بھی ناصحانہ انداز، وعظ و تلقین اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ایک قابل عمل نظام اور ایک جدید سماجی ادارے کی صورت میں متشکل کر کے اہل دنیا کو دکھا دیا ہے۔ کہ "وحدت" یہ ہوتی ہے۔ نیز اس نے عملاً ایسے مواقع بھی فراہم کر دیئے ہیں جن سے عربی، عجمی، یہودی حبشی، مفلوک الحال اور تمام قوموں کے ستم رسیدہ لوگوں کو برابر کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ دینِ قیم میں سب سے پہلے انسان کو بحیثیت فرد استحکام کی ضمانت دی جاتی ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرد پہلے اپنے جبلی تقاضوں اور عقلیت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے پھر وہ اس معاشرے کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے جس میں اس کی گزر بسر ہے۔ اور آخر میں اس جیسے دوسرے افراد اس کے ساتھ اخلاق، اقدار، مقصدِ حیات اور اللہ کی وحدت پر ایمان کے ذریعے سے پیوست ہو جاتے ہیں اور اس طرح فرد اور ملت ایک "وحدت" یا مکمل اکائی بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔

خواجہ عبدالحکیم صاحب کی کتاب اسلامک آئیڈیالوجی (شائع کردہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور) سے اس طویل اقتباس کا ترجمہ اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق کی تشریح و توضیح اس سے بہتر انداز میں نہیں کی جا سکتی۔ توحید کی اس مدلل بحث میں جن روابط کو سامنے لایا گیا ہے وہ نہایت ہی اہم ہیں جن روابط کے ذکر کرنے کا حکم [illegible] کتابوں میں تقریباً ایک جیسے الفاظ میں آیا ہو انہیں صرف ازدواجی تعلقات تک محدود

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

مقید نہیں رکھا جا سکتا، ہمارے قدیم مفسرین نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ آیت زیرِ موضوع کے معانی وسیع پھیلاؤ کے متقاضی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ کے مفہوم کے دائرے کو میاں بیوی کے رشتے سے بڑھا کر زوجین کے قریبی رشتہ داروں تک وسیع کر دیا ہے اور صلہ رحمی کی تاکید اور قطع رحمی کی ممانعت کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کو عصرِ حاضر کا اچھا مفسر سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اس آیت کے معانی میں تھوڑی سی اور وسعت پیدا کی ہے، کہتے ہیں کہ "تمدنی اور معاشرتی روابط بھی جن کی درستی پر انسان کی اجتماعی زندگی کی صلاح و فلاح منحصر ہے، اس حکم میں شامل ہیں" مزید وضاحت اس طرح کی ہے کہ

"جن روابط کے قیام اور استحکام پر انسان کی اجتماعی و انفرادی فلاح کا انحصار ہے، اور جنہیں درست رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، ان پر یہ لوگ (یعنی فاسقین: نافرمان اطاعت کی حد سے نکل جانے والے) تیشہ چلاتے ہیں اس مختصر سے جملہ میں اس قدر وسعت ہے کہ انسانی تمدن و اخلاق کی پوری دنیا پر جو دو آدمیوں کے تعلق سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلقات تک پھیلی ہوئی ہے، صرف یہی ایک جملہ حاوی ہو جاتا ہے۔ روابط کے کاٹنے سے مراد محض تعلقاتِ انسانی کا انقطاع ہی نہیں ہے بلکہ تعلقات کی صحیح اور جائز صورتوں کے سوا جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی وہ سب اسی ذیل میں آ جائیں گی، کیونکہ ناجائز اور غلط روابط کا انجام وہی ہے جو قطعِ روابط کا ہے۔ یعنی بین الانسانی معاملات کی خرابی اور نظامِ اخلاق و تمدن کی بربادی۔"

اب ایک مشہور ادیب اور نقاد وسیم احمد کی ایک نشری تقریر سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ان رشتوں کی مزید وضاحت سامنے آ جائے جو ایک بالغ نظر دانشور کے نزدیک فردِ انسانی کے اپنے آپ سے ہیں، معاشرے میں یا فطرت کے وہ تقاضا کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

"اسلام نے دنیا کے سامنے کردار کی تشکیل و تعمیر کا جو مکمل ضابطہ پیش کیا ہے اس میں اولین اہمیت صحتِ فکر یا صحتِ خیال کو دی ہے۔ صحتِ فکر کائنات کے بارے میں صحتِ فکر معاشرے کے بارے میں اور صحتِ فکر اپنے نفس کے بارے میں۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس کے بارے میں اگر ہمارے خیالات غلط بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو وہ ہمارے تمام معیارات اور اندازوں کو غلط بنا دیتے ہیں اور نتیجے کے طور پر ہمارا عمل بھی غلط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم معاشرے یعنی دوسرے انسانوں کے بارے میں غلط خیالات کا شکار ہو جائیں تو اس سے ہمارے اندر غلط رویے اور غلط جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ خود اپنے نفس کے بارے میں بھی غلط خیالات ہمارے تمام اعمال

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو غلط اور منفی بنا دیتے ہیں۔

ان اقتباسات کی روشنی میں فصل و وصل روابط کے بعض اہم گوشے ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ تاہم ہمارے اپنے نزدیک انسان کا سب سے پہلا اور آخری رشتہ اپنے خالق سے ہے جس نے اسے باقی اکثر مخلوقات سے بہتر اور ممتاز بنا کر پیدا کیا اس کی جسمانی اور روحانی نشوونما کے لئے فراوانی کے ساتھ سامان مہیا کیا اور اس کے اندر کے شخص کی صلاحیتوں کو آزمانے اور انہیں نقطۂ عروج تک پہنچانے کے لئے کائنات کا بے پایاں وسیع اور عریض میدان عطا کر دیا۔ تاکہ یہ اپنے انسانی شرف کا تحفظ بھی کر سکے اور اسے ممکنہ ارتقا تک بھی لے جا سکے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی معاونت کے لئے ان قوتوں کو بھی اس کے علم کے تابع فرمان کر دیا جو اس کائنات کو چلا رہی ہیں۔ اس معاونت سے مسجودِ ملائک انسان اللہ کی عام ربوبیت کے پروگرام کو آگے بڑھا سکتا ہے تاہم آگے بڑھانے کے لئے قوت درکار ہوتی ہے اور قوت کا خاصہ یہ ہے کہ جب تک کوئی دوسری قوت اس کے ساتھ متصادم نہ ہو اس وقت تک یہ بیدار ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اللہ نے ایک حریفِ سخت کی صورت میں اس کا انتظام بھی کر دیا۔ ابلیس لاؤ لشکر نے للکار کر کہا کہ میں گوشت پوست کے اس آدمی کو دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف سے گھیر لوں گا۔ اور طرح طرح کی گھاتیں لگا کر اسے اپنے دامِ تزویر میں پھانس لوں گا۔ یہ خس و خاک سے بھی زیادہ کمزور انسان کہاں تک میرا مقابلہ کرے گا۔ ظاہر ہے کہ انسانی عقل جو انسان کا سب سے زیادہ طاقتور ہتھیار ہے۔ اس قابل نہ تھی کہ ابلیس کی بے پناہ قوتوں کا تنہا مقابلہ کر سکتی۔ چنانچہ اللہ کی رحمت اور عنایتِ خاص نے انسان کی ہدایت اور راہنمائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا اور اسے یقین دلایا کہ جو کوئی اس کے دکھائے ہوئے راستے پر چلے گا ابلیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے خوف اور حزن سے محفوظ رہے گا۔

خالق اور مخلوق کے درمیان محبتوں اور رحمتوں کا یہی وہ رشتہ ہے جسے ہم نے انسان کے غور و فکر کے لئے سب سے بڑا پہلا اور آخری رشتہ قرار دیا ہے۔ تاہم اس حقیقت کو بھی محوظ رکھنا چاہئے کہ یہ رشتہ مصوّر اور تصویر یا معمار اور عمارت یا صانع اور اس کی صنعت کے مابین والا رشتہ نہیں ہے۔ تصویر، عمارت اور صنعت بے جان چیزیں ہیں اور حیوانات کی سطح سے بھی کمتر درجے کی مخلوقات ہیں۔ یہ چیزیں اپنے بارے میں کچھ نہیں جان سکتی۔ تو اپنے خالق اور پروردگار کے بارے میں کیا شعور رکھ سکیں گی؟ ارض و سماوات کی ساری مخلوقات میں صرف انسان ہی ہے جو فکر و شعور، احساسات و جذبات اور اختیار و ارادہ سے متصف ہے۔ اسی طرح خالق بھی صرف مصوّر اور معمار اور صانع نہیں ہے جو اپنی تخلیق کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر الگ ایک طرف کو بیٹھ رہے اور پھر اپنی تخلیق کو پلٹ کر بھی نہ دیکھے۔ بلکہ یہ خالق ایسا سمیع اور علیم اور بصیر اور خبیر خالق ہے جو اپنی مخلوق کے لمحے لمحے کی خبر رکھتا ہے اور تخلیق میں نئے سے نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے تاکہ بنی نوع انسان کی صلاحیتیں تازہ بتازہ امکانات سے روشناس رہ کر پیہم فعال اور ارتقا پذیر رہیں۔

انسان اپنی چند سالہ حیاتِ ارضی کے دوران جو کد و کاوش اور جد و جہد کرتا ہے اس کا از روئے قرآن مقصد یہ ہے کہ وہ حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر منعکس کرتا چلا جائے اور اس طرح اپنی انسانی ذات کو خود اپنے ہی سعی و عمل کے ذریعے نشوونما و ارتقا سے ممکنہ تکمیل کی منزل تک پہنچ جائے۔ اللہ اور انسان کے درمیان اس نوعیت کے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

رابطے کی مثال اور کسی مخلوق میں نہیں ہے۔ اس رشتے کو ہمارے کون سے اعمال تقویت پہنچاتے اور کون سے اعمال کمزور کرتے ہیں اس کی تفصیل قرآنِ حکیم کے اندر پوری وضاحت کے ساتھ دے دی گئی ہے۔ تاکہ ہر ذہنی سطح کا انسان اچھی طرح جان اور پہچان لے اور اس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں کہیں کوئی غلطی نہ کرے۔ عبادت، دعا، استعانت طلبی سجدہ، اطاعت، توبہ، مغفرت، صراطِ مستقیم، الصلوٰۃ اور دوسری بہت سی جامع اصطلاحات خالق اور مخلوق، معبود اور عبد، حاکم اور محکوم، رب اور مربوب، اور مسجود اور ساجد کے باہمی رشتے کے لطیف تر پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نیز ان سے اس راہِ عمل کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے جس پر چل کر فرد اور فرد، فرد اور معاشرے، فرد اور کائناتی ماحول کے ضمنی رشتوں کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ اور پھر ان مضبوط رشتوں کے توسط سے عدل و مساوات، اخوت و حریت اور دوسری عالمگیر مستقل قدروں کا تحفظ و ارتقا کیا جا سکتا ہے۔

اگر انسان کے سامنے کوئی "قدر" مقصود و مطلوبِ زندگی بن کر نہ آئے تو اس کا کوئی بھی عمل تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ نیز اس کے مقاصد میں یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی جو ہر کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ جن آیاتِ ربانی کا حوالہ ان سطور میں دیا گیا ہے ان میں "مستقل قدروں" سے چمٹے رہنے کی تاکید ہے۔ اور یہ تاکید خود ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ ہر مستقل قدر کا استنباط اللہ تعالیٰ کی صفاتی اسمائے حسنیٰ سے کیا جاتا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ سرچشمۂ حیات ہے۔ منبع و ماخذ خیر و خوبی ہے اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ہے اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ ہے لَحْدٌ ہے صَمَدٌ ہے۔ جس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی اطاعت کی جائے یا جس کے آگے جھکا جائے، ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز جو زمین اور آسمانوں میں ہے اپنی نشو و ارتقا کی تکمیل کے لئے اسی کی عطا و داد و دہش کی محتاج ہے اور اپنی حیات و بالیدگی کا سامان اُسی سے مانگتی ہے، یہ زبردست قوتوں والا رب رحیم بھی ہے اور رحمٰن بھی ہے حاکم بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ لہٰذا یہی وہ دائم قائم ہستی مطلق ہے جس کے حضور بے لوث عبودیت کا ادا کیا ہوا ایک سجدہ بھی انسان کو ہزاروں دوسرے سجدوں سے نجات دلا دیتا ہے۔

یہ ایک سجدہ جس کی تڑپ ہر جبینِ نیاز میں ہونی چاہیئے انسان کی عبودیت کی معراج ہے کیونکہ اسی سے "انسانی ذات" کی تکمیل ہوتی ہے اور اسی سے ابلیسی قوتوں کی یلغار کو روکا جا سکتا ہے تاہم اس ایک سجدے کے جو مختلف گوشے ہیں انہیں سامنے لانے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اپنے آپ کا مطالعہ کرنا ہوگا پھر اس کائنات پر نظر ڈالنی ہوگی، جو آنکھوں کے سامنے ہے اور آخر میں اس دنیا کا جائزہ لینا ہوگا جو ہماری جسمانی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔ مادی دنیا افراد کے باہمی تعلقات کی دنیا ہے جس میں ماں باپ، بھائی بہن، عزیز و اقارب، دوست دشمن، چھوٹے بڑے سب لوگ آ جاتے ہیں۔ اس سطح پر گویا انسان کا پہلا رشتہ اپنے آپ سے ہے اور پھر دوسرے افراد سے ہے، قرآنِ حکیم نے معاشرے کو دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک قوم اہلِ ایمان کی ہے اور دوسری قوم انکار کرنے والوں کی ہے۔ ان دونوں سے ہمارے رشتے کی نوعیت کیا ہوگی، ہمارے موضوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ پھر اس کے بعد ارضی مخلوق سامنے آتی ہے جس میں وہ کائناتی قوتیں بھی شامل ہیں جنہیں انسان کے لئے مسخر بنا دیا گیا ہے ہمارے لئے ان سب کے ساتھ رشتوں کی نوعیت کا سمجھنا ضروری ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ تخلیق اور ارتقا کیا ہے، میں کون ہوں، مجھے اس مختصر سی زندگی میں کیا کرنا ہے اس وقت تک انسان یعنی اپنے آپ کو "میں" کہنے والی واحد مخلوق کسی بھی رشتے کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔ اور نہ ان رشتوں کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

اس مطالعے کی تیسری سطح پر مادّی دنیا سے ماوراء لیکن اس سے متعلق ایک ایسی دنیا ہے جسے عالم الغیب کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سطح پر باری تعالیٰ کی ذات و صفات کا غیر فلسفیانہ انداز میں جاننا اور پہچاننا ضروری ہے اس کے علاوہ چونکہ وحیِ ربّانی کا سلسلہ بھی اسی حقیقتِ کبریٰ کی بے پایاں رحمت کا ایک حصہ ہے اس لئے اس کی ماہیت اور ضرورت کو سمجھنا بھی لازمی ہے بسلسلۂ نبوت و رسالت کے برحق ہونے کو جزوِ ایمان بنا لینے کے بعد ہمیں خاتم النبیین، سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ جوڑنا ہے۔ کیونکہ صرف حضور اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی پوری انسانیت کے محسنِ اعظم اور نجات دہندہ ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معرفت جو ابدی پیغامِ ربّانی مکمل ترین رہنمائی کی صورت میں ہمیں ملا ہے وہ لفظ بہ لفظ اپنی اصلی حالت میں قرآن حکیم کے اندر محفوظ ہے لہٰذا اب ہمارا رشتہ اور رابطہ براہِ راست اس کتابِ مبین اور فرقان کے ساتھ قائم ہو چکا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارا رشتہ امن و سلامتی کے اس بے نقص نظام سے بھی ہے جسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوری انسانیت کی فلاح و فوز کے لئے عملاً متشکل فرمایا تھا۔ یہ توازن بدوش نظام حُسن و خوبی کا نظام ہے اور انسان بھی چونکہ احسنِ تقویم میں پیدا ہوا ہے اس لئے حُسن وغیرہ خوبی کے ساتھ رشتے کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

ہم نے اس کتاب میں ان تمام رشتوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے تاہم بعض موضوعات کے ضمن میں افکارِ مغرب کو بھی پیش کیا ہے تاکہ تقابلی مطالعے سے متلاشیانِ حق و صداقت خود ہی غلط اور صحیح میں تمیز کر سکیں اور معلوم کر سکیں کہ مغربی مفکرین نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اللہ کسی قوم کے اندر کوئی تبدیلی نہیں لاتا جب تک لوگ اپنے انفس کے اندر آپ تبدیلی پیدا نہ کر لیں۔ انفس کے اندر تبدیلی نقطۂ نظر کے اندر تبدیلی پیدا کرنے سے ہوتی ہے بالفاظِ دیگر جب تک زاویۂ نگاہ نہیں بدلتا یا غلط اعتقادات کو توڑ کر ان کی جگہ صحیح اقدار کو نہیں لایا جاتا، تقدیریں بھی نہیں بدلتیں۔ تقدیروں کے بدل جانے کی طرف پہلا قدم ان عالی دماغ دانشوروں کی طرف اُٹھتا ہے جنہیں قرآن حکیم نے اُولوالالباب کہا ہے اور جن کے قلب و نظر کی وسعتیں زمان و مکان کی حدود کو بھی اپنے دامن میں لے لیتی ہیں۔ جب اربابِ عقل و علم کا اندازِ فکر صحیح سمت اختیار کر لیتا ہے تو پھر عوام الناس کی ذہنی تبدیلی کچھ مشکل نہیں رہتی۔

اللہ کرے یہ کتاب اہلِ دانش کے اندر "زندگی" کی وہی حرارت پیدا کر دے جس کے عملی طور پر محسوس کرنے کی تمنا میں چشمِ فلک چودہ سو سال سے محوِ انتظار ہے

ملتان ۔ ۲۲ اگست ۱۹۸۶ء
جمعہ ۱۵ ۔ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ

عبدالحق

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۲۔ رُوح اور مادّہ کی بحثیں

عام آدمی کی عقل یہی سوچتی اور سمجھتی ہے کہ دُنیا رُوح اور مادّہ دو مختلف چیزوں پر مشتمل ہے۔ مادّہ بے جان اور بے حس و حرکت ہے۔ آپ گھریلو ساز و سامان کی کسی بھی چیز کو آگے پیچھے دھکیل سکتے ہیں۔ اسے اٹھا کر جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں، اسے توڑ پھوڑ سکتے ہیں، اس کے الگ الگ حصوں کو پھر سے جوڑ سکتے ہیں۔ یہ کوئی مزاحمت پیش نہیں کرتی۔ اس کا کوئی اپنا مقصد نہیں ہے۔ اس قسم کی تمام اشیاء کو ہم "مردہ مادّہ" کہتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک بہت بڑی چٹان کے اوپر ایک ننھی سی چیونٹی کو دوڑتا بھاگتا دیکھئے۔ بھاری بھرکم جسامت کی چٹان بھی اس حقیر سی چیز کے آگے بے بس ہے۔ آپ اس چیونٹی کا راستہ روکنے کی کوشش کریں، یہ فوراً اپنا رُخ بدل لے گی۔ مزاحمت کرے گی۔ زیادہ تنگ کریں گے تو کاٹ لے گی۔ ہے یہ بھی مادّے ہی کی بنی ہوئی۔ لیکن حرکت، ارادے اور مقصد کے باعث ہم اسے انتہائی چھوٹا ہونے کے باوجود "زندہ" قرار دیتے ہیں، جبکہ چٹان کو اس کے حجم اور جسامت کے باوجود "مردہ" کہتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ "مردہ مادّہ" اپنے قوی ہیکل تن و توش کے ہوتے ہوئے بھی "زندگی" کے ادنیٰ ترین مظہر کے بھی تابع فرمان ہے۔ اور اس کی حرکت، ارادے اور مقصدیت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

آپ کسی کیڑے کو لکڑی وغیرہ سے اچانک چھیڑ کر دیکھیں اس کا پہلا اور فوری ردّ عمل یہ ہوگا کہ یہ سمٹ اور سکڑ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ردّ عمل میں یہ آپ پر حملہ کر دے یا بھاگ جائے لیکن پہلا ردّ عمل اس کا سمٹ اور سکڑ جانا ہے اس سکڑنے اور سمٹ جانے کے عمل کو عربی زبان میں "حَیَا" کہتے ہیں۔ اسی سے "حیات" کا لفظ بنا ہے جس کے معنی "زندگی" کے ہیں۔ ہر ذی حیات چیز اس خوف سے سمٹنے اور سکڑنے لگ جاتی ہے کہ خارجی مزاحمت سے کہیں اس کی متاعِ حیات لٹ نہ جائے۔ کہیں وہ صفحۂ ہستی سے نابود و ناپید نہ ہو جائے وہ اپنی "زندگی" کو عزیز رکھتی ہے۔ اس کے تحفظ اور بقا کیلئے جدّ و جہد میں مصروف رہتی ہے۔ اور اس سلسلے کو آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب "مادّہ" باشعور ہو جاتا ہے تو اس کے اندر حرکت و عمل پیدا ہو جاتا ہے اور یہ حرکت و عمل اس مقصد کے عین مطابق ہے جو اس کے اپنے اندر ایک فعّال رہنما کی صورت میں موجود ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ بامقصد عمل و حرکت شعور کی وہ خاصیت ہے جس سے مادّہ عاری ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "اندرونی فعّال رہنما" جو ہمارے تمام افعال و اعمال کو کنٹرول کرتا ہے کیا چیز ہے؟ کیا یہ مادّے ہی کی کوئی صورت ہے یا اس سے الگ یعنی ماورائے مادّہ کوئی چیز ہے؟ کیا یہ نوعی ارتقا کا عطیہ ہے یا مادّے کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے باعث رونما ہونے والی کوئی نئی جنس ہے، اس نئی چیز کے وجود میں آنے کی پشت پر جو قانون کارفرما ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ روح اور مادّے کے مندرجہ بالا واضح فرق کے باوجود علمائے فلسفہ اور سائنسدان ان دونوں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی بنیادی پہچان کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی روح کو مادّے ہی کی ایک شکل قرار دیا ہے تو کبھی یہ کہا ہے کہ مادّہ درحقیقت روح کا ہی ایک مظہر ہے۔ عہد قدیم سے لے کر ازمنۂ وسطیٰ تک علمائے فلسفہ جن میں سے اکثر سائنسی علوم میں دسترس رکھتے تھے اس "اندرونی رہنما قوت" کو روح، جان، آتما، سول (SOUL)، سپرٹ (SPIRIT) وغیرہ الفاظ کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کوئی ایسی غیر فانی چیز ہے جو مادی جسم کے ساتھ عارضی طور پر ملحق ہو جانے سے پہلے بھی موجود رہتی ہے اور جسم کے ختم ہو جانے کے بعد بھی موجود رہتی ہے، فنا نہیں ہوتی ارسطو نے اس قدیم نظریے سے اختلاف کیا اور کہا کہ (SOUL) جسم ہی کا ترقی یافتہ تکملہ (ENTELECHY) ہے اور جسم ہی کی ایک صورت ہے اس لئے اسے جسم سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مظاہر فطرت کا حصہ ہے اور جسم کی موت کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے، البتہ جسم کے زندہ رہنے کے دوران جسمانی حرکات و سکنات پر اسی کا کنٹرول ہوتا ہے ارسطو کے اس خیال کو بہت کم لوگوں نے تسلیم کیا اور کئی صدیوں تک فلسفی اور سائنسدان اسی سابقہ نظریئے کو ہی تسلیم کرتے رہے جس میں رُوح یا SOUL کو آزاد اور ماورائے فطرت چیز سمجھا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں رُوح یا SOUL کی بجائے "ذات" (SELF) کی اصطلاح رائج کر دی گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سائنس نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ اور ہر نظریئے کو تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا تھا۔ "ذات" کی نئی اصطلاح اس لئے اختیار کی گئی کہ ایک تو یہ نیچر کے زیادہ قریب تھی۔ دوسرے اس لئے کہ روح یا SOUL یا (MIND) وغیرہ کے الفاظ میں مادی فطرت سے بالاتر اور ماورائی اور حقیقت کے وجود کا شائبہ پایا جاتا تھا۔ اور یہ بات فطرت کے پرستاروں کو یعنی سائنسدانوں کو قبول نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان کا خیال تھا کہ "ذات" (SELF)، ہی شعور کے اجزائے واینگ یعنی حسیات، جذبات اور مدرکات کو باہم مربوط و منظم رکھتی ہے۔ اور "ذات" ہی کی روشنی میں شعور کی اس وحدت کو جو دنیا میں بالکل یگانہ اور بے مثال ہے، جانا پہچانا اور سمجھا جا سکتا ہے چنانچہ یہ بات حتمی طور پر تسلیم کر لی گئی کہ "ذات" مکمل آزاد چیز کا نام ہے، فطرت کے قوانین و ضوابط کا اس پر کوئی اطلاق نہیں ہوتا۔ اور یہ فرد کی طبعی عمر کے پورے دورانیئے میں غیر متبدل اور یکساں حالت میں رہتی ہے۔ یہ نظریہ لاک ([illegible]) سے شروع ہو کر ہیوم (HUME) کے فلسفے تک اپنی انتہائی تکمیل تک پہنچا۔

لاک (LOCKE) کا نظریہ کچھ اس طرح سے ہے کہ انسان کا دل و دماغ جسے لاک مائینڈ کہتا ہے ایک صاف ستھری تختی کی مانند ہے جس پر خارجی دنیا کے نقوش غیر محسوس انداز میں مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔ مائینڈ کے اپنے اندر کوئی تخلیقی قوت موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے اندر کسی قسم کی کوئی فعالیت ہے۔ یہ محض ایک ذخیرہ گاہ (STORE-HOUSE)، ہے جس میں خارجی واقعات، واردات و حوادث کے تاثرات جمع ہوتے رہتے ہیں، اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں ہے لہٰذا اگر ہم کسی نئے تصوّر کو ذہن میں کسی پہلے سے موجود اور نقش شدہ تصور کے ساتھ مربوط و منسلک نہیں کر سکتے تو وہ تصوّر باطل اور غیر خالص ہے۔

"ذات" کے بارے میں دوسرا عقیدہ اس کی آزادی اور خود مختاری کا عقیدہ تھا۔ یعنی یہ کہ "ذات" اپنی فعالیت میں کسی دوسری چیز کی محتاج نہیں بلکہ کلیتہً آزاد اور خود مختار ہے۔ تاہم اس عقیدے کو ہیوم نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "ذات" تو کبھی خود

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ذہن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جسے شعور اور اس کے اجزا یعنی حسیات، جذبات اور مدرکات کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی میں نے ذہن کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس کا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے مجھے ذہن یا مائینڈ کی قسم کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے میں یہ باور کرنے پر مجبور ہوں کہ ذہن یا مائینڈ محض تصورات کے تسلسل کا نام ہے۔ یہ تصورات ایک ہی شعور کے اندر یکجا ہو کر یا پھر ایک کڑی در کڑی زنجیر کی صورت میں موجود رہتے ہیں۔ اور ان کا آپس کا رابطہ صرف خارجی طور پر قائم رہتا ہے۔ یہ مفکر چونکہ شدت کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ صرف تجربہ ہی صحیح علم کا ذریعہ ہے اس لئے وہ کسی ایسے نظریئے کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا جو شعور کے کسی فی الواقعہ حقیقت کے عین مطابق نہ ہو۔ اس کے علاوہ ذہن کے اجزاء کے اندر جو ربط پایا جاتا ہے اس کے متعلق وہ کہتا تھا کہ اس ربط کو قانونِ تسلسلِ خیالات (یا اصول سلسلۂ علائق) (ASSOCIATION OF IDEAS) کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ہیوم کے ان خیالات کا اثر یہ ہوا کہ وہ سائنسدان جو صرف تجربے میں آسکنے والی حقیقتوں کو تسلیم کر لینے کے قائل تھے ذات یا (SELF) کے تصور کے بھی منکر ہو گئے۔

مشہور فلسفی کانٹ (KANT) نے ذات یا ''ایگو'' یا انانیت (EGO) کے بارے میں یہ کہا کہ اگرچہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے تجربہ میں لایا جا سکے تاہم کوئی ماورائی انا ایسی ضرور موجود ہے جسے تجربے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے ہم خیال مفکرین نے جو تصوریت (IDEALISM) کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اس ماورائی انا اور اس کے تجربے کی بنیاد بن سکنے کے بارے میں قیاس آرائیاں شروع کر دیں اور ساری بات بحث میں غتر بود ہو کر رہ گئی۔ کوئی بات حتمی طور پر طے نہ ہو سکی۔

انیسویں صدی سائنسی انقلابات کی صدی ہے۔ سائنسدانوں کے نزدیک مادہ ہی وہ چیز تھی جسے اصل حقیقت اور مستقل یا دائم و قائم چیز کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی ایسی چیز کے ماننے کے لئے قطعاً آمادہ نہیں ہو سکتے تھے جس کے خواص مادے کے خواص کے مطابق نہ ہوں۔ یعنی ہر وہ چیز غیر حقیقی ہے جو حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں آسکتی، یا جو تجربہ گاہ میں مادے کی طرح نہیں لائی جا سکتی۔ چنانچہ مائینڈ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ان کے خیالات کے عین مطابق تھا۔ کہ یہ زندہ مادے کا ایک خاصہ ہے۔ جو اس کے مختلف عناصر کے اتفاقیہ امتزاج کا نتیجہ ہے اور اس پر علم طبیعات کے خاص اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ تاہم سائنسدانوں ہی کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ایک قابل شخص کیلون (KELVIN) (۱۸۲۴–۱۹۰۷) نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فطرت بھی مائینڈ کی خصوصیات رکھتی ہے اور کائنات کے اندر ضرور کوئی ایسی قوت کارفرما ہے جو تخلیق اور ادراک دونوں صفات سے متصف ہے۔

فلسفے کا طریق کار مختلف ہے۔ یہ سائنس کی طرح حقیقت کو اجزا کے ذریعے سے سمجھنے کا قائل نہیں ہے۔ یعنی یہ اسے جزوی انداز سے نہیں بلکہ من حیث الکل دیکھتا ہے۔ چنانچہ قدیم فلسفہ کے ساتھ جدید زمانے کے فلسفیوں ڈیکارٹ، لیبنیز، شوپن ہائر، نطشے، کانٹ، اسپینوزا، ہیگل، فشطے، کروس اور برگسان کے نظریات میں بھی ''حقیقت کبریٰ'' کی بحث کے سلسلے میں خدا (GOD)، روح کائنات (UNIVERSAL SPIRIT)، المطلق (THE ABSOLUTE) تصور مطلق (THE ABSOLUTE IDEA) ذہنی فعالیت (MENTAL ACTIVITY) ارادۂ دنیا (WORLD WILL) ابدی ذہن (ETERNAL MIND)، مونادز (MONADS)، ذات (SELF) ایلان وائٹل (ELAN VITAL)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وغیرہ کئی اسمائے صفات ملتے ہیں۔ تاہم پہلا سنجیدہ چیلنج جو فلسفے نے سائنسی مادیت کو دیا وہ انگلستان کے پادری بشپ جارج برکلے کی طرف سے تھا جس نے یہ نکتہ اٹھایا کہ مادی دنیا کو ہم صرف اپنے ادراک اور تصور کی مدد سے ہی جانتے پہچانتے ہیں۔ اور ہماری قوت ادراک و تصور ہمارے اپنے ذہن (MIND) ہی کا تجربہ ہے اس لئے مادی دنیا کا کوئی علیحدہ آزاد وجود نہیں ہے۔ پس چونکہ مادی دنیا، جس طرح ہم اس کا ادراک کرتے ہیں، کوئی وجود نہیں رکھتی سوائے اس وجود کے جو ہمارا مائینڈ اسے عطا کرتا ہے اس لئے مائینڈ اصل حقیقت ہے: "مادی دنیا" اصل حقیقت نہیں ہے۔ جو چیز ہمارے ادراک میں آتی ہے وہ مادہ نہیں ہوتا۔ بلکہ مادہ کی کوئی خاصیت ہوتی ہے مثلاً رنگ، بو، شکل صورت، آواز اس کا سخت یا ملائم ہونا اس کا ٹھوس یا مائع یا گیس ہونا وغیرہ، نیز اس مقصد کے پیش نظر کہ ان خواص کو ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ انہیں ہم جانتے ہیں کہ یہ فی الواقعہ ہیں، ہمارا مائینڈ اس کا ادراک کرتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مادی دنیا کی اصلیت بھی مائینڈ یعنی شعور ہے۔ اور ایک ازلی و ابدی مائینڈ کا وجود ناگزیر ہے۔

موجودہ زمانے میں برکلے کی موضوعی تصوریت کو زبردست تائید حاصل ہو رہی ہے۔ جدید ترین فلسفے کی بنیاد اسی قضیئے پر رکھی گئی ہے، کہ ہمارے مائینڈ کا تجربہ ہی وہ اصل حقیقت ہے جس کا ہم یقین کر سکتے ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی حقیقت بھی، اگر واقعی یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے انسانی مائینڈ جان سکتا ہے، یقیناً ہمارے اپنے ذہنی تجربے کے مطابق ہوگی۔ چونکہ ذہنی تجربے کی سب سے زیادہ واضح اور بلند ترین صورت "خود آگہی" ہے اس لئے لازماً کائنات کا شعور بھی "خود آگہی" کی قسم کا شعور ہوگا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ انیسویں صدی کے سائنسدان اس قسم کے کسی خیال کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے کیونکہ اس سے ان کے طبعی قانون کی عمارت کے گر جانے کا اندیشہ تھا۔ فلسفی ان سے بار بار کہتے رہے کہ حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہو تو کائنات کی کوئی روحانی تعبیر تلاش کرو، کیونکہ حواس خمسہ جن پر تمہارے تجربات اور مشاہدات کا دارومدار ہے سمعی بصری معاونات کی مدد کے باوجود انتہائی ناقص اور کمزور ہیں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی دریافتوں، ایجادوں اور حواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کے گھمنڈ میں کنوئیں کے مینڈک بنے رہے، اور سمجھتے رہے کہ بس کل کائنات یہی ہے۔ جو حواس خمسہ کی رسائی کے اندر ہے ان کی اس ہمہ دانی کے زعم سے مادیت کو فروغ حاصل ہوگا۔ تاہم جوں جوں ان کی تخلیقات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور بجلی کی رو، مختلف قسم کی شعاعیں، ریڈیائی لہریں اور اس قسم کی بہت سی ایسی دریافتیں ان کے سامنے آنا شروع ہوئیں جو حواس خمسہ کی رسائی سے باہر تھیں تو اہل سائنس کا نقطۂ نظر بدلنے لگا، اور ان پر واضح ہو گیا کہ کائنات صرف انہیں چیزوں پر مشتمل نہیں جن کا علم ہمیں حواس خمسہ کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ جب ہمیں گرد و پیش کی بعض چیزوں کا علم بھی کتنے عرصے کے بعد ہوا ہے۔ تو کیا عجب ہے کہ یہاں اور بھی بہت سی چیزیں ہوں جن کے ظاہر ہو جانے سے ہماری علمی ترقی میں مزید اضافہ ہو۔ لہٰذا اب کوئی سائنسدان یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے حواس خمسہ تمام موجوداتِ عالم کا ادراک کر سکتے ہیں۔ نظریۂ اضافیت، کوانٹم تھیوری اور علم حیاتیات کے بعض دریافت شدہ حقائق نے مادیت کے تخت کو پاش پاش کر دیا ہے۔ علم طبیعات کی جدید دریافتوں نے اب مادے کو جو کسی وقت عین حقیقت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور ٹھوس مسلّمہ سمجھا جاتا تھا، اور اس کے ساتھ قوت (ENERGY) ، حرکت (MOTION) ، خلا (SPACE) ، زمان (TIME) اور ایتھر (ETHER) کو مطلقاً کالعدم قرار دے دیا ہے۔ نظریۂ اضافیت نے جدید علم طبیعات پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں، اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہم یہاں پر پروفیسر رُوجیئر (ROUGIER) کی کتاب "فلسفہ اور جدید طبیعات" سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

> "مادّہ اپنے اجزا میں شکست و ریخت ہو کر الیکٹرانز کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور پھر یہ الیکٹرانز بھی ایتھر کی لہراتی حرکت میں آ کر غائب ہو جاتے ہیں، اس طرح گویا مادّہ بالآخر فنا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی قوت بھی بغیر کسی تلافی کے منتشر ہو جاتی ہے۔ وہ جو آیونیا کے حکمائے طبیعات نے کہا تھا کہ مادّہ ہمیشہ قائم رہتا ہے، صرف شکل بدلتا ہے فنا نہیں ہوتا اور مابعد کے سائنسدانوں نے اپنے اپنے ایمان کی بنیاد بنا لیا تھا اب بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے، پہلے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی چیز تخلیق نہیں ہوتی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ اب انہیں کہنا چاہیے کوئی چیز تخلیق نہیں ہوتی، ہر چیز ضائع ہو جاتی ہے۔ دنیا اپنے آخری دیوالیہ پن کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ایتھر، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ تمام جہانوں کا مبداء اور اوّلین پرورش گاہ ہے اب وہی ایتھر اپنی دنیاؤں کا مدفن ثابت ہو رہا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اضافیت کی دریافت سے زمان و مکان کی حیثیت اب سائے (SHADOW) سے زیادہ نہیں رہی، خود حرکت بے معنی ہو گئی ہے، اجسام کی شکل و صورت محض ایک زاویۂ نگاہ ہے اور ایتھر کا لفظ ہمیشہ کے لئے سائنس کی لغت سے خارج ہو چکا ہے۔

اب اگر مادّہ مستقل بالذات نہیں رہا اور نہ ہی یہ کائنات کا اصل الاصول ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جسے اس سارے نظام کا ماخذ و منبع قرار دیا جائے۔ یہ جو تخلیقات کے اندر نوع بہ نوع کثرت اور فراوانی ہے، یہ جو کائنات کے ذرّے ذرّے سے حسن و خوبی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں، یہ جو جگہ جگہ فنکارانہ صنعت گری کے شہکار بکھرے ہوئے ہیں، یہ جو بے شمار ڈیزائن دکھائی دیتے ہیں، جن میں ایک سے ایک بڑھ کر ریاضیاتی صحت و صفائی دکھائی دیتی ہے یہ جو ہر چیز میں توازن و تناسب اور ہم آہنگی کے بیشمار مظاہر ہیں۔ یہ جو اشیائے فطرت کا باہمی ربط و ضبط و تعاون ہے اور یہ جو ہر چیز کے اندر مقصدیت کا بے پناہ جذبہ کار فرما ہے کیا یہ سب کچھ ایک حیّ و قائم خالق کی نشاندہی نہیں کرتا؟ حسن، آرٹ، ڈیزائن، مقصد، توازن، تناسب اور ریاضیاتی صحت کی سوچ یقیناً شعور کی صفات ہیں۔ لہٰذا شعور ہی اس کائنات کی اصلیت تامّہ ہے نہ کہ مادّہ جو ہر لمحے فنا سے ہمکنار ہو رہا ہے ______ مادّے کے اس طرح کالعدم ہو جانے سے نہ صرف دنیا کی رُوحانی توجیہہ کا راستہ ہموار ہو گیا ہے بلکہ اب روحانی توجیہہ کے بغیر اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا۔ اب سائنسدان اپنی ہی دریافتوں کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ صداقت کبریٰ کی تلاش میں مادّے کی دنیا سے ماورا پہنچ کر مادّے کی اصل ماہیت کو معلوم کریں۔ بالفاظ دیگر اب طبیعات کی بجائے مابعد الطبیعات کی طرف انسانی فکر و تدبر کی پرواز ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سر اولیور لاج نے لکھا کہ ؎

"کائنات پر عظیم ذہن (MIND) کی حکمرانی ہے۔ یہ مائنڈ خواہ کسی بڑے ریاضی دان کا ہے یا کسی بڑے فنکار ((ARTIST) کا ہے یا کسی بڑے شاعر (POET) کا ہے یا ان سب کا ہے یا ان سب سے بھی زیادہ صفات والی ہستی کا ہے، جو کچھ بھی ہے بہر حال ایک عظیم ترین ہستی ہے اور وہی واحد حقیقت کبریٰ ہے جو "وجود" کو معانی عطا کر رہی ہے، ہمارے روز مرہ کے معمولات کو پُر لطف بنا رہی ہے، ہماری امیدوں کو سہارا دے رہی ہے، جہاں علم ناکام رہ جاتا ہے وہاں ایمان کے ذریعے ہمیں قوت عطا کر رہی ہے۔ اور ساری کائنات کو غیر فانی محبت سے جگمگا رہی ہے"

سر جیمز جینز کی دلائل کا خلاصہ یہ ہے :

مادے کی تمام صورتوں کو ریاضیاتی تعلیقات میں ڈھالا جاسکتا ہے ایٹم کی ساخت سے لیکر نظام اجرام فلکی تک میں ریاضی ہی کا عمل دخل ہے۔ آپ کے قریب ترین کوئی طبعی چیز ہو یا کائنات کے دور دراز گوشے میں کوئی چیز ہو ان میں سے ہر ایک ریاضی کے قوانین کی سختی سے پابندی کرتی ہے۔ ہم انسانوں کے پاس ریاضی کا جتنا بھی علم ہے۔ یہ ہم نے منطقی اصولوں کی روشنی میں حاصل کیا ہے۔ اور اس کو آگے بڑھانے میں فطرت سے کوئی مدد نہیں لی، ریاضیاتی قوانین کو اپنے ذہنوں کی پیداوار کے طور پر مرتب کرنے اور اپنی تخلیقی قوتوں سے مدد اور رہنمائی حاصل کرنے کے بعد جب ہم نے مادی دنیا کی طرف توجہ کی تو ہم نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ طبعی دنیا ریاضیاتی اصولوں کے عین مطابق بنی ہوئی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ ریاضیاتی قوانین اس دنیا کی طبیعت کا آخرین خاصہ ہیں، اب چونکہ مادہ غیر حقیقی ثابت ہو چکا ہے اس لئے اس مادی کائنات میں سے سوائے ریاضیاتی قوانین کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ ہم انسانوں نے اپنے ریاضیاتی قوانین کیسے حاصل کئے اور مادی دنیا کی ساخت و تعمیر میں ان قوانین کی پابندی کس طرح ممکن ہوئی اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ یہ دنیا کسی ہمارے ہی طرح کے ذہن کی پیداوار ہے اور یہ ذہن پوری صحت اور درستی کے ساتھ ریاضیاتی انداز میں بالکل اسی طرح سوچتا ہے جس طرح ہم سوچتے ہیں۔ لازماً خارجی دنیا اور ہمارے اپنے اذہان دونوں اسی عظیم ذہن کا تخلیقی کارنامہ ہیں۔

آج سے تیس سال پہلے ہم نے سوچ رکھا تھا یا شاید فرض کر لیا تھا کہ ہم کسی میکانکی قسم کی حقیقت کبریٰ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آج طبیعات کے ماہرین کا تقریباً متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہمارے علم کی رودکوہی کا رُخ غیر میکانکی حقیقت کی طرف ہے۔ کیونکہ کائنات اب ایک بہت بڑی مشین کی بجائے ایک عظیم ترین "خیال" دکھائی دیتی ہے۔ پہلے یہ باور کر لیا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

گیا تھا۔ کہ مائنڈ کسی اتفاقیہ حادثے کے طور پر مادّے کی قلمرو میں آن گھسا ہے اب ہم اُس مائنڈ کو خوش آمدید کہہ کر سلام کرتے ہیں اگر یہ مادّے کی قلمرو کا خالق یا حاکم ہے، مائنڈ بھی وہ کہ جس کے ایٹمی ذرات (جن سے ہمارے تمہارے انفرادی مائنڈ نشوونما پاکر وجود میں آئے ہیں) اس کے اندر بطور تصوّرات علمی کے وجود رکھتے ہیں۔

آج کا یہ جدید ترین علم ہمیں اپنے سابقہ اور جلد بازی سے بنائے ہوئے مفروضات پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کرتا ہے جن کی رُو سے ہم ایسی کائنات میں آن گرے تھے جس کا کوئی تعلق اور واسطہ اوّل تو "زندگی" سے تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو مُعاندانہ تھا۔ رُوح اور مادّے کے ایک دوسرے کے متغائر ہونے کی صدیوں پُرانی بحث جس نے باہمی مخاصمتوں کو بھڑکایا تھا اب ختم ہو چکی ہے۔ اس خاتمے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اب مادّے کی حیثیت سائے سے زیادہ نہیں رہی اور نہ ہی یہ ہے کہ اب مائنڈ کو مادّے کی حرکت و عمل کا باعث کہا جاتا ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ خود مادّے کو مسلّمہ طور پر رُوح یعنی مائنڈ ہی کی تخلیق اور مظہر باور کیا جاتا ہے ہم نے یہ حقیقت بھی پالی ہے کہ کائنات کے مظاہر سے اعلیٰ ڈیزائن کی اور ایک کنٹرولنگ قوت کی جو شہادت ملتی ہے اس کی رُوح سے اس عظیم ترین مائنڈ اور ہمارے انفرادی مائنڈ کے درمیان بہت بڑی مماثلت ہے اور یہ مماثلت جذبات یا اخلاقیات یا تحسینِ جمال وغیرہ کے سلسلے کی مماثلت نہیں ہے بلکہ سوچنے کے اس انداز کے بارے میں جسے ہم کسی بہتر لفظ کے نہ ملنے کی وجہ سے "ریاضیاتی سوچ" کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ہماری اس دریافت کی بعض باتیں زندگی کے مادّی لوازمات کے ساتھ متصادم ہوں تاہم بہت سی باتیں "زندگی" کی بنیادی معرفت سے مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔ اب ہم اپنی کائنات میں اجنبی یا مسافر نہیں اور مقام سے آگر دخل اندازی کرنے والے نہیں رہے۔

ماہرین طبیعات و فلسفہ کے علاوہ علم حیاتیات کے دانشوروں کی تازہ دریافتیں بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ فطرت کی روحانی توجیہہ ہی ہمیں اصلیت کے قریب لاسکتی ہے۔ اس ضمن میں جو منظّم مکاتب فکر سامنے آئے ہیں ان میں فرانس کے پروفیسر ہنری برگساں کا نظریۂ تخلیقی ارتقا بہت اہمیت رکھتا ہے، مادّیت پرستوں کا خیال یہ تھا کہ "زندگی" ایک خاص قسم کے مادّے کی صفت ہے جو عناصر کے ایک خاص امتزاج سے ظہور میں آتی ہے۔ عناصر کی اس خاص اتفاقیہ ترکیب یا امتزاج سے جو نامیاتی وجود ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اپنے ماحول کی شرائط و حالات کے مطابق مشینی انداز سے ردِّ عمل کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اسکی جسمانی ساخت کے اندر مناسب تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں یا تراجم مدّت مدید تک جاری رہتی ہیں۔ کیونکہ ماحول بھی تغیّر پذیر رہتا ہے اور ان تازہ تغیّرات سے اس نامیاتی وجود کو بھی مسلسل نمٹنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلی نوع سے بالکل مختلف دوسری نوع وجود میں آجاتی ہے، جدید

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

علم حیاتیات اس نظریئے کی تائید نہیں کرتا۔ اب کوئی ماہر حیاتیات بھی یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ "زندگی" محض چند خاص عناصر میں ظہور ترکیب کا نام ہے" مادّے کے اندر خاص کیمیائی ساخت سے وجود میں آتی ہے۔ جرمن ماہر درلیش (DRIESCH) کے تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ ماحول کا ردِّعمل میکانکی انداز کا نہیں ہے۔ مشین کے برعکس زندہ نامیاتی وجود کے اپنے اندر ایک قوّت فعّال ایسی موجود ہے جو جسم کو ایک خاص مطلوبہ حالت اور شکل و صورت پر قائم رکھتی ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ نامیاتی وجود اپنی اس اندرونی قوّت فعّال کے ساتھ بحیثیتِ کُل ردِّعمل کا مظاہرہ کرتا ہے اور کُل کی ضروریات کو مدِّنظر رکھتا ہے۔ جزوی ترمیم کو نہیں چاہتا۔ مثلاً کیکڑے کی ایک ٹانگ کاٹ دیں تو اس کی جگہ دوسری ٹانگ اُگ آئے گی۔ کوئی مشین اپنے ناکارہ اور شکستہ پرزے کی اس طرح کی مرمت نہیں کر سکتی۔ درلیش (DREISCH) نے بچے کی ابتدائی لوتھ کو ایسی حالت میں دو برابر حصوں میں کاٹ ڈالا۔ جبکہ اس کے ریشے ابھی نرم وگداز تھے، اور اس کے خلیوں میں کیمیاوی امتیازات ابھی قائم نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ہر حصّہ پورا جانور بن کر وجود میں آگیا۔ مزید تجربات سے یہ ثابت ہو گیا کہ نتائج ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں، خواہ لوتھ کو کہیں سے کاٹ ڈالا جائے یا جُزو کا اپنے کُل سے جو تعلق ہے اُس پر کوئی بھی حادثہ گزر جائے، وہ خلیے جو لوتھ کا شاید سر بناتے اب پاؤں بنا ڈالتے ہیں گویا صورتِ حال یوں ہوئی کہ کُل کی ضروریات کے مطابق لوتھ کا کوئی بھی حصّہ کوئی بھی عضو بنا سکتا ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جزو اپنے اندر کُل کی خاصیات پیدا کر لیتا ہے، لوتھ کے ریشوں کی نشوونما بھی اسی نظام کے تحت ہوتی ہے۔ چھپکلی کی دم کاٹ ڈالو تو اس کی جگہ دوسری اُگ آئے گی۔ اگر ابتدائی مراحل میں دُم بھی کاٹ ڈالو اور ٹانگ بھی کاٹ ڈالو اور ٹانگ والی جگہ پر دُم کا پیوند لگا دو تو دُم ٹانگ کی شکل اختیار کرے گی۔ کیونکہ کُل کو اسی کی ضرورت ہے۔۔

---- یہ ہیں وہ ٹھوس حقائق جو کائنات کی مادی تشریح کو باطل بنا دیتے ہیں۔ "زندگی" کیمیا اور طبیعات کے مخصوص قوانین کے عمل سے وجود میں نہیں آتی "زندگی" کے اصل راز کو پانے کے لئے روحانی تعبیرات کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے درلیش (DRIESCH) اپنے متعدد تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے۔ کہ کوئی اندرونی اصول ایسا خودکار موجود ہے۔ جو جزو کو اپنے کُل کے مقاصد میں ڈھال لیتا ہے اور کُل کے مقاصد کے مطابق تبدیلیاں لانے کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا لازماً یہی خودکار اندرونی "اصولِ زندگی" کے ارتقا میں بھی عامل ہے۔ برگسان اس خودکار اندرونی قوّت کو ایلان ویٹل (ELAN VITAL) کہتا ہے۔ یعنی زندگی کو قائم اور برقرار رکھنے کا جذبہ جسے شعور کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

برگسان نے اپنی کتاب "تخلیقی ارتقا" (CREATIVE EVOLUTION) میں بہت سے اور حقائق بھی پیش کئے ہیں جن سے یہ نتائج استنباط ہوتے ہیں کہ اسی اندرونی خودکار جذبۂ حیات ہی کی وجہ سے ہماری زمین پر حیوانی زندگی کا اوّلین ظہور ہوا ہے اسی سے تکرارِ نسل کا عمل جاری ہوا ہے اور اسی سے تخلیق کی بلند تر صورتیں وجود میں آرہی ہیں۔

لیمارک (LAMARK) نے زندگی کے ارتقا کی توجیہہ یہ پیش کرتا ہے کہ زندہ چیزیں اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ اس مطابقت سے حیوان کی صورت میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ تبدیلی کا یہ عمل آئندہ نسل میں منتقل ہو جاتا ہے نومولود کو اپنے ماحول سے مطابقت رکھنا پڑتی ہے تو پہلے والی تبدیلی میں مزید تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اس طرح رفتہ رفتہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بالکل نئی وضع کی نوع وجود میں آجاتی ہے۔ جسے ہم نوع جدید کہتے ہیں۔ اس بیان میں مزید حقائق کی دریافت نے یہ اضافہ کیا ہے کہ تبدیلیاں صرف بتدریج جمع شدہ اثرات ہی کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اچانک بھی رونما ہوسکتی ہیں۔ نوع جدید کا اس طرح اچانک وجود میں آجانا ناممکن ہے جب تک زندہ وجود کے اپنے اندر شعوری یا غیر شعوری تمنائے حیات کی قوت موجود نہ ہو، جو اسے نہ صرف اچانک نمو پذیر کرے بلکہ اسے ترقی یافتہ بھی بنائے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت کو، بجائے اس کے کہ اسے زندگی کے ارتقا کی دلیل بنائیں، اس بات پر بھی بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ اس سے تو زندگی کی بالیدگی کا عمل رک جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ جب کوئی ذی حیات اپنے ماحول سے پوری مطابقت حاصل کر چکے گا اور اس قابل ہو جائے گا کہ وہ ماحول کے برد باؤ کا مقابلہ اپنی پوری قوت کے ساتھ کر سکے تو اُسے کسی مزید تغیر یا ارتقا کی ضرورت ہی نہیں رہیگی۔ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا وہ اصول جس کا تعلق انفرادی یا اجتماعی بقائے نوع کی ضرورت سے ہے زندگی کے عمل کے رک جانے کی وضاحت کرتا ہے نہ کہ اس کے روز بروز ارتقا کی۔ کہ جو ہمیں نئی نئی اور بلند تر صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔ برگساں لکھتا ہے کہ:

"نہایت ادنیٰ سی ذی حیات مخلوق بھی اپنے ماحول اور زندگی کی شرائط و حالات سے اس طرح مطابقت رکھتی ہے جس طرح ہم انسان رکھتے ہیں۔ جس طرح اس مخلوق نے اپنی زندگی کو قائم اور برقرار رکھا ہوا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے۔ جب صورت حال یہ ہے کہ زندگی مطابقت اختیار کر کے اپنے آپ کو تحفظ دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اپنے مخالف عناصر پر فتح پا لیتی ہے تو پھر کیوں یہ اپنے آپ کو پیچیدگیوں میں مبتلا کرتی رہتی ہے؟ کیوں زیادہ سے زیادہ خطرات کو دعوت دیتی ہے؟ کیوں قدم قدم پر مزاحمتوں سے الجھ پڑتی ہے؟ آج ہمارے سامنے حیوانی زندگی کی وہ صورتیں بھی ہیں جو کروڑوں اربوں سالوں سے جوں کی توں آرہی ہیں۔ اور انہوں نے ہیئت کی کسی تبدیلی کو قبول نہیں کیا۔ یہ ابتدائی صورتیں معدوم کیوں نہیں ہوئیں؟ زندگی کو تو کسی ایک معینہ شکل و صورت پر پہنچ کر ٹھہر جانا چاہیے تھا۔ یہ کیوں نہیں ٹھہری جب اسے ٹھہر جانے کے مواقع بھی ملتے رہے؟ یہ کیوں آگے اور آگے ہی بڑھتی رہی ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اس کے اپنے اندر وہ مخفی تمنا ہے جو اسے زیادہ سے زیادہ خطرات مول لینے پر اکساتی ہے تاکہ یہ بلند سے بلند تر مقامات کو مسخر کرتی چلی جائے"۔

المختصر! یہ ہیں وہ چند ٹھوس حقیقتیں جو ہمارے اس نظریے کی زبردست تائید کرتی ہیں۔ کہ

۱۔ "شعور" مادّے کی پیداوار نہیں ہے۔

۲۔ اس کا اپنا علیحدہ وجود ہے۔

۳۔ اس کی حیثیت بنیادی ہے یعنی یہ اصل الاصول ہے۔ اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۴ — یہ مادّے کے خواص سے مشتق نہیں ہے

اس نظریئے کے تسلیم کر لینے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر شعور تنہا اصولِ حیات ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ مظہر کے اندر رواں دواں ہے تو پھر ساری کائنات کا واحد اصل الاصول بھی یہی ہے اور مادہ بھی اسی کی پیداوار ہے، مادہ اور نامیاتی زندگی تو ارتقاء کے مدارج طے کرنے میں ہزاروں سال لگ گئے ہیں۔ نامیاتی زندگی کو برقرار رکھنے اور ارتقاء دینے میں "اندرونی تقاضائے حیات" کی جو معاونت ہے وہی مادّے کے ارتقاء کی بھی ذمہ دار ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود مادہ بھی شعور ہی کی ایک صورت ہے۔ جدید علم طبیعات اب اسی نتیجے کی تائید کرتا ہے۔

شعور کے خواص کیا ہیں؟ ان کا اظہار تخلیقی اعمال سے جو ہر لمحے ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں ہر گھڑی ہوتا رہتا ہے ہم اپنے گرد و پیش کا بغور مطالعہ کر کے ان خواص کا استنباط کر سکتے ہیں۔ تخلیق کی یہ اعلیٰ ترین صورت جس میں "شعور" نے اپنا بھرپور اظہار کیا ہے انسان ہے۔ انسان کے مطالعے سے جو بلند ترین اور اعلیٰ صفات ہمارے سامنے آتی ہیں اور جن ترقی یافتہ اوصاف کا ہمیں پتہ نشان ملتا ہے ان سے یہ حقیقت اخذ کی جا سکتی ہے کہ شعور بھی انہی اوصاف و صفات سے متصف ہے تاہم اس کی صفات انسان کی صفات کے مقابلے انتہائی مکمل اور اتم ہیں۔ سر جیمز جینز سائنسدان ہونے کے ناطے سے بڑے محتاط انداز میں کہتا ہے کہ روحِ کائنات کی صفتِ ذہانت در ریاضیاتی فکر تو بلا شک و شبہ واضح اور ثابت ہے تاہم اس عظیم سائنسدان کو سوچنا چاہیئے تھا کہ جب ایک صفت تسلیم کی جا سکتی ہے تو باقی صفات کیوں تسلیم نہیں کی جا سکتیں، جبکہ ان صفات شعوریہ کا استنباط بھی تو ہماری عقل نے کیا ہے!

ہم اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ جس سوچ کو ریاضیاتی سوچ کی اصطلاح دی جاتی ہے وہ آج تک کسی ایسے انسان کے اندر نہیں پائی گئی جو اخلاق عالیہ کی صفات کا بھی حامل نہ ہو کیونکہ علم صحیح اور عمل صالح کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بلند ترین ذہانت سے بلند ترین شعور کا پتہ چلتا ہے اور بلند ترین شعور کا نام خود آگہی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اخلاق عالیہ کی صفات کا براہ راست تعلق اپنا مشاہدہ آپ کرتے رہنے سے ہے۔ لہٰذا شعور صرف ریاضیاتی سوچ کی صفت نہیں ہو سکتی۔ ہر شعور خود آگاہ ہے۔ اسے اپنا علم ہوتا ہے اس لئے یہ "ذات" (SELF) یا شخصیت (PERSONALITY)، ہے۔ اسے قوت، صداقت، خوبی اور محبت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ انسانی مائنڈ کائناتی مائنڈ کے ساتھ اساسی مماثلت رکھتا ہے۔ اس لئے ہماری فطرت اس روحِ کائنات کی تمام صفات کو اپنانا چاہتی ہے۔ ان تمام الوہیاتی صفات کو جن کے اپنانے کی والہانہ تڑپ ہمارے دل میں ہر وقت موجود رہتی ہے ہم ایک لفظ "حسن" سے منسوب کر سکتے ہیں۔ کائنات کی اصل الاصول حقیقتِ مطلقہ کے لئے منبعِ حیات، سرچشمہ خود آگہی، ذاتِ ربانی وغیرہ کے الفاظ آئندہ صفحات میں استعمال ہوں گے۔ تاہم اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہم فلسفہ اضداد کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جسے قرآن حکیم کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

فلسفۂ اضداد

"روح اور مادّے" کی بحث نامکمل رہ جائے گی۔ اگر ہم یہاں اختصار کے ساتھ ہی بھی فلسفۂ اضداد کا ذکر کریں جو عصرِ حاضر کی جدلیاتی مادہ پرستی کی بنیاد ہے اور جس پر اشتراکی نظامِ معیشت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اس ذکر میں ہمیں چند باتوں کو دہرانا اور ان کا معروضی جائزہ لینا پڑے گا۔ کیونکہ جدلیاتی فکر نے مطالعۂ تاریخ کے طریقوں کو بھی متاثر کیا ہے اور زندگی کے بعض مسلمات کی بھی نفی کر دی ہے۔ مادہ پرست کہتے ہیں کہ :-

۱۔ جس چیز کا ادراک حواسِ خمسہ نہیں کر سکتے اس کا کوئی وجود نہیں ہے وہ محض ایک خیال یا تصوّر ہے لہٰذا عدم ہے۔

۲۔ عدم سے عدم ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ وجود پیدا نہیں ہو سکتا۔

۳۔ مادّہ یا کائنات از خود ہے کسی خیال یا تصوّر وغیرہ سے پیدا نہیں ہوا کیونکہ خیال یا تصوّر وغیرہ حواسِ خمسہ کے ادراک سے باہر ہونے کی بنا پر عدم ہیں۔

۴۔ خیال یا تصوّر وغیرہ مادّے ہی کی پیداوار ہیں اس لئے یہ حادث ہیں اور مادّہ جو ان کا خالق ہے قدیم ہے۔

۵۔ ذہن بھی مادّے ہی کی ہزاروں سالہ ترقی کا نتیجہ ہے اس لئے اس کی صلاحیتیں یعنی شعور علم، تفہیم وغیرہ بھی مادّے ہی کی تخلیقات ہیں۔

ان تمام باتوں کی بنیاد انہوں نے اس نظریئے پر رکھی ہے کہ "چونکہ میں ہوں اس لئے میں سوچتا ہوں" سائنٹفک نظریہ ہے جبکہ اس کا عکس "چونکہ میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" تصوریت پرستوں کا نظریہ ہے سائنٹفک نہیں ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا دونوں نظریات میں ضمیرِ متکلم کا لفظ "میں" فاعلی حیثیت سے مشترک ہے۔ مادّیت نواز منکرین اسی "میں" کی ماہیت پر غور کر لیتے تو بہت سی فکری لغزشوں سے بچ جاتے اگر لمحہ بھر کے لئے ہم ذہن، شعور، عقل، تفہیم، جذبات، احساسات اور اختیار وارادے کو مادّے کی ارتقا کا نتیجہ مان لیں تو پھر "میں" کیا ہے جو ان سب پر حکم چلاتا ہے۔ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہے انہیں چاہے تو پابند بنا لیتا ہے چاہے تو آزاد کر دیتا ہے۔ بلکہ خود مادّے کو بھی جسے ان کا خالق تصوّر کر لیا گیا ہے، مسخر کرتا چلا جا رہا ہے۔ مادّیت نواز منکرین کے نزدیک شعور، ذہن، جذبات وغیرہ غیر حقیقی ہیں کیونکہ حواسِ خمسہ کے ادراک میں نہیں آتے۔ جسم حقیقی ہے کیونکہ محسوس شکل میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے "میں" بھی غیر حقیقی ہوا کیونکہ یہ بھی حواس کی عملداری سے بالاتر ہے۔ تو پھر یہ کیا ہوا، عجیب ہوئی کہ غیر حقیقی وجود نے حقیقی وجود کو اپنا تابعِ فرمان خادم بنا رکھا ہے یہاں تک کہ حقیقی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وجود اپنی غلامی اور بے بسی پر صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتا! بلکہ خود رستے دکھاتا چلا جا رہا ہے۔ کہ مجھے اس طرح مطیع اور فرماں بردار بنا لو۔ واضح رہے کہ حقیقت تغیّر پذیر نہیں ہوتی کیونکہ بدلتی رہنے والی چیز پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھا، چاند پر غور کیا، سورج کا مشاہدہ کیا پھر غور و فکر کے بعد کہا کہ یہ چیزیں ایک وقت میں بڑی آب و تاب سے چمکتی ہیں۔ مگر دوسرے لمحے تاریکی کے پردے میں جا چھپتی ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی تغیّر پذیر چیزیں "حقیقت" نہیں کہلا سکتیں۔ صاحب اقتدار بھی وہی ہو سکتا ہے جو تغیّر سے ماورا ہو "میں" بلاشبہ صاحب اقتدار ہے۔ جیسا کہ تسخیر کائنات کے جاریہ عمل سے ثابت ہے، اس لئے یہ حقیقت ہے۔ اور "مادّہ" جو روز بروز بلکہ لمحہ بہ لمحہ تغیرات کی زد میں آکر اس کے زیرِ دام آتا جا رہا ہے۔ غیر حقیقی اور باطل ہے، آپ اپنی انفرادی "میں" کو دیکھیں جب آپ بچے تھے، لڑکپن میں تھے، جوان تھے تو بھی آپ کی "میں" وہی تھی جو آج ہے۔ اس میں ماہیت کے اعتبار سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کی مقبوضات مثلاً علم، تجربہ، مشاہدہ وغیرہ میں اضافہ ہوا ہے۔ تو ہوا ہے۔ اس کے اپنے اندر کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی اور یہ شروع سے آخر تک تغیّر ناآشنا رہی ہے۔ لہٰذا مادّیت نواز فکر یہ کی یہ فکری اساس ہی غلط ہے کہ جس چیز کا ادراک حواس خمسہ نہیں کر سکتے اُس کا وجود ہی نہیں ہے۔

حواسِ خمسہ اشیا کا ادراک حاصل کرنے کے لئے "اجسام" کے محتاج ہیں۔ "اجسام" "ابعاد ثلاثہ" THREE DIMENSIONS کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتے کیونکہ انہیں جسامت دینے کے لئے خطوط کا ہونا لازمی ہے۔ جو ان کی حد بندی کرتے ہیں۔ "خط" "نقطے" سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کی اپنی نہ لمبائی ہے اور نہ چوڑائی اور نہ اونچائی یا گہرائی ہے۔ یہ ابعاد ثلاثہ کا خالق ہے لیکن خود ابعاد ثلاثہ سے محروم ہے۔ چونکہ حواس خمسہ اس کا ادراک نہیں کر سکتے اس لئے مادّیت کے فلسفے کی رُو سے عدم ہے لیکن ابعاد ثلاثہ اسی عدم سے وجود میں آتے ہیں گویا مادّی فلسفے کی یہ بات بھی غلط ہو گئی کہ عدم سے صرف عدم ہی پیدا ہو سکتا ہے ٹھوس وجود پیدا نہیں ہو سکتا۔ نقطے کے اس "کالعدم" وجود پر ایمان نہ رکھا جائے تو سائنس ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ علم ریاضی کی بدیہیات اور مسلّمات AXIOMS & POSTULATES کو عقلی دلائل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ انہیں بغیر دلیل اور ثبوت کے صحیح مان کر مفرودن سے تجریدی کلیات کی طرف آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ اور پھر ان تجریدی کلیات کی مدد سے ایجادات کی نئی مفرودن دنیا میں آباد کر دو، گویا کائنات تجریدی خیال سے شروع ہو کر مفرودن بنی۔ مفرودن سے ذہن سے پھر تجرید کی طرف قدم بڑھایا اور ایک بار پھر تجرید سے مفرودن اشیا وجود میں آئیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایک حقیقت کبریٰ کے انکار سے کتنی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا انکار بھی لازم ہو جاتا ہے اور اس طرح مادّیت نواز سوچ خود اپنی ہی تردیدات میں الجھتی چلی جاتی ہے۔ مادہ پرستوں کے اس مفروضے کو دیکھئے کہ مادّے ہی نے ذہن اور عقل وغیرہ کو ارتقادے کر پیدا کیا ہے یہ تو بدیہی طور پر ناممکن ہے کہ کوئی چیز ذہن اور عقل کو پیدا کرے اور خود بے عقل رہ جائے علم کو تخلیق کرے اور خود جاہل رہ جائے۔ شعور کی خالق ہو اور خود بے شعور ہو۔ احساسات اور جذبات کو وجود میں لے آئے اور خود بے حس اور ظالم ہو۔ جذبات سے عاری سیلاب

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یہ نہیں پوچھتا کہ میں کس کا گھر بہا کرے جا رہا ہوں احساس سے محروم برق گرتی ہے تو نادار کے کاشانوں پر!

لہٰذا اندھے ظالم، بے شعور اور بے بس مادّے کو علم، تفہیم، احساسات اور اختیار وارادے کا خالق ماننے کی بجائے کیوں سیدھی سادی سی اس حقیقت کا اعتراف کر لیتے کہ مادّی کائنات سے بالاتر ایک اور وجود ایسا بھی ہے جس نے مادّے کو ایک مقصد کے تحت انتہائی "ریاضیاتی صحت" کے ساتھ تخلیق کیا ہے اور اپنی "روح" میں سے کچھ پھونک کر علم، تفہیم احساس اور اختیار وارادے کی مدد سے مادّے کی تسخیر پر مامور کر دیا ہے

اشتراکیت صرف ایک معاشی نظام کا نام ہوتا تو کوئی ایسی بات نہیں تھی کیوں یہ نظام قرآن حکیم کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بہت پیچھے ہے لیکن اس نظام کو مادیت نواز طبقے نے ایک ایسے فلسفۂ زندگی پر استوار کر دیا جو قرآنی فلسفۂ زندگی کے بالکل برعکس ہے چونکہ اشتراکی معاشی نظام کو تسلیم کرنے کے لئے اشتراکی فلسفۂ زندگی کو تسلیم کرنا بھی لازمی ہے اس لئے دنیائے اسلام اس کی شدومد سے مخالفت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ اشتراکی فلسفۂ زندگی کو جدلیاتی مادیت کہا جاتا ہے اور اس کی بنیاد ہیگل کے فلسفۂ اضداد پر رکھی گئی تھی۔ فلسفۂ اضداد کا کہنا یہ ہے کہ دُنیا میں ایک تصوّر (THESIS) وجود میں آتا ہے۔ وہ پروان چڑھتا اور پھیلتا پھولتا ہے۔ جب اپنے شباب کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد ایک اور تصور پیدا ہوتا ہے وہ بھی اسی طرح اپنے عروج تک پہنچتا ہے تو پھر ایک تیسرا تصور ابھر آتا ہے جس میں ان دونو متضاد نظریات کی خصوصیتیں موجود ہوتی ہیں اس طرح تصورات کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے اس تمام عمل کو متحرک اور جاری رکھنے والی قوت کا نام روح عصر یا SPIRIT OF THE AGE ہے

کارل مارکس نے ہیگل سے اس فلسفے کو اپنا کر اس میں ترمیم کر دی اور کہا کہ یہ تضاد اور تغیر صرف تصورات میں ہی نہیں بلکہ انسان کے مرتب کئے ہوئے معاشی نظام میں بھی رونما ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کا محرک تاریخی وجوب یا HISTORICAL NECESSITY ہے یعنی جب تک تاریخی وجوب کسی نظام کو متغیر نہ کرے معاشرہ یا اجتماعی قوت یا کوئی اور طاقت اسے بدل نہیں سکتی۔ اشتراکیت نے تاریخی جبریت کے اس فلسفے کو مزدوروں کے ذہن میں بٹھا کر دراصل یہ تعلیم دی ہے کہ وہ مشین کا محض ایک پرزہ بن کر محنت اور مزید محنت میں جتے رہیں اور اگر چاہیں بھی تو اپنے مقدر کو نہیں بدل سکتے کیوں کہ مقدر کو صرف تاریخی وجوب ہی بدل سکتا ہے لہٰذا ان کا کام اشیائے صرف پیدا کرنا ہے اور بس۔ اس نظام کے خلاف احتجاج ان کا کام نہیں ہے۔ یہ نظام اپنے پرستاروں سے کہتا ہے 'اے محنت کشو! جتنا کچھ تم نے مملکت کو اپنی استعداد کے مطابق دیا ہے اس کے مطابق اپنا حق الخدمت لیتے رہو، نظام کے خلاف تمہارا احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوگا۔ کیونکہ جب تک تاریخی وجوب حرکت میں نہ آئے گا آجر اور اجیر کا یہ نظام نہیں بدل جائے گا۔" مارکسی فلسفے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ تیسرے نظام میں پہلے دو نظاموں کی خصوصیتیں بھی برقرار رہتی ہیں تو یہ بھی جبریت کی اسی ارتش کی بدولت ہے۔ سرمایہ دار کو اپنے سرمایے کا تحفظ چاہیئے۔ بغاوتوں اور احتجاجوں سے نجات چاہیئے اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ انسان کی ضروریات حیوانی سطح کی [illegible] زیادہ اضافہ چاہیئے۔ [illegible] انسانی سطح کے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا ہر [illegible] صرف روٹی، کپڑے، اور مکان تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ

Presented by: Rana Jabir Abbas

اچھے معاشرے کا فرض ہوتا ہے۔ چونکہ مادّہ نواز فلسفہ مادّے اور جسم ہی کو حقیقت سمجھتا ہے، اس سے بلند تر سطح کی زندگی کو جس میں اعلیٰ اور ارفع قدریں آجاتی ہیں، تسلیم نہیں کرتا کیونکہ یہ حواسِ خمسہ کے ادراک سے باہر ہیں اس لئے اس میں سیرت و کردار اور روح کی بالیدگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

چینی اشتراکیت کا علمبردار ماؤزے تنگ بھی اسی فلسفے کا مؤیّد تھا لیکن اس کا فلسفۂ اضداد ہیگل اور مارکس کے فلسفوں سے قدرے مختلف تھا۔ اس کے خیال کے مطابق کائنات کی ہر شئے کے اندر ہی متضاد عناصر موجود رہتے ہیں جو ایک دوسرے سے باہم برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ تاہم ان متضاد عناصر میں ایک وقت میں ایک عنصر غالب اور دوسرا مغلوب بن جاتا ہے یہ "چکر" اسی طرح جاری رہتا ہے۔ خواہ یہ مکمل دائرے کی شکل میں ہو خواہ SPIRAL یعنی گھنگھرال کی صورت میں ہو۔ زندگی کو دائرے کی کسی بھی صورت میں متصوّر کر لیا جائے تو اس میں ہر موڑ پر ماضی اور مستقبل دونو آنکھوں سے اوجھل رہیں گے اور حال بلکہ صرف حال پیشِ نظر رہے گا۔ جو کسی نصب العین کے تسلسل سے محروم ہونے کی وجہ سے اتفاقات CHANCES پر منحصر رہے گا، اور اس طرح ہمیشہ عدمِ تیقّن کا شکار رہے گا۔ اس تصوّر میں دوسری خرابی یہ ہے کہ "دائرے کی قوس" انسانیت کے محض ایک جُزو کو سامنے لا سکتی ہے۔ من حیث الکل پیش نہیں کر سکتی۔ لہٰذا فلاحی منصوبے چھوٹے چھوٹے گروہی مفادات تک محدود رہ جاتے ہیں، عالمگیر بہبود کی سطح تک نہیں پہنچ سکتے۔ زندگی کی شاہراہ کو صراطِ مستقیم سمجھ لیا جائے جو دائماً آگے ہی آگے بڑھتی اور بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے تو ماضی، حال اور مستقبل ایک واضح ربط اور تسلسل کے ساتھ آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں اور پوری انسانیت بلا امتیاز رنگ و نسل فوز و فلاح کا محور و مقصود بن جاتی ہے۔

ارتقا میں تغیّر لازمی ہے۔ لیکن ہر تغیّر ارتقائی نہیں ہوتا۔ رجعتِ قہقری کی طرف بھی لے جا سکتا ہے تعمیری نصب العین کی طرف اٹھنے والے ہر قدم کا نام ارتقا ہے۔ بیج کے اندر پورا درخت موجود ہے۔ بیج کی اس مضمر صلاحیت کو ابھارنے والا ہر عمل اور تغیّر ارتقائی کہلائے گا۔ لیکن اگر کوئی تغیّر بیج کی اس صلاحیّت کو ابھرنے نہیں دیتا تو اس تغیّر کو ارتقائی نہیں کہا جائے گا انحطاطی کہا جائے گا۔

قرآنِ حکیم نے جدلیاتی فلسفے کو صرف اضداد کی کشمکش تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کی روشنی میں دو اور کائناتی قوانین کے ساتھ مربوط کر کے واضح کیا ہے اور پھر فیصلہ یہ کیا ہے کہ جو چیز بھی "النّاس" کے لئے نفع بخش ہوگی وہی ٹھہر سکے گی۔ لہٰذا تاریخ کے دھارے کو رواں دواں رکھنے والے تین کائناتی قوانین یہ ہیں۔

۱۔ قانونِ نشو و ارتقا یا ربوبیت
۲۔ قانونِ کشمکشِ اضداد یا تصادمِ حق و باطل
۳۔ قانونِ "مَا يَنفَعُ النَّاسَ"

یہ تینوں قوانین کائنات پر غور و فکر کرنے سے استنباط کئے جا سکتے ہیں۔ پہلا قانون ربوبیت تو نامیاتی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

زندگی کے شروع ہوتے ہی متحرک ہو جاتا ہے اور "نومولود زندگی" کی نشو و ارتقا کے ہر مرحلے پر اس کا ممد و معاون بنا رہتا ہے۔ یہ قانون نہ ہو تو تخلیق و ارتقا کا سارا عمل ہی تعطل کا شکار ہو جائے، دوسرے قانون کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ماحول ہر نامیاتی وجود کی نشو و ارتقا کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے اور نامیاتی وجود اپنے اندر کے "تمنائے زیست کے جذبے" کی قوت سے ان رکاوٹوں پر غالب آ کر نشو و ارتقا کی طرف بڑھتا رہتا ہے، گویا نشو و نما کے عمل میں تیزی اور قوت پیدا کرنے کے لئے مزاحمت کی مزاحمت ضروری ہے اسی تصادم سے خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور نامیاتی وجود کو اپنی مضمر صلاحیتوں کے آزمانے کا موقعہ ملتا ہے۔ تاریخی سطح پر اگر ہم اس قانون کو مثال کی صورت میں پیش کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ دو گروہ ہیں جن کے مقاصد الگ الگ یعنی متضاد ہیں۔ ان مقاصد کی پشت پر دو الگ الگ وفاداریاں بھی ہیں۔ اور دو منظم ارادے بھی ہیں۔ اب ان دو ارادوں کے درمیان تصادم شروع ہو جائے گا۔ اور ان تضادات کو کامیاب بنانے کے لئے دو پروگرام وجود میں آ جائیں گے۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اس لئے ایک لازماً تعمیری ہو گا اور دوسرا لازماً تخریبی ہو گا۔ ایک پروگرام الناس کے لئے نفع بخشی کا ہو گا۔ اور دوسرا گروہی مفادات اور پست خواہشات کے گرد گھومے گا۔ اب یہاں تیسرا قانون پائیدار اور دیرپا نتائج پیدا کرنے کے لئے لاگو ہو جاتا ہے۔ اگر "روح عصر" ذاتی مفادات اور حرص وغیرہ سے پاک ہو گی تو نفع بخشی، فوز و فلاح اور نشو و ارتقا کے راستے کھل جائیں گے اور اگر اس پر ذمائم کا غلبہ ہو گا تو تخلیقی جدوجہد میں تعطل پیدا ہو جائے گا اور ارتقا کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ اس آخری قانون کی خلاف ورزی ہمیشہ قوموں اور تہذیبوں کے زوال کا باعث بنی ہے اور اس قانون کی متابعت سے انہیں عروج و استقامت نصیب ہوئی ہے کائنات کے اندر حق یعنی تعمیری قوتوں اور باطل یعنی تخریبی قوتوں کی کشمکش میں حق ہمیشہ باطل پر غالب رہتا ہے اور اس طرح زندگی ارتقائی منزل کی طرف ایک قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔ اگلی منزل میں پھر تصادم شروع ہو جاتا ہے، اور حق و باطل کی طویل کشمکش کے بعد بالآخر حق فتحیاب ہو کر رہتا ہے "طویل" کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ انسانی حساب و شمار کی رو سے کائناتی قوتوں کے عمل کی رفتار بہت سست ہوتی ہے اگر انسانی دست و بازو بھی ان قوتوں کے رفیق کار بن جائیں تو پھر حق کی کامیابی اور فتح مندی انسانی حساب و شمار کے مطابق لائی جا سکتی ہے۔

کشمکش اضداد کے قرآنی اور اشتراکی فلسفۂ حیات میں فرق یہ ہے کہ اشتراکی فلسفہ اس تیسرے قانون کا منکر ہے کیونکہ اس نے زندگی کی شاہراہ کو دائرے کی شکل میں دیکھ رکھا ہے۔ جس میں زاویۂ نگاہ صرف قوس تک محدود رہتا ہے اور قوس کے موڑ کے اس پار کچھ دیکھ نہیں سکتا۔

1. PHILOSOPHY OF HISTORY: W.H. WALSH, HARPER TORCH BOOKS, NEW YORK.
۲۔ تاریخ پاکستان۔ دور قدیم۔ یحییٰ امجد۔ ۱۹۸۹۔ سنگ میل پبلیکیشنز۔ لاہور
۳۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔
۴۔ نظام ربوبیت، غلام احمد پرویز۔ طلوع اسلام پبلیکیشنز۔ گلبرگ۔ لاہور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۳۔ "زندگی" کی کہانی۔ تخلیق اور ارتقا کے حوالے سے

ہم جانتے ہیں کہ کائنات کی بنیادی فطرت ایک شعوری عمل کی غماز ہے لہٰذا اس کی تخلیق "شعور" ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ یہ دنیا بنی بنائی صورت میں اچانک وجود میں نہیں آگئی بلکہ تخلیق ہو جانے کے بعد اسے موجودہ صورت تک پہنچنے کیلئے تدریجی ارتقا کے مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ گویا تخلیق نے ارتقا کی صورت اختیار کر لی۔ ہر تخلیق خواہ وہ انسانی ہو یا اُلوہیاتی یہی راہِ عمل اختیار کرتی ہے۔

اگر عملِ ارتقا کے تمام سابقہ مراحل کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ہر طرف صرف مادّہ ہی مادّہ تھا اور کوئی "نامیاتی حیات" وجود میں نہ آئی تھی۔ پھر وہ مرحلہ آیا جس میں سب قوّت ہی قوّت تھی اور کہیں مادّے کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اور آخر میں وہ مقام جہاں ہر طرف صرف شعور کی حکمرانی تھی اور سوائے شعور کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ مادّہ چند الیکٹرونوں اور پروٹونوں کا مجموعہ ہے جو برقی قوت کی لہریں ہیں، گویا تمام تر مادّے کو قوّت میں تبدیل کی جا سکتا ہے اور جدید ترین دریافتوں کے مطابق قوت ختم ہو جانے والی چیز ہے پس عملِ تخلیق کو شعور نے نہ صرف شروع کیا ہے بلکہ اسے تسلسل کے ساتھ جاری رکھا ہے۔ کائنات کو خالقِ اکبر کا خیال قرار دینے سے یہ لازم آتا ہے کہ اس خیال کا سرچشمہ خالقِ اکبر کا اختیار و ارادہ ہے۔ قرآن حکیم کی اصطلاح "کُنۡ" اِسی اختیار و ارادے کا پتہ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہے فَیَکُوۡنُ یعنی تخلیق کا عمل جاری ہو گیا۔ یہ اختیار و ارادہ عملِ ارتقا کے ذریعے اسی طرح پورا ہو رہا ہے جس طرح کسی مصوّر کی تخلیقی خواہش تصویر کی مرحلہ وار تخلیق کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔ اختیار اور ارادے کا اظہار شعور کی طاقتور رَو یا عملِ تخلیق کی اُس تندی و تیز مندی کی مانند ہے جو اپنے انتخاب و پسند کی سمت بڑھتی چلی جا رہی ہو۔ حیوانی سطح کے ارتقا میں یہی ذوقِ نمو ارتقا کا سبب بن کر سامنے آتا ہے، بے آب و گیاہ صحراؤں میں جنگلی پودوں کی جڑوں کو پانی کی تلاش میں تین تین فرلانگ تک دُور نکل جانا، دانۂ روئیدہ تہِ سنگ کی جدّوجہد، جانوروں میں تیز نوکدار پنجے، زہریلے ڈنگ، سخت سینگ، سُم، کھال، پشم، رفتار، سب اسی تمنّائے زیست کے مظاہر ہیں جسے برگساں نے ایلان وائٹل کا اور فرائڈ نے لبیڈو کا نام دیا ہے!

اس سوال کے جواب میں کہ شعور نے کائنات کو کیوں تخلیق کیا ہم اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حسن کا کمالِ وجود یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ظاہر کر دے۔ ذوقِ نمود کا تقاضا اہلِ نظر کو چاہتا ہے تاکہ وہ اسے اپنا مشہود و مطلوب بنا سکیں۔ بقول صوفیائے حسنِ ازل نے کہا۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ۔

میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا

گویا یہ بھی اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ حسن و جمال جب اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو "باطن" کی قید سے آزاد ہو کر "ظاہر" کی جلوہ نمائی کو چاہتا ہے۔ چنانچہ شعور کا تخلیقی عمل اور وہ سمت جو یہ عمل اختیار کرتا ہے یقیناً اس کے خودکار تمنائے خود اظہاری کا نتیجہ ہے اور اسی تخلیقی عمل کے ذریعے اس کی صفات بھی فعال ہو کر سامنے آ رہی ہیں۔ گویا تخلیق، اور جس شکل و صورت میں یہ تخلیق ہمارے سامنے ہے، شعور کا فطری تقاضا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تخلیق کی صرف یہی ایک صورت ممکن تھی۔ کیا معلوم کہ ہماری کائنات سے مختلف کئی اور کائناتیں تخلیق کی جا چکی ہوں یا آئندہ تخلیق ہو جائیں! اس کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور عالمِ امر کی ماہیت انسانی عقل و شعور کی دسترس سے باہر ہے، ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ آرٹسٹ اگر ایک عمدہ سی تصویر بنا سکتا ہے تو یقیناً وہ مختلف تصویریں بنانے پر بھی قادر ہے۔ آرٹسٹ کی فنکارانہ صلاحیتوں اور اس کی شخصیت کی صفات کا بھرپور اظہار اس کے فن پاروں سے ہوتا ہے۔ لیکن تصویر کو مصوّر نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا کائنات "تخلیقی شعور" نہیں ہے تخلیقی شعور کی صفات کا مظہر ہے۔ بالفرضِ محال اگر فلسفۂ "وحدت الوجود" کی اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ "ذات" اور "صفات" ایک ہیں تو بھی کائنات کو صفات کا مظہر کہا جا سکتا ہے، صفات نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتبار سے بھی اشیائے کائنات اور خالقِ کائنات کے درمیان غیریت ہے عینیت نہیں ہے۔

شعور کے تخلیقی عمل نے تمنائے خود اظہاری کو پورا کرنے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا اس کا تھوڑا بہت علم جو مطالعۂ طبیعیات سے ہمیں حاصل ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ کائنات کے حوالے سے جو چیز سب سے پہلے وجود میں آئی وہ نور کی ایک قسم تھی جسے اصطلاحاً کاسمک شعاعیں کہتے ہیں۔ نور کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ) سے زیادہ رفتار والی کوئی چیز ہمارے علم میں نہیں آئی اس لئے اس سے یہ اشارہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ مادی اشیاء کا سرچشمہ قوت (E N E R G Y) ہے۔ قوت نے مثبت اور منفی لہروں کے پیکٹ بنائے جنہیں الیکٹرون اور پروٹون کہا جاتا ہے پھر الیکٹرون اور پروٹون مختلف تعداد اور تناسب سے آپس میں جڑتے چلے گئے اور اس طرح ایٹموں کی تشکیل ممکن ہوئی۔ اور عناصر بن گئے۔ شروع شروع میں کائنات گیس کی حالت میں تھی۔ اور اس کی صورت ایک گردش کرتے ہوئے بادل کی سی تھی۔ اس بادل کو اصطلاحاً نیبولا کہتے ہیں۔ یہ عظیم الجثہ نیبولا اپنی گردش کے دوران پھٹ پڑا اور اس سے اور کئی نیبولے پیدا ہو گئے۔ قرآن حکیم میں ارض و سمٰوٰت کے بارے میں ہے کَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنٰهُمَا یہ پہلے جڑے ہوئے تھے پھر پھٹ پڑے اور الگ الگ ہو گئے۔ پھر ہر نیبولا شکست و ریخت ہو کر نظام انجم میں تبدیل ہو گیا، کہکشانی نیبولا کے پھٹ پڑنے سے جو نظام انجم وجود میں آیا اس میں ایک سورج ہے جس کے گرد ہماری زمین گھومتی ہے۔

شعور کی قوتِ تمنا کے عمل تخلیق کے صدہا سالہ مدت کے دوران مادہ بلند سے بلند تر ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا بالآخر اس سطح پر پہنچ گیا ہے کہ آج ہم اپنے تمام ریاضیاتی قوانین کا اطلاق اسی پر دیکھتے ہیں ابتدائے زمان سے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

لیکن ارض کی ساخت تک جو وقت صرف ہوا ہے اس کا اندازہ ۱۰×۲ سال لگایا گیا ہے جس میں مادہ اور زندگی بظاہر ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اصل دونوں کی ایک ہی ہے یعنی شعور۔ اس کے علاوہ مادے کے اندر تعمل کی خاصیت بھی موجود ہے۔ یعنی اگر اس کے قوانین تخلیق کے مطابق یا مخالف اس پر عمل کیا جائے تو یہ "عمل" کو رد یا قبول کرنے کی خاصیت رکھتا ہے، اس کی یہ خاصیت بے لچک اور قائم انداز کی ہے۔ تاہم خود "زندگی" میں بھی "تعمل" کی خاصیت موجود ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادے اور "زندگی" میں خاصیتِ تعمل کا اشتراک ہے۔ مشہور جرمن فلسفی لیبنیز نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مادے کے اندر باشعور خور دبینی ذرات موجود ہیں۔ ان ذرات کا اس نے "موناڈ" نام رکھ دیا تھا۔ اس فلسفی کی بات کو کلی طور پر تسلیم نہ بھی کیا جائے تو بھی آنکھوں دیکھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کیمیاوی عمل کے دوران صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایٹم باشعور ہے۔ یعنی اُسے معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ خاص طور پر جب سیر شدہ محلول کے مالیکیول خود بخود جمع ہو کر خوبصورت وضع قطع کے اور جیومیٹری کی اشکال کی صحیح پیمائش کے مطابق کرسٹل بناتے ہیں تو ذرات کا باشعور ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح زندہ مخلوق کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے اسی طرح مادے کے ہر جزو کے اندر زندگی کی رَو چل رہی ہے حالانکہ ہماری ظاہری آنکھ کو مادہ بے جان دکھائی دیتا ہے۔

مادہ زندہ ہے کیونکہ اس کے اندر ایسے خواص موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ از خود عامل اور فعّال رہتا ہے، یہ خارجی مہیجات کا اسی طرح ردِ عمل پیش کرتا ہے جس طرح حیوان اور انسان پیش کرتے ہیں۔ اس کے ہر فعل و عمل کا تعلق کسی نہ کسی قانون سے ہوتا ہے جس کا یہ ہمیشہ پابند رہتا ہے۔ کیمیا اور طبیعیات کے ماہرین ان قوانین کا مطالعہ کر کے مادے کی خاصیت کو اپنے تابع کر لیتے ہیں۔ حالات کے مطابق ردِ عمل پیش کرنا یا "تہیج کا جواب دینا" "زندگی" کی خاصیت ہے۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ مادہ زندہ ہے۔

مادے کے زندہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں، اگر مادہ زندہ باشعور اور باذہانت نہ ہوتا تو ایسا کرنا ناممکن ہوتا۔ اس کے علاوہ اگر "زندگی" کی ایک نمایاں خاصیت "نشوو ارتقا" مان لی جائے تو مادہ اس صفت سے بھی عاری نہیں ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مادہ قوت کے ابتدائی مرحلے سے بتدریج نشوو ارتقا پاتا ہوا موجودہ حالت میں پہنچا ہے۔ اس کی موجودہ حالت ابتدائی مادی قوت کے اندر اسی طرح مضمر طور پر موجود ہے جس طرح بیج کے اندر پورا درخت مضمر طور پر موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مادہ مردہ نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیوان مادے کے مقابلے میں زندگی کی زیادہ ترقی یافتہ سطح پر ہے۔ اور انسان حیوان کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ سطحِ زندگی پر ہے۔ "زندگی" اور "مادے" کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں میں "زندگی" ارتقا کے مختلف مدارج میں ہے۔ "زندگی" اپنی موافقت کا ماحول خود پیدا کرتی ہے پھر یہ ارتقا حاصل کر کے اپنے ماحول سے زیادہ نشوونما پا کر اس سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ عمل اور ردِ عمل کے ذریعے ماحول بدلتا رہتا ہے۔ تبدیلی کا کوئی بھی مرحلہ ہو زندگی کے ماحول کا سب سے زیادہ اہم وہ ارتقائی مرحلہ ہے جو موجودہ مرحلے سے پہلے گزر چکا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کیونکہ اسی سے متعین کیا جا سکتا ہے وہ مرحلہ جو موجودہ مرحلے کے بعد آئے گا۔ گویا زندگی کا ماحول زندگی کا عہد ماضی بھی ہے اور اس کے مستقبل کا آئینہ دار بھی ہے۔

"زندگی، جو نشو و نما پا چکی ہے ہر اس نئی زندگی" کی مزاحمت کرتی ہے جس نے ابھی نشو و نما پانی ہے۔ یہ مزاحمت جو اپنی ہی نشو و نمائے آئندہ کے لیے زندگی آپ پیدا کرتی ہے اس کی ترقی اور مستقبل کی نشو و نما کے لیے ناگزیر ہے۔ اقبال نے اسی کو خوب سے خوب تر کی تلاش کہا ہے۔ اپنے آپ سے الجھ کر جد و جہد جاری رکھنا عمل ارتقا کا دوسرا نام ہے۔ "زندگی" اپنے زمانۂ حال کی مزاحمتوں کو توڑ کر آگے بڑھتی ہے

مادہ ابتدائی زندگی ہے، اور اس پر جن قوانین کا اطلاق ہوتا ہے انہیں متعین (وہ عہد امر) رجحانات کہا جا سکتا ہے، ان کو مادے نے خود نشو دی ہے جس طرح حیوانات نے جبلتوں کو خود نشو دی ہے گویا یہ تعلق داریاں ہیں جو مادے نے ارتقائی عمل کے واسطے سے پیدا کر لی ہیں۔ نئی نئی تعلق داریوں کی تلاش ہر "زندگی" کا خاصہ ہے، مادہ ہو یا حیوانی دنیا یا انسان سب نئے نئے تعلق اور رشتے جوڑتے رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ طبعی قوانین وہ فتوحات ہیں جو شعور نے اپنے آپ کو نشو و ارتقا دینے کی کشمکش اور جد و جہد کے دوران حاصل کی ہیں۔ اب تو یہ قوانین متعین اور ناقابل ترمیم و تنسیخ ہیں کیونکہ انہیں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں رہی تاہم یہ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے۔ شروع شروع میں یہ بدلتے رہے۔ نشو و ارتقا پاتے رہے، حالات کے مطابق ڈھلتے رہے لیکن جب زندگی کی بلند تر ارتقائی سطوح کے لیے کامل موزونیت ان میں آ گئی تو یہ خود کار بھی بن گئے اور ناقابل تغیر و تبدل بھی ہو گئے۔ بلند تر سطح زندگی پر البتہ تغیر کامل جاری رہا۔ زندگی صرف اس وقت تغیر قبول کرتی ہے جب یہ ایک نقطۂ ارتقا پر پہنچ کر مزید ارتقا کی طرف پر تول رہی ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی ایک سمت میں یہ اپنا مکمل ارتقا حاصل کر لیتی ہے تو پھر جہاں کہیں یہ پہنچتی ہے وہیں جم کر بیٹھ رہتی ہے۔ اور پھر اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

برگساں نے ناقابل تردید دلائل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ حیوانی سطح پر "زندگی" نے جو مختلف سمتوں میں ارتقا حاصل کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شعور نے اندرونی قوت نمو کے ذریعے اپنی تمام صلاحیتوں کو تکمیل کی ممکنہ حد تک پہنچانا چاہا تو حیوانی مخلوق نے بھی اپنے اپنے شعور کے مطابق اس کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اندرونی قوت نمو کو زیادہ سے زیادہ فعال بنانے میں اپنا پورا زور لگا دیا۔ گویا شعور کی اندرونی قوت نمو اور حیوانی مخلوق کے تعاون دونوں نے مل کر شعور کو جہاں ہست و بود میں قدم جمانے کا اور اس حیوانی مخلوق کے واسطے سے خود اظہاری کا موقع مل گیا۔ اس طرح "زندگی" مزاحمتوں کے باوجود، اور انہی کی وجہ سے ارتقا کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ جب کبھی اس مخلوق کی راہ میں کوئی رکاوٹ آتی یہ اپنی اندرونی قوت نمو اور ذاتی جد و جہد دونوں کو مجتمع کر کے اور ان میں اضافہ کر کے رکاوٹوں کو دور کر دیتی تھی، رکاوٹوں کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس شعور ہی فاتح بن کر آگے بڑھتا اور اپنی امکانی صلاحیتوں کو حاصل کرتا رہا ہے۔ حیوانی مخلوقات کا ارتقا جو سمتیں بھی اختیار کرتا رہا ہے (خواہ یہ ارتقا اس کی اپنی جد و جہد ہی کا نتیجہ تھا) ان کا تعین ہمیشہ ان امکانات اور صلاحیتوں نے کیا ہے جو اس کے شعور کے اندر پہلے سے راسخ تھیں۔ وہ جو قرآن حکیم

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کا ارشاد ہے کہ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (۱۷:۸۴) تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ہر شے اپنی امکانی صلاحیت کی حد تک پہنچ سکتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خارجی کائنات کی ہر شے کی شاکلہ متعین ہے لیکن "زندگی" کے امکانات بے حد وسیع ہیں۔ یہ اقطار السموات کو توڑ کر بھی آگے بڑھ سکتی ہے۔ ان ابتدائی حیوانی سطح پر جب کوئی مخلوق شعور کی امنگوں کے مطابق ارتقا کی سمت متعین کرنے میں ناکام رہی تو دستِ قدرت نے اسے مٹا دیا کیونکہ یہ زندگی کے تقاضے پورے نہ کر سکتی تھی۔ اور زندگی کو اب اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ سینکڑوں حیوانی انواع صفحۂ ارض سے اسی لئے معدوم ہو چکی ہیں کہ انہوں نے زندگی کی جوئے رواں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس حد تک شعور، ارتقا کے کسی مرحلے کے دوران، اپنا اظہار مادّے کے ذریعے سے نہیں کر سکا اس حد تک یہ عمل ارتقا کو جاری رکھنے کے لئے اپنی ہی قوت پر انحصار رکھتا رہا ہے۔ لیکن جہاں کہیں شعور نے اپنے آپ کو زندہ اور باشعور مخلوق کی شکل میں، مادّے کے ذریعے سے ظاہر کر رکھا ہے۔ وہاں مزید ارتقا کے لئے یہ زندہ مخلوق ہی کو استعمال میں لاتا ہے اور اسی کے ذریعے ارتقا کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ پھر جس حد تک یہ زندہ مخلوق شعور کے مقاصد پورے کرتی رہتی ہے اسی حد تک یہ پھلتی پھولتی بھی رہتی ہے۔ ترقی بھی کرتی ہے خوب سے خوب تر بھی ہوتی رہتی ہے۔ نشو و ارتقا بھی پاتی ہے اور اپنے اندر شعور کی مخفی قوتوں کو جذب بھی کرتی رہتی ہے۔ شعور کی یہی وہ طاقتور لہر تھی اور زندگی کی یہی وہ قوتِ اظہار و نمو تھی جو مادّے کو جمادی مرحلے سے حیوانی مرحلے تک لائی اور جس نے ننھے سے خوردبینی جانور امیبیا کی پیدائش کو ممکن بنایا۔ "زندگی" کی تاریخ میں امیبیا کی پیدائش بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے "زندگی" مادّے کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرتی رہی تھی۔ اب مادّی قوانین کے بندھن توڑ کر یہ ارتقا کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور آگے بڑھنے کے بیشمار نئے امکانات اس کے سامنے تھے۔ اب امیبیا حرکت کر سکتا تھا جبکہ پیشتر ازیں مادّہ اپنے طبعی قوانین کی مزاحمتوں میں گرفتار تھا۔ یہ ننھی سی جان طبعی قوانین کو توڑ کر آگے بڑھ چکی تھی۔ اور "حرکت و عمل" کا وصف پیدا کر چکی تھی۔ زندگی نے آگے بڑھنے اور اپنی ممکنات کی اور زیادہ تکمیل کے لئے اسے اپنی "شاہراہ" بنا لیا تھا!

زندگی کو اپنے عروج تک پہنچنے کے لئے ابھی بہت سے مراحل طے کرنے تھے۔ اس نے اگرچہ مادّے کی مزاحمتوں کو شکست دیدی تھی لیکن یہ صرف ایک پہلو کی کامیابی تھی۔ بعض مزاحمتیں ابھی باقی تھیں۔ اور شاید ابھی باقی ہیں۔ امیبیا سے ترقی کر کے یک خلیاتی مرحلے تک پہنچتے پہنچتے بھی اسے کئی ادوار میں سے گزرنا پڑا ہے۔ بقا اور تحفظ کی تمنا سے پیدا ہونے والی دو جبلتوں یعنی بھوک اور تولید نے اسے بہت سہارا دیا۔ اور شعور کی قوتِ نمو کی بدولت اس ننھی سی جان نے اپنی قوتوں میں بے پناہ اضافہ کر ڈالا۔ آہستہ آہستہ زندگی کی بہت سی مختلف صورتیں نمودار ہونے لگیں۔ یہ نئی صورتیں اپنے تحفظ و بقائے نسل کے لئے بنیادی جبلتوں کو اور زیادہ بہتر طریقے پر استعمال کرنے لگیں اور شعور کی تہوں میں جو مزید چھپے ہوئے امکانات تھے انہیں رجحانات کی شکل میں ابھار ابھار کر سامنے لانے لگیں۔

بہت اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ "زندگی" کا کوئی بھی ایسا رجحان جبلت کی صورت میں وجود میں نہیں آیا۔ جو پہلے سے ہی شعور کے تہ خانوں میں مستور نہیں تھا۔ لہٰذا جیسا کہ ڈارون اور لیمارک نے فرض کر لیا تھا، حیوانی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انواع کا ارتقا محض تنازع للبقا کا نتیجہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ارتقا بے شمار سمتیں اختیار کرتا اور کوئی بھی صورت، بلکہ یوں کہیے کہ ہر صورت اس کے لئے کھلی ہو سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بہت سی انواع نے، جہاں تھیں وہیں رہ کر، ارتقا پانا بند کر دیا ہے۔ پس ضروری نہیں کہ جو حیوان بقا کے لئے موزوں ہے وہ لازماً ارتقا کے لئے بھی موزوں ہو یہ حیوان زندہ تو ہیں لیکن ارتقا کی طرف نہیں بڑھ رہے کیونکہ اب ان کے زندہ رہنے کی جدّ وجہد شعور کی تمنائے نمو کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ نوعِ اسپ اب ہمیشہ کے لئے نوعِ اسپ ہی رہے گی، انسان نہیں بن سکے گی! نہ ہی کسی اور نوع میں تبدیل ہو سکے گی۔ زندگی کی تگ و دو میں جوہ گیا رہ گیا۔

ارتقا کے کسی ایک راستے پر اگر زندگی نے کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو اس کامیابی کو اس نے ہر گز ضائع نہیں ہونے دیا خواہ دوسرے راستوں پر اس نے اس کامیابی کو محفوظ کر لینے کی کوشش نہ بھی کی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی کبھی ناکام نہیں رہی۔ بلکہ آہستہ آہستہ، ہچکچاتے ہوئے لیکن پورے اعتماد اور استقلال کے ساتھ ارتقا کی جانب بڑھتی رہی ہے، "زندگی" کی آخری منزل کے بارے میں کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہے تاہم موجودہ دنیا کے حوالے سے بھی قطرۂ آبِ نیساں کو گہر بننے کی منزل تک پہنچنے کے لئے ہزاروں مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ رواں دواں اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی اور مختلف راستوں پر چلنے سے کامیابیاں اسے نصیب ہوتی رہیں یہ انہیں سمیٹتی رہی یہاں تک کہ اس جہانِ آب و خاک کے ارتقا کی آخری کڑی یعنی انسان کی تخلیق کے لئے حالات سازگار ہو گئے، حیوانی زندگی کی پہلی نمود اور تخلیقِ آدم کے درمیان کی مدت کا اندازہ ۵×۱۰^{۸} سال لگایا گیا ہے۔ ان پچاس کروڑ سالوں کے دوران "زندگی" کو اپنا مطلوب حاصل کرنے کے لئے بے شمار "سعی و خطا" کے مراحل طے کرنے پڑے۔ ایک نفعے کی خاطر لاکھوں نقصان اٹھانے پڑے ایک قیمتی جان کو وجود میں لانے کے لئے لاکھوں جانوں کو تلف کر دینا پڑا۔ بعض کم فہم اس تلفی اور ضیاع کو ظلم کا نام بھی دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اعلیٰ مقصد کی تکمیل و حصول کے لئے وسائل کا اسراف ضروری ہوتا ہے۔ جب تک "زیاں" میں سے نہ گزرا جائے "سُود" کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تخلیقِ آدم "زندگی کے ذوقِ ارتقا" کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ یہ شاہکار فطرت کے تمام نقصانات کی تلافی کر دیتا ہے۔ عملِ تخلیق ہمیشہ ردّ و انتخاب کرتا تھا جس کے اندر اس کے مستقبل کی آرزوؤں کی تکمیل یقینی ہو سکتی تھی "زندگی" نے بے شمار قالب اختیار کئے۔ یہ لاتعداد صُوَر و اشکال میں ڈھلتی رہی۔ آخر اس ایک صُورت" کا انتخاب کرنے میں کامیاب ہو گئی جس میں اس کے آئندہ کے عزائم زیادہ حُسن و صحت کے ساتھ پورے ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اسے باقی تمام صورتوں کو رد کرنا پڑا۔ یہ رد کی ہوئی صورتیں یا تو صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئیں یا جہاں پہنچی تھیں وہیں رُک گئیں، اور مزید ارتقا حاصل کئے بغیر "زندگی" کے ساتھ گھسٹتی رہیں۔ "زندگی" کے سامنے کوئی پہلے سے مرتب شدہ پروگرام نہیں تھا جس کی یہ اندھا دھند پیروی کرتی۔ اگر یہ ایسا کرتی تو یہ نقالی ہوتی تخلیقی عمل نہ ہوتا۔ اس کا پروگرام تو آگے بڑھنے کے عمل کے دوران ہی مرتب ہوتا رہتا ہے کیونکہ تخلیق ایک آزادانہ عمل ہے۔ زندگی اپنی فعالیت کے دوران ہی رَدّ و انتخاب کا عمل اس لئے جاری رکھتی ہے کہ خود شعور "فعالیت اور تخلیق" کا دوسرا نام ہے اس کی سوچ کا انداز ہی فعالیت اور تخلیق ہے جبکہ ہماری سوچ فعالیت اور تخلیق سے پہلے منصوبے بناتی ہے۔ ہم بعض

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پابندیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہماری سوچ کا انداز یہی ہے۔ زندگی پابندیوں سے آزاد ہے اس لئے اس کی سوچ اور ہماری سوچ کے انداز مختلف ہیں۔ ہماری سوچ کی ندی احوال و ظروف اور وسائل و ذرائع کے کناروں کے اندر بہتی ہے۔ زندگی کی جوئے تند و تیز بیکراں ہے جدھر چاہے نکل جائے! یہ اپنے امکانات کے اظہار اور تخلیق دونوں میں آزاد ہے۔ اپنی تخلیقات کو رد کرنے میں بھی آزاد ہے اور ان میں سے چند یا کسی ایک کا انتخاب کرنے میں بھی آزاد ہے۔ یہ صرف اُسے انتخاب کر کے تحفظ دیتی ہے جس کے ساتھ اس کے مستقبل کے عزائم قوی تر اور حسین تر انداز میں وابستہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی تخلیق میں اسے اپنے مستقبل کا عکس نظر نہ آئے تو یہ اُسے فوراً رد کر کے آگے بڑھ جاتی ہے خواہ یہ تخلیق بظاہر کتنی ہی حسین اور قیمتی کیوں نہ ہو۔ جس تخلیق کو اپنے مستقبل کے عزائم کی تکمیل کے لئے منتخب کر لیتی ہے تو پھر اس کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے تحفظات بھی فراہم کرتی ہے۔

شعور کو فنائیت کی جو آزادی حاصل ہے یہ اس کا "مستقبل کے علم" میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ نہ ہی اسے ناقابلِ عمل بناتی ہے۔ شعور "وقت" کی حدود و قیود سے بالاتر ہے اس کے لئے حال اور مستقبل ایک سے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ شعور کو آئندہ پیش آنے والے تمام واقعات کا بخوبی علم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اپنے لئے پہلے سے کوئی پروگرام مرتب نہیں کرتا تو بظاہر ان دونوں باتوں میں منطقی تضاد نظر آتا ہے۔ ہماری عقل موجودہ سطح پر اس نکتے کو نہیں سمجھ سکتی۔ ذات یا خودی "۔۔۔۔۔" جب خود آگہی کے اعلیٰ اور ارفع مقام پر پہنچ جاتی ہے تو اس وقت اس پر یہ راز براہِ راست یا "وحی" کے ذریعے کھل جاتا ہے "زندگی" اپنی منتخب کردہ مخلوق کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے جو تحفظات عطا کرتی ہے ان میں سے سب سے اعلیٰ ارفع اور یقینی تحفظ کا نام "وحی" ہے۔ آئندہ صفحات میں اس ارفع اور یقینی تحفظ کی مزید وضاحت پیش کی جائے گی۔ تاہم یہاں ہم چونکہ "زندگی" کے شعوری عمل تخلیق و ارتقا کا مطالعہ علم الحیات و طبیعات کی روشنی میں کر رہے ہیں اور ابتدائے آفرینش سے تخلیقِ آدم تک آ پہنچے ہیں۔ اس لئے مزید تحقیقات کو انہی علوم تک محدود رکھیں گے۔

عمل تخلیق و ارتقا کے تسلسل کو دیکھ کر عام سطحی ذہن کے آدمی یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ کیا "زندگی" انسان کو تخلیق کر کے ارتقا کے کسی نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہے یا یہ انسانی مرحلہ بھی حیوانی مرحلے ہی کے تسلسل میں ہے؟ بالفاظ دیگر یوں پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ حیوان اور انسان میں جو فرق ہے وہ مقداری ہے یا نوعی؟ نوعی فرق اس طرح کا ہوگا جس طرح کا فرق ہم مادے اور حیوانات میں دیکھتے ہیں۔ ہم سب پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ انسان حیوانات سے افضل ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ اس کی کون سی صفات اسے یہ فضیلت عطا کرتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زندگی جب حیوانی سطح کے مرحلے میں داخل ہوئی تھی تو اس نے مادے کی قیود کو جنہیں ہم طبعی قوانین کہتے ہیں توڑ کر جبلتیں وضع کر لی تھیں جبلتوں کا وضع کر لینا حیوانی مرحلے کی زندگی کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسی سے حیوانی زندگی اور مادے کی سطح کی زندگی کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ اب انسانی مرحلے میں داخل ہو کر "زندگی" نے کون سی کامیابی حاصل کی ہے اس کا جواب ہمیں مل جائے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سا عظیم مقصد ہے جس کی خاطر کروڑوں سالوں تک عناصر

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کروٹیں بدلتے رہے، قالب بنتے اور ٹوٹتے رہے' زندگی اپنے آپ کو پیچیدگیوں میں اُلجھا کر اور مشکلات میں پھنسا کر بار بار اُبھرتی بھی منظم ہوتی رہی اور قدم قدم نشو و ارتقا کی طرف بڑھتی رہی۔ یقیناً یہ مقصد کوئی بہت بڑا مقصد ہے جس کے لئے تدریجی ارتقا کا طریقہ اختیار کرنا پڑا ہے اور پچاس کروڑ سال تک چشمِ فلک کو محوِ انتظار رکھا گیا ہے' اس مقصد کے اندر پوری کائنات کی تخلیق کا مقصد بھی شامل ہوگا۔ اور اسے جان کر ہم "زندگی" کے مقصد کو بھی سمجھ سکیں گے۔ اور آئندہ کی منزل کو بھی پہچان سکیں گے۔ اس مقصد کی پوری آگہی تو ہمیں قرآن حکیم کی رہنمائی ہی عطا کر سکتی ہے تاہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ فکرِ مغرب کا رُجحان کس طرف کو ہے۔

برگسان کہتا ہے کہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق مقدار یا درجے کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان بالاتر سطح کا حیوان ہے جس طرح آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حیوان نچلے درجے کا انسان ہے۔ انسان سے کمتر نوع کی جتنی بھی مخلوق ہے ان میں شعور ابھی تک مقید ہے۔ انسان میں آکر یہ یکدم آزاد ہوگیا ہے۔ بندر کے دماغ اور انسان کے دماغ میں ساخت اور پیچیدگیوں کے اعتبار سے بہت تھوڑا سا فرق ہے لیکن اس تھوڑے سے فرق کے نتائج بہت بڑے ہیں۔ مثال کے طور پر حیوانی دماغ نے جو خود کار میکانکی نظام بنا لیا ہے یعنی اپنی رضا و رغبت سے جو عادات اس نے مرتب کر لی ہیں ان کا اور کوئی مقصد یا اثر نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ مذکورہ میکانکی نظام میں ذخیرہ شدہ عادات کے مطابق مقررہ افعال کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن انسانی دماغ کا یہی میکانکی نظام ایک دوسرا اضافی فریضہ بھی انجام دیتا ہے اور وہ ہے خود کار عادات کو کنٹرول میں رکھنا۔ اس طرح "خود کاریت" کی مجبوری پر قابو پا کر اس نے شعور کو آزاد اور با اختیار بنا دیا ہے۔ اس بات کو ایک اور مثال کے ذریعے یوں سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ فرض کیا کسی مشین کے چالو رکھنے کیلئے آپریٹر کو ہر وقت ہینڈل گھمانا پڑتا ہے۔ ایک دن اسے خیال آتا ہے کہ مشین کے پہیئے کے ساتھ کسی طرح ہینڈل کو جوڑ دیا جائے تو پہیئے کے گھومنے سے ہینڈل جو اس کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا اپنے آپ گھومتا رہے گا۔ اور وہ محنت اور خصوصی توجہ کی زحمت سے بچ جائے گا۔ غور فرمایئے اس معمولی سی ترکیب نے کتنا فرق ڈال دیا ہے! دونوں صورتوں میں میکانکی نظام بالکل ایک ہی ہے لیکن پہلے نظام کو آپریٹر کی ہمہ وقتی توجہ کی ضرورت تھی اب اس معمولی سی ترکیب سے وہ آزاد ہوگیا ہے اور اپنی توجہ کو دوسرے زیادہ اہم کاموں کی طرف لگا سکتا ہے انسان نے اپنے شعور کو عادات کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کا جائزہ لے سکے اور اپنے آپ کو پہچان سکے۔ چنانچہ اس نے خود شناسی اور آزادی دونوں کو حاصل کر لیا ہے۔ شعور کے لئے "علم آزادی اور آزادی علم" ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ حیوان زیادہ سے زیادہ "باشعور" کہلا سکتا ہے یعنی یہ جان سکتا ہے' محسوس کر سکتا ہے اور سوچ سکتا ہے لیکن انسان کو اپنے باشعور ہونے کا شعور بھی حاصل ہے یعنی وہ صرف جان ہی نہیں سکتا۔ محسوس ہی نہیں کر سکتا' سوچ ہی نہیں سکتا بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ سوچ سکتا ہے جان سکتا ہے اور احساس کر سکتا ہے۔ یہی وہ فضیلت ہے جس کی بدولت انسان اپنی جبلت کے شدید ترین تقاضوں پر بھی قابو پا سکتا ہے!

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم اخذ کردہ نتائج کو دہراتے ہیں کہ شعور کے پیش نظر اس طویل عمل ارتقا میں سے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

گزرنے کا جو عظیم مقصد تھا وہ تھا حصولِ خود آگہی، اپنی آزادی اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کی رسائی اور نارسائی کی حدود کے بارے میں علم حاصل کرنا۔

جب تک یہ دنیا باقی ہے۔ ارتقا کا عمل بھی جاری رہے گا۔ ماضی میں جھانک کر دیکھئے زندگی کی تو ّت نمو کئی مہمیں سر کر چکی ہے، یہ ہر دن، ہر گھنٹے اور ہر منٹ ایک نہ ایک منزل تک پہنچتی رہی ہے۔ ہر منزل نے ایک نئی منزل کی نشاندہی کی ہے اور "زندگی" کمربستہ ہو کر اس نئی منزل کی طرف چل پڑی ہے، یہ کہیں رکی ہی نہیں کیونکہ رکنا اس کے اصول فطرت کے خلاف ہے بس یہیں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ منزل بھی آئندہ کی بے شمار منازل کے لئے نشانِ راہ ہے

"زندگی" کے لئے ضروری ہے کہ یہ ہمیشہ، متواتر اور مسلسل، رواں دواں رہے، اپنی مضمر صلاحیتوں کو حاصل کرتی رہے اپنے امکانات کا تعاقب کرتی رہے اور دائم آگے بڑھتی رہے۔ زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں، ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں شعور کا راز یہی ہے کہ یہ دم بدم تغیّر سے دوچار رہے۔ یہی ایک حقیقت کہ ہم زندہ ہیں، دنیا جاری اور ہمارے ارد گرد کی ہر شئے کو شدّت کے ساتھ بدلتی چلی جا رہی ہے اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ شعور کا اظہار و نمو ابھی تکمیل تک نہیں پہنچا اور اسے ابھی بہت سی مضمر صلاحیتوں کو منصہ شہود پر لانا ہے۔ ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است!

جب یہ کائنات ہر اعتبار سے مکمل ہو جائے گی تو یہ معدوم ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کی جگہ کوئی اور کائنات وجود میں آ جائے۔ تخلیق شعور کی ابدی صفت ہے جس طرح آرٹسٹ ایک تصویر مکمل کر لینے کے بعد دوسری تصویر بنانا شروع کر دیتا ہے اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خالق اکبر بھی اس کائنات کو تکمیل تک پہنچانے کے بعد کسی دوسری کائنات کی تخلیق شروع کر دے۔

شعور کا مقصد آزادی اور خود آگہی حاصل کرنا ہے یہ دونوں صفات اسے مکمل طور پر، اور اس حد تک کہ جس حد تک یہ انہیں حاصل کر سکتا ہے، حاصل نہیں ہوئیں۔ اس نے ابھی اپنے بارے میں بھی بہت کچھ جاننا ہے "زندگی" کو بہر حال آگے بڑھنا ہی ہے۔ اس کے مستقبل کے ارتقا کی صورت کیا ہوگی، ہمارے نامور ماہر نفسیات ڈاکٹر رفیع الدین خالص نفسیاتی اور حیاتیاتی علوم کے نقطۂ نظر سے اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

"اوّلاً: شعور اپنی آئندہ کی جدّوجہد میں انسان اور صرف انسان کے توسط سے آگے بڑھے گا، کیونکہ ارتقا کی تمام دوسری راہوں پر اس کی حرکت پہلے ہی ختم ہو چکی ہے۔ اس وقت زندگی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت انسان ہے اس لئے ارتقائی عمل کو جاری رکھنے کے لئے شعور کو لازماً اسے ہی اپنا "واسطہ" بنانا پڑے گا۔

ثانیاً: شعور کے آئندہ ارتقا کی منزل بھی زیادہ سے زیادہ آزادی اور خود آگہی حاصل کرنا ہوگی۔ اس کے مستقبل کی کامیابی بھی اسی قسم کی ہوگی جس قسم کی کامیابی اس نے ماضی میں حاصل کی ہے گویا ماضی کی کامیابیوں میں اضافہ کرتے جانا اس کی اگلی منزل ہے۔

ثالثاً: ۔زندگی کے آئندہ ارتقا کے لئے کسی جدید "نوع" کی ضرورت نہیں ہے جس چیز کو بالعموم ارتقائے نوع کہا جاتا ہے وہ درحقیقت ارتقائے شعور ہے کیونکہ ہر ترقی یافتہ نوع جس کا دماغ پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا ہے اسی ارتقا کا آلۂ کار یا واسطہ اور ذریعہ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا چونکہ شعور کا عضو دماغ ہی ہے اس لئے دماغ کے ساخت کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پیچیدگیوں میں اضافہ بھی ارتقائے شعور کی نسبت سے ہوتا رہا ہے۔ پھر ارتقائے شعور کا مطلب ارتقائے خود آگہی ہے اب جبکہ شعور کا مادّی آلۂ کار یعنی جسم اور دماغ شعور کے استعمال میں مزاحم نہیں ہوتا اور اسے خود آگہی کی طرف آزادانہ بڑھنے دیتا ہے، اس لئے شعور اب اپنی آزادی میں جس قدر چاہے اضافے کر سکتا ہے، اس میں شک نہیں کہ مادّے یعنی جسم اور جبلتوں کی مزاحمتیں شعور کے ارتقا پر بوجھ بنی رہیں گی۔ لیکن یہ اسے روک نہیں سکتی۔"

ڈاکٹر رفیع الدین نے یہ بات چالیس سال پہلے کہی تھی۔ آج کی تحقیقات کا رجحان اس طرف کو ہے کہ انسان کے مادّی آلۂ کار یعنی دماغ کے اندر ریشوں کے کچھ ایسے جوڑ ہیں جنہیں آج تک استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ ذہانت اور فطانت کی مقدار پر تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اب تک دماغ کا صرف ایک تہائی حصہ استعمال ہوتا رہا ہے، دو تہائی حصے کو استعمال میں لایا ہی نہیں گیا۔ اس سے ڈاکٹر رفیع الدین کے اخذ کردہ اس نتیجے کی بھی تائید ہوتی ہے کہ انسانی جسم یا انسانی دماغ کی پیچیدگیوں میں اب کسی مزید اضافے کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا کسی نئی نوع کی تخلیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب ارتقا شعور کے مادّی ہتھیاروں میں نہیں بلکہ اس کی خود آگہی کی صلاحیتوں میں ہوگا۔

عمل تخلیق و ارتقا کے حوالے سے "زندگی" کی تگ و دَو کی کہانی آپ نے سن لی۔ اس کی تائید اور تفتیش میں قرآنِ حکیم کے ارشادات مختلف عنوانات کے تحت پیش کئے جائیں گے۔ اب ہم خود آگہی کی منزل کی طرف اہلِ تصوّف و فلسفہ کی بصیرت کی روشنی میں چند قدم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۴۔ خود آگہی کے مسافر

کسی نے بڑی دانائی کی بات کہی ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے اپنے نشوونما دینے والے ربِ رحیم رحمٰن کو بھی پہچان لیا۔ گویا خود آگہی خدا آگاہی کا پہلا اور اہم ترین مرحلہ ہے۔ خالقِ اکبر نے انسان کے اردگرد انفس و آفاق کی دنیاؤں میں بے شمار نشانیاں اسی لئے بکھیر دی ہیں کہ یہ دانا و بینا مخلوق جو پچاس کروڑ سال کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے ان پر غور و فکر کرکے عالمین میں اپنا منصب اور مقام بھی متعین کر سکے اور حقیقتِ کبریٰ کا ادراک بھی کر سکے۔

عالم اُس ذریعے یا واسطے کو کہتے ہیں جس سے کسی بلند تجریدی حقیقت کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے، عالمین کتنے ہیں یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا۔ تاہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ، جیسا کہ زندگی کے ارتقا کی کہانی ہمیں بتاتی ہے، عالمین کی مرئی یا غیر مرئی مخلوقات میں انسان اور صرف انسان صاحبِ شعور ہستی ہے اور شعور کی صلاحیت کی بدولت انفس و آفاق کے رشتوں کو سمجھ سکتا ہے، البتہ اس کے لئے ان روابط اور تعلقات کی تفہیم صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب پہلے یہ اپنی بابت جان لے کہ کائنات میں اس کا مقام کیا ہے اور کونسی صلاحیتوں کی وجہ سے اکثر مخلوقات سے افضل اور اشرف ہے۔ اس کی صلاحیتوں کی رسائی کہاں تک ہے یعنی وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا وہ اپنی تخلیق کا مقصد کو کس طرح حسن و خوبی کے ساتھ پورا کر سکتا ہے۔ جب تک انسان کو یہ باتیں معلوم نہ ہوں وہ ترقی یافتہ شعور رکھنے کے باوجود حیوانی سطحِ زندگی پر رہ جائے گا۔ اور اپنے شرف و فضیلت کے مقام تک نہیں پہنچ سکے گا۔

زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک بڑے بڑے مفکرین اور اہلِ علم و دانش نے اس ضمن میں فکر و تدبّر کی کئی راہیں اختیار کی ہیں کسی نے من کی دنیا میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی کوشش کی اور کسی نے کائناتی قوتوں کے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے پر اصرار کیا ہے۔ انسان کے لئے جس "زمین" کو مستقر اور مستودع بنایا گیا ہے وہ ایک بہت بڑی اور وسیع و عریض کائنات کا انتہائی چھوٹا سا حصّہ ہے۔ تاہم چونکہ انسان ہی وہ واحد ہستی ہے جو کائنات کی پہنائیوں کا جائزہ لے سکتی ہے اور اس کی بے پناہ قوتوں کو اپنے علم کی گرفت میں لا سکتی ہے۔ اس لئے اس کا براہِ راست یا بالواسطہ کوئی نہ کوئی تعلق اس کائنات کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے، اگر انسان ان تعلقات کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھ پائے گا تو وہ فطرت کے غیر ذی شعور چیزوں کو اپنے آپ سے بہتر اور بالاتر جاننے لگے گا، اور اس طرح وہ چیزیں جو اس کی خدمت پر مامور ہیں اس کی "آقا" بن جائیں گی۔ اس کم علمی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے وہ اپنی خداداد قوّتِ تسخیر کو بھی ضائع کر بیٹھے گا۔ حالانکہ اسی قوّتِ تسخیر نے اُسے مسجودِ ملائک ہونے کا شرف بخشا ہے! اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے قرآن حکیم نے اُسے انفس اور آفاق دونوں پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔

"اہلِ یقین کیلئے زمین کے اندر بھی نشانیاں ہیں اور تمہارے اپنی ذات میں بھی نشانیاں ہیں کیا تم کو کچھ نہیں سوجھتا (۵۱: ۲۰-۲۱)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس حکم کی تعمیل میں قرونِ اُولیٰ کے اہلِ یقین نے انفس و آفاق کے مطالعے سے جو عظیم الشان کامیابیاں قلیل ترین مدت میں حاصل کر لی تھیں انہوں نے ساری دنیا کو محوِ حیرت کر دیا ہے۔ آفاق کے مطالعے نے علوم الابدان والاجسام کے دروازے کھول دیئے اور اہلِ دنیا کو مادی ترقی کی راہیں دکھا دیں۔ انفس کے مطالعے نے سیرت و کردار کی پاکیزگی، فکر و عمل کی ندرت اور شائستگی، اخلاقی قدروں کا تحفظ اور معاشرتی روابط میں حسن و توازن کے راستوں کی نشاندہی کی ہے۔ تقریباً طور پر یہ مطالعۂ آفاق ہمارے حکماء کے ان ہی خطوط پر آگے بڑھتا رہا ہے وہ اس طرح سے ہے کہ اگر ہم اپنے گرد و پیش کی اشیاء پر نگاہ ڈالیں تو منجملہ اور بہت سی باتوں کے یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ کائنات کے اندر کئی نظام ہائے شمسی چل رہے ہیں۔ اور ہر نظامِ شمسی میں لاتعداد اجرامِ فلکی، ثوابت و سیّار اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں منہمک ہیں۔ ثوابت مقررہ مقامات پر قائم ہیں تو سیّارے اپنے اپنے مداروں پر رواں دواں ہیں۔ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز میں بھی یہ جسارت نہیں ہے کہ وہ اپنے مقررہ راستے سے ذرا بھی انحراف کر سکے یا تھوڑی سی دیر کے لئے سستا لے یا کسی دوسرے سیّارے کی قلمرو پر چڑھ دوڑے یا اس بات سے غرض رکھے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ ہر چیز متواتر اور پیہم اپنے منصبی فریضے کے پورا کرنے میں لگی ہوئی ہے، کرہاً نہیں بلکہ طوعاً تسلیمِ خم کئے ہوئے ہے اور کسی ایک کو بھی مجالِ سرکشی نہیں ہے۔

زمین پر جو مخلوقات آباد ہے اسے اہلِ دانش نے بغرضِ تفہیم و مطالعہ چار طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلا طبقہ ان چیزوں پر مشتمل ہے جو بظاہر ساکن اور جامد ہیں۔ اسی اعتبار سے انہیں جمادات کہا جاتا ہے۔ اس سے قدرے بالاتر طبقے میں جسے نباتات کا نام دیا گیا ہے "زندگی" کی نہایت معمولی سی رمق اور بالکل غیر ارادی سی حرکت پائی جاتی ہے اس سے ذرا اونچے طبقے پر حیوانات ہیں جن میں حرکت ارادی بھی ہے اور خفیف سے شعور کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ آخری سطح پر نوعِ انسانی ہے جس میں بہت سی صفات نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں۔ خاص طور پر "شعور" تو اپنی ممکنہ حد تک اس خوبی کے ساتھ پہنچ چکا ہے کہ اسے مزید نشو و ارتقا کی راہوں پر چلنے کے لئے کسی نئی مخلوق کے واسطے کی ضرورت نہیں رہی۔

مخلوقات کے ان چاروں طبقات پر غور کرنے سے ایک بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ جمادات سے لے کر انسان کی سطح تک کی ہر مخلوق کی صفات الگ الگ ہیں۔ تاہم ہر اوپر کی سطح کی مخلوق میں اپنے سے کمتر مخلوق کی صفات بھی کچھ نہ کچھ موجود رہتی ہیں مثلاً انسان کے طبعی افعال حیوانوں کے افعال جیسے ہیں۔ حیوانوں میں نباتات اور نباتات میں جمادات کی خاصیتیں موجود ہیں شعور کے ارتقائی عمل سے مادے کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں علم الکائنات کی کتابوں میں ان کی تفصیلات مل سکتی ہیں۔ ان تفصیلات کے مطالعے سے جو دوسری بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مخلوق کی جس نوع میں صفاتِ حیاتیہ کی جتنی کمی ہے اتنی ہی وہ نوع فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے آزاد نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ خود فطرت نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر پودا اپنی خوراک کی تلاش میں چل پھر نہیں سکتا تو فطرت اس کی تمام غذائی ضروریات اسے موقعے پر ہی فراہم کر دیتی ہے۔ برگد کا بیج بہت سخت ہوتا ہے اور زمین کی عام گرمی اور نمی اس کو اس قابل نہیں بنا سکتی کہ اس میں سے پودا پھوٹے۔ کوّا برگد کے پھل کو کھا لیتا ہے اور پیٹ کے ذریعے برگد کے بیج کو اُگنے کے قابل بنا کر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ کوّے کے معدے کی حرارت اور نمی بیج کو اُگنے کی صلاحیت عطا کر دیتی ہے۔ ہوائیں اور آندھیاں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کتنے بیجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی رہتی ہیں۔ اسی طرح نر اور مادے کے زیرے (POLLEN) کا ملاپ بھی ہواؤں کے ذمہ ہے۔ کوئلے کو ہیرا بننے کے لئے جن مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے ان سب کا طے کرنا فطرت نے اپنے ذمے رکھا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیسے جیسے مخلوق کے شعور، ادراک اور احساس کی آنکھ کھلتی جاتی ہے اور وہ اپنی راہوں کو زیادہ آزادانہ طور پر دیکھ اور پہچان سکتی ہے ویسے ویسے فطرت اس مخلوق کی صلاحیت اور استعداد کی حد اور مقدار کے مطابق ذمہ داریاں اس کے سپرد کر کے خود پیچھے ہٹتی جاتی ہے بڑے بڑے پہاڑ بظاہر صفاتِ حیاتیہ سے عاری ہیں تو سونا چاندی اور دوسری معدنیات کو ہزاروں سال تک پرورش دیتے رہنے کا کام فطرت نے خود سنبھال رکھا ہے لیکن ننھی سی شہد کی مکھی اڑتی ہے پھر پھرا کر جہاں سے چاہے پھول پھول کا جیون رس جمع کرتی ہے اور سونے چاندی سے بھی زیادہ قیمتی امرت چند ہفتوں میں تیار کر لیتی ہے گویا جمادات سے لیکر انسان تک کی مخلوقات میں سے جو بھی اپنی صلاحیتوں کے بلوغ کی طرف بڑھ جاتا ہے فطرت اُسے اپنی مشفقانہ نگرانی کی گرفت سے آزاد کر دیتی ہے۔ ارتقا کا مطلب انواعِ مخلوق میں اضافے کرتے رہنا نہیں بلکہ شعور کو منتہائے کمال تک پہنچانا ہے۔

اشیائے فطرت کا ایک بار پھر مشاہدہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انواعِ مخلوق کی طبعی پرورش اور نشوونما کے بے نقص انتظامات کے ساتھ ساتھ ان کے لئے حفاظتی سامان کی فراہمی کا نظم و نسق بھی بطریقِ احسن جاری و ساری ہے، ہیرا تو خیر بڑی چیز ہے کوئلے جیسی معمولی چیز تک پہنچنے کے لئے بھی آپ کو سخت زہریلی گیس کے حصار میں سے گزرنا پڑے گا۔ مچھلی کو آپ بیچاری بے ضرر مخلوق کہہ کر نظر انداز کر دیں گے۔ لیکن دریا کی موجوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کھیلتی ہوئی اس ننھی سی جان کو ہاتھ لگا کر دیکھئے فوراً تیز نوکدار کانٹا آپ کے ہاتھ میں چبھ جائے گا۔ اور تو اور چیونٹی جیسی حقیر سی مخلوق بھی کاٹنے سے گریز نہ کرے گی۔ فطرت نے اپنی مخلوق کی ہر چیز کو اس کی ضروریات کے مطابق مسلح کر رکھا ہے۔ کسی کو تیز دانت، کسی کو نکیلے ناخن، کسی کو سینگ، کسی کو رفتار، کسی کو طاقتِ پرواز، کسی کو ڈنک، کسی کو زہر، غرض طرح طرح کے ہتھکنڈے رکھے ہیں جن کی مدد سے ہر مخلوق "زندگی" جیسی متاعِ بے بہا کی حفاظت کر کے اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کی طرف آگے بڑھا رہی ہے لیکن سوچئے کہ یہ عجیب بات نہیں کہ انسان کو اس قسم کا کوئی اسلحہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ اسے تو اپنے جسم کی پرورش کے لئے بھی جان مارنی پڑتی ہے یہ بیچارا زمین میں کئی کئی بار ہل چلاتا ہے، بیج بوتا ہے فصلوں کو پانی دیتا ہے، درخت اُگاتا ہے اور نجانے کیا کیا مشقتیں اٹھاتا ہے پھر کہیں جا کر اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ تمام طبعی اور مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اسے خود ہی محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ گرمی اور سردی سے بچاؤ کے لئے بھی فطرت نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے وہ انتہائی ناکافی ہے۔ مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھی نہ اس کے پاس ہاتھی کے سے بڑے بڑے دانت ہیں نہ شیر کے سے تیز پنجے ہیں۔ نہ بیلوں کے سے سینگ ہیں نہ سانپوں کا سا زہر ہے۔ نہ بچھوؤں اور بھڑوں کے سے ڈنک ہیں، نہ رفتار ہے، نہ پرواز ہے، نہ قوی ہیکل جسم ہے۔ گویا ظاہری اعتبار سے بالکل نہتا ہے۔ فطرت کے عطا کردہ کسی بھی ہتھیار سے مسلح نہیں ہے، لیکن اس انتہائی بے سامانی کے باوجود اس نے جنگل کے خونخوار درندوں پر اپنی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ زمین کے ہیبت ناک پہاڑ اس کی یلغار سے خوفزدہ ہیں۔ سمندر کی کوہ پیکر مخلوق اس کے خوف سے لرزہ براندام ہے۔ ہواؤں پر کنٹرول اسی کا ہے فضاؤں پر حکمرانی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اسی کی ہے۔ بلکہ اب تو خلاؤں میں بھی اسی کی طاقت اور قوتِ تسخیر کے چرچے ہیں۔ تو اب دنیا اس کی دہشت سے کانپ رہی ہے۔ آخر انسان کس اسلحے کے بل بوتے پر ہے؟ یقیناً کوئی ایسی چیز اس گوشت پوست کے وجود کے اندر موجود ہے جس کی عظمت کے آگے فطرت کی بڑی سے بڑی طاقت بھی سرنگوں ہے۔ قرآن حکیم کے بیان کردہ قصۂ آدم کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "آدم" کے اندر جونہی "نام رکھنے کی صلاحیت" بیدار ہوئی اور اس نے اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے تمام اشیاء کے نام بتا دیئے، تو ان تمام قوتوں نے جو اس کائنات کے نظام کو چلا رہی ہیں آدم کے آگے سجدہ کیا یعنی سرِ اطاعت خم کر دیا اور اس کی برتری اور فوقیت کو تسلیم کر لیا۔ علم اور اختیار کے آگے سرکش سے سرکش قوتیں بھی سربسجود ہونے پر مجبور ہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ جتنی اعلیٰ صلاحیتیں انسان کو عطا کی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اس کے علاوہ کسی اور مخلوق کو بھی دی گئی ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ اشیائے فطرت اور انسان کی صلاحیتوں میں ذرا بھر بھی اشتراک ہوتا تو اس سے تصادم پیدا ہو جاتا اور ارتقائے شعور کا عظیم پروگرام آگے نہ بڑھ سکتا۔ مثال کے طور پر انسان کو محدود اختیار اور ارادے کی جو صلاحیت عطا کی گئی ہے یہی صلاحیت ان طبعی قوتوں کو بھی عطا کر دی جاتی جو کائنات کے نظام کو چلا رہی ہیں تو ارتقا کا سارا نظام منتشر ہو کر رہ جاتا۔ گرمیوں کے موسم میں بجلی کو جسے آپ نے مسخر کر رکھا ہے، آپ کہتے: "پنکھا چلاؤ" تو وہ کہتی: "اب نہیں سردیوں میں چلاؤں گی۔" اختیار اور ارادے کے یکساں اشتراک سے فطرت کے سارے پروگرام ختم ہو جاتے۔

تسخیرِ فطرت اور ارتقائے شعور کے عمل کو جو انسانی صلاحیتیں پایۂ تکمیل تک پہنچا رہی ہیں وہ مجملاً چار ہیں:

۱۔ علم ۲۔ تفہیم و تعقل ۳۔ جذبات و احساسات اور ۴۔ اختیار و ارادہ۔ تاریخ اور تجربے دونوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اعلیٰ انسانی صلاحیتیں ایک طرف تو انسان کی طبعی نشوونما کے ضروری سامان مہیا کرتی ہیں اور دوسری طرف خود ان صلاحیتوں کے اندر استحکام اور ارتقا کے امکانات کو روشنی اور توانائی بخشتی ہیں۔ اگر یہ صلاحیتیں انسان کو حاصل نہ ہوتیں تو وہ بھی ملائکہ کی طرح یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ کی پابندی میں رہ کر مجبورِ محض ہوتا۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے وہ محدود آزادیٔ عمل اور اختیار و ارادے کا مالک ہے اور اسی وجہ سے ذمہ دار اور مستوجب جزا و سزا بھی ہے۔ اس لئے وہ باقی مخلوقاتِ عالم میں سے اشرف اور افضل ہے۔ علم اور تفہیم و تعقل کی صلاحیت نہ ہوتی تو پھر ہم "انسانی زندگی" اور "حیوانی زندگی" کے فرق و امتیاز کو بھی نہ سمجھ سکتے۔ ان تمام صلاحیتوں نے اسے "شخص" بنا دیا ہے۔ باقی مخلوقات محض "اشیاء" ہیں اشخاص نہیں کیونکہ شخصیت کی مذکورہ صلاحیتوں سے عاری ہیں۔ "شخص" کی زندگی محض سانس لے کر جیتے رہنے یا طبعی افعال سرانجام دیتے رہنے میں بڑا فرق ہے۔ مذکورہ صلاحیتوں کے استعمال سے انسان اپنے آپ کو "میں" کہنے کا حقدار بنتا ہے۔ چونکہ فطرت کی اور کسی مخلوق کے پاس یہ اعلیٰ صلاحیتیں نہیں ہیں لہٰذا ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو "میں" کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

جن خاص صلاحیتوں کو انسان کے سپرد کیا گیا ہے ان کے مجموعے کو بغرضِ تفہیم ہم جوہرِ انسانیت کہیں گے۔ وہ زندہ فعال اور باشعور "وجود" جو ان صلاحیتوں سے کام لے سکتا ہے اسے ہم سب لوگ "میں" کے عام فہم لفظ سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ متکلمین نے اس "وجود" کی ماہیت کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے بہت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نام مثلاً۔ انا، ایگو، مائینڈ، خودی، ذات، شخصیت، نفس وغیرہ وضع کئے ہیں۔ چونکہ کائنات کی کوئی اور "چیز" ہیں ہونے یعنی (۹۶، ۸۸-۸۴-۱) کی خصوصیات کی حامل نہیں ہے۔ اس لئے یہ اپنے افعال و اعمال میں نہ آزاد ہے اور نہ ان کے لئے ذمہ دار ٹھہرائی جا سکتی ہے۔ آزادی اور ذمہ داری صرف اسی وجود کو سونپی جا سکتی ہے جو اپنے آپ کو "میں" کہنے کا اہل ثابت کر سکے۔ اور یہ شرف اور امتیاز صرف انسان کو حاصل ہے!

"آفاق" پر غور و فکر ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں انفس کے مطالعہ سے کیا نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

انفس کے آئینے میں اپنے "اندر کے شخص" کے خدوخال پر ناقدانہ نظر ڈال کر خود ہی یہ فیصلہ کرنا کہ یہ "میں" کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں ہے، اپنی پہچان کا دوسرا طریقہ ہے۔ جوہر انسانیت کا عطیہ ازلی تو اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر بچے کو برابر مقدار میں اور بلا امتیاز رنگ و ملت ابن آدم ہونے کے ناطے سے ملتا ہے، لیکن اس کی تراش خراش نشو و ارتقا اور تزئین و آرائش کی ذمہ داری کا خود انسان کے سپرد کر دی گئی ہے۔ لہٰذا ہر لمحے اس کی بڑھتی یا گھٹتی ہوئی قدر و قیمت کا جائزہ لیتے رہنا بھی انسان ہی کے ذمے ہے۔ اسی جائزے سے ہر شخص اپنا مقام متعین کر سکتا ہے اور جہاں کہیں خرابی نظر آئے اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے۔ من کے اندر ڈوب کر زندگی کا سراغ پا لینے والے طریقے کو جس کے ذریعے حقیقت کبریٰ (خدا) اور حقیقت صغریٰ (انسان) کے باہمی تعلق کا ادراک بھی ہو جاتا ہے۔ تصوف، (MYSTICISM) باطنیت، اندرون بینی (INTROSPECTION)، روحانیت (SPIRITUALISM) وغیرہ کا نام دیا جاتا رہا ہے، قدیم زمانے سے لیکر آج تک مختلف مکاتب فکر نے مختلف انداز سے اس طریق خود احتسابی کو آگے بڑھایا ہے۔ یہاں تصوف کے ان تمام اسلامی یا غیر اسلامی طریقوں کا تفصیلی جائزہ تو نہیں لیا جا سکتا۔ تاہم چند حقائق ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن پر اکابر صوفیا متفق ہیں۔ اور جنہیں وہ مسلمات کے طور پر قبول کر کے اپنے فلسفے کی بنیاد بناتے ہیں۔ چنانچہ اہل تصوف کا فلسفہ جن خطوط پر چل کر اپنے "وجود" کا کھوج لگاتا اور کائنات میں اس کا مقام متعین کرتا ہے اس کا مختصر سا خاکہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ "وجود حقیقی" تو صرف اس عظیم ترین ہستی کو کہا جا سکتا ہے جو اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے زمان و مکان کی محتاج نہیں ہے۔ جو ابتدا میں بھی آپ ہے اور انتہا میں بھی، جو ظاہر بھی ہے باطن بھی ہے اور تمام صفات وجودیہ سے بدرجۂ اتم متصف ہے۔ صفات وجودیہ یہ ہیں۔

۱۔ حیات ۲۔ علم ۳۔ ارادہ ۴۔ قدرت ۵۔ سماعت ۶۔ بصارت اور ۷۔ کلام

ہستی مطلق میں یہ صفات وجودیہ بدرجۂ کمال اور بغیر حد و انتہا کے موجود ہیں کیونکہ یہ بے مثال، واحد اور لاشریک ہستی ان صفات کا ماخذ و سرچشمہ بھی ہے۔ جس کسی اور ہستی میں ان صفات میں سے کوئی ایک یا سب کی سب نظر آئیں گی تو وہ انہی کا عکس یا پرتو ہوں گی۔ اور محدود ناقص ہوں گی۔ ایسے وجود کو حقیقی وجود نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ امکانی وجود کہا جائیگا

چونکہ انسان کے اندر بھی یہ صفات بہت قلیل سی مقدار میں پائی جاتی ہیں اس لئے انسان ممکن الوجود ہے خدا کی صفات وجودیہ کے مقابلے میں انسانی صفات انتہائی ناقص، محدود اور نامکمل ہیں۔ اس لئے صوفیا نے انہیں صفات وجودیہ کی بجائے صفات عدمیہ کہا ہے اور تشریح یوں کی ہے کہ انسان کے پاس "حیات" کی صفت کی بجائے "ممات" کی صفت ہے، علم کے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

برعکس "جہل" ہے ، ارادے کی جگہ "اضطرار" ہے ۔ اختیار یا قدرت کے مقابلے میں "عجز" ہے ۔ سماعت' بصارت اور کلام کے برخلاف اس کے انداز "صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ" کی کیفیت ہے ۔ چنانچہ اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر جب اہلِ تصوف نے اپنی ممکنہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسان تو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے بھی خارجی سہاروں کا محتاج ہے ۔ اس کا جسم زمان و مکان کی مضبوط فصیلوں اور طبعی قوانین کی گرفت میں جکڑا ہوا ہے تو اس کا "اندر کا شخص" جسم کے ساتھ وابستہ ہے ۔ یہ اس کے وجود کا حال ہے ۔ وجود کی صفات کو دیکھا جائے تو جس "حیات" کو وہ باعثِ افتخار جانتا ہے وہ گردشِ دولابی کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ سو سال سے اوپر پہنچ ہو سکتی ہے جو زمانِ مسلسل کے ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہے ۔ اس کے "علم" کی حالت یہ ہے کہ موجودہ سائنسی دور کی انتہائی ترقی اور جدید طاقتور آلات کی مدد حاصل ہونے کے باوجود فطرت کے لاکھوں کروڑوں سربستہ رازوں کو ابھی تک منکشف نہیں کر سکا اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گا ۔ اگر کسی وقت ایسا کر بھی لے تو صرف "یہ کیا ہے ؟" کا سوال حل کر سکے گا ۔ "ایسا کیوں ہے" کا جواب اس کے ناقص عقل کی رسائی سے باہر ہے ۔ اس کے "ارادے" کی کمزوری اسی بات سے ظاہر ہے کہ یہ متلوّن مزاج مخلوق نہ تو کسی ارادے پر مستقل طور پر قائم رہتی ہے اور نہ اسے کما حقہ پورا کر سکتی ہے ۔ پھر اس کے ارادے بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ "اختیارات اور قدرت" تو اسے اتنا بھی حاصل نہیں کہ اپنے ہی کسی طبعی عمل مثلاً چھینک وغیرہ کو روک سکے ۔ اس کا ہر فعل اور عمل حالات کی گرفت میں رہتا ہے اور اس کی ناتوانیاں پیچ و تاب کھاتی رہتی ہیں ۔ "سماعت اور بصارت" میں فاصلے حائل ہیں ۔ کلام الفاظ کا محتاج ہے ۔ الفاظ صدیوں سے بنتے اور بگڑتے آ رہے ہیں ۔ مگر کوئی انسان آج تک ایک بھی زبان ایسی تیار نہیں کر سکا جو اس کے دل کی تمام کیفیات کا بھرپور اظہار کر سکے ۔ فصیح سے فصیح خطیب بھی ہاتھوں' آنکھوں اور جسم کی حرکات کی مدد سے کر کے اپنے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کہی باتیں دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہیں ۔ اپنے اندر جھانک کر دیکھنے والے صوفیا نے مزید غور و فکر کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کی تو کوئی چیز بھی اس کی اپنی نہیں ہے ۔ نہ حیات' نہ علم' نہ ارادہ' نہ اختیار و قدرت' نہ سماعت' نہ بصارت' نہ کلام ! پھر ہے کیا اس کے پاس ؟ کچھ بھی نہیں ! بالکل کچھ بھی نہیں ! ! صرف حیاتِ وجودیہ کی ہلکی سی جھلک ہے جسے وہ دھندلی سی شکل میں اپنے داخل اور خارج میں مشاہدہ کر رہا ہے ۔ پھر یہ ہلکی سی جھلک بھی اس کی اپنی نہیں' خالقِ اکبر کی بخشش ہے جسے وہ چند روزہ حیاتِ مستعار کے دوران استعمال کر سکتا ہے ۔ بالفاظِ دیگر انسان ہر اعتبار سے محتاج ہے ۔ درویش ہے ۔ دست نگر ہے منگتا ہے گداگر ہے فقیر ہے ! ــــــ اور وہ واجب الوجود جس نے صفاتِ وجودیہ میں سے کچھ ذرا بھر ہی سہی اسے عطا کر رکھی ہیں جس کی حیات میں وہ زندہ ہے ۔ جس کے علم کے نیرِ اعظم سے اس کی ٹمٹماتی ہوئی شمع روشن ہے جس کے ارادے' اختیار اور قدرت کی عظیم کامیابیوں سے اس کے فعل و عمل کو تحرک ملتا ہے جس کی سماعت' بصارت اور کلام کے اعجاز سے اس کے حواس اور اس کی فصاحتیں بلاغتیں بہرہ یاب ہوتی ہیں وہ دائم القائم لم یزل ہستی یقیناً "غنی" ہے لامحتاج ہے' صمد ہے' ما عطا کنندہ ہے' جواد الرحیم ہے' رحیم الکریم ہے کیونکہ کائنات کی ہر چیز اسی سے اپنی نشو و ارتقا کا سامان مانگتی ہے (۲۹ : ۵۵) مقامِ فکر کی اس تفہیم کے بعد صوفیائے کرام کو جب ذاتِ باری تعالیٰ کے غنی اور اپنے تہی دامن فقیر ہونے کا احساس

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یقین بن کر ذہن میں جاگزیں ہوگیا تو یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ بھی عارضی ہے۔ دینے والا جب چاہے اپنی عارضی طور پر دی ہوئی چیزیں واپس لے لیتا ہے۔ ایسی چیز جو عند الطلب واپس لے لی جائے عام فہم زبان میں امانت کہلاتی ہے، امانت ایک معاہدہ ہے جس میں طے پاتا ہے کہ

(الف) جس کو امانت سپرد کی جا رہی' وہ اس میں خیانت نہیں کرے گا۔

(ب) واپس طلب کرنے پر امانت میں دی ہوئی چیز جوں کی توں واپس کرے گا، تاہم اُسے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ

(ج) اسے استعمال میں لا سکے' لیکن امانت دینے والے کی مرضی اور حکم کے مطابق۔ امانت لینے والا اپنی مرضی سے اس میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور نہ ہی امانت میں لی ہوئی چیز کی بجائے کوئی اور چیز واپس کر سکتا ہے۔

(د) امانت دینے والے کو امانت لینے والے پر پورا اعتماد ہوتا ہے کہ یہ میری چیز کو خراب نہیں کرے گا بلکہ اس کی حفاظت کرے گا کیونکہ یہ صاحب شعور ہے' فہیم ہے' حساس ہے اور اس لائق ہے کہ اس پر پورے اعتماد کے ساتھ بھروسا کیا جا سکتا ہے

انسان نے جب اپنی صفات مستعار کو امانت کے اس مفہوم کی روشنی میں دیکھا تو اس کے دل میں اپنے قلاش اور تہی دامن ہونے کا جو ملال تھا وہ دور ہو گیا۔ اور اس کی جگہ احساسِ عظمت کی ایک ایسی کرن پیدا ہو گئی جس نے اس کے حوصلوں کو تابانی بخش دی۔ اور اس کے لئے علم کو نئی راہیں دکھا دیں۔ امانت کے مفہوم کا یہی تصور کہ باری تعالیٰ نے اپنی بیشمار مخلوقات میں سے صرف اُسے قابلِ اعتماد سمجھا ہے اس کی ہمت کے لئے مہمیز کا کام کر گیا۔ یہی ایک بات کہ وہ اللہ کا امین ہے اس کا معتمد علیہ ہے اور عطیاتِ ربانی کا محافظ ہے اس کے لئے شرف و امتیاز اور اعزاز و بلندی کا موجب بن گئی تو اس کریم نے تو اُسے اپنی صفاتِ حیاتیہ میں بحدِ امکاناتِ بشریہ شریک کر کے کائنات کی اعلیٰ مخلوق میں افضل و اشرف بنا دیا ہے چونکہ امانت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ امانت میں ملنے والی قیمتی صلاحیتوں کو استعمال میں لا سکتا ہے لہٰذا اس مفہوم نے اُس کے اندر اپنے آزاد ہونے کا تصور بھی پیدا کر دیا۔ اسی خیال کہ وہ امانت کے مفہوم کے مطابق خیانت نہیں کرے گا، امانت میں ملنے والی چیز میں بگاڑ پیدا نہیں کرے گا، بلکہ اس کی حفاظت کرے گا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں وہ اس کی حفاظت کر سکتا ہے وہاں وہ اسے بگاڑ بھی سکتا ہے۔ اس میں رد و بدل بھی کر سکتا ہے' خیانت بھی کر سکتا ہے۔ گویا یہ کرے یا وہ کرے اپنے فعل و عمل میں وہ آزاد ہے اتنا پابند نہیں جتنا وہ اپنے آپ کو سمجھتا رہا ہے آزادی کا یہ تصور پہلی بار اس کے ذہن میں اُبھرا تو اس کے دل میں اشرف المخلوق ہونے کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ فطرت کی کوئی ایک چیز بھی اختیار اور ارادے کی مالک نہیں' وہ وہی کچھ کرنے پر مجبور ہے جس کے کرنے کا اسے حکم دیا جاتا ہے اس کے ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ چونکہ وہ آزاد اور فعل مختار ہے اس لئے اپنے ہر فعل و عمل کے لئے جوابدہ بھی ہے آزادی ہمیشہ ذمہ داریاں بھی ساتھ لے کر آتی ہے۔ یہ دونوں نعمتیں صرف صاحبِ شخصیت وجود کو دی جا سکتی ہیں' چونکہ آزادی اور ذمہ داری اُسے معتمد علیہ ہونے کے باعث ملی ہے اس لئے وہ صاحبِ شخصیت ہستی ہے۔ اور ہر اعتبار سے "میں" کہلانے کی مستحق ہے۔ جبکہ اور کوئی مخلوق' خواہ وہ ارضی ہو یا سماوی اپنے آپ کو "میں" نہیں کہہ سکتی۔ لہٰذا بحیثیت صاحبِ انا شخص اور بحیثیت محافظِ اشیائے ربانی انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ امانت میں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ملنے والی چیزوں کو ان کے اصلی مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور امانت میں خیانت نہ کرے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ انفس کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے سے بھی ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں جس پر آفاق میں فکر و تدبر کرنے سے پہنچے تھے۔ انسان کے اندر صفاتِ حیاتیہ چونکہ محدود اور ناکمل ہیں۔ اس لئے بعض قدرے زیادہ حساس قسم کے لوگ اپنی اسی خامی کا خیال کر کے احساسِ کمتری اور یاس و ناامیدی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ جب انہیں آزادی اور ذمہ داری کا نور بھی دکھائی نہیں دیتا جو انائے فعال و زندہ کو حوصلے اور بلند ہمتی کی راہیں دکھاتا ہے اور وہ قنوطیت کے اندھیروں میں بھٹک جاتے ہیں۔ چنانچہ اکثر منکرینِ انفس و آفاق کی نشانیاں نہ دیکھ سکنے کے باعث اپنے وجود کا بھی انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اہلِ تصوف کے بعض مکاتبِ فکر کے ان دنیا کی بے ثباتی، ترکِ تعلقات، اپنی شخصیت سے انکار اور اس قسم کے منفی رجحانات کا اظہار بھی قنوطی اندازِ فکر کی بازگشت ہے جو دنیا کو قبول کرنے کی بجائے اسے رد کر دیتی ہے اور "میں" کو مارنے کا سبق سکھاتی ہے حالانکہ یہی "میں" تو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام ہے۔ جو انسان کو ساری کائنات میں افضل اور اشرف مقام حاصل کرتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ کوئی ایک "انا" کسی دوسری انا کے خلاف صف آرا نہ ہو بلکہ ان اشیائے فطرت کو مسخر کرنے پر کمربستہ رہے۔ جو اپنے آپ کو "میں" کہنے کا استحقاق نہیں رکھتیں۔

انفس کے مطالعے میں اگر احتیاط اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتے تو افراد کی عقل و فہم پر جذبات اور احساسات غالب آجاتے ہیں۔ اور پھر انسان اپنے آپ کو بھی جھٹلا دیتا ہے اپنے انسانی شرف کا بھی انکار کرنے لگ جاتا ہے افلاطون، مہاتما بدھ، عیسائی راہبوں اور موجودہ دور کے مشہور جرمن فلاسفر نطشے یاسیت کے بڑے علمبردار ہیں۔ نطشے کہتا ہے کہ "انسان ہی وہ حیوان ہے جو ہمیشہ سے اپنے وجود کو باعثِ ننگ و عار سمجھتا رہا ہے۔ انسان ناقابلِ علاج حد تک شائستگی پسند ہے اور اسی وجہ سے خارجی اشیاء بھی جیسی کہ یہ ہیں اس کو مطمئن نہیں کر سکتیں اور وہ اپنے آپ سے بھی جیسا کہ وہ ہے راضی نہیں رہتا۔ وہ دونوں کو خوب تر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ تمام حیوانات میں یہی ایک حیوان ایسا ہے جو اپنے آپ کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو اپنے اس مشاہدے پر حیران رہ جاتا ہے۔ یہی ایک حیوان ہے جو اپنی صورت کو آئینوں میں دیکھتا ہے خواہ یہ آئینے شیشے کے ہوں یا "ذہنی آئینے" ہوں جب وہ ان آئینوں میں جھانکتا ہے تو جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے اس سے وہ خوش نہیں ہوتا۔ لہٰذا خوش نہ ہونے کی بنا پر وہ تنقید کر سکتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بہتر بنا سکتا ہے۔" نطشے نے بات یہیں تک کہی ہوتی تو بھی کسی حد تک گوارا ہو سکتی تھی لیکن یاسیت کے غلبے نے اس سے ایسی بات کہلوا دی جس سے پوری انسانیت کی توہین ہوتی ہے۔ اپنی سوچ کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جب انسان اپنا اور دوسرے انسانوں کا مشاہدہ کرتا ہے، تو اسے ہر شخص بے تمیز، جاہل، غلط کار، بد وضع، بدتہذیب، غیر حساس، اچھے برے میں تمیز نہ کر سکنے والا، کند ذہن، کمزور، غیر صحت مند، احمق، غیر منظم، بے انصاف، خام سر، خود غرض، مصیبت زدہ اور انتہائی برا نظر آتا ہے اور یہی وہ کمزوریاں ہیں جو اس کی اپنی اور دوسروں کی خوشی کی راہ میں رکاوٹ بنی رہتی ہیں۔" نطشے کا یہ بیان کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ اس نے جن سلبی صفات کا ذکر کیا ہے ان پر یہ حکم بھی لگا دیا ہے کہ ان میں ہر انسان بلا استثناء ملوث ہے اور پوری نوعِ انسانی ایجابی صفات سے عاری ہے، اگر واقعی ایسا ہے تو ہم اضداد کے نہ ہونے سے اچھائی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کا تصور کہاں سے آیا؟ حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت میں دونوں امکانات موجود ہیں، امانت کو محفوظ رکھنے اور اسے بہتر بنانے کے بھی اور اس میں خیانت کرنے کے بھی۔ جوہر انسانیت کا غلط اور صحیح استعمال اس کے اپنے اختیار میں ہے "زندگی" کو قبول کر لینے والوں کی راہ میں کئی رکاوٹیں آئیں گی کیونکہ رکاوٹیں نہ آئیں تو جوہر انسانیت میں توانائی نہیں آسکتی۔ "زندگی" کو رد کر دینے والوں کو جد وجہد اور کش مکش حیات سے گریز کرنا اچھا لگتا ہے وہ اپنے جوہر کو آزمائشوں میں ڈال کر پرکھنا ہی نہیں چاہتے، فراریت میں پناہ لیتے ہیں اور اس طرح اپنے قیمتی اثاثے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

"انسانی ذات" کیا چیز ہے؟ کیا یہ مادے ہی کی کوئی صورت ہے یا اس سے الگ یا ماورا کوئی اور چیز ہے؟ ان سوالات کے ضمن میں بہت سے اہم نکات ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ مطالعۃ النفس ہی کے ذوق سے ایک نیا مضمون "نفسیات" کے نام سے پیدا ہوا جس نے تھوڑے سے عرصے ہی میں حیرت انگیز کامیابی اور مقبولیت حاصل کر لی۔ چونکہ اس علم کے ماہرین بھی بنیادی طور پر سائنسدان تھے۔ اس لئے ان کا طریق کار بھی تجربے اور مشاہدے تک محدود رہا اس کے علاوہ چونکہ اس کا نقطۂ نظر بھی مظاہر فطرت پر مرکوز تھا اور اس سے الگ ہونے پر تیار نہ ہوتا تھا اس لئے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کسی ماورائے فطرت وجود کا تصور ہمارے مطلب کا نہیں ہے چنانچہ انہوں نے اپنی تمام تر توجہات کو صرف محسوس حقائق تک محدود رکھا۔ تاہم جس بات کو انہوں نے یقین کی حد تک تسلیم کر لیا ہے یہ ہے کہ ذہن کے مشمولات غیر مربوط نہیں ہیں یہ سب "انا" یا "میں" کے گرد گھومتے ہیں۔ چنانچہ اس بنیاد پر انہوں نے انائے مشہود یا انائے تجربی (EMPIRICAL SELF) کا ایک نظریہ قائم کر لیا اور پھر اس تحقیق میں لگ گئے کہ یہ کس طرح وجود میں آتی ہے۔ چونکہ اس نظریے کے ساتھ استقرار اور دوام کا تصور وابستہ تھا اس لئے یہ تغیر (CHANGE) کے قائل تھے کسی (CHANGELESS) "غیر متبدل" ہستی کے ماننے پر تیار نہیں تھے اس لئے یہ نظریہ ترک کر دیا گیا۔

موجودہ علم نفسیات مختلف گوشوں میں بہت آگے بڑھ چکا ہے انا یا ذات (SELF) کے تصور کی بجائے شخصیت (PERSONALITY) کو اہمیت دی جا رہی ہے اور ماہرین نفسیات شخصیت کے ماخذ تلاش کرنے اور انہیں زیر مطالعہ لانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے بہت بڑا سوال یہ ہے کہ شخصیت کی نشو و نما کن عوامل سے ممکن ہے اور اس کے ٹوٹ پھوٹ کے اسباب کیا ہیں۔ یہ سوال لمحۂ موجود میں بہت زیادہ اہمیت اس لئے کر گیا ہے کہ آج دنیا کے کونے کونے کا نوجوان ذہنی انتشار اور قلبی اضطراب کا شکار ہو چکا ہے اور سکون و اطمینان کا متلاشی ہے۔ اہل مغرب کو یہ حقیقت بھولنی نہیں چاہیے تھی کہ جہان فکر و عمل میں صرف تغیر کی فرماں روائی ہوئی وہاں کسی پائیدار اور مستحکم حقیقت کا تصور کبھی قائم نہیں ہو سکے گا غیر مادی اور غیر مرئی حقیقتوں کو اوزان و مقادیر کے پیمانوں پر تولا اور ماپا نہیں جا سکتا۔ اگر شخصیت کو عارضی، وقتی یا لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتے رہنے والی کیفیت سمجھ لیا جائے یا جیسا کہ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ یہ کبھی واردات اور کیفیات کی مجتمع شدہ صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی شکست و ریخت ہو کر منتشر ہو جاتی ہے اور اسے غیر یقینی اور ناقابل اعتماد چیز سمجھ لیا جائے تو پھر انسان کے ہاتھ سے تو وہ بنیاد ہی نکل جائے گی جس پر کسی قابل عمل

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ضابطۂ اخلاق کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ انسان کو عارضی سہاروں کی بجائے ایسی مستحکم اور دوامی "ذات" کی ضرورت ہے جو اس کی ذہنی کیفیات میں موجود بھی رہے اور ان کیفیات یعنی واردات و احساسات وغیرہ کی اساس بھی بن سکے ذہنی عمل میں انسان کو اپنے "اندر کے وجود" کو اظہار کا موقع بھی ملتا ہے اور اس کا رُخ اُس حقیقتِ کبریٰ کی سمت بھی رہتا ہے۔ جو خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کے جاری و ساری ہونے کا انکار نہ سائنس کر سکتی ہے، نہ فلسفہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا عقلی اور تجرباتی علم کر سکتا ہے، عصرِ حاضر کا انسان محض اسی لئے سطحی زندگی گزار رہا ہے کہ اس سے اس کا اپنا وجود چھین لیا گیا ہے۔ یعنی اس کا علم، اس کی قوتِ تفہیم و تعقل، اس کا اختیار اور ارادہ اور اس کے جذبات و احساسات پر ایسے لاقوتر ادارے قابض اور متصرف ہو چکے ہیں جو گروہی مفادات سے الگ ہو کر کچھ سوچ سکتے ہی نہیں۔

انسان کے اندر کے شخص کے بارے میں ہمارے آج کے عقلی علوم یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی "وجود" (ENTITY) نہیں ہے بلکہ ایک ایسی غیر مرئی سی شئے ہے جسے ذہن کا خام مال کسی خاص نظم اور ترتیب میں لا کر بناڈالتا ہے انسان کی شدید جبلی خواہش اس کے طبعی رجحانات اور اس کی استعدادات وغیرہ ذہن کا خام مال ہیں یہ خواہش طبعی رجحانات اور استعدادیں عمر کے ابتدائی سالوں میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں اور کچھ عرصے کے بعد خاص نظم و ترتیب کے ساتھ متشکل ہو جاتی ہیں۔ گویا پانچ سال کی عمر میں ہی شخصیت کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے اس بنیاد پر مزید عمارت تعمیر کرنے کا کام طبعی اور معاشرتی عوامل کرتے ہیں۔

علم الاعضاء کے ماہرین کا خیال ہے کہ انڈوکرین غدودوں سے جو ہارمونز خارج ہوتے ہیں وہ شخصیت کی نشوونما کرنے اور اس کے افعال کو ہموار اور متوازن رکھنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس معاشرتی نفسیات کے ماہرین کی رائے ہے کہ شخصیت کی نشوونما میں سماجی ماحول کے عمل و دخل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اسی کے مثبت اور منفی روابط اور تصادمات کا مسلسل عمل ہی شخصیت کو نمو اور نمود عطا کرتا ہے بچہ اپنے مخصوص گروہی اصول و ضوابط اور سماجی قوانین کی پابندیوں کو داخلی لحاظ سے بھی اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے اور پھر انہی کی پیروی اور مطابقت میں اس کی زیادہ طاقتور جبلی خواہشیں (U R G E S)، اور محرکاتِ عمل ایک خاص نہج پہ ڈھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو بچے کا گروہ اسے ایک مخصوص کردار منصب عطا کر دیتا ہے جس کے مطابق اس کی صلاحیتیں آگے بڑھنا شروع کر دیتی ہیں۔ جب وہ اپنا یہ کردار کامیابی کے ساتھ ادا کرنے لگتا ہے تو اس کے رجحانات کو اسی نہج پہ پھلنے پھولنے کا موقع مل جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شخصیت کی تشکیل اور نشوونما میں معاشرے کا بڑا عمل دخل ہے تاہم عمرانیات کے ماہرین کا یہ فیصلہ درست نہیں ہے کہ بچہ اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں خود کوئی کردار ادا نہیں کرتا اور وہ بالکل غیر فعال رہتا ہے اگر یہ بچہ صرف "خاموش وصول کنندہ" ہی بنا رہتا اور جس مخصوص سانچے میں معاشرہ اُسے ڈھالنا چاہتا یہ چپکے سے اسی میں ڈھل جاتا، تو معاشرے کے تمام افراد شخصیت کے اعتبار سے بالکل ایک جیسے ہوتے۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ایک ہی معاشرے میں پرورش پانے کے باوجود کوئی بھی دو افراد' خواہ یہ باپ بیٹا یا سگے بھائی کیوں نہ ہوں' آج تک ایک جیسی شخصیت کے مالک نہیں ہوئے۔ اس ضمن میں تعلیمی نفسیات کے ماہرین حقیقت کے زیادہ قریب ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ شخصیت فرد کے اپنے ہی ردِ عمل کے نتیجے میں ابھرتی ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ندی کی روانی اور تندی و تیزی بلکہ یوں کہئے کہ اس کی قوت و شوکت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک کوئی چٹان اس کا راستہ روکنے کے لئے درمیان میں حائل نہ ہو جائے۔ کوئی بھی فرد خشک بے جان ریت بن کر سماجی اثرات کو جذب نہیں کرتا رہتا بلکہ ہر شخص عمل اور ردِ عمل کے ذریعے سے اپنی شخصیت کو ابھارتا رہتا ہے۔ اسے اپنی نشو و نما میں آپ ہی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں جسمانی ساخت اور دوسرے طبعی عوامل بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اور معاشرتی ماحول بھی اثر انداز ہوتا ہے' بلکہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ فرد کے تحفظات' اور زندگی کی ضروریات نیز شخصیت کو ابھارنے کے مواقع معاشرے کے تقاضے پورے کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

ماہرین نفسیات کے کسی بھی مکتبِ فکر کی طرف سے شخصیت کی جامع اور مانع تعریف ابھی تک پیش نہیں ہوئی' جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ عام طور پر جو کچھ کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "شخصیت" فرد کے تمام رویوں کی مجموعی صفت کا نام ہے' اس تعریف میں شخصیت کی علیحدہ وحدت اور اس کے پیچیدہ تنوع کے دونوں پہلو آجاتے ہیں۔ دراصل شخصیت ایک ایسی جامع الصفات چیز ہے جس کی احاطت سے کوئی تحریک' کوئی رجحان اور کوئی استعداد باہر رہ ہی نہیں سکتی۔

شخصیت کی ایک تعریف اس طرح بھی کی گئی ہے کہ یہ انسان کے قابلِ پیمائش خصائص اور محرکاتی لہروں کا ایک ایسا باہمی ربط و ضبط ہے جو طفولیت کی ابتدا سے ہی آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے مرورِ وقت کے ساتھ اس میں تیز رفتاری آجاتی ہے۔ بلوغ کی عمر میں پہنچ کر یہ اپنی تشکیل مکمل کر لیتا ہے' تاہم تشکیلی صورت مکمل ہو جانے کے بعد اس کی نشو و نما کے مراحل ختم نہیں ہو جاتے کیونکہ شخصیت ایک ایسی قابلِ اصلاح اور اثر پذیر چیز ہے جس میں انسان کے آخری دم تک خواہ شعوری خواہ بہت تعمیری یا تخریبی چھوٹی یا بڑی' تبدیلیاں ضرور ہوتی رہتی ہیں۔ خاص طور پر بیماری' ضعیفی' صدمات یا اعصابی اضمحلال کی وجہ سے نشو و نما کی بجائے انحطاط کا عمل معکوس بھی جاری ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پے در پے ناکامیاں' مایوسیاں' غیر یقینی حالات اور دوستوں کے بچھڑ جانے کے صدمات جو بے چینی اور عدمِ سکون کی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں' ان سے بھی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ شکستہ شخصیتوں کے معالجین کی تحقیقات یہ بھی بتاتی ہے کہ بعض شخصیتیں دوہری بلکہ تہری قسم کی بھی پائی جاتی ہے۔ ایسی شخصیتوں میں فکر' قول اور عمل تینوں میں تضادات ہوتے ہیں۔ ظاہر اور باطن میں اختلافات ہوتے ہیں۔ دوہرے' تہرے معیارات کی وجہ سے ایسی شخصیت کے حامل لوگ خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔

کیا یہ عجب بات نہیں ہے کہ اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی شخصیت کے بارے میں اہلِ مغرب کی طرف سے کوئی ٹھوس اور وقیع معلومات ہمارے سامنے نہیں آئیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا گیا ہے کہ شخصیت ایک تعمیری صورت ہے جسے اس کے مشمولہ عناصر کبھی اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ یوں بھی ہوتا ہے کہ یہ عناصر ایک مرکز پر جمع ہو کر پھر سے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

منتشر ہو جاتے ہیں۔ اہل فلسفہ میں سے وہ دانشور جو وجودیت کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں کسی ماورائی ذات کے وجود کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔ سائنسدان اور ماہرین نفسیات لیبارٹری سے باہر ایک قدم رکھنے کو تیار نہیں' ایک مکتب فکر جو اپنے آپ کو (LOGICAL POSITIVISTS) کہلاتا ہے (یعنی منطقی مثبت سوچ رکھنے والے مفکرین) اس بات کا قائل ہے کہ جو نظریہ یا تصور کسی تجربہ میں آ سکنے والی ٹھوس حقیقت سے نہیں ملایا جا سکتا وہ قابل اعتنا نہیں ہے۔ جو چیز تجربے میں نہیں لائی جا سکتی وہ کالعدم ہے' بات یہ ہے کہ یہ لوگ جس چیز کا تعاقب اپنے تجرباتی طریقوں سے کرتے ہیں وہ انہیں جل دے کر کہیں راستے ہی میں غائب ہو جاتی ہے اور یہ لوگ سانپ کی بجائے اس کی لکیر پیٹتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی اتنی متنوع' اتنی وسیع اور اتنی پیچیدہ ہے اور انسانی ذہن اس قدر گہرا اور پُر پیچ ہے کہ ہر محقق صرف اس کی اوپری سطح کا ہی مشاہدہ کر سکتا ہے "دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانڑے ہو" دل کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے' ہمارے زمانے کے دو بڑے مفکرین اور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ اور کارل ژونگ نے شخصیت کی گہرائیوں میں اتر کر بعض عوامل کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ لیکن ان کی تحقیق بھی بہت سے اسرار و رموز سے پردے نہیں اٹھا سکی۔

فرائڈ کے نظریات عالمگیر مقبولیت تو حاصل نہیں کر سکے تاہم ان کے بعض پہلو فکر انگیز ہیں۔ اصل میں اس محقق نے تعمیر شخصیت کے ضمن میں گھر کے اثرات و عوامل کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے اور بعض باتیں ایسی کہہ ڈالی ہیں، جنہیں سنجیدہ فکر کا کوئی آدمی بھی ماننے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ فرائڈ کا نظریہ مسئلے کے اس پہلو کو زیادہ نمایاں کرتا ہے' کہ ہم اپنی روایات' عقائد اور روز مرہ میں چلنے والے اصولوں اور ضابطوں کے ساتھ شدید وابستگی کیوں رکھتے ہیں جبکہ کبھی کبھی یہ رسوم و رواج ہمارے مفادات کے صریحاً خلاف ہوتے ہیں۔ یا عقل بھی انہیں فضول اور بے فائدہ کہتی ہے۔ عقیدوں کی اس طرح کی مضبوط گرفت کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ چونکہ بچے کی عقل ناپختہ اور غیر ترقی یافتہ ہوتی ہے اس لیے عقیدے اور رسوم و رواج نیز اخلاقی ضابطے عقل کے راستے سے نہیں بلکہ جذبات کے راستے سے داخل ہو کر بچے کے ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ فرائڈ کی یہ بات کسی حد تک تسلیم کی جا سکتی تھی لیکن اس کی جو توجیہہ اس نے پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اس توجیہہ کو اہل مغرب کے معاشرتی نظام سے اخذ کیا جا سکے تو کیا جائے دنیا کے دوسرے معاشروں سے اسے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کا کہنا یہ ہے کہ بچہ ماں اور باپ دونوں سے محبت کرتا ہے لیکن ماں کے ساتھ اس کی جو محبت ہے وہ ملکیتی قسم کی محبت ہے یعنی بچہ چاہتا ہے کہ ماں ہر وقت اس کے پاس رہے اور اس کی لحظہ بہ لحظہ پیدا ہوتے رہنے والی ہر ضرورت کو پورا کرتی رہے بچے کی اس محبت میں تمنائے زیست کا جنسی پہلو بھی شامل ہے گویا ماں بچے کی پہلی محبوبہ ہے اس کے برعکس باپ کے ساتھ اس کی محبت دوغلی قسم کی ہے جس میں خوف اور رقابت شامل ہیں بچہ محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے' کہ باپ اس کی پہلی محبت میں حائل ہو رہا ہے اور اس کی خواہشات کی تکمیل نہیں ہونے دیتا۔ رقابت کا یہ جذبہ نفرت میں بدل جاتا ہے۔ لیکن معاشرے کے قوانین و ضوابط اس کی نفرت کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے اس کے ردِ عمل میں موافق لو نا موافق

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دونوں قسم کے جذبات بڑی شدت کے ساتھ آپس میں متصادم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ ایک ہی شخص کے ساتھ بیک وقت محبت بھی کرتا ہے اور نفرت بھی کرتا ہے۔ عقلاً وہ ان متصادم کیفیات پر قابو نہیں پا سکتا کیونکہ اس کی عقل ابھی خام ہے جذبات بہت تیز اور طاقتور ہیں۔ معاشرے کی ناپسندیدگی اسے مجبور کر دیتی ہے۔ کہ وہ باپ کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات کو دبا دے، چنانچہ اس طرح لاشعور کی طرف پیچھے دھکیلے ہوئے جذبات اور ان کے ردِ عمل کی وجہ سے ابھرنے والے خیالات اسے ذہنی الجھنوں کا شکار بنا دیتے ہیں۔ فرائڈ اس الجھن کو ایڈی پس کمپلکس کہتا ہے اس کمپلکس کے نتیجے میں باپ کی صورت اور سماجی ضابطۂ اخلاق جس کے نفاذ میں باپ کا کردار ہی زیادہ نمایاں رہتا ہے دونوں لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں اور اس طرح ذہن ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے اس نئی صورت کو فرائڈ سپر ایگو کہتا ہے اور ہم عرفِ عام میں اسے ضمیر کہتے ہیں۔ فرائڈ کے خیال کے مطابق چونکہ انسان کو اوائل عمر سے ہی خوف سے مرعوب ہو کر باپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے اس لئے اب بڑی عمر کو پہنچ کر بھی وہ مجبور ہے کہ "ضمیر" کے احکام اور فیصلوں کی تعمیل بھی بغیر کسی عذر بہانے یا احتجاج کے کرتا چلا جائے۔ اگرچہ وہ محسوس کرتا ہے کہ ان احکام کا سرچشمہ اس کی اپنی ذات کے اندر نہیں بلکہ کہیں خارج میں ہے، پھر بھی وہ اپنے آپ کو عقائد، روایات اور "ضمیر" کی طاقتور گرفت سے آزاد نہیں کر سکتا اس کے وہ رجحانات جو ابتداءً باپ سے متعلق تھے اب "ضمیر" کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ گویا ضمیر، شعور کی طرف دھکیلی ہوئی باپ کی تصویر پر قائم ہوا ہے اور اب "باپ کا جبر" "ضمیر کا جبر" بن چکا ہے۔

فرائڈ کے اس نظریے پر بڑی تیز ابی تنقیدیں کی گئی ہیں۔ ان تمام تنقیدوں کو یہاں "احاطہ" بھی پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم صرف "انسانی ذات" کے بارے میں اہلِ مغرب کے نظریات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ فرائڈ کی یہ بات درست ہے کہ ماں کی گود ہی بچے کی اولین درسگاہ ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ انسانی ذات یا شخصیت کی تشکیل اور نشوونما میں گھر اور ماحول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم ہر ماں اور ہر باپ مشینی مصنوعات کی طرح ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بعض باپ اپنے بچوں سے ماں سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں اور بعض مائیں تند خو اور بدمزاج ہونے کی وجہ سے باپ سے بھی زیادہ سخت گیر ہوتی ہیں۔ اس سے بھی قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اکثر خاندان ایسے ملیں گے جن میں بچے پیدائش کے پہلے دن سے ہی اناؤں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اور ہر بچہ انا ہی کو ماں سمجھتا ہے۔ یورپ میں تو ہسپتال کی نرسیں ماں کا کردار ادا کر رہی ہیں، مشترکہ بود و باش کے قبیلوں میں صورتِ حال اور بھی مختلف ہوتی ہے۔ پھر خانہ بدوش کنبے بھی تو ہیں جو تپتے صحراؤں میں برفانی چوٹیوں پر اور دریاؤں اور سمندروں کی لہروں کے ساتھ رفاقت کے رشتے جوڑ کر عمریں گزار دیتے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں وہ حالات کبھی پیدا ہی نہیں ہوتے جن کو سامنے رکھ کر فرائڈ نے اپنے نظریات قائم کئے ہیں۔ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا کے بعض عظیم ترین انسانوں نے باپ یا ماں کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ عمرانیات کے دانشوروں کا کہنا یہ ہے کہ بچے کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل صرف ماں اور باپ کا ہاتھ ہی نہیں ہوتا بلکہ گھر کے دوسرے افراد مثلاً بھائی بہنیں قریب اور دور کے رشتہ دار، نانیاں، دادیاں، خالائیں، ماموں، چچے وغیرہ بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یوں سب کا گھریلو ماحول یقیناً مختلف سا ہے، لیکن باقی پانچ تہائی اشخاص میں گھر کی چار دیواری کے اندر ہی پورے کا پورا معاشرہ موجود رہتا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

بیگانوں کی طرح نہیں بلکہ اپنوں کی طرح۔ اپنے کیسے ہوتے ہیں اس بات کو یورپ والے نہیں جان سکتے۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بچے اور ماں کے درمیان محبت کا جو بے مثال رشتہ ہے اس کی ابتدا ہمیشہ ماں کی طرف سے ہوتی ہے بچے کی طرف سے نہیں ہوتی، پھر ماں کی محبت بے لوث ہوتی ہے جبکہ بچے کی محبت میں "ضروریات کی تسکین" کا عنصر شامل ہے جسے فرائڈ بھی تسلیم کرتا ہے اگر یہ بچے کی محبت تو جوابی محبت ہے، جبکہ ماں اور اس کے بعد بہن کی محبت کی تو کوئی مثال ہی پیش نہیں کی جا سکتی۔ بچہ اگر ماں سے محبت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ باپ سے یا گھر کے کسی دوسرے فرد سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی غلط ہے کہ اخلاقی ضوابط کی پابندیوں میں باپ کی بھی کا زیادہ عمل دخل ہے۔ باپ کو تو اندرون خانہ بہت کم چند لمحات ہی ملتے ہیں۔ آداب معاشرت، اخلاقی اصول و ضوابط چھوٹے بڑے کے ساتھ ادب، آداب، مروّت، رواداری، صبر، تحمل، میانہ روی، نشست و برخاست کے طور طریقے لباس اور طعام اور صفائی کے عادات وغیرہ ان سب کی تربیت خود فطرت ہی نے ماں کے سپرد کر رکھی ہے لہٰذا باپ کے ساتھ رقیبانہ جذبات کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرائڈ کے نظریات کی اساس ہی غلط ہے، اس پر اٹھائی ہوئی مزید عمارت کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے۔

فرائڈ نے انسانی ذات کے لیے انا، ذات اور شخصیت وغیرہ کے الفاظ استعمال نہیں کیے بلکہ ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے جسے وہ سائیکی (PSYCHE) کہتا ہے۔ اس کے نظریے کے مطابق انسان کے اندر دنیا میں یہی وہ پلیٹ فارم ہے جہاں بہت سے جبلی محرکات جمع ہو جاتے ہیں۔ سائیکی ان سب کی مشترکہ آماجگاہ بن جاتی ہے۔ پھر مختلف جبلی خواہشیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر آپس میں الجھ پڑتی ہیں تو سائیکی کے اندر میدان جنگ کی سی کشیدگی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی بہت ہی طاقتور خواہش پوری ہو گئی تو جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ خواہش پوری نہ ہوئی تو گرمجوشی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ خواہشات کو اکسانے اور بھڑکانے والی قوت کو فرائڈ لبیڈو (LIBIDO) کا نام دیتا ہے اس کا کہنا ہے کہ خواہشات کی تکمیل سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے یا ان کے جوش میں ٹھنڈک پڑ جانے سے آسودگی کا جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ اسی لبیڈو یا شہوانی قوت کا مطلوبہ انعام ہے، تاہم باہمی کشمکش کے اس ماحول میں جو سائیکی کے مشترکہ پلیٹ فارم پر پیدا ہو جاتا ہے، صرف شہوانی قوت ہی نہیں اور قوتیں بھی فعال بن جاتی ہیں جو کبھی شہوانی قوت کی مدد و معاون بن جاتی ہیں اور کبھی اس کی مخالفت پر ڈٹ جاتی ہیں۔ چونکہ شعور کا رابطہ اپنے ماحول سے براہ راست رہتا ہے اس لیے یہ سائیکی کی گہرائیوں میں جوش کھاتے رہنے والی خواہشوں اور ماحول کی سطح پر ابھرنے والی دوسری قوتوں کے درمیان ایک واسطہ سا بن جاتا ہے، یہ واسطہ جبلی خواہشوں کو پابند اور مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنی تسکین اور تکمیل کو مناسب وقت تک کے لیے ملتوی رکھیں اور ذرا انتظار کریں۔ ایسے موقع پر ایڈی پس کمپلیکس فعال ہو جاتا ہے اور سائیکی کے اندر سوئی ہوئی ایک تیسری قوت سپر ایغو کو بیدار کر دیتا ہے، سپر ایغو (SUPER-EGO) بڑی طاقتور قوت ہے۔ چونکہ یہ قوت معاشرے کے قوانین اور اصول و ضوابط کو بہت عزیز رکھتی ہے اس لیے یہ شہوانی جذبات کے لیے تسکین کے متبادل راستے ڈھونڈ نکالتی ہے سپر ایغو کے اس طرح متبادل راستے نکالنے کی وجہ سے شہوانی قوت کا رخ معاشرے کی پسندیدہ اور مرغوب چیزوں کی طرف پھر جاتا ہے، فرائڈ نے

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سبلی میشن (SUBLIMATION) یا لطافت کا نام دیا ہے۔

اس توضیح کی رو سے سائیکی کے گویا تین جزو سامنے آتے ہیں (۱) ایڈ (۲) ایغو اور (۳) سپر ایغو۔ پہلا جزو ایڈ جبلی خواہشات پر مبنی ہے، دوسرا جزو ایغو شعوری کیفیت کا نام ہے اور تیسرا جزو سپر ایغو جسے ایڈیپس کمپلکس ایغو کے کہنے پر جنم دیتا ہے معاشرتی اقدار و قوانین کا محافظ و پاسدار ہے۔ فرائڈ کے نظریات کے مطابق یہ آخری دو اجزاء شہوانی قوت کے اثر سے خالی ہیں۔ تاہم شہوانی قوت اتنی زبردست ہوتی ہے کہ آسانی سے فرو نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے اندر اتنی لچک ضرور موجود رہتی ہے کہ یہ اپنے اصلی ماخذ سے منقطع ہو کر کسی اور جذبے کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ لے۔ سپر ایغو اس کی لچک کا فائدہ اٹھاتا ہے اور اس بپھری سر زور قوت کو معاشرے کی پسندیدہ راہوں پر لگا دیتا ہے، چنانچہ ماضی اور حال کے تمام تمدنی آثار اور بنی نوع انسان کی اعلیٰ تہذیبیں، فرائڈ کے نقطہ نظر سے شہوانی جذبات کی لطافت کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی ہیں چونکہ جنسی آگ کسی طور بھی بجھائی نہیں جا سکتی اس لئے اس کی تسکین کی یہی صورت بہتر ہے کہ اسے تہذیب و تمدن کی تعمیر و تشکیل کے فریضے پر لگا دیا جائے اس کے علاوہ چونکہ یہ آگ اس وقت تک برابر جلتی رہے گی جب تک انسان اس کرۂ ارض پر موجود ہے اور مہذب معاشرے کی اقدار بھی ہمیشہ زندہ رہیں گی، اس لئے ان دونوں کے درمیان کشمکش بھی کبھی ختم نہ ہوگی، اس طرح تہذیب و تمدن متواتر آگے بڑھتے رہیں گے

یہ ہیں فرائڈ کے مفروضے جنہیں شروع شروع میں تو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی لیکن بعد کی تحقیقات اور غور و فکر نے اکثر و بیشتر رد کر دیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اول تو جبلی خواہشیں کئی ہیں۔ اور یہ سب کی سب تسکین چاہتی ہیں ان میں سے جنسی خواہش تو الگ کر کے اسے منفرد اور ممتاز مقام دے کر یہ کہنا کہ یہ سب سے طاقتور ہے درست نہیں فرائڈ جنسی خواہش کو بھوک اور پیاس کی طرح کی شدید ضرورت سمجھتا ہے۔ حالانکہ بھوک اور پیاس کی تسکین نہ ہو تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک تو صحت اور زیادہ اچھی ہو جاتی ہے۔ جنس محض تسلسل نسل کی خاطر ایک امکانی صلاحیت ہے جسے خواہش کا سا روپ عطا کر دیا گیا ہے۔ نہ یہ کوئی طاقتور جبلی جذبہ ہے نہ کوئی قوی خواہش ہے کہ جس کی تسکین نہ ہونے سے حیات و موت کی سی کش مکش پیدا ہو جائے۔ اور نہ ہی ایسا کوئی فطری رد عمل ہے جیسا کہ انتقام کی آگ یا غیظ و غضب وغیرہ جس پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو بے شمار انسانوں کی ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جنہوں نے جنسی قوت کو عمر بھر ضبط میں رکھا، اور انہیں کچھ بھی نہ ہوا۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا، جنس، خود کوئی خواہش نہیں ہے۔ بلکہ ذریعہ ہے دوسری خواہش کے پورا کرنے کا، یہ دوسری خواہش یعنی عائلی زندگی بسر کرنا اور گھر کے ذریعے جو معاشرے کا اولین بنیادی یونٹ ہے آداب معاشرت سیکھنا اور سکھانا تقاضائے ذاتِ انسانی کا ایک حصہ ہے اس لئے ضروری ہے لیکن صرف انہی کے لئے جو عائلی زندگی بسر کرنا چاہے یا اس کی استطاعت رکھتا ہو۔ گویا یہ دوسری خواہش جس کے تابع جنسی خواہش کو رکھا گیا ہے اختیاری ہے لازمی نہیں۔ جب اصل چیز ہی لازمی نہیں تو پھر فروعی چیز کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے! علاوہ ازیں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ بچے پیدا کرنے کی خواہش فطرتاً عورتوں کے دل میں زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ قدرت کے تقسیم کار کے نظام کے مطابق تربیتِ اطفال یعنی تشکیلِ انسانیت کے ابتدائی نازک مراحل کی نگہداشت کے لئے "آغوشِ مادر"

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے بہتر مدرسہ نہیں ہے۔ بلکہ فرائڈ کا نظریۂ جنسیات اس اہم نکتے کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

جنسی خواہش کے اندر ہیجان اور تلاطم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مادی آسودگی اور خوش حالی اس حد تک زیادہ ہو جائے کہ "جسم اور دماغ" دونوں کے کرنے کا کوئی کام ہی نہ ہو، زر و مال کی ریل پیل میں رزق کمانے کیلئے ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو، سامانِ عیش و عشرت کی فراوانی "جذبے کار" لوگوں کی طرف منتقل ہو جائے اور یہ قلیل افراد اپنی دولت کی بے پناہ قوت سے ہر قسم کی عیاشی کو خرید لینے پر قادر ہو جائیں۔ اس طرح کی اقتصادی ناہمواری دست نگر انسانوں کی عزت و آبرو کو لوٹ لیتی ہے۔ وہ بیچارہ شخص جو ہر شام اسی فکر میں پہلو بدل بدل کر گزار دے کہ آنے والی صبح کو وہ اپنے بچوں کے لئے سوکھی روٹی کے دو ٹکڑے کہاں سے لائے گا، تو وہ قسمت کا مارا جنسی خواہش کی تسکین کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہ جو جنسی خواہش کو بھوک بنا کر اور اسے پیٹ کی آگ کے مقابلے میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے تو یہ بھی اہلِ زر کی ایک مذموم سازش اور مکروہ چال ہے جو مجبور بے زر اور محروم انسانوں کی حمیت، غیرت اور عزتِ نفس کو ختم کرنے کیلئے تیار کی گئی ہے اس کا مقصد طبقاتی اونچ نیچ کے نظام کو مضبوط رکھنا ہے تاکہ طاقتور سرمایہ داروں کی عیاشی کے راستوں میں وہ نیچے طبقے کے رگ حائل نہ ہوں۔ جو ماؤں بیٹیوں کی عزت و ناموس کو بچانے کی خاطر جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ قوت زر کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینے پر غریبوں کو ذہناً آمادہ کر لینے کی یہ چال کتنی کامیاب ہو چکی ہے اس کا اندازہ گرد و پیش میں ہونے والے واقعات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ فرائڈ کے جنسی نظریات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے، متوسط گھرانوں تک پہنچانے اور بڑے پیمانے پر ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرنے میں سرمایہ داروں نے جو حصہ لیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، ہر زمانے کے قارون، ہامان اور فراعین کی مساوی الاضلاع مثلث ایسے ہی فکری اداروں کے آگے بڑھاتی رہی ہے۔ اسی مثلث نے مزدکیت اور قحبہ گری کے جواز کے فلسفے تراشے ہیں اور پھر اسی مثلث کے زر خرید کارندوں نے کئی کئی طریقوں سے ان فلسفوں کو خوشنما بنا بنا کر "گرفتارِ احتیاج" ذہنوں تک پہنچایا ہے۔

اہلِ مغرب "جنسی خواہش" کو طاقتور اور ناقابلِ تسخیر جذبہ ثابت کرنے کے لئے اسے حیوانی جبلت بھی قرار دیتے ہیں۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح حیوان اپنی جبلتوں کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے اسی طرح انسان بھی جو ایک قسم کا حیوان ہی ہے، جنسی جبلت کا غلام ہے تمادہ لوح نوجوانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے۔ کہ "حیوانیت" ناقابلِ تسخیر ہے۔ ہمارے نوجوان کتابوں کے صفحات سے باہر نکل کر ذرا حیوانی دنیا کا بچشم خود مشاہدہ کر لیں، تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ لاکھوں کروڑوں انواعِ حیوانات میں سے کوئی ایک بھی حیوانی مخلوق ایسی نہیں ہے جو جنسی بے راہ روی کی کسی صورت میں مرتکب ہوتی ہو۔ ہر حیوان ننھی سی مخلوق سے لے کر ہاتھی تک صرف اپنے فطری طور پر مقرر کردہ "وقت" (HEAT PERIOD) کے دوران جنسی عمل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس فطری وقت کے علاوہ مجال ہے جو کوئی سانڈ کسی مادہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔ انسان کو حیوان مان بھی لیا جائے تو بھی یہ عقل و شعور والا حیوان کہلائے گا۔ کیا فرائڈ اور اس کے ہمنوا اپنے آپ کو مقامِ انسانیت سے گرا کر اتنا نیچے لے جانا چاہتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیوان بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں؟

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بالفاظ دیگر تمنائے زیست کی بجائے آرزوئے مرگ ہمارے وجود کی بنیاد ہے اور زندگی کی انکاری خواہش ان تمام خواہشوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ جو سائیکی کے تہ خانوں میں پڑی ہوتی ہیں۔ اور اپنے اظہار کے مواقع کی تلاش میں رہتی ہیں۔ یہی دبی ہوئی لیکن طاقتور خواہش خود زندگی ہی کو اپنا حریف سمجھتی ہے۔

گوتم بدھ نے بھی زندگی کے بارے میں یہی کچھ کہا تھا اور تمام خواہشات کو کچل دینے کے ذریعے "نروان" حاصل کرنے کی تلقین کی تھی۔ نروان کے معنی کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری نے یہ دیئے ہیں۔

(EXTINCTION OF INDIVIDUALITY AND ABSORPTION INTO THE SUPREME SPIRIT)

یعنی "انفرادی تشخص کو مٹا دینا اور روح اعظم میں جذب ہو جانا"۔ ہندو فلسفے میں بھی یہی کہا گیا۔ یعنی پیدائشوں کے چکر یا زندگی کی مختلف صورتوں سے چھٹکارا پانے کی تمنا کی جاتی ہے۔ عین ممکن ہے فرائڈ نے شوپن ہاور کے فلسفہ قنوطیت سے متاثر ہو کر زندگی کی نفی کرنے والے خیالات کو اپنا لیا ہو اور پہلی سی بے سکون حالت کی طرف لوٹ جانے کے نظریے کو نفسیاتی الجھن بنا کر پیش کر دیا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ شعوری طور پر تو شاید ہم اپنی نشوونما کے لئے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر ہم اپنی فنا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مشہور ریاضی دان فیثا غورث نے یہی بات ایک مختلف انداز سے پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "زندگی" دائرے کی صورت میں گردش کرتی ہے اور اس طرح گردش کرتے کرتے بالآخر وہیں واپس آ جاتی ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہندو کے ان گردش چکر، نسواستیکا اور ایرانیوں کے اس گردش گردون گردان کے تصورات سب اسی "مدور زندگی" کے نظریے کی صدائے بازگشت ہیں۔ موجودہ زمانے کا مارکسی نظام بھی اسی دوری گردش کے مفروضے پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ نظریہ اسی کے گرد گھومتا ہے۔

زندگی اور انسانی ذات سے متعلق ان نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ دریافت کرنے میں حق بجانب ہیں کہ زندگی کے بارے میں ہمیں کیا عملی رویہ اختیار کرنا چاہیئے؟ زندگی کو قبول کر لینے کا، زندگی کو مسترد کر کے اس کے انکار کا؟ یا کسی ذمہ داری کو اپنے اوپر نہ لیتے ہوئے (NON-COMMITTAL) رویہ اختیار کرنا چاہیئے؟ انسان کے اندر صرف بقائے نوع کی حیوانی سطح کی خواہش ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ پاکیزہ، اعلیٰ اور ارفع "انسانی سطح" کی آرزو زندگی کو دوام اور ثبات دینے کی بھی ہے۔ جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے بہت سنجیدہ ہے۔ انسان صرف حیات کا تسلسل ہی نہیں چاہتا بلکہ اپنے علم و ادب کو تہذیبی ورثے کو تجربات اور تاثرات کو اور معلومات و اقدار کو آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کر کے دوام دینا چاہتا ہے۔ وہ تمنائے مرگ کو نہیں بلکہ آرزوئے زیست بلکہ دائمی زیست کو اپنے سینے میں لئے پھرتا ہے۔ وہ زندگی کے بحر بیکراں سے تو ہمکنار ہونا چاہتا ہے یا پھر اسی کی طرح بے کنار ہو جانے کا آرزومند ہے۔ یہ جذبہ اتنا قوی اور شدید ہے کہ اسے ان عقائد سے چمٹے رہنے پر بھی مجبور کرتا ہے جو زندگی کے دوام اور ثبات کے مقصد سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ "دوام و ثبات حیات" کے یہی عقائد اور مقاصد مرور وقت کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کی بنیاد بن جاتے ہیں۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اعلیٰ تہذیبوں کے بنیادی محرکات کو جبلی خواہشوں میں تلاش کرنا اُن عظیم ہستیوں کی توہین ہے جنہوں نے بے مثال قربانیاں دے کر انسانیت کو حسنِ عمل، طہارتِ فکر اور بلند اخلاق کی مستقل قدروں سے روشناس کرایا اور فنونِ لطیفہ کے ذریعے نوعِ انسانی کو نوعِ حیوانی سے ممتاز کر دکھایا۔ یہ اعلیٰ تہذیبیں، قدیم ہوں یا جدید، لاشعور کی طرف دھکیل دی گئی غیر تسکین یافتہ جبلتوں کی ممنونِ احسان نہیں ہیں۔ بلکہ حسن و جمال کی تلاش کے فطری رجحان کا نتیجہ ہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ تہذیبیں اس وقت ابھرتی ہیں جب کسی شعوری مجبوری اور جبلی خواہش کے درمیان تصادم پیدا ہو جائے۔ یہ جو آج ہم خلائی تسخیر اور کمپیوٹر عہد میں پہنچ چکے ہیں تو کیا یہ بھی جنسی خواہش اور معاشرتی مخالفت کے درمیان تصادم کا نتیجہ ہے۔ اگر بفرضِ محال کسی وقت بھی جبراً دبائی ہوئی جنسی خواہشات کا لاوا پھٹ پڑے تو کیا تہذیب و تمدن کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ رہے گی۔ کیا فرائڈ کے نزدیک عظیم الشان تہذیبوں کی بنیادیں اتنی کمزور ہیں؟ کیا انسان کے دل و دماغ کی اندرونی کشمکش ہی وہ قیمت ہے جو ہم اپنی گراں بہا تہذیب کے لئے ادا کر رہے ہیں؟ اگر معاشرتی پیچیدگیوں کے ہر اضافے سے اندرونی کشمکش میں تیزی آ جاتی ہے اور اس تیزی کے نتیجے میں، بقول فرائڈ، تہذیبیں اور زیادہ ابھرتی ہیں تو پھر تو ضروری ہے کہ معاشرتی مسائل کو اور زیادہ پیچیدہ بنایا جائے اور اگر کوئی حل سامنے آئے تو اسے بھی روک لیا جائے۔ تاکہ اندرونی کشمکش میں اضافہ ہو اور تہذیبیں اور زیادہ پھلیں پھولیں۔ کیا مغربی تہذیب کے یہی میں وہ عناصر جن پر اہلِ مغرب کو فخر ہے؟ انسان گناہ آلودہ "پیدا نہیں ہوا۔ جیسا کہ عیسائی مذہب کے مرتبین نے سمجھ رکھا ہے اور اس عقیدے کو بنیاد بنا کر کئی معاشرتی نظریے اور فلسفے پھیلا رکھے ہیں۔ انسان کی تخلیق احسنِ تقویم میں ہوئی ہے اور اسی وجہ سے جمال آفرینی اور خوب سے خوب تر کی تلاش اس کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔ حسن و جمال اور توازن و تناسب کے ساتھ پیمانِ وفا کا ازلی رشتہ صرف انسان ہی قائم کر سکتا ہے۔ اور اسی لئے وہ تہذیبوں کا خالق ہے۔ تہذیب اور تمدن کی اعلیٰ قدریں تولیدی نہیں تخلیقی ہیں۔ اور ان قدروں کو تحفظ دینے اور آگے بڑھانے کا عمل صرف اور صرف انسانی امکانات سے متعلق ہے اور کوئی مخلوق اس عمل کے لائق نہیں سمجھی گئی۔

سطورِ بالا میں اندرونی کشمکش کا ذکر آیا ہے تو فرائڈ کی بیان کردہ ایک اور ذہنی الجھن کا حال بھی سن لیجئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ یاسیت کے اکثر مبلغین، یعنی وہ لوگ جو زندگی کو "نو" کہتے ہیں یا اس کی نفی کرتے ہیں مثلاً گوتم بدھ اور افلاطون سے لے کر نطشے اور ژاں پال سارتر تک کے قنوطیت پسند فلسفی اسی الجھن کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ فرائڈ کہتا ہے کہ انسان ایک نامیاتی وجود ہے اس حیثیت سے اسے ورثے میں ایک اور الجھن بھی ملی ہے جو جنسی الجھن سے بھی زیادہ گہری ہے۔ جس قوت کو ہم جبلت کا نام دیتے ہیں درحقیقت وہ اُس حالت کی طرف واپس پلٹ جانے کا رجحان ہے کہ جس حالت میں ہم پیکرِ انسانی میں آنے سے پہلے رہتے تھے۔ زندہ نامیاتی وجود ہمیشہ ناپائیداری کی حالت میں رہتا ہے جبکہ غیر ذی حیات مادہ نسبتاً زیادہ پائیدار اور پرسکون ہوتا ہے۔ جب غیر ذی حیات مادے کو پہلی مرتبہ زندگی کی حرکت عطا ہوئی تو اس نے اپنی اس نئی غیر مستحکم، عارضی اور بے ثبات حالت کو پسند نہ کیا۔ اس کے اندر شدت کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ وہ پہلے کی سی پرسکون جامد و ساکن اور نسبتاً زیادہ پائیدار حالت کی طرف لوٹ جائے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک انسان نے جتنے بھی مذاہب اختیار کئے ہیں ان میں بدھ مت ہی وہ اکیلا مذہب ہے جس میں (ESCHATOLOGY) یعنی جزا سزا اور حیات بعد الممات کا تصور نہیں ہے حالانکہ یہی وہ تصور ہے جو جدید اور قدیم مذاہب میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور یہی وہ تصور ہے جو زندگی کو لیک کہتا ہے۔ اگر ہم یہ باور کر لیں کہ "ہم" جسم کی موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گے اور اس دنیا میں ہم اچھے برے جو کام بھی کرتے پھریں اس کی کوئی باز پرس نہ ہوگی تو ہماری زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی، اس کا نہ کوئی اصول ہوگا، نہ ضابطہ، نہ مقصد۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو بھی کوئی چیز کسی اصول ضابطے یا قانون کی پابند نہیں ہوتی یا کسی مقصد کو اپنے سامنے نہیں رکھتی وہ بے ہنگم، بد وضع، غیر متوازن اور ناپسندیدہ ہو جاتی ہے۔ ایسی ناپسندیدہ چیز کو لوگ پھینک دیتے ہیں۔ جزا سزا کا تصور زندگی کو اصول و ضوابط کا پابند بنا کر اسے حسن اور توازن و تناسب عطا کر دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی کو چند ماہ و سال کی مدت میں قید کر دینا زندگی کی توہین ہے۔ تسلسل حیات کا تصور ہی تو ہے جو شاعر کے تخیل کی بلند پروازی کو قوت و شوکت عطا کرتا ہے۔ جو فنکار کی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے اور جو لطیف اور نفیس قدروں کی تخلیق کے عمل کو نشوو ارتقا دیتا ہے۔

خود آگہی کی منزل کی طرف قدم اٹھانے والے باہمت مسافروں میں ایک نام کارل ژونگ کا بھی آتا ہے۔ یہ پہلے فرائڈ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ پھر دونوں کے نظریات میں اختلاف پیدا ہو گیا تو یہ اس سے الگ ہو گیا۔ اس کی تحقیقات کے نتائج کو بڑی وقعت دی جاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانی شخصیت بہت پیچیدہ نظام پر استوار ہے یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے اندر اور بہت سے چھوٹے چھوٹے نظام ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کام کرتے ہیں۔ "کشمکش" یا تو ان علیحدہ علیحدہ نظاموں کے اپنے اندر پیدا ہوتی ہے یا پھر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب یہ نظام آپس میں متصادم ہو جاتے ہیں۔ شخصیت کے بارے میں ژونگ کا نظریہ خاصہ طویل اور پیچیدہ ہے۔ تاہم اس کا وہ حصہ جو موجودہ دور کی اضطرابی کیفیت سے متعلق ہے دلچسپی سے خالی نہیں وہ کہتا ہے کہ تضادات کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض اوقات انسان کی شعوری خواہش کسی لاشعوری خواہش کے مخالف ہوتی ہے تو اس عدم موافقت سے بھی ذہنی کشمکش پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص شعوری طور پر دولت جمع کرنے کا خواہشمند ہے اور وہ اس خواہش کو پورا کرنے میں بہر تن مصروف بھی ہے۔ لیکن اس کے لاشعور میں فنکار بننے کی آرزو دفن ہے۔ تو وہ کروڑ پتی بن جانے پر بھی ناخوش رہے گا کیونکہ اس کے اندر کی تمنا پوری نہیں ہوئی۔ ژونگ کے نزدیک اس کشمکش کا علاج شخصیت کے اندر ہی موجود رہتا ہے۔ مریض کو کسی تحلیل نفسی وغیرہ جیسے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ شخصیت کے اندر کوئی ایسی ماورائی قوت ضرور موجود رہتی ہے جو مختلف اندرونی نظاموں کے متضاد عناصر میں صلح صفائی کرا دیتی ہے اور پھر اس صلح صفائی کے نتیجے میں انسان اپنی شخصیت کو جزوی تسکین کے راستے سے ہٹا کر اپنی من حیث الکل وحدت کو مکمل کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

چیست دین؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۵۔ "انسانی ذات" — قرآنی بصیرت کی روشنی میں

گذشتہ ابواب میں "انسانی ذات" کے لئے بہت سی اصطلاحات مثلاً آتما، سول، پرسنیلیٹی، روح، انا، ایغو، شخصیت وغیرہ سامنے آئی ہیں۔ نفسیات کی کتابوں میں معانی کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ انہی لفظوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ ہم نے آئندہ سطور میں "ذات" کے لفظ کو ترجیح دی ہے اول اس لئے کہ یہ لفظ قرآن حکیم کی جامع اصطلاح "نفس" کے زیادہ قریب ہے۔ دوسرا اس لئے کہ مذکورہ بالا تمام دوسری اصطلاحات سے ذہن میں ایک عارضی سے مظہر کا تصور ابھرتا ہے جو چند لمحوں کے لئے سامنے آکر پھر ہمیشہ کے لئے حقیقی دلائل کے خلاؤں میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنے وجود کے کوئی نشانات پیچھے نہیں چھوڑتا۔ وہ تصور جو غیر مستحکم اور ناپائیدار ہو نہ تو اخلاقیات کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد فراہم کر سکتا ہے اور نہ کسی ذمہ دار وجود کی کوئی واضح شکل اختیار کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسا عارضی تصور تو "اقدار" کی تخلیق میں بھی کوئی مددگار واسطہ نہیں بن سکتا۔ ہم نے قرآنی لفظ "نفس" کو بھی اختیار نہیں کیا کیونکہ زبان اردو میں اس کے عام معنے بعض مغالطوں کا باعث بن سکتے ہیں تاہم جہاں کہیں قرآنی مفہوم کے بیان کرنے کے لئے اس لفظ کا استعمال ناگزیر تھا۔ وہاں ہم نے یہ لفظ آزادانہ استعمال کیا ہے

جیسے ہم اردو زبان میں کہتے ہیں فلاں شخص صاحب اولاد ہے یا عقل والا ہے تو اسی طرح "صاحب" اور "والا" کے معنوں میں عربی زبان میں ذُوْ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مؤنث "ذات" آتی ہے۔ ذَاتَ الْيَمِيْنِ دائیں طرف اور ذَاتَ الشِّمَالِ بائیں طرف۔ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ کے معنے ہیں دلوں کے اندر کی باتیں۔ یعنی جو کچھ دل میں ہے۔ آپ دیکھا کہ ذات کوئی ایسی چیز نہیں جسے دیکھا یا چھوا جا سکے۔ لہٰذا آئندہ صفحات میں ہم اس بات پر بھی بحث نہیں کریں گے کہ ذات کیا چیز ہے۔ یہ ایک وجود تو ہے لیکن غیر مرئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ وجود یگانہ اور بالکل منفرد ہے۔ یعنی اس کی مثال کسی دوسری "چیز" سے نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا کسی منفرد اور بے مثال غیر مرئی وجود کے بارے میں کرید کرنا یا بحث کرنا کہ یہ کیا ہے یا کیسی ہے، غیر ضروری ہے۔ اس بحث کا نہ تو عملی دنیا میں کچھ فائدہ ہے اور نہ خود "ذات" کے تصور کے لئے سودمند ہے یا دنیائے معاملات کو کوئی فائدہ اس سے پہنچ سکتا ہے جہاں نام کی بجائے کام زیادہ ضروری ہے

قرآن حکیم میں خدا کی "ذات" کے لئے اللہ کا لفظ استعمال ہوا۔ اس کے معنے ہیں وہ بلند و بالا وجود جو انسانی حواس سے پوشیدہ ہے۔ جو یگانہ اور بے مثال ہے، جس کی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل و ادراک حیران رہ جاتے ہیں۔ جس کی بے چون و چرا اطاعت کائنات کی ساری مخلوق کر رہی ہے جس کے اقتدار کی فرمانروائی ذرّے ذرّے پر چھائی ہوئی ہے ہم اس "ذات" کی کنہہ، ماہیت یا کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے کیونکہ کوئی محدود FINITE کسی لا محدود

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

INFINITE کا ادراک کر ہی نہیں سکتا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے اندر اپنی جن صفات کا ذکر کیا ہے ان کی مدد سے اپنی ذہنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس ذات بے مثال کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

سورۂ اخلاص میں (۱ تا ۴) اور بعض دوسرے مقامات پر ذاتِ باری تعالیٰ کے صفاتی نام آتے ہیں۔ ان پر غور و فکر کرنے سے ایسی صفات بھی سامنے آتی ہیں جو "ذات" کی خصوصیات کو بیان کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر اعتبار سے مکمل، اتم، بے عیب اور بے نقص ہے۔ تاہم اس نے "ذات" کی کچھ خصوصیات انسان کو بھی بحیثیت بشریت عطا کر دی ہیں۔ بصیرتِ قرآنی کی روشنی میں "ذات" کی جو خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

اوّل: چونکہ ذاتِ کبریا کی بعض صفات کا کچھ نہ کچھ پرتو انسانی ذات کے اندر بھی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "ذات" ناپائیدار اور غیر مستحکم نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں قیام اور ثبات ہے۔ آسان زبان میں یوں کہا جائے گا کہ "ذات" اپنی حیات کے تمام مراحل اور مدارج میں اپنی شناخت کو برقرار رکھتی ہے۔ جن آزمائشوں میں سے اسے گزرنا پڑتا ہے یا جن طاقتور مؤثرات سے اس کا واسطہ رہتا ہے وہ اس کی تراش خراش اور آراستگی و پیراستگی تو کرتے رہتے ہیں لیکن جو کچھ یہ ہے اسے اس سے مختلف نہیں بنا سکتے۔ "ذات" بدستور ذات ہی رہتی ہے کچھ اور نہیں بن جاتی۔

واضح رہے کہ "ذات" اپنا سفرِ حیات غیر ارتقا یافتہ شکل میں شروع کرتی ہے اسے نشوونما ارتقا کی بہت سی صلاحیتیں دی گئی ہیں، ان صلاحیتوں کو ابھرنے اور تکمیل تک پہنچنے کے مواقع فراہم کرنے کے لئے بھی اس کے سامنے "امکانات" کے بیشمار میدان موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ اختیار بھی دے دیا گیا ہے کہ چاہے تو یہ اپنی ممکنہ صلاحیتوں کو مشہود کرے اور چاہے تو ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے۔ اور انہیں ضائع کر دے۔ "ذات" اپنی صلاحیتوں کو مشہود نہ بھی بنائے تو بھی اس کی اپنی ہستی فنا نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ "ذات" کوئی بے حرکت، جامد، ساکن یا غیر فعال خام مسالہ نہیں ہے کہ خارجی قوتیں جس طرح چاہیں اسے ڈھال لیں کسی سانچے میں ڈھل جانے کو قبول کرے یا نہ کرے اس کا فیصلہ کرنا بھی اس کے اپنے اختیار میں ہے حرکت اور فعالیت "ذات" کی فطرت ہے اس کی اصل صفت کو جسم کی موت بھی ختم نہیں کر سکتی کیونکہ ذات جسم یا مادے کی پیداوار نہیں ہے اور نہ ہی مادے کی کوئی ترقی یافتہ صورت ہے یہ جسم سے اس طرح وابستہ ہے جس طرح کوئی ایکٹر سٹیج سے یا کوئی معمار سامانِ تعمیر سے وابستہ ہوتا ہے سٹیج نہ ہو تو ایکٹر اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا لیکن خود قائم رہتا ہے سامانِ تعمیر نہ ہو تو معمار اپنا ہنر نہیں ظاہر کر سکتا مگر خود موجود رہتا ہے۔ اسی طرح جسم کے مر جانے سے "ذات" صرف سامانِ فعالیت سے محروم ہو جاتی خود نہیں مر جاتی۔ موت صرف جسم پر وارد ہو سکتی ہے، ذات پر نہیں، لہٰذا موت کو ہم ذات کے ارتقائی سفر کا ایک مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔

"ذات" کی دوسری خصوصیت اس کی آزادی اور فعل مختاری ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ناقابلِ انتقال ہے یہ اگرچہ کون و مکان کی محدودیت کے اندر رہ کر سرگرم عمل رہتی ہے تاہم اس کی فعالیت کا سرچشمہ اس کے وجود کے اندر ہی واقع ہے۔ کیونکہ فطرت کے اسباب و علل اس کے افعال کو متعین نہیں کرتے اگرچہ کسی حد تک ان پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ اگر ذات فعل مختار نہ ہوتی تو یہ اخلاقیات کے لئے واسطہ یا محمول (MEDIUM) نہیں بن سکتی تھی۔ اگر ذات اپنے ہر فعل اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عمل پر مجبور ہو تو فرائض اور ذمہ داریوں سے عائد کرنے، قبول کرنے اور پورا کرنے یا نہ کرنے کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہ جاتا، "ذات" کی ذمہ داری اس کے اختیار اور آزاد ارادے کی وجہ سے ہے۔ یہ اپنے عمل کا جو بھی راستہ اختیار کرے اسے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ شیر گھاس کھانا چاہے یا بکری گوشت کھانا چاہے تو جبلت کا جبران کا راستہ روک لیگا لیکن انسان کا راستہ روکنے والا ایسا کوئی جبر موجود نہیں ہے۔ البتہ راستے کے انتخاب میں بہت سے عناصر اسکی مدد کرتے ہیں۔ ان عناصر میں مشکلات کا جائزہ لینا، اچھے اور برے نتائج کا سامنے آنا اور سود و زیاں کے معیارات وغیرہ شامل ہیں۔

"انسانی ذات" کی آزادی مطلق نہیں محدود ہے اسے اپنے ماحول، مخصوص حالات اور چند طبعی شرائط کے ماتحت رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ٹھوس حقائق کی دنیا اس کے اعمال کے راستوں میں مختلف طریقوں سے مختلف مدارج و مراحل میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہتی ہے۔ "ذات" اگر اپنے انتخاب اور فیصلے پر قائم رہ کر ان رکاوٹوں کی پروا نہ کرے اور متصادم قوتوں سے بنجر آزما ہو جائے تو اس میں پہلے سے کہیں زیادہ توانائی، مضبوطی اور استحکام آجاتا ہے لہٰذا اس کے اس طرح توانا، شستہ و رفتہ اور مضبوط و مستحکم ہو جانے کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نشوونما اور ترقی کا دار و مدار اسکی آزادیٔ عمل پر ہے۔ جس کسی معاشرے میں "جبر" پر اصرار کیا جائیگا یا ذات کی آزادیٔ عمل میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں گی اس معاشرے کے افراد کی "ذات" میں کبھی کھار اور ابھار پیدا نہ ہو سکے گا یہ سکڑی سمٹی رہ جائے گی۔ وہ معاشرہ جو "ذات" کی خود اظہاری (SELF EXPRESSION) اور خود ذات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے یا اس کی فعالیت کی راہ مسدود کر دیتا ہے یا آزادی کو روکنے کے لئے بہت زیادہ تحدیدی حربے استعمال کرتا ہے وہ ذات کے نشوونما کی رفتار کو سست بنا دیتا ہے۔ وہ "ذات" جو آگے بڑھ سکے، خام اور غیر ارتقائی رہ جائے یا شگفتہ نہ ہو سکے تو وہ مرجھا جائیگی ضعیف اور ناتواں رہ جائے گی اور ضعیف و ناتواں "ذات" کوئی نمایاں اور قابل قدر کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ "ذات" کی شگفتگی سے مراد فکر کی پاکیزگی اور بلندی ہے اعلیٰ مقاصد کی تخلیق ہے اور پسندیدہ اعمال و اطوار کی "از خود روانی" ہے۔ "ذات" کی آزادی مسدود ہو جائے تو تخلیق فکر اور پاکیزہ اطوار و عادات کا بہاؤ دونوں رک جاتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں مملکت (STATE) کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ اس ادارے کا منصب یہ ہے کہ یہ اپنے ہر فرد کی "ذات" کو نشوونما پانے کے بھرپور مواقع فراہم کرے۔ لیکن اب یہ ادارہ انسانی ذات کی نشوونما میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس ادارے کا نظم و نسق محدود نظریات کی حامل اور چند خاص مقاصد لے کر آنے والی سیاسی پارٹیوں کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس ادارے کے پاس ذہنی تطہیر، پراپیگنڈا اور مختصر لیکن تیز کاٹ رکھنے والے جملوں کے نعرے اور اس قسم کے جدید اور انتہائی موثر ہتھیار موجود ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات اور "لکھے ہوئے الفاظ" (WRITTEN WORD) کی ایمائیت (SUGGESTION) اتنی تیز اور طاقتور ہو چکی ہے کہ افراد کی اپنی سوچ مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ سوچنا محنت طلب کام ہے۔ جب تیار شدہ سوچ ہمارے اہل فکر نوجوانوں کے سامنے آجاتی ہے تو مزید غور و فکر کرنے یا اس کے اچھے اور برے نتائج کا جائزہ لینے کی بجائے ہمارے نوجوان اسی تیار شدہ (READY-MADE) سوچ کو ہی قبول کر لیتے ہیں۔ مملکت اور پبلسٹی کے دوسرے ادارے نوجوانوں کی اس کمزوری

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

کا خوب خاطر خواہ اثاثہ تھیں۔ جب سوچ فالج زدہ ہو کر مستعار بیساکھیوں کے سہارے چلنے لگے تو فکری تخلیق ممکن ہے اور نہ اخلاقِ حسنہ کا جمال پیدا ہو سکتا ہے۔ ماضی میں یہ صورت بہت کم پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ اسلامی مملکت میں تو رائے کی آزادی اور اظہار اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ ایک بدوی بھی بھرے دربار خلیفۂ وقت سے بازپرس کر سکتا تھا۔ آج انسان کے ظاہری اعمال ہی کو نہیں بلکہ دل کے اندر پیدا ہونے والے خیالات تک کو مملکت نے اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے۔ "انسانی ذات" جسے تخلیقِ فکر میں آزاد ہونا چاہیئے افکار و تخیل کی گدائی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کسی فرد کو بھی اپنی خودی تک رسائی حاصل نہیں رہی۔ کمپیوٹر کے خودکار عہد میں "خودی" کا تو اور بھی زیادہ لنگڑا لولا ہو جانا صاف نظر آ رہا ہے!

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مطلقاً "آزاد" ذات صرف اللہ کی ہے جو زمان اور مکان کی بھی خالق ہے۔ انسانی ذات مطلقاً آزاد تو ہو نہیں سکتی کیونکہ اسے زمان و مکان کی حدود کے اندر رہ کر کام کرنا ہوتا ہے تاہم اس کی خلاقیت کو ایک میدانِ عمل ضرور ملنا چاہیئے جس کے اندر رہ کر یہ اپنی تگ و تاز کے جوہر دکھا سکے۔ قرآن حکیم نے یہ میدان "مستقل قدروں" کی شکل میں اس کے سامنے کھول رکھا ہے۔ یہ دائم، قائم اور محکم قدریں کسی خاص مکتبِ فکر، کسی خاص طبقہ، کسی خاص علاقے یا قومیت یا نسل یا زمانے کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ ہر زمان اور ہر مکان کے انسانوں کے لئے ہیں۔ ان قدروں کے حصار کے اندر رہ کر "انسانی ذات" آزادی سے بھی ہمکنار ہو سکتی ہے اور اپنی نشوونما کی جدّ و جہد کو بھی ارتقا کی مکمل حد تک لے جا سکتی ہے۔ لہذا "ذات" کی تیسری خصوصیت آگے بڑھنے اور بلند سے بلند تر درجۂ ارتقا طے کرتے چلے جانے کی صلاحیت ہے۔ وجود کی بلند سطحیں کیا ہیں ان کا بیان قرآن حکیم نے علامات کے ذریعے کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم زمان و مکان میں گھری ہوئی موجودہ سطحِ زندگی پر، وجود کی آئندہ بلندیوں کا ادراک نہیں کر سکتے۔

"ذات" کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ صرف یہی قدروں کی آشنا اور شناسا ہو سکتی ہے۔ انسان کے علاوہ جتنی بھی مخلوق ہے، وہ اس خصوصیت سے عاری ہے کیونکہ اسے علم، تفہیم، اختیار اور ارادہ اور جذبات و احساسات نہیں دیئے گئے۔ تاہم انسانی ذات کے اندر بھی اقدار کو جاننے اور پہچاننے کے مدارج ہیں یعنی یہ صفت مختلف انسانوں میں ان کی ذات کے درجۂ استحکام اور مرتبۂ ارتقا کے مطابق کم و بیش ہو سکتی ہے۔ جب ذات بلند قدروں کو اپنا لیتی ہے تو اسے تسکین و اطمینان کا کیف و سرور نصیب ہوتا ہے پھر یہ اور زیادہ فرحت حاصل کرنے کے لئے بلند تر اقدار کی بلندیوں کی طرف چل پڑتی ہے اور اس طرح خوب سے خوب تر کی تلاش اس کے عزائم کو اور متحرک و بیدار رکھتی ہے۔

"ذات" کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے عروج و زوال اور استحکام و اضمحلال کا دار و مدار کلیتًہ اس کے اپنے سعی و عمل پر ہے۔ دوسرے لوگ مثلاً بھائی، دوست، والدین، اساتذہ، بزرگ اور معاشرے کے عام افراد صرف سازگار اور موافق و سازگار ماحول مہیا کر سکتے ہیں، نشیب و فراز سے آگاہی دے سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ دانا اور تجربہ کار طبیب کی طرح پرہیز اور دوا تجویز کر سکتے ہیں لیکن دوا بھی مریض کو خود پینی ہوگی، اور پرہیز بھی خود کرنی ہوگی۔ یہاں ایک نکتہ یہ ذہن میں رکھ لینا چاہیئے کہ انسانی جسم پر موت اس وقت طاری ہوتی ہے، جب یہ "حیات بخش دوا" کی تاثیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ ورنہ "دوا" کے صحت بخش اثرات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ "ذات" کی نشوونما کا دار و مدار بھی اس کی اپنی قبولیت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی صلاحیت پر ہے۔ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق اس کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے یہ سعی و عمل کرتا ہے (۴۲:۴۷) حسن و خوبی پیدا کرنے والے اعمال سے اس کی توانائی اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور برے اعمال جن سے معاشرے اور فطرت کے حسن و توازن میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اسے کمزور اور نڈھال بنا دیتے ہیں۔ چونکہ اثرات قبول کرنے یا نہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری اس کی اپنی ہے۔ اس لئے خارجی عوامل اور موانع اس پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتے اسی وجہ سے یہ اپنے افعال اور اعمال کے لئے جوابدہ بھی ہے۔

• ذاتِ انسانی" کی چھٹی اور آخری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر صفاتِ ربانی کے جذب اور منعکس کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چونکہ یہ فطرتاً متحرک اور فعال ہے اس لئے اس کی فعالیت کے سامنے یہی مقصد رہتا ہے کہ یہ باری تعالے کی کمال اور مثالی صفات کو مشہود کرتی رہے اور اس طرح ذاتِ کبریا سے قریب تر ہوتی چلی جائے' اسی کو قربِ الٰہی کہا جائے گا' یہ قرب زمان و مکان کے معنوں میں نہیں بلکہ صفاتی ہم آہنگی اور ہم رنگی کے معنوں میں ہے صفاتِ ربانی " انسانی ذات" کی جدوجہد اور ارتقا کی طرف بڑھنے کے سعی و عمل کے لئے معیارات بن جاتی ہیں۔" ذات" جس قدران صفات کو اپنے اندر جذب کرتی جائے گی اتنی ہی وہ زیادہ حقیقی (۸۴:۸۷) بنتی چلی جائے گی' صفات کے جذب کرلینے کا دوسرا نام عبودیت یا اطاعت ہے۔

اگر صفاتِ ربانی کو ہم نور سے تشبیہہ دیں تو اس نور کو اپنے اندر جذب کرلینے کی صلاحیت اس ساری کائنات میں صرف ایسی مخلوق کو دی جاسکتی ہے جو نہ صرف اختیار اور ارادے کی مالک ہو بلکہ انجذابِ نور کے مفہوم کو بھی سمجھتی ہو۔ کائنات میں آپ کو دو طرح کی مخلوق کا علم ہو سکتا ہے۔ ایک وہ جو پتھر کی سی کیفیت والی مخلوقات ہے اور دوسری وہ جو دکھی نہیں جاسکتی کیونکہ یہ شیشے کی طرح کی لطیف مخلوقات ہے۔ پتھر جیسی مخلوقات میں جمادات' نباتات اور حیوانات شامل ہیں۔ پہلی قسم کی مخلوقات اتنی کثیف ہے کہ صفاتِ ربانی کے نور کی کرنیں ان سے ٹکرا کر رہ جاتی ہیں' نہ ان کے اندر جاسکتی ہیں اور نہ منعکس ہوسکتی ہیں۔ دوسری قسم کی مخلوقات اتنی زیادہ شفاف ہے کہ یہ شعاعیں ان کے پار نکل جاتی ہیں گویا شیشہ انہیں اپنے اندر روک نہیں سکتا اور پتھر کی کثافت اتنی زیادہ بستہ اور پیوستہ ہے کہ اس میں نور کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ پس ضروری تھا کہ شیشے کی پشت پر زنگار کی ہلکی سی تہہ چڑھا دی جائے تاکہ یہ آئینہ بن کر نور کی شعاعوں کو جذب اور منعکس کرسکے۔" انسانی ذات" جسے ذاتِ کبریا نے اپنی روح کہہ کر پکارا ہے اپنی لطافت کی وجہ سے شیشے کی مثال ہے۔ اور انسانی جسم اپنی کثافت کی بنا پر زنگار کی مانند ہے۔ ان دونوں کے امتزاج نے آئینۂ دل تیار کر کے لقائے رب کے دیدار کو ممکن بنا دیا۔ اسی مثال کو آگے بڑھائیے۔ شیشہ جتنا زیادہ صاف' شفاف اور بلوریں ہوگا اور زنگار کی تہہ جتنی ہلکی سے ہلکی اور ہموار اور متوازن اس پر چڑھے گی آئینہ اتنا ہی زیادہ عمدہ اور اعلیٰ درجے کا ہوگا۔

اس مثال میں شیشہ بے جان چیز ہے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اپنے اجزائے ترکیبی کو زیادہ شفاف اور پاک صاف بنا سکے لیکن" ذاتِ انسانی" زندہ اور فعال وجود ہے اس کے اندر یہ صلاحیت بدرجۂ اتم رکھ دی گئی ہے کہ یہ خود اپنے اجزائے ترکیبی کو بہتر سے بہتر بناتی چلی جائے' اور ان کے تزکیہ میں نگران و معاون کی حیثیت سے ہمہ وقت مصروف

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک بڑی خوبی یہ بھی رکھی گئی ہے کہ جب نورِ ربانی کے انجذاب میں اس کا اپنا ذوق و شوق اور سعی و عمل آئینۂ دل کی صفائی اور عمدگی کے پورے عروج و کمال تک لے جاتا ہے تو پھر "ذاتِ انسانی" کے شیشے کو جسم کے زنگار کی ضرورت بھی نہیں رہتی اس کا اپنا نور اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں موجود رہتا ہے گویا جاذبِ ربّ کے انجذاب کے لئے کسی درمیانی واسطے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ شیشے اور پتھر وغیرہ کی مثال محض سمجھنے اور سمجھانے کیلئے دی گئی ہے۔ ورنہ ذاتِ انسانی کی ترقی کی منازل جو قرآن حکیم نے ارشاد فرمائی ہیں وہ اس مثال سے کہیں زیادہ معنی خیز اور سوچ کو دعوت دینے والی ہیں۔ عروج و کمال کی وہ منازل جو موجودہ معیاراتِ وجود سے دُور بہت دُور واقع ہوں۔ انہیں چشمِ تصوّر کے سامنے صرف "علامت" کے ذریعے پیش کیا جا سکتا ہے!

انسانی تخلیق سے متعلق قرآن حکیم نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں بہت سی وضاحتیں ہماری قوتِ تفہیم کے سامنے رکھ دی ہیں۔ ان سب میں "رُوح" کی علامت (SYMBOL) کو نہایت معنی خیز جامعیت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ:

"لوگ آپ سے رُوح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ رُوح امرِ ربّی میں سے ہے اور تم کو علم کا بہت تھوڑا سا حصّہ دیا گیا ہے" (۱۷ : ۸۵)

علم کا بہت تھوڑا سا حصّہ انسان کو دیا گیا ہے اس کے مطابق ہمارے علماء، مفسرین، متکلمین اور اہلِ تصوف نے رُوح کے بارے میں کئی نظریات قائم کئے ہیں لیکن یہ تمام نظریات فلسفیانہ موشگافیوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں کوئی واضح بات کسی طرف سے بھی سامنے نہیں آ سکی۔ اقبال نے امرِ ربّی کو (DIRECTIVE ENERGY) کہہ کر فکر کے لئے صحیح سمت کی نشاندہی کر دی ہے، عالمِ امر تخلیقِ کائنات کا وہ گوشہ ہے جہاں انسانی فکر کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے رُوح کی ماہیت معلوم کرنے کی کوئی بھی کوشش ظن و تخمین سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس لفظ کے لسانی مشتقات کو سامنے رکھ کر قرآنی آیات کے سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کئے جائیں۔ لغوی اعتبار سے ر۔و۔ح کے مادّے سے راحت، استراحت، ترویح، ریحان وغیرہ بہت سے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے معانی اُردو زبان میں بھی وہی ہیں جو عربی میں ہیں۔ یعنی آرام، سکھ، چین، سکون، فرحت، خوشگواری وغیرہ۔ عربی زبان میں "رَاحَ" کے بنیادی معنے ہیں "ہوا کا چلنا"۔ چونکہ اس سے زندگی میں انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہوا قوت و حرکت کی مظہر ہے اس لئے اس مادّے سے جتنے بھی الفاظ بنائے جائیں گے ان میں انبساط، قوت اور حرکت کے تینوں مفاہیم شامل ہوں گے۔ قرآن حکیم نے رُوح کے لفظ میں ان تینوں مفاہیم کو اور زیادہ بلندی اور وسعت دی ہے۔ چنانچہ رُوحُ القُدُس اور رُوحُ الاَمِین سے مراد جبریل ہے رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا خود قرآن حکیم ہے۔ جس آیت (۱۷ : ۸۵) کا ترجمہ ہم نے اوپر دیا ہے اس میں بھی سیاق و سباق کے اعتبار سے رُوح کے معنے وحیِ ربّانی کے ہیں۔ "امر" حکم کو کہتے ہیں یعنی یہ کرو، وہ نہ کرو وغیرہ کی قسم کی ہدایات "حکم" جاری کرنے کا اختیار صرف صاحبِ قوّت و اقتدار ہستی کو حاصل ہوتا ہے، ایسی ہستی جو فعّال ہو، علیم ہو، بصیر ہو، سمیع ہو، رحمٰن اور رحیم ہو، ایسی زندہ، متحرّک اور فعّال ہستی کا حکم بھی خواہ ایجابی ہو یا سلبی اپنے دامن میں راحت، فرحت، سکون، آرام

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور مسرتوں کے کیسے گھاٹے جانفزا رکھتا ہے، لہٰذا ذہن میں اَمرِ رَبّی کے یہ تینوں مفاہیم رکھکر اور روح کو انرجیاتی توانائی جان کر ہم مندرجۂ ذیل آیات کے معنے متعین کرنے کی کوشش کریں تو بہت سی الجھنیں صاف ہو جائیں گی۔ اور ہم فلسفیانہ مباحث میں پڑنے سے بچ جائیں گے۔ یہ آیات تخلیقِ آدم سے متعلق ہیں:

۱۔ اور جب کہا تیرے رَبّ نے ملائکہ سے کہ میں کھنکھناتے ہوئے گارے سے "بشر" بناؤں گا۔ پھر جب میں اسے سنوار لوں اور اس میں "اپنی روح میں سے کچھ" پھونک چکوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ (۱۵:۲۹)

۲۔ اور جب کہا تیرے رَبّ نے ملائکہ سے کہ میں مٹی سے انسان بناؤں گا۔ جب اسے ٹھیک ٹھاک کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدے میں گر پڑنا۔ (۳۸:۷۱)

سجدہ سرِ تسلیم خم کر دینے کو کہتے ہیں، یہ قوّت و اقتدار کے سامنے جسمانی طور پر نیز دل کی پوری رضامندی کے ساتھ جھک جانا ہے، اطاعت اور خود سپردگی ہے۔ اطاعت اور پرستش یا پوجا پاٹ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اطاعت زندہ فعّال اور صاحبِ قوّت و اقتدار ہستی کی کی جاتی ہے جس کا مقصد تعمیلِ حکم ہے۔ جبکہ پرستش اور پوجا مٹی یا پتھر یا لکڑی یا دھات کے بت کی کی جاتی ہے جو نہ زندہ ہے نہ فعّال ہے نہ حکم دے سکتا ہے نہ قوّت و اقتدار رکھتا ہے۔ ویسے غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو لوگ مٹی یا پتھر وغیرہ کی بے جان مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں وہ بھی پہلے تصوّر ہی تصوّر میں اپنے معبودوں کو اختیار ارادہ، قوّت اختیار اور سماعت و بصارت وغیرہ تفویض کرتے ہیں، پھر اس کے آگے ماتھا جھکا دیتے ہیں گویا جب تک انسانی ذہن کسی چیز کے اندر "ذات" کے اجزائے ترکیبی کے فعّال ہونے کو تسلیم نہ کرے اس وقت تک انسان کسی کے حضور سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ ناصر علی سرہندی کا ایک شعر ہے جس میں بت اپنے پجاری سے پوچھتا ہے ؎

مرا بر صورتِ خویش آفریدی   برون از خویشتن آخر چہ دیدی؟

اَے میرے پرستار تو نے مجھے اپنی ہی صورت پر بنایا ہے، یہ بتا کہ اپنے آپ سے باہر نکلنے میں تم نے کیا مصلحت دیکھی؟ پوجا ہی کرنا تھی تو اپنے آپ کی پوجا کرتا میری اور تیری صورت میں کیا فرق ہے میں بے جان ہوں تو فعّال ہے، میں جامد اور ساکن ہوں تو متحرک ہے، میں بے اختیار ہوں تو با اختیار اور بالارادہ ہے، حیرانی کی بات ہے کہ میرے بے نور آئینے میں تو اپنی ہی دھندلی سی شکل دیکھتا ہے اور پھر اس کے سامنے ماتھا ٹیک دیتا ہے!

خیر۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ بات ہو رہی تھی سجدے کی جس کے معنے ہیں سرِ تسلیم خم کر لینا، زندہ اور ذی قوّت ہستی کے اقتدار کے سامنے جھک جانا، اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا۔ سرِ تسلیم بھی اسی کے آگے خم کیا جاتا ہے جو قوّت اور اختیار میں کہیں زیادہ ہو۔ اور ساجد سے بلند تر قوی تر ہو۔ اوپر دی گئی آیات کو پھر دیکھئے۔ ملائکہ کو سر بسجود ہو جانے کا حکم بھی انسانی پیکر میں انرجیاتی توانائی کے پھونکے جانے کے بعد مؤثر ہو رہا ہے اس سے پہلے نہیں یعنی انسان جب تک محض ایک پیکرِ آب و گِل تھا اس لائق نہیں تھا کہ ملائکہ اس کی اطاعت قبول کرتے۔ جونہی اس کے اندر انرجیاتی توانائی کا ہلکا سا جھونکا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

داخل ہوا یہ مٹی کا پیکر صاحبِ علم و فہم و اختیار ہو گا اور ان قوتوں کا مسجود بن گیا جو "صفاتِ ذات" سے محروم تھیں۔ گویا "روحانی توانائی کے پھونکے جانے کا مطلب" عطائے ذات" ہے یا عطائے قوّت و حرکت و انبساط!

اس نکتے کی مزید وضاحت نہایت حسین انداز سے سورۃ ۲۳ آیات ۱۲ تا ۱۴ میں کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے،

"ہم نے انسان کو کھنکھناتی مٹی سے بنایا، یعنی ہم نے اسے ایک ٹھکانے میں "پانی کی بوند"
بنا کر رکھ دیا۔ پھر ہم نے اس بوند سے جما ہوا خون تخلیق کیا۔ اس کے بعد ہم نے اس جمے ہوئے
خون سے گوشت کی ایک بوٹی بنائی۔ پھر اس بوٹی سے ہڈیاں بنائیں اس کے بعد ان ہڈیوں
پر گوشت چڑھا دیا"۔ . . . .

ارشادِ ربانی جاری ہے لیکن آپ تھوڑی دیر کے لئے یہاں رک جائیں۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھا دینے تک تخلیق کے چھ مراحل ختم ہوئے کھنکھناتی مٹی سے پانی کی بوند، بوند سے جما ہوا خون، خون سے بوٹی۔ بوٹی سے ہڈیوں پر گوشت یہی چھ مراحل حیوانی جنین بھی ماں کے پیٹ میں طے کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس مرحلے تک پہنچ کر بھی ابھی "انسان" وجود میں نہیں آیا، حیوان ہی جسمانی تشکیل پا رہا ہے، ہر مرحلہ دوسرے سے الگ ہے۔ کیونکہ ہر مرحلے کے بعد "ثُمَّ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے ہیں "پھر یا" اس کے بعد' عربی زبان میں یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی پہلا کام ختم ہو جاتے اور اس کے بعد واقع ہونے والا دوسرا عمل شروع ہو جاتے، ہڈیوں پر گوشت چڑھانے تک کے سارے مرحلے طے پا گئے اور حیوان کی تخلیق مکمل ہو گئی۔ لیکن انسان کو تو حیوانی مخلوق سے آگے لے جانا مقصود تھا لہٰذا یہاں پھر "ثُمَّ" کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی حیوانی ساخت کا کام ختم ہو گیا' اس کے بعد ارشاد جاری ہے کہ

"اس کے بعد ہم نے اسے ایک نئی مخلوق بنا کر اٹھا کھڑا کیا۔ بڑی برکت ہے اللہ کی جو سب
خالقین سے احسن ہے"

لیجئے ایک نئی مخلوق وجود میں آ گئی۔ ایسی مخلوق جو موجوداتِ عالم میں پہلے کہیں بھی نہیں تھی۔ اسکی مثال نہ عالمِ نباتات میں تھی نہ عالمِ جمادات میں تھی، نہ عالمِ حیوانات میں تھی اور نہ غیر مرئی مخلوق ملائکہ یا جنات میں تھی۔ اور یہ "بالکل نئی تخلیق" اعجاز تھا "روحانی توانائی کے پھونکے جانے کا" حیوانی سطح کا ارتقائی آخری مرحلہ، لیکن انسانی سطح کی زندگی کا پہلا مرحلہ!

تخلیقِ آدم کے سلسلے کی ان تمام قرآنی وضاحتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی آپ سوچ رہے ہیں کہ مان لیا "روحانی توانائی کے پھونکے جانے سے ایک بالکل نئی مخلوق وجود میں آ گئی جس کی پہلے کوئی مثال کہیں بھی موجود نہیں تھی۔ تاہم اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ "روحانی توانائی سے مراد "انسانی ذات" ہے جس کے اجزائے ترکیبی علم، تفہیم، جذبات اور اختیار و ارادہ ہیں؟ لیجئے، قرآنِ حکیم آپ کے اس سوال کا بھی نہایت اطمینان بخش اور مکمل جواب ارشاد فرماتا ہے۔

"یہ ہے اللہ، غیب اور شہود کا جاننے والا جو بڑی طاقتوں والا بھی ہے اور رحیم بھی ہے
اس نے نہایت حسین بنائی جو چیز بھی بنائی
پھر اسکے بعد بے وقعت نچڑے ہوئے پانی سے اس کی نسل بنائی،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پھر اس نے انسان کو سنوارا (یعنی ان حیوانی مراحل میں سے گزارا جو اوپر بیان ہوئے ہیں)
اور اس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھونک دیا
اور بنا دیئے تمہارے لئے سماعت، بصارت اور قلب ملا
لیکن بہت تھوڑی شکر گزاری کرتے ہو تم!!

لیجئے "صاحبِ ذات" اور "صاحبِ شخصیت" انسان کی تخلیق مکمل ہو گئی۔ لیکن ذرا ٹھہریئے قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے۔ رُوح کے پھونکے جانے سے پہلے جو مخلوق تیار ہو چکی ہے وہ صرف پیکرِ آب و گِل ہے حیوانی سطح کی مخلوق ہے۔ "چیز" ہے "شخص" نہیں ہے اس کے لئے واحد غائب کے صیغے کا فی ہیں ذات کے اوصاف سے محروم اشیاء کو اِس یا اُس کی ضمائر سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن رُوح کے پھونکے جانے سے جونہی صاحبِ شخصیت ہستی وجود میں آئی تو فوراً "واحد غائب" کا صیغہ بھی جمع مخاطب کے صیغے سے بدل دیا گیا۔ اب "اُس" کی بجائے "تم" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو صرف صاحبِ شخصیت ہستی کے لئے بولا جاتا ہے!

ان تصریحات سے "انسانی ذات" کا تصوّر بالکل واضح طور پر سامنے آجاتا ہے یعنی یہ وہ اُلوہیاتی توانائی ہے جسے "شخصیت" یا "جوہرِ انسانیت" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبال نے اسے خودی کا نام دیا ہے جو اگرچہ بعض غلط مفاہیم کا حامل بھی ہو سکتا ہے تاہم قابلِ قبول ہے کیونکہ اور کوئی بہتر لفظ سامنے نہیں آیا۔ ہم بھی یہی لفظ استعمال کرتے لیکن اقبال کے شارحین نے فلسفیانہ مُوشگافیوں میں پڑ کر اس کے معنے عام فہم نہیں رہنے دیئے بلکہ ہمارے صوفیانہ ادب میں اس لفظ کو خود پسندی یا خود پرستی کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے اور اس سے فخر، غرور، تکبّر وغیرہ کے معنے لئے جاتے ہیں۔ ویسے اسے آپ انسانی ذات کہیں، شخصیت کہیں یا جوہرِ انسانیت کہیں بات ایک ہی ہے۔ یعنی یہ وہ اُلوہیاتی توانائی ہے جو انسان کو تمام دوسری مخلوقات سے ممتاز بناتی ہے۔ یہ انسان کو خام اور ناپختہ صورت میں ملتی ہے تاہم اس میں نشوونما کے بے شمار امکانات ہیں۔ مذکورہ صدر آیاتِ قرآنی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "ذاتِ انسانی" جس کے ساتھ سمع اور بصر کی صفات یعنی علم بالحواس اور قلب کی صفات یعنی جذبات و احساسات وابستہ ہیں۔ ہر انسان کو یکساں عطا ہوئی ہے۔ چونکہ یہ عطائے خاص منجانب اللہ ہے اس لئے ہر انسان واجبِ تکریم ہے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس نعمتِ غیر مترقبہ کی قدر کرتا ہے یا نہیں، اسے مضبوط اور توانا بناتا ہے یا اسے کھو دیتا ہے، اسے مستحکم بناتا ہے، غیر ترقی یافتہ رکھتا ہے یا ریزہ ریزہ بنا دیتا ہے۔ انسانی ذات ایک گراں بہا انعام ہے جو خالقِ اکبر نے ہر انسان کو بلا امتیاز رنگ و نسل عطا کیا ہے اس کا احترام ہر دوسرے انسان پر فرض ہے۔ جو کوئی الوہیاتی توانائی کے اس طرح عطا ہونے کا منکر ہے وہ اس توانائی کے عطا کرنے والے کو بھی نہیں پہچان سکتا!

بعض ذہنوں میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ "اللہ نے "انسانی ذات" کو اپنی رُوح کیوں کہا ہے؟ کیا یہ رُوح ذاتِ خداوندی کا کوئی حصہ ہے۔ جو اس سے الگ ہو گیا ہے؟ اس سوال کا حتمی اور اطمینان بخش جواب سورۂ اخلاص میں ملتا ہے۔ جہاں ذاتِ کبریا کی بعض صفات کی تشریح کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین ذات ہے اور ذات کے حصّے بخرے ہو ہی نہیں سکتے۔ سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت احدیت بیان فرمائی گئی ہے۔ احد کے معنے ہیں منفرد، یگانہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یکتا (UNIQUE) ناقابل تقسیم اکائی۔ علم ریاضی میں عملاً ایک کو ایک پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ نظریاتی طور پر ایک بٹا ایک کا مفروضہ وضع کر لیا جائے تو بھی اس کا حاصل ایک ہی رہے گا۔ یعنی اکائی ہر حال میں ناقابل تقسیم رہے گی۔ یکتائیت کے مفہوم میں بھی اکائی کے ناقابل تقسیم ہونے کا مسئلہ شامل ہے۔ جو چیز اجزا میں منقسم ہو جائے وہ یکتا اور بے مثال نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اجزا ایک دوسرے کے اور کل کے مثیل بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ غیر محدود اور لامنتہا ہے۔ لامحدودیت (INFINITY) پر ریاضی کے کسی قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا من وجہٖ یا الوہیاتی توانائی ذات کبریا کا جزو نہیں ہے"

یگانہ اور منفرد ہونے میں ماورائیت کا پہلو بھی سامنے آ جاتا ہے۔ سورۂ اخلاص میں احدیت کے فوراً بعد صمدیت کی صفت بیان ہوئی ہے اَلصَّمَدُ وہ ذات ہے جو دوسروں کی تو تمام ضروریات پوری کرے لیکن خود ہر ضرورت سے مستغنی ہو اور اس کے تمام مخلوقات پر فیوض و برکات غیر منقطع ہوں۔ جہاں پہلی صفت میں بے ہمگی مضمر ہے وہاں اس دوسری صفت میں باہمگی کا تصور ابھرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جو صفات، حدودِ بشریت کے تابع، انسانی ذات میں منعکس ہو سکتی ہیں ان میں صمدیت بھی شامل ہے۔

چونکہ ہر شخصیت منفرد ہوتی ہے اس لئے انسانوں میں بھی شخصیت کے اعتبار سے کوئی دو افراد ایک جیسے نہیں ہوتے خواہ یہ باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہوں۔ الف کی شخصیت اس کی اپنی ہے۔ ب کی اپنی ہے اور دونوں منفرد اور یگانہ ہیں انسانی جسم توالد اور تناسل کے عمل سے وجود میں آتا ہے لیکن "انسانی ذات" بذریعہ تناسل وجود میں نہیں آتی۔ توالد میں والدین کا جزو مولود میں شامل ہو جاتا ہے لیکن تخلیق میں (اور عطائے ذات میں بھی) خالق کا کوئی جزو مخلوق میں نہیں آ جاتا۔ عطائے ذات تخلیقی عمل ہے تولیدی عمل نہیں ہے۔ اس لئے یہ اللہ کی ذات کا حصہ یا اس سے علیحدہ شدہ جزو نہیں ہے۔

توانائی کے بارے میں تھوڑا بہت علم سائنس کا ہر طالب علم رکھتا ہے۔ توانائی کائنات کے ہر مظہر میں موجود ہے جو مخلوق ذی حیات ہے اس میں توانائی کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریقے سے ہوتا ہے۔ کائنات کے اندر یہ توانائی طبعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے اور اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے اسی لئے ہم اس توانائی کو مادی توانائی (PHYSICAL ENERGY) کہتے ہیں۔ انسانی جسم کے اندر بھی دوسرے اجسام کی مانند، اسی قسم کی توانائی موجود رہتی ہے تاہم طبعی یا مادی توانائی کے علاوہ "انسانی ذات" کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا اظہار انسان کے اختیار اور ارادے کی صورت میں ہر لمحے ہوتا رہتا ہے۔ یہ توانائی انسان کی طبعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے کیونکہ انسان کی ہر نقل و حرکت اور اس کی طبعی توانائی کا ہر عمل اس کے اختیار اور ارادے کے تابع ہوتا ہے۔ جب تک انسان ارادہ نہ کرے یا اپنے اختیار کو استعمال نہ کرے جسمانی توانائی کوئی مظاہرہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ فطرت کے اندر جتنی توانائیاں اور موجود ہیں وہ بھی سب کی سب علم و تفہیم، اختیار و ارادہ اور جذبات و احساسات یعنی ذات کے اجزائے ترکیبی کے ماتحت ہیں۔ لہٰذا اس دوسری توانائی کو جو طبعی توانائی کی مالک اور اس پر قادر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ یہ الوہیاتی توانائی نہ تو مادے کی پیداوار ہے اور نہ ہی طبعی عناصر کی باہمی ترکیب کے کسی عمل یا ارتقا کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یہ طبعی توانائی سے الگ اور ممتاز ہے اس کا سرچشمہ عالم امر ہے۔
"انسانی ذات" کی عطائے خاص کے لئے قرآن حکیم نے "نفس" کا لفظ استعمال کیا ہے نفس کے بہت سے معنے ہیں۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعے پر بولا جاتا ہے اس کے علاوہ وہ توانائی جس سے شعور اور احساس کی قوت یعنی تمیز کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی نفس کہلاتی ہے اسی طرح یہ لفظ علم، عقل اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے اور عظمت، ہمت، غیرت، ارادہ وغیرہ کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نفس کے معنی کجائی بند بھی ہیں اور اپنے آپ کا وجود بھی۔ انسانی ذات کا اظہار اس کے اختیار اور ارادے سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ایسی غیر مادی قوت ہے جو اختیار اور ارادے کی استعداد رکھتی ہے، یہ اختیار اور ارادہ اللہ کا عطا کردہ ہے اور محدود ہے انسانی ذات کے اندر مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے لہٰذا اسے ہم ایک ملکہ، صلاحیت، استعداد یا امکانی قوت کہہ سکتے ہیں جو بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر ہے۔ جب انسان اپنی اس ملکے یا صلاحیت یا استعداد کو بلند قدروں کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے، اور جب انسان اپنے اختیار اور ارادے کو پست ذاتی مفادات کی خاطر استعمال کرتا ہے تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس دوسری صورت میں "انسانی ذات" کو ایغو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ایغو حیوانی سطح پر ہوتا ہے اور "ذات" انسانی سطح زندگی پر۔ جب ایغو پست مفادات کی طرف جاتا ہے، تو اسے نفس امارہ کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات برائی سرزد ہونے پر احساس ندامت بیدار ہو جاتا ہے تو نفس کی اس کیفیت کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ یہ دراصل حیوانی سطح کے ایغو اور انسانی سطح کی ذات کے درمیان ایک کشمکش ہے، تاہم جب ذات اتنا استحکام حاصل کر لیتی ہے کہ پست مفادات اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور یہ ان تمام جاذبیتوں پر غالب آجاتی ہے۔ تو اسے نفس مطمئنہ کی اصطلاح دی گئی ہے یہ مستحکم ذات (INTEGRATED PERSONALITY) کہلائے گی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ "ذات" امکانی صلاحیت ہے جس میں پستی کی طرف گر جانے کا احتمال بھی ہے اور بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کے امکانات بھی ہیں۔ امارہ اور مطمئنہ کے الفاظ سے یہ دونوں امکانات واضح ہو جاتے ہیں۔

جوہر انسانیت، جسے قرآن حکیم نے نفس کہا ہے، ناتراشیدہ اور خام سہی۔ لیکن پھر بھی انسان اور کائنات کی باقی تمام مخلوقات کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔ اسی امتیاز کے طفیل انسان نہ صرف فطرت کی محتاجی سے آزاد ہوا ہے بلکہ خود فطرت کو اور اس کی تند و توانا قوتوں کو اپنے اختیار اور ارادے کے تابع کر لینے کے قابل بھی ہوا ہے۔ اس کے علاوہ شعور کی بالیدگی نے انسان کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ بھی رکھ دیا ہے جو اور کسی مخلوق نے نہیں اٹھایا۔ اختیار اور ارادے کی آزادی خواہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو، اپنے ساتھ ذمہ داریاں بھی لاتی ہے۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے یا نہ کرنے کے دونوں امکانات "انسانی ذات" میں موجود ہیں اور اسی وجہ سے اسے قرآن حکیم نے امانت کہا ہے۔

انسانی زندگی کے بارے میں ہمیشہ سے دو تصورات چلے آرہے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کے طبعی جسم اور اس کے حیوانی سطح کے تقاضوں کو پورا کرنے والے مظہر کا نام "زندگی" ہے۔ یہ چیز مادے کی ابتدائی تبدیلیوں سے گزرتی ہوئی اولین جرثومہ حیات تک پہنچی، پھر وہاں سے آگے بڑھی اور مختلف سانچوں میں ڈھلتی ڈھلاتی موجودہ پیکر انسانی میں نمودار ہو گئی۔ گویا انسان نامیاتی وجود کی صورت میں ایک ایسی مشین کی مانند ہے جو طبعی قوانین کے تقاضوں کے تحت چالو رہتی ہے۔ اس میں سوچنے سمجھنے، فیصلہ کرنے اور پھر ان فیصلوں کے مطابق اقدامات کرنے کی صلاحیتیں بھی طبعی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ جونہی یہ مشین چلتی بند

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہو جائے گی، انسان کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی کا مقصد جسم کی مشین کو چالو رکھنا ہے چنانچہ اسے چالو رکھنے کے لئے جو بھی ذرائع اور وسائل استعمال کئے جائیں وہ نہ صرف جائز ہیں بلکہ ضروری بھی ہیں۔ ہر طرح کا آرام لذائذ دنیوی کا تمتع اور سامان راحت و انبساط جسم ہی کو ملنا چاہیئے۔ اور وہ بھی صرف اپنے جسم کو۔ اگر دوسرے اجسام محروم ہی رہ جائیں تو اپنی بلا سے۔ ہر فرد اپنے جسم کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کا ذمہ دار ہے، اور دوسروں کا نہیں۔ دوسروں کو اگر کچھ دینا ہو تو صرف اتنا دو جس سے یہ صرف زندہ رہ سکیں یا تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ سامان راحت پیدا کر سکیں۔ زیادہ سے زیادہ کا حقدار طاقتور ہے خواہ اس کے پاس طاقت علم کی ہو، سرمایہ کی ہو، اقتدار کی ہو، ذہانت کی ہو یا جسمانی تن و توش کی ہو۔ زندگی بارے اس تصور کو مادی نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نظریۂ حیات پر یقین رکھنے والے کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت ہے اور نہ وحیٔ خداوندی کی رہنمائی کی حاجت ہے۔ اگر اس نظریۂ حیات کا پیروکار خدا کے وجود کا اقرار کر بھی لے تو اس کا یہ اقرار بس یہیں تک محدود رہے گا کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا پر صرف اتنا ایمان لانے سے زندگی اور انسان کے اعمال و افعال متاثر نہیں ہوتے۔ خدا نے کائنات اور اس کی چیزوں کو پیدا کیا ہے تو ٹھیک ہے، پیدا کیا ہے، نہیں کیا؟ خدا نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین بنائے ہیں اور اب وہ کائنات کو انہی قوانین کے ذریعے چلا رہا ہے، تو بس ٹھیک ہے چلانے دو! میری زندگی اور اس کے مشاغل پر خدا کے ہونے نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ صحیح ہے کہ خدا پر صرف اتنا سا ایمان لانے سے انسانی زندگی متاثر نہیں ہوتی۔ انسانی زندگی اُس وقت متاثر ہوتی ہے جب انسان خدا کی ہستی کا اقرار کرنے کے ساتھ اس بات پر ایمان لاتا ہے کہ یہ زندہ و دائم قائم خدا اُس کے اعمال کو دیکھ بھی رہا ہے۔ اُس کی ہر بات کو سن بھی رہا ہے۔ اس کے جذبات، احساسات بلکہ دل کے اندر اُٹھنے والے خفیف سے خفیف خیالات تک کو جانتا ہے۔ اور اس کے ہر فعل اور ہر عمل کے نتیجے پر قادر اور جزا و سزا کا مالک ہے۔ پھر زبانی کلامی اقرار کر لینے اور دل و جان کی پوری رضامندی سے قبول کر لینے میں بھی فرق ہے۔ پہلی صورت میں عقیدے اور عمل کے درمیان کوئی ربط اور تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سوچ، قول اور عمل میں تضاد پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسری صورت میں جب ایمان دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو پھر انسان کا ہر قدم ذمہ داری کے احساس سے لازماً اُٹھتا ہے اور صرف ایک سمت کو اُٹھتا ہے۔ ایک ہی سمت کو اُٹھنے والے قدم سے سوچ اور قول و عمل میں تضادات پیدا ہو جانے کا کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ اسی چیز کا نام توحید ہے! ـــــ یعنی وحدتِ فکر و عمل ہے۔ اسی سے انسانی ذات کو دوام و استحکام حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی زندگی کا مقصود و منتہا ہے۔

اگر زندگی کو صرف طبعی زندگی تک محدود کر لیا جائے تو پھر اچھائی اور بُرائی کے معیارات بھی ناپائیدار، عارضی اور ہر لمحے بدلتے رہ جانے والے ہوں گے۔ یعنی "خیر" صرف اسی چیز یا عمل کو سمجھا جائے گا جس سے طبعی زندگی کو فائدہ پہنچے اور "شر" وہ چیز ہوگی جو طبعی زندگی کے مفادات کے منافی ہو۔ یا جسے کوئی مخصوص معاشرہ اچھا یا بُرا کہہ دے۔ اسی طرح وہ شخص جو صرف طبعی زندگی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرے کے مقرر کردہ ضابطوں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بالاتر کوئی قانون نہیں ہو سکتا۔ معاشرے کے مقرر کردہ ضابطے بھی صرف اس صورت میں مؤثر ہوں گے جب یہ افراد کے ذاتی مفادات سے متصادم نہ ہوں۔ کیونکہ ہر شخص کی زندگی کا مقصد صرف اپنی انفرادی خواہشات کی تکمیل ہوگا۔

مادی نظریۂ حیات کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف جسمانی زندگی تک ہی محدود نہیں کیونکہ انسان کی تحویل میں جسم کے علاوہ ایک اور "شے" بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں اور جس کا مرکز و محور جوہر انسانیت ہے چونکہ یہ "شے" طبیعی قوانین کے ماتحت نہیں ہے اس لئے جسم کی موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اگر اس "شے" کی مناسب نشوونما کی جائے اور اسے مستحکم اور توانا بنا لیا جائے تو انسان کی موجودہ دنیا کی زندگی بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر خوشگوار ہوگی۔ اور جسم کے مر جانے کے بعد کی زندگی میں بھی اس "شے" کو ارتقاء کے مزید مدارج طے کرنے کی استعداد حاصل ہو جائے گی چنانچہ اس دوسرے نظریۂ زندگی کی رو سے "جسم" اور اس دوسری "شے" یعنی انسانی ذات دونوں کی پرورش ضروری ہے۔

یہ درست ہے کہ انسانی زندگی کی نشوونما جسمانی قالب کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے (جس طرح موتی سیپ کے اندر رہ کر پرورش پاتا ہے) تاہم یہ حقیقت ہر حال میں تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ "انسانی ذات" کا وجود جسم سے الگ ایک آزاد اور خود مختار وجود ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ "انسانی ذات" ایک مکمل غیر مادی "شے" ہے کیونکہ جسم کی بیرونی ساخت اور اندرونی شکست و ریخت سے یہ ذرا بھر بھی متاثر نہیں ہوتی۔ میں اس وقت بھی "میں" ہی تھا جب سکول میں پڑھتا تھا۔ اس وقت بھی "میں" تھا جب جوانی کو پہنچا اور اب بھی "میں" ہی ہوں جب ستر بہتر کے پیٹے میں ہوں۔ میرا جسم گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔ اعضا کی طاقت کم ہوتی رہی ہے۔ خدوخال میں نمایاں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن میرے "میں ہونے میں" ذرا بھر بھی فرق نہیں آیا۔ میری انسانی ذات اور اس کے تشخص میں طبیعی اعتبار سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اگر کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہے، تو میرے علم میں ہوئی ہے۔ میری استعداد معاملہ فہمی میں ہوئی ہے۔ میری قوت فیصلہ میں ہوئی ہے۔ میرے جذبات و احساسات کی تراش و خراش میں ہوئی ہے۔ خود مجھ میں نہیں ہوئی۔ جن مقادیر اور صفات میں کمی بیشی واقع ہوئی ہے وہ "میری" تو ضرور ہیں لیکن "میں" نہیں ہیں۔ پس جب "انسانی ذات" طبیعی قوانین کے اطلاق سے ماوراء ہے تو اس پر موت کیسے طاری ہو سکتی ہے جسم تو موت سے مر جائے گا لیکن موت "میں" کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ موت کے بعد ہر وہ چیز جو میری ہے یہیں پڑی رہ جائے گی لیکن "میں" آگے بڑھ جائے گی۔ انسانی ذات کی یہی تغیر ناآشنا مرکزی وحدت اسے اپنے اعمال کی ذمہ دار اور جوابدہ بناتی ہے۔

اس سلسلے میں دو ایک مغربی مفکرین کے بیان بھی سن لیجئے۔ ای۔ ایس۔ برائیٹ مین اپنی کتاب "اے فلاسفی آف ریلیجن" کے صفحہ ۱۹۶ پر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص اپنی عمر کے مختلف تجربات کے دوران غیر متغیر وحدت نہیں رہتا تو پھر روحانی ارتقاء بھی ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اخلاقی ترقی کا انحصار اس مفروضے پر ہے کہ میں اپنے سابقہ وعدوں، معاہدوں اور مقاصد کا پابند ہوں۔ اگر جسمانی تبدیلیوں کی وجہ سے میں وہ نہیں رہا جو اپنے سابقہ معاہدوں اور مقاصد کے وقت تھا تو نہ مجھے کوئی ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے اور نہ میں خود تدریجی ارتقائی منازل طے کر سکتا ہوں۔"

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

شخصیت کی پہچان ہی اسی میں ہے کہ تمام جسمانی تبدیلیوں کے باوجود یہ جوں کی توں رہے کیونکہ میرے تمام افعال، خیالات، احساسات، تعارفات اور اختیاری اعمال کی مالک میری اپنی انفرادی شخصیت ہے جو تمام جسمانی تبدیلیوں کے باوجود میری شناخت بنتی ہے۔ کسی کا ملکیہ پالتو جانور کسی دوسرے شخص کو کاٹ لے تو سزا جانور کو نہیں بلکہ جانور کے مالک کو ملتی ہے۔ اسی اصول پر اگر میرا علم کسی کو نقصان پہنچائے، میرے جذبات اور احساسات کسی کو زخمی کریں، میری عقل کسی کو گزند پہنچائے یا میرے اختیار اور ارادے سے کوئی شخص ناحق مجروح ہو تو سزا مجھے ملنی چاہیے کیونکہ یہ میری ملکیہ پالتو چیزیں ہیں۔ یہ میری ہیں "میں" نہیں ہیں۔

مشہور جرمنی فلاسفر ہیگل کہتا ہے کہ میرے پاس بے شمار خیالات ہیں، میرے اندران کا ایک بڑا خزانہ محفوظ ہے لیکن ان تمام مختلف اور متنوع خیالات کے ہوتے ہوئے بھی میں وہی ہوں جو شروع سے تھا۔

"انسانی ذات" پر غور و فکر کے دوران مفکرین کے سامنے یہ سوال بھی آیا ہے کہ کیا "انسانی ذات" کیلئے جسم کا ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ پروفیسر لے ری کیبیل نے اس بات پر بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جسم ضروری نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ بچہ اپنے جسم کے مالک ہونے کے شعور سے بہت

پہلے جسموں کے احساس کے تجربے سے گزر چکا ہوتا ہے اس کے علاوہ جسمانی بیماریوں کے دوران یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جسم کا احساس قطعی طور پر معطل ہو کر رہ گیا لیکن پھر بھی مریض کے اندر اپنے آپ کا شعور برقرار رہا۔

جسمانی امراض کا مشہور معالج ڈاکٹر ایف۔ آر۔ شیلنٹ لکھتا ہے کہ "جب بیماری کی غشی کی حالت میں بیہوشی کے مصنوعی طور سے عمل کو روک لیا جاتا ہے تو مریض اپنے جسم کو بالکل اجنبی بلکہ کوئی مخالف سی چیز سمجھنے لگ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے اعضا کا مالک ہونے کا بھی انکار کر دیتا ہے"

سڑک پر نشے کی حالت میں پڑے ہوئے ایک افیونی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میری ٹانگوں پر سے بیشک گاڑی گزار دو یہ ٹانگیں میری نہیں ہیں!

ان شواہد کی روشنی میں جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ "انسانی ذات" نہ تو کسی جسم کے مماثل ہے اور نہ ہی یہ کسی طبعی قانون کے تابع ہے۔ بلکہ یہ جسم سے بالکل الگ اپنا آزادانہ وجود رکھنے والی "شے" ہے۔ اور یہ "شے" فرد کی عمر کے دوران بالکل تغیر ناآشنا رہتی ہے۔ گویا بات پھر پھرا کر وہیں آپہنچی کہ انسانی ذات کی

۱۔ تغیر ناپذیری ۲۔ آزادی اور ۳۔ فعل مختاری، اسے اپنے افعال و اعمال کے بارے میں ذمہ دار اور جوابدہ بناتی ہے۔

علم حیاتیات اور علم الابدان کے ماہرین کہتے ہیں کہ جسم کے خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ اور ان کی جگہ نئے خلیوں کی پیدائش کا عمل ہر لمحے جاری رہتا ہے اس عمل کے نتیجے میں ہر جسم تین سے سات سال کے دوران سارے کا سارا بدل جاتا ہے یہاں تک کہ نئے جسم میں پرانے جسم کا کوئی ایک خلیہ باقی نہیں رہتا۔ بالوں تک کے خلیے تبدیل ہو جاتے ہیں اگر انسان

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جسم ہی کا نام ہے تو ہر سات سال کے بعد ایک نیا انسان وجود میں آجاتا ہے اور سابقہ انسان کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر انسانی ذات کسی بھی اعتبار سے جسم کے تابع ہوتی تو کیا نفیس تاثر شمار ہو سکتی تھی؟ پھر یہ بھی سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہر مرنے والا خلیہ جسم کی طبعی ساخت کو بھی نئے پیدا ہونے والے خلیے کے حوالے کرکے مرے؟ یہ ناممکن ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو بلا تامل قبول کرنا پڑے گا کہ جسمانی تشخص کے پیچھے انسان کا ذاتی تشخص بھی ہے جو جسم سے کہیں زیادہ پائیدار اور لطیف ہے۔

اب ہم ایک اور سوال کی طرف آتے ہیں۔ مادی نظریۂ حیات رکھنے والوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسانی ذات " چند شعوری کیفیات کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر قوتِ حافظہ ہمارے تجربات کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں جوڑتی نہ چلی جائے تو ہماری خود شناسی ختم ہو جائے گی اور ہماری پہچان کا انحصار ہماری "انسانی ذات" پر نہ رہے گا۔

یہ اعتراض عقلیت پرستوں کے ایسے سطح بین اشخاص کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے جو "کل" کی وحدت کو تجزیاتی مطالعے کے توسط سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر "کل" صرف اجزاء ہی کا ریاضیاتی مجموعہ ہوتا اور اس کے علاوہ کچھ نہ ہوتا تو شاید اس اعتراض میں کچھ وزن ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ "کل" صرف اجزاء ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ اس سے زائد اس کا ایک اپنا علیحدہ تشخص بھی ہے جو اسے انہی اجزاء کے دوسرے مجموعوں سے منفرد، نمایاں اور ممتاز بنا دیتا ہے۔ کیا تاج محل یا دنیا کی کوئی دوسری عجوبۂ روزگار عمارت صرف اینٹ گارے اور چونے پتھر کا مجموعہ ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے؟ کیا لیونارڈو ڈاونچی یا پکاسو کی تصاویر صرف چند آڑی ترچھی لکیروں یا سبز و سرخ رنگوں ہی کا مجموعہ ہیں یا ان کے علاوہ بھی کچھ ہیں؟ کیا بڑے بڑے ادیبوں کے شہپارے صرف الفاظ ہی کا مجموعہ ہیں یا ان کی اپنی کوئی انفرادیت بھی ہے؟ اگر گھڑی کے پرزوں کو اکٹھا کرکے کسی ڈبے میں بند کر دیا جائے تو کیا یہ مجموعہ گھڑی کہلا سکے گا؟ کیا یہ مجموعہ وقت بھی دے گا؟ دنیا کی ہر چیز اجزاء ہی سے مرکب ہے۔ لیکن ہر چیز ہر دوسری چیز سے منفرد ہے۔ خواہ ان کے اجزاء تعداد اور وزن کے اعتبار سے بالکل برابر ہی کیوں نہ ہوں، اور یہی انفرادیت ہر چیز کی الگ الگ پہچان بن جاتی ہے۔ گویا "کل" میں پیدا ہو جانے والی انفرادیت اجزاء کے ریاضیاتی مجموعے سے علیحدہ اور بالاتر ایسی "چیز" ہے جو اجزاء کے ختم ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ مثلاً "سقراط، افلاطون اور ارسطو کے جسمانی اجزاء گل سڑ کر خدا جانے کہاں بکھر چکے ہوں گے لیکن ان کی انفرادی شخصیت ابھی تک زندہ ہے۔ اور آئندہ بھی زندہ رہے گی۔ چیزوں کے اجزاء کی طرح "انسانی ذات" کے بھی اجزاء ہیں (گو ہم انہیں ان معنوں میں اجزاء نہیں کہہ سکتے جن معنوں میں یہ لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ یہ بعض قوتیں یا صلاحیتیں ہیں یا چند استعدادوں کے مظاہر ہیں) لیکن جس طرح انسانی جسم اپنے اعضاء اور اعضاء اپنے اجزاء کے مجموعے سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات بھی اپنے قویٰ کے مجموعے سے زیادہ ہے۔ گویا "ذات" اور "جسم" اپنی اپنی جگہ دو مکمل وحدتیں ہیں۔ ان کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ کرکے ان کی وحدانی شناخت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہم ان دونوں کی اصل فطرت یا قانونِ تخلیق کے سمجھنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ چونکہ ایک مکمل وحدت ہونے کی حیثیت سے انسانی ذات

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اپنا علیحدہ تشخص رکھتی ہے۔ اور یہ تشخص اس کے مختلف مظاہر مثلاً سوچنے، محسوس کرنے، ارادہ باندھنے، انتخاب کرنے وغیرہ کے ذریعے اپنا مشاہدہ کراتا ہے۔ اس لئے انسانی ذات کو "کل" کی حیثیت سے ہی تسلیم کرنا اور ایک منفرد اور مکمل وحدت کی صورت میں اسے قبول کرنا ہی اس کی شناخت ہے۔

اب آیئے اس بات کی طرف کہ اگر قوت حافظہ ہمارے تجربات کی کڑی سے کڑی نہ ملاتی رہے تو ہماری خودشناسی ختم ہو جائے گی؟ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔ اور قدرے نازک بھی کیونکہ جزا اور سزا کا تعلق حافظے کے "بعد از مرگ بدن" فعال رہنے سے ہے۔ "انسانی ذات" کے متعدد ہتھیاروں میں سے ایک نام قوت حافظہ ہے۔ یہ اسی طرح کی قوت ہے جس طرح علم، تفہیم، فیصلہ، اختیار و ارادہ وغیرہ کی قوتیں ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ چونکہ جسم کے مر جانے سے "انسانی ذات" کی تمام قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے انسانی ذات بھی ختم ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر قوت حافظہ کے باقی نہ رہنے سے جزا و سزا کا تصور قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جب تک کردہ اور ناکردہ گناہوں کا مکمل ریکارڈ یاد داشت میں محفوظ نہ ہو جزا اور سزا بے معنی ہیں۔ اسی طرح علم، ذہانت و تفہیم اختیار و ارادہ کے ختم ہو جانے سے انسانی ذات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ یہی تو انسانی ذات کے اجزا ہیں۔ جب اجزا نہ رہیں تو کل کیسے رہ سکتا ہے؟ اس سوال کے سمجھنے کے لئے پہلے تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کہ سمع، بصر اور اندرونی علم، عقل، ذہانت اور اختیار و ارادہ وغیرہ انسانی ذات کے اجزا نہیں مظاہر ہیں۔ انسانی ذات ایک لاتجزی وحدت ہے جو ان صلاحیتوں کو جسم کے "واسطے" سے استعمال کر کے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اب اگر جسم کا "واسطہ" درمیان سے ہٹا لیا جائے تو اس کا مطلب صرف اتنا ہو گا۔ کہ انسانی ذات اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہ کر سکے گی۔ اور اپنا اظہار نہ کر سکے گی۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھئے کہ فرض کیا کہ آدمی کی ٹانگیں کاٹ دی گئی ہیں لیکن وہ فٹ بال کو کک لگانا چاہتا ہے آپ اس کے ارادے کی نفی نہیں کر سکتے۔ بلکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے ارادے پر پابندی نہیں لگا سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عملی طور پر اپنی خواہش اور ارادے کا اظہار نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے پاس ٹانگوں کا وہ واسطہ نہیں رہا جس کے ذریعے وہ اپنے ارادے کی تکمیل کر سکتا تھا۔ اسی طرح اگر آپ کے دل میں کسی کے خلاف نفرت کے جذبات ہیں۔ تو معاشرتی جبر سے زبان تو بند رہ سکتی ہے لیکن دل کے اندر اٹھنے والے طوفانوں کو کون روک سکتا ہے۔ گونگوں کی بے بسی پر غور کیجئے کتنی حسرتوں کے ساتھ یہ بیچارے بولنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہ جاتے ہیں کیونکہ ان کے پاس زبان کا وہ "واسطہ" نہیں ہے جس سے وہ اپنی خواہش کی تکمیل کر سکیں۔ وہ خود معذور اور مجبور ہیں۔ لیکن ان کے ارادوں پر کوئی بھی شخص معذوری اور مجبوری عائد نہیں کر سکتا۔ قوت ارادی تو وہ زبردست قوت ہے جو جسمانی عوارض اور معذوریوں پر بھی قابو پا کر جسم کے دوسرے حصوں سے کام لے لیتی ہے۔ اندھے ہاتھوں کی انگلیوں سے حروف ٹٹول ٹٹول کر عالم و فاضل بن جاتے ہیں۔ اور ٹنڈے پاؤں کی انگلیوں سے قلم پکڑ کر خوشنویس بن جاتے ہیں۔ یہ اس لئے ممکن ہوا ہے کہ قوت ارادی جس کا تعلق انسانی ذات سے ہے ہر وقت زندہ اور فعال ہے جبکہ آنکھ اور ہاتھ جن کا تعلق جسم سے ہے موجود نہیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسانی ذات کی قوتیں اور صلاحیتیں زائل نہیں ہو جاتیں۔ صرف ان کا اظہار معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ اظہار کا "واسطہ" جسم ہے اور جسم فانی ہے جو کسی بھی سبب ناکارہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ انسانی ذات

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی قوتیں دائمی ہیں۔ اور یہ کسی طور پر ناکارہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ انسانی ذات کا پرتوِ جمال و جلال ہیں۔ انداز ہائے اظہار و نمود ہیں اور انہیں خود "انسانی ذات" کی طرح دوام اور ثبات حاصل ہے۔

قوتِ حافظہ کی بھی بعینہٖ یہی صورت ہے، ذاتِ انسانی کی اس صلاحیت کو استعمال میں لانے کے لئے دماغ کے "واسطے" کی ضرورت رہتی ہے۔ دماغ کے بارے میں ماہرینِ اطباء کی رائے یہ ہے کہ بھیجے کے خاص خلیے یادداشتوں میں تسلسل پیدا کرتے ہیں۔ جس چیز کو خالص حافظہ (PURE MEMORY) کہا جاتا ہے۔ وہ برگساں کے الفاظ میں "روحانی مظاہرہ" ہے جس کا مادے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ذہن کے اکثر افعال کو (MENTAL HABITS) ذہنی عادات کہا جاتا ہے، ان کی جبلّی اعصابی نظام میں پائی گئی ہیں، بعض اوقات کسی عارضے یا حادثے یا بڑھاپے کی وجہ سے حافظہ بظاہر زائل بھی ہو جاتا ہے یا وہ خلیے جو یادداشتوں کو محفوظ کر لیتے ہیں کمزور پڑ جاتے ہیں تو حافظہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حافظے میں جمع شدہ اطلاعات کو شعور کی سطح پر لانے یعنی RECALL کرنے کا کچھ نہ کچھ انحصار دماغی خلیوں پر بھی ہے۔ بعض لوگوں کے حافظے حیران کن حد تک تیز ہوتے ہیں۔ بعض چند لمحات کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں، ان تمام باتوں پر میڈیکل سائنس والوں سے زیادہ ماہرینِ نفسیات نے کام کیا ہے۔ ان کی طویل محنت تحقیقات اور تجربات کا نچوڑ یہ ہے کہ حافظے کے لئے نیوران برین سیل یعنی بھیجے کے خلیے ضروری نہیں ہیں۔ کیونکہ خلیوں کی ریکارڈنگ، جو مشینی عمل ہے، ضروری ہوتی تو پھر "حافظہ" بار بار کی دہرائی کا محتاج ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بعض عجیب و غریب، یا دہشتناک، یا دلچسپ، یا دردانگیز یا مسرت افزا واقعات ایک ہی مرتبہ رونما ہونے سے ہمیشہ کے لئے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں اور ہزار کوشش کے باوجود فراموش نہیں ہوتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظے کا دارومدار معانی اور مفاہیم پر ہے ایک دلچسپ اور معنی خیز جملہ ایک ہی مرتبہ پڑھ لینے یا سن لینے سے یاد ہو جاتا ہے اگر کسی جملے سے معنی نکال دیئے جائیں اور کسی کو اتنی ہی تعداد کے مہمل اور بے ربط الفاظ کا جملہ یاد کر لینے کو کہا جائے تو یہ کام اس کے لئے بہت دشوار ہو گا۔ انسان فطرتاً معانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ الفاظ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، معانی کو اوّلیت حاصل ہے۔ ایک گول میز کے گرد دس، بیس آدمی بٹھا دیں۔ اپنے قریب کے شخص کے کان میں ایک جملہ کہیں اور اسے ہدایت کریں کہ یہ جملہ وہ آگے دوسرے شخص کے کان میں کہہ دے اسی طرح کانوں کان پھرتا پھراتا جملہ جب واپس آپ تک پہنچے گا تو یہ اصل جملے کے مفہوم کے قریب ہو تو ہو لیکن الفاظ سارے کے سارے بدل چکے ہوں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ انسانی ذہن الفاظ کی بجائے مطالب و مفاہیم میں دلچسپی لیتا ہے۔ مہمل اور بے ربط الفاظ محنت کر کے رٹ بھی لئے جائیں تو کچھ دیر بعد بھول جائیں گے۔

نرم آوازوں والے آسان اور مترنم جملوں کو یاد کر لینا غیر مترنم اور ثقیل جملوں کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ جب چند افراد مل کر کوئی کورس گاتے ہیں تو یہ بہت جلدی یاد ہو جاتا ہے۔ دنیا میں قرآنِ حکیم وہ اکلوتی کتاب ہے جسے دس بارہ سال کے بچے بھی پوری صحت تلفظ کے ساتھ ازبر کر لیتے ہیں، حالانکہ زبان بھی غیر ملکی ہے اور کتاب کی ضخامت بھی بہت بڑی ہے اس کی وجہ یہی چھوٹے چھوٹے جملوں کا بے مثال ترنم ہے، ترنم حسن و توازن، تفہیم معانی تحسین جمال لفظ و صوت اور دلچسپی کا تعلق جذبات اور احساسات سے ہے جو قلب کی کیفیات ہیں دماغ کی کیفیات نہیں ہیں، لہٰذا اس حقیقت کو تسلیم کر لینے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ "انسانی ذات" ہی ہے جس پر بنیادی زندگی کے تمام تاثرات، خواہ یہ مایوسی اور ناکامی کے ہوں، خواہ امید اور کامرانی کے ہوں، خوف اور حزن کے ہوں یا اطمینان وبہجت کے ہوں، گناہ کے تاسف اور حرمان کے ہوں یا نیک اعمال کی مسرت وشادمانی کے ہوں، سب کے سب قلبی واردات کی صورت میں ذات انسانی پر مرتسم ہوتے رہتے ہیں تاکہ "زندگی" جب بھی بلند تر سطحوں کی طرف رواں ہونے لگے، تو اپنی کمائی کی فرد بھی اپنے ساتھ لیتی جائے۔ اس حقیقت سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ دنیاوی زندگی کے دوران ہماری "روح" جسم کے اندر بڑی بڑی تبدیلیوں کے رونما ہوتے رہنے کے باوجود معانی اور مفاہیم کی پوری کائنات کو اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے۔ تو پھر جب جسم کے اوپر زیادہ مکمل اور زیادہ بنیادی تبدیلی واقع ہوگی تو اس وقت ہماری "روح" معانی کی دنیا کو برقرار کیوں نہ رکھ سکے گی۔ اس زیادہ مکمل اور زیادہ بنیادی تبدیلی کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ ایک دن لازماً ایسا آئے گا۔ جب آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ جو کچھ بھی اس کے ہاتھوں نے آگے بھیج رکھا ہے (۷۸ : ۴۰) جب نگاہیں اتنی تیز ہو جائیں گی کہ وہ ٹھوس چیزوں کے بھی آر پار چلی جائیں گی (۲۲ : ۵۰) جب انسان اپنا محتسب آپ ہوگا (۱۴ : ۱۷) اور جب یاد آ جائے گا آدمی کو جو کچھ بھی اس نے کمایا ہے (۷۹ : ۳۵)

سگمنڈ فرائڈ نے نیند کے دوران دیکھے جانے والے خوابوں پر تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ وہ انہیں غیر تسکین یافتہ خواہشات کے مختلف روپ کہتا ہے۔ تاہم سارے خواب ایسے نہیں ہوتے۔ بعض خواب گزرے ہوئے واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ اور بعض آئندہ پیش آنے والے واقعات کا نقشہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ خواب کے دوران حافظہ اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ شعور کی کامل بیداری کے دوران بھی کبھی نہ ہوا تھا۔ سابقہ زندگی کے واقعات اتنی تفصیل سے سامنے آ جاتے ہیں، کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خواب کے دوران زمان ومکان دونوں کے تصورات باطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چند لمحوں میں سالہا سال کے واقعات پوری صحت کے ساتھ پردہ شعور پر نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل پر کرب وانبساط کے نقوش بھی چھوڑتے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے نیند اور موت کو ایک ہی کیفیت کا نام دیا ہے۔ نیند عارضی، موت طویل کیفیت ہے۔ اب اگر نیند کی عارضی کیفیت کے دوران حافظہ پوری فعالیت کے ساتھ گزشتہ واقعات کو بالتفصیل پیش کر سکتا ہے تو موت کی طویل کیفیت کے دوران کیوں نہیں کر سکتا، موت طویل نیند ہے۔ اس طویل نیند کے دوران عمر بھر کی کمائی کی جو بیلنس شیٹ آنکھوں کے سامنے آئے گی اس میں اگر کچھ نفع ظاہر کیا گیا ہے۔ تو اس کی مسرتیں بھی طویل ہوں گی اور اگر خسارہ ظاہر کیا گیا ہے تو اس کا رنج وملال بھی طویل ہوگا۔ یہ سب کچھ اس دلیل پر مبنی ہے کہ جو "انسانی ذات" نیند کی عارضی موت کے دوران زندہ وباشعور رہے وہ موت کی طویل نیند کے دوران بھی زندہ اور باشعور رہے گی۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھ کر یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں کہ "انسانی ذات" کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور ہم اس مقصد کو کس طرح باحسن طریق پورا کر سکتے ہیں۔ اب تک جو حقائق سامنے آئے ہیں انہیں ایک بار پھر دہرا لیتے ہیں۔ آزاد سوچ (FREE THINKING) اور قرآنی رہنمائی سے بصیرت پانے والی عقل دونوں کا فیصلہ یہ ہے کہ "زندگی"

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ایک مسلسل رواں دواں رہنے والی وحدت ہے جو اپنی تکمیل و ارتقا کی طرف آگے ہی آگے بڑھتی رہتی ہے

۱۔ جب یہ جمادات، نباتات اور حیوانات کی سطح سے بلند ہو کر پیکرِ انسانی میں پہنچی تو اس میں ایک ایسی چیز کا اضافہ ہوا جو اس سے پہلے "زندگی" کی کسی مرئی یا غیر مرئی شکل میں موجود نہ تھی۔

۲۔ اس نئی اضافہ شدہ چیز کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رُوح کہہ کر پکارا ہے کیونکہ یہ نہ تو کسی مادی ارتقا کا نتیجہ ہے اور نہ ہی یہ جسمانی تغیرات سے متاثر ہوتی ہے۔

۳۔ یہ آلوہیاتی توانائی انسانیت کا وہ خاص جوہر ہے جو اسے تمام دوسری ارضی و سماوی مخلوقات سے ممتاز بناتا ہے،

۴۔ اس الوہیاتی توانائی کو انسانی ذات، نفس، خودی، شخصیت وغیرہ بہت سے نام دیئے گئے ہیں۔

۵۔ انسانی ذات جن قوتوں یا صلاحیتوں کی مالک ہے۔ انہیں قرآن حکیم نے سمع، بصر اور قلب (یا فواد) کی جامع اصطلاح عطا کی ہے۔ سمع اور بصر سے علم، عقل اور تفہیم، نیز قوت فیصلہ اور قوت حافظہ وغیرہ کا استنباط ہوتا ہے اور قلب یا فواد سے جذبات، احساسات اور اختیار و ارادہ کی قوتیں وابستہ ہیں انسانی ذات "جسم" کا واسطہ بنا کر ان صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے اور اپنا اظہار کرتی ہے۔

۶۔ انہی قوتوں کی وجہ سے انسان آزاد اور ذمہ دار قرار پاتا ہے اور انہی کے صحیح یا غلط استعمال کے لئے وہ جوابدہ ہے۔

۷۔ "انسانی ذات" کی چند خصوصیات یہ ہیں۔

ا۔ اس میں قیام و ثبات ہے۔

ب۔ یہ آزاد اور فعل مختار ہے۔

ج۔ یہ بلند تر سطح زندگی کی طرف بڑھنے اور اسے طے کر جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

د۔ قدروں کی پہچان اور تخلیق صرف یہی کر سکتی ہے۔

ہ۔ اس کے عروج و زوال کا دارومدار تمام تر اس کے اپنے ہی سعی و عمل پر ہے۔

و۔ اس کے اندر صفاتِ ربانی کے جذب اور منعکس کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے

ز۔ یہ متاعِ گراں بہا ابنائے آدم کو عطا ہوئی ہے اس لئے ہر انسان صرف انسان ہونے کی بنا پر واجب تکریم ہے۔

ح۔ یہ ذاتِ کبریا کا حصہ یا جزو نہیں ہے کیونکہ اس کی نمود عمل تخلیق سے ہوتی ہے، عمل تولید سے نہیں ہوئی۔

ط۔ یہ بیش بہا چیز "انسان کو امانتاً دی گئی ہے۔

ی۔ جسم اس کے فعال ہونے کا ایک "واسطہ" ہے جسم ختم ہو جائے تو فعالیت ختم ہو جائے گی یہ خود برقرار رہے گی۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ک ــ قوّتِ حافظہ بھی اس کی ایک صلاحیت ہے جو طبعی قوانین سے بہت حد تک غیر متاثر رہتی ہے اور جسم کی موت کے بعد دوسری صفات کی طرح یہ بھی انسانی ذات کے ساتھ ملی رہتی ہے

اب آگے بڑھیئے اور اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع اور عریض کائنات کا جائزہ لیجئے۔ سر جیمز جینز اور سر جیمز جینز نے اس کے انتہائی صحیح توازن و تناسب کو دیکھ کر اسے ایک بہت بڑے ریاضی داں کی تخلیق کہہ دیا تھا۔ مشرق و مغرب کے قدیم اور جدید دانشوروں، فلسفیوں، سائنسدانوں اور عقلیت پرستوں نیز قلب و نظر کی گہرائیوں میں اتر جانے والوں نے بڑا دیکھا ہے، ہر انداز سے اور ہر پہلو سے اسے دیکھا ہے، پرکھا اور جانچا ہے لیکن سب کے سب بے اختیار ہو کر یہ پکار اٹھے ہیں۔ کہ اس کارخانۂ قدرت کے نظام میں کہیں کوئی نقص نہیں، عیب نہیں، جھول نہیں، خرابی نہیں، کمی نہیں، بلکہ ہر جگہ حسن ہے جمال ہے، توازن اور تناسب ہے۔ پختہ اور اٹل قوانین کی فرماں روائی ہے اور کروڑوں، اربوں چیزوں کے درمیان بھی ایک ناقابلِ شکست ربط و ضبط ہے۔ یہ تمام باتیں کبھی از خود پیدا نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا ان کے پیچھے کوئی انتہائی پختہ عقلیت اور نہایت ہی کامل ذہن کام کر رہا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ عقلمندی سے کیا ہوا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس عظیم الشان کائنات کی تخلیق کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ تاہم یہ مقصد بے نتیجہ ثابت ہوگا جب تک اس مقصد کو سمجھنے اور اسے آگے بڑھانے والی کوئی ہستی موجود نہ ہو۔ انسان اتنی بڑی کائنات کا ایک نہایت معمولی سا حصہ ہے لیکن نہایت معمولی سا حصہ ہوتے ہوئے بھی تنہا وہی صاحبِ شخصیت وجود ہے جو مقصدِ تخلیق کو سمجھ بھی سکتا ہے اور اس کو آگے بڑھا بھی سکتا ہے۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں دو مختلف نظریاتِ حیات کا ذکر کیا تھا۔ مادی نظریۂ حیات رکھنے والے عقل کے علاوہ اور کسی چیز کو اپنا رہنما تسلیم نہیں کرتے، جبکہ دوسرا نظریۂ حیات رکھنے والے عقل کی قوت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے وحیٔ ربانی کی رہنمائی کے تابع رکھتے ہیں۔ عقل کی فطرت میں یہ خاصیت رکھ دی گئی ہے کہ یہ اپنے مالک کی وفادار رہے پس جب عقلِ خود بین و مفاد پرست نے انسان کو حیوانوں کے زمرے میں شمار کر لیا تو اس نے سوچا کہ جس طرح حیوان کا مقصد صرف اپنے تن بدن کو آسائش بہم پہنچانا ہے اسی طرح انسان کو بھی صرف یہی مقصد اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ جس طرح طاقتور وحشی جانور کمزور جانوروں کا شکار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح طاقتور انسانوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ دوسرے کمزور انسانوں کو شکار کریں۔ جس طرح جنگل کے قانون میں چھینا جھپٹی، دوسروں کی کمائی اُچک لینا۔ اوروں کی محنت کے ثمرے پر جبراً قبضہ کر لینا جائز ہے اسی طرح انسانوں کی دنیا کا قانون بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہونا چاہیئے تاکہ مادی زندگی کی توانائی میں فرق نہ آنے۔ اس کے برعکس دوسرا نظریۂ حیات رکھنے والوں کا فیصلہ تھا کہ عقلِ محض کوتاہ بین، خود نگر اور مفاد پرست ہے یہ قوت ممد و معاون بن سکتی ہے۔ لیکن انسان کی آقا اور مالک نہیں بن سکتی۔ عقل سے تسخیرِ کائنات کا کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن تسخیرِ کائنات کے مفادات کی تقسیم وحیٔ ربانی کی رُو سے ہونی چاہیئے جو عقل کو بے لگام ہونے سے روک سکتی ہے۔ اور جو اسے صحیح راستے پر گامزن رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کے مقصد کے بارے میں وحیٔ ربانی سے ہدایت ملی تو اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ:

ا ــ اہلِ ایمان کی موت و حیات خدائی پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے (۶:۱۶۲) اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۲ ۔ سلسلۂ موت و حیات اس لئے جاری کیا گیا ہے کہ اس میں تمہاری صلاحیتوں کا امتحان ہو جائے اور تمہیں حُسنِ عمل کے مواقع میسر آسکیں (۲ : ۶۷)

یعنی بات صاف ہو گئی۔ خدائی پروگرام کی تکمیل اور انسانی ذات کی نشوونما۔ یہ ہیں دو مقاصد جن کی تکمیل کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔

خدائی پروگرام کے سمجھنے کے لئے کائنات کی وسعتیں اپنی تمام و کمال جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہماری چشم بصیرت کے مشاہدے کے سامنے دامن کشا ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے کہ جلوہ گاہِ فطرت کا نظارہ محض تماشائی بن کر نہ کرو۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کا باشعور اور فعال جزوِ اعظم سمجھ کر کرو۔ ہر چیز کا قریب ترین زاویے سے مطالعہ کرو گے تو تم اس نکتے کو پا لوگے کہ یہ سارا نظام تسلیم و اطاعت کے قانون اور مکافاتِ عمل کے اٹل اصولوں پہ چل رہا ہے۔ لہٰذا تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نظام بھی اسی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اشیائے فطرت میں توازن و تناسب کا بے نظیر حُسن دامنِ دل میکشد کہ جا اینجا ست۔ تم بھی اپنے فکر و عمل میں توازن و تناسب پیدا کرو۔ فطرت ہر لمحے "حُسن کی تخلیق" میں مصروفِ عمل ہے، تم بھی تخلیق کے پروگرام کو آگے بڑھاؤ اور انسانی معاشرے کو حُسن کی ضیا پاشیوں سے منور کر دو۔ فطرت کا ہر عمل ارتقا پر منتج ہوتا ہے۔ تمہارا بھی ہر قدم آگے ارتقا کی طرف اُٹھے۔ فطرت میں ہر طرف وحدت ہی وحدت کے جلوے ہیں۔ تمہارے بھی اقوال و افعال میں ثنویت نہ آنے پائے فطرت کا ربط و ضبط ایک مکمل اکائی کے رشتے میں پرو دیا ہوا ہے۔ تم بھی صفحۂ ہستی پہ نقشِ واحد بن کر رہو۔ ہر سیارہ اپنے محور پر گردان رواں ہے۔ کوئی دوسرے کی راہ میں حائل نہیں ہوتا، متصادم نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے پر چڑھ نہیں دوڑتا۔ تم بھی یک رنگی اور باہمگی کے اصولوں پر چلو۔ فطرت کی ربوبیت کے پروگرام کا مشاہدہ کرو۔ ہر چیز اپنے سعی و عمل اور دوسروں کے بے لوث تعاون سے اپنی ممکنہ صلاحیتوں کی تکمیل کر رہی ہے۔ تم بھی زندگی کو اسی طرح نکھار دو۔ ہر بیج کو اپنے اندر کے درخت کو تکمیل تک پہنچانے کے "مواقع فراہم کرو۔ اشیائے فطرت کے راستے میں بھی مخالف اور متحارب قوتیں مزاحم ہوتی ہیں۔ لیکن یک مقصدیت کا قوی جذبہ ان سب موانعات پر قابو پا لیتا ہے۔ تمہارے سعی و عمل کی راہ میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوں گی لیکن تم ہمت ہار کر بیٹھ نہ رہنا، تندیٔ بادِ مخالف تو تمہیں اور زیادہ اونچا اُڑانے کے لئے ہے۔ سکون اور جمود کا نام موت ہے۔ تم تمنائے حیات کی زبردست قوت کو آواز دینا۔ وہ فوراً تمہاری مدد کو پہنچ جائے گی۔ تمہارا ہاتھ تھام لے گی۔ اس رفیقِ اعلیٰ کی رہنمائی پہاڑوں جیسی رکاوٹ کو بھی اپنی ٹھوکر سے پاش پاش کر دے گی۔ ہواؤں میں اڑنے والے پر پھیلائے پرندوں کو دیکھو، پانی میں بسنے والی مخلوق کا مشاہدہ کرو، بے آب و گیاہ صحراؤں میں زندگی کے آثار ڈھونڈو، برفانی چوٹیوں پہ قدرت کی نیرنگیاں ملاحظہ کرو۔ ہر جگہ تمہیں بقائے زیست کی فتحیابیوں کے نشان ملیں گے۔ "زندگی" متحارب قوتوں سے نبرد آزما ہو ہو کر آگے بڑھ رہی ہے۔ ہر چھوٹی بڑی مخلوق اپنی صلاحیتوں کو امتحان میں ڈال کر خدائی پروگرام کی تکمیل کر رہی ہے ان سب میں شعور اور ادراک کی کمی ہے۔ لیکن تم تو دانا و بینا صاحبِ شخصیت مخلوق ہو۔ خدائی پروگرام کی غرض و غایت کو بھی سمجھ سکتے ہو، فطرت کو تسخیر کر کے اپنی قوتوں میں اضافہ بھی کر سکتے ہو۔ اور تسخیرِ فطرت کے ماحصل کو پوری انسانیت کی فلاح و بہبود اور نشوونما کے لئے استعمال بھی کر سکتے ہو۔ اس طرح تم تخلیقِ کائنات کے مقاصد کو بہتر اسلوب اور زیادہ حُسن کارانہ طریق عمل سے پورا کر سکتے ہو۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس طرح تمہاری "انسانی ذات" بھی زیادہ توانا اور مستحکم ہوتی چلی جائے گی اور ربوبیت عامہ کا پروگرام بھی آگے بڑھتا جائے گا۔ اس پروگرام کو صرف صاحبِ شخصیت ہستی ہی تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔ اور وہ صاحبِ شخصیت ہستی تم ہو!

"انسانی ذات" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ بامعنی ربط قائم کرنے کے لئے اپنی جیسی دوسری شخصیتوں سے گھل مل جانے کو پسند کرتی ہے، کیونکہ اسے اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے لئے اپنے ہم جنسوں کی مدد، تعاون اور ہمدردی کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ اس لئے کہ دوسروں کے بھی وہی مقاصد ہیں جو اس کے اپنے ہیں۔ لہٰذا یہ مشترکہ مقاصد صرف مشترکہ سعی و عمل سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔ چونکہ کوئی ذات تنہا اور دوسروں سے الگ رہ کر نہ اپنی صلاحیتوں کو آزما سکتی ہے اور نہ انہیں ارتقاء دے سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے رہبانیت کی ہر شکل کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ہر "ذات" کی خواہشیں صرف اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہیں کہ وہ دوسروں سے تبادلۂ خیالات کرے اور ان کے بلند حوصلوں سے حوصلہ یاب ہو۔ معاشرے کا وجود اسی لئے "انسانی ذات" کے لئے ضروری ہے۔ معاشرے میں اختلافات اور تضادات اگر نیک نیتی پر مبنی ہوں، تو انسانی ذات کے لئے امتحان بھی بن جاتے ہیں اور اس کی پیش رفت میں مدد بھی دیتے ہیں۔ "انسانی ذات" کی ممکنہ صلاحیتوں اور قوتوں کو بہ حسن و خوبی تکمیل کی حد تک لے جانا سفرِ زندگی کی آخری منزل ہے۔ لیکن اس منزل تک لے جانے والی شاہراہ بازار کے عین بیچ میں سے گزرتی ہے۔ شہر و دیار سے باہر جنگلوں کی تنہائیوں سے ہو کر نہیں جاتی!

شعور و ادراک، علم، ذہانت، اختیار و ارادہ، جذبات وغیرہ کی جتنی صلاحیتیں انسان کے پاس ہیں ان کی حیثیت ہتھیاروں جیسی ہے یا ان خدمت گاروں کی مانند ہے جو اپنے آقا کے سامنے دست بستہ کھڑے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ قرآن حکیم بار بار تنبیہہ کرتا ہے کہ "انسانی ذات" کا کھو جانا بہت بڑا عذاب ہے (۹:۵۵) اور یہ بھی کہ مفاداتِ عاجلہ کے عوض اپنی ذات کو بیچ دینا بہت بڑے خسارے کا سودا ہے (۲:۹۰-۲:۱۰۹) آج غلامیوں کے انداز بدل چکے ہیں، زنجیریں بھی وہ نہیں رہیں جو "ازمنۂ تاریک" میں استعمال ہوتی تھیں۔ تاہم انسان کو غلام بنانے کا اور غلام بننے کا کچھ ایسا چسکا پڑ چکا ہے کہ ذہنوں سے آزادی کے معنے ہی محو ہو چکے ہیں۔ ہم قدیم انسان کی سادہ لوحی پر ہنستے ہیں کہ یہ بیچارے اپنے خدا، مٹی اور پتھر وغیرہ سے آپ ہی بناتے تھے اور پھر آپ ہی ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے، ذرا سوچئے کہیں آج کا نام نہاد ترقی یافتہ انسان بھی وہی کچھ تو نہیں کر رہا۔ جو یہ غیر مہذب لوگ کرتے تھے! کیا یہ بھی اپنے "ہاتھوں سے بنائی ہوئی" چیزوں کی حاکمیت کو تسلیم کر کے ان کے آگے سجدہ ریز تو نہیں ہے۔ مشینیں عقل کی غلام ہیں۔ عقل انسان کا خادم ہے۔ مشینوں کو خدائی طاقتوں کا مظہر سمجھ لینا گویا خادموں کے خادموں کی غلامی کا دم بھرنا۔ جو کوئی اپنے آقا ہونے کی حیثیت کو بھول کر اپنی عکیسہ چیزوں مثلاً علم، عقل، جذبات وغیرہ کی پرستش شروع کر دیتا ہے وہ گویا شرفِ انسانی کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔

"انسانی ذات" کی نشوونما کیسے کی جائے؟ اس کے لئے قرآن حکیم نے تاریخ اور آثارِ قدیمہ سے مثالیں دے کر، مظاہرِ فطرت کو پیش کر کے، واقعاتِ حاضرہ کی آنکھوں دیکھی شہادتوں کے ذریعے، عقل و بصیرت کو دعوتِ فکر دے کر، اسلوبِ بیان کو بدل بدل کر اور مختلف پیرایوں سے وضاحتیں اور تشریحیں پیش کر کے اس جوہرِ انسانیت کے تحفظ کے طریقے اور اس کو مستحکم بنانے کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ یہاں ہم ان تمام باتوں کا احاطہ تو نہیں کر سکتے تاہم ایک خاص قرآنی اصطلاح کی تھوڑی سی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وضاحت پیش کر دیتے ہیں جو معانی کے اعتبار سے نہایت جامع ہے اور اُن تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ جو اس سوال کے سلسلے میں سامنے آسکتے ہیں۔ یہ جامع اصطلاح جسے قرآن حکیم نے بہت زیادہ اہمیت دی ہے "تقویٰ" ہے۔ عام طور پر اس لفظ کے معنے "پرہیزگاری" کئے جاتے ہیں جو ایک سلبی صفت (NEGATIVE VIRTUE) ہے۔ تقویٰ کی اصطلاح میں زندگی تباہیوں سے بچ کر چلنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کا ایجابی پہلو (POSITIVE ASPECT) بھی ہے جس پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جس چیز کو سیرت و کردار کی بلندی کہا جاتا ہے یا جسے کیریکٹر کی مضبوطی اور پائیداری سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ اس کا ایجابی پہلو ہے۔ کیریکٹر کی تعریف میں مغرب کے علماء (اخلاقیات) متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ہاں خود اخلاق (MORALITY) کے معیارات بھی مختلف ہیں۔ قرآن حکیم نے اس مشکل عقدے کو بڑی آسانی سے حل کر دیا ہے۔ اس نے زندگی کی دو سطحیں پیش کر دی ہیں' ایک حیوانی سطح کی زندگی ہے دوسری انسانی سطح کی زندگی ہے۔ حیوانی سطح کی زندگی روٹی۔ کپڑے اور مکان یا تحفظِ خویش — (SELF-PRESERVATION) تغلب (SELF-ASSERTION) اور افزائش نسل (PROCREATION) سے آگے نہیں بڑھتی۔ تحفظِ خویش (روٹی۔ کپڑا۔ مکان) کا جذبہ اس قدر قوی اور شدید ہے کہ کوئی فرد اپنے مفادات کے مقابلے میں دوسرے کے مفادات کی پرواہ نہیں کرتا اور اس سے باہمی کشمکش کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔

انسانی سطح کی زندگی کا مقصد "انسانی ذات" کی نشو و ارتقا ہے۔ یہ ارتقا ان بلند اور مستقل قدروں کے تحفظ سے حاصل ہوتا ہے جو ہدایتِ ربانی کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں۔ حیوانی سطح کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ حیوانی سطح کا کوئی تقاضا انسانی سطح کے تقاضے کے مقابل میں آجائے تو حیوانی سطح کے تقاضے کو قربان کر دینا ہوگا۔ یہ تقویٰ ہے۔ اس کی مزید وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔ یہاں اتنا جان لیں کہ "زندگی" کو محض حیوانی سطح تک محدود رکھنا اور انسانی سطح کی زندگی سے آنکھیں بند کر لینا قرآنِ حکیم کے ارشادات کی رُو سے کفر ہے (۲۵:۴۴ - ۴۷:۱۲)

"انسانی ذات" کے بارے میں سورۃ وَالشّمس (۹۱) کی پہلی دس آیات نہایت بلیغ اور فصیح ہیں۔ مظاہرِ فطرت کے اضداد کو سامنے لاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ "نفس" یعنی ذاتِ انسانی کی تراش و خراش اور آراستگی اور پیراستگی اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ یہ ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے اور یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو تحفظ دے کر یہ توانا اور مستحکم بن جائے۔ فجورہا اور تقوٰیہا کے دو لفظ بڑے معنی خیز ہیں۔ فجر پھٹ جانے کو کہتے ہیں۔ فجورہا نفسِ انسانی کی وہ خاصیت ہے۔ جس کے تحت یہ ریزہ ریزہ ہو کر (DISINTEGRATIVE) ہو جاتی اور بکھر جاتی ہے۔ تقوٰیہا اس کی وہ خاصیت ہے جو اسے مجتمع رکھ کر محکم اور مضبوط بناتی ہے یعنی (INTEGRATE) کر لیتی ہے۔ جب انسانیت کی سطح کی بلند قدریں اور ان کا تحفظ و استحکام انسانی ذات کے پیش نظر رہتا ہے تو یہ ارتقا کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیتی ہے۔ جب اس کی صلاحیتیں ادنیٰ اور پست مفادات کے حصول کے لئے صرف ہونے لگتی ہیں تو انسانی ذات غیر مجتمع ہو کر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ گویا اپنی ذات کو مجتمع رکھنا یا اسے بکھیر دینا خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت ایک تمثیل کے ذریعے اگلی دو آیات میں اس طرح کی گئی ہے:

۱۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۔ وہ کامیاب ہوا جس نے اس کو نشوونما دی (۹۱:۱۰)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۲۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا: وہ ناکام ہوا جس نے اس (نعمتِ عظمیٰ) کو خاک میں ملا دیا (۱۱ : ۹۱)

تمثیل کاشتکاری کے پیشے سے لی گئی ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے ان چار لفظوں کے معانی پر غور کیجئے۔ اَفْلَحَ۔ زَکّٰہَا۔ خَابَ اور دَسّٰهَا۔ عربی زبان میں فَلَّاحٌ کاشتکار کو کہتے ہیں۔ جو زمین کو ہل سے پھاڑتا ہے۔ فَلَاحَۃٌ کھیتی باڑی ہے، کسان کی محنت کا پھل اُسے یہ ملتا ہے کہ فطرت ایک ایک دانے کے بدلے سو سو دانوں سے اُس کی جھولیاں بھر دیتی ہے۔ اس اعتبار سے فلاح کے معنے ہوئے کامیابی اور بقاء۔ مُفْلِحُوْن وہ ہوئے جن کی کھیتیاں پروان چڑھ گئیں جن کا سعی و عمل ثمر بار ہوا اور جنہیں کامیابی اور بقاء نصیب ہوگئی۔

زکا کے بنیادی معنے ہیں نشو و نما، بالیدگی، پھلنا پھولنا، بڑھنا، ارتقا پانا۔ اَلزَّکٰوۃُ کے بھی یہی معنے ہیں۔ چونکہ پودوں کی صحیح بالیدگی کے لئے شاخ تراشی اور فالتو جڑی بوٹیوں کا نکالنا بھی ضروری ہوتا ہے اس لئے اَلزَّکٰوۃُ اور تزکیہ کے ثانوی معنے صفائی کے بھی ہیں۔ قرآنی نظام معاشرت کے دو بڑے ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں اقامت صلوٰۃ کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ ایتاء کے معنے ہیں دینا اور زکوٰۃ کے معنے ہیں نشو و نما" یعنی نوعِ انسانی کی نشو و نما (GROWTH OR DEVELOPMENT) کا سامان بہم پہنچانا۔ اس "نشو و نما" میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی "ذات" کی بالیدگی دونوں شامل ہیں۔

خَابَ کے معنے ہیں محروم رہ جانا، نقصان اٹھانا، مایوس اور ناکام ہو جانا۔ چقماق پتھر کا اپنی چنگاری سے محروم ہو جانا، توقعات کا کٹ کر رہ جانا، خاسر اور تہی دامن ہو جانا وغیرہ

اَلدَّسُّ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے نیچے چھپا دینے، دبا دینے یا دفن کر دینے کو کہتے ہیں۔

ان معانی کی روشنی میں مذکورہ دو آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ جس کسی نے اپنے جوہر انسانیت کو بڑھنے، پھلنے پھولنے کے لئے مواقع فراہم کئے تو اس کی نشو و نما میں دلچسپی لی۔ اس کی بالیدگی کے لئے سعی و عمل کیا، اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی اور وہ کامیاب و کامران ہوا لیکن جس نے انسانی ذات کے لئے ابھرنے کو دبلو دیا اور اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیا۔ اسے بخیلوں کی طرح چھپا دیا۔ اس کی برومندی اور بالیدگی کی استعداد کو خاک میں ملا دیا۔ اس کی کشتِ حیات ویران و برباد ہوگئی، اسکی زندگی کی چقماق کی چنگاری بجھ گئی۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۶۔ ذاتِ باری تعالیٰ

(۱)

"خدا" کے عقیدے اور "مذہب" کے تصور دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ کیونکہ خدا کے بغیر مذہب اور مذہب کے بغیر خدا کا کوئی خیال انسانی ذہن پیدا نہیں کر سکتا۔ جس کسی محقق نے "مذہب" کی ماہیت اور اس کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں تاریخی یا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے تو اس نے پہلے خدا کے عقیدے کی چھان بین کی ہے اور جس کسی نے خدا کے عقیدے کا کھوج لگایا ہے اس کے لئے مذہبی تصورات کا مطالعہ بھی ناگزیر رہا ہے۔ تاہم عجیب بات یہ ہے کہ آج تک کوئی بھی محقق، فلسفی اور مفکر ہمیں اس سوال کا تسلی بخش اور حتمی جواب نہیں دے سکا کہ مذہب کیا ہے؟ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جب تک ہم مذہب کے ابتدائی دھندلے سے نقوش سے شروع کر کے اس کے "مکمل ضابطہ حیات" بن جانے تک کے تمام ارتقائی مراحل کا بغور مطالعہ نہ کریں ہمارے سامنے خدا کا تصور بھی صحیح اور واضح خد و خال کے ساتھ نہیں ابھرتا۔ اسلامی کیلنڈر کی یہ پندرھویں صدی جدید علوم اور حیرت انگیز ٹیکنالوجی کے عروج کی صدی ہے۔ آج نقد و نظر کے پیمانے اور زاویے بھی مختلف ہیں اور ایمان و یقین کے معیارات بھی بدل چکے ہیں۔ ایک "مولانا" نے بڑے حسرت ناک لہجے میں کہا: اب وہ پہلے سے صاحب ایمان کہاں؟ اس عاجز نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: وہ پہلے سے کافر بھی تو نہیں رہے! نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں۔ عام ذہنی سطح کا آدمی بھی ہر چیز کو سوالیہ انداز سے دیکھتا ہے اور پھر وہی چیز قبول کرتا ہے جسے وہ اپنے لئے نفع بخش سمجھتا ہے مثلاً کچھ عرصہ ہوا جاپان کی ایک بڑی شخصیت سے پوچھا گیا! "خدا" کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو اس نے صاف صاف کہہ دیا "ہم کاروباری لوگ ہیں کسی ایک قسم کے خدا پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ جس قسم کے خدا کو دنیا میں ترقی کرتا دیکھتے ہیں اپنے خدا کو اسی کے روپ میں ڈھال لیتے ہیں" یہ اندازِ فکر صرف اہلِ جاپان کا نہیں ہر مادہ پرست کا ہے۔ بلکہ ہر اس شخص کا ہے جس کے سامنے انسانی تاریخ نے جابر خود مختار بادشاہوں، ڈکٹیٹروں، قبائلی سرداروں اور وڈیروں کے قاہرانہ کارناموں کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ دنیادار لوگ مفادات سے الگ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتے۔ سوچیں بھی تو کیوں اور کیسے سوچیں۔ جب آج کی زندگی ایسی پیچیدہ اور پُرمسائل ہو گئی ہے کہ آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا تصور ہی باقی نہیں رہا۔ ہر طرف جبر ہی جبر ہیں جنہوں نے خدائی اختیارات کے ساتھ قلب و نظر کو پابندِ سلاسل کر رکھا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قلب و نظر کے سکون و اطمینان کے بعد خدا کا تصور ابھرتا ہے یا یہ خدا پر عقیدہ رکھنا ہے جس سے قلب و نظر کو تسکین اور فرحت نصیب ہوتی ہے۔ یا شاید دونوں باتیں ایک ساتھ صحیح ہیں۔ ممکن ہے آئندہ سطور میں اس سوال کا جزوی یا مکمل جواب آپ کو مل جائے تاہم ایک نہایت ضروری بات

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جسے کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے یہ ہے کہ جب انسان اپنی خواہشات کی غلامی اختیار کرکے اپنے آپ کو بے بس بنا لیتا ہے۔ تو پھر حریّتِ فکر کی دولت اس کے ہاتھوں سے چھن جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں خواہشات کی چکا چوند سے چندھیا جاتی ہیں اس کی سماعت یکسر ماؤف ہو جاتی ہے اور اس کے قلب پر غلاف در غلاف پردے پڑ جاتے ہیں۔ پھر سمع و بصر اور قلب کے اس طرح مفلوج ہو جانے سے وہ فکری تخلیق کے شرف سے محروم ہو جاتا ہے اور اس محرومی کے نتیجے میں حیوانی سطح زندگی پر گر جانے سے واضح اور روشن حقیقتوں کا سمجھنا بھی اس کے لئے دشوار ہو جاتا ہے کیونکہ تفہیمِ حقائق خاصۂ انسانی ہے خاصۂ حیوانی نہیں ہے، تاہم حیوانی سطح پر گرے ہوئے انسانوں کو واپس انسانی سطحِ زندگی کی طرف بلانے والی عظیم ہستیاں اس نازک مرحلے پر ہمیشہ سامنے آجاتی رہی ہیں اور مشکلات کے باوجود خلقِ خدا کو اپنے صحیح مقام پر رکھنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ مذہب کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے، اور سائنس، فلسفہ، آثارِ قدیمہ، نفسیات وغیرہ کے ترقی یافتہ علوم بھی انسان کی "اسی روحانی عروج و زوال" کی داستانیں ہیں!

جن مفکرین نے مذہب کی نوعیت کے بارے میں کچھ سوچا ہے انہوں نے "انسانی ذات" کی تین خصوصیتوں یعنی ۱) قوتِ فکر و تدبر ۲) قوتِ اختیار و ارادہ اور ۳) جذبات و احساسات کو بنیاد بنا کر علی الترتیب یہ تین نظریے قائم کئے ہیں:

۱۔ مذہب کا ذہنی یا عقلی نظریہ (INTELLECTUAL THEORY OF RELIGION)

۲۔ مذہب کا اخلاقی نظریہ (MORAL THEORY OF RELIGION)

۳۔ مذہب کا روحانی نظریہ (ROMANTIC THEORY OF RELIGION)

عقلیت پر مذہب کی اساس رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ چونکہ مذہب مظاہرِ فطرت کے مشاہدات پر مبنی ہے اس لئے یہ ایک طرح کا علمی سعی و تجسس ہے اور اسی اعتبار سے مذہب اور فلسفے میں مماثلت اور یگانگت پائی جاتی ہے۔ مشہور جرمن فلاسفر ہیگل نے جو فلسفے کو "روح کی اونچی اڑان" کہتا تھا، یہ کہا ہے کہ فلسفے کی عظمت اور صداقت کے بعد روح کی جو دوسری مستقل آزاد فعالیت ہے اس کا نام مذہب ہے۔ اس کے اطالوی شاگرد کروس (IMAGES) نے اپنے استاد کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہر مذہب ایک خام فلسفہ ہی ہے جو دنیا کے سامنے محض خیالی تصویریں (CROACE) پیش کرتا ہے، "یہ تصویریں بھی ایسی ہیں جو فنونِ لطیفہ کے لائق ہوں تو ہوں فلسفے کی صداقت تک بلند معیار کو نہیں پہنچتیں" "مذہب" کو ایک عارضی سی روحانی جھلک تو کہا جا سکتا ہے لیکن یہ روح کی لازمی اور مستقل صورتِ حیات نہیں ہے۔ کروس کے سامنے مذہب کی جو بگڑی ہوئی صورتیں تھیں انہیں دیکھ کر ہر دانشور یہی کہتا جو کروس نے کہا ہے۔ غیر خالص مذہب میں ہمیشہ ایسے غیر ضروری عناصر عقائد بن کر داخل ہو جاتے ہیں، جن کو دیکھ کر صداقتوں کے متلاشی پریشان اور بد دل ہو جاتے ہیں۔ مذہب کی صورت آج بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ عقلیت پر مبنی نظریۂ مذہب پر بھی اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ مذہب صرف خدا یا بہت سے خداؤں کو مان لینے کا نام نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ انسان کے اندرونِ قلب کا ایسا زبردست رجحان ہے جو ایجاب، عفو خواہی کے فطری جذبے پر مبنی ہے اور جو مشہور سائیکی ایٹرسٹ ڈاکٹر ولیم براؤن کی تحقیقات کے مطابق لاشعور کی گہرائیوں سے کبھی نکل ہی نہیں سکتا۔ بلکہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔

مذہب کا اخلاقی نظریہ رکھنے والوں نے انسان کی قوت اختیار و ارادہ کو زیادہ اہمیت دے کر مذہب کو اخلاقیات کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک مذہب ہے ہی اختیار اور ارادے کو عمل کا راستہ دکھانے کا نام۔ اس نظریے کو منظم شکل میں سب سے پہلے کانٹ نے پیش کیا وہ (KANT) کہتا ہے کہ اگر ہم اپنے تمام فرائض کو خدائی احکام سمجھ کر ادا کریں تو یہ مذہب ہے۔ آپ نے گھریلو چڑیا کی آشیانہ بندی کا بارہا مشاہدہ کیا ہوگا۔ اپنی ضرورت اور اپنی پسند کا ایک ایک تنکا خدا جانے کہاں کہاں سے اٹھا کر لاتی ہے۔ تنکے گرتے رہتے ہیں اور یہ انہیں اٹھاتی رہتی ہے۔ ہزار بار گریں ہزار بار اٹھا کرتے جائے گی۔ اتنی محنت، اتنی جاں فشانی، اتنی لگن؟ اور وہ بھی بلا معاوضہ، بغیر تھکے، بغیر ہمت ہارے، بغیر کوئی حرف شکایت زبان پر لائے، آخر کیوں؟ فطرت نے ایک فریضہ اس کے ذمہ لگا دیا ہے۔ کہ تمہیں یہ کچھ کرنا ہے اور بس چڑیا کے لئے اتنا کافی ہے۔ حکم کی اطاعت اور تسلیم سے جو روحانی "تسکین مل جاتی ہے وہی اس کا معاوضہ ہے۔ چونکہ ہر مذہب اعمال حسنہ اور اچھے اخلاق کا درس دیتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کانٹ کے نظریئے میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور موجود ہے۔ تاہم مذہب کو صرف اخلاقی رجحان کہہ دینا درست نہیں ہے۔ اخلاق عالیہ کے خصوصی رجحانات کا انحصار اس بات پر ہے کہ کسی شخص کا اختیار و ارادہ اس کے فرائض کے تقاضوں کو یا نیکی کی دعوت کو کس حد تک قبول کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ کانٹ کا مفروضہ یہ ہے کہ "چونکہ نیک اعمال مجھ پر فرض کر دیئے گئے ہیں اس لئے ثابت ہوا کہ میں نیک اعمال کر سکتا ہوں۔ اس کے برعکس مذہب کہتا ہے کہ اگر توفیق ایزدی میرے شامل حال رہی تو میں نیک اعمال کر سکوں گا۔ گویا مذہب انسان کی اہلیت اور صلاحیت کو بھی تائید ربانی اور اللہ کی رحمت کے تابع کر دیتا ہے۔ یعنی اختیار اور ارادے کی قوت کو بھی اللہ کی رحمت کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اور انسان اب یہ کہتا ہے کہ نیک اعمال مجھ پر فرض ہیں لیکن میں یہ فریضہ توفیق ربی کے بغیر کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتا۔

مذہب کا رومانی نظریہ عقلی اور اخلاقی دونوں نظریوں سے مختلف ہے۔ اس میں اہمیت جذبات اور احساسات کو دی گئی ہے۔ تاہم تخیل کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس نظریئے کا بانی شلیئر ماچر (SCHLEIMACHER) کہتا ہے۔ کہ مذہب کا تعلق عقلی بصیرت سے بھی نہیں ہے۔ اخلاقی رویئے یا سیرت و کردار سے بھی نہیں ہے بلکہ یہ اس فطری احساس کا نام ہے جو کسی بھی محدود ہستی کے دل میں لامحدودیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر رڈولف آٹو نے اس قول میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی اور کہا کہ مذہب ہے تو لامحدودیت کا احساس ہی لیکن یہ خود انحصاری کے جذبے سے پیدا ہونے والا احساس ہی نہیں بلکہ اس میں وہ خوف بھی شامل ہے جو انسان کے دل میں اپنے مخلوق ہونے کے خیال سے پیدا ہوتا ہے اس کے علاوہ اس خوف اور احترام کی تہہ میں پر اسراریت کا عنصر بھی شامل ہے۔ "خدا" ایک ایسی پر اسرار ہستی ہے کہ اس کی دہشت اور ہیبت سے ہم کانپتے بھی رہتے ہیں اور اس کی طرف کھنچے بھی چلے جاتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ رومانی نظریئے میں بھی کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے۔ اس مفکر نے دراصل خدا کی ماورائیت اور اس کے قرب و احاطت کے باہمی رشتے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ اس رشتے کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ ان تینوں نظریات

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں جزوی صداقتیں موجود ہیں تاہم ہر مفکر نے مذہب کا محدود سا تصور پیش کیا ہے۔ اور اسے وسیع تر تناظر میں نہیں دیکھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بلند سطح کے ہر مذہب میں کچھ اصول و ضوابط مقرر کر دیئے گئے ہیں کچھ رسوں اور طور طریقوں کی پابندی کو بھی لازمی قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت کبریٰ کے بارے میں کچھ اعتقادات کو بھی ضروری سمجھا گیا ہے اور ان سب باتوں میں عقلیت کا عنصر بھی موجود ہے۔ اخلاقیات کا رنگ بھی شامل ہے کیونکہ کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو زندگی بسر کرنے کے اچھے طور طریقوں کو پسند نہ کرتا ہو۔ تاہم مذہب کی ہر بیانیہ تعریف (DEFINITION) اس وقت نامکمل رہ جائے گی جب تک اس میں "انسانی ذات" کی مکمل نشوونما کا حوالہ نہ ہو۔ یعنی جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ اس کے ذریعے کس طرح انسان کی قوت فکر و تدبر، قوت فیصلہ و تفہیم، قوت اختیار و ارادہ اور جذبات و احساسات کو بحد امکان اور آزادانہ طور پر نشوونما پانے کے مواقع میسر نہ آئیں گے مذہب کی کوئی بھی تعریف مکمل اور جامع نہیں کہلا سکتی۔

دوسری بات جو مذکورہ تینوں نظریات کے مطالعے سے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ آپ مذہب کو کسی بھی زاویئے سے دیکھیں اس میں خدا کا تصور کسی نہ کسی رنگ میں ضرور موجود ہوگا۔ پہلی صدی عیسوی کا مشہور سیاح اور مفکر پلوٹارک (PLUTARCH) لکھتا ہے: "آپ زمین کا چپہ چپہ گھوم پھر آئیں، کونے کونے کی سیر و سیاحت کر ڈالیں، آپ کو بغیر فصیلوں کے شہر بھی مل جائیں گے۔ بغیر حکمرانوں کے آبادیاں بھی ہوں گی۔ بغیر محلات کے سلطنتیں بھی نظر آ جائیں گی۔ بغیر خزانوں کے بستیاں بھی آباد ہوں گی، بغیر سائنس کے قصبے بھی دکھائی دے جائیں گے۔ بغیر تفریح گاہوں کے شہر و بلاد بھی بس رس رہے ہوں گے لیکن ساری زمین پر کوئی دور افتادہ گاؤں، کوئی دشوار گذار گھاٹیوں میں چھپی ہوئی بستی، کوئی جھونک، کوئی واندھا ایک بھی ایسا نظر نہ آئے گا جہاں دو چار جھونپڑیوں کے درمیان کوئی نہ کوئی معبد، کوئی نہ کوئی گرجا، کوئی نہ کوئی مندر، دویر، کنشت یا عبادت گاہ موجود نہ ہو۔ یا کوئی ایسا خاص گھر دیکھنے میں آئے جہاں دعائیں نہ مانگی جا رہی ہوں، جہاں کسی کی حضوری میں کوئی گردن نہ جھک رہی ہو۔ یا جہاں دل کی گہرائیوں سے کوئی پکار نہ اٹھ رہی ہو۔ میں نے تو کیا کسی بھی فانی انسان نے آج تک کوئی چار جھونپڑیوں کی چوہ بلکہ خانہ بدوشوں تک کی کوئی ٹکڑی بھی ایسی نہیں دیکھی اور نہ کبھی آئندہ کوئی دیکھ سکے گا۔" (بحوالہ ڈبلیو۔ ایم۔ اربن کی کتاب ہیومینٹی اینڈ ڈیٹی صفحہ ۱۵)

مذہب کے بارے میں مشہور فلسفی کانٹ اور شلیئر ماچر نے جو کچھ کہا وہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ یعنی ایک نے کہا کہ موضوعی اعتبار سے تمام فرائض کو خدائی احکام سمجھ لینا مذہب ہے۔ دوسرے نے کہا کہ ہر انفرادی چیز کو کسی کل کا جزو مان لینا مذہب ہے۔ کیونکہ تمام محدود چیزیں کسی لامحدود ہستی کی نمائندہ ہیں۔ اب کچھ اور فلسفیوں کی تعریفات بھی دیکھ لیجئے:

ہافڈنگ کہتا ہے کہ وہ چیز جو تمام مذاہب کے سب سے اندرونی رجحان (یعنی خدا) کا اظہار کرتی ہے وہی "اقدار" کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔

ولیم جیمز کا قول ہے کہ ہر فرد کے عالم تنہائی کے احساسات، اعمال و افعال اور تجربات جو کسی الوہیاتی تعلق اور واسطے سے سامنے آتے ہیں وہی مذہب کی اساس ہیں۔

کارل ورش کہتا ہے کہ "سحر" اور "مذہب" دونوں اس درمیانی واسطے کی صورت میں ابھرے ہیں جس کی مدد سے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسان نے اپنے ماحول پر قابو پانے کا عہد کر لیا تھا اور اس طرح عقلیت کی طرف پہلا قدم اٹھا کر فطرت کی قوتوں کو اپنی مرضی کے سامنے جھکا دیا تھا۔

پروفیسر جی گیلووے کے بیان کے مطابق مذہب ہستیٔ ماورا پر ایمان لانے کا نام ہے۔ اور یہ ہستی ایسی ہے کہ جس کے اندر ڈوب کر انسان اپنی آرزوؤں کی تسکین اور تکمیل تلاش کرتا ہے، اور یہ تسکین اور تکمیل عبادت کی راہ سے اس کی زندگی کو استحکام عطا کرتی ہے۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ کہتے ہیں کہ انسان اپنی تنہائی کے لمحات میں جو کچھ بھی کرتا ہے وہ مذہب و ایمان کی کسی ایسی قوت کے ساتھ کرتا ہے جو اس کے باطن کے جذبات کو پاکیزہ اور طیّب طاہر بنا دیتی ہے" مذہب کسی ایسی چیز کا نظارہ ہے جو فطرت کی موجودات میں موجود بھی ہے اور ان سے بہت دور بھی ہے، ان کی پشت پر بھی ہے اور ان کے اندر بھی ہے۔ اور یہ "چیز" ہر لمحے اور ہر آن موجود رہتی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو فی الواقعہ حقیقت (REAL FACT) ہوتے ہوئے بھی ہماری دسترس سے باہر رہتی ہے۔ جو امکان بعید بھی ہے اور قریب ترین اصلیت بھی ہے۔ جو ہر منظر گزراں کو معانی عطا کرتی ہے۔ لیکن ہماری اپنی تفہیم سے بالاتر رہتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس تک پہنچنا ہر نیکی اور ہر "خیر" کی تمنا ہے۔ لیکن یہ خود ہر پہنچ سے دور ہے۔ یہ ہماری سب سے آخری مقصود و مدعا ہے لیکن اس کی تلاش و جستجو سعیٔ لاحاصل ہے۔

سی کیمبل نے اپنی کتاب "دی سائیکولوجیکل سٹڈی آف ریلیجن" میں مذہب کے بارے میں سوچنے والے مفکرین کی کوئی اڑتالیس آراء درج کی ہیں۔ پروفیسر ڈیوکس نے ان میں (۲۸) سے تائیس تعریفات کا اضافہ کیا ہے ان میں بہت سی متضاد باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ تاہم وہ خاص بات جو تضادات کے باوجود ان سب میں مشترک ہے یہ ہے کہ کون و مکان کے اندر کوئی ایسی ماورائی قوت موجود ہے اور فعال بھی ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقام اُلوہیت پر متمکن ہے۔ ان تعریفات میں سے اکثر اس اُلوہیاتی قوت کو واحد تسلیم کرتی ہیں تاہم اس واحد قوت کے بارے میں بھی تصورات مختلف ہیں۔ یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ جس کسی نے بھی مذہب کی گہرائیوں میں اُتر کر جھانکنے کی کوشش کی ہے اس نے "خدا" کے بارے میں وہی تصور پیش کر دیا ہے جو اس کے ذہن میں، اجزائے مذہب کی ترتیب دینے سے پہلے موجود تھا۔ یا جو خدا کی کسی ایک صفت یا چند صفات کے مجموعے سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا اس پریشان خیالی کی بھی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ انسان ہر اعتبار سے محدود اور خدا ہر اعتبار سے لامحدود ہے کسی محدود چیز کے بس میں ہی یہ بات نہیں کہ وہ لامحدود کا پورا پورا ادراک کر سکے، خاص طور پر جب خود ادراک بھی محدود ہو۔ لہٰذا جو چیز پوری طرح ادراک کی گرفت میں آ ہی نہیں سکتی اُسے بیان کیسے کیا جائے۔ یہ ہے وہ فطری دشواری جو بالکل ناگزیر ہے تاہم اس بہت بڑی مشکل پر قابو پانے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا بالکل صاف انکار یا دل کے کامل ایمان کے ساتھ اقرار۔ انکار اور اقرار کے درمیان کا راستہ اختیار کرنا نہایت خطرناک رویّہ ہے اس سے عمل کا کوئی بھی نتیجہ تعمیری صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ نہ اس سے "انسانی ذات" نشوونما کی طرف قدم بڑھا سکتی ہے اور نہ نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی میں حسن و توازن پیدا ہو سکتا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اوّلین انسان سے لے کر آج کے انتہائی ترقی یافتہ دور تک "مذہب" ہر انسان کے دل کی پکار رہا ہے جب تک انسان کے سینے میں دل دھڑکتا رہے گا اور دل کے اندر جذبات کی حرارت باقی رہے گی اس وقت تک مذہب کی مقبولیت اور عالمگیر حیثیت میں فرق نہیں آئے گا۔ موجودہ دَورِ تشکیک میں مذہب کو بالکل نئے انداز سے دیکھا جا رہا ہے۔ چونکہ تشکیک کے بعد جو ایمان نصیب ہوتا ہے وہ نہایت پختہ ہوتا ہے اس لئے مذہب کا مستقبل پہلے سے کہیں زیادہ درخشاں دکھائی دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیزاری "مذہب" سے نہیں ہے بلکہ ان غیر خالص عناصر سے ہے جو بعض مصلحتوں کے تحت یا خود اہلِ مذہب کی نادانی کی وجہ سے مذہب میں داخل ہو گئے ہیں۔ مذہب اب بھی تشنہ روح کی تسکین کا اوّلین و آخرین ہے۔ لیکن جو مذہب اس وقت اس کے سامنے ہیں وہ اس کی پیاس کو نہیں بجھاتے۔

سائنسدان مذہب کو فطرت کے حوالے سے سمجھنا چاہتا ہے۔ فلسفی اسے اپنی کھوئی ہوئی حکمت سمجھتا ہے۔ ریاضی ان اسی کی ابتدا اور انتہائی کڑیوں کو ملا کر ابدی صداقتیں تلاش کر رہا ہے۔ ماہر نفسیات انفرادی تجربات کی روشنی میں اسے اپنی چیز جانتا ہے۔ معاشرتی علوم کا ماہر مذہب کو عمرانی علوم کی روح و رواں سمجھتا ہے۔ اخلاقیات کا معلم اسے اصلاحی کا گہوارہ تسلیم کرتا ہے، اقتصادیات کا طالب علم اپنے پیچیدہ مسائل کا حل اسی کی روشنی میں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ مشینی جبر کے خوف و دہشت کا ستایا ہوا شخص اسی کے دامنِ عافیت میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ گویا ہر شخص اپنی مخصوص ذہنی تربیت اور اندازِ فکر کے مطابق اسے از سر نو جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں ہے۔ یورپ کی قومیت پرستی (NATIONALISM) کا ڈسا ہوا انسان حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا سخت مضطرب اور بے قرار ہو کر ہزار جان سے چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کی موجودہ دنیا ایک اور دنیا سے بدل جائے جس میں روح کو سکون اور اطمینان مل سکے۔ مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر ژونگ اپنی کتاب "ماڈرن مین اِن سرچ آف سول" میں لکھتا ہے: "آج کرۂ ارض کی عظیم شاہراہوں پر سناٹے، ویران، اداس اور فرسودہ نظر آتی ہے" کیتھولک چرچ کا ایک پادری (TEILHARD-DE-CHARDIN) جس کی کتابوں کو اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ رقمطراز ہے:۔

"اگر ہم کو ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کرکے کرۂ ارض کی تعمیر نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے اچھال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے وحدت کا راستہ۔ اب شعور انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے نکل کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے" (بلڈنگ دی ارتھ)

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب "دی کمیونٹی آف مین" میں لکھتا ہے کہ تہذیب کہا بھی اسے جاسکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے۔ انسانی ارتقا کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسانی پر مشتمل ہو۔ مشہور امریکی مفکر اپنی کتاب "ٹرانسفارمیشن آف مین" میں لکھتا ہے کہ مغربی اندازِ معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے۔ یہ تمدن بُری طرح ناکام ہوا ہے۔ اب دنیا کو ایک ایسے عظیم ترین انسان کی ضرورت ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے . . . . جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے ۔ جولین ہکسلے جیسا دشمن مذہب بھی پکار اٹھا ہے کہ دنیا میں موجود مختلف حکومتوں کی ایک عالمگیر واحد حکومت کا قیام ہی نوعِ انسانی کو تباہی سے بچا سکتا ہے (آن ہیومن اِن لے ریوولیوشن)

سویڈن کی فلاحی مملکت دنیا میں سب سے آگے سمجھی جاتی ہے ۔ وہاں کا ماہر معاشیات GUNNER MYRDAL اپنی کتاب بیونڈ دی ویلفیئر سٹیٹ میں لکھتا ہے کہ ۔

"یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بلند مقاصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں کرۂ ارض کے نقشے پر کھینچی ہوئی نہ کوئی لکیریں، نہ قوموں کے وضع کردہ حدود ہوں ۔ یہ وہ دنیا ہوگی جہاں انسان آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے ۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورے سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اس قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو"

"انسانی روح کے مذہبی نشیمن" میں اس قسم کی خوابیدہ دنیا کا تصور تو اب عوام الناس کے ذہنوں میں بھی ابھر رہا ہے، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ حسین خواب محسوس تعبیر کا پیکر کس رنگ کا اختیار کرے گا ۔ دنیائے مغرب اپنے ارد گرد کے مذاہب سے مایوس ہو چکی ہے ۔ پروفیسر WILLIAM ERNST HOCKING اپنی کتاب "لونگ ریلیجنز اینڈ اے ورلڈ فیتھ" میں لکھتا ہے

"یہ تمام مذاہب ٹوٹی پھوٹی کشتیاں ہیں ۔ یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں، اطمینانِ خوش نے ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے ۔ ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی ۔ یہ لوگ قدامت پسندی کے کوٹھل کے تصور سے اس قدر ڈرتے اور سہمے رہتے ہیں کہ ان میں سوچ اور سمجھ سے کام لینے والا بھی کوئی جرأت مند نہیں رہا"

گویا دنیا کا انسان انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنی مشکلات کے حل کے لئے ایک بار پھر "مذہب" کے دروازے پر دستک دے رہا ۔ لیکن کس قسم کا مذہب ؟ فرائڈ کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مشہور سائیکی ایٹرسٹ ایرک فرام کا خیال ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی ،

"جو انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا جو عالمگیر ہوگا ۔ جو منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا ۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مرقع ہوگا ۔ جو عقلیت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جس کے ذریعے سائنس اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی ۔ جو انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے ۔ اسی مذہب کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ پوری نوعِ انسانی کا مذہب بن سکے ۔" (THE SANE SOCIETY)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

غور فرمایئے یہ کس مذہب کے خدوخال بیان کر رہے ہیں۔ کیا یہ وہی مذہب تو نہیں جس نے اپنے آپ کو "مذہب" کی بجائے "اَلدِّین" کہا ہے؟ افسوس تو یہ ہے کہ اپنوں اور پرایوں دونوں میں سے کسی نے اس کو آفاقی قدروں کے آئینے میں دیکھا ہی نہیں۔ جس نظریاتی، فکری، علمی اور عملی رنگ میں اسلام نے "مذہب" کو عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطۂ زندگی بنا کر پیش کیا ہے اور اسے "مذہب" کی سطح سے بلند کر کے "اَلدِّین" کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا ہے اس رنگ میں اسے دیکھنے کے لئے سائنس، فلسفہ، نفسیات، سب بیتاب نظر آتے ہیں، ہر بڑے سے بڑے مفکر اور دانشور نے اسے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن کوئی بھی "اَلدِّین" کی کاملیت تک نہیں پہنچ سکا۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ کی بیان کردہ تعریفِ مذہب کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ اگر خدا کی ہستی کا اتنا سا ادراک بھی حاصل ہو جائے جو وائٹ ہیڈ نے پیش کیا ہے تو بھی غنیمت ہے۔ عقلیت کی مدد سے ہی سہی یہ ادراک ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو تعصبات سے پاک ہو کر اَنفس و آفاق میں غور و فکر کر سکتا ہو۔ اور جو اپنے مشاہدات اور تجربات کا صحیح تجزیہ بھی کر سکے۔ وحیٔ ربانی کی رہنمائی تو خیر بڑی چیز ہے جس کسی کو نصیب ہو جائے اس کی قوتوں کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ تاہم عام عقل کی دیدہ وری بھی اگر غبار آلود فضاؤں کا پردہ چاک کرے تو حقیقتِ کبریٰ کا نظارہ کر لینے میں ناکام نہیں رہ سکتی، پاسبانِ عقل اگر دل کے پاس رہ جائے تو اچھی بات ہے تاہم دل کو کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنی واردات کو براہِ راست مجتمع کرے انہیں عقل کے مقرر کردہ معیارات پر آپ ہی پرکھ سکے۔

وارداتِ قلب کا ذکر چل نکلا ہے تو آیئے ذرا عقلیت سے ہٹ کر بھی تھوڑی سی بات کر لیں حیوانی سطح کے افعال، (ACTS) جو جبلت کے تقاضوں کے تحت سرزد ہوتے ہیں صرف طبعی ضروریات کو پورا کرتے ہیں کیونکہ اس سطحِ زندگی پر کوئی ضرورت ہوتی ہی نہیں۔ انسانی سطحِ زندگی کے اعمال (DEEDS) دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو اس کی طبعی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور دوسرے وہ جنہیں جوہرِ انسانیت کے مظاہر کہا جا سکتا ہے "عمل" صرف انسانی خاصہ ہے کیونکہ اسی کے ذریعے انسان اپنی رُوح کی پیاس کو بجھا سکتا ہے اور اپنی لطیف تر آرزوؤں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اشیائے فطرت کی ماہیت اور حقیقت تک پہنچنے کے لئے خواہ سائنس اپنی تگ و تاز میں مصروف ہے، یا صداقت کی جستجو میں خواہ فلسفہ اپنی فکر و تدبر میں ڈوبا رہے یا حسن آفرینی کے ذوق کی تکمیل میں فنونِ لطیفہ سرگرمِ عمل ہوں، یا پاکیزہ اور لطیف اور امن و سلامتی کی اعلیٰ زندگی کی تلاش میں اخلاقیات "قدروں" کا کھوج لگا رہا ہو، یہ سب انسانی سطحِ زندگی کے اعمال ہیں اور اسی بنا پر ہم انہیں طبعی افعال کی بجائے "روحانی اعمال" کہتے ہیں۔ تاہم ایک عام تجربے کی بات یہ ہے کہ طبعی اور روحانی دونوں قسم کے افعال و اعمال میں انسان کو ایک عجیب و غریب تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان ہر لمحہ تخلیق میں اور ہر حیاتیاتی عمل کے دوران اپنے آپ کو کسی "دوسرے وجود" کی حضوری میں پاتا ہے وہ وجدانی طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ "دوسرا وجود" ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اس کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی ہر بات کو سن رہا ہے اور اس کے اپنے "اندر کے شخص" سے ہمکلام ہے۔ یہ وجدانی احساس روحانی اعمال کے دوران زیادہ قوی ہوتا ہے کیونکہ یہ اعمال تخلیقی ہیں اور تخلیق کے دوران انسان اپنے جوہرِ انسانیت (من ذوجہ) کی تکمیل کی طرف قدم بڑھا رہا ہوتا ہے۔

تخلیقی اعمال کے دوران اس "دوسرے وجود" کی موجودگی کے علاوہ ایک احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ "دوسرا وجود" ہماری

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

امنگوں میں ہمارے اعلیٰ مقاصد میں، ہمارے سعی و عمل میں برابر کا شریک ہے اور ہماری آرزوؤں کی تائید کر رہا ہے، ہماری تمناؤں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور ہمارے اندر کے شخص کا غیر نہیں ہے، چونکہ ہم اس "دوسرے وجود" کو اپنے روحانی اعمال یعنی سائنس، فلسفے اور فنون لطیفہ کی تلاش صداقت میں اسی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں اس لئے ہم اپنے سعی و عمل میں اس کی طرف سے حوصلہ افزائی پا کر درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے اپنی آرزوؤں کی جزوی اور کلی تسکین میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم اس "دوسرے وجود" کو ہم جتنا زیادہ جاننے اور پہچاننے لگتے ہیں یہ ہم سے اتنا ہی زیادہ دور اور اتنا ہی زیادہ لامحدود ہوتا چلا جاتا ہے۔ خاص طور پر فطرت کے حسن و جمال کے مظہر میں جو موسیقی، مصوری اور شاعری کی تو گویا جان ہیں ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ یہ "دوسرا وجود" ہمارے پاس کہیں بہت ہی قریب ہے اور ہماری مخلصانہ پکاروں کا جواب بھی دے رہا ہے یہی وہ ربط دا یجاب ہے جس کی بدولت ہم انسانوں نے اعلیٰ قدروں کے تعینات پیدا کئے ہیں اور ان قدروں کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز بنا رکھا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ:

> "انسانی ذات" اور اس "دوسرے وجود" کے باہمی ربط و ایجاب کے مثبت رویئے کا یہ وجدانی احساس جو ہمارے انسانی عمل کے تمام تخلیقی اعمال میں ہر لمحے موجود رہتا ہے جب ارتقا کی منزل طے کر جاتا ہے تو ہم اسے مذہب کہتے ہیں۔

چونکہ یہ "دوسرا وجود" ہماری ہر پاکیزہ آرزو کا مثبت جواب دیتا ہے اس لئے ہمارے دل کے اندر جتنی بھی مستقل آرزوئیں اور ارفع مقاصد کی تکمیل کی امنگیں ایجاب و تائید و قبول کی منتظر رہتی ہیں ان سب کی تسکین ہمیں اسی "دوسرے وجود" کی رحمی میں ملتی رہتی ہے، زمانہ قدیم کے ابتدائی دور کے انسانوں کی ضروریات طفلانہ حد تک سادہ تھیں کیونکہ خود انسانی شعور نے ابھی طفولیت سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ ان لوگوں کی خواہشات عارضی اور وقتی مسائل کے حل کرنے تک محدود تھیں۔ تاہم جوں جوں انسانی شعور بلوغ کی طرف بڑھتا گیا انسان کی وہ ضروریات بھی سامنے آنے لگیں جو پہلے اس کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ آخر جب انسانی شعور پختگی کی منزل تک پہنچ گیا تو روحانی زندگی کی بلند تر سطحیں بھی واضح ہو گئیں۔ دوسرے الفاظ میں انسان کے شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کا "مذہب" بھی آگے بڑھتا رہا، تا آنکہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کی سند اسے حاصل ہو گئی۔

ابتدائی دور کا انسان اپنے معبودوں سے لمبی عمر، بچے، خوشحالی، دشمنوں کی ہلاکت یا مہمات میں کامیابی مانگتا تھا۔ آج کا انسان اپنے ایک خدا کو اعلیٰ قدروں کا منبع اور خدا اور صداقت کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ گویا مذہب اپنی ابتدائی صورت میں بھی انسانی ضروریات کی اس "دوسرے وجود" میں تسکین و تکمیل کی تلاش کا نام تھا۔ اور آج الدین کی ترقی یافتہ صورت میں بھی اس کا یہی منصب ہے۔ یہ منصب ہمیشہ برقرار رہے گا کہ "انسانی ذات" کا ارتقا اس دوسرے وجود پر انحصار کئے بغیر ناممکن ہے!

(۲)

خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے جو دلیلیں اب تک پیش کی جاتی رہی ہیں وہ سب کی سب انتہائی معقول اور ذی شعور انسان کو مطمئن کرنے کے لئے کافی تھیں۔ لیکن جدید زمانے کی عقلیت پرستی کے پیش نظر قدیم طرز استدلال میں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تبدیلیاں کردی گئی ہیں اور اب انہیں نئے ماحول کے مطابق ڈھال لیا گیا ہے۔ بحث فلسفیانہ اور خاصی طویل ہے۔ ہم اسے یہاں اختصار کے سبب پیش نہیں کر سکتے، صرف چند اشاروں تک اپنی بات کو محدود رکھیں گے۔ تاہم جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ پروفیسر سورلے (SORLEY) کی کتاب (MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD) اور پروفیسر وائٹ ہیڈ (WHITEHEAD) کی تصنیف SCIENCE IN THE MODERN WORLD) کا مطالعہ ضرور کریں۔ جدید زمانے کا ذہن جو سائنسی انداز فکر سے کچھ زیادہ ہی مرعوب نظر آتا ہے، دراصل یہ جاننا چاہتا ہے کہ ہمارے سامنے جو اتنی بڑی وسیع اور عریض کائنات پھیلی ہوئی ہے یہ کیا ہے، کیسی ہے، کیوں ہے؟ بالفاظ دیگر موجودہ دور کا انسان اس بات کی وضاحت چاہتا ہے کہ کائنات کی توجیہہ اور تفہیم کے لئے ہم کس عقلی بنیاد کو لے کر آگے بڑھیں۔ مذکورہ دو کتابوں میں ایسی تمام امکانی بنیادوں کو پیش کیا گیا ہے اور ان کی خوبیوں اور خرابیوں پر بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ عقلی معیارات پر صرف ایک ہی عقیدہ پورا اترتا ہے اور وہ یہ ہے کہ

کسی ایسی ہستی پر ایمان لانا ناگزیر ہے جو ہر لمحے تخلیق کے عمل کو آگے بڑھا رہی ہو،
جو ذی شعور شخصیت بھی ہو اور کائنات کے اندر ہوتے ہوئے اس سے ماوراء بھی ہو،
جب تک اس عقیدے کو بنیاد نہ بنایا جائے گا انسان کا کوئی بھی عمل تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکے گا۔

خدا کے وجود کو برحق تسلیم کرنے کے جن دلائل کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے وہ تین طرح کی ہیں۔ پہلی دلیل کی بنیاد اس عام تجربے پر رکھی گئی ہے کہ خدا کا تصور ذہن انسانی میں از خود موجود ہے۔ فرائڈ نے دعویٰ کیا تھا کہ تحلیل نفسی کے ذریعے تمام الجھنوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے مشہور شاگرد جان ویم ہارڈن جو خود بھی تحلیل نفسی کے طریق علاج کا بہت بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے اپنے استاد کے قول کی سچائی کا اندازہ لگانے کے لئے پے در پے کئی تجربے کئے۔ اس کا کہنا ہے کہ تحلیل نفسی کے ذریعے ہر قسم کی الجھنیں دور ہو گئیں لیکن مریضوں کے اندر مذہب کا جو تصور تھا وہ نہ صرف یہ کہ دور نہیں ہوا بلکہ ہر مریض کے دل میں پہلا استثنے پہلے سے بھی زیادہ گہرا، مضبوط اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا فرائڈ نے جو یہ کہا تھا کہ خدا کا تصور انسانی ذہن کی موہوم تخلیق ہے، قطعاً غلط ہے۔ مذہب یا خدا کا تصور ذہنی مرض نہیں ہے بلکہ ذہن کے اندر از خود موجود ہے۔ اور انسانی ذہن کی روحانی ساخت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ خدا کے تصور کا اس طرح ذہن کے اندر خود موجود ہونا خدا کے وجود کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ اسے وجودی یا آنٹولوجیکل (ONTOLOGICAL) دلیل کہتے ہیں۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں ان کے ذہن میں بھی خدا کا تصور موجود ہے کیونکہ اس تصور کے بغیر ان کا انکار بے معنی ہے۔

خدا کے وجود کی دوسری دلیل کی بنیاد وہ حسن و توازن اور ربط و ضبط ہے جو کائنات کے اندر جگہ جگہ کارفرما نظر آتا ہے اس دلیل کو نظم تکوین یا کاسمولاجیکل (COSMOLOGICAL) دلیل کہتے ہیں۔ اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ نظم و ضبط اور حسن ترتیب و تنظیم کسی عقل کل کے بغیر اپنے آپ وجود میں نہیں آ سکتا۔ ضرور کوئی علت العلل موجود ہے۔

تیسری دلیل کو مقصدیت کی اساس پر قائم کیا گیا ہے اسے ٹیلیولاجیکل (TELEOLOGICAL) یعنی مقصدیت پر مبنی دلیل کہتے ہیں۔ فطرت کو "زندگی" میں تدریجاً جاری ہے کہیں بھی کسی بیج سے کوئی شگوفہ پھوٹے، کہیں بھی کسی انڈے کا خول

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

ٹوٹتے اور اس میں سے ایک ننھی سی جان باہر جھانکے فطرت کی تمام قوتیں فی الفور آغوش شفقت وا کر کے اس کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔ نمکیات، ہوا، پانی، نائٹروجن، حرارت، روشنی سب کی سب مہربان ماں کی طرح اس نومولود کو چھاتی سے لگا لیتی ہیں۔ اور اس کی امکانی قوتوں کو ابھرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ ہر چیز اپنے نقطۂ آغاز سے سفر کر کے نقطۂ تکمیل تک پہنچنے کے لئے رواں دواں ہے شگوفہ تناور درخت بننے آرزو اور پودا تکا دہیل پھیل کر جانے کی تمنا لئے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے اور فطرت کے عناصر اس کی پرورش اور حفاظت کی تمام ضروریات مسلسل اور متواتر، بے طلب اور بلا معاوضہ نہ کم نہ بیش، پوری ذمہ داری کے ساتھ پہنچا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا یہ سب کچھ کھیل تماشا یا دل بہلاوا ہے؟ کھیل تماشے میں تو قانون کی پختگی اور پابندی ایسی نہیں ہوتی۔ توازن اور تناسب کا مضبوط اور اعلیٰ نظام پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسا بے عیب نظم و ضبط صرف اس وقت ممکن ہے، جب کوئی بہت بڑا منصوبہ زیر تکمیل ہو اور اس منصوبے کو آگے بڑھانے والا مستحکم ارادے اور عظیم قوت کا مالک ہو۔ اس کے علاوہ یہ دیکھیں کہ فطرت کا ہر عمل اور ہر مظہر با مقصد ہے۔ اس کی کوئی بھی چیز ضائع نہیں جاتی کوئی چیز فالتو نہیں ہے، بیکار نہیں ہے۔ ہر چیز کا ہر دوسری چیز کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ہے اور یہ باہمی تعلقات ایسی زنجیر کی مانند ہیں کہ جس کی کوئی کڑی بیہودہ نہیں ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق بھی کوئی نہ کوئی فریضہ ادا کر رہی ہے، ارشاد ربانی ہے۔ (۶۷: ۳-۴)

"کیا تو دیکھتا ہے رحمٰن کی تخلیق کاری میں کوئی تفاوت؟ کوئی کمی؟ کوئی جھول؟ کوئی خرابی؟
نگاہ کو پھر پلٹ کر دیکھ۔ کیا نظر آتی ہے تجھ کو کوئی دراڑ؟ پھر لوٹا اپنی نگاہ کر۔ ایک نہیں دو بار
تیری نگاہ تیرے پاس ناکام ہو کر اور تھک ہار کر واپس لوٹ آئے گی!"

یہ اعلیٰ نظم و نسق، یہ پختہ اور مکمل ضبط و ربط، یہ عیب سے پاک تخلیق صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ سارا انتظام کسی ایسی ہستی کے ہاتھ میں ہو جو ہر چیز پر قادر ہو، جو چاہے تخلیق کرے اور جو حکم ہو اس کا ارادہ اور اختیار!

کسی ہر لحاظ سے مکمل اور مطلق ہستی کا تصور بالخصوص انسانی ذہن کے لئے ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی ہے ہماری سوچ مطلقیت کے تصور سے خالی رہ ہی نہیں سکتی۔ مثال کے طور پر اگر ہم سچائی کی ماہیت پر غور کرنا شروع کر دیں تو بالآخر ہم سچائی کی اس آخری حد تک پہنچ جائیں گے جسے مطلق کہا جائے گا کیونکہ اس سے آگے نہیں بڑھا جا سکتا یہی صورت حال تمام اقدار کی ہے۔ انسانی ذہن کے لئے جزوی سچائیاں اور نامکمل قدریں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو محدود اور نامکمل سمجھتے ہیں تو اسی وجہ سے سمجھتے ہیں۔ کہ ہمارے ذہن میں اکملیت اور لامحدودیت کا تصور موجود ہے اگر یہ تصور موجود نہ ہوتا تو زندگی کا کوئی بھی تجربہ ہمیں مطلقیت کی آگہی نہ دے سکتا تھا۔ وجودی دلیل کا یہی عنصر خدا کے وجود کا حتمی ثبوت ہے!

کائنات کے حسن نظم و ترتیب سے مقصدیت کی جو دلیل سامنے آتی ہے اسے مدتوں تک کافی اور مکمل سمجھا جاتا رہا ہے لیکن جب ڈارون اور اس کے ہم خیالوں نے ارتقا کا نظریہ پیش کر کے یہ کہا کہ فطرت کی ہر چیز خود بخود ابتدائی مراحل طے کرتی ہوئی ارتقائی حد تک پہنچ جاتی ہے اس لئے فطرت کے اعمال کے پیچھے کوئی مقصد کام نہیں کر رہا تو لوگوں کے دلوں میں یہ شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے کہ یہ سب کچھ قانون اسباب و علل کے تحت ہو رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ حیات انسانیہ اور اس کے

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

گوناگوں حوادث، تجارب اور واقعات ہرگز وہ نہیں ہیں جو ایک جرثومے کی زندگی سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ یہ ان سے کہیں زیادہ بلند معیار کے ہیں۔ لہٰذا نظریۂ ارتقا کے نتائج کو حیاتِ انسانیہ پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ معترضین کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اعلیٰ قدریں محض اتفاقات کا نتیجہ ہیں اور اب قدروں کی تخلیق کا عمل ختم ہو چکا ہے۔ اگر بالفرضِ محال اس مفروضے کو مان لیا جائے کہ اعلیٰ قدریں عملِ ارتقا کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی ہیں تو پہلی قدر "علم" محض اضافی اور اتفاقیہ پیداوار کی صورت میں ہمارے سامنے آئے گی۔ کیا سائنس اپنے لئے یہ حیثیت قبول کرنے کے لئے تیار ہے؟ اگر کر لے تو پھر یہ علم صحیح ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی کیونکہ کوئی بھی چیز جس میں ارادے اور مقصد کا دخل نہ ہو یا جو محض اتفاقات کا نتیجہ ہو صحیح علم قرار نہیں پا سکتی۔ اگر سائنس علم صحیح ہونے کا دعویٰ چھوڑ دے تو نظریۂ ارتقا کا وجود کہاں باقی رہے گا؟ عقلیت کا تقاضا یہ ہے کہ "قدروں" کو محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ سمجھنے کی بجائے اس حقیقت کو مان لیا جائے کہ قدریں بھی عملِ ارتقا ہی کا حصہ ہیں اور کائنات میں ارتقا کا ہر عمل ایک اعلیٰ ترین ذہن کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بالارادہ اور بالمقصد جاری ہے۔ بعض فلسفیوں نے جو علمِ حیاتیات کے بھی ماہر تھے ڈاروِن کے نظریہ ارتقا میں ترمیم کر کے ایک نیا نظریہ فجائی یا ہنگامی ارتقا (EMERGENT EVOLUTION) کے نام سے پیش کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عملِ ارتقا ہی میں ایک نامعلوم قوت کام کر رہی ہے۔ جو اچانک ایسے نئے نئے وجود سامنے لاتی ہے جن کی تخلیق کو ان کی نوع کی کسی سابقہ کڑی سے نہیں ملایا جا سکتا۔ یعنی وہ ماہر شخص بھی جو کسی درجے سے ارتقا کی تمام سابقہ کڑیوں کا تجربی علم رکھتا ہے یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ نئی چیز کیسے وجود میں آ گئی، کیونکہ اس نئی چیز میں پچھلی شرائط میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں ہوتی۔ چنانچہ شعور، خود شناسی، بلکہ زندگی بھی اسی فجائی یا ہنگامی ارتقا کا نتیجہ نہیں۔ یہ تمام چیزیں یا اچانک نمودار ہوئی ہیں اور ان کا جوڑ کسی سابقہ کڑی سے نہیں ملایا جا سکتا۔

فجائی ارتقا کے اس جدید نظریئے سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ کائنات کا ہر عمل مشینی طرز کا ہے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ اس میں مقصدیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے تو یہ میکانکی نظریہ ترک کر دیا گیا اور اس کی بجائے یہ کہا جانے لگا کہ جدت (NOVELTY) بھی عملِ ارتقا کی ایک صورت ہے۔ اب اگر یہ پوچھا جائے کہ فجائی ارتقا میں جدت کی خاصیت کیوں اور کیسے پیدا ہوئی تو اس کے جواب میں پھر مقصدیت سامنے آ جاتی ہے۔ سیدھی سادی سی بات یہ ہے کہ مسئلے نئی اصطلاحات وضع کر لینے سے حل نہیں ہو جایا کرتے۔ حرکت کوئی بھی ہو بلا ارادہ اور بے مقصد نہیں ہوتی۔ اگر ایٹم کے اندر خلا ہے اور اس خلا کے عین مرکز میں ایک "سورج" ہے جس کے گرد پروٹون اور نیوٹرون وغیرہ کے سیارے گردش کر رہے ہیں۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس گردشِ پیہم کا کوئی مقصد نہ ہو؟ کیا اس مقصد اور افادیت کو سائنسدانوں نے اپنے مقصد اور اپنی افادیت کے تابع فرمان نہیں کر لیا؟ اگر یہ کہا جائے کہ ایٹم کی حرکی صلاحیت کا یہی مقصد تھا کہ انسان اس سے فائدہ اٹھائے تو اس سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے؟

مقصدیت کو تسلیم کر لینے کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ مقصدیت ایک عظیم ترین صانع اور خالق کے نہایت اعلیٰ ذہن میں موجود ہے۔ اور یہ اعلیٰ ذہن کسی قسم کے اسباب و علل کے قانون کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس قانون کا بھی خالق ہے۔ اس نے اپنی تخلیقی عمل کو بہ ہر نوع، بہ ہر صورت اور بہ ہر انداز جاری رکھا ہوا ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

"اللہ نے کائنات کو پیدا کیا اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کی مثل اور بنا ڈالے (۹۹:۱۷-۸۱:۳۶)
وہ ایسی چیزیں تخلیق کرتا رہتا ہے جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ہوتا (۸:۱۶-۳۶:۳۶)
اپنی مشیئت کے قانون کے مطابق مخلوق میں اضافہ کرتا رہتا ہے (۱:۳۵)

(۴۲)

موجودہ دور کی عقلیت پرستی جہاں مروجہ مذاہب اور ان کے پیش کردہ تصورات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے وہ اس بات کی بھی قائل ہے کہ انسانی زندگی کے لیے مذہب ضروری اور ناگزیر ہے یہ ایک ایسا تضاد ہے جو پچھلی نصف صدی سے بہت بڑی ذہنی الجھن کا باعث بنا ہوا ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ دنیا میں فساد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان خدا کی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب مطلقیت کا تصور بگڑ جاتا ہے۔ تو ہر وہ شخص جس کے اندر صفات خداوندی کی ہلکی سی جھلک بھی ہوتی ہے اپنی اس جھلک کو مطلق سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اور اس طرح الوہیت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ انسانی دماغ کے لیے خداؤں کا ڈھالنا مشکل نہیں ہے۔ آج تک لاکھوں کروڑوں خدا اس سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔ لیکن جب یہ خدا مجلۂ ذہن انسانی سے گر کر ٹوٹ جاتے ہیں تو پھر ان ٹوٹے ہوئے خداؤں کو جوڑ کر دوبارہ بنا لینا ناممکن ہے۔ خود انسانوں کے اندر تین طبقے ایسے ہیں جو رَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ۔ إِلٰهِ النَّاسِ بننے کے شوق میں گٹھ جوڑ کرتے رہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے فرعون، ہامان اور قارون کے علامتی ناموں سے ان تین طبقوں کو بے نقاب کیا ہے۔ لوگ ان خداؤں سے تنگ آ کر خود الوہیت کے تصور سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ جس رنگ میں ان خداؤں کو اپنی آنکھوں سے کام کرتا دیکھتے ہیں اسی رنگ الوہیت کا تصور اپنے ذہن میں بھی باندھ لیتے ہیں۔ الوہیت سے اسی قسم کی بیزاری تھی جس نے آگسٹس کامٹے (AUGUSTUS COMTE) کو مذہب سے خدا کو نکال دینے کی طرف راغب کیا۔ اس شخص نے یہ کہا کہ گوتم بدھ نے اپنے مذہب میں خدا کو کوئی جگہ نہیں دی۔ پھر بھی کروڑوں انسان اس مذہب کے پیروکار ہیں تو کیوں نہ "بے خدا مذہب" کی بنیاد رکھی جائے۔ اس نے مزید کہا کہ انسانی علم اپنے موجودہ ارتقا تک تین ادوار میں سے گزر کر پہنچا ہے پہلا دور مذہبی عقائد کا تھا۔ پھر فلسفے اور عقلی تحقیق کا دور آیا اور یہ اپنی آخری منزل "سائنسی حقائق" کے دور میں پہنچ چکا ہے۔ اس لئے اب انسان کے لئے صرف سائنسی علم ہی کا راستہ کھلا ہے۔ خدا کے بارے جتنے بھی عقیدے پائے جاتے ہیں ان سب کو ذہنوں سے نکال دینا چاہیئے کیونکہ یہ واہموں کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ البتہ مذہب کا جذبہ ایسا ہے جو انسانی فطرت کے اندر موجود ہے اور اس کا ہونا معاشرتی ترقی کے لئے ضروری بھی ہے لیکن بجائے اس کے کہ ہم کسی موہوم خدا کی پرستش کرتے پھریں کیوں نہ انسانیت کے پجاری بن جائیں۔ کامٹے کی بظاہر دلکش بات خدا سے دور بھاگنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس میں اور عہد جاہلیت کی بت پرستی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ خدا اور مذہب کے دونوں تصورات ایک ساتھ چلتے ہیں، بدھ مت کی مثال دیتے ہوئے کامٹے نے یہ نہیں دیکھا کہ گوتم بدھ نے خدا کے وجود کا نہ کہیں اقرار کیا ہے اور نہ کہیں انکار کیا ہے اس نے تو دکھ درد سے نجات پانے کے لئے چند نکات پیش کئے ہیں۔ جن کو بنیاد بنا کر اس کے پیروکاروں نے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بہت عرصے کے بعد مذہب کی شکل دی ہے۔ یہ پیروکار جو بھکشو کہلاتے تھے، مذہب کے حوالے سے تاریخ مذاہب میں اس وقت تک کوئی جگہ نہ پاسکے جب تک انہوں نے گوتم بدھ کے اصولوں کو مناسب ترامیم کے بعد منظم مذہب کی صورت نہ دے دی اور پھر خود مہاتما بدھ کو اُلوہیاتی مقام پر نہ بٹھا دیا۔ جہاں تک کومٹے نے بھی کہہ دیا کہ مذہب خدا کے تصور کے بغیر ممکن نہیں ہے لیکن جب اسے کہا گیا کہ مذہب میں پوجا پاٹ کے کچھ طریقے بھی ہوتے ہیں، آپ اپنے نئے مذہب کے لئے کن چیزوں کی پوجا تجویز کرتے ہیں تو اس نے کہا کہ جن عظیم شخصیتوں نے سیرت و کردار کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں یا انسانیت کی گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں میرے پیروکار ان کے مجسمے بنائیں یا ان کی تصویریں سامنے رکھیں اور ان کی پرستش کریں۔ دیکھا آپ نے کہ ایک ترقی یافتہ ذہن بھی تعصب کا شکار ہو جائے تو ایک ہی جست میں صدہا سال پیچھے جا گرتا ہے! کومٹے نے انسانیت کی عظمت کا خوشنما نعرہ لگا کر جذباتی نوجوانوں کو ورغلانے کی کوشش تو کی ہے لیکن یہ نہیں سوچا کہ جس صورت میں ہم نوع انسانی کو جانتے اور پہچانتے ہیں وہ اس لائق ہے بھی کہ اس کی پرستش کی جائے؟ اگر یہ کہا جائے کہ انسانیت سے مراد مثالی انسانیت ہے تو پھر وہی سوال سامنے آتا ہے جو خدا کے تصور کے ساتھ وابستہ ہے کہ مثالی انسانیت ہے کہاں؟ اگر مذہب میں خدا محض ایک خیال، واہمہ یا تصور ہے تو مثالی انسانیت بھی تو ایک توقع، ایک خیال اور واہمہ ہے۔ سائنسی عقلیت پرستی POSITIVISM کا بیان یہ ہے کہ مثالی انسان کا نہ تو کہیں وجود ہے اور نہ اس کی کوئی بیانیہ تعریف کی جاسکتی ہے۔ آپ کو ہر جگہ انسان نظر آئیں گے انسانیت کہیں دکھائی نہ دے گی کیونکہ یہ تجرید ہے ان مثالی صفات کی جو بحد بشریت کسی فرد کے اندر اپنی تمام و کمال انتہا کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کاملیت کے اس شاہکار کو چشم فلک نے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ اور تا قیامت پھر کبھی نہ دیکھ سکے گی تاہم حمد و ثنا کے لائق وہ رب العالمین ہے جس نے سید الکونین والثقلین اور رحمۃ للعالمین کو اپنے بعد بزرگ ترین ہستی بنا کر بھیجا اور اس خاص پیغام اور عملی تعلیم کے ساتھ بھیجا کہ عبادت اور عبودیت، پرستش و اطاعت کے لائق بھی صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے جو واحد لاشریک ہے، کوئی انسان کوئی فرشتہ، کوئی حیوان۔ کوئی درخت، کوئی پہاڑ، کوئی سورج چاند، ستارہ یا کوئی مخلوق نہیں ہے۔

انسانی عقل لاکھ پینترے بدلے، ہزاروں چکر کاٹے اور جتنی چھوٹی بڑی پگڈنڈیوں پر چلے گھومتی پھرے اسے تھک ہار کر بالآخر اسی عظیم شاہراہ پر واپس آنا ہوگا، جسے قرآن حکیم نے صراط مستقیم کہا ہے اور جس کے سوا منزل مقصود تک پہنچنے کا کوئی اور یقینی محفوظ اور مختصر ترین راستہ نہیں ہے۔ رہا آگسٹس کومٹے کا یہ دعویٰ کہ سائنس ہی صحیح ترین علم ہے اور اس کے سوا اور کوئی علم یقین کی حد تک نہیں پہنچتا تو اس دعوے کو خود سائنسی ترقی نے ہی غلط ثابت کر دیا ہے مثلاً ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سائنس نے اشیائے فطرت کی ماہیت بارے کوئی نظریہ قائم کیا ہو اور کچھ عرصہ کے بعد اس میں ترمیم نہ کی ہو یا اس سے مزید مسئلے پیدا نہ ہوئے ہوں۔ بلکہ ہوا یوں ہے کہ ہر مزید تحقیق نے مزید مسائل ہی کو جنم دیا ہے۔ علمی دنیا میں سائنس کو کیا مقام حاصل ہے اس کے جواب میں خود سائنسدانوں میں بیشمار اختلافات پائے جاتے ہیں اور انہی کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ سائنس چند تجریدات (ABSTRACTION) ؟ اور بیانیہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کلیات (DESCRIPTIVE FORMULAE) کے مجموعے پیش کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اتنا بتا سکتی ہے کہ "ایسا ہے" یہ نہیں بتا سکتی کہ "ایسا کیوں ہے"۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر انسان کو ضرورت ایسی حکمت (WISDOM) کی ہے جو محض سائنسی نتائج کو آپس میں جوڑنے والے علم سے کہیں زیادہ صداقتوں پر مبنی ہو کہیں زیادہ عمیق ہو اور کہیں زیادہ حقیقت شناس ہو۔ وہ عقلیت جو خود تخلیق شدہ ہو اپنے تخلیق کرنے والے کا پورا پورا ادراک کر ہی نہیں سکتی۔

قرآن حکیم نے ایک نہایت لطیف استعارے کے ذریعے ایک حکیمانہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے پوچھا کہ تم دل کی پوری رضامندی کے ساتھ (طوعاً) آؤ گے یا بادلِ ناخواستہ مجبور ہو کر (کرہاً) آؤ گے؟ سب نے کہا کہ ہم طوعاً آئیں گے (۴۹ : ۱۶ - ۱۱ : ۴۱) طوعاً خود سپردگی اور تسلیم و رضا کا وہ بلند ترین مقام ہے جسے ہمارے صوفیاء نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ عقل بھی آشیانۂ تسلیم و رضا میں واپس تو آجاتی ہے لیکن ادھر ادھر کی دو چار اڑانوں اور حوادث کی آندھیوں کے تھپیڑوں کے بعد۔ یعنی "کرہاً"۔ قافلہ سالار دونوں ہیں، عقل بھی اور عشق بھی لیکن عقل دلائل کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہے جبکہ عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود جاتا ہے۔

(۴)

عقل حیلہ جو کی داستانیں طویل بھی ہیں، عجیب و غریب بھی ہیں، دردناک بھی ہیں اور بیشمار بھی ہیں۔ ان سب کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم اس کی ایک دو باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کا صحیح جائزہ نہ لیا جائے تو ناپختہ ذہن اور عقلیت پسند نوجوانوں کے شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے۔ پہلی بات جو عقل کے پرستاروں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے یہ ہے کہ خدا کے عقیدے اور مذہب میں فوق الفطرت عناصر کو کیوں شامل کیا جاتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے تو فطرت کی کتاب کھلی ہوئی ہے لہٰذا ہم فطرت ہی کے مندرجات کو قوانین و ضوابط کا درجہ دے سکتے ہیں، اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ جو چیز فطرت سے ماوراء بیان کی جائے گی اُسے ہم بہ طیبِ خاطر قبول نہیں کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم ان دیکھے خدا پر ایمان لانے پر کیوں مجبور کئے جاتے ہیں۔ جبکہ عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ جو چیز حواس کے ادراک سے باہر ہو اُس کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے پہلو بہ پہلو قرب اور بُعد کا مسئلہ بھی کچھ پیچیدہ سا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی چیز کائنات کے اندر رہ کر فعال بھی ہو اور پھر اُسے کائنات سے ماوراء بھی مان لیا جائے۔ ہمیں تو فطرت کے افعال و مظاہر کے حوالے سے ایسے دلائل چاہئیں جو مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اتریں۔

یہ باتیں بڑی اہم اور وزنی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا ایک معلم کے لئے درست نہیں ہے۔ چونکہ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ بات قوانینِ فطرت کے حوالے سے کی جائے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "فطرت" کا مفہوم متعین کر لیں۔ تاکہ اس کی روشنی میں "فوق الفطرت" کے معنے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ رہے۔ اس کے علاوہ ایک ضرورت اس لفظ کے معانی سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کوئی سبب ایسا نہیں ہے جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ اور کوئی نتیجہ ایسا نہیں ہے جس کا کوئی سبب نہ ہو۔ اس علم ہم ہر واقعے کا سراغ اسباب پر غور کرنے سے لگا سکتے ہیں۔ سائنسدانوں کی یہ بات بڑی حد تک درست ہے لیکن خود سائنس نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ فطرت کے چاروں مذکورہ بالا طبقوں میں قوانینِ علت (CAUSATION) الگ الگ ہیں یعنی جو قانون علت جمادات پر لاگو ہوتا ہے وہ نباتات پر لاگو نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو قانونِ علت نباتات کے لئے مقرر ہے وہ حیوانی ذہن کو کنٹرول نہیں کرتا۔ اور جو قانون حیوانی ذہن پر نافذ رہتا ہے وہ انسانی ذہن پر غیر مؤثر ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اوپر کی سطح کے لئے جو قانونِ علت مقرر ہے وہ نچلی سطح کے قانون سے بالا تر ہے۔ اسی بات کو سادہ زبان میں یوں کہا جائے گا کہ نچلی سطح کا قانون اوپر کی سطح کے قانون کو اپنے لئے فوق الفطرت سمجھتا ہے۔ آیئے اس نکتے کو ایک اور زاویے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سب سے نچلی مخلوق پتھر، پہاڑ، سورج، چاند، ستارے، گیس وغیرہ جمادات کہلاتی ہیں۔ اور ان میں نمکیات اور دھاتیں وغیرہ بہت سی چیزیں ہیں جو مفرد اور مرکب دونوں صورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام عناصر ذی حیات سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک عنصر کا اپنا علیحدہ قانون علت ہے۔ مثال کے طور پر قلمی شورہ اپنے الگ قانونِ علت کے ماتحت ہے اور کوئلہ اپنے الگ قانون علت کے ماتحت ہے۔ لیکن جب دونوں کو باہم ملا کر رگڑا جائے تو یہ بارود بن کر بھک سے جل اٹھے گا اور اپنی زد میں آئی ہوئی چیزوں کو بھی بھسم کر دے گا۔ تاہم یہی دونوں عناصر باہم گھل مل کر نباتات میں بھی موجود رہتے ہیں نہ بارود بنتے ہیں اور نہ دھماکہ کرتے ہیں، گویا نباتات کی سطح کا قانون جمادات کی سطح کے قانون کو کنٹرول کر لیتا ہے وہ قانون جو جمادات پر لاگو تھا یہاں نباتات کی سطح پر پہنچ کر غیر مؤثر ہو گیا ہے۔ اور اپنے سے بالاتر قانون کے تابع ہو جاتا ہے "نباتات" جس میں زندگی اپنی ابتدائی شکل میں پہلی مرتبہ نمودار ہوئی ہے اپنی نوع کے مطابق جمادات کے تمام عناصر کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ لیکن ان عناصر پر اپنے جمادی سطح کے پہلے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ

بالاتر مرتبۂ زندگی کا قانون اپنے سے نچلی سطح کے قانون پر حاوی رہ کر اسے منسوخ کر دیتا ہے۔

گویا قوانینِ علت (LAWS OF CAUSATION) کی صورت یہ ہوئی کہ نباتات کے مرتبے کا قانون حیوانی ذہن کے تو تابع رہے گا لیکن جمادی سطح کے قانون سے بالاتر ہوگا۔ اسی طرح حیوانی ذہن کی سطح کے قوانینِ علت اپنی سطح کے نیچے والے قوانین کو تو منسوخ کر دیں گے لیکن خود اپنے سے بالائی سطح یعنی انسانی ذہن کے تابع رہیں گے۔ بالفاظِ دیگر،

"زندگی" جمادات یعنی مادے (PRIMEVAL MATTER) کے لئے فوق الفطرت ہے۔

"حیوانی ذہن" زندگی اور مادے دونوں کے لئے فوق الفطرت ہے۔ اور

"انسانی ذہن" حیوانی ذہن، زندگی اور مادے تینوں کے لئے فوق الفطرت ہے۔

پودوں کا غذا حاصل کرنا۔ بڑھنا۔ پھلنا۔ پھولنا اور درخت بن کر بیج پیدا کرنا وغیرہ اپنے قانونِ علت کے عین مطابق ہے لیکن اگر پودے سمجھ سکتے اور اپنی زمین کے ساتھ پیوستگی کا مقابلہ حیوانوں کے چلنے پھرنے کے قانون سے کر سکتے تو حیران رہ جاتے کہ کوئی چیز یوں چل پھر بھی سکتی ہے، یہ اس لئے کہ چلنے پھرنے کا قانون ان کی "فطرت سے بالاتر ہے" یعنی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کلیات (DESCRIPTIVE FORMULAE) کے مجموعے پیش کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اتنا بتا سکتی ہے کہ "ایسا ہے" یہ نہیں بتا سکتی کہ "ایسا کیوں ہے"۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر انسان کو ضرورت ایسی حکمت (WISDOM) کی ہے جو محض سائنسی نتائج کو آپس میں جوڑ دینے والے علم سے کہیں زیادہ صداقتوں پر مبنی ہو کہیں زیادہ عمیق ہو اور کہیں زیادہ حقیقت شناس ہو۔ وہ عقلیت جو خود تخلیق شدہ ہو اپنے تخلیق کرنے والے کا پورا پورا ادراک کر ہی نہیں سکتی۔

قرآن حکیم نے ایک نہایت لطیف استعارے کے ذریعے ایک حکیمانہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے پوچھا کہ تم دل کی پوری رضامندی کے ساتھ (طوعاً) آؤ گے یا با دلِ ناخواستہ مجبور ہو کر (کرہاً) آؤ گے؟ سب نے کہا کہ ہم طوعاً آئیں گے (۴۹ : ۱۶ - ۱۱ : ۴۱) طوعاً خود سپردگی اور تسلیم و رضا کا وہ بلند ترین مقام ہے جسے ہمارے صوفیاء نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ عقل بھی آشیانۂ تسلیم و رضا میں واپس تو آجاتی ہے لیکن ادھر ادھر کی دو چار آزمائشوں اور حوادث کی آندھیوں کے تھپیڑوں کے بعد۔ یعنی کرہاً۔ قافلہ سالار دونوں ہیں، عقل بھی اور عشق بھی لیکن عقل دلائل کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہے جبکہ عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود جاتا ہے۔

(۴)

عقل حیلہ جو کی داستانیں طویل بھی ہیں، عجیب و غریب بھی ہیں، دردناک بھی ہیں اور بیشمار بھی ہیں۔ ان سب کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم اس کی ایک دو باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کا صحیح جائزہ نہ لیا جائے تو ناپختہ ذہن اور عقلیت پسند نوجوانوں کے شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے۔ پہلی بات جو عقل کے پرستاروں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے یہ ہے کہ خدا کے عقیدے اور مذہب میں فوق الفطرت عناصر کو کیوں شامل کیا جاتا ہے ہماری آنکھوں کے سامنے تو فطرت کی کتاب کھلی ہوئی ہے لہٰذا ہم فطرت ہی کے مندرجات کو قوانین و ضوابط کا درجہ دے سکتے ہیں، اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ جو چیز فطرت سے ماورا بیان کی جائے گی اُسے ہم بر طیبِ خاطر قبول نہیں کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے پر کیوں مجبور کئے جاتے ہیں۔ جبکہ عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ جو چیز حواس کے ادراک سے باہر ہو اُس کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کے پہلو بہ پہلو قرب اور بُعد کا مسئلہ بھی کچھ پیچیدہ سا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہے، کہ کوئی چیز کائنات کے اندر رہ کر فعال بھی ہو اور پھر اُسے کائنات سے ماوراء بھی مان لیا جائے۔ ہمیں تو فطرت کے افعال و مظاہر کے حوالے سے ایسے دلائل چاہئیں جو مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اتریں۔

یہ باتیں بڑی اہم اور وزنی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا ایک مُعلّم کے لئے درست نہیں ہے۔ چونکہ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ بات قوانینِ فطرت کے حوالے سے کی جائے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "فطرت" کا مفہوم متعین کر لیں۔ تاکہ اس کی روشنی میں "فوق الفطرت" کے معنے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ رہے۔ اس کے علاوہ ایک ضرورت اس لفظ کے معانی سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

فلاں شخص نیک فطرت ہے یا فلاں شخص کی فطرت بد ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مغرب سے درآمد شدہ اس مفروضے کو بھی صحیح مان لیتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ تو اپنے بارے میں تو ایک طرف رہا خدا کے بارے میں بھی ہمارے تصورات بگڑ جاتے ہیں۔ ہوا یوں کہ جب یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تو اس میں نیچر کا لفظ بھی آ گیا۔ اس کا ترجمہ عربی زبان کے قریب ترین لفظ "فطرت" سے کیا گیا تو جتنے معانی نیچر کے ساتھ وابستہ تھے وہ سب کے سب "فطرت کے معنوں میں شامل ہو گئے اور اس طرح بیشمار غلط فہمیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ آیئے پہلے دیکھتے ہیں "نیچر" کے معنے کیا ہیں: واضح رہے کہ انگریزی میں یہ لفظ لاطینی زبان سے آیا ہے جس میں نیچورا کے معنے ہیں پیدا ہونا۔

کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق اس لفظ کے معنے یہ ہیں

۱۔ اشیا کی اہم خصوصیات۔ ۲۔ حیوانات اور اشخاص کے پیدائشی خصائص۔
۳۔ بنی نوع انسان کی پیدائشی صفات یا اوصاف مثلاً جذبات وغیرہ یا انسانی کردار کے مخصوص عناصر۔
۴۔ قسم، نوع، جماعت۔ ۵۔ موروثی محرکات جو انسانی اعمال اور کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔
۶۔ وہ افعال یا ضروریات یا قوتیں جو انسانی کنٹرول سے باہر ہیں۔ ۷۔ لکڑی کا گودا۔
۸۔ وہ طبعی قوت جو مادی دنیا کی علت ہے۔ ۹۔ آرٹ میں ایماندارانہ صحت۔
۱۰۔ جسمانی عریانی۔ معاشرے کے منظم ہونے سے پہلے کی حالت۔
۱۱۔ جانوروں اور پودوں کی غیر ترقی یافتہ جنگلی حالت۔
۱۲۔ وہ طبعی قوت جس نے مادی دنیا کے مظاہر کو پیدا کیا نیز ۱۳۔ طبعی مظاہر بصورت مجموعی۔

کمیونسٹوں نے اپنے نظریات کے مطابق اس لفظ کے معانی میں ترمیم و اضافہ کر کے یہ معانی بتلائے ہیں

۱۔ وہ دنیا جو اپنے گوناگوں مظاہر کے ساتھ ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے نیچر دراصل ایک معروضی حقیقت ہے جو شعور سے باہر اور اس سے مطلقاً آزاد ہو کر اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام ہے، یہ زمان و مکان کے لحاظ سے غیر متناہی ہے اور دائماً متغیر اور متحرک ہے۔
۲۔ اشیاء اور مظاہر کی صحیح اصل، اور کُنہہ، اندرونی باقاعدگی اور ان کی مخصوص صفت۔

اب عربی زبان کے لفظ "فطرت" کے معنے دیکھیے۔

اَلْفَطْرُ کے معنے ہیں پھاڑنا، شق کر دینا، پہلی مرتبہ ایسا کرنا۔ چنانچہ فطر کسی کام کے پہلی مرتبہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے جس نے پہلی مرتبہ ارض و سماوات کو پیدا کیا۔ لہٰذا فطرت کے معنے ہوئے۔

"وہ قانون یا طریقہ جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کون و مکان اور اس کی اشیاء کو پیدا کیا"

نیچر کے معنوں میں اس سے ملتا جلتا مفہوم آٹھویں نمبر پر ہے "وہ طبعی قانون جو مادی دنیا کی علت ہے"۔ اس

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ایک مفہوم کے سوا اور کوئی معنی فطرت کے معنوں پر منطبق نہیں ہوتا۔ کمیونسٹوں کی لغت کے پہلے معنے تشریحی ہیں، اور ان کے مخصوص اعتقادات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دوسرا مفہوم بھی قانونِ تخلیق کا صاف صاف اعتراف نہیں کرتا۔ "فطرت" کے لفظ کے اندر "اوّل مرتبہ پیدا ہونے" کے معنے موجود ہیں۔ جبکہ "نیچر" کے معانی میں کہیں بھی آغاز یا ابتداء کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ جس چیز کی ابتداء ہوگی لازماً اس کی انتہا بھی ہوگی۔ اس باریک سے نکتے سے کائنات کا متناہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور پھر اسی متناہیت سے لامتناہیت اور لا متناہیت سے باری تعالیٰ کے وجود کا عرفان ہوتا ہے۔

اگر فطرت سے مراد ہر اس چیز کا منظم وجود لیا جائے جو مادہ، زندگی، ذہن اور بالائے ذہن پر مشتمل ہے تو پھر اس میں محسوس اشیاء کے تمام طبقات کے علاوہ آنوحیاتی سطح زندگی بھی شامل ہی جائے گی۔ اگر فطرت کا یہ مفہوم قبول کر لیا جائے تو پھر کوئی چیز فطرت کے دائرے سے باہر نہیں رہتی۔ پھر تو وہ چیز بھی جسے فوق الفطرت کہا جاتا ہے۔ وہ ایک منفی اور بے حقیقت تصور سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ لیکن پچھلی صدی عیسوی میں جب سائنس کی فطرت پرستی صرف محسوس چیزوں تک محدود رہ گئی تو فطرت کے مفہوم میں صرف انہی چیزوں کو شامل رہنے دیا گیا جنہیں آلات کی مدد سے ناپا یا تولا جا سکتا تھا۔ لہٰذا جو چیزیں پیمائش اور وزن میں نہ آسکتی تھیں انہیں فطرت کے دائرے سے خارج کر دیا گیا۔ اس طرح فطرت کا مفہوم سکڑتے سکڑتے صرف مادے یا قوت یا ان دونوں کے مجموعے پر آ کر رُک گیا۔ اور "حقیقت" کو بھی انہی دو چیزوں تک محدود کر لیا گیا۔ اس کے بعد فطرت پرستوں کی تنگ نظری اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ خود "ذہن" کے وجود کا بھی انکار کر دیا گیا حالانکہ اسی بنا پر فطرت پرستی نے اپنے آپ کو تعمیر کیا تھا۔ ذہن کا انکار اس بنا پر کیا گیا کہ یہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ کیا قوت جس کو آپ اصل حقیقت مانتے ہیں دکھائی دیتی ہے تو جواب میں خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ عقلیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک ہی نوعیت کی دو چیزوں میں سے ایک کا انکار اور دوسری کا اقرار نہیں ہونا چاہیے۔ جس طرح قوت نظر نہیں آتی البتہ اس کے مظاہر نظر نہیں آتے اسی طرح ذہن بھی نظر نہیں آتا۔ اس کے مظاہر نظر آتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا مظہر سائنس ہے۔

جو چیز گنتی کے چند طبقات میں منقسم ہو سکتی ہے اسے محدود کہا جائے گا۔ محدود چیز "مخلوق" ہوتی ہے، قدیم نہیں ہوتی۔ قدیم اس کا خالق ہوگا جو ہر اعتبار سے غیر محدود ہوگا۔ ہماری زمین کا اس محدود فطرت میں اپنا مقام ہے۔ اس کی مخلوقات کو ہم چار طبقات یعنی جمادات، نباتات، حیوانات اور نوعِ انسانی میں تقسیم کرتے ہیں۔ فطرت کے چاروں طبقے ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتے رہتے ہیں۔ زمین کے علاوہ سمٰوات میں جو لاکھوں کروڑوں دنیائیں ہیں اب تک ان میں کہیں "زندگی" کے آثار نہیں پائے گئے۔ لہٰذا انہیں جمادات میں شمار کیا جائے گا۔ جمادات سے ایک سطح بالاتر طبقے یعنی نباتات میں پہلی بار زندگی کا ظہور ہوا ہے، اس سے ذرا بلند سطح پر حیوانی ذہن ابھرا ہے، اور اس سے زیادہ بلند سطح پر انسانی ذہن اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ نمودار ہوا ہے۔ اس بات کی کوئی دلیل سائنس کے پاس نہیں ہے کہ اس سے بھی بلند سطح کا ذہن نہیں ہو سکتا۔ خیر اس کو بھی چھوڑیئے۔ ایک اور بات جو سائنس کی طرف سے بڑی شدومد کے ساتھ پیش کی جاتی ہے یہ ہے کہ فطرت کی ہر چیز اسباب و علل کے قانون میں جکڑی ہوئی ہے۔ یعنی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کوئی سبب ایسا نہیں ہے جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ اور کوئی نتیجہ ایسا نہیں ہے جس کا کوئی سبب نہ ہو۔ اس لئے ہم ہر واقعے کا سراغ اسباب پہ غور کرنے سے لگا سکتے ہیں۔ سائنسدانوں کی یہ بات بڑی حد تک درست ہے لیکن خود سائنس نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ فطرت کے چاروں مذکورہ بالا طبقوں میں قوانینِ علل (CAUSATION) الگ الگ ہیں۔ یعنی جو قانون علت جمادات پر لاگو ہوتا ہے وہ نباتات پر لاگو نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو قانونِ علت نباتات کے لئے مقرر ہے وہ حیوانی ذہن کو کنٹرول نہیں کرتا۔ اور جو قانون حیوانی ذہن پر نافذ رہتا ہے وہ انسانی ذہن پر غیر مؤثر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اوپر کی سطح کے لئے جو قانونِ علت مقرر ہے وہ نچلی سطح کے قانون سے بالاتر ہے۔ اسی بات کو سادہ زبان میں یوں کہا جائے گا کہ نچلی سطح کا قانون اوپر کی سطح کے قانون کو اپنے لئے فوق الفطرت سمجھتا ہے۔ آیئے اس نکتے کو ایک اور زاویئے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سب سے نچلی مخلوق پتھر، پہاڑ۔ سورج، چاند، ستارے، گیس وغیرہ جمادات کہلاتی ہیں۔ اور ان میں نمکیات اور دھاتیں وغیرہ بہت سی چیزیں ہیں جو مفرد اور مرکب دونوں صورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام عناصر ذی حیات سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک عنصر کا اپنا علیحدہ قانونِ علت ہے مثال کے طور پر قلمی شورہ اپنے الگ قانونِ علت کے ماتحت ہے اور گندھک اپنے الگ قانونِ علت کے ماتحت ہے۔ لیکن جب دونوں کو باہم ملا کر رگڑا جائے تو یہ بارود بن کر بھک سے جل اٹھے گا اور اپنی زد میں آئی ہوئی چیزوں کو بھی بھسم کر دے گا۔ تاہم یہی دونوں عناصر باہم گھل مل کر نباتات میں بھی موجود رہتے ہیں نہ بارود بنتے ہیں اور نہ دھماکہ کرتے ہیں، گویا نباتات کی سطح کا قانون جمادات کی سطح کے قانون کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ قانون جو جمادات پر لاگو تھا یہاں نباتات کی سطح پر پہنچ کر غیر مؤثر ہو گیا ہے۔ اور اپنے سے بالاتر قانون کے تابع ہو جاتا ہے۔ "نباتات" جس میں زندگی اپنی ابتدائی شکل میں پہلی مرتبہ نمودار ہوئی ہے اپنی نوع کے مطابق جمادات کے تمام عناصر کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ لیکن ان عناصر پر اپنے جمادی سطح کے پہلے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ

بالاتر مرتبہ زندگی کا قانون اپنے سے نچلی سطح کے قانون پر حاوی رہ کر اسے منسوخ کر دیتا ہے۔

گویا قوانینِ علت (LAWS OF CAUSATION) کی صورت یہ ہوئی کہ نباتات کے مرتبے کا قانون حیوانی ذہن کے تو تابع رہے گا لیکن جمادی سطح کے قانون سے بالاتر ہو گا۔ اسی طرح حیوانی ذہن کی سطح کے قوانینِ علت اپنی سطح کے نیچے والے قوانین کو تو منسوخ کر دیں گے لیکن خود اپنے سے بالائی سطح یعنی انسانی ذہن کے تابع رہیں گے۔ بالفاظِ دیگر،

"زندگی" جمادات یعنی مادّے (PRIMEVAL MATTER) کے لئے فوق الفطرت ہے۔

"حیوانی ذہن" زندگی اور مادّے دونوں کے لئے فوق الفطرت ہے۔ اور

"انسانی ذہن" حیوانی ذہن، زندگی اور مادّے تینوں کے لئے فوق الفطرت ہے۔

پودوں کا غذا حاصل کرنا۔ بڑھنا۔ پھلنا۔ پھولنا اور درخت بن کر بیج پیدا کرنا وغیرہ اپنے قانونِ علت کے عین مطابق ہے لیکن اگر پودے کچھ سکتے اور اپنی زمین کے ساتھ پیوستگی کا مقابلہ حیوانوں کے چلنے پھرنے کے قانون سے کر سکتے تو حیران رہ جاتے کہ کوئی چیز یوں چل پھر بھی سکتی ہے، یہ اس لئے کہ چلنے پھرنے کا قانون ان کی فطرت سے بالاتر ہے" یعنی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

فوق الفطرت ہے۔ اسی طرح حیوانات جو بولنے، جاننے، جذبات رکھنے اور دوسری بہت صلاحیتوں سے عاری ہیں انسانی سطح زندگی کے قوانین علّت کے تابع ہیں کیونکہ یہ ان کے لئے فوق الفطرت ہیں۔ جو قانون ایک سطح پر فطرت ہے وہی قانون نچلی سطح کے لئے فوق الفطرت ہے۔

فطرت اور فوق الفطرت کے مفہوم کو اس حد تک سمجھ لینے کے بعد اس حقیقت کے پہچاننے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہنی چاہیے کہ اوپر کی سطح کی مخلوق کو اپنی مرضی، منشا یا ضرورت کے مطابق اپنی ڈھب پر لا سکتی ہے۔ یعنی ان پر حاوی اور متصرّف ہے۔ جبکہ نچلی سطح کی مخلوق اپنی سطح سے بالاتر مخلوق کے ہر حکم کی تعمیل پر پابند ہے حکم کی تعمیل کا مطلب یہ ہے کہ نچلی سطح کی مخلوق بالاتر سطح کی کسی بھی چیز پر کوئی اختیار، کوئی قدرت، کوئی تصرّف، کوئی استحقاق اور کوئی دخل نہیں رکھتی۔ یہ قاعدہ کلیّہ ہے جو فطرت کے قوانین علّت کے مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے اور اس میں استثنٰی یا شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ "مذہب" اسی قاعدہ کلیہ کے مطابق یہ کہتا ہے کہ کائنات انہی چار مراتب وجود پر مشتمل نہیں ہے۔ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ جب ہر نچلی سطح کی اشیاء پر اس کی بالائی سطح کی موجودات غالب اور متصرّف ہیں تو پھر کیسے ممکن نہیں کہ کائنات سے بھی بالاتر قانون اس ساری فطرت پر حاوی اور متصرّف ہو؟ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھیے کہ اگرچہ نباتات کے اندر جمادی عملیات موجود ہوتے ہیں لیکن ہم اسے جمادات نہیں کہتے۔ حیوانات میں نباتی اور جمادی دونوں عناصر موجود ہیں لیکن پھر بھی نباتات نہیں ہے۔ انسان کے اندر حیوانی، نباتی اور جمادی تینوں مراتب کی خاصیتیں موجود ہیں لیکن یہ ان سب سے الگ بالکل نئی مخلوق ہے، نہ حیوان، نہ نباتات اور نہ جمادات! مذہب کہتا ہے کہ خدا کی نشانیاں ساری فطرت کے اندر موجود ہیں، اسی کے قوانین اس کائنات کے گوشے گوشے میں جاری و ساری ہیں لیکن وہ خود اپنی اس ساری مخلوق سے ماورا ہے کیا تصویر میں مصوّر کا تخیل، اس کی مخصوص افتادِ طبع، اس کا انفرادی اندازِ فکر وغیرہ شامل نہیں ہوتا؟ ہر تصویر اپنے خالق کی منہ بولتی شہادت پیش کرتی ہے۔ ہر نقش اپنے نقاش کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہوتا ہے تاہم مصوّر اپنی تصویر کے اندر ہوتے ہوئے بھی اس سے ماورا رہتا ہے اور نقاش اپنے نقش کا جزوِ اعظم ہونے کے باوجود اس سے بالاتر اور بعید تر ہے۔ انسان مراتب زندگی کی ساری خصوصیات رکھتے ہوئے بھی حیوان، نباتات اور جمادات سے بالاتر ہے پھر کائنات کا خالق اپنی تخلیقات کے اندر ہوتے ہوئے بھی کیسے اس سے ماورا اور بالاتر نہیں ہے۔؟

یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ "ذہن" کے اعمال و افعال کے دائرے میں "زمان" کو تو دخل حاصل ہے لیکن "مکان" اس کے لئے بے معنی ہے۔ حالانکہ مادّی سطح کی تمام چیزیں زمان اور مکان دونوں سے جکڑی ہوئی ہیں۔ لہٰذا اگر مذہب یہ کہے کہ "وجود" کی کچھ ایسی سطحیں بھی ممکن ہیں جو زمان و مکان دونوں کے اطلاق سے ماورا ہیں۔ تو کونسا اعتراض اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں مانع ہو سکتا ہے؟ ہم بعض ایسی موجودات کا سائنس کی دنیا میں بھی ذہنی علم رکھتے ہیں۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ علم ریاضی کی تمام بدیہیات (AXIOMS AND POSTULATES) اور مسلّمات

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہیں ۔ علم ہندسہ و مساحت میں " نقطے " کو ہر مکان کی بنیاد تسلیم کیا جاتا ہے لیکن یہ خود " لامکان " ہے گویا لامکان اور لازمان دونوں کے ہوتے ہوئے بھی " موجود " ہے پھر خدا کیوں موجود نہیں ؟ اس میں کونسی بات فوق الفطرت ہے ؟ اگر لامکان اور لازمان دونوں نقطے ہوتے ہوئے " موجود " ہونا فوق الفطرت ہے تو پھر تو ہم کہیں گے کہ سائنس اور مذہب دونوں نے اسی فوق الفطرت پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے !

اگر فوق الفطرت سے مراد فطرت کے قوانین میں عارضی تبدیلی پیدا کرنا ہے تو اسلام نے سختی سے اس کی ممانعت کر رکھی ہے ۔ بعض مشقیں اور ریاضتیں ایسی ہیں جن سے توجہ کا ارتکاز خارقِ عادت واقعات کا باعث بن جاتا ہے ۔ یوگا ، مسمریزم ، ہپناٹزم ، اہلِ تصوف کی کرامات وغیرہ کا تعلق اسی قبیل سے ہے ۔ تاہم اگر کبھی بالائی قوت کے زیرِ اثر اور بہ اذنِ ربّ السمٰوات والارض کبھی ایسا ہوا بھی ہے تو ہم اسے پھر بھی فوق الفطرت نہیں کہیں گے (گویا یہ فوقِ عادت یا (UNUSUAL) ضرور ہے) کیونکہ ہر بالائی سطح کے وجود کو یہ اختیار اور قدرت حاصل ہے کہ اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی خاطر وہ نچلی سطح کے وجود کے قوانین پر متصرف ہو کر انہیں اپنی مرضی ، منشا یا ضرورت کے تابع بنا لے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ جمادی عناصر نباتات کے کام آسکتے نہ حیوانات نباتاتی اشیاء کو استعمال میں لا سکتے ، اور نہ انسان جانوروں پر قابو پا سکتا ۔ تسخیرِ کائنات کا عظیم وظیفہ جو انسان ادا کر رہا ہے ابتدائی عمر کی تعلیم و تدریس و تربیت کی وجہ سے ہے ۔ اور تعلیم و تدریس و تربیت کا سارا عمل جو اساتذہ ، والدین ، بزرگ ، قوم کے بزرگ وغیرہ سرانجام دے رہے ہیں اسی امکان کی وجہ سے ہے کہ بالاتر آنا زیریں آنا پر متصرف اور اثر انداز ہے ۔ اگر یہ امکان نہ ہوتا تو انسانی زندگی ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتی ۔ آنائے کبیر کے حالیہ تصرّف کا ذکر تو دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہو چکا ہے ۔ امریکی سپر پاور نے انتہائی خفیہ طریقے سے اور اعلیٰ پیمانے پر منصوبہ بندی کر کے خود کار ہتھیاروں سے لیس ہو کر اپنے یرغمالیوں کو چھڑانے کے لئے ایران پر حملہ کر دیا لیکن ذہنِ انسانی سے کہیں زیادہ سپر پاور نے ایک منٹ میں سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا ۔ ایسا کیوں ہوا ، کیسے ہوا ، کوئی سائنسدان آج تک اس کی توجیہہ پیش نہیں کر سکا ۔

اسبابِ اول (THE FIRST CAUSES)

قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام اسباب (CAUSES) کل موجودات کا سببِ آخرین ہے ، ہر ممکن الوجود کا مصدر و ماخذ ہے ، اللہ وہ مستقل اور قائم بالذات ہستی ہے ۔ جو ہر تغیّر کی مبدا اور خالق ہے ۔ کیونکہ وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے (۳ : ۵۷) وہی ذات حقیقی ہے وہ بعید بھی ہے قریب بھی ہے ، وہ کائنات کے اندر اپنی قوت ، اپنے علم اور اپنی عقل و حکمت کی بنا پر ہمارے قریب ہے ۔ چونکہ کائنات اپنی کسی بھی حالت میں کسی بھی وقت مجموعی طور پر اور اپنے تمام حالات و واقعات میں محدود ہے اور اللہ کے ارادۂ تخلیق کا محض جزوی مظاہرہ ہے اس لئے اللہ اس سے ماوراء بھی ہے ، کائنات کے ساتھ اس کی احاطت اور ماورائیت کا یہ تعلق نہ تو مکمل طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اسے لیبارٹری کے کسی عملی تجربے کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے یہ اس لئے ہے کہ غیر محدود اور ابدی حقیقت کو کبھی زمان اور مکان کے حوالے سے بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ اللہ کی تو کوئی مثال بھی کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی اور نہ ہمارے مدرکات یا مادی تصورات اسے بیان کر سکتے ہیں ۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کائنات اللہ کی بالارادہ تخلیق ہے۔ ہماری مادی دنیا' زمان و مکان کی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ اور جس انداز سے اسے ہم جانتے ہیں اس کا ابدی ہونا محال ہے۔ اللہ کی کوئی تخلیق حکمت اور خیر و خوبی سے خالی نہیں ہے ہر عاقلانہ اور حکیمانہ فعل صداقت احسن ترتیب اور مقصد پر مبنی ہوتا ہے۔ اللہ کی کوئی تخلیق ان صفات سے خالی نہیں ہے اسی لئے قرآن حکیم میں بار بار یاد دلاتا ہے کہ اللہ نے دنیا کو بالحق اور بالمقصد پیدا کیا ہے یونہی کھیل تماشے طور پر پیدا نہیں کیا۔ قرآن حکیم خدا کی ہستی کے ثبوت میں بہت سی دوسری دلائل کے علاوہ مقصدیت کی دلیل پر زور دیتا ہے۔ اس کی عام دعوت یہ ہے کہ فطرت کے نظم و نسق پر غور فکر کرو اور دیکھو کہ اس میں ہر جگہ قانون کی حکمرانی ہے اور اسی لئے یہ کسی متلون ارادوں والی ہستی کی تخلیق نہیں ہے۔ فطرت کی حکیمانہ وحدت ہی خالق واحد کی حکمت کا ثبوت ہے

علم طبیعیات کے مادہ پرست ماہرین نے فرض کر رکھا ہے کہ طبعی اسباب اندھے اور میکانکی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے "زندگی" اور "ذہن" دونوں کو میکانکی اسباب سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ نامیاتی وجود کے بامقصد عمل کی تشریح مادے اور قوت کے قوانین کی رو سے نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ نامیاتی علت اور ارتقاء ایسے اعمال میں جو کسی نہ کسی مقررہ منزل تک لے جاتے ہیں تاہم ہر قسم کی نامیاتی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ یہ مادی دنیا میں ہی عامل رہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ نامیاتی وجود میں دو طرح کی علتیں کام کر رہی ہیں اور یہ دونوں علتیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بھی عامل ہیں اور بالائے یک دیگرے بھی عامل ہیں۔ لیکن وجود محض کی زندگی کو چونکہ مادے پر فوقیت حاصل ہے اس لئے مادی علتوں کو حیاتیاتی علتوں کے تابع رہنا پڑتا ہے یا دوسرے الفاظ میں میکانکیت کو مقصدیت کا آلہ کار بننا پڑتا ہے اگر مادی واقعات کا تسلسل مطلق ہوتا یا یہ بلکہ علتوں کا نتیجہ ہوتا تو "زندگی" کا ظہور میں آنا مشکل ہو جاتا۔ اس لئے اب اس حقیقت کو مان لینے میں کوئی عذر باقی نہیں رہتا کہ بالاتر سطح کی علتیں اپنے سے کمتر موجودات کے قوانین علت میں ترمیم بھی کر سکتی ہیں۔ تبدیلی بھی لا سکتی ہیں اور ان کو منسوخ بھی کر سکتی ہیں۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہمارے سامنے "وجود" کی صرف تین سطحیں پیش کرتا ہے۔ مادہ، حیات اور ذہن یا شعور ان تینوں کے قوانین علت ایک دوسرے سے مختلف، منفرد اور بے مثل ہیں۔ یعنی جو طریق عمل "ذہن" کا ہے، وہ حیوانی اور نباتاتی "حیات" کے طریق عمل سے مختلف ہے مادی علت کو حیاتی علت ترمیم، منسوخ یا تبدیل کر سکتی ہے۔ اور حیاتی علت پر ذہنی علت غالب رہتی ہے۔ "ذہن" کو قرآن حکیم نے قلب اور فواد کہا ہے۔ سمع بصر اور فواد کے مجموعے کو اللہ نے اپنی روح سے منسوب کیا ہے یہ وہ روحانی قوت ہے جو حیات اور مادے کے تمام قوانین علت پر غالب رہتی ہے۔ اس برتر قوت کے ہزاروں مظاہرے تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں۔ پہلے انہیں جادو اور سحر کا نام دیا جاتا تھا۔ اب علم نفسیات نے بڑی محنت کے بعد انہیں قوت ارادی اور ارتکاز توجہ کے کرشمے قرار دیا ہے۔ یہ قوت جو قلب کی دوسری قوتوں میں سے ایک ہے جسم کے افعال پر جس طرح اثر انداز ہوتی ہے عام لوگ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مراقبہ، محویت، ارتکاز توجہ، استغراق وغیرہ سب اسی قوت کو مجتمع کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ راقم الحروف کی زندگی میں بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے بالاتر علت کا زیریں علت پر متصرف ہونے کا بین ثبوت ملتا ہے ان میں سے دو واقعات یہاں پیش کئے جاتے ہیں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ایک واقعہ سے اپنی ہی قوتِ ارتکازِ توجہ کا اثر اپنے ہی جسم پر اور دوسرے واقعہ سے خارجی قوت کا اثر ایک اور جسم پر ظاہر ہوتا ہے۔ ایک بزرگ استغراق اور محویت میں کمال کی حد تک پہنچے ہوئے تھے، ان کی دائیں ٹانگ میں اگزیما ہو گیا۔ گھٹنے سے نیچے ٹانگ کا ٹنا ضروری ہو گیا۔ اپریشن تھیٹر میں انہیں بتایا گیا کہ آپ کی ٹانگ کاٹی جانی ہے اس سے پہلے آپ کو بیہوش کیا جائے گا۔ بزرگ نے فرمایا بیہوش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹانگ کاٹنے سے پہلے مجھے بتا دینا میں ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاؤں گا۔ جب استغراق میں پہنچ جاؤں ٹانگ کاٹ دینا۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ چند لمحات میں بزرگ ذکر الٰہی میں ایسے مستغرق ہوئے کہ ٹانگ کے کٹ جانے کے نصف گھنٹہ بعد تک ان کا جسم ان کی محویت کے تابع رہ گیا۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ۴۳-۱۹۴۲ء کے دوران میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں زیرِ تربیت تھا۔ پروفیسر آر، آر کمریا میرے نفسیات کے استاد تھے ہندو مسلم سکھ عیسائی ہر مذہب کے طلبہ زیرِ تربیت تھے۔ جب انہوں نے بالاتر قوتِ ارادی کے جسم پر بھی اثر انداز ہونے کی بات کی تو ساری جماعت نے یک زبان ہو کر مطالبہ کیا کہ عملی طور پر اس کا مظاہرہ کیا جائے۔ انہوں نے ایک طالب علم کو ہپناٹائز کر کے سامنے بٹھا دیا۔ سرخ رنگ کی ایک پنسل ہاتھ میں لی اور اس طالب علم کو باور کرایا کہ میرے ہاتھ میں لوہے کی ایک سلاخ ہے جسے میں آگ میں گرم کر کے سرخ کر رکھا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ کی پشت کو اس سے داغ رہا ہوں۔ جونہی پروفیسر صاحب نے لکڑی کی پنسل ہاتھ کی پشت سے لگائی طالب علم نے چیخ ماری اور جہاں پنسل لگی تھی وہاں آبلہ نمودار ہو گیا۔ جسم کا یہ جوابی ردِّ عمل دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ جسم "روح" کی نسبت زیریں سطح پر ہے اور اس کے تابع ہے یہی اس کی فطرت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بالائی قوت اپنے سے نچلی سطح کے اجسام وغیرہ پر اثر انداز ہوتی ہے تو یہ فوق الفطرت نہیں ہے بلکہ فطرت کی درجہ بندی کے قوانین کے عین مطابق ہے۔ جسم اور روح کے اس طرح کے باہمی عمل کو بھی ان اصولوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا جن کا اطلاق مادے یا نامیاتی زندگی پر ہوتا ہے۔

ایک ہی وجود (ENTITY) میں بیک وقت مادہ، حیات اور ذہن کی تین اہم مختلف قسم کی علتیں کیسے عامل ہیں؟ ان کا ایک دوسرے پر عمل اور ردِّ عمل کس طرح کا ہے؟ ان کی متوازیت کس طرح کام کرتی ہے؟ ان سوالات کو سائنس حل نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے کہ وجود (EXISTENCE) ایسے طبقات میں منقسم ہے جن میں درجہ بدرجہ ارتقا ہے اور بالاتر وجود اپنے زیریں وجود کے اعمال پر کسی اعلیٰ مقصدیت کے لئے متصرف ہے تو پھر ہمیں وجود کے عالمگیر قانون کو سمجھنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر بالاتر ذہن اپنے اس نچلی سطح کی موجودات پر غالب نہ ہوتا تو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، زندگی کی تنظیم کبھی قائم نہ رہ سکتی نہ کوئی اَنا کسی دوسری اَنا سے تعاون کر سکتی۔ اور نہ کسی قسم کی زندگی یا زندگی کی حرکت وجود میں آ سکتی۔ لہٰذا ہر نچلی سطح کے وجود کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے سے بالاتر وجود کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے، اپنے قانونِ علت کو بالاتر قانونِ علت کے تابع رکھے۔ اور خود سپردگی، اطاعت، عبودیت اور انقیاد کا وہی رویہ اختیار کرے جسے قرآن حکیم نے اسلام کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

(۵)

گزشتہ سطور میں ضمناً غیب کا ذکر آگیا تھا۔ غیب یعنی اَن دیکھے خدا پر ایمان لانا اسلام کا بنیادی اور سب سے پہلا عقیدہ ہے بلکہ اسے ان لوگوں کے لیے جو حقیقت اور صداقت کی منزل تک امن وسلامتی کے ساتھ پہنچنے کی آرزو بھی رکھتے ہیں اور اس کے لیے سعی وعمل بھی کرتے ہیں ضروری شرط (PRE-REQUISITE) قرار دیا گیا ہے۔

"غیب" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے اوجھل ہو۔ اگر کوئی چیز تصور میں موجود ہے مگر نگاہوں سے پوشیدہ ہے تو اسے بھی غیب کہیں گے۔ گویا چھپے رہنا، اوجھل رہنا یا آنکھوں سے نظر نہ آنا اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں قرآن حکیم نے غَیْبٌ کے مقابلے میں شَہَادَۃٌ کا لفظ لا کر (۵۹:۲۲) ان دونوں الفاظ کے معنے سمجھا دیے ہیں۔ یعنی غیب وہ ہے جو مشاہدے میں نہ آیا ہو۔ اور شَہَادَۃ وہ ہے جو آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ صرف تصور ہی میں نہیں رہا بلکہ محسوس حقیقت بن کر ظاہر ہو گیا ہے۔ لہٰذا غیب "ناموجود" نہیں ہے بلکہ وہ حقیقت ہے جو کہیں چھپی ہوئی ہے۔ آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اگر کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے تو پھر اسے غیب نہیں کہا جائے گا۔ جب غیب یعنی چھپی ہوئی حقیقت سامنے آجائے تو غیب گویا مشہود ہو جائے گا۔ شہادت (گواہی) میں آنکھوں دیکھے کا عنصر ضروری ہے۔ بیج کے دانوں کا پھلنا پھولنا اور ایک ایک کا ستر بن جانا ایک حقیقت ہے۔ کسان کو اس حقیقت کو مان کر دانے زمین میں ڈال دیتا ہے اور مہینوں محنت انتظار میں گزار دیتا ہے۔ جب تک فصل پک کر تیار نہیں ہو جاتی ایک ایک دانے کے ستر ستر بننے کی حقیقت غیب رہتی ہے جب دانے پک کر واضح شکل میں سامنے آجاتے ہیں تو گویا حقیقتِ غیب اب حقیقتِ مشہود میں بدل جاتی ہے۔

غیب پر ایمان لائے بغیر زندگی اپنے تعمیری مقاصد کی تکمیل کی طرف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی اگر کسان اپنی محنت کے بار آور ہونے اور فصل کی برومندی پر ایمان نہ لائے تو نہ دانہ بوئے گا نہ فصل اٹھائے گا۔ ہر علم کی بنیاد اَن دیکھی بدیہیات پر رکھی جاتی ہے۔ ہر مفروضہ پہلے تخیل کی سطح پر ابھرتا ہے اور جب تک مشہود نہیں ہو جاتا غیب رہتا ہے، ہر موجد اور ہر خالق کو اپنے غیب کے صحیح ہونے پر کامل یقین ہوتا ہے۔ اگر اس کے یقین میں تزلزل آجائے تو اس کے سعی وعمل کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ اور اس کا غیب کبھی مشہود نہ ہو سکے گا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم سوائے آنکھوں دیکھی چیزوں کے اور کسی وجود کو نہیں مانتے وہ بھی غیب پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ ہر سعی وعمل کے لیے ضروری ہے کہ اَن دیکھے نتائج کی واقعیت پر یقین کیا جائے، جو کوئی بھی یہ کہتا ہے کہ میں "اَن دیکھی" حقیقتوں کو نہیں مانتا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتا ہے اور دوسروں کو بھی غلط فہمیوں میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے کیا روز افزوں حادثات کی خبریں سُن کر اس نے سڑکوں اور بازاروں میں چلنا پھرنا بند کر دیا، کیا یہ موٹروں، بسوں، ریل گاڑیوں یا ہوائی جہازوں میں سفر نہیں کرتا۔ کیا کسی خطرناک اپریشن کے لیے اپنے جسم وجان کو سرجن کے نشتر کے حوالے نہیں کر دیتا؟ یہ صحیح ہے کہ زندگی میں اتفاقات (CHANCES) کا بڑا دخل ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چھوٹے بڑے سب کاموں میں اَن دیکھے نتائج پر مثبت انداز سے یقین رکھنا پڑتا ہے۔

زمانے صرف دو ہیں، ایک ماضی اور ایک مستقبل یعنی ایک وہ جو واقعیت کے ساتھ سامنے آچکا ہے اور ہر اعتبار

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے مشہود ہے۔ دوسرا وہ جو نظروں سے اوجھل ہے، اَن دیکھے واقعات کی دھند میں چھپا ہوا ہے اور ہر اعتبار سے غیب ہے۔ "حال" کا کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ مستقبل کا ہر ثانیہ پلک جھپکنے کے وقفے سے بھی کم وقت میں ماضی بنتا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ ہم غیب پر ایمان رکھتے ہیں اپنے سعی و عمل کو بارآور اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے "دنیا بامید قائم" کا اصول وضع کئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم نے مستقبل کو کاٹ کر اس کے دو حصے کر دیئے ہیں اور قریب ترین مستقبل کا نام حال رکھ دیا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ہمارا کوئی بھی سعی و عمل آگے نہ بڑھ سکتا۔ نتیجہ خیزی پر ایمان امیدوں کے نئے نئے جلوے دکھاتا جاتا ہے اور ہم "حال" کو کئی نسلوں تک وسیع کرتے چلے جاتے ہیں۔

سائنس کو بھی علم صحیح ہونے کا دعویٰ ہے۔ لہٰذا اس نے بھی آگے بڑھنے کے لئے اَن دیکھی حقیقتوں پر ایمان لا رکھا ہے مثلاً اسباب و علل کا قانون، فطرت کی یکسانی کا مفروضہ، اس کے بدیہیات میں سے ہیں سائنسدان عقیدے کو ذہن میں رکھ کر اپنا کام شروع کرتا ہے اور اس کے سامنے ایک وسیع کائنات موجود ہے جس میں ہر اعتبار سے قانون ہی کی حکمرانی ہے۔ اور وہ اس قانون کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن جس کائنات کو اس نے فرض کیا ہوا ہے اس کا تو ہزارواں حصہ بھی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ پھر وہ کیسے وسیع اور عریض "غیب" یعنی اَن دیکھے حصے پر ایمان رکھتا ہے۔ دیکھتا تو وہ جزو کو ہے جو مشہود ہے لیکن اس کے ایمان میں باقی کا وہ سارا کل ہے جو غیب ہے۔ لہٰذا علم صحیح کے دعویداروں کو بھی اندھا یقین رکھنا پڑتا ہے اس مفروضے پر کہ دیکھی ہوئی حقیقت کے مقابلے میں اَن دیکھی حقیقت کہیں زیادہ وسیع اور گہری ہے۔

سائنس کا غیب دو طرح کا ہے: ایک کائنات کی اُن وسعتوں کا جو اس کے تجربے اور مشاہدے سے باہر ہے دوسرا وہ جو قانون علت کی یکسانی اور عالمگیریت میں پنہاں ہے اور جسے سائنس نے بغیر دیکھے اور آزمائے فرض کر لیا ہے۔ افلاطون اس نظریے کا مبلغ تھا کہ دیکھی دنیا کی بنیاد اَن دیکھی دنیا پر رکھی گئی ہے اس کا یہ باوثوق دعویٰ تھا کہ تمام طبعی موجودات میں "اعداد" اساسی حقیقت رکھتے ہیں۔ لیکن "اعداد" اور "ہندسی نسبتیں" غیب ہی پر قائم ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص مثالی نقطے کو یا مثالی خط کو یا مثالی دائرے کو نہیں دیکھ سکتا۔ سطح دنیا کے اندر جتنے نقطے یا خط یا دائرے کھینچے جائیں گے وہ سب کے سب اپنے مثالی نمونے کی ادھوری سی نقل ہی ظاہر کر سکیں گے۔ اسی طرح ہمارے خیالات اور تجریدی تجربے بھی کسی اَن دیکھی دنیا سے وابستہ ہیں اس کے علاوہ اور بھی جتنی حقیقتیں ہمیں قابل ادراک نظر آتی ہیں سب کی سب "اَن دیکھی دنیا" کے اندر فعال ہیں۔ مثال کے طور پر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ کسی شخص نے مثالی حسن کو نہیں دیکھا۔ مثالی سچائی کا مشاہدہ نہیں کیا۔ مثالی عدل کا تجربہ نہیں کیا لیکن پھر بھی یہ تمام قدریں تمام موجودات کی اَن دیکھی بنیادیں ہیں۔ اسی طرح "عقل" جس کی فی زمانہ پرستش کی حد تک ستائش کی جاتی ہے اس عقیدے پر مبنی ہے کہ موجودات کے اندر "معقولیت" کام کر رہی ہیں حالانکہ موجودات کی معقولیت کو نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دیکھی جا سکنے والی حقیقت ہے۔ تو کیا عقل اور معقولیت کے یہ مفروضے اَن دیکھی حقیقتوں پر قائم نہیں کئے گئے؟

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اب عقلی علوم کی طرف آیئے۔ فلسفہ تحیّر سے شروع ہوتا ہے۔ اور تحیّر پر ہی ختم ہوتا ہے۔ ریاضی اور سائنس کو آپ نے دیکھ لیا کہ ان کی خشتِ اوّل ہی اَن دیکھی مفروضات پر رکھی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کی ابتدا بھی تحیّر اور خوف سے ہوئی ہے۔ لیکن اگر ہم "امید" کا تیسرا عنصر بھی شامل کر دیں تو کوئی قباحت نہ ہوگی۔ کیونکہ قدیم انسان کے ابتدائی ارتقا کے دوران بیم و رجا کے ساتھ پُراسراریت، تحیّر اور غیب کے کچھ دھندلے سے اور توہماتی قسم کے غیر واضح تصورات موجود تھے۔ جوں جوں علم میں اضافہ اور مذہب میں ارتقا ہوتا گیا قلب و نظر میں بلندی، پاکیزگی اور وسعت آتی گئی تو یہ تصوّرات بھی صاف اور واضح ہوتے چلے گئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذہب ہو یا سائنس، علوم باطنی ہوں یا علوم ظاہری، سب کی ابتدا بے تکی باتوں پر ہوئی ہے۔ ریاضی اور سائنس کی ابتدائی ماخذ بھی بڑی بھونڈی وضع قطع کے تھے۔ ان دونوں علوم نے سہو و آزمائش (TRIAL AND ERROR) کے ذریعے تدریجاً ترقی کی ہے۔ اب یہ اس مقام تک پہنچے ہیں کہ معروضی اور واقعیت پسند ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اب کوئی بھی ان کو ابتدائی بھونڈے پن کا طعنہ نہیں دیتا۔ پھر اگر مذہب کی ابتدا بھی خوف، تحیّر اور مدد طلبی کے جذبات سے ہوئی ہے تو اس میں کون سی بات انوکھی ہے۔ علم فلکیات کی ابتدا جوتش سے ہوئی۔ کیمسٹری کا علم سونا چاندی بنانے کے شوق سے شروع ہوا۔ فنِ تحریر اور خطاطی کی ابتدا پتھروں پر کوئلے سے بنائی گئی بھدّی سی تصویروں پر رکھی گئی۔ جغرافیہ شکاری انسان کا ممنون ہے جس نے گھر واپس پہنچنے کے لیے نشانات سے کام لیا۔ تعمیرات کا عظیم الشان فن غاروں میں بسنے والے وحشیوں کا پیدا کردہ ہے۔ آج کی محیّر العقول مشینی ترقی "پہیے" کی ممنونِ احسان ہے۔ ابتدائی انسان نے کسی پہاڑ کی چوٹی سے نیچے سے پتھر یا درخت کے تنے کو لڑھکتے دیکھا تو پہیہ بنا ڈالا۔ اب اگر مذہب کی ابتدا بھی دیوتاؤں کی پوجا سے ہوئی ہے یا فطرت کی ہیبت ناک قوتوں کے خوف کھانے کی بنیاد پر رکھی گئی ہے، تو اس پر تعجب اور طنز کیوں؟ جس طرح تمام سائنسی علوم کا "غیب" دھندلے تصورات، فرسودہ اور متروکہ مفروضوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح مذہب نے بھی اپنے غیب کو دھندلے خیالات اور جذبات کی عکسی شہادتوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح سائنسی علوم نے اپنے غیب کو مشہود و معقول بنانے میں بار بار غلطیاں کی ہیں لیکن اس ایمان و یقین کا ساتھ نہیں چھوڑا کہ ایک نہ ایک دن یہ علوم معروضی شکل اختیار کر لیں گے۔ اسی طرح مذہب نے بھی اَلدّین کی اکملیت تک پہنچنے کے لیے کئی ارتقائی مدارج طے کیے ہیں اور اپنے "غیب" کے مشمولات کو تمام غیر معقول اور توہماتی عناصر سے پاک و صاف کر دیا ہے۔ جب دنیا اپنی تخلیق کے لاکھوں کروڑ سال بعد دینِ فطرت کی اکملیت کا مژدہ، کائنات کے ذرّے ذرّے کی زبان سے سُن رہی تھی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "آج زمانہ پھر پھرا کر پھر اُسی نقطے پر آ گیا ہے جس میں اللہ نے ابتدا میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔" دینِ اسلام بھی جو انسانی ذات اور ذاتِ خداوندی کے رشتوں کی دریافتِ نَو (RE-DISCOVERY) کا نام ہے مذہب کی وادیوں میں سے گزرا ہے۔ اس نے بھی مذہب کے مشمولات کے غلط فیصلوں اور تخیّل کی آمیزشوں کی بیشمار خطاؤں کی تطہیر کی ہے۔ لیکن اپنے "غیب" کو تکمیل اور اتمام کی آخری حد تک مشہود بنانے میں ایمان اور یقین کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اگر سائنس آج اپنے غیب سے کنارہ کش ہو جائے تو اس کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ رہے گی۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اسی طرح غیب پر ایمان لائے بغیر کسی مذہب کا ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔
"غیب" دونوں کے ہیں، لیکن ایک دوسرے سے الگ الگ۔ مذہب ضابطۂ زندگی ہونے کی حیثیت سے اپنے غیب سے ذاتی رجحانات کا متقاضی ہے، یعنی یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر فوز و فلاح طلب کرتا ہے جبکہ سائنس اپنے غیب سے ایسی علمی بنیاد مانگتی ہے جو مظاہر فطرت کی تفہیم میں اس کی مدد و معاون ہو۔ سائنس دعویٰ کرتی ہے کہ اب وہ ترقی کی اس منزل تک پہنچ چکی ہے جہاں اس کے غیب کے مشمولات میں کوئی توہمات اور ظن و گمان کے عناصر باقی نہیں ہیں۔ قرآن حکیم نے بھی مذہب کی آخری ارتقائی صورت "اَلدِّین" پیش کر کے یہی دعویٰ کیا ہے کہ "مذہب کا غیب" بھی اب تخیلاتی خداؤں کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہے۔ اور اس میں توہمات مشرکانہ رسوم اور جاہلانہ طریق ہائے پرستش کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ سائنس کے دعوے کو ابھی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ قرآن حکیم کا دعویٰ مصدق بالنتائج (PRAGMATIC) آزمائش سے بھی کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہے "اَلدِّین" کے اندر غیب کے تصور کی تطہیر ایک ایسی اعلیٰ اور ارفع ہستی کی تحمید و تسبیح ہے، جو ہر قوت، ہر علم اور ہر محبت کا ماخذ اور سرچشمہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس کی صداقتوں کو نتائج کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے، اور اس کی افادیت کو انسانی بہبود کی میزان میں تولا جا سکتا ہے۔ "اَلدِّین" کے نفاذ نے بھی، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ساری دنیا پر عینی شہادت مہیا کر کے ثابت کر دیا تھا کہ اس کے ہر لحاظ سے مکمل ضابطۂ حیات ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ انسان نے نہ صرف سینکڑوں علتوں سے نجات حاصل کر لی ہے بلکہ زندگی اور علم دونوں کے لیے ارتقائے دوام کی راہیں کھول دی ہیں۔ سائنس کا عملی میدان مادیت ہے اور انسان کی مادی زندگی کو بہتر بنانے میں سائنس نے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ قابل فخر ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بنی نوع انسان کو خوف حزن اور باطل پرستی سے نجات مادیت نے نہیں اسلام نے دلائی ہے۔

جب اسلام صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوا، اس وقت اکثر مہذب قومیں کثیر خداؤں کی پرستش میں مبتلا تھیں اور تجسیم یعنی اوتاریت اور حلول وغیرہ کے باطل عقائد کی گرفت میں آئی ہوئی تھیں۔ بنی نوع انسان کی سب سے بڑی خدمت جو اسلام نے کی ہے یہ ہے کہ اس نے اللہ کی وحدانیت کا اعلان کر کے الوہیاتی تصور کو تمام آلائشوں سے پاک کر دیا ہے۔ تاکہ غیب اپنی اصلی مطہر اور منزہ صورت میں قائم و برقرار رہے۔ ہر ذی حیات اور غیر ذی حیات مخلوق کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ صرف اطاعت اور تسلیم کا رشتہ ہے۔ طوعاً یا کرہاً۔ اس اعتبار سے ارض و سماوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ سب "مُسلِم" ہیں، مطیع ہیں، فرماں بردار ہیں، تعمیلِ احکامِ ربی میں سرگرم ہیں۔ قانونِ خداوندی کو عملاً تسلیم کرنے والے ہیں۔ یہ زمین جو خوبصورت قالین کی طرح بچھی ہوئی ہے، یہ آسمان جو جگمگاتے قمقموں کے ساتھ سائبان کی طرح تنا ہوا ہے، یہ دریا جو پہاڑوں سے سمندروں تک مسلسل سفر میں رواں دواں ہیں، یہ ہوائیں جو میکدہ بدوش کالی گھٹاؤں کو اٹھائے پھرتی ہیں۔ یہ سرسبز و شاداب درخت جو رنگ برنگ پھلوں، پھولوں سے لدے پھندے باد صبا کے جھونکوں سے جھوم جھوم جاتے ہیں۔ یہ طیور نغمہ سنج و پرفشاں جو فضاؤں میں ہزاروں میل دور دراز کے سفر میں بھی دل کی آنکھ کا

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

رشتہ اپنے آشیانوں سے جوڑے رہتے ہیں۔ یہ ننھی منی چڑیاں جو شاخ شاخ پر بیٹھی چہچہا رہی ہیں اور یہ لاکھوں کروڑوں دَابۃ الارض سب کے سب اپنے خالق کی تسبیح میں مگن ہیں۔ اور اپنے اپنے طور طریقوں سے اس کی حمد و ثنا کے ایسے ایسے گیت الاپ رہے ہیں کہ شجر و حجر بھی وجد میں آجاتے ہیں۔ ان کا قانونِ تخلیق (یعنی ان کی فطرت) جس کے تقاضوں کے مطابق یہ اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی صلوٰۃ و تسبیح ہے بے لوث عبادت ہے، خاموش تسلیم و رضا ہے، بے لوث بندگی ہے!

تمام مخلوق اللہ کی قدرت کی مظہر ہے۔ لیکن اللہ کا کوئی جسم نہیں۔ کوئی چیز اس جیسی نہیں۔ وہ بے مثال ہے (۱۱:۴۲) اللہ سے متعلق تمام تشبیہیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ اس کی ماہیت اور کُنہہ کو کوئی انسان مکمل طور پر نہیں جان سکتا۔ وہ ہر ادراک سے ماوراء ہے۔ ہر نزدیک سے زیادہ نزدیک اور ہر دُور سے زیادہ دُور ہے۔ تمام دنیاؤں میں اُسی کا ارادہ کارفرما ہے اُسی کا اختیار چل رہا ہے، کوئی چیز اس کے اختیار اور ارادے میں کم و کاست پیدا نہیں کر سکتی۔ اللہ زمین کا اور آسمانوں کا نور ہے (۲۴:۳۵) لیکن ہر روشنی جو ہماری بصارت کی نامکمل اور غیبدار حِس ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اُس کے نور کے مقابلے میں سائے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اُس کا نور از خود روشن اور لامکانی ہے۔ وہی مشرق ہے اور وہی مغرب ہے لیکن اس کا نور نہ شرقی ہے نہ غربی ہے۔ اللہ ہر چیز کا منبع اور ماخذ ہے اور ہر چیز کو اسی کے قانون کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ وہ اپنی تمام مخلوقات پر قوت اور علم سے مستولی ہے لیکن اس کی رحمت ہر چیز کو احاطے میں لئے ہوئے ہے (۱۵۶:۷) وہ علم و حکمت، قوت و محبت کا سرچشمہ ہے۔ اللہ کی جلوہ نمائی دیکھنا چاہتے ہو تو فطرت کے حُسن اور توازن و تناسب میں دیکھو، ضبط و ربط میں دیکھو، رعنائی اور خوبی میں دیکھو۔ اس کی شانِ ربوبیت کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہو تو گٹھلی کے پھٹنے اور کونپل کے پھوٹنے سے لے کر تناور درخت کے ثمردار ہو جانے کے مراحل کو دیکھو اور غور کرو۔ اللہ سمیع اور علیم اور بصیر ہے۔ تاہم اس کی بصارت، علم اور سماعت کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام و کمال علم تمام و کمالِ قوت اور تمام و کمالِ خیر و خوبی کا مثالی نمونہ (IDEAL) ہے لیکن کوئی مثالی نمونہ کبھی مکمل طور پر مشہود و منقول نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو جائے تو وہ مثالی نمونہ نہ رہے گا کیونکہ وہ تو منقول اور مشہود ہو کر مثال میں آگیا ہے۔ لہٰذا ہر آئیڈیل کو کارل ژونگ کی علامت کی طرح دُور بہت دُور رہنا ہوگا۔ اسی وجہ سے تو وہ غیب ہے! اس کی عبادت و اطاعت بھی غیب ہی کی حیثیت سے کی جانی لازم ہے کیونکہ غیب ہر مشہود سے ماوراء اور ہمیشہ ماوراء رہے گا۔

یہی ہے اسلام کا خدائے غیب! اسی اَن دیکھے خدا پر ایمان لانا اسلام کا سب سے پہلا اور بنیادی عقیدہ ہے۔ غیب کے اسی پختہ عقیدے کے ذریعے "الّدین" نے انسان کو متعین سے مجرد کی طرف "ہجرت" کر جانے کا راستہ دکھایا۔ اسی کے ذریعے "فی الواقعہ موجود" حقیقتوں کو چھوڑ کر آئیڈیل کی طرف چل پڑنے کا اذن دیا۔ اسی کے ذریعے زندگی کا ارتقا بدوش قائم اور سیدھے راستے کی رہنمائی کی۔ جو خدا مکمل طور پر ہمارے ادراک میں آجائے وہ خدا نہیں رہتا۔ جو مثال مشہود ہو جائے وہ مثال ہی نہیں ہے۔ اسلام کا خدا ہر ادراک سے باہر ہے۔ منطقی دلائل کی پہنچ سے بھی دُور ہے۔ عقلِ خالص (PURE INTELLECT) خدا کی حکمتوں کے ساتھ ہم آہنگی کا قرب تو حاصل کر سکتی ہے تاہم اس کی ہر حکمت منطق کے اُن

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اصولوں سے ہمیشہ بلند تر رہے گی جو قضیات سے نتائج تک اور علت سے معلول تک ہی بھاگ دوڑ سکتے ہیں لیکن علت العلل (CAUSE OF CAUSES) کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اسلام کا خدا تمام قوانینِ تخلیق کا منبع و ماخذ ہے اس لیے صرف انسان ہی اس کا شارح نہیں ہے۔ تخلیق کا ہر مظہر اس کے قانونِ تخلیق کی وضاحتیں پیش کر رہا ہے، اس کا ارادہ ہی قانون ہے کیوں کہ وہ جو چاہے تخلیق کرتا ہے اور جس قسم کا قانونِ تخلیق چاہے اپنی مخلوق کو عطا کر دیتا ہے اس کے قوانینِ تخلیق کبھی ختم نہیں ہوتے، وہ نت نئے انداز سے اپنی تخلیقات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

اسلام کے عقیدۂ غیب نے انسانیت کو کیا دیا ہے؟ اس سوال کا جواب تفصیل طلب ہے۔ تاہم مختصراً دو چار باتوں میں یوں سمجھ لینا چاہیے کہ علم صحیح کی پائیدار بنیادیں فراہم کر دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ کسی مفکر کا قول ہے کہ انسانیت کی تربیت تجریدات ہی کا دوسرا نام ہے (ALL EDUCATION IS ABSTRACTION) مقرون کو چھوڑ کر مجرد کی طرف قدم اٹھانا یا واقعیت کو ترک کر کے مثالیت کی طرف سفر کر جانا علم صحیح کی قلمرو میں داخل ہو جانے کے مترادف ہے۔ موجودہ سائنسی علوم کا دروازہ اسی دن کھل گیا تھا جس دن اسلام نے مقرون کو چھوڑ کر تجریدی غیب کی طرف بڑھنے کا حکم دیا تھا۔ اگر انسان محسوس پیکروں کی غلامی سے آزاد ہو کر غیب کی مثالیت کو اپنی منزل مقصود نہ بنا لیتا تو وہ اپنے خلیفہ فی الارض ہونے کا کبھی کوئی ثبوت پیش نہ کر سکتا۔ جب تک محسوس پیکر اس کے ذہن پر سوار رہیں گے وہ ان سے خوف زدہ رہ کر یا ان سے امیدیں وابستہ کر کے انہیں اِلٰہ سمجھتا رہے گا۔ اس کے اپنے وجود کی سطح حیوانیت کی سطح سے بلند نہ ہو سکے گی، بلکہ وہ اس سے بھی نچلی سطح میں ڈوبا رہے گا۔ اور اپنے شرفِ انسانیت کو نہ پا سکے گا۔ اُلوہیت کی تنزیہہ میں ہر قسم کی ملاوٹ کو اسلام نے شرک کہا ہے اور اسے سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے یہ سب سے بڑا گناہ اس لیے ہے کہ اس سے خدائے پاک کی توہین ہی نہیں ہوتی بلکہ خود انسان ذلت کے گڑھوں میں گر جاتا ہے۔ قرآن حکیم کو کبھی یہ منظور نہیں کہ احسن التقویم انسان اپنے مرتبۂ انسانیت سے گر جائے۔

اِسلام نے توحید کا جو عظیم درس انسان کو دیا ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کے لامحدود مثالی مقصود و مطلوب کے تصور کی تطہیر کا پہلو اور دوسرا عظمتِ انسان کی بحالی کا پہلو۔ اسلام نے انسان کو مادی اشیاء کی غیر ضروری محبت سے اور پھر اس محبت کے نتیجے میں انسان کو جو غلامیاں اور پرستشیں قبول کرنی پڑتی ہیں ان سے نکال کر آزاد فضاؤں میں بلند پرواز وں کی راہیں دکھائی ہیں۔ یہ اسلام کے ایمان بالغیب کا دوسرا بڑا احسان ہے۔ اَلدِّین انسان کو داخلی اور خارجی دونوں غلامیوں سے آزاد ہو جانے کی نوید جاں فزا دیتا ہے۔ صرف ایک ہی غلامی اختیار کر لی تو باقی تمام غلامیاں اپنے آپ ختم ہو گئیں۔ اور یہ ایک "بھی ایسا ایک ہے" جو خالق و مالک ہے، رَبُّ العالمین ہے، رحیم اور رحمٰن ہے۔ اور انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔

(۶)

• ذات • کی چند ضروری خصوصیتیں گذشتہ اوراق میں بیان کی جا چکی ہیں۔ ان خصوصیتوں کا استنباط قرآنی علوم کے محققین نے اللہ تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ غور و فکر کرنے سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کہ "ذات" "صرف" ذات" کے ساتھ ہی بامعنی رشتہ استوار کر سکتی ہے۔ "انسانی ذات" کو اپنی صلاحیتیں اُبھارنے کے لئے اپنی ہی جیسی "ذات" کے تعاون۔ تائید اور مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ دوسری "ذات" کے درمیان رہ کر اور روابط استوار کرکے ہی پھلتی پھولتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان تنہائیوں سے گھبراتا ہے اور معاشرتی اجتماع کو پسند کرتا ہے۔ تاہم اس کی بعض ضروریات ایسی بھی ہیں جو اس سطحِ زندگی سے بالاتر ہیں۔ یعنی یہ ضروریات اس کے اردگرد کی اُس کی اپنی جیسی ذوات یا بعض زیادہ ترقی یافتہ انسانی ذوات بھی پوری نہیں کر سکتیں۔ ان ضروریات کی تسکین کے لئے اسے اللہ کی مکمل ترین ذات کی تائید و نصرت کی طرف کاسۂ طلب لے کر جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ اکلوتی ذات ہے جو اُسے کبھی مایوس نہیں کرتی۔ خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ اپنی رحمتوں سے محروم نہیں رکھتی۔ اللہ کی ذات کے ساتھ اس کا یہ تعاون اور اشتراکِ عمل اسے "زندگی" کی توانائیاں عطا کرتا ہے اور اسے مستحکم بناتا ہے، اگر انسانی ذات کو یہ بلند تر تعاون حاصل نہ ہو تو یہ مرجھا جائے گی اور اس کی زندگی کی اُمنگ زائل ہو جائے گی۔ انسانی ذات، بامقصد مصروفیات میں خوش رہتی ہے اور اگر کائنات کے ضبط و نظم میں اضافہ کرنے اور اس کے حسن کو نکھارنے کے مقصد کے ساتھ ساتھ اسے اللہ کی مکمل ترین ذات کا اشتراکِ عمل بھی حاصل ہو جائے تو اس کی مسرتیں حدود نا آشنا ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس کے اندر ہر لمحے ایک تڑپ، ایک تمنائے بیتاب ایک آرزوئے صادق ایسی موجزن رہتی ہے جو دنیا کو بامعنی بنانے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ کائنات اس کے ذوقِ عمل کو دعوت دیتی ہے کہ آؤ، آگے بڑھو اور میرے ہر منظر کو مقصد و معنیٰ کا جامہ پہناؤ۔ اسے عقلیت سے ہم آہنگ کرو اور اس میں نوعِ انسانی کی افادیت کے گوشے تلاش کرو۔

قرآن حکیم فطرت کے عجائبات پر غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید کرتا ہے۔ سورج، چاند، ستاروں سے آگے بڑھو، آسمانوں کی پہنائیوں کا مطالعہ کرو، زمین کے ذرّے ذرّے کو الٹ پلٹ کر دیکھو، ہواؤں اور بادلوں کے نظام کو سمجھو، سمندروں کے قطرے قطرے کی گہرائیوں میں اُتر جاؤ، تمہاری قوتِ تفہیم ہزاروں اور باتوں کے علاوہ تم پر یہ حقیقت بھی واضح کر دے گی کہ فطرت کے ہر مظہر سے اللہ کی ربوبیت کی شان جھلکتی ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ کس طرح ہر چیز اپنی ممکنہ صلاحیتوں کو نشو و نما دے کر پایۂ تکمیل تک پہنچا رہی ہے۔ کائنات کو "زندگی"، زندگی کو حُسن اور توازن و تناسب اور توازن و تناسب کو قانون کی پابندی عطا کرنے والی یہ عظیم قوت مالک ہے ہر اس ادنیٰ سے ادنیٰ اور بڑی سے بڑی چیز کی جو ارض و سماوات یا ان کے درمیان میں ہے مالک اور خالق اور رَبّ ہونے کے باعث ان سب پر پوری قدرت رکھتی ہے اور حاکمِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے فرماں روا ہے قانون کی حکمیت کی وجہ سے کائنات کا کوئی عمل حکمت، مقصدیت اور افادیت سے خالی نہیں ہے۔ "خدا" اس کے اندر "تخلیقی قوتِ آرزو" کی صورت میں عامل ہے اس لئے ہر چیز کے قریب ہے، اس کے باہر مبدائے اسباب کی حقیقت سے فعال ہے اس لئے ہر چیز سے دُور ہے وہ اَبدی ہے لیکن ہماری ہر لحظ بدلتی رہنے والی دُنیا کی چیزوں میں بھی اس کی شانِ ربوبیت ہر دم نئے انداز میں نظر آتی ہے (۲۹ : ۵۵) دُنیاوی بادشاہوں کی حکومتیں رعایا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی اطاعت کے سہارے قائم رہتی ہیں۔ لیکن اللہ ان تمام سہاروں سے مستغنی ہے وہ اس وقت بھی احکم الحاکمین تھا جب ہم نہیں تھے اور اس وقت بھی قادرِ مطلق کی شانِ کبریائی کے ساتھ قائم رہے گا جب ارض و سماوات باقی نہ رہیں گے۔ اس کا اقتدارِ اعلیٰ اور حکومت ہماری فرماں برداریوں کے سہارے قائم نہیں ہے بلکہ ہماری فرماں برداریاں خود ہمیں سہارا دے کر قیام و ثبوت کی طرف لے جاتی ہیں لیکن انسانوں ہی کے بعض طبقے ایسے ہیں جو اللہ کی ربوبیت، مالکیت اور الوہیت کی کرسی پر خود بیٹھ جانے کی کوشش کرتے ہیں قارونیت (سرمایہ داری) ربّ الناس بن جاتی ہے، فرعونیت (ملوکیت) ملک الناس ہونے کا اعلان کر دیتی ہے اور ہامانیت (پیشوائیت) اپنے آپ کو الٰہ الناس بنا ڈالتی ہے۔ پھر یہ دائرہ مذموم (VICIOUS CIRCLE) باہم متحد ہو کر اپنے خدائی اختیارات کو قائم رکھنے کے لئے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کی حاکمیت کے بارے میں ان کا پھیلایا ہوا عقیدہ وہی ہے جو کسی مطلق العنان آمر کے بارے میں آپ کے ذہن میں آ سکتا ہے۔ یعنی نہ قاعدہ نہ قانون بلکہ فرمانروائی مرضی جس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ یعنی بادشاہ زمین پر اللہ کا سایہ ہے۔ سایہ دیکھ کر اصل کے اللہ کے بارے میں تصور قائم کرو، جیسا یہ بادشاہ ویسا وہ بادشاہ۔ یہ بادشاہ کبھی سلام کرنے پر بگڑ گیا تو اس نے بال بچوں تک کو کولھو میں پلوا دیا، کبھی گالی دینے پر خوش ہو گیا تو جاگیریں بخش دیں۔ دربار کی شان و شوکت یہ کہ دور دور تک حاجب و دربان پھیلے ہوئے، وزیروں، امیروں، رئیسوں کی فوج ظفر موج، قصیدہ گو، خوشامدی، جی حضوریوں کا گروہ جس کی سفارش کے بغیر مقربینِ خاص کے بعد ظلّ اللہ تک نہیں پہنچ سکتا پھر مقربینِ خاص بھی وہ کہ جسے چاہیں پھانسی لگوا دیں اور جسے چاہیں خاک سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیں مقصد اس سارے کاروبار کا بادشاہ کی خوشنودیٔ طبع اور بس۔ لہٰذا بالکل اسی نمونہ کا خدا ہوتا ہے!

مشہور مغربی فلسفی جان لاک (JOHN LOCKE) نے اپنے اردگرد کے مذاہب کو ان مذاہب نے خدا کا جو تصور پیش کر رکھا تھا اسے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ "تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا ہے۔ تو میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا"۔ پرستش معبود کو خوش کرنے سے آگے نہیں بڑھتی جبکہ عبادت میں اطاعت کا عنصر زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا "معبود" یا تو انسانی ذہن کا اپنا تراشیدہ ہوگا۔ یا اسے انسانی ذہن نے معبود ہونے کی حیثیت سے قبول کر لیا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں وہ اس قوم کی ذہنی سطح اور نفسیاتی شعورات کا آئینہ دار ہوگا جس نے اسے پرستش یا عبادت کے لئے اختیار کر رکھا ہوگا۔ چونکہ معبود کا مقام قوم کے تصور میں بلند ترین ہوتا ہے اس لئے اس قوم کی تہذیب و تمدن کے خدوخال لازماً اس معبود کی خصوصیات سے متاثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کے ہاں بادل، بجلی، بارش، سورج، زمین، ہوا دریا، درخت، گھنے وغیرہ کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ دیویاں اور دیوتا زراعت پیشہ قوم کے ذہن کے تراشیدہ ہیں۔ جن چیزوں نے اس کی کھیتی کو اجاڑ دیا اُن سے خوفزدہ ہو کر اور جن چیزوں نے انہیں فائدہ دیا اُن سے امیدیں وابستہ کر کے اس قوم نے کئی چھوٹے بڑے خدا بنا ڈالے پھر اسی کے مطابق معاشرے کو تقسیم کر ڈالا۔ برہمن اعلیٰ درجے کے لوگ ہیں کیونکہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یہ برہما رخدا) کے سر سے پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں باقی انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ کھشتری برہما کے بازو سے پیدا ہوئے لہٰذا یہ ملک کا دفاع کریں۔ ویش برہما کے پیٹ سے پیدا ہوئے پس یہ باقی سب لوگوں کے لئے روٹی پیدا کریں۔ شودر سب سے پنچ قوم برہما کے پاؤں سے نکلی ہے اس لئے اس کا کام اونچی ذات والوں کی خدمت کرنا ہے علاوہ ازیں اگر جرم ایک ہی ہے تو سزا طبقات کے درجوں کے مطابق ہے، برہمن کو معاف یا سب سے تھوڑی اور شودر کو سب سے زیادہ، راجہ ایشور (خدا) کا اوتار ہے اس لئے اس کے ہر حکم کی تعمیل لازمی ہے۔

یہودیوں کا خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے کسی اور کا خدا نہیں ہے۔ بنی اسرائیل اس خدا کی چہیتی اولاد ہے اس تصور سے یہودی قوم کی دنیا کی باقی ہر قوم سے نفرت پیدا ہوگئی اور یہی نفرت یہودیوں کے قانون کی بنیاد بن گئی۔ اور یہی اسرائیل غیر بنی اسرائیل کی جزاؤں سزاؤں میں فرق کا باعث بنی۔

عیسائیوں کے ہاں خدا کا جو تصور ہے وہ اس بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار ہوتا ہے۔ اپنے کسی قصور کی وجہ سے نہیں بلکہ ماں باپ کے اولین گناہ کی وجہ سے۔ خدا کو ان کی حالت پر ترس آیا۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے دی تاکہ اس کا خون لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے جو لوگ کفارے پر ایمان لائیں ان کے گناہ معاف ورنہ جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ اس ترس کھانے والے خدا کے ہاں قانون کا کوئی تصور ہی نہیں۔ جہنم کی سزا میں انسان کے اپنے اعمال کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔ نہ اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی واسطہ یا ذریعہ موجود ہے عدل کے تصور سے خالی "خدا" کا اثر جو عیسائیوں کے معاشرے پر پڑا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ جھوٹ، فریب، ریاکاری وغیرہ عام ہوگئے۔ انہیں بخشوانے کے لئے معافی ناموں کی خرید و فروخت کا کاروبار شروع ہوگیا اور دنیا کے تمام دوسرے انسان جو کفارے پہ یقین نہیں رکھتے تھے "بے روح جانور" قرار پائے جن کا قتل عام اسی طرح جائز ہے جس طرح جنگلی جانوروں کا شکار جائز ہے، چنانچہ آسٹریلیا، امریکہ وغیرہ میں مقامی باشندوں کو بھی شکار کھیل کر ختم کیا گیا تھا۔

مجوسیوں کا خدا مستبد، مطلق العنان ڈکٹیٹر، قہرمانیت کا مجسمہ جو جی میں آئے احکام جاری کرتا رہتا ہے۔ اس کے ارد گرد مقربین کی جماعت جسے خدا کے مزاج میں خاصہ دخل حاصل ہے۔ سفارش، رشوت، درباریوں کی معرفت خدا تک رسائی اور داد خواہی۔ نذرانے اور سب کچھ وہی جو شخصی حکومتوں کے درباروں میں ہوتا رہا ہے۔ اور جو ایران کی معرفت باقی ملکوں میں بھی پھیل گیا تھا۔

ظہور اسلام سے پہلے خدا کے لئے جتنے نام استعمال کئے ہیں یا جنہیں غیر مسلم اس وقت استعمال کرتے ہیں، اگر کوئی محقق ان کی ایک جامع فہرست تیار کرتا اور متعلقہ زبانوں میں ان کے معانی بھی ذرا تفصیل سے بیان کر دیتا تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان نے مختلف ادوار میں خدا کا تصور کن کن پہلوؤں سے قائم کیا ہے، خدا کا لفظ جو اس کتاب میں ہم اب تک استعمال کرتے آئے اور جو ہماری تمام علاقائی زبانوں میں بھی رچ بس چکا ہے فارسی زبان کا لفظ ہے۔ فارسی لغات میں لکھا ہے کہ یہ لفظ "خود آ" (یعنی خود آنے والا) ہے، انہی معنوں سے وحدت الوجود کا تصور پیدا ہوا۔ دوسرے معنے اس لفظ کے مالک اور آقا بتائے گئے ہیں۔ چنانچہ خدا وند، خداوند نعمت

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وغیرہ بادشاہ، امیر، وزیر، درباری وغیرہ سب کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ تیسرے معنے "خاوند" بتائے گئے ہیں جس سے تصور لیا گیا کہ خاوند بیوی کا مجازی خدا ہے۔

انگریزی کے لفظ گاڈ کے معنے کن لز آکسفورڈ ڈکشنری کی رو سے یہ ہیں: وہ بالائے انسان ہستی جس کی پوجا (WORSHIP) اس بنا پر کی جائے کہ اس کو فطرت اور انسانوں کی قسمت پر قدرت حاصل ہے۔ دوسرے معنے ہیں دیوی دیوتا۔ اسے بالعموم سابقے کے طور پر استعمال کرتے ہیں جیسے آسمانوں کا گاڈ جوپیٹر۔ دوزخ کا گاڈ پلوٹو، سمندر کا گاڈ نیپچون۔ دن کا گاڈ سورج فیبس، آگ کا گاڈ ولکن، جنگ کا گاڈ مارس، محبت کا گاڈ یا اندھا گاڈ کیوپڈ، شراب کا گاڈ بیکس۔ اس دنیا کا گاڈ ڈیول۔ تیسرے معنے ہیں کوئی مورتی، جانور یا کوئی اور چیز جس کی پرستش علامت سمجھ کر کی جائے۔ کوئی بت جس کے بارے میں یہ عقیدہ دل میں بیٹھ جائے کہ خود اسی میں الوہیاتی قوت ہے یا یہ کسی ایسی ہی قوت کا مسکن ہے۔ اگر گاڈ کے پہلے حرف "جی" کو بڑا لکھ دو جیسے لارڈ گاڈ یا آل مائیٹی گاڈ میں یا گاڈ دی فادر، بیٹا یا ہولی گھوسٹ میں، تو یہ تثلیث کے خدا ہیں۔

آتش پرستوں کے عقیدے کے مطابق دو خدا ہیں: ایک نیکی کا خالق یزدان ہے دوسرا بدی کا خالق اہرمن ہے۔ یزدان اور اہرمن کے لغوی معنے معلوم نہیں ہو سکے۔

ہندو تین بڑے خداؤں کی پوجا کرتے ہیں۔ برہما کل جہان پر محیط ہے۔ اسی سے ہر چیز پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز پھر واپس اسی میں جانے کے لئے بے قرار ہے۔ اسے ایشور، پرم ایشور، پرمیشور، پرمیشر اور پرماتما بھی کہتے ہیں۔ پرم کے معنے ہیں بڑا، اعلیٰ، افضل، پہلا، لامحدود وغیرہ اور آتما کے معنے ہیں "روح"۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کسی طرح انسانی روح اس بڑی روح سے جدا ہو گئی۔ اب یہ دنیا کی دلدل میں پھنس گئی ہے اور واپس پرم آتما میں جانے کے لئے چیخ چلا رہی ہے۔ آتم زندگی کا بڑا اصول یعنی بڑی روح ہے جس میں سے چھوٹی روحیں الگ ہو گئی ہیں۔ دوسرا خدا وشنو ہے جو مخلوقات کی پرورش کرتا ہے، یہ سرسوتی کا خاوند اور کام دیو کا باپ ہے، تیسرا خدا شو جی ہے جو ہلاک کرتا ہے۔ پاربتی اس کی بیوی ہے۔ ان تینوں بڑے خداؤں کے علیحدہ علیحدہ بیسیوں اوتار ہیں۔ اوتار خدا کا انسانی روپ اختیار کرنے والے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ وشنو کے دس یا بائیس یا چوبیس اوتار مانے جاتے ہیں اسی طرح باقی خداؤں کے اوتار ہیں۔ ان اوتاروں کی پوجا بھی اصلی خداؤں کی طرح کی جاتی ہے۔ چھوٹے بڑے سب خداؤں میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی بیویاں بھی چھین لیتے ہیں۔ سازشیں بھی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بدھ مت میں خود گوتم بدھ کو خدا مان لیا گیا ہے۔ ہندو انہیں وشن جی کا نواں اوتار مانتے ہیں۔ بدھ کے معنے عقل مند ہے۔

لاطینی زبان میں خدا کے لئے ڈے ای ٹم (DEITUM) ڈے اس (DEUS) یا ڈو (DU) کے الفاظ ہیں۔

جرمن زبان میں گاٹ کا لفظ ہے۔ جس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شاید آریائی لفظ گھیتو (GHI EU) سے بنا ہے جس کے معنے "قربانی" کے ہیں۔

عربی کی ہمشیرہ عبرانی زبان میں ایل اور ایلیا کے دو لفظ ملتے ہیں۔ ایلواہ (ELOAH) بھی اس کا تلفظ ہے قدیم

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عبرانی صحیفوں میں جَہ ۔ جیہووَہ ۔ یہٰ اور یہوسیہ بھی خدا کے نام آتے ہیں۔
جاپانیوں کا قدیم مذہب شنٹوازم تھا۔ شِن تاؤ کا معنیٰ ہے دیوتاؤں کا راستہ۔
روس اور روسی اشتراکیت کے پیروکار کسی خُدا کو نہیں مانتے۔
افریقہ کے قدیم قبائلوں، امریکہ کے ریڈ انڈین اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کے خداؤں کے کیا نام تھے یہ ابھی تحقیق طلب ہے

قرآنِ حکیم نے ان تمام تصورات کے بے جن سے ذاتِ الوہیت کو وابستہ کیا جا سکتا ہے ہمیں "اللہ" کا لفظ بطور اسمِ ذات عطا کیا ہے۔ اس ایک لفظ نے نہ صرف مندرجہ بالا انسانی ذہن کے تراشیدہ تصورات کی تطہیر کر دی ہے بلکہ ثنویت، تثلیث اور کثیر خداؤں کے عقیدوں کو ختم کرنے کے ساتھ ملوکیت، سرمایہ داری اور پیشوائیت کے پیدا کردہ تصورات کی بھی نفی کر دی ہے۔ ہر قسم کے اقتدار، ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی سلطانی اور کبریائی کو ایک اور صرف ایک حیّ و قائم زندہ جاوید ہستی کے ہاتھ میں دیکر بنی نوع انسان کو تمام غلامیوں سے آزاد کر دیا ہے اور یہ حیّ و قائم اور زندہ فعال ہستی بھی وہ جس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ اس ہستی کے کسی مثال سے بھی بیان نہیں کیا جا سکتا (۱۱:۴۲) کوئی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ (۶:۱۰۳) تاہم جو باتیں ہماری نگاہوں سے اوجھل اور ہمارے حواس کی پہنچ سے دور ہیں اللہ کو ان سب کا علم ہے۔ (۶:۵۹) وہ تمام انسانی اعمال اور افعال کا بھی علم رکھتا ہے (۱۹:۱۶) یہاں تک کہ وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کے اندر پیدا ہونے والے خیالات تک کو جانتا ہے (۵۰:۱۶) اسے کائنات کے تمام اسرار و رموز کا بھی علم ہے (۲۵:۱۶) اللہ سب کچھ دیکھتا اور سب کچھ سنتا ہے (۵۸:۱) اور وہ ہر بات کی خبر رکھتا ہے (۲:۲۳۴) سمیع اور بصیر اور علیم ہونے کے علاوہ "اللہ قادر ہے" (۱۰:۹۹) قدیر ہے (۲۳:۴) اور ہر قسم کی قوت و اقتدار کا مالک ہے (۵۱:۵۰) کائنات کی حرکت و عمل کا مرکزی کنٹرول مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں ہے (۷:۵۴) یعنی کائنات پر حکومت اسی کی ہے، (۹:۱۱۶) لیکن اس نے ہر چیز کے لیے قوانین مقرر کر دیے ہیں۔ (۲:۶۵) ہر چیز اسی کے مقرر کردہ پیمانوں کے تابع رہتی ہے (۳۷:۳۳) اور ہر چیز اس کے قوانین کی اطاعت پر مجبور ہے (۴۰:۲۶)۔

یہ باتیں ہمیں اللہ کے کلام یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہونے والی آخری وحی کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں تاہم ان کی تصدیق اور توثیق کائنات کے مظاہر، ان کے ضبط و ربط اور نظم و نسق پر غور و فکر کرنے سے بھی کی جا سکتی ہے جہاں تک اللہ کی قدرت اور اختیار و ارادہ اور اقتدار کا تعلق ہے وہ لامحدود اور بے نہایت ہیں۔ ان کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اللہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے (۱۴:۲۷)

لیکن

اس نے خود ہی اپنے لامحدود اختیارات اور بے انتہا قوت و قدرت اور ارادے پر عدل و قانون کی مہر لگا رکھی ہے۔ اور وہ اس مہر کو کبھی نہیں توڑتا۔ یعنی کائنات کی ہر چیز کو اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تخلیق کیا، ہر شئے کے لیے پیمانے مقرر کر دیے (۲:۶۵) تاکہ نظم و نسق قوانین کے تحت اور کارخانۂ قدرت مقرر کردہ پیمانوں اور اندازوں کے مطابق چلتا رہے۔ اللہ کی اس عادت اور روش کو سنت اللہ کہا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ تم اللہ کی اس عادت یا روش میں کبھی تبدیلی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نہیں پاؤ گے۔ (۲۲:۶۱) اور یہ قانون ہے! "گندم بوؤ گے تو گندم کاٹو گے" یعنی جیسا عمل ویسا نتیجہ — نظامِ عدل! یہ ہے اللہ کے قرآنی تصور کی ایک جھلک۔ اور پھر حکم یہ کہ اگر تم اس تصور کے مطابق اللہ پر ایمان لاؤ گے تو اسے تسلیم کیا جائے گا۔ اور اگر اس میں ذرا بھر بھی ملاوٹ کرو گے تو لے ایمان باللہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

آپ پوچھیں گے اللہ پر اس طرح ایمان لانے میں "ملاوٹ" کیسے ہو سکتی ہے؟ تو گزارش ہے کہ فرعون، ہامان اور قارون کا دائرہ مذمومہ جو ربّ الناس، ملک الناس اور الٰہ الناس بنے رہنے پر مُصر رہتا ہے وسوسوں کی ملاوٹ کی شر انگیزی کرتا رہتا ہے۔ جب یہ وسوسے صدور الناس میں اتر جاتے ہیں تو پھر ان کا وہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انسانی نظامِ عدل اور اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل میں جو فرق ہے پہلے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھ لیں۔ آپ آگ میں انگلی ڈالیں گے تو آپ کی انگلی جل جائے گی۔ اور آپ کو تکلیف ہوگی۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ قانون ہے۔ قانونِ فطرت یا قانونِ مکافاتِ عمل! یہ قانون کس طرح خودکار نظام کے تحت چلتا ہے دیکھئے!

۱— اگر آپ لوگوں کے سامنے آگ میں انگلی ڈالیں گے تو آپ کی انگلی جل جائے گی۔

۲— اگر آپ کمرے کی تنہائی میں جہاں کوئی بھی آپ کو نہیں دیکھ رہا۔ ایسا کریں گے تو بھی جل جائے گی (یعنی قانون شکنی کی سزا کے لئے کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہے نہ پکڑنے والے کی، نہ خارجی عدالت کی۔ جزا یا سزا خود عمل کے اندر موجود ہے)

۳— یہ بھی نہیں ہوگا کہ آپ اقبال کریں کہ واقعی آپ نے آگ میں انگلی ڈالی تھی تو آپ کو درد ہو اور اگر انکار کر دیں تو آپ درد کی تکلیف سے بچ جائیں۔ جرم کی سزا بہرحال آپ کو مل کر رہے گی۔

۴— یہ بھی نہیں ہوگا کہ چونکہ آپ "بڑے آدمی" ہیں اس لئے آپ کو درد کی سزا نہ ملے یا دوسروں سے کم ملے۔ فطرت کے قانون میں "خونِ رگِ بادشاہ رنگین تر از خونِ رگِ مزدور نیست"!

۵— یہ بھی ہرگز کبھی نہیں ہوگا کہ کسی کو ہزاروں روپے رشوت دے کر آپ اس سزا سے بچ جائیں۔

۶— یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ کسی رشتے سے بڑے صاحبِ اختیار کی سفارش لے آئیں اور آپ سزا سے بچ جائیں۔

۷— یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آگ میں انگلی تو آپ ڈالیں لیکن درد کسی اور کو ہونے لگے۔ آپ کا بیٹا، بھائی، بیوی، عزیز ترین دوست اور غمخوار بھی چاہے تو یہ درد اپنی طرف منتقل نہیں کر سکتا۔

اب دیکھئے انسانی نظامِ عدل میں کیا ہوتا ہے۔ اوّل تو مذکورہ دائرہ مذمومہ کی طرف سے یہ "وسوسہ" لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا گیا ہے کہ ارتکابِ جرم، جرم نہیں بلکہ پکڑا جانا جرم ہے۔ یعنی جرم کرو اور خوب کرو لیکن بڑی احتیاط سے کرو۔ کہیں پکڑے نہ جاؤ۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ اگر آپ نے کسی ایسی جگہ جرم کیا جہاں کوئی دیکھنے والا نہ تھا یا اگر آپ نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر جرم کیا تو آپ سزا سے بچ گئے۔ اگر اپنی غلطی سے آپ پولیس کی گرفت میں آ گئے تو دامے، درمے، سخنے، قدمے ہزاروں طریقے ہیں جان چھڑانے کے۔ اگر بات عدالت تک پہنچ گئی تو بھی دامے، درمے، سخنے، قدمے کے علاوہ انکارِ جرم، وکیلوں کی موشگافیاں، گواہوں کا انحراف

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

آپ کی غلط بیانیاں، آپ کا سوشل سٹیٹس، سفارش، رشوت، اثر و رسوخ وغیرہ سے آپ بآسانی بری ہو سکتے ہیں. آپ سچے دل سے اعترافِ جرم بھی کر لیں تو بھی آپ کا وکیل عدالت سے کہہ دے گا یہ خوف کے مارے اعترافِ جرم کر رہا ہے ورنہ میرا مؤکل تو جرم کر ہی نہیں سکتا ان سب جان بچانے والی دوائیوں Life Saving Drugs کے استعمال کے باوجود اگر معاملہ جیل خانے تک بھی جا پہنچے تو وہاں بھی قوی امکانات ہیں اس بات کے کہ چکی کی سزا آپ کو ملے لیکن لے پیسے کوئی اور!

ملوکیت، "انسانی ذات" کی فطری آزادی کو سلب کر دیتی ہے. پیشوائیت اس کی فطری صلاحیتوں کو تباہ کرتی ہے. اور قارونیت اس کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کر کے رکھ دیتی ہے، ان تینوں کے استبداد کو توڑنے کے لئے ضروری ہے کہ اختیار اور اقتدارِ اعلیٰ صرف ایک اتھارٹی کے ہاتھ میں ہو۔ اسلام نے اس ایک اتھارٹی کا نام ہمیں "اللہ" بتایا ہے۔ اس لفظ کے معنے اگر سابقہ خداؤں والے ہوتے یا ان معنوں کی زد انسانی خداؤں کے اقتدار پر نہ پڑتی تو اسلام کی اتنی شدت سے مخالفت نہ ہوتی جو پورے چودہ سو سال سے جاری ہے اور آئندہ بھی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دنیا میں فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کا وجود باقی رہے گا۔ تو آیئے دیکھتے ہیں وہ معنے کیا ہیں۔

اہلِ لغت کہتے ہیں کہ لفظ اللہ دو الگ الگ لفظوں اَل اور اِلٰہٌ سے مرکب ہے۔ اَلْ حرفِ تخصیص ہے۔ یعنی جس لفظ کے ساتھ بطور لاحقہ مل جائے اسے خاص بنا دیتا ہے. اَلِہَ اِلَیْہِ یا اَلِہَ کے معنے ہیں گھبرا کر پناہ ڈھونڈنا۔ اَلِہَ کے معنے حیران ہونا بھی ہے اور اَلَہَ یا اَلَہٗ کا مطلب ہے امان یا پناہ دینا اَلِہَ بمکان سے مراد ہے امن اور سکون سے کسی مکان میں سکونت اختیار کر لینا۔ ان مفاہیم کے پیشِ نظر اِلٰہٌ کے معنے ہوئے وہ ہستی جس سے کسی خطرے کے دوران پناہ حاصل کی جائے یا جس سے مصائب اور مشکلات دور کرنے کی استدعا کی جائے۔ یا وہ ہستی جس کی عظمت انسان کو متحیر کر دے. اب ایک اور پہلو سے بھی اس کے معنے دیکھئے۔ اَلَہَ کے ایک معنے یہ بھی کئے گئے ہیں، کہ وہ شخص غلام بن گیا۔ اَلَّہَہٗ کے معنے ہیں اس نے اسے غلام بنا لیا۔ اسی سے تَالِیہٌ کے معنے غلام بنانے کے آتے ہیں۔ لہٰذا ان معنوں کے اعتبار سے اِلٰہٌ وہ ہستی ہوئی جس کا غلبہ اور اقتدار قبول کر لیا جائے اور جس کے ہر حکم کی تعمیل کو فرض جان لیا جائے گویا محکومیت اور غلامی قبول کر لینا بھی اس لفظ کے مفہوم کا حصہ ہے. قرآن حکیم میں آیا ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ سے کہا اگر تم نے میرے سوا کسی کو اِلٰہٌ مان لیا تو میں تجھے قید کر دوں گا (۲۶:۲۹) تو یہاں اِلٰہٌ کے معنے صاحبِ اقتدار و قوت کے ہیں اسی طرح جہاں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشات کو اِلٰہٌ بنا لیا ہے (۴۳:۲۵) تو یہاں بھی معنے اقتدار والے حاکم کے ہیں. اب تیسرا پہلو ایک اور بھی ہے اس لفظ کے معنے متعین کرنے کا۔ اور وہ یہ کہ چونکہ توہم پرستی کے زمانے میں اجرام فلکی یعنی سورج۔ چاند ستاروں وغیرہ کی پوجا بھی کی جاتی تھی. اور انہیں بڑی طاقت والا سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اَلْاِلٰہَۃُ کے معنے چاند اور اَلْاٰلِہَۃُ کے معنے سورج کے ہو گئے۔ اب

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یہیں سے یہ لفظ ہر قسم کے معبود کے لئے استعمال ہونے لگا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اصنام پرستی امید اور خوف کے تصورات کے گرد گھومتی ہے۔ لہٰذا ان تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر "اِلٰہ" کے معنے اس طرح متعین کئے جائیں گے کہ

> اِلٰہ ہر وہ چیز، ہر وہ شخص، ہر وہ خیال اور تصور ہے۔ جس کے بارے میں انسان یہ یقین کرے کہ یہ چیز یا شخص یا خیال اور تصور اُسے نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر ہے لہٰذا یہ اس کے آگے جھک جائے۔ اس کی قوت اور اس کے اقتدار کو تسلیم کرے اور اس اعتبار سے یہ معبود بن جائے اور اس کے ساتھ تحیّر اور خوف اور اُمید وابستہ کرنے والا اس کا پجاری ہو۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اِلٰہ کے معنے صرف معبود ہی نہیں بلکہ ایسا صاحبِ قوت و اقتدار وجود ہے جو نفع یا نقصان پر بھی قادر ہے اور تحیّر اور بیم و رجا کا بھی مرکز ہے، اب اس لفظ کے ساتھ الف لام کا لاحقہ لگا دینے سے معانی میں تخصیص پیدا ہو جاتی ہے اور کثیر خداؤں کا وجود ختم ہو کر صرف ایک ہی ہستی کا تصور باقی رہ جاتا ہے۔ اہلِ عرب میں اللہ کا لفظ اسلام سے پہلے بھی رائج تھا۔ وہ اس لفظ کے معنوں کو ان تمام پہلوؤں سے جانتے پہچانتے اور سمجھتے تھے، اور ایک خدا کے وجود پر ایمان بھی رکھتے تھے۔ کہ یہ ایک خدا ان سے بہت دور کہیں آسمانوں میں رہتا ہے ہماری کسی بات کو نہیں سنتا۔ اس سے مدد مانگنے کے لئے یا اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ان چھوٹے چھوٹے خداؤں کا ہونا ضروری ہے ہماری آرزوئیں، تمنائیں، خواہشیں اور امنگیں اللہ تک ان چھوٹے چھوٹے معبودوں کے وسیلے سے ہی پہنچ سکتی ہیں۔ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہر وقت موجود ہیں۔ جبکہ اللہ "غیب" ہے۔ ہم قریب کے دیکھے بھالے خداؤں کو چھوڑ کر دور کے ان دیکھے "اللہ" کی طرف رجوع کیسے کریں۔ گویا اللہ کا تصور ان کے لئے کوئی نیا یا انوکھا تصور نہیں تھا۔ نئی اور انوکھی بات ــ جو انقلاب آفریں ثابت ہوئی اور شدید سے شدید مخالفتوں کا پیش خیمہ بن کر سامنے آئی یہ تھی۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ وہ اعلان ہے جو آج بھی قیصر و کسریٰ کے محلات میں زلزلہ برپا کر دیتا ہے۔ اس اعلان کے ذریعے ہم زبان سے اقرار اور خلوصِ دل سے اقرار کی تصدیق کرتے ہیں کہ کوئی چیز، کوئی شخص، کوئی تصور، کوئی نظریہ، کوئی فلسفہ غرض کوئی داخلی یا خارجی قوت اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت ایسی نہیں ہے جو ہمارے لئے کسی بھی قسم کے نفع یا نقصان پر قادر ہو، ہماری اُمید و بیم کا محور ہو یا جس کی کسی طرح کی حاکمیت تسلیم کرنے پر ہم مجبور ہوں۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمیں اپنا غلام بنائے یا جس کی قوت کی برتری تسلیم کر کے ہم جھک جائیں یا جس سے مغلوب ہو کر ہم اس کا اقتدار مان لیں، سوائے البتہ ایک کے اور وہ ایک اللہ ہے!

نفی کی یہ تلوار پندار کے ہر بُت کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور کعبۂ دل سے تمام تصوراتی اصنام کو نکال باہر پھینکتی ہے۔ نہ چھوٹے بڑے انسان نما خدا باقی رہتے ہیں۔ نہ بادشاہ۔ نہ سردار، نہ جاگیردار، نہ وڈیرے، نہ خلفا ہوں کے رہبان، نہ مال و دولت کے زور سے انسانوں کو غلام بنانے والے۔ نہ جھوٹی کرامتیں دکھا کر سادہ لوح مریدوں کو

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حلقہ بگوش بنانے والے پیر باقی رہتے ہیں اور نہ نسلی امتیازات کے باطل تصورات سے انسانوں کو مرعوب یا خوفزدہ یا مسحور کرنے والے دشمنانِ دین وملت باقی رہتے ہیں۔ بلکہ اس کی ضربِ کوہ شکن سے خود اپنی بکیہ صلاحیتوں یعنی علم، عقل، جذبات وغیرہ کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

انکار کا یہ مقام بظاہر بڑا ہی کٹھن اور صبر آزما دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی رنگ برنگی دلفریبیاں اس قدر پرکشش اور پرشر باہیں کہ جگہ جگہ کرشمات دل کے دامن کو کھینچ لیتے ہیں کہ رک جاؤ، یہی تو ہے وہ بہشت جس کی تلاش میں یوں مارے مارے پھر رہے ہو! قدم قدم پر گوناگوں دام ہائے تزویر بچھے ہیں۔ قریہ قریہ محسوس پیکروں کی جاذبیت سے آباد ہے۔ لیکن کثیر خداؤں کے انکار کی حکمت، ایمان کامل بن کر جس کے قلب ونظر میں اتر گئی اس نے سوا اللہ کے تمام بتوں کو جھکنا چھوڑ کر دیا اور صرف ایک کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے ایسی سلطانی پیدا کرلی جو زمان ومکان کی فصیلوں کو بھی توڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

یہ ہے اللہ کا وہ قرآنی تصور جو سادہ بھی ہے، لطیف بھی ہے۔ اور سمجھنے میں آسان بھی ہے۔ اللہ وہ عظیم اور بلند وبالا ہستی ہے، جو انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جس کی تخلیقی فعالیت، قدرت اور قانونِ توازن و تناسب کے استحکام کے سامنے عقل وادراک ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ جس کی حاکمیت کائنات کے ذرّے ذرّے پر حاوی اور محیط ہے جس کا قانون ہر جگہ اور ہر وقت نافذ و جاری ہے۔ جو اپنی صفاتِ ربانیہ اور افعالِ کونیہ میں واحد لاشریک ہے، جو اپنی ساری مخلوق کا پہلا اور آخری سہارا اور یقینی آسرا ہے۔ تمام جمالی وجلالی صفات و کمالات اسی کو زیبا ہیں۔ اور وہی نظامِ کائنات پر مکمل طور پر متصرف ہے وہی خالقِ اکبر ہے، قادرِ مطلق ہے، مالکِ کل ہے۔ ارحم الراحمین ہے۔ احکم الحاکمین ہے اور احسن الخالقین ہے۔

اللہ احد ہے، الصمد ہے، نہ وہ عمل تولید کے ذریعے وجود میں آیا ہے اور نہ کوئی اور ہستی اس سے بذریعہ تولید وجود میں آئی ہے، اس کی کوئی نظیر اور مثال نہیں ہے (۱۱۲: ۱-۴)

اللہ کے حکم میں کوئی شریک نہیں (۱۸: ۲۶) اس نے ہر شئے کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں (۵۴: ۴۹) وہ کائنات میں تخلیقی اضافے کرتا رہتا ہے (۳۵: ۱) اللہ کی ربوبیت میں کوئی شریک نہیں ہے (۶۳-۳) اللہ نے پیدا کیا اور سامانِ زندگی مہیا کیا (۴۰: ۳۰) سامانِ زندگی پیدا کرسکنے والی ہستی اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے (۲۳: ۱۹) ہر سانس لینے والے کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے (۶: ۱۱) اللہ رحمٰن اور رحیم ہے (۱: ۲) اس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے (۶: ۱۲) اس کی رحمت ہر شئے کو احاطے میں لئے ہوئے ہے (۷: ۱۵۶) اللہ ہر قوت اور اقتدار کا مالک ہے (۵۸: ۵۱) اللہ ہی موت و حیات عطا کرتا ہے (۵۶: ۱۰) موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرنے والا بھی اللہ ہے (۲: ۲۸)۔

انسان کو اپنی محدودیت، ناقص اور نامکمل ذات" کی وجہ سے ایک دوست، رفیق اور مددگار کی ضرورت رہتی ہے، لیکن اللہ کو اس قسم کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی (۱۷: ۱۱۱) اللہ ہر معاملے کو اس کی صحیح حدود کے اندر رکھتا ہے اور اسے مدام

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نہیں ہونے دیتا وہ الحکیم ہے (۴۰:۶) اللہ رہنمائی عطا کرنے والا ہے (۳۱:۲۵) اللہ اپنے "وعدوں" کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا (۸۰:۳) اللہ سرچشمۂ خیر ہے (۲۵:۳) اللہ ساری مخلوق کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ (۱۱۷:۲) بیج سے پودا اگانے والا بھی اللہ ہے (۹۴:۶) اللہ کائنات کے اندر ہر جگہ موجود ہے (۱۱۵:۲) اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۳۵:۲۴) اللہ ہی تمام انسانوں کا رب، مالک اور الٰہ ہے (۱۱۴:۱-۳)

(ے)

اُلوہیت کے تصور کو صحیح خد و خال کے ساتھ ذہن میں نقش کر لینے سے ایک تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کیا ہے۔ دوسرا یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کیا نہیں ہے۔ قرآن حکیم انسان سے بار بار یہ تقاضا کرتا ہے کہ جب اللہ کے تصور کی تنزیہہ و تطہیر کر چکو اور اس کا وہ نقش ذہن پر بٹھا چکو جو قرآن حکیم نے پیش کیا ہے، تو پھر عابد، مطیع، محکوم اور ذاتِ ناقص و ناتکمل ہونے کی حیثیت سے اللہ کی ہدایت اور رہنمائی کی روشنی میں اُسی کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتے چلے جاؤ۔ اور اللہ کے مقرر کردہ قوانین کی رفاقت کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑو۔ دنیا میں عدل و حریت کے نظام کو مشہور بنانے کا جو فریضہ تمہارے سپرد کیا گیا ہے اسے محض تصورات ہی میں نہ رہنے دو بلکہ اسے عملاً قائم کرنے کی طرف قدم بڑھاتے رہو۔ اللہ کی معاونت اور بالآخر اپنے مشن کی کامیابی پر یقین رکھو۔ جس طرح اللہ کا تخلیقی عمل کائنات میں جاری ہے اسی طرح تم بھی تخلیقی عمل میں اللہ کے شریکِ کار بن کر "قدسون" کی تخلیق اور ان کے تحفظ میں سرگرم عمل رہو۔ اس پروگرام پر عمل کرنے سے اخلاقی نظام میں استحکام پیدا ہوگا اور عدل و مساوات اور اخوت و حریت اور امن و سلامتی کی اعلیٰ قدریں اپنی تکمیل و ارتقا کی منزل تک پہنچ جائیں گی۔ اللہ کی "ذات" کے ساتھ انسان کی "ذات" کا تعاون اور اشتراکِ عمل اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عطا نعمت ہے، انسانی "ذات" میں صرف امکانات ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی "ذات" اکمل اور اتم ذات ہے۔ اس اتم اور اکمل ذات کو مثالی مقصود و مطلوب بنا کر انسان اپنی ذات کو ممکنہ حد تک ارتقا دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اس کے لئے معیارات ہیں، ان معیارات پر وہ اپنے اعمال کا احتساب بھی کر سکتا ہے، اور اپنی تکمیلِ ذات کی رفتارِ ترقی کا جائزہ بھی لے سکتا ہے، اس طرح انسان کے ساتھ اللہ کا رشتہ رفیقِ اعلیٰ ہونے کے علاوہ مثالی مقصود و مطلوب کا بھی قائم ہو سکتا ہے۔

تمہارے نشو و ارتقا دینے والے کا حکم یہ ہے کہ تم اس کے سوا اور کسی کی محکومیت و اطاعت اختیار نہیں کرو گے (۱۷:۲۳) محکومیت اور اطاعت اختیار کرنے کے معنے ہیں، اپنے آپ کو آقا کی مرضی اور منشاء کے ساتھ ہم آہنگ کر لینا۔ اپنے آپ کو اسی ایک اعلیٰ رفیق کی صفات کے رنگ میں ڈبو دینا۔ اسی کی ذاتِ لامتناہی کے پرتو نور سے اپنی محدود سی ذات کو منور و درخشاں بنا لینا۔ بالکل اسی طرح جس طرح لوہا درجہ بدرجہ آگ کی صفات اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اسماء الحسنیٰ کی معانی پر غور و فکر کرنے سے "ذاتِ خداوندی" کے مختلف گوشوں کی جھلک سامنے آتی ہے، علم الاخلاق کی مدد سے ہم انہیں "مستقل قدریں" کہہ سکتے ہیں۔ کائنات کے عمل حرکت و تغیر اور عمل تخلیق میں تسلسل اور اضافے کے قوانین کے معروضی مطالعے سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا استنباط ہوتا ہے۔ بنی نوع

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسان پر قرآن حکیم کا یہ بھی ایک خاص احسان ہے کہ اس نے اسے اللہ تعالیٰ کے خوبصورت صفاتی نام بھی بتا دیئے ہیں۔ یہ اسماءِ "حسنیٰ" اس لئے ہیں کہ ان میں توازن و تناسب ہے۔ توازن و تناسب میں افراط و تفریط نہیں ہوتی بلکہ کامل اعتدال ہوتا ہے۔ چنانچہ اسماء الحسنٰے میں اگر ایک طرف ذاتِ ربانی غفور الرحیم ہے تو دوسری طرف شدید العقاب بھی ہے۔ ایک طرف عفوًا کریم ہے تو دوسری طرف جبار المتکبر بھی ہے۔ محیی ہے تو ممیت بھی ہے۔ معز ہے تو مذل بھی ہے علیٰ ہذا القیاس۔ بظاہر یہ صفات ایک دوسرے کی متضاد نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، ہر صفت اپنا الگ مقام رکھتی ہے اور اس کا ظہور اس کے مناسب موقع پر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے لئے سخت گیر ہے۔ تو مظلوم کیلئے رحیم و کریم ہے۔ قوانینِ حیات آفرین کے سامنے جھک جانے والوں کو سرفرازیاں اور سربلندیاں عطا کرتا ہے تو سرکشوں اور باغیوں کے تکبر اور غرور کو توڑ دیتا ہے۔ بندگانِ مولا صفات بھی جب ان صفات کے رنگ میں بحدِ بشریت ڈوب جاتے ہیں تو رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ اور اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ بن جاتے ہیں۔ ان میں وہ خوبیاں بھی بدرجۂ کمال موجود ہوتی ہیں جنہیں "اخلاقی خوبیاں" کہا جاتا ہے۔ لیکن مومنین دوسرے "نیک لوگوں" سے جس باب میں منفرد ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب کائنات کے کسی معمولات کے یا ہنگامی واقعے سے اللہ کی کسی صفت کا ظہور ہوتا ہے تو مومنین کی طرف سے بھی اسی صفت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ ہر واقعہ پر مومنین کا ردِ عمل بھی وہی ہوگا جو اللہ کا "ردِ عمل" ہوگا۔ یعنی گرفت کے موقع پر گرفت، عفو کے موقع پر عفو۔ پھوڑے کے لئے نوکِ نشتر اور زخم کے اندمال کے لئے مرہم کا پھایہ۔ جب لوہے کی سلاخ آگ کی خاصیتوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے تو اس میں سے روشنی اور حرارت از خود پھوٹنے لگتی ہے۔ اسی طرح بندۂ مولا صفات کے ردِ عمل سے بھی صفتِ ربانی کا ظہور از خود ہوتا ہے اُسے سعی و کوشش یا فیصلے کی کشمکش سے نہیں گزرنا پڑتا۔ بلکہ ان صفات کا اظہار دریا کی روانی کی طرح خود بخود ہوتا ہے اس کی ذات میں یہ صفات ہمہ وقت موجود رہتی ہیں۔ اور مناسب موقع پر مناسب صفت خود بخود ظاہر ہوتی ہے، مومن کی "ذات" کے اندر "صفات" اس طرح سمو جاتی ہیں جس طرح پھل کے اندر خوشبو، رنگینی، لطافت اور لذت و افادیت ہوتی ہے۔ "انسانی ذات" کے اس طرح "ذاتِ خداوندی" کے ہم رنگ ہو جانے کو اہلِ تصوف نے قربِ الٰہی کی اصطلاح دی ہے۔ یہ قرب زمان و مکان سے ماورا قرب ہے یعنی قطرے کے دریا میں مل جانے والا قرب نہیں بلکہ قطرے کا اپنے اندر قطرہ رہتے ہوئے بھی، دریائی صفات کا پیدا کر لینا ہے۔ یہ اطاعت و خود سپردگی ہے۔ تسلیم و انقیاد ہے۔ عبودیت و بندگی کی معراج ہے۔ شریعت و طریقت و معرفت و حقیقت ہے۔ صراطِ مستقیم ہے۔ اسلام ہے۔ سورۂ والنجم میں قابَ قوسین کی تلمیح۔ سورۂ بقرہ میں اِنّی قریب کی بشارت اور سورۂ مومن میں اَسْتَجِبْ لَکُمْ کا ارشاد اللہ کی رفاقت کے اسی رشتے کی طرف بلاتے ہیں۔ ناصر، نصیر، ولی، وکیل، اور ھُوَ مَعَکُمْ کے الفاظ بھی رفاقت تائید اور اشتراکِ عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اسلام نے باہمی اشتراکِ عمل کی طرف متوجہ کر کے انسانی زندگی کو پہلی بار فعال، با مقصد اور رجائیہ بنا دیا ہے، خوف اور حزن اور بے ہمتی کے احساس کی کالی گھٹائیں جو صدیوں سے قنوطیت کے اندھیرے لے کر روحِ انسانی پر منڈلا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

رہی تھیں یکسر صاف ہو گئیں اور انسان نے اپنے ہی ذہن کے پیدا کردہ غلط تصورات سے نجات حاصل کر کے آزاد اور ارتقا پذیر وسیع فضاؤں میں پرفشاں ہونے کے لئے کمر ہمت باندھ لی چونکہ "ذات" "صرف" "ذات" ہی کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کرتی ہے اور مخلوقات خداوندی میں صاحب "ذات" شخصیت صرف انسان ہے اس لئے انسان اور اللہ کا رشتہ رفاقت اور بھی نتیجہ خیز اور بامقصد بن جاتا ہے۔

> جو لوگ ہر آزمائش میں پورے اترتے ہیں، ہر مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اگر مفاداتِ عاجلہ اور "مستقل قدروں کے تحفظ" کے درمیان کسی ایک کو منتخب کرنے کا دشوار مرحلہ پیش آجائے تو وہاں مستقل قدروں کا ساتھ دیتے ہیں، جذبات کے پیچھے نہیں چل پڑتے۔ اور جو صبر و استقلال کے ساتھ آگے بڑھتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور قوانین خداوندی کی پیروی میں ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹتے اللہ انہی کا مددگار، حامی اور ناصر یوں ان کے ساتھ رہتا ہے۔

انسان اس دنیا میں بہت بڑی ذمہ داریاں قبول کر کے آیا ہے اس نے امانت کا جو بار اپنے ناتوان کندھوں پر اٹھا رکھا ہے اسے بخیر و خوبی کے ساتھ پار لگانے کے لئے انسان کو اللہ کی تائید و نصرت اور تعاون اور ہمراہی کی ہر لمحے ضرورت رہتی ہے۔ اگر اسے محدود اختیار و ارادہ نہ دیا گیا ہوتا، تو یہ امانت کو قبول کرنے کے قابل ہی نہ ہوتا۔ تاہم اس کا اختیار و ارادہ اسے غلط راہوں پر بھی لے جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ محدود ہے۔ نامکمل (LIMITED) ہے اور اس کے حوصلوں میں بلندی، ہمت میں پختگی اور عزم میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے جب وہ یہ سوچتا ہے کہ اس کا معاون، اس کا حامی اور ناصر، اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے والا اس کا رفیق، غیر محدود قوتوں کا مالک ہے، یہ بلند حوصلگی اس کے ایمان اور یقین کا جزو بن جاتی ہے، اور پھر بڑی سے بڑی مزاحمت بھی اس کے عزم کا راستہ نہیں روک سکتی۔ قوتِ ایمان اسی کو کہتے ہیں۔

اللہ کی رفاقت پر کامل یقین، رفیقِ اعلیٰ کی ہدایات پر اعتقاد اور پوری پوری اطاعت، صراطِ مستقیم پر بے خوف و خطر چلتے چلے جانا، صبر و استقلال کا دامن کسی بھی صورت میں نہ چھوڑتے ہوئے اقدارِ عالیہ کے تحفظ میں سرگرم عمل رہنا اور اپنی تمام سعی و کاوش کا رخ، دنیاوی زندگی کے ہر لمحے میں اللہ کی سمت قائم رکھنا، انسان کی صلوٰۃ و تسبیح ہے۔

> اسی صلوٰۃ و تسبیح کا دوسرا نام صبغۃ اللہ ہے۔ یہی قربِ الٰہی ہے۔ یہی تزکیۂ نفس ہے۔ فنا فی اللہ اور بقا باللہ بھی یہی ہے۔ عشق بھی یہی ہے۔ وصل و محبت و استغراق بھی یہی ہے۔

(۸)

ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں اتنا کچھ جان لینے کے بعد اب ہم "اسماء الحسنیٰ" کے مفاہیم کی طرف قدم۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اٹھاتے ہیں۔ تاکہ ہمیں اپنی محدود "انسانی ذات" کو "صفاتِ ربانی" کے رنگ میں رنگ لینے کی جدوجہد میں آسانی ہو۔ قرآن حکیم کی پہلی آیت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ جس کے معنے ہیں ہر قسم کی تعریف و ستائش کی سزاوار اللہ کی ذات ہے۔ سچی محبت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آپ کسی کے حسن و جمال کی عظمتوں کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم نہ کر لیں۔ محبوب اور مطلوب و مقصود بلکہ واجب اتباع و تقلید ہستی صرف وہی ہو سکتی ہے جو ہر خوبی میں منتہائے کمال تک پہنچی ہوئی ہو اور اس کے ساتھ ہی چاہنے والے سے کچھ اشتراک بھی رکھتی ہو۔ الحمد وہ خاص کلمۂ ستائش ہے جو سوائے اسم ذات "اللہ" کے اور کسی کیلئے نہیں بولا جاتا۔ مثلاً ہم اَلْحَمْدُ لِلرَّحْمٰن یا اَلْحَمْدُ لِلرَّحِیْم وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح اللہ کا اسم اپنے مسمّیٰ کی ذات و صفات سب پر مجموعاً حاوی ہے اسی طرح لفظ "حمد" بھی کمال و جمال کے تمام تعریفات کا جامع ہے۔ چونکہ کامل ترین ہستی کے لئے کامل ترین اسم صفت استعمال ہوا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس لفظ کے مفاہیم کو سمجھ لیں۔

جب ہم کسی حسین و جمیل، متناسب و نادر شاہکار کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں تحسین و تعریف کے جذبات اس شدت کے ساتھ ابھرتے ہیں کہ ہمارے منہ سے بے ساختہ واہ واہ کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ ستائش کے اس طرح کے اظہار کو حمد کہتے ہیں۔ اس اظہار کا مقصد اس شاہکار کے خالق کی عظمت اور برتری کا اعتراف ہوتا ہے، لیکن اس طرح کی تعریف و توصیف کے لئے بھی جو حمد کے خاص معنوں میں آتی ہے، کچھ شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جس شاہکار کے حسن و رعنائی کی تعریف کی جا رہی ہے اس کا خارجی حیثیت سے ایک محسوس پیکر ہونا ضروری ہے۔ غیر محسوس اور مشاہدے میں نہ آنے والی چیزیں ہمارے دل میں تحسین و ستائش کے جذبات نہیں پیدا کر سکتیں۔ مثلاً کسی مصور کی تعریف نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اس کی بنائی ہوئی کوئی اعلیٰ درجے کی تصویر ہمارے سامنے نہ ہو۔ ایسی تعریف جو سُنی سنائی باتوں پر مبنی ہو یا لوگوں کی دیکھا دیکھی کی جائے تعریف نہیں بلکہ تحسینِ ناشناس ہے یا محض رسمی چیز ہے اور اسی لئے بے معنیٰ ہے۔ قرآن حکیم ایسے لوگوں کی سخت مذمت کرتا ہے جو نمود و نمائش کے متمنی تو ہوتے ہیں لیکن کوئی ٹھوس کارنامہ پیش نہیں کرتے (۳:۱۸۸)

دوسری بات یہ ہے کہ کسی شخص کے جس کارنامے کی تعریف کی جا رہی ہو وہ اس شخص سے بالارادہ عمل میں آیا ہو۔ تاکہ اس کے ذریعے اس کی انفرادیت کے زندہ اور بیدار ہونے کا اندازہ ہو سکے۔ اضطراری طور پر یا میکانکی انداز سے یا محض اتفاقاً کسی اچھے فعل کا رونما ہو جانا ستائش کا حق پیدا نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ کسی کے پیدائشی حسن کے لئے بھی 'حمد' کا لفظ نہیں بولا جائے گا۔ اس کے لئے مدح کا لفظ استعمال ہو گا۔ اگر کوئی مشین نہایت عمدہ چیزیں بناتی ہے تو وہ قابل مدح تو ہو سکتی ہے قابل حمد نہیں ہے۔ البتہ اس مشین کا موجد قابلِ حمد ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خوبصورت پروں والا رقاص مور بھی مدح کا مستحق ہے حمد کا نہیں ہے۔

تیسری ضروری شرط یہ ہے کہ 'حمد' دل سے نکلے۔ کسی دباؤ کے تحت تعریف کرنا خوشامد تو ہو سکتی ہے حمد نہیں۔ حمد میں تصنع، نمائش، ناز برداری، ارکھ رکھاؤ، خوف، منافقت یا لالچ کدی وغیرہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

چوتھی بات یہ ہے کہ "حمد" کرنے والے کو اس شخص کے بارے میں پورا پورا علم ہونا چاہیئے جس کی وہ حمد کر رہا ہے کیونکہ محض گمان اور ظن و تخمین کی بنا پر حمد نہیں کی جا سکتی۔ مبہم تصورات، دھندلے سے نقوش، شکوک اور شبہات آمیز باتیں یا تذبذب پیدا کرنے والے خیالات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تخیل کی فریب کاری، توہمات اور اندھی عقیدتوں سے بھی حمد پیدا نہیں ہوتی۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جس شاہکار کی حمد کی جا رہی ہے وہ کمال کے درجے تک پہنچ چکا ہو، ادھورا یا خام نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کی افادیت اور نفع بخشی محسوس شکل میں سامنے آئے، وہ آرٹ جو تکمیل کی حد تک نہیں پہنچ پایا جو بنی نوع انسان کے لئے کسی قسم کی افادیت کا موجب نہیں بنا (جیسے جیب کترے کے ہاتھ کی صفائی) وہ حمد و ستائش کا مستحق نہیں ہے۔

ان شرائط میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہو تو اس کے لئے مدح وغیرہ کا لفظ تو استعمال ہو سکتا ہے، حمد کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان تمام شرائط کو ذہن میں رکھ کر آپ کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی تخلیق سے لے کر بڑی سے بڑی چیز کا بغور مشاہدہ کریں گے تو بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ سماوات و ارض کے اندر ہر جگہ "حمد" کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے (۳۰:۱۸) بادلوں کی گرج بھی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے (۱۳:۱۳) بلکہ کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو (۱۷:۴۴)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ ہر قسم کی حمد اللہ کے لئے ہے۔ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ عالمینی ربوبیت کی صفت ہے۔ "رب" کے لغوی معنے نشو و نما دینا ہیں۔ یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس طرح گزارنا کہ وہ چیز درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ کائنات کا ہر حسین گوشہ اللہ کی صفت ربوبیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ادنیٰ سا بیج بھی اپنے اندر کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ایک بے نقص اور خود کار نظام کے تحت ابھار کر انہیں تکمیل کی آخری حد تک لے جا رہا ہے۔ ہم نے کائنات کی آغوش مادری میں پلنے بڑھنے اور پھلنے پھولنے والے، عالم جمادات سے لے کر عالم انسان تک کے تمام عالمین کی بود و باش کے اصولوں، طریقوں اور ان کے درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کو چشم بصارت و بصیرت وا کر کے دیکھا تو ہم نے آنکھوں دیکھی شہادت کی رو سے یقین کر لیا کہ اس قدر وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی مخلوقات کی پرورش اندرونی صلاحیتوں کے ابھارنے کا انتظام اور انتظام بھی ایسا کہ اس میں کہیں نقص نہ ہو کہیں عیب نہ ہو، جو خود کار ہو۔ جو ہر چیز کی زندگی اور نشو و نما کا سامان مفت، بلا معاوضہ، بن مانگے اور ضروریات کے عین مطابق بہم پہنچا رہا ہو۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات واحد لاشریک اور قادر مطلق کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس چشم دید گواہی سے ہمارے ایمان کو اور زیادہ تقویت ملی اور ہمارا یقین عین الیقین سے بڑھ کر حق الیقین کی حد تک پختہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بحیثیت انسان، اپنے شرف و امتیاز کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ چونکہ اس ساری کا، کے اندر صرف ہم انسان ہی ذی شعور اور صاحب ذات "شخصیت" ہیں اس لئے اللہ کے ربوبیت کے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس عالی شان نظام کو اور زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ چلانے میں ہم بھی معاون و مددگار بن سکتے ہیں۔ بلکہ خلیفہ فی الارض ہونے کی حیثیت سے ہم تو ذمہ دار اور جوابدہ ہیں کہ اس نظام کو کم از کم اپنی دنیا میں آگے بڑھائیں اور ان سرکش قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں جو منطقی دلائل سے، روایات اور تاویلات کا سہارا ڈھونڈ کر یا "ملاءۂ مذمومہ" کی حمایت حاصل کر کے اللہ کے اس پروگرام میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں اور رزق کے بہتے سرچشموں کا رُخ موڑ کر اپنے حرص و ہوس کے کھیتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ (یَبْتَغُوْنَ اُمْنَاعُوْنَ ۱۰۷:۸۴)۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے اللہ کی صفتِ ربوبیت کو اپنے افعال و اعمال کے آئینے میں منعکس کریں۔ ہماری اس "انسانی ربوبیت" کا دائرہ بھی اتنا وسیع ہونا چاہیئے جتنی یہ ہماری زمین ہے، کیونکہ اسی کو ہمارا "مستقر" یعنی عارضی ٹھکانہ یا (ROAD-SIDE INN) اور اسی کو ہمارا "مستودع" یعنی جائے روانگی یا (PLACE OF DEPARTURE) قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی کو ہماری "انسانی ذات" کا دار العمل بنایا گیا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ ربوبیت عام ہو یا خاص، الوہیاتی ہو یا انسانی اس کا براہِ راست تعلق رحم سے ہے۔ ہماری زبان میں یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہے، لیکن عربی زبان سے آتے ہوئے بعض دوسرے الفاظ کی طرح اس کا بھی اصل مفہوم نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ اور اس کی بجائے ترس کھانے (MERCY) کا مفہوم سامنے آگیا ہے، اگر آپ تھوڑا سا غور کریں کہ شکمِ مادر میں بچے کی پرورش کس طرح ہو رہی ہے اور بچہ دانی کے غلاف کے اندر ملفوف رہ کر بچے کا خارجی اثرات سے محفوظ رہنے کا انتظام کتنا اعلیٰ ہے تو آپ "رحم" کے معنے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ رحمت کا لفظ بھی اسی سے بنا ہے اس کے معنے ہیں، ضرورت مند کی ضرورتوں کے مطابق ظاہر اور باطن کی کمی کو پورا کرتے رہنا گویا رحمت اور عطیہ ہے، جو بغیر کسی معاوضے کے بے مزد اور بلاقیمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے از خود ملتا ہے اور نشو و نما کے سامان کے ساتھ ساتھ حفاظت کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر جسم کے کسی حصے پر کسی تیز دھار چیز سے زخم آجائے تو خون جاری ہو جائے گا۔ اگر یہ خون بہتا رہے اور بند نہ ہو تو جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ لیکن اللہ کی رحمت نے خون کے اندر ہی ایسے اجزاء رکھ دیئے ہیں جو خون کو خود بخود جما دیتے ہیں۔ خون مزید بہنے سے رک جاتا ہے اور جان جیسی قیمتی چیز بچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خارجی دنیا کی چیزوں میں بھی ایسی تاثیرات رکھ دی ہیں جن سے زخموں کا اندمال ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں اللہ کی رحمتیں ہیں جن سے ہر زندہ مخلوق فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ہر وہ چیز رحمتِ ربانی ہے جو زندگی کو خوشگواریاں عطا کرتی ہے، جو اس کے نشو و نما کا باعث بنتی ہے اور جو اسے خارجی خطرات سے محفوظ رکھتی ہے۔

چونکہ انسان کا وجود صرف جسم تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں "انسانی ذات" بھی شامل ہے، اس لئے شرفِ انسانی کی نشو و نما، پرورش، بالیدگی اور نگہداشت کا سامان بھی رحمت ہے۔ وحیٔ ربانی کی پیروی سے "جسم اور جان" دونوں کو سامانِ افزائش فراوانی سے نصیب ہوتا ہے، اس لئے یہ اعلیٰ ترین رحمت ہے۔ اس کی رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنے جوہرِ انسانیت کی تکمیل کر سکتا ہے اور اسی کے ذریعے "انسانیت کو زخمی، بیمار،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور مضمحل کر دینے والے عوارض سے شفا حاصل کی جا سکتی ہے اس لئے یہ رحمت ہے (۵:۱۰۵-۲:۷۲-۴۴:۴۳)

اللہ رحیم اور رحمٰن ہے۔ قواعد کی رو سے یہ دونوں الفاظ تفضیلِ کُل کے صیغے ہیں۔ یعنی ان سے مراد وہ ہستی ہے جس میں "رحم" کی صفت اپنے انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ تاہم ان دونوں الفاظ کے معانی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ شکمِ مادر کے اندر بچے کی پرورش پانے کی مثال کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ مستقبل کے مولود کو نشو و نما کے دوران ربوبیت کے مراحل سے اس طرح گزارا جا رہا ہے کہ جرثومے کو لوتھڑے، لوتھڑے سے گوشت، داستخوان، پھر انسانی بچے کی شکل و صورت، پھر یہاں سے نامکمل اور غیر ترقی یافتہ جوہرِ انسانیت تک کے تمام مراحل پوری حفاظت کے ساتھ اور توازن و تناسب کے معیارات کے مطابق طے ہو رہے ہیں۔ اسے ہر لمحے ایسے نامیاتی اور کیمیاوی اجزاء کی ضرورت رہتی ہے جو اس کی لازمی طلب کے مطابق، یعنی نہ کم نہ زیادہ، تسلسل اور متواتر ملتے رہیں۔ یہ سارا کچھ ایک بے نقص انتظام کے تحت اپنے آپ ہو رہا ہے لیکن جونہی یہ بچہ پیٹ سے باہر آتا ہے اس کی ضروریات کے تقاضے یک دم بدل جاتے ہیں پہلا ماحول کچھ اور تھا اب ماحول کچھ اور ہے۔ پہلے اندھیرا تھا اب روشنی ہے۔ پہلے تجربہ کچھ اور تھا اور اب تجربہ کچھ اور ہے۔ پہلے سانس ماں کے توسط سے لیتا تھا اب خود لینے لگا ہے۔ روشنی، ہوا، حرارت، انحصار، ماحول سارے کا سارا بدل گیا ہے۔ بلکہ غذا کی نوعیت بھی مختلف ہو گئی ہے۔ اب حواسِ خمسہ بھی اپنی فعالیت کی طرف بڑھنے کے لئے جاگنے کی کوشش کر رہے ہیں، ذہنی قوتیں بھی انگڑائی لے رہی ہیں۔ گویا سابقہ نظام آن کی آن میں بدل گیا ہے۔ تاہم اللہ کی رحمت اور ربوبیت اس طرح فوری طور پر بدل جانے والے تقاضوں کے مطابق بھی بدستور جاری ہے اور اس میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ماں کی چھاتی سے اس کے لئے دودھ کے چشمے جاری کر دیئے گئے ہیں جس کا دنیا میں کوئی متبادل نہیں ہے، پرورش اور حفاظت کی یہ پہلی صورت "رحمتِ عمومی" ہے جو تسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری ہے۔ اب حالات بدل کر عام سے خاص ہو گئے ہیں اور ہنگامی اور شدید نوعیت اختیار کر گئے ہیں۔ تو اب "رحمتِ خصوصی" نشو و ارتقاء کے سامان مہیا کر رہی ہے۔ ارتقائی مراحل پھر بھی آئیں گے اور آتے رہیں گے (جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی نشو و نما کے اعتبار سے) لیکن اس کے ساتھ ساتھ شانِ ربوبیت بھی نئے نئے انداز بدلتی رہے گی، رہی وہ رحمت جو بہتے دریا کی طرح عام افادیت لئے ہر وقت جاری ہے اللہ کی صفتِ رحیمی کی مظہر ہے اور ہر وہ رحمت جو خاص، شدید اور ہنگامی حالات میں نشو و ارتقاء اور حفاظت کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کی مظہر ہے۔

ارشادِ ربانی ہے کہ ارض و سماوات میں جو چیز بھی ہے وہ اپنی (ہر ضرورت کے تقاضے کے مطابق) اسی کے در کی سوالی ہے۔ کیونکہ وہ ہر لمحے (ارتقاء کی) نئی سے نئی حالت میں رہتی ہے (۵۵:۲۹) اگر ہر چیز ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتی تو اسے ایک ہی قسم کے سامانِ نشو و نما کی ضرورت ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز تغیر پذیر ہے، کیونکہ ارتقاء کی منزل کی طرف رواں دواں ہے اس لئے اس کی نشو و ارتقاء کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب تک کوئی چیز یکساں ایک ہی حالت میں رہتی ہے اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمیت اسے اپنی آغوشِ عاطفت میں تھپکتی رہتی ہے، جونہی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس نے تغیرّ و ارتقا کی طرف قدم اٹھانے کی کوشش کی اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت نے اس کی انگلی پکڑ لی اس طرح کائنات کی ہر چیز اپنے نقطۂ آغاز سے چل کر منزلِ تکمیل تک حفاظت اور اطمینان کے ساتھ پہنچ رہی ہے۔

رحمت اور ربوبیت کے باہمی تعلق اور ان کے وسیع تر معانی کو ذہن میں رکھ کر اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیجیۓ اور پھر اپنے آپ سے پوچھیۓ کہ کہیں ایسا تو نہیں ہو رہا کہ بعض غنچے بن کھلے ہی مرجھا رہے ہوں یا بعض بیج پھوٹے تو ہوں لیکن ان کا درخت بننے کا عمل اس طرح ہوا ہو جس طرح بے آب و گیاہ صحراؤں میں لنڈ منڈ بے شاخ و ثمر کیکر یا جھنڈ کا ہوتا ہے۔ یا ان پودوں کی مانند ہوتا۔ جو تناور، بڑی بڑی شاخوں۔ بھرے بھرے پتوں والے گھنے اور مضبوط درختوں کے نیچے اُگتے ہیں لیکن جھاڑ جھنکار بن کر رہ جاتے ہیں۔ پھر دیکھیۓ کہیں بے جڑ کی توت بوٹی (آکاس بیل) تو آپ کے کسی چمن زار کی زندگی نہیں چوس رہی! کوئی دیمک تو اس کے بیخ و بن کو نہیں چاٹ رہی کہیں ایسا تو نہیں کہ صلاحیتیں اُبھرنے سے پہلے ہی دم توڑ رہی ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ملوکیت، پیشوائیت اور قارونیت کے رکھنوں نے رزق کے بہتے ہوئے قدرتی سرچشموں کو بند باندھ کر روک دیا ہو یا ان کا رخ اپنی ہوا اور ہوس کے کھیتوں کی طرف کر دیا ہو، اگر کہیں بھی "زندگی" کی نشوونما کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے تو اس سدِ راہ کو دور کرنا آپ کا فرض ہے۔ انسان رحمٰن نہیں بن سکتا۔ لیکن راحم بن سکتا ہے جس نے رحمت اور ربوبیت کو اپنی بشری حدود کے مطابق اپنی سیرت و کردار کا جزو اعظم بنا لیا اسے رحمٰن کا قرب حاصل ہو گیا۔ مہربانی۔ ہمدردی، نرم خوئی، باہمی امداد و تعاون، ایثار اور لطف و کرم اخلاقِ عالیہ کے اوصاف ہیں لیکن بدمزاجی، تند خوئی، درشتی، کم ظرفی اور ترش روئی بہیمیت کے خصائص ہیں۔ لیکن انسان اخلاقِ الٰہیہ کے ساتھ تخلق چاہتا ہے، جو صبغۃ اللہ میں اپنے آپ کو رنگنا چاہتا ہے وہ اس سے کہیں آگے بڑھ جاتا ہے۔ بہیمیت کے خواص کا اظہار ویسے بھی جوہرِ انسانیت کے ارتقا کے منافی ہے!

اہلِ مغرب نے ڈسپلن (DISCIPLINE) کے نام سے جو اخلاقیات کا درس ہمیں دیا ہے اور جس "رہبانیت" کے انداز پر ہم اپنے نظم و نسق چلانے والے عمّال کو عام انسانوں سے الگ تھلگ رہنے کی تربیت دیتے ہیں یہ قرآنی احکام اور رحمت و ربوبیت کے اصولوں کے سخت خلاف ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان کسی بھی قسم کے اور کسی بھی سطح پر فاصلے قائم کرنا آیۂ جلیلہ خَلَقْنَا كُم مِّن نَّفْسٍ (؟) آدم کا انکار ہے۔ مراتب کے اصولوں کو صرف تقوے کی فضیلت کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیۓ، ہر وہ رویہ جو "رحم" کی ربانی صفت کے خلاف ہے انسان کو اپنے امتیازی شرف سے گرا کر حیوانیت کی سطح پر لے آتا ہے اور یہ وہ خسارہ ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہے۔

اللہ نے رحمت اپنے اوپر واجب قرار دے رکھی ہے (۶:۱۲، ۵۴) انسان بھی بجدِّ بشریت رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے سکتا ہے اگر نہیں دے گا تو یہ رویّہ خود اس کی اپنی ذات کی تکمیل کے حق میں نقصان دہ ہے۔

اللہ رزّاق (۵۱:۵۸) اور خَیْرُ الرَّازِقِیْن ہے (۵:۱۱۴) رزق ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے معاد اور متمتع حاصل کیا جائے، وہ غذا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذی حیات مخلوق کو سامان نشوونما کے طور پر ملتی ہے، اس اعتبار سے تمام کھانے پینے کی چیزیں اللہ کا دیا ہوا رزق ہیں۔ مقررہ آمدنی بھی رزق ہے۔ بارش بھی رزق ہے (۲:۱۰) معاش اور رزق ہم معنی بھی ہیں (۱۵:۲۰) ارشاد ربانی ہے کہ "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی"، زمین پر ہر متنفس

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو رزق دینے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے (۱۱ : ۶) اس اعتبار سے رزاق صرف اللہ ہو سکتا ہے کیونکہ کوئی دوسری ہستی ہر ذی حیات مخلوق کو رزق نہیں دے سکتی۔ انسان ذی شعور صاحبِ ذات ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق کی منصفانہ تقسیم کا ذمہ دار ہے۔ اس لئے اس کا شمار رازقین میں ہوتا ہے۔

متقین کے لئے ایک شرط یہ بھی لازمی قرار دے دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے عطا کردہ رزق یعنی مادی اور روحانی دونوں قسم کے سامانِ نشو و نما کو عام ربوبیت کے لئے کھلا رکھیں۔ (۲ : ۳) قرآنی معاشرے میں رزق کے سرچشمے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں (۴۱ : ۱۰) افراد ان میں سے صرف محنت کا معاوضہ لے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

روح اور مادہ کی بحث کے دوران یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ اگر انسان ان دونوں کا مرکب ہے تو پھر اس کا کون سا جزو زیادہ اہم ہے۔ اگر جسم کو ضروری سمجھا جائے تو پھر مادہ پرستی کے نظریہ زندگی کو درست تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور قارونی ذہنیت کو اجازت ہو گی کہ وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر بیٹھ جائے، رزق کے سرچشموں پر بند باندھ دے یا ان کا رخ اپنی طرف موڑے اور اپنے ذخائر بڑھاتا چلا جائے۔ اور اگر روح کو زیادہ اہمیت دی جائے تو پھر ترک دنیا لازم آئے گی جس سے معاشرتی کاروبار سب چوپٹ ہو کر رہ جائیں گے، اور "انسانی ذات" جو معاملات کی بھٹی میں پگھل پگھل کر کندن بنتی ہے خاک میں مل جائے گی۔ انہی دنوں مشہور مغربی مفکر ایرک فرام (ERICH FROMME) کی ایک دلچسپ اور قابلِ مطالعہ کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہی (TO HAVE OR TO BE) اس کے موضوع کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نے سوال اٹھایا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد ملکیتیں جمع کر کے جائدادیں بنانا ہے یا خود کچھ بن جانا ہے۔ پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ انسان اس دنیا میں کچھ بنانے کے لئے نہیں کچھ بن جانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم ان دونوں انتہائی اقدامات کو غلط قرار دے کر یہ رہنمائی دیتا ہے کہ مقصدِ حیات ان دونوں کا درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ یعنی (TO HAVE AND TO BE)۔ متاع کی حد تک اللہ کے فضل سے فائدہ بھی اٹھاؤ۔ اور خود بھی وہ کچھ بن جاؤ جس کی امکانی صلاحیت تمہارے اندر رکھ دی گئی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ ایک "فرد" کی ذاتی ملکیت میں کتنی چیزیں ہونی چاہئیں۔ تو اول تو قرآنِ حکیم نے انسانی ملکیت کے تصور ہی کو یہ کہہ کر باطل قرار دے دیا ہے کہ اللہ کی ہے ہر چیز جو بھی آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ تاہم عارضی استعمال کی چیزوں کو بھی ملکیت سمجھ لیا جائے تو پھر ہمارے سامنے قرآنِ حکیم کا ایک ہی جامع لفظ "متاع" آتا ہے جو بنیادی زندگی کے تمام ساز و سامان پر محیط ہے، عرب کے لوگ اکثر حالتِ سفر میں رہتے تھے۔ بیشتر آبادی یا خانہ بدوش تھی یا تجارت پیشہ تھی۔ دونوں صورتوں میں سفر ہی ان مقدر تھا۔ صحراؤں میں نہ آجکل کی سی شاہراہیں ہوتی تھیں نہ راستوں کے نشانات، نہ کہیں بڑی بڑی آبادیاں، نہ سرائیں، نہ ہوٹل، نہ آرام گاہیں۔ اور راستوں کے خطرات سے محفوظ رہنے کی کوئی ضمانت تھی۔ سفر بھی اکثر پیدل یا اونٹ گھوڑے پر کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں مسافر کو صرف چند انتہائی ضروری چیزیں اپنے پاس رکھنی پڑتی تھیں، مثلاً ایک ڈول رسی، لاٹھی، چاقو، پانی کی چھاگل، ستوؤں کا تھیلا وغیرہ۔ یہ ساز و سامان ایسا تھا کہ اس کے بغیر سفر کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ پھر

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

مجبوری یہ تھی کہ وہ کوئی زائد یا فالتو چیز بھی اپنے پاس نہ رکھ سکتا تھا کیونکہ زائد ایک تنکا بھی اس کے لیے بار دوش بن سکتا تھا۔ گویا انتہائی ضروری استعمال کی چیزیں اس کے سفر کے لئے "کم از کم" (MINIMUM) بھی تھیں، اور زیادہ سے زیادہ (MAXIMUM) بھی تھیں یعنی یہ ایسی چیزیں تھیں کہ اگر ایک بھی کم ہو جائے تو سفر ناممکن اور اگر ایک بھی زائد ہو جائے تو سفر ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ ضروری استعمال کی چیزوں کے لیے عربی زبان میں "متاع" کا لفظ ہے قرآن حکیم نے "انسانی ذات کے دنیاوی سفر حیات کے دوران استعمال آنے والے تمام ساز و سامان کو متاع کہا ہے "تمہارے لئے ہے زمین پر کچھ وقت کے لئے رکنا (۲:۳۶) اور اس کا سامانِ زیست تمہارے لئے متاع ہے (۷:۱۰،۲۴) ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے انسانوں کے لئے خوشنما بنا دیا ہے چاہتوں کی محبت کو: عورتیں۔ بیٹے۔ سونے چاندی کے ڈھیر اعلیٰ نسل کے گھوڑے۔ کھیتیاں وغیرہ۔ لیکن یہ تو ہیں متاعِ حیاتِ دنیا! انجامِ سفرِ حیات کا حسن تو اللہ کے پاس ہے۔"

دیکھا آپ نے کہ اس ایک لفظ "متاع" کے اندر (TO [illegible]) اور (TO HAVE) یعنی کچھ بنانے رہنے اور کچھ بن جانے کے دونوں پہلو کس حسنِ جامعیت کے ساتھ سمٹ کر آ گئے ہیں۔ گویا سارا "اسلامی معاشی نظام" اسی ایک لفظ میں بند ہے!

اللہ خیر الرازقین ہے تو مومن "رازقِ خیرین جاؤ" رازق ہو گو نہ بنو! سامانِ زیست و نشو و نما ہر فردِ معاشرہ کو میسر ہو لیکن اس طرح کہ ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ قرآنی نظام میں میسر آنے والے رزق کو صرف رزق ہی نہیں بلکہ رزقِ کریم بنایا گیا ہے۔

اللہ خالق اور خلاق ہے۔ (۳۶:۸۱ - ۵۹:۱۵) خلق کے معنے ہیں کسی چیز کا اندازہ کر کے اس کے حشو و زوائد دور کر کے اور اسے توازن اور قالب دے کر صاف اور ہموار بنانا۔ بدیع اور فاطر عدم سے وجود میں لانے کو کہتے ہیں۔ انسان بدیع اور فاطر نہیں ہو سکتا۔ لیکن خالق بن سکتا ہے کیونکہ خلق موجود مسالے کو نئی نئی ترکیبوں سے مختلف چیزیں بنانا ہے۔ تاہم اللہ احسن الخالقین ہے (۲۳:۱۴)

جو فرد یا قوم اپنے اندر صفاتِ ربانی جذب و منعکس کرتی رہتی ہے اس کا ثبوت و اظہار اس کی قوتِ تخلیق میں دیکھا جا سکتا ہے، انسانی سطح کی زندگی شروع ہی تخلیق سے ہوتی ہے۔ انسان جب تک تخلیق نہیں کرتا حیوان ہی رہتا ہے، اولاد پیدا کرنا حیاتیاتی عمل ہے اور اس میں انسان اور حیوان برابر کے شریک ہیں تخلیق میں انسان سے نچلی سطح کی کوئی مخلوق شریک نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کے لئے تخلیق نہ کرنا انسانی ذات کے امکانات کا انکار ہے۔

اللہ حاکم اور حکیم ہے:- اللہ عزیز الحکیم ہے (۲:۲۲۰) حکیم العلیم ہے (۶:۸۳) علیم الحکیم ہے (۴:۲۴) تواب الحکیم ہے (۲۴:۱۰) علی الحکیم ہے (۴۲:۵۱) حکیم الخبیر ہے (۶:۱۸) حکیم الحمید ہے (۴۱:۴۲) واسع حکیم ہے۔ احکم الحاکمین ہے (۹۵:۸) اور خیر الحاکمین ہے (۷:۸۷)

ان اسمائے حسنیٰ میں اللہ تعالیٰ کی دو صفاتِ عالیہ "حکمت" اور "حاکمیت" کا بیان ہے۔ چونکہ ان دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ یعنی ح۔ک۔م اور ان کا تعلق انسان سے بھی خاص ہے اس لئے ان کے معانی کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے گھوڑے کے منہ میں لگام ہو کر اسے ایک ایسے چمڑے سے باندھ دیا جاتا ہے جو گھوڑے کے دونوں جبڑوں کو کس دیتا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور ادھر اُدھر نہیں ہونے دینا۔ اس جبڑے کے ٹکڑے کو حَکَمَۃ کہتے ہیں گویا روک دینا اور منع کرنا اس کے بنیادی معنے ہو گئے۔

روکنے اور منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اس کے اختیار کی آزادی کی آخری حد کون سی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ اختلافی امور میں اسی چیز کو فیصلہ کرنا کہتے ہیں۔ یعنی ہر ایک کے حقوق اور واجبات کی حدیں مقرر کر دینا اور کسی کو ان سے آگے نہ بڑھنے دینا۔ اسی کو حکم کہتے ہیں۔ اس طرح کا حکم دینے والا۔ فیصلے کرنے والا "حاکم" ہوا۔

یہیں سے حکمت کے معنے بھی اخذ کر لیجئے۔ عدل کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ہر ایک کے حقوق اور واجبات کی حدیں مقرر کر کے کسی کو بھی تجاوز نہ کرنے دینا "حکمت" ہے۔ لہٰذا حکیم وہ ہوا جو ہر چیز کو صحیح توازن اور تناسب کے ساتھ اور عدل کا ہر تقاضا ملحوظ رکھتے ہوئے معاملات کو طے کرے۔ حکومت کے معنے ہوئے اس طرح فیصلے دینے کی صلاحیت اور اس کے ساتھ ہی فیصلے کو عملی طور پر نافذ کرنے کی قوت۔ قرآن پاک "حکیم" ہے کیونکہ یہ ہر شے کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو بھی مقررہ حدود سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا اور تمام اختلافی امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے۔

حکومت اور حکمت کا مادہ مشترک ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ حکومت کو مبنی بر حکمت ہونا چاہیئے۔ اور حکمت کے نفاذ کے لئے حکومت ہو۔ چونکہ قرآن پاک حکیم ہے اس لئے صرف وہی حکومت مبنی بر حکمت ہو سکتی ہے جو اقدار قرآنی کے مطابق متشکل ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ملوکیت یا آمریت ہوگی، قرآن حکیم کا اس ضمن میں اصل الاصول یہی ہے کہ

۱۔ کسی بھی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ خواہ اسے ضابطۂ قوانین (کتاب)، قوتِ فیصلہ (حکمت) اور نبوت تک کیوں نہ عطا کر دی گئی ہو (۳:۷۸)۔ کیونکہ

۲۔ حکومت کا حق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے (۱۲:۴۰) اور

۳۔ اللہ کی یہ حکومت اللہ کی کتاب کے ذریعے قائم ہو گی (۶:۱۱۵)

تاہم قرآنی فیصلوں کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک زندہ اجتماعی ناگزیر ہے یہ زندہ اجتماعی "اسلامی نظام" یا مملکتِ الٰہیہ کہلاتی ہے اس حکومت کو سب سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی "اللہ اور رسول" کی اصطلاح آئی ہے اس سے یہی حکومتِ الٰہیہ مراد ہے۔ اس مرکزی نظام کی اطاعت خود اللہ کی اطاعت تھی۔ کیونکہ یہ مرکز اللہ کے احکام کی اطاعت کراتا تھا اپنے فیصلوں کی نہیں (۴:۱۰۵)۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد یہ نظام علیٰ حالہٖ آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہتے ہیں (۳:۱۴۳)۔ چونکہ "الدین" انفرادی چیز نہیں ہے اس لئے یہ اپنی اصلی شکل وصورت میں صرف مملکتِ الٰہیہ کے اندر ہی سامنے آ سکتا ہے۔

ایک لطیف نکتہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کتاب اور حکمت دونوں مُنزّل من اللہ ہیں۔ یعنی ضابطۂ قوانین اور ان قوانین کی حکمت دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قرآن حکیم کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ قوانین کی اطاعت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے جو مقاصد حاصل اور جو نتائج برآمد ہوں انہیں دیکھ کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ ہماری اطاعت کا عمل درست تھا یا نہیں، مثلاً قانون مقرر ہوا کہ تم روزے رکھو اور حکمت اس قانون کی یہ بتائی گئی ہے کہ اس سے تقویٰ شعار بن جاؤ گے (۲:۱۸۳) اب اگر ہم نے روزے رکھے ہیں۔ لیکن ہم تقویٰ شعار نہیں بنے تو ہمیں فوراً جان لینا چاہیئے کہ ہم نے صحیح معنوں میں روزے نہیں رکھے۔ چونکہ قانون اور حکمت دونوں فرمودۂ رحمٰن ہیں اس لئے یہ تو ہرگز ہرگز غلط نہیں ہو سکتے۔ حکم کی تعمیل کے نتیجے کو عین فرمودۂ قانون کے مطابق ہونا چاہیئے۔ لہٰذا ہمیں روزے رکھنے کے عمل کو درست کرنا ہوگا تاکہ اس سے وہی نتیجہ برآمد ہو جو حکمت میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح اگر آپ سے الصلوٰۃ کے عمل میں فواحش اور منکرات کا سدِ باب نہیں ہو رہا تو آپ کو اپنے عمل کا جائزہ لینا ہوگا کہ کہاں غلطی ہوئی ہے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کا بیان من جانب اللہ اسی خود احتسابی کے مقصد کے پیشِ نظر ہوا ہے ورنہ جب کوئی آمر حکم نافذ کرتا ہے تو وہ اس کی حکمت نہیں بتاتا کیونکہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ 'قانون' اور اس کی بلا چون و چرا تعمیل ہر ایک کا فریضہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عادل حکمران حکم نافذ کرتا ہے تو اس کی غرض و غایت کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کرا دیتا ہے تاکہ لوگ اس کی حکمت کو سمجھیں اور اس طرح قانون کی اطاعت کا جذبہ ان کے دلوں کی گہرائیوں سے ابھرے۔ قرآن حکیم کا یہ ارشاد بھی سن لیجئے:

جو لوگ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق فیصلے یا حکومت نہیں کرتے وہ کافر ہیں (۵:۴۴)

اَلْجَبَّارُ (۵۹:۲۳) جبر کے معنے ہیں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لئے کھپاچیوں سے باندھ دینا۔ لہٰذا اصلاح اور درستی کھپاچیوں سے باندھ دینے کا عمل ہیں جو کچھ تھوڑی سی سختی اور قوت کا استعمال ہے وہ شکستگی کو دور کرنے کے لئے ہے جبر کا متضاد کسر ہے جس کے معنے توڑنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اندر ہر شکستگی کے درست کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ اللہ ہی ہے انسانیت کی ریڑھ کی ہڈیوں کو پیوستگی دینے والا، کشتی شکستگان کو منزلِ مراد تک پہنچانے والا، شکست و ریخت کو اصلاح و تعمیر جدید سے درست و متوازن رکھنے والا۔ اس نے اپنے محکم اور یقینی قوانین کے ذریعے کائنات کے نظام کو درستی قائم کر رکھا ہے۔ اللہ کی جباریت (جبروت) دراصل اس کی رحمانیت اور رحیمیت ہی کا ایک پہلو ہے۔ کیونکہ مقصد انسان کو قانون کی حدود کے اندر چلانا ہے اور اس طرح کی اطاعت خود انسان کے اپنے فائدے کے لئے ہے۔ اگر اللہ کا جبروت فعال نہ ہو تو کائناتی قوتیں سرکش ہو جائیں اور ساری کائنات آناً فاناً درہم برہم ہو جائے۔ انسان ذی اختیار ہونے کے باعث سب سے زیادہ سرکشی کر سکتا ہے لیکن اللہ کی جباریت اس کی سرکشی کو روکے ہوئے ہے!

انسان سرکشی اختیار کرے اور ظلم و استبداد پر اتر آئے تو اسے بھی جبار یا جابر کہیں گے۔ کمزور انسانوں پر استبداد روا رکھنے والے ظالم انسانوں کی گرفت بھی جباریت ہے اور اس ظالمانہ گرفت سے انسانیت کو نجات دلانے والی گرفت جو اللہ کے نظام کے اندر رکھ دی گئی ہے وہ بھی جباریت ہے۔ یہ جباریت مضبوط نہ ہوتی تو فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت کمزور انسانوں کو کبھی کا چبا چکی ہوتی۔ جباریت دونوں میں ہے لیکن اللہ کی جباریت اصلاح اور درستی کے لئے ہے جبکہ مستبد آمر اور ظالم و جابر انسانوں کی جباریت ان کی ذاتی اغراض، خواہشات اور استحصالی مقاصد کے لئے ہے۔ وہ 'جبروت' جو قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے فولادی بصیرت پیدا کرے گا وہ انسانیت کے سراپا خیر ہوگا۔ وہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جباریت جو فرعونیت اور اس کے مذموم حلقے سے پیدا ہوگی انسانیت کے درحق مستقل عذاب ہوگی۔ قوّت کوئی بھی ہو بجائے خویش نہ خیر ہوتی ہے نہ شر ہوتی ہے اسے خیر اور شر اس کا صحیح یا غلط استعمال بنا دیتا ہے۔ جباریت کو شکستگی کی اصلاح کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ سراسر خیر ہے لیے سرکشی، استبداد اور ذاتی اغراض کی خاطر استعمال کیا جائے تو اس سے زیادہ اور کوئی شر نہیں ہے۔

اَلْقَہَّارُ (۲۹ : ۱۲) اَلْقَاہِرُ (۹:۱۸)

اردو اور علاقائی زبانوں میں "قہر" کے معنے بہت بڑے ظلم، بیدردی اور غیظ و غضب کے لئے جاتے ہیں اور پھر انہی معنوں کو ذہن میں رکھ کر ہم اللہ تعالیٰ کی "قہاریت" کا مفہوم متعین کر لیتے ہیں اور کانپ اٹھتے ہیں کہ زمین پر چنگیزیت کیا کم تھی کہ اب آسمانوں میں بھی آمرانہ لاقانونیت سے واسطہ پڑے گا۔ یہ غلط تصورات ملوکیت کے پیدا کردہ ہیں جس میں ناحق جور و ستم اور ظلم و استبداد کو "تقدیر کا لکھا" مان کر سہتے چلے جانے کا درس دیا جاتا ہے۔ اللہ ہر اعتبار سے خیر ہے اور اس کی ہر صفت بھی خیر ہے جس طرح سرکش انسان جباریت کے غلط استعمال سے "خیر" کی بجائے "شر" بن جاتے ہیں اسی طرح قہاریت کا غلط استعمال بھی باعثِ فسادِ آدمیت بن جاتا ہے۔

اَلْقَاہِرَۃُ ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں۔ جیسے مصر کا مشہور شہر قاہرہ ہے۔ اسی اعتبار سے سینے کے اوپر ہنسلی کی ہڈی بھی قاہرہ کہلاتی ہے یہیں سے اس لفظ کے معنے بلندی کے ہو گئے۔ چنانچہ اَلْقَھْرُ کسی کو مغلوب کر لینے کے لئے اوپر سے پکڑنا ہے پس اس لفظ کے معنے ہیں تسلط، غلبہ، اقتدار، مضبوط گرفت وغیرہ۔ اللہ وہ بلند و بالا ہستی ہے جس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے جس کی سلطانی سے باہر ایک ذرہ تک بھی نہیں ہے، جس کا پختہ قانون سب پر غالب ہے اور جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ تاہم یہ اقتدار، غلبہ اور تسلط ہر درجے کی مخلوق کے لئے خیر اور خوبی کا محافظ ہے اس نکتے کو اس مثال سے سمجھئے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس زمین پر بسنے والی ہر ذی حیات مخلوق کی زندگی کا انحصار آکسیجن پر ہے ہم سانس لیتے ہیں تو آکسیجن ہمارے پھیپھڑوں میں پہنچ کر خون کے فاسد مادّوں کو جلا ڈالتی ہے اور ہمارا خون ازسرِ نو تازہ اور صاف ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا ہمیں نئی زندگی مل جاتی ہے۔ سانس رک جائے تو چند لمحوں میں موت واقع ہو جائے گی۔ جب ہم سانس باہر نکالتے ہیں تو کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں جو سخت زہریلی گیس ہے۔ تنفس کا یہ عمل انسانوں اور جانوروں میں لاکھوں کروڑوں سالوں سے جاری ہے یعنی زندہ مخلوق آکسیجن خرچ کر رہی ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ جیسی سخت زہریلی گیس پیدا کر رہی ہے، اس خطرناک گیس کی پیداوار میں زندہ چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں اضافہ کر رہی ہیں۔ کارخانوں میں جلنے والے ایندھن، موٹروں کے دھوئیں، بمباریاں، وسیع پیمانے پر جلنے جلانے کا عمل، آتشیں اسلحے کا استعمال۔ یہ سب لاکھوں، کروڑوں ٹن کی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ گیس پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن آکسیجن جیسی حیات بخش گیس کا خزانہ پھر بھی نہ ختم ہوا ہے نہ کم ہوا ہے۔ ان تمام مخالف کارروائیوں کے باوجود آکسیجن ہر جاندار کی ضرورت کے مطابق فضا میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ آخر کیسے؟ اس کا ذخیرہ تو کب کا ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ ختم نہیں ہوا۔ کیوں نہیں ہوا، ذرا غور سے سنئے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اس کائنات کے اندر یا باہر کوئی ہے جو اللہ کے قانون

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو مغلوب کر سکے۔ اس کے منصوبوں کو ناکام کر سکے یا اس کے اختیار اور ارادے کی راہ میں رکاوٹ بن سکے" زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے اللہ نے قانون یہ بنا دیا کہ فضا میں جتنی بھی کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوگی وہ سب کی سب نباتات کے لئے غذا کا کام دے گی، اور گھاس کی پتی سے لے کر بڑے بڑے تناور درختوں سے آکسیجن تیار کرنے والے کارخانوں کا کام لیا جائے گا۔ یعنی ہماری خارج کردہ چیز نباتات کی غذا اور نباتات کی خارج کردہ چیز ہماری غذا۔ اب آپ اس قانون کے توڑنے کی لاکھ کوشش کریں، یہ اتنا مضبوط ہے کہ آپ تو کیا دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں توڑ سکتی۔ اگر یہ قانون نہ ہو تو دنیا بھر کے کارخانے جو اس وقت چل رہے ہیں یہ سب اور ان کی دگنی تعداد اور بھی، اگر صرف آکسیجن پیدا کرنے پر لگ جائیں تو بھی یہ صرف اتنی مقدار میں آکسیجن پیدا کر سکیں گے جو جانداروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کا سوواں حصہ بھی پورا نہ کر سکے گی۔ یہ قوت، یہ غلبہ، یہ اقتدار، یہ سلطانی اللہ ہی کے شایانِ شان ہے کہ وہ اپنے ہر منصوبے کو تمام ممکنہ مخالفتوں کے باوجود کامیاب کر کے رہتا ہے۔ کوئی طاقت اللہ کی اس "بالا دستی" میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ہے اللہ کی قہاریت کا صحیح مفہوم!

اگر کوئی انسان جو ہدایتِ ربانی کے نور سے مستفیض نہیں ہے، قہاریت کو اپنائے تو اسے فرعونیت کہا جائے گا جو خاص استبداد کی علامت ہے اور جسے قرآن حکیم نے سختی سے منع کیا ہے۔ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹۳ : ۹) جو کوئی بے سہارا اور تن تنہا رہ جائے تم اسے کمزور جان کر اس پر سختی نہ کرو، قہر نہ توڑو۔ اگر تمہیں اللہ کی صفتِ قہاریت کو اپنانا ہے تو پہلے اپنے ارد گرد کے حالات کا جائزہ لو اور دیکھو کہ ظلم کی کتنی قوتیں ہیں جو انسانیت کو کچل رہی ہیں۔ تم ان تمام مستبد قوتوں کے خلاف اس قوتِ ربانی کو استعمال کرو۔ یا پھر اپنے فرائض کو پہچانو۔ تمہیں اشیائے فطرت کو مسخر کر کے بنی نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا ہے۔ لہٰذا اپنی اجتماعی قوتِ قہاریت کو اس پروگرام کے کامیاب بنانے میں صرف کرو۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم میں انفرادی جباریت اور انفرادی قہاریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے ان دونوں پر حق ملتِ اسلامیہ ہے۔

اَلْغَفَّارُ (۲۰ : ۸۲) **اَلْغَفُوْرُ** (۲ : ۲۱۸) غَفْر کے معنے ہیں چھپانا، پردہ ڈالنا۔ اور اس طرح کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ مِغْفَر، زرہ کی طرح لوہے کے حلقوں سے بنی ہوئی جالی کو کہتے ہیں، جو خود کے نیچے پہنی جاتی ہے۔ اور جو گردن اور کندھوں کو چھپا لیتی ہے تاکہ اس پر تلوار وغیرہ کا اثر نہ ہو۔ اور پہننے والا حملہ آور کے وار سے محفوظ رہے، غِفَارَۃٌ" پٹی سی ہوتی ہے جسے عورتیں اس لئے سر پر باندھ لیتی ہیں کہ ان کی اوڑھنی تیل وغیرہ کی چکنائی سے محفوظ رہ جائے۔ یہیں سے مغفرت کے معنے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ یعنی حفاظت (PROTECTION) جس طرح جسمانی بیماریوں سے بچاؤ کے لئے حفاظتی اقدامات (PROTECTIVE MEASURES) اور بیماری کے لاحق ہو جانے کے بعد علاج یا اصلاحی تدابیر (CURATIVE MEASURES) اختیار کی جاتی ہیں اسی طرح انسانی ذات یا جوہرِ انسانیت کی صحت مندی کے لئے بھی ضروری ہے کہ پہلے حفاظتی اقدامات کئے جائیں اور روح کو اتنا صحت مند توانا اور مضبوط رکھا جائے کہ اس پر کسی قسم کے "امراض" حملہ نہ کر سکیں۔ جو شخص کمزور ہو جاتا ہے اس میں قوتِ مدافعت باقی نہیں رہتی۔ مختلف بیماریاں جو ہر وقت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

گھات میں رہتی ہیں فوراً حملہ کر دیتی ہیں۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ توانائی اور قوتِ مدافعت کو مضبوط رکھا جائے "اپنے اندر اس قسم کی طاقت کا پیدا کر لینا استغفار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کا کما حقہٗ اطاعت کرنے سے اپنی "ذات" کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر لی جائے جس سے تخریبی قوتوں کا کوئی حملہ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

مومنین ہر وقت اللہ سے استغفار چاہتے ہیں۔ "انسانی ذات" کی صلاحیتیں ناقص اور ناپختہ ہیں۔ ان سے لغزش کا ہر لمحے احتمال رہتا ہے، وہ لوگ جو صدقِ دل سے چاہتے ہیں کہ اپنی انسانی ذات کو مضبوط اور توانا بنائیں وہ اپنے جذباتِ سفلی پر قابو پانے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے استعانت اور استمداد کے طالب رہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک توفیقِ ربانی حاصل نہ ہو شیطانی وساوس سے بچ کر رہنا محال ہے، جب کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے تو مومنین کے دل میں فوراً احساسِ ندامت پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پھر اللہ کی طرف راجع ہو جاتے ہیں اللہ اس رجوعِ صادق سے ان کی لغزشوں کو معاف کر دیتا ہے، اور مومنین ایک مرتبہ پھر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے قدم حق و صداقت پر جمائے رکھیو اور ہمیں ایسی استقامت عطا ہو کہ ہم پھر لغزش نہ کھائیں۔ یہ حفاظت طلبی اللہ کی طرف رجوع کرتے رہنے کا اہم ترین حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زبانوں میں "توبہ استغفار" ہم معنی مرکب بن گیا ہے۔

اجتماعی لحاظ سے ملت اور اس کے استحکام کے لئے سامانِ حفاظت بہم پہنچاتے رہنا بھی استغفار ہے اور انفرادی طور پر اپنے قول و عمل کے ذریعے کسی فساد انگیز بات کی اصلاح کی تمنا رکھنا اور حفاظت چاہنا بھی استغفار ہے لہٰذا مغفرت کے معنے ہوئے بندے کی لغزشوں سے صرفِ نظر کرکے اس سزا سے کسی کو بچا لینا جس کا وہ مستوجب ہو چکا ہو اگر قوم غلط روش پر چلتے چلتے اپنی غلطی کا احساس کرے اور اپنی اصلاح کی فکر کرے اللہ کی اطاعت کی طرف دوبارہ رجوع کرے (یعنی توبہ) تو اس کے اندر بھی از سرِ نو توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ اپنی غلط روش کے مضر اثرات سے محفوظ اور مامون ہو جاتی ہے۔ یہ قوموں کی مغفرت ہے۔

اللہ کے سوا کوئی غفار اور غفور نہیں ہو سکتا۔ وہی اور صرف وہی ہے حفاظت اور پناہ دینے والا۔ وہی ہے محفوظ رکھنے والا اور بچا لینے والا۔ اسی کے قوانین کی متابعت تخریبی قوتوں کے لگائے ہوئے "زخموں" کا اندمال بھی کر دیتی ہے اور بچاتے بھی رکھتی ہے۔ تاہم حفاظت کرنے اور پناہ دینے کے معنوں میں انسان غافر ہو سکتا ہے، غفور اور غفار نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تفضیل کل کے صیغے ہیں۔ مظلوم، کمزور اور ناتواں کی حفاظت نیز قرآنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت بھی مستقل غفر ہے۔

التواب (۲:۱۵۳) اسلام سے پہلے کے تمام ادیان و مذاہب میں گمراہ ہو جانے والے لوگوں کے لئے سخت اذیتناک سزائیں مقرر تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گناہوں اور معمولی سی لغزشوں پر بھی وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں کیونکہ ان کے پاس اصلاح اور واپسی کا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ کہیں لوگوں کو زندہ آگ میں ڈال دیا جاتا تھا تاکہ اگنی دیوی (آگ) ان کی آتما (روح) کو پوتر (پاک صاف) کر دے اور کہیں شیر کے آگے ڈال دیا جاتا تھا کہیں زہر کا پیالہ پینے کو دیا جاتا تھا کہیں مینار

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یا کسی پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جاتا تھا۔ روس میں تو اب بھی مخالف نظریات رکھنے والوں کو سائبیریا کے برفانی جنگلوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عیسائیت نے کفارے کا فلسفہ وضع کیا جس میں مرنے سے کچھ دیر پہلے پادری کے سامنے اعتراف گناہ کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے ایسے وقت میں نیک عمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ جو کوئی اپنے "گناہ" پر اڑا رہے اُسے "مذہب" کے امام پیسا کے مینار سے گرا کر پاش پاش کر دیتے تھے۔ یا سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پلا دیتے تھے۔ پچھتاوا اچھی چیز ہے کیونکہ یہ احساسِ ندامت ہے لیکن اس کا اظہار صرف زبان سے ہونا کافی نہیں ہے۔ احساس سے ندامت دل کے اندر پیدا ہو تو ذاتِ انسانی کو قوت ملتی ہے۔ اس کے بعد ندامت کا اظہار اعمال سے ہونا چاہیے کیونکہ عمل ہی سیرت و کردار کی کسوٹی ہے۔

اسلام کی عطا کردہ بیشمار نعمتوں میں سے عظیم ترین نعمت "توبہ استغفار" کی نعمت ہے۔ استغفار گناہوں سے تحفظ چاہنا ہے، اور اس لحاظ سے حفاظتی اقدام ہے۔ توبہ اصلاحی تدبیر ہے جو اور کسی بھی مذہب نے پیش نہیں کی موجودہ دور کے لادینی مکاتبِ فکر اور طریق ہائے زندگی بھی توبہ کے پاکیزہ مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ بلکہ اس وقت دنیا کے مختلف علاقوں پر جتنے بھی "ازم" مسلط ہیں یہ اپنے دائرہ معاشرت سے باہر نکل جانے والوں یا اپنے مخصوص اندازِ فکر رکھنے والوں کے مخالفین کو برداشت تک نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان پر واپس آنے کے دروازے بھی بند کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے انسان ضعیف البنیان ہے خطا اور نسیان کا پتلا ہے۔ سہو و آزمائش کا دلدادہ ہے۔ اس کی انسانی ذات کے پاس صرف امکانی صلاحیتیں ہیں۔ جذبات کی طاقت و کشش کے باعث اس کے کمزور ارادے کا سیدھے راستے سے ہٹ جانا بعید از امکان نہیں ہے۔ تاہم اس کے شرف و مجد اور اعلیٰ ظرفوں کا ثبوت ہی یہ ہے کہ یہ اپنی خطاؤں کا اعتراف کرکے اور اپنی لغزشوں پر نادم ہو کر راہِ راست پر واپس آ بھی سکتا ہے، وہ معاشرتی نظام اور مکاتبِ فکر جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو واپسی کے حق سے محروم کر دیتے ہیں کبھی احترامِ آدمیت اور آزادیٔ فکر و عمل کے دعویدار نہیں بن سکتے۔ یہ صرف اسلام ہے جو ہر ایک راہ گم کردہ کو علانیہ دعوت دیتا ہے کہ باز آ، باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ۔

توبہ کے لفظ کا مادہ "ت۔ و۔ ب" لوٹ آنے، پلٹ آنے، واپس مڑنے، رجوع کرنے کے معنوں میں آتا ہے گویا توبہ ایک عملی اقدام ہے، نظریاتی یا زبانی کلامی بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ ارادی عمل ہے کسی مجبوری یا مصلحت یا اضطرار وغیرہ کا پیدا کردہ عمل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں احساس اور جذبے کی صداقت کا دخل ہے نہ کہ جبر و اکراہ ... جو تبدیلی قلب کرتا ہے وہ اٹل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جب تک نفس کے اندر تبدیلی واقع نہ ہوگی قلب و نظر ... نہ بدلے گا یا بقول اقبال۔ دل و نگاہ مسلمان نہ ہوں گے۔ کوئی تعمیری تبدیلی اور دیرپا نتائج برآمد نہیں ہو سکتے

صراطِ مستقیم سیدھے، انتہائی متوازن اور قائم راستے کو کہتے ہیں۔ علم ریاضی کی رُو سے سیدھا خط دو نقطوں کو ملانے والا صرف ایک ہو سکتا ہے۔ یہ خط سب سے چھوٹا بھی ہوگا۔ اس ایک خط کے علاوہ دو نقطوں کو ملانے والے اور جتنے بھی خط ہوں گے وہ منحنی، شکستہ یا خمدار ہوں گے اور تعداد میں بے شمار ہوں گے۔ سیدھا خط ایک ہی سمت کو جاتا ہے اور اپنا رُخ کبھی نہیں بدلتا۔ اس تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ذیل کی شکل سے توبہ کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

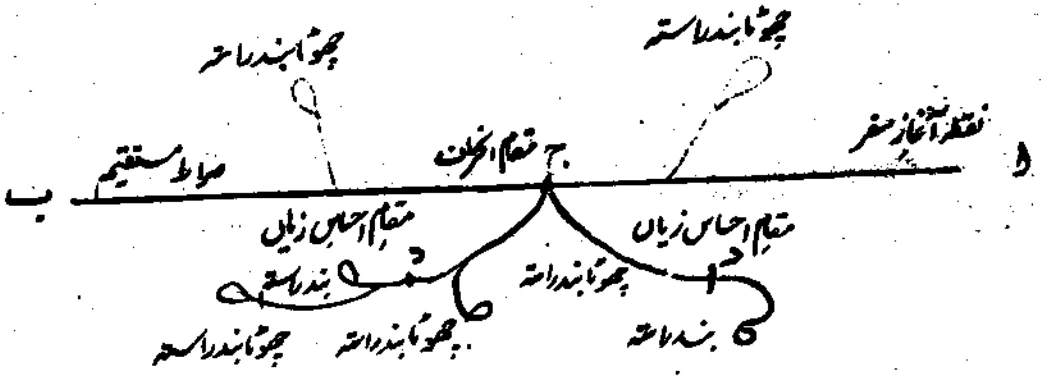

خط اب کو صراطِ مستقیم فرض کر لیجیے۔ ا ہمارا سفرِ زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ آپ اسے مقامِ روانگی سمجھ لیں نقطہ ب ہماری منزل ہے جہاں سفرِ زندگی طے کرکے ہمیں پہنچنا ہے۔ ہم مقام ا سے روانہ ہو پڑتے ہیں صراطِ مستقیم پر جا رہے ہیں۔ بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے۔ لیکن کہیں کہیں اور راستے بھی اس شاہراہ سے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ راستے بڑے خوبصورت اور دلکش ہیں۔ اکثر پر تو گمان ہوتا ہے کہ اصل راستے یہی ہیں صراطِ مستقیم پہ چلتے جا رہے ہیں۔ منزل بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ کیونکہ شاہراہ بالکل سیدھی ہے لیکن جب ہم نقطہ ج پر پہنچتے ہیں تو یہاں سے ہمیں کئی راستے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو بڑی شاہراہ سے کہیں زیادہ نظر فریب اور پُرکشش ہیں ہم جذبات اور خواہشات کے اس پُرکشش راستے پر چل پڑتے ہیں اور اصل شاہراہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ نقطہ ج گویا ہمارا مقامِ انحراف ہے۔ اب ہم کسی اور راستے پر چل نکلے ہیں جہاں تن آسانیاں تو بہت زیادہ ہیں لیکن منزل کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ یہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ مقام د پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں اور کسی غلط راستے پر چل نکلے ہیں۔ مقام ب کا تو نشان ہی گم ہو چکا ہے۔ بلکہ جوں جوں ہم اس نئے راستے پر آگے بڑھتے جا رہے ہیں ہم اپنی اس منزل سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ خواہشات اور جذبات کا راہبر ہمیں کئی کئی راستے دکھاتا ہے راستے بھی ایسے جو ایک سے ایک پُرکشش ایک سے ایک حسین اور مفاداتِ عاجلہ کے پُربہار چمن زاروں میں سے گزرتے ہوئے۔ اگر ہم عارضی لذتوں کی ان دلفریب بہشتوں میں کھو نہیں گئے اور دائمی مسرتوں کی صحیح منزل کا تصور ہمارے ذہنوں میں ابھی باقی ہے تو ہم پکار اٹھیں گے کہ یہ عارضی جنتیں ہماری اس منزل سے بالکل مختلف ہیں جن کی طرف ہم اپنے آغازِ سفر کے وقت روانہ ہوئے تھے۔ یہ راستہ جس پر ہم چلتے جا رہے ہیں قدم بہ قدم اپنی منزل سے دور لے جا رہا ہے۔ بلکہ یہ تمام چھوٹے چھوٹے راستے جو ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں اندھی گلیوں (BLIND ALLEYS) کی طرح آگے جا کر بند ہو جاتے ہیں۔ مسافر نہ آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ واپس پلٹ سکتا ہے اب اگر اس احساسِ غلط روی کے باوجود ہم اسی غلط راستے پر چلتے جائیں اور زبان سے ہائے افسوس ہائے افسوس یا اللہ میری توبہ بکتے رہیں تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ نہ توبہ استغفار کی تسبیحیں ہمارے کچھ کام آئیں گی۔ نہ کانوں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتے رہنا سود مند ہو گا اور نہ لمبی لمبی دعاؤں سے کچھ بنے گا۔ اگر کچھ بنے گا تو صرف اس طرح کہ احساسِ زیاں پیدا ہوتے ہی ہم فوراً رک جائیں اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں، کیونکہ یہی توبہ کا پہلا عمل ہے رک جانے کے فوراً بعد ہمیں اُلٹے پاؤں واپس مقام جر پر آنا ہو گا جہاں سے ہم بھٹک کر غلط راستے پر چل نکلے تھے۔ یہ توبہ کا دوسرا عمل ہے۔ واپس مقام جر پر پہنچ کر اپنی سمت کو درست کرنا ضروری ہے، یہ توبہ کا تیسرا عمل ہے۔ سمت درست کر لیتے ہی صحیح راستے پر چل پڑنا اور منزلِ مقصود کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دینا چوتھا اور آخری عمل ہے جو کبھی ناکام نہ ہونے دے گا۔

جونہی ہم سیدھے راستے پہ آ گئے اور ہم نے سمت درست کر کے منزل کی طرف چلنا شروع کر دیا منزل کے فاصلے بھی کم سے کم تر ہونا شروع ہو گئے۔ اللہ کی رحمتیں لوٹ آئیں۔ ربِ جلیل کی تائید اور نصرت نے بھی ہر گام پہ آپ کا ساتھ دیا اور توّاب الرحیم کا فضل و کرم ایک بار پھر آپ کا حامی اور ناصر بن گیا ——— وہ ہمارا رجوع تھا (رجوع الی اللہ) حمایت و نصرت اللہ کا رجوع ہے (رجوع الی العبد) وہ بندے کا تائب ہونا ہے۔ یہ اللہ کی توّابیت ہے!

اس کے علاوہ ایک اور توّابیت بھی ہے اور وہ ہے مقامِ انسانیت کی توّابیت۔ جب کوئی کم خوش نصیب کمزور اور ناتواں انسان زمانے کی تیز رفتاری کے ساتھ نہ دیکھنے کے باعث یا اپنی کسی غلطی کی وجہ سے پھسل جائے۔ گر پڑے، یا تھکاوٹ کے مارے نڈھال اور خستہ حال ہو جائے تو اسے تھام لینا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دینا۔ اس کو سہارا دے دینا ہر انسان کا فرض ہے۔ جو کسی گرے ہوئے کو دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے، وہ مقامِ انسانیت کی توہین کرتا ہے۔

اَلْمُسْتَقِیْمُ (۴ ۴ ۲) توبہ کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ قول و عمل کی سچائی کے ساتھ سیدھے راستے پر واپس آ جانا ہی بے راہ روی کے نقصانات کی تلافی ہے۔ جو شخص واپس نہیں آتا وہ اپنی "انسانی ذات" کے قیمتی جوہر کو کھو دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے چھوٹے چھوٹے راہوں پر چل نکلتا ہے جو تھوڑی دور جا کر بند ہو جاتے ہیں اور بھول بھلیاں بنا لیتے ہیں۔ ان بھول بھلیوں میں پھنسا ہوا انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتا ہے اور خوف و حزن سے نجات کی راہ نہیں پا سکتا۔ گویا بے راہ روی غلط عمل تھا۔ گم ہو جانا اس غلط عمل کی سزا ہے۔ غور فرمائیے۔ کیا یہ اسی طرح کی چیز نہیں جو ہم نے آگ میں انگلی ڈالنے اور اس کے جل جانے کی مثال پیش کی تھی؟ یا جس طرح سنکھیا کھا لینے سے موت واقع ہو جاتی ہے؟ یا کسی بلندی سے گر جانے کے باعث ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی ہے؟ یقیناً یہ وہی چیز ہے۔ یعنی عمل اور نتیجے کا باہمی تعلق۔ نتیجے کے خود عمل کے اندر ہونے کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ "اعمال خود ہی اپنی جزا آپ ہوتے ہیں (۷: ۱۴۷)، یعنی ہر عمل کا نتیجہ اپنے عمل کی جگہ پر خود بخود آ جاتا ہے اور اس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ کہیں خارج سے نہیں آتا۔

عملی اعتبار سے عمل اور نتیجے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ فرض کیا "الف" نے "ب" کو گالی دی "ب" نے جواباً "الف" کو تھپڑ مار دیا۔ گویا گالی دینے والے کو یہ سزا خارج سے ملی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو گالی دینے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے گالی دینے والے کی "ذات" پر جو اثر پڑا ہے وہ بھی تو سزا ہے، خارجی سزا کے بارے میں ارشادِ ربّانی یہ ہے کہ سزا جرم کے عین مطابق ہونی چاہیئے۔ نہ کم نہ زیادہ، تا ہم مجرم محسوس کرے کہ اُسے ٹھیک سزا ملی ہے۔ اتنی ہی ملنی چاہیئے کیونکہ کم سزا انسدادِ جرم میں ناکام رہتی ہے، اور زیادہ سزا غم و غصہ کی آگ کو بھڑکا دیتی ہے۔

اَلنَّقَم۔ راستے کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں۔ وسطِ طریق۔ لیکن اس کے مادّے کے معنے ہیں کسی چیز کو ناپسندیدہ قرار دینا اور اسے معیوب بتانا۔ اِنتِقام" کے معنے ہوں گے، بُری بات کو بُرا کہنا اور برائی کرنے والے کو برائی کا بدلہ دینا۔ اَلنِّقمَۃ" جرم کی سزا دینا ہے۔ یہی مکافاتِ عمل ہے، اللہ تعالیٰ انہی معنوں میں ذُوانتقام ہے یعنی وہ ذی قوت و اقتدار ہستی جس کے پختہ اور اٹل قوانین کے مطابق اعمال اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں اور جرائم کرنے والوں کو سزا ملتی ہے۔ ہماری زبانوں میں انتقام کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس میں اندھے جوش و خروش اور آگ سے بھڑک اٹھنے کی سی کیفیت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور عدل (یعنی راستے کا درمیانی حصہ) اوجھل ہو جاتا ہے۔

"اَسمَآءُ الحُسنیٰ" کے نام سے قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب بازار میں دستیاب ہے، خاصی محققانہ کتاب ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ اسماءُ الحُسنیٰ کی تعداد ۱۵۰ ہے، ترمذی شریف میں ۹۹ اسماءُ الحُسنیٰ آئے ہیں، مرکب اسماء ان کے علاوہ ہیں۔ ہم نے صرف دس اسمائے ربّانی کے تفصیلی معانی پیش کئے ہیں۔ اسی انداز پر باقی اسماء کے معنے بھی متعین کئے جا سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کون سی صفت اس ذاتِ عالی کے لئے مخصوص ہے جس میں ہم انسان شریک نہیں ہو سکتے۔ (مثلاً هُوَ الاَوَّل، هُوَ الآخِر، هُوَ الظَّاهِر، هُوَ البَاطِن وغیرہ) اور کون سی صفت ہم انسان بھی اپنی بشریت کی حد کے اندر رہتے ہوئے اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اسمائے ربّانی سلبی اور ایجابی دونوں صفات کے حامل ہیں۔ ان پر غور و فکر کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ متوازن شخصیت کی تشکیل و تکمیل میں ہم ان سلبی اور ایجابی صفات کو اپنے تعلیمی پروگرام میں کس طرح داخل کر سکتے ہیں کیونکہ اسماءُ الحُسنیٰ ہی پوری انسانیت کے لئے اخلاقیات (MORALITY) کی محکم بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اگر کوئی معیارات ہیں تو وہ باطل ہیں۔ خواہ ان کے مقرر و مرتب کرنے والے کتنے ہی بلند پایہ انسان کیوں نہ ہوں۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۷۔ "انسانی ذات" کے عناصر ترکیبی

• انسانی ذات "جن قوتوں سے کام لے کر اپنے آپ کو فعال رکھتی ہے قرآن حکیم نے انہیں سمع، بصر اور فوأد کی جامع اصطلاحات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ سمع کان کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان آوازوں کو محسوس کرتا ہے تاہم اس لفظ کا اطلاق فہم اور تدبر پر بھی ہوتا ہے۔ بصر قوتِ بینائی ہے۔ نیز اس کے معنے اس روشنی کے بھی ہیں جس کے ذریعے آنکھ نظر آنے والی چیز کا ادراک کر لیتی ہے۔ اس کے ایک معنی کسی چیز کا دل میں اتر جانا بھی ہے۔ بَصِیْرَۃٌ قوتِ ادراک، فطانت و ذہانت ہے۔ حجت و دلیل، یقین و ارادہ، عبرت و موعظت اور گواہ کے معنوں میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کے الفاظ قرآن حکیم میں ایک ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ فُؤَادٌ فَأَدَ سے ہے جس کے معنے ہیں روٹی کو بھوبل میں بھوننا۔ گویا یہ تپش و خلش، سوز و گداز، درد و داغ ہے۔ قَلْبٌ کے بنیادی معنے ہیں الٹنا پلٹنا، کسی چیز کو ادلتے بدلتے رہنا، اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کر دینا۔ چونکہ انسان کا دل لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے کسی ایک حالت میں نہیں رہتا اس لئے اسے بھی قَلْبٌ کہتے ہیں۔ ابن ہشام نے اس کے چار معنے لکھے ہیں۔ (۱) دل (۲) عقل (۳) ہر شئے کا خلاصہ اور (۴) ہر چیز کا بہترین حصہ۔ چنانچہ خالص چیز بھی قلب کہلاتی ہے۔ اگر ہم قلب اور فؤاد میں خطِ امتیاز کھینچنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ قلب فہم و بصیرت اور عقل و فکر کا سرچشمہ ہے۔ جبکہ فؤاد احساسات اور جذباتِ سوز و گداز کا منبع ہے۔ تاہم قرآن حکیم نے قلب کا لفظ جہاں عقل وغیرہ کے لئے استعمال کیا ہے۔ (مثلاً ۱۷۹:۷، ۵۰:۲۸ وغیرہ میں) وہاں اس لفظ کو جذبات کے لئے بھی استعمال کیا ہے (مثلاً ۱۰-۹:۲۸ میں)۔

قرآن حکیم نے علم حاصل کرنے کے سلسلے میں سمع بصر اور فواد (قلب) کا ذکر کیا ہے۔ سمع اور بصر کے ذریعے حاصل کردہ علم کو علم بالحواس (SENSORY KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے۔ حواسِ خمسہ معلومات (SENSE DATA) فراہم کر کے قلب کے پیش کر دیتے ہیں۔ قلب ان سے تصورات متعین کرتا ہے اور اس طرح علم بالحواس تصورات میں ڈھل کر تجریدی علم (ABSTRACT OR CONCEPTUAL KNOWLEDGE) بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے علم محسوسات اور علم تصورات دونوں کے حصول پر زور دیا ہے، بلکہ ان لوگوں کو جہنمی قرار دیا ہے جو سمع، بصر اور قلب سے کام نہیں لیتے (۱۷۹:۷)۔ تاہم اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب انسان پر جذبات غالب آ جاتے ہیں تو پھر اس کے ذرائع علم اسے نہ صحیح خبر دیتے ہیں اور نہ صحیح نتیجے پر پہنچنے دیتے ہیں۔ (۱۷-۱۴:۸۳) عام مشاہدے کی بات ہے کہ غصے کی حالت میں انسان نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ کچھ سنتا ہے، بالکل اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے، جو "رنگ" جذبات کا ہوتا ہے وہی رنگ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

سمع اور بصر اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنی خبر کو بھی رنگین بنا ڈالتے ہیں۔ پھر اس رنگینی کی کشش اور دلفریبی میں آکر انسان ایسے شرمناک افعال کر گزرتا ہے جو بعض اوقات حیوانوں سے بھی سرزد نہیں ہوتے۔ اسی طرح جذبات اگر ضدیت یا عصبیت کا رنگ اختیار کریں تو پھر انسان دوسرے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ ضدیت، غرور، انا پرستی وغیرہ ایسے "امراض" ہیں جو عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ جذبات کی مغلوبیت کو نشے کی مغلوبیت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس سے عقل مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایسی حالت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے "ان لوگوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں، کانوں میں ڈاٹ لگ گئی ہے اور دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں۔"

قلب کی ملکہ صلاحیتوں میں علم، عقل اور جذبات کے علاوہ اختیار اور ارادہ بھی ہے۔ علم بالحواس کے کچھ مدارج ہیں جن میں سے گزرنے کے لئے اختیار اور ارادے کی صلاحیت بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ ماہرین فن تدریس جانتے ہیں کہ جب تک طالب علم کے اندر حصولِ علم کی آمادگی اپنے نقطۂ عروج تک نہ پہنچ جائے مدرس کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لے طالب علم کے ذخیرۂ واقفیت میں ذرا بھر بھی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کھیت بیج کو قبول ہی نہ کرے تو کسان کی ہزار آبپاشی کے باوجود فصل نہیں اگائی جا سکتی۔ علم کو اس کو برومند قبولیت تک پہنچانے یا دوسرے لفظوں میں ذہن نشین ہونے کے لئے جو مراحل طے کرنے پڑتے ہیں انہیں مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ مثلاً شعور، ادراک، عرفان، درایت، تفہیم، قوتِ فیصلہ وغیرہ۔ اسی طرح خود علم بھی دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک ظن، گمان یا تخمینی علم (SPECULATIVE) اور دوسرا یقینی علم۔ ظن و گمان اور یقینی علم کیا ہیں اور ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ہمیں خود معلوم نہیں ہے۔ جب سے مسلمان قوم کے ان علمی انحطاط شروع ہوا ہے انہوں نے اصطلاحات کو "ڈیفائن" کرنا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی مسئلہ صحیح طور پر "ڈیفائن" ہو جائے تو اول تو فریب خوردگی اور فریب دہی دونوں کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ آدھا مسئلہ "ڈیفائن" کرنے سے ہی حل ہو جاتا ہے۔ ہمارے علمائے مذہب نے جب سے اپنے ذہن کو تقلید پرستی میں مقید کر لیا ہے انہیں غور و فکر کرنے یا جدید سوچ کو قبول کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنی اصطلاحات کے صحیح مفاہیم تک ہی رسائی حاصل نہیں رہی۔ ہم علم یقینی کی تعریف (DEFINITION) کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ہمیں پروفیسر وائٹ ہیڈ کے الفاظ یاد آ گئے جو انہوں نے سچائی کو ڈیفائن کرتے ہوئے کہے ہیں۔ یعنی:

TRUTH IS CONFORMATION OF APPEARANCE TO REALITY.

"ظاہر کا اصلیت کے عین مطابق ہونا صداقت ہے"

اگر ظاہر اصلیت کے عین مطابق نہیں ہے بلکہ اس سے جدا بن کر دکھائی دے رہا ہے جیسے کسی منافق کا جسم، تو یہ فریب نظر ہے۔ صداقت نہیں ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ صداقت کی ضد جھوٹ نہیں بلکہ فریب نظر (ILLUSION) ہے۔ جھوٹ کبھی اپنے آپ کو جھوٹ کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرے تو کوئی بھی انسان اسے قبول نہ کرے گا۔ بلکہ وہ انسان بھی جو اسفل السافلین یعنی حیوانات کی سطح سے بھی نیچے گر چکا ہے اسے رد کر دے گا

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جھوٹ کو اپنی اس حیثیت کا علم ہے۔ لہٰذا جب کبھی وہ سامنے آتا ہے سچ کا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے۔ لوگ اس کے ظاہری لباس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اسے سچ سمجھ لیتے ہیں اور اس طرح جھوٹ سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے حق کے مقابلے میں باطل کا لفظ استعمال کیا ہے اور باطل کے یہی معنے ہیں۔ ظن وگمان اور ایمان ویقین میں یہی فرق ہے۔ ظن اور گمان پر مبنی علم اپنے آپ کو منوانے کے لئے یقینی علم کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔

جو علم یقین کی حد تک نہیں پہنچتا محض گمان کے مرحلے میں رہ جاتا ہے وہ علم صحیح نہیں کہلا سکتا۔ ایسا علم نہ صرف بے کار ہے بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔ بلند حقیقتیں ہمیشہ تجریدی (ABSTRACT) ہوتی ہیں مگر انہیں سمجھانے اور عمل میں لانے کے لئے محسوس مظاہر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایمان اور یقین چونکہ تجریدی کیفیت کا نام ہے اس لئے ہر علم صحیح کو بھی محسوسات کی بنیاد سے نکل کر تجریدی کی طرف قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ وہ علم جو محسوسات میں پھنس کر رہ جائے گا ناقص اور خام ہوگا۔ اور وہ حقیقت کی پہچان نہیں کر سکے گا علم ریاضی کو اسی لئے صحیح علم کہا جاتا ہے کہ اگرچہ اس کی بنیاد چند ایسے مسلمات اور بدیہیات (AXIOMS AND POSTULATES) پر رکھی گئی ہے جنہیں ہم عقلاً ثابت نہیں کر سکتے۔ اور جنہیں ہم صرف ایماناً تسلیم کرتے ہیں تاہم اس علم کے نتائج کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ باقی جتنے بھی علوم اپنے آپ کو سائنٹفک کہتے ہیں ریاضی ہی کے ممنون ہیں۔ مقرون سے مجرّد کی طرف بڑھنے کا عمل علم ریاضی میں روز اوّل ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ بچے کو جمع تفریق کا پہلا سبق محسوس چیزوں کے "واسطے" سے دیا جاتا ہے۔ جب وہ مقرون اشیاء کی کمی بیشی کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے تو آہستہ آہستہ مقرون چیزیں درمیان سے ہٹالی جاتی ہیں اور ان کی جگہ "اعداد" کو سامنے لایا جاتا ہے جو مجرد تصورات ہیں۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اعداد کو بھی ختم کر کے حروف کو لایا جاتا ہے اور اس طرح تدریجاً پورے ریاضیاتی چیلے کی تفہیم ممکن ہو جاتی ہے۔

مقرون سے مجرّد تک کے اس سفر کو اسلام نے کس نقطۂ عروج تک پہنچا دیا ہے یہ ایک الگ موضوع تحقیق ہے۔ جو بہت بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ اور سردست ہماری بحث سے خارج ہے تاہم افراد کے مقرونیت سے آگے بڑھ کر انسانیت کی تجریدی کی طرف "ہجرت" کرتے چلے جانے کی تعلیم کو اس ضمن میں بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے محبت ایک تجریدی کیفیت کا نام ہے لیکن اس کی ابتداء محسوس اشیاء یا افراد سے ہوتی ہے۔ بچے کو پہلے ماں باپ اور بھائیوں، بہنوں سے محبت ہوتی ہے، پھر گھر کی بعض بے جان چیزوں کا رخ کرتی ہے، پھر ماحول میں تحلیل ہونا شروع ہو جاتی ہے، پھر ہمجولی ساتھی، دوست، رشتہ دار، پھر محلے والے، شہر والے اور علاقے والے اس کے دائرے میں آجاتے ہیں یہ دائرہ اور زیادہ وسیع ہو تو صوبے، ملک، براعظم سے گزر کر پوری دنیا کے انسانوں تک پھیل گیا۔ اس سے ذرا آگے بڑھا تو کائنات، خالق کائنات پھر خالق کائنات کے قوانین و ضوابط، علم، صداقت، دیانت وغیرہ کی مستقل قدریں۔ تجریدی تصورات بن کر محبت کے اس دائرے میں آگئیں۔ اب اگر کوئی شخص مقرون کو چھوڑ کر اِلّا اللہ تک نہ پہنچے، کھیتوں سے چل کر جنت الفردوس کے تصور میں داخل نہ ہو، یا جو مقرون اشیاء اور افراد مثلاً رنگ، نسل، وطن اور زبان وغیرہ کی محبت میں اٹک کر رہ جائے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اُسے ارتقا یافتہ شخص نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی "انسانی ذات" نامکمل رہ گئی ہے اور وہ خوب سے خوب تر کی حکمت کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا۔ لہٰذا علمِ صحیح کی پہچان ہی یہی ہے کہ یہ محسوسات کو چھوڑ کر تجریدات کی طرف بڑھتا چلا جائے ۔ اور اس طرح حقیقتِ کبریٰ کی تفہیم تک پہنچ جائے "تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اوپر کی سطح پر پہنچ کر نیچے کی سطح کی محبتیں چھوٹ جائیں ، یہ محبتیں بدستور برقرار رہیں گی۔ البتہ محبتوں کے دائرے میں وسعت ہوتی چلی جائے گی ہاں اگر کسی بلند تر مقصد اور کسی پست محبت کے درمیان تصادم پیدا ہو جائے اور دونوں میں سے کسی ایک کا چھوڑنا ناگزیر ہو تو اعلیٰ قدر کی خاطر پست قدر کو چھوڑ دینا ہوگا کیونکہ یہی کردار کی بلندی ہے اور یہی سیرت کی پختگی اور پاکیزگی ہے ۔

معروف اشیاء کے ذریعے یا واسطے سے واقفیت حاصل کرنے کو "ادراک" کہتے ہیں اَلْاَدْرَاکُ کے معنے ہیں کسی چیز کا پیچھا کر کے اسے جا لینا۔ چونکہ حواسِ خمسہ کے ذریعے ہم اشیاء کے بارے میں "کیا" اور "کیسے" کا جواب معلوم کر لیتے ہیں اس لئے ادراک وہ علم ہے جو محسوسات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ باری تعالیٰ کا وجود معروض نہیں ہے اس لئے کوئی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی ۔ ہم حواس کے ذریعے اللہ کی قدرت کے مظاہر کا علم حاصل کرتے ہیں۔ پھر اس علم کی مدد سے اس یقین کو دل میں قائم کر لیتے ہیں کہ مظاہرِ قدرت اور ان میں پائے جانے والے نظم و ضبط اور مقصدیت کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔

"خبر" اُس واقفیت کا نام ہے جو تجربے کی بنا پر حاصل ہو۔ نبأ بھی جس سے نبوّت کا لفظ بنا ہے خبر کے معنے دیتا ہے ۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ خبر عام واقعات سے متعلق ہوتی ہے جبکہ نبأ کسی بہت بڑے واقعے کو کہتے ہیں۔ ہر نبی کسی آنے والے عظیم انقلاب کی خبر لاتا ہے ، اور اس کی خبر علمِ صحیح پر مبنی ہوتی ہے۔ ویسے ہر خبر کے لئے علم اور واقفیت کا ہونا ضروری ہے۔

جاننے کے مفہوم کے لئے ایک لفظ درایت بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنے ہیں کسی چیز کو کوشش یا تدبیر سے معلوم کرنا یا ایسی چیز کی بابت جاننا جس میں پہلے شک ہو۔ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا قصد کرنا اور اسے طلب کرنا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں طبعِ سلیم کے لئے کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے اس لئے درایت کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بولا جاتا۔

"عرفان" ادراک سے ذرا آگے کی سطح پر ہے ۔ اَلْعَرْفُ کے معنے ہیں بُو یا مہک۔ یہیں سے اس کے معنے پہچان کے ہو گئے ہیں۔ عرفان اُس پہچان کو کہتے ہیں جو چیزوں کی علامات اور آثار سے پیدا ہو۔ بعض تجربہ کار شکاری ہرنوں کے کھُروں کے نشان دیکھ کر ہرنوں کی موجودگی کا تعین کر لیتے ہیں۔ بعض نشانات دیکھے بغیر صرف بُو پا کر ہی ہرنوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ نشان دیکھ کر پہنچنا ادراک ہے ۔ بُو پا لینا عرفان ہے۔ اللہ کی ذات کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اُس کی صفات کو پہچانا اور سمجھا جا سکتا ہے ۔ یہ اللہ کی معرفت یا اللہ کا عرفان ہے۔

ادراک کا تقریباً ہم معنیٰ لفظ شعور ہے۔ یہ لفظ شَعْرٌ سے نکلا ہے جس کے معنے انسانی جسم کے بال ہیں،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بال کی باریکی کے لحاظ سے "شعر" کے معنے ہوگئے کسی چیز کو سمجھ لینا، جان لینا، تاڑ لینا، معاملات کی باریکیوں تک پہنچ جانا یا حواس کے ذریعے کسی باریک چیز کا ادراک کر لینا۔ عربوں کے ہاں فلسفہ اور تجریدی تصورات شعور نہیں کہلاتے تھے۔ انہیں شعور سے تعبیر کرنا بیرونی اصطلاح سازوں کا کام ہے۔ جو یونانی طرزِ تفکر سے متاثر تھے۔ چونکہ عربوں کی نازک خیالی، بذلہ سنجی اور رازداسرار کی باتیں "شاعری" کے اندر ہی سما جاتی تھیں۔ اس لئے "شعر" کا عام مفہوم کلام منظوم ہوگیا۔ کلامِ منظوم کے مصنف کو "شاعر" اس لئے کہنے لگے کہ ان کے خیال میں شاعر فطانت اور ذہانت سے اُن معانی کا ادراک کر لیتا ہے جن کا ادراک کر لینا عام لوگوں کے لئے مشکل ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا تھا جو شاعر سے عجیب وغریب باتیں لکھواتا تھا۔

فہم کا لفظ بھی کسی چیز کے جان لینے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تاہم اس میں دل سے پہچان لینے کا اضافہ شامل ہے۔ علم کو اگر مطلق ادراک کہا جائے تو "فہم" خارجی اشیاء پر غور کرنے کے بعد ذہن کا دوسری چیزوں کی طرف تیزی سے منتقل ہو جانا ہوگا۔ جیسے ہم دھواں دیکھتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً "آگ" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ بعض لغت نویسوں نے ذہنی تصور ہی کو فہم کہا ہے اور بعض نے اُس خوبی یا وصف کو فہم کہا ہے جس سے ہمارا ذہن مطالب ومعانی کو تیزی اور عمدگی کے ساتھ اخذ کر لیتا ہے۔ تعقّل اور تدبّر بھی اسی قسم کا عمل ہے۔ عقل کے بنیادی معنے ہیں "روک لینا" یا "منع کرنا" چونکہ بیش قیمت چیزوں کو حفاظت کے خیال سے روک لیا جاتا ہے۔ اس لئے عقل کے معنے ہوگئے کام کی باتوں کو عام باتوں سے الگ کرکے روک لینا اور انہیں محفوظ کر لینا عقل کا صحیح منصب ہی یہ ہے کہ انسان کو نامناسب اور غیر پسندیدہ باتوں سے روکے خواہ جذبات کے برخلاف ہی کیوں نہ فیصلہ دیں۔

"تدبّر" کسی معاملے کے انجام کو نظر میں رکھ کر غور وفکر کرنا ہے۔ "فکر" کسی چیز میں اطمینان اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ سوچنے اور عقل ونظر سے کام لینے کو کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہم صرف اُنہی چیزوں پر فکر کر سکتے ہیں جن کا کوئی تصور دل میں قائم ہو سکتا ہو۔ اللہ کی ذات کا کوئی تصور دل میں قائم نہیں ہو سکتا۔ صرف اس کی قدرتوں پر غور وفکر کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ذاتِ باری تعالیٰ "فکر" سے بالاتر ہے۔ تفکّر کے معنے ہیں عبرت حاصل کرنے کے لئے دل کو گھمانا اور اِدھر اُدھر پلٹنا۔ عبرت (عبور سے) کسی دیکھی چیز کی وساطت سے اَن دیکھے نتائج تک پہنچ جانا ہے۔

علم حاضر سے علمِ غائب تک پہنچنے کو تفقّہ کہتے ہیں۔ یہ گویا محسوسات کے مشاہدے سے نتائج اخذ کر کے ان کے ذریعے مجرّد حقیقتوں کا سمجھنا ہے۔

ان اصطلاحات کے معانی میں جو لطیف سا فرق ہے وہ سامنے رہے تو علم بالحواس اور علم بالیقین کے فرق کو بھی سمجھا جا سکتا ہے "علم" ان تمام اصطلاحات سے حاصل ہونے والی محکم آگہی اور کماحقّہٗ جان پہچان کا نام ہے۔ تدبّر، تعقّل، تفکّر اور تفقّہ انسانی ذہن کے ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ عرفان، شعور اور ادراک کی منزلوں سے گزرتا ہوا علم یعنی آگہی کی بالاتر سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے کائنات پر، زمین میں مخفی اور ظاہر خزانوں پر، مظاہرِ فطرت پر اور خود انسانی ذات کے اسرار ورموز پر غور وفکر کرنے کی تاکید کی ہے، بلکہ یہاں تک کہہ دیا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کہ خود میری آیات پر بھی اندھوں اور بہروں کی طرح نہ گر پڑو۔ یہ اس لئے ہے کہ قرآن حکیم اپنے ہر دعوے کو دلائل اور براہین کے ساتھ پیش کرتا ہے اور انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کے حقائق کو فکر و تدبّر کے بعد تسلیم کریں، تو دل و جان سے تسلیم کریں، کیونکہ انسان کے پاس علم صحیح تک پہنچنے کا صرف ایک ہی ذریعہ تدبّر اور تفکر کا ہے اور اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اسی ضمن میں قرآن حکیم کی وہ آیت کتنی تابناک ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ حقیقت ترجمان سے اللہ تعالیٰ عوام الناس سے اس طرح خطاب کرتا ہے کہ اے لوگو! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ جس سیلاب میں تم بہے چلے جا رہے ہو اسے ایک لمحہ کے لئے روک لو۔ ایک ایک، دو دو، تین تین ہی ذرا تھم جاؤ۔ اور میری اس بات کو سنو اور میری بات صرف اتنی سی ہے کہ "سوچو، تفکر کرو"۔ آیتِ جلیلہ میں یہاں وقف ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ یہ جو غور و فکر کی طرف بار بار تمہیں بلا رہا ہے یہ مجنون نہیں ہے! (۳۴:۴۶)

انسانیت کو علم و عقل کی راہیں دکھانے والا یہ حکم کسی خاص زمانے کے انسانوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ جس طرح ہمارے اسلاف اس کے مکلف تھے اسی طرح ہم اور ہماری آئندہ نسلیں بھی،

۱۔ تدبّر فی القرآن ۲۔ تدبّر فی السمٰوات والارض اور ۳۔ تدبّر فی الانفس

کی مکلف ہیں۔

تدبّر، تفکر اور تفقہ صرف انسانی ذات کا خاصہ ہے۔ جو کوئی انسان یا قوم "انسانی ذات" کی اس خصوصیت کا انکار کرتی ہے یعنی اس خصوصیت کو بروئے کار نہیں لاتی یا یہ خیال کرے کہ جو کچھ سوچا جانا تھا وہ سوچا جا چکا ہے تن آسانی میں مبتلا ہو جاتی ہے یا طرح طرح کے دلائل اور تخیل پیدا کر کے دوسروں کو بھی غور و فکر کرنے سے روکتی ہے اس قوم یا انسان کو "انسانی سطحِ زندگی" کا منکر کہا جائے گا۔ یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ "انسانی سطحِ زندگی" کا انکار "حیوانی سطحِ زندگی" کا اقرار ہے، اس کے معنے یہ ہوئے کہ "وہ شخص جو غور و فکر سے کام نہیں لیتا یا کرنے والوں کو غور و فکر کرنے سے روکتا ہے وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے" (۷:۱۷۹) انسان اور حیوان میں یہی تو فرق ہے کہ انسان کو غور و فکر کی استعداد دی گئی ہے۔ جبکہ حیوان سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ چونکہ ہر نئی نسل سابقہ نسل سے علمی و فکری سطح سے بلند تر ہوتی ہے اس لئے تدبّر کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ پھر قرآن حکیم کا تو اپنا دعویٰ ہے کہ اس کی تعلیمات ہر زمانے اور ہر خطۂ ارض کے لئے ہیں، بلکہ زمانہ اپنے علم میں جتنا بھی آگے نکل جائے قرآنی حکمت اس سے بھی آگے ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم غور و فکر نہ کرنے والوں کے لئے سخت تنبیہات آئی ہیں۔

غور و فکر اور تدبّر و تعقّل کے نتیجے میں جو آگہی حاصل ہوتی ہے اسے علم کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کو کماحقہ، جان لینا پہچان لینا۔ ادراک کر لینا۔ یقین کر لینا۔ ظاہر ہے کہ اس کی آگہی حاصل کرنے کے لئے ذہن کے ان تمام ذرائع کو استعمال میں لانا پڑے گا جنہیں درایت، عرفان، ادراک، شعور، فہم، تدبّر، تفکر، تعقّل وغیرہ کے نام دیئے گئے ہیں چونکہ قرآن حکیم نے سمع بصر کے ساتھ قلب کو بھی ذرائع علم میں شامل کر دیا ہے اس لئے علم کی تعریف میں علم بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) اور تجریدی یا تصوراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) دونوں شامل ہیں۔ پھر فواد کی نسبت سے علم

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں جذبات اور احساسات کا عنصر بھی آجاتا ہے لیکن چونکہ علم اس وقت اَلْعِلْمُ کہلا سکتا ہے جب وہ یقین کے درجے کو پہنچ جائے۔ اس لئے قرآن حکیم نے وحیِ ربّانی کو اَلْعِلْمُ اور اس کی ضد کو اَھْوَاءٌ کہا ہے (۲:۱۲۰) اَھْوَاءٌ میں خود ساختہ تصورات اور جذباتی عقیدتمندوں کے علاوہ ہر وہ ظنّی اور گمانی بات شامل ہوگی جس کے لئے عقل کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم نے خارجی کائنات سے علم حاصل کرنے پر جو اتنا زیادہ زور دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ کہ اس علم کی بنیاد دلائل و براہین، حقائق و شواہد اور تجربات و مشاہدات پر ہوتی ہے۔ اور جذباتی عقیدت مندیوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم میں قصۂ آدم متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے (مثلاً ۳۰ تا ۳۴ : ۲ - ۱۱ : ۷ — ۲۰ - ۲۸ : ۱۵ - ۹ : ۱۷ - ۵ : ۱۸، ۱۱۶ : ۲۰ اور ۷۱ : ۳۸ میں) ان آیات کو یکجا کر کے دیکھا جائے اور مطالب کا جائزہ غور و فکر کے مختلف زاویوں سے لیا جائے تو عجیب و غریب حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے یہ دو آیات خصوصی توجہ چاہتی ہیں۔

۱۔ اور جب تیرے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں پھر جب اسے سنوار لوں اور اس میں اپنی رُوح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ (۱۵:۲۸-۳۰)

۲۔ اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام۔ پھر ان کو ملائکہ کے سامنے کیا۔ اور کہا، بتاؤ مجھ کو ان کے نام اگر تم سچے ہو۔ تو انہوں نے کہا سبحان ہے تو۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے جتنا تم نے ہم کو سکھایا ہے (۲:۳۱-۳۲)

ان آیات میں پہلے تو بشر اور آدم کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ لغوی اعتبار سے بَشَرَۃٌ کے معنے انسان کی جلد کی اوپر کی سطح کے ہیں۔ پھر اَلْبَشَرُ کے معنے خود انسان کے ہوگئے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بَشَرٌ سے انسان کی صرف طبعی سطحت مراد ہوتی ہے اور جسمانی تقاضوں کی طرف حوالہ ہوتا ہے۔ تاہم عمومی حیثیت سے انسان اور بشر مترادف طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اَدَمَۃٌ کے معنے ہیں۔ قرابت، موافقت، مل جل کر رہنے کی صلاحیت، میل جول، باہمدگر مخلوط ہونا وغیرہ۔ اَدَ اَمٌ وہ مثالی فرد ہے جس سے قبیلوں کے نام منسوب کئے جاتے تھے۔ قرآن حکیم میں آدم اور انسان انہیں معنوں میں آئے ہیں، جن معنوں میں ہم اپنی زبانوں میں استعمال کرتے ہیں یعنی آدمی یا نوعِ انسان، تاہم مذکورہ بالا آیات میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ملتا ہے کہ "رُوح" کے پھونکے جانے سے پہلے بَشَر کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس وقت تک انسان ایک زندہ جسم سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ تاہم جب بشر کو "انسانی ذات" عطا ہوگئی تو اب اس کے لئے آدم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اب اس کے بعد دوسرا لطیف نکتہ یوں سامنے آتا ہے کہ جب آدم نے "اَسْمَآءَ کُلَّھَا" کے جاننے پہچاننے کی صلاحیت کا مظاہرہ پیش کر دیا تو اس پر ملائکہ کو حکم ہوا کہ اب تم سجدے میں گر پڑو۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں "اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوتی ہے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم ہیں مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں۔ اس لئے مرتبۂ خلافت انسان ہی کو عطا ہوا" اور ملائکہ نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ اور ہونا بھی یونہی چاہیئے تھا کیونکہ عبادت تو خاصۂ مخلوقات ہے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

خدا کی صفت نہیں ہے۔ البتہ علم خدائے تعالیٰ کی صفتِ عالیہ ہے اس لئے قابلِ خلافت یہی ہوئے کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہٗ کا کمال ہونا ضروری ہے۔ اللہ علیم ہے" انسانی ذات" اپنی حدود کے اندر "عالِم" بن سکتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے تحصیلِ علم کو انسان کے لئے لازمی قرار دیکر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کسی وقت بھی یہ سمجھ لینا کہ اب ہمیں مزید علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے تو یہ نعمائے خداوندی سے محرومی ہے (۲ : ۸۸) علم ہی کے ذریعے انسان صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے (۲۸ : ۱۰) قرآن نازل ہی اہلِ علم کے لئے ہوا ہے۔ (۱۳ : ۴۱) علم "حق" ہے۔ اس کی ضد ظن اور گمان ہے، ظن اور گمان حق کے مقابلے میں کچھ کام نہیں دے سکتا (۲۸ : ۵۳)

علم کی خاصیت ہی یہ ہے کہ یہ اپنی طاقت سے ان مخفی قوتوں کو اپنے تابع فرمان کر سکتا ہے جو کائنات کے اندر سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشیا کا علم کیسے دیا اس کی تفصیل امام راغب اصفہانی کی مشہور عالم کتاب مفردات القرآن کے حوالے سے سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ

"جب تک مسمّیٰ کا یعنی جس کا نام رکھا جا رہا ہے پورا پورا علم نہ ہو
اس کے اسماء کا تعارف کوئی فائدہ نہیں دیتا"

آیتِ جلیلہ "وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" (اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے) میں عَلَّمَ کا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو چیزوں کے نام اسی طرح سکھائے جس طرح استاد بچے کو تعلیم دیتا ہے۔ اور الفاظ و معانی کے رٹے لگواتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے اللہ نے انسان کے اندر یہ صلاحیت رکھ دی اور مِنْ رُوْحِہٖ کے پھونکے جانے کی بدولت یہ استعداد پیدا کر دی کہ وہ چیزوں کے نام رکھ سکے اس استعداد اور صلاحیت کے استعمال سے انسان چیزوں کے نام رکھنے کا علم خود حاصل کرتا ہے اور یہ وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان کروڑوں سالوں سے نت نئے نام رکھ رکھ کر اپنے علم میں اضافہ کر رہا ہے اور ناموں کی تعداد کو بھی بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔

اَسْمَاءٌ کا لفظ اسم کی جمع ہے اسم کا مادہ س۔م۔و ہے، اسی مادّے سے سماوات کا لفظ بنا ہے جس کا واحد سَمَاءٌ ہے۔ سَمَاوٌ کے بنیادی معنے بلندی کے ہیں۔ چونکہ چیزیں بلندی سے پہچانی جاتی ہیں اس لئے اسم کے معنے نام کے ہو گئے گویا اسم وہ علامت ہے جس سے کوئی چیز پہچانی جاتی ہے ویسے علم اور علامت دونوں کا مادہ ایک ہے۔ عَلَم جھنڈا ہے جسے ہمیشہ بلند رکھا جاتا ہے اور اس سے ایک جماعت دوسری جماعت (یا فوج) کو پہچان لیتی ہے۔ دو کھیتوں کے درمیان یا ریگستانوں اور دوسری جگہوں پہ راستے کی پہچان کے لئے جو چیزیں بطور نشان کھڑی کر دیتے ہیں انہیں بھی عَلَم اور علامت کہتے ہیں۔ کسی چیز کو اچھی طرح پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ

۱۔ پہلے اس کی شکل و صورت، ہیئت اور شناخت کے بارے میں واقفیت حاصل کی جائے۔
۲۔ پھر تجربات اور مشاہدات کی مدد سے اس کے خواص متعین کئے جائیں۔
۳۔ پھر ان خواص کا امتحان لیا جائے یعنی ان کا عمل اور ردِّ عمل معلوم کیا جائے۔
۴۔ اس کے بعد اس کے نفع و ضرر اور استعمالات پر تحقیق کی جائے۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ظاہر ہے کہ ان مراحل سے گزرنے کے لئے ذہن کو فکر، تدبر وغیرہ کے مذکورہ تمام اعمال سے کام لینا پڑے گا۔ پھر کہیں جا کر اشیاء کا صحیح نام رکھا جا سکے گا۔ نفع اور ضرر کی معلومات ہمیں اقدار کی طرف لے جاتی ہے لہٰذا کلمہ کے لفظ میں اشیاء اور اقدار دونوں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چیزوں کے نام رکھنے کی صلاحیت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے اسی صلاحیت کی بدولت ہم چیزوں کو ان کا صحیح مقام دے سکتے ہیں اور اس مقصد کو بھی جان سکتے ہیں جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو پیدا کیا ہے۔ جو لوگ اس صلاحیت کے استعمال کو بھول چکے ہیں وہ کائنات کے حسن و توازن سے بھی ناآشنا ہیں اور اس کے اندر ربط و ضبط اور باہمی تعاون کے جو قوانین کارفرما ہیں انہیں بھی نہیں پہچانتے خانقاہیت کا مسلک فطرت سے اسی بیگانگی کا نتیجہ ہے، یہ اسی صلاحیت کا نتیجہ ہے کہ آج اکثر و بیشتر کائناتی قوتوں نے انسان کے آگے سر جھکا دیا ہے اور اپنی خدمات اس کے پیش کر دی ہیں۔ جب انسان اس قانون کو معلوم کر لیتا ہے جو اشیائے فطرت کی خاصیتوں کو کنٹرول کرتا ہے اور جو چیزوں کے عمل اور ردّ عمل کو متعین کرتا ہے تو جو قوتیں اس قانون کے مطابق کام کر رہی ہوتی ہیں سب کی سب انسان کے آگے سجدہ ریز ہو جاتی ہیں۔ پھر ان سے جو کام انسان لینا چاہے لے سکتا ہے۔

ہومیو پیتھی کا ایک ڈاکٹر ہے ایم۔ ایل ٹیلر۔ اس نے اپنی کتاب ہومیو ڈرگ پکچرز کے مقدمے میں ایک بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ "آدمی پر چیزوں کے نام رکھنے کی ذمہ داری ڈال دی گئی تھی جو حقیقتاً یہ بہت مشکل کام تھا جو انسان کے سپرد کیا گیا تھا اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص بھی غیر متعین رہتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام رکھے جاتے ہیں ان سے ناقابل تلافی نقصان پہنچتے ہیں۔" شیکسپیئر کے زمانے میں شاید مٹی کے ڈھیر کو "آستانۂ رحمت"، کیکر کے درختوں کو رنگ برنگی دھجیاں پہنا کر انہیں "مستجاب الدعوات" اور ننگے دھڑنگے دیوانوں کو "پہنچے ہوئے فقیر" کہنے کا رواج نہیں تھا۔ ورنہ وہ کبھی نہ کہتا کہ ناموں میں کیا رکھا ہے!

اسماء کا علم یعنی نام رکھنے کی صلاحیت "آدمیت" کی پہچان ہے جو کوئی "ابن آدم" اس صلاحیت کو استعمال میں نہیں لاتا، اشیاء اور اقدار کی ماہیت پر غور و فکر نہیں کرتا، خواص کو نہیں پرکھتا، اور ان کے صحیح اور غلط استعمال کو نہیں جانتا یا ان کی قدر و قیمت پہچان کر ان کو ان کے صحیح مقام پر نہیں رکھتا وہ اپنی صلاحیت اور شرف انسانیت دونوں پر پردہ ڈال رہا ہے۔

اشیاء اور اقدار کی حقیقت معلوم کر لینے سے اللہ کی قدرت کاملہ اور اس کی بے مثال صنعت گری کے نظارے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے قانون کی محکمیت، تخلیق اشیاء کی حکمت اور مقصدیت، اس ذات یکتا کی ربوبیت اور رحیمیت کا مشاہدہ عین الیقین کی حد تک راسخ ہو جاتا ہے اور پھر ان مشاہدات کی افادیت کسی فرد واحد کے تجربے یا چند ارادت مندوں کے حلقے تک محدود نہیں رہتی بلکہ پوری نوع انسانی کو اپنے دامن رحمت میں لے لیتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اشیائے فطرت کی بے بہا نعمتوں پر غور و فکر نہ کرنے والے ان تمام انعامات سے محروم رہ جاتے ہیں جن کا اللہ نے اپنے اطاعت گزاروں سے وعدہ کر رکھا ہے کیونکہ اطاعت گزار صرف وہی ہیں جو اللہ کے ہر حکم کی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تعمیل کریں نہ کہ وہ چند منتخب احکام کی تو تعمیل کریں باقیوں کو چھوڑ دیں۔ یا انہیں غیر ضروری سمجھیں۔ "الدّین" میں داخلے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس میں آنا ہے تو مکمل طور پر (کافّتہ) آیئے۔ کچھ تسلیم کچھ ناتسلیم کی حالت میں مت آیئے۔ یہ منافقت ہے!

خالق ارض و سماوات اپنی تخلیقات کو نت نئے انداز سے دہراتا اور ان میں اضافے کرتا رہتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ تمام چیزوں کے نام رکھے جا چکے ہیں۔ اب کسی مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کائنات میں ہر چیز کا صحیح مقام وہی ہے جو اسے اللہ کے قانون نے عطا کر رکھا ہے۔ اشیائے فطرت سے قانونِ تخلیق کے سمجھ لینے سے اشیاء کا نام بھی صحیح رکھا جا سکتا ہے اور ان کا صحیح مقام بھی متعین کیا جا سکتا ہے۔ غلط نام رکھنا یا یونہی کوئی نام دے دینا دونوں جہالت کے مظاہرے ہیں۔ اور جہالت "علم" کی خرابی کا دوسرا نام ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"اللہ کے علاوہ جن دوسری چیزوں کو تم نے معبود بنایا ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ یونہی سے کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ (۱۲:۴۰)

اللہ کے قانون کو فطرت کے اندر کارفرما دیکھنا چاہتے ہو تو یہ اسی اٹل اور پختہ اصولوں پر نظر آئے گا۔ اسے انسانی دنیا میں دیکھنا چاہتے ہو تو یہ غیر متبدل ضابطوں کی صورت میں قرآن حکیم کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون کر دیا گیا ہے۔ پہلی صورت میں یہ اپنے آپ لاگو ہے کیونکہ فطرت صاحب شخصیت نہیں ہے۔ دوسری صورت میں انسان چونکہ صاحب شخصیت ہستی ہے اس لئے یہ مکلّف ہے کہ اللہ کے قانون کو اپنی دنیا میں خود نافذ کرے!

قصّہ آدم کی جزئیات کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ جب آدم کو علم عطا ہو چکا تو حکم ہوا کہ فلاں "درخت" کے قریب تک نہ پھٹکنا چہ جائیکہ اس کا پھل کھاؤ۔ لیکن آدم نے حکم عدولی کی اور شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ ذرا سوچیئے، اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ابلیس کے بہکاوے میں کیوں آیا؟ کہا گیا ہے یہ اس کے اختیار و ارادے کی صلاحیت کا پہلا امتحان تھا جس میں وہ ناکام رہ گیا۔ ابلیس نے جذبات کے راستے سے اس پر حملہ کیا تھا اور وہ مغلوب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان کے اپنے اندر خرابی نہ ہو ابلیس کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ابلیس نے اُسے شجرِ ممنوعہ کا پھل جبراً نہیں کھلایا تھا بلکہ اس کے کھا لینے کی ترغیب دی تھی۔ ابلیس، صاحبِ شخصیت ہستی کو ترغیب ہی دے سکتا ہے اپنی کسی قوت سے اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ مجبور اسے اپنے اندر کے جذبات کر سکتے ہیں۔ ابلیس کا کام ہر برائی کو خوشنما بنا کر انسان کے سامنے لاکھڑا کرنا ہے، ایمائیت (SUGGESTION) کے ذریعے ایمان کو متزلزل کرنا ہے، وسوسوں کے ذریعے یقین کو گمان و شبہات سے بدل دینا ہے، سفلی خواہشات کو انگیخت کرنا ہے، شکوک پیدا کر کے علم صحیح کے استحکام کو ہلا دینا ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ ایمائیت کو قبول کرنا یا نہ کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔ لہٰذا اس اوّلین نافرمانی کی تمام تر ذمہ داری آدم کے اپنے اوپر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ جب اُسے اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہوا تو اس نے فوراً "علم صحیح" کی طرف رجوع کیا۔ صدقِ دل سے اپنے کردہ گناہ کی معافی مانگی، سمجھ لیا کہ وہ امانت میں خیانت بھی کر سکتا ہے اور جان لیا کہ اس کا "علم" دوسری

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تمام صلاحیتوں کی طرح ناپختہ ہے، نامکمل ہے اور ناقص و غیبدار ہے۔ تاہم یہ ناقص اور ناپختہ علم جب کبھی علم صحیح کی طرف رجوع کرے گا اس میں قوت آجائے گی اور جذبات کے بہکاوے میں آنے سے بچ جائے گا۔

علم ناقص کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے اور بے چینی ایسا کہ ہم جانتے ہیں عجلت اور تیزی پیدا کر دیتی ہے۔ آدمؑ کے اندر اس بات کا کھوج لگانے کے لیے بے چینی پیدا ہو گئی کہ آخر یہ شجر ممنوعہ کیا ہے جس کا پھل کھانے سے مجھے روکا گیا ہے۔ کیا یہ پھل میٹھا ہے؟ کھٹا ہے؟ کڑوا ہے؟ کیا ہے؟ مجھے کیوں روکا گیا ہے؟ کیوں نہ اس کی تفصیلات خود معلوم کر لوں، ہو سکتا ہے اسے کھا لینے سے مجھے ابدی زندگی مل جائے آخر تجربہ کر لینے میں ہرج ہی کیا ہے، چنانچہ کرید اور جستجو کے طاقتور محرک نے اس کے دل و دماغ میں تذبذب کا طوفان پیدا کر دیا اور اس طرح ابلیس نے اس کے ناپختہ علم کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے اپنے مقام انسانیت سے نیچے گرا دیا ناپختہ علم وہ ہوتا ہے جو ایمان و یقین کی حد تک نہ پہنچ سکا ہو۔ اسی ناپختہ علم کی بدولت آج بھی ہم اپنے "انسانیت کے مقام" سے بار بار گرتے رہتے ہیں اور علم صحیح کی رہنمائی بار بار ہمیں اپنے صحیح مقام پر واپس لاتی رہتی ہے، جو علم "وحی ربانی" کے تابع رہ کر آگے نہیں بڑھے گا۔ وہ ہمیشہ ناپختہ رہے گا!

علم کی ایک اور خرابی اس بات میں بھی ہے کہ اس کا انحصار جن ذرائع پر ہے، یعنی سمع، بصر، ذائقہ، لمس، شامہ، وغیرہ وہ محدود ہیں یعنی اپنی مقررہ حد سے آگے نہیں جا سکتے، لہٰذا ناقص ہیں۔ سائنسی معاونات بھی ان حواس کی رسائی کے فاصلے بڑھا سکتے ہیں، انہیں محدود نات سے لا انہیں بنا سکتے۔ لہٰذا ان محدود ذرائع سے جو علم حاصل ہو گا یقیناً وہ بھی محدود ہو گا۔ اور اگر بیماری، حادثے، معاونات کی فنی خرابی اور کسی اور وجہ سے ان محدود ذرائع میں بھی کوئی نقص واقع ہو جائے تو ان کی فراہم کردہ اطلاعات نہ صرف اور بھی زیادہ محدود ہو جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو اصلیت کے بالکل برعکس بھی ہو جاتی ہیں۔ انسان اپنے علم کی اس خرابی اور محدودیت کا خیال نہیں کرتا اور چند چھوٹی موٹی کامیابیوں پر مغرور ہو کر اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ جزوی اور ناقص اطلاع کو مکمل اور صحیح خبر سمجھ لینا "علم" کی بہت بڑی خرابی ہے۔

"انسانی ذات" کے عناصر ترکیبی میں یہ جو محدود اختیار و ارادے کی صلاحیت ہے یہ اللہ تعالیٰ کی عطائے خاص ہے تاہم اس عظیم نعمت کو اگر انسان اپنے ناپختہ علم اور سرکش جذبات کے ماتحت رکھ کر استعمال کرے تو اس کے "ہبوط" کا باعث بنے گا (جیسا کہ قصہ آدم سے ظاہر ہے) جذبات مشتعل ہو کر عجلت کی طرف لے جاتے ہیں اور اس طرح باقی تین صلاحیتیں یعنی تعقل، تفہیم اور اختیار و ارادہ بھی مغلوب ہو کر کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ اس بحرانی کیفیت میں پھر انسان سے ایسے فعال سرزد ہونے لگتے ہیں جن کی توقع ایک متوازن شخصیت سے نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ جب آدمؑ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے گویا اپنی انسانی ذات کے عناصر ترکیبی کی محدودیت اور ان کے ناپختہ اور ناقص ہونے کی حقیقت کو سمجھ لیا اور اپنی پوزیشن کو پہچان لیا کہ وہ واقعی ظلوماً (حد سے تجاوز کر جانے والا) اور جہولاً (نادان یعنی ناقص علم والا) ہے اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اس نے اللہ کی رہنمائی سے استمداد چاہی جو اسے مل گئی۔ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جہولاً کو علم کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

خرابی اور ظلوماً کو عمل کی خرابی سے تعبیر کیا ہے۔ (خطبات مدراس)

قرآن حکیم میں انسان کے ظلوماً جہولاً ہونے کے علاوہ اور بھی بہت سی خرابیوں کا ذکر آیا ہے۔ جس طرح مندرجہ بالا توضیح کے مطابق ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ظلوماً جہولاً ہونا انسان کی فطرت یعنی اس کی تخلیق کے قانون کی خرابی نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ اسی طرح اس کی باقی خرابیاں بھی اس کی فطری خرابیاں نہیں ہیں بلکہ صلاحیتوں کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے یہ خرابیاں ناگزیر نہیں ہیں بلکہ ان سے بچا جا سکتا ہے۔ غفور الرحیم سے مغفرت طلبی (استغفار) ان خرابیوں سے بچ کر رہنے کی تمنا ہی تو ہے۔ چونکہ انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کی تخلیق کے قانون (فطرت) میں کوئی نقص ہو ہی نہیں سکتا۔ "احسن" تفضیل کل کا صیغہ ہے۔ اس لئے فطری خرابی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اگر اس کی فطرت خراب ہوتی تو اسے کون ٹھیک کر سکتا تھا۔ اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں نہ کوئی ترمیم کر سکتا ہے اور نہ اضافہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی ردّ و بدل کا اختیار رکھتا ہے۔ انسان اپنے قانونِ تخلیق کے اجزاء یعنی علم، تفہیم، جذبات اور اختیار ارادہ کو اپنے ہاتھوں سے آپ بگاڑے تو ارتقا اور تکمیلِ ذات کے وسیع امکانات اس کے سامنے کھلے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے

"تو سیدھا رکھ منہ دین پر۔ ایک طرف کا ہو کر۔ وہی تراش اللہ کی جس
پر تراشا لوگوں کو۔ بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو۔ یہی ہے دین
سیدھا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے" (۳۰ : ۳۰)

اس آیت جلیلہ کے یہ الفاظ کہ "تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر" اور "بدلنا نہیں ہے اللہ کے بنائے ہوئے کو" واضح طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان اپنے اختیار اور ارادے کو استعمال کرنے میں آزاد ہے۔ انسان کی تراش خراش خراب ہوتی یا تو جس طرح حیوانات اپنے افعال پر مجبور ہیں اور اسی مجبوری کی وجہ سے جوابدہ نہیں ہیں اسی طرح انسان بھی اپنے افعال پر مجبور اور ذمہ داری سے بری ہوتا۔ ایسی صورت میں یہ حکم بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کہ "تو اپنا منہ یکسو ہو کر دین پر سیدھا رکھ۔"

معلوم نہیں کب اور کیسے یہ عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھ گیا کہ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے" اوّل تو اللہ کی شکل و صورت نہیں ہے۔ وہ تجسیم کے ہر طرح کے تصورات سے پاک اور منزّہ ہے، دوسرا یہ کہ اگر ہم انسان کی فطرت کو مان لیں (کیونکہ صورت کا غیر تجسیمی معنی یہی ہو سکتا ہے) تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کی تمام خرابیاں نعوذ باللہ اللہ کی فطرت کی خرابیاں ہیں! اس سے بڑھ کر کفر اور کیا ہو سکتا ہے' اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وہی تصور ذہن میں قائم رکھو جو قرآن حکیم نے بنی نوع انسان کو دیا ہے۔ اس تصور سے بال برابر انحراف بھی ہزار خرابیوں کا باعث بن جائے گا۔ وہ عقل جو محسوس میں پھنس جاتی ہے اور تجرید کی طرف نہیں بڑھتی اسی قسم کے تصورات پیدا کرتی رہتی ہے۔ محسوس پرست ذہن پہلے خدا کو انسانی شکل و صورت میں ڈھالتا ہے پھر اس سے وہی صفات منسوب کر دیتا ہے جو وہ اپنے ارد گرد کے جابر لوگوں میں دیکھتا ہے۔ جب جابر لوگوں کا ڈنڈا پیشوائیت کی معرفت سر پر پڑتا ہے کہ بادشاہ زمین پر اللہ کا سایہ ہے تو پھر وہ واپس انسان کو خدا کے روپ میں ڈھالتا ہے اور اس طرح ملوکیت قائم

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

اور پیشوائیت اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم نے انسان کی جن کمزوریوں کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ یہ پست حیوانی جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ (۴:۲۸)

۲۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کھڑے بیٹھے اور پڑے ہوئے اللہ کو پکارتا رہتا ہے لیکن جب اللہ اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے تو یوں چلا جاتا ہے کہ گویا کبھی پکارا ہی نہ تھا (۱۰:۱۲)

۳۔ انسان کھلا جھگڑالو ہے (۴ : ۱۶ وغیرہ)

۴۔ انسان بھلائی کی بجائے ان چیزوں کو مانگتا ہے جو اس کے لئے برائی کا موجب ہوں۔ یہ بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے (۱۷:۱۱)

۵۔ انسان بڑا ناشکرا ہے (۱۷:۶۷-۱۷:۱۱ : ۸ وغیرہ)

۶۔ انسان کا دل بہت تنگ ہے (۱۷:۱۰۰)

۷۔ انسان ظلوماً جہولاً ہے (۳۳:۷۲) اور

۸۔ ظالم و کفار بھی (۱۴:۳۴)

۹۔ مفاداتِ عاجلہ سے محبت رکھتا ہے۔ (۷۶:۲۷)

۱۰۔ جی کا کچا ہے، بے صبرا ہے، بے توفیقا ہے (۱۹ تا ۲۱ : ۷۰)

۱۱۔ انسان سرکشی برتتا ہے (۶ : ۹۶)

۱۲۔ انسان حاسد ہے (۴، ۵ : ۱۲)

۱۳۔ لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کر کے شر کا موجب بنتا ہے (۶، ۵ : ۱۱۴) وغیرہ

ان خرابیوں پر آپ ایک ایک کر کے غور و فکر کریں گے تو یقیناً آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ سب کی سب اکتسابی خرابیاں ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی وہبی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اسے بہترین ہیئت پر پیدا کیا ہے تاہم اس میں ایمان اور عمل کی خرابی پیدا ہو جائے تو یہ اپنے آپ کو نچلی سے نچلی سطح پر بھی گرا کر لے جاتا ہے (۹۵:۴) اسے بہترین توازن پر اس لئے تخلیق کیا گیا تھا کہ یہ مختلف موانع کو اپنے راستے سے ہٹا سکے۔ لہٰذا اس کی سرشت میں تو کوئی خرابی ہو ہی نہیں سکتی (بد باطن، بد گوہر، بد سرشت، بد طینت وغیرہ سب عجمی تصورات کی وضع کردہ ترکیبیں ہیں) فطرتاً یہ پاک صاف ہے اور کسی بھی آلودگی کو ساتھ لا کر پیدا نہیں ہوا اس کے عروج و ارتقا کے امکانات اتنے وسیع اور بلند ہیں کہ کوئی اور مخلوق ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسے طبقاً عن طبق ارتقائی مدارج طے کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے (۸۴:۹) ارض و سماوات کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے ان سب کو اس کے تابع فرمان (مسخر) کر دیا گیا ہے (۴۵:۱۳) لیکن یہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر یا انہیں غلط استعمال کر کے ان کمزوریوں کا شکار ہو جاتا ہے جن کا ذکر مندرجہ بالا فہرست میں کیا گیا ہے ورنہ انسان کے اندر تو یہ تک امکان ہے کہ یہ وحیٔ ربانی کی متابعت سے

Presented by: Rana Jabir Abbas
jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حاصل کردہ قوت کے ذریعے زمان و مکان کی حدود سے بھی باہر نکل سکتا ہے (۵۵:۳۳)

قرآن حکیم کے واضح ارشاد وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ کے مطابق ہر انسانی بچہ اولادِ آدم ہونے کی وجہ سے واجب التکریم ہے۔ بالفاظ دیگر اس کی تکریم و تعظیم کا باعث اس کی وہ "انسانی ذات" ہے جو اُسے تمام دوسری مخلوقات سے ممتاز بناتی ہے۔ یہ "انسانی ذات" سب کو یکساں عطا ہوئی ہے۔ یعنی اگر کوئی پیدائشی طبعی نقص نہ ہو تو حصول علم و عقل کی صلاحیت، جذبات اور اختیار و ارادے کی قوت میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ ان استعدادات میں مقداری اور وصفی کمی و بیشی کا عمل بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ماحول کی نوعیت کے مطابق شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کی حفاظت کرنا، ان کی صحیح نشوونما میں کوشش کرنا، یا ان کو توڑ پھوڑ کر ضائع کر دینا انسان کا اپنا کام ہے۔ اگر یہ اپنی "انسانی ذات" کے ساتھ اپنے رشتہ ملکیت کو مضبوط رکھے گا تو کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی کے اگلے مراحل بآسانی طے کرتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر یہ اپنی ذات سے رشتہ توڑ دے گا تو اس کی "ذات" حیوانیت کی سطح پر ہی رُکی رہے گی اور ارتقا کے مدارج طے نہ کر سکے گی۔ رُک جانا گویا انسانی ذات کا کھو جانا ہے جو بہت بڑا عذاب ہے ——— اور یہ عذاب انسان اپنے لئے آپ پیدا کرتا ہے۔

قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے انسانی صلاحیتیں نشوونما پا کر "انسانی ذات" کو اتنا توانا اور صحت مند بنا دیتی ہیں کہ یہ "زندگی" کی اگلی ارتقائی منزل تک پہنچنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کی نشوونما اس طرح صحیح انداز پر نہ ہو تو یہ آگے بڑھنے سے رُک جاتی ہے۔ یہ قانونِ ارتقا کا بنیادی اصول ہے۔ اس رُک جانے کو قرآن حکیم نے اَلْجَحِیْم کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنے ہی رُک جانا اور روک لینا ہیں۔ تَجَحَّم کے معنے آگ بھڑکانا ہیں۔ تَجَحَّمَ بخل اور تنگدلی کی وجہ سے جل بھن جانے کو کہتے ہیں۔ ترقی کے رُک جانے کے احساس کی شدت سے جو آگ انسان کے دل میں بھڑک اٹھتی ہے۔ (۱۰۴:۷-۶) وہ اس کی امیدوں کی کھیتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ "زندگی" جوئے رواں ہے۔ جونہی اس کی روانی رُک گئی یہ ساکن، بدبودار جوہڑ میں بدل گئی۔ جہنم کے بارے میں بعض اہلِ لغت کا خیال ہے کہ یہ عربی زبان ہی کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں گہرا، عمیق۔ جیسے رَکِیَّۃٌ جِہِنَّامٌ گہری تہ والے کنوئیں کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں یہ عبرانی زبان سے آیا ہے جی ھنوم ایک وادی تھی جہاں انسانوں کو مولوک دیوتا کے آگے ذبح کر کے جلا دیا جاتا تھا۔ ان معنوں میں جہنم کے معنے ہوں گے "انسانیت کی قربان گاہ"۔ گہرے کوئیں میں پڑا ہوا آدمی جس طرح "ارتقائے ذات" کا سفر جاری رکھنے سے رک جاتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اَلْجَحْمَۃُ ہر اس بڑی آگ کو کہتے ہیں جو کسی گہرے گڑھے میں بھڑک رہی ہو۔ تیسرا لفظ ھَاوِیَۃٌ بھی غور طلب ہے۔ ھَوٰی کے معنے ہیں اوپر سے نیچے گرنا۔ اَلْھَوٰی انسانی جذبات اور خواہش کو بھی کہتے ہیں۔ جو انسان کو شرف اور امتیاز کی بلندیوں سے گرا کر حیوانی سطح کی پستیوں پر لے آتے ہیں۔ پستیوں کی زندگی ہاویہ ہے جہاں نَارٌ حَامِیَۃٌ (بھڑکتی آگ) کے سوا کچھ نہیں۔ ارشاد ہے کہ جو کوئی غلط راستے پر چل کر جا رہے انعامات سے محروم رہ گیا وہ پستیوں میں جا گرا (۲۰:۸۰)۔

علم KNOWLEDGE: کے ساتھ جو دوسری استعداد "انسانی ذات" کو عطا ہوئی ہے وہ عقل (INTELLECT)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یا تفہیم (UNDERSTANDING) ہے۔ عقل ان باتوں کا جائزہ لیتی ہے جو علم اس کے سامنے رکھتا ہے یہ ان باتوں کی اچھائی اور برائی کو الٹ پلٹ کر جانچتی پرکھتی ہے اور پھر دلائل و براہین کی مدد سے کسی نتیجے پر پہنچتی ہے پھر تفہیم اس پر حکم لگاتی ہے عقل یہ بھی فیصلہ کرتی ہے کہ جذبات اور اختیار و ارادے کو کس حد تک آگے جانا چاہیئے۔ اور کہاں پہنچ کر رک جانا چاہیئے۔ جذبات اپنے طوفانی مزاج کی وجہ سے عقل کی حدبندی اور ممانعت کو قبول نہیں کرتے۔ یہ سرکشی اور طغیان کو پسند کرتے ہیں اور ہر قیمت پر اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ خواہشیں بے لگام ہونے کی طرف مائل رہتی ہیں۔ جبکہ عقل انہیں اپنا تابع فرمان رکھنا چاہتی ہے۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان شدید کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں انسانی اعمال بری طرح متاثر ہو جاتے ہیں اور انسانی ذات بھی ابھرنے نہیں پاتی۔ عقل اور جذبات کی کشمکش کا قصہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی تاریخ قدیم ہے۔ متوازن اور تعمیری زندگی کے لئے عقل اور جذبات دونوں ضروری ہیں لیکن ان دونوں میں باہمی تائید و تعاون کی فضا ہونی چاہیئے۔ نہ کہ کشمکش کی۔

عقل کی فضیلت میں تو قرآن حکیم نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "صاحبان عقل و فکر ہی ایمان والے ہیں اور یہی تقویٰ شعار ہیں (۱۰: ۶۵)" جو کوئی فہم و فراست سے کام نہ لے اسے رسول کی تبلیغ بھی فائدہ نہیں دے سکتی (۲۷:۴۰) اہل جہنم کہیں گے کہ اگر ہم عقل و فکر سے کام لیتے تو آج یہاں نہ ہوتے (۶۷ : ۱۰)

عقل احتیاط اور صبر و تحمل کا سبق دیتی ہے۔ جلد بازی سے روکتی اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا تقاضا کرتی ہے جبکہ جذبات خطرات میں کود پڑنے کے لئے اکساتے ہیں۔ عقل کہتی ہے چھلانگ لگانے سے پہلے دیکھ لو کہ آگے کہیں آتش نمرود کا الاؤ تو نہیں ہے۔ جذبات کہتے ہیں ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!

برٹرینڈ رسل کہتا ہے "جذبات کے عنصر کے بغیر زندگی بے کیف، بے مزہ، خشک اور سپاٹ ہو جائے گی اور ان کے ساتھ زندگی گزارنا ـــــ انتہائی خطرناک ہے!

فکر انسانی کی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ عقل نے جب کبھی اپنی قوت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اسی وقت اس کے خلاف جنگ آرائی کا محاذ قائم ہو گیا ہے۔ عقلیت کے ہر دور کے فوراً بعد عقلیت کے برخلاف بغاوت کا دور شروع ہوتا رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی عقلیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ آج ہم اس کے خلاف پیدا ہونے والے ردعمل کو دیکھ رہے ہیں۔ طویل مدت تک عقلیت کے بے روک تسلط کے بعد اب اس کے خلاف آواز اٹھی ہے تو ہر طبقے کے لوگوں کی طرف سے یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یورپ میں احیائے علوم کی تحریک کے بعد بلکہ دوران ہی میں شعراء نے احتجاج کرتے ہوئے جذبات کے آزادانہ اظہار کی ضرورت پر زور دیا۔ اہل تصوف نے علی الاعلان کہہ دیا کہ انسان کی رہبری عقل کی نسبت جذبات کہیں زیادہ بہتر انداز پر کر سکتے ہیں۔ اور تو اور فلسفی بھی عقلیت کی بالادستی کے خلاف بول اٹھے۔ شوپن ہائر نے کہا کہ کائنات کے اندر جو اندھی قوت [illegible] کام کر رہی ہے وہ عقل سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ کیونکہ اس نے عقل کو اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رکھا ہے۔ برگساں نے علم لدنی [illegible] کے گیت گانے شروع کر دیئے اور عقلیت کے خلاف پورا محاذ جنگ قائم کر ڈالا۔ پھر ان سب نے مل کر اور علم الحیات کے ماہرین کا تعاون

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حاصل کر کے عقلیت کا تخت چھین لیا۔ علمائے نفسیات بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرائڈ کی سربراہی میں اس نظریے کو غلط قرار دے دیا کہ انسان عقل کی روشنی میں ہی اپنی زندگی مرتب کرتا ہے کیونکہ محض عقلیت پسندی ہے۔ فرائڈ کے نظریات کے مطابق "غیر عقلی لاشعور" انسانی زندگی میں عقل کی نسبت کہیں زیادہ دخیل ہے۔ بلکہ عقل تو اس کے آگے محض غلام کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ الغرض جذبات پرستی نے وہ طوفان کھڑا کیا کہ خدا کی پناہ!

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جب عقل جذبات پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتی ہے تو یہ صرف ہتھیار ہی نہیں ڈال دیتی بلکہ اس کی غلام بن کر رہ جاتی ہے۔ جذبات کا اس طرح عقل پر سوار ہو جانا انسانیت کا بہت بڑا المیہ ہے۔ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں عقل کا رجحان ہمیشہ اسی طرف رہتا ہے کہ یہ خواہشات کا آلہ کار بنی رہے اور وہی کچھ کرے جو خواہشات اسے کرنے کا حکم دیں۔ اس کا کام ہی یہی ہے کہ ہم بے شعوری میں جو مقاصد اپنے لیے مقرر کر لیں یہ اُن کی تکمیل کرے جو کچھ ہم کسی جبلت کے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں عقل ہمیشہ اس کے خلاف بہانے تراش لاتی ہے اور جن "قدروں" پر ہم فطرتاً ایمان لانا چاہتے ہیں عقل ان کے حق میں دلائل گھڑ لاتی ہے۔ لہٰذا عقل وہ قوت ہے جو دھوکے سے ہمارے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیتی ہے کہ جس چیز کے "سچا ہونے" کی ہم خواہش رکھتے ہیں وہ واقعی سچی ہے۔ الغرض انسانی سوچ جذبات کے پیچھے پیچھے اس طرح چلتی ہے جس طرح کوئی بھوکا شکاری جانور اپنی ناک کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

پست جذبات کی اندھی پیروی جس طرح انسان کو خود فریبی میں مبتلا کر دیتی ہے، اس کی طرف قرآن حکیم نے اس سے بھی زیادہ سخت لہجے میں اشارہ کیا ہے "بھلا دیکھو تو سہی اس شخص کو جس نے اپنے پست جذبات و خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور اللہ کے قانون نے باوجود اس کے علم و دانش کے، اسے راہ سے بھٹکا دیا ہے، مہر لگ گئی ہے اس کے کان پر اور اس کے دل پر، اور پردہ پڑ گیا ہے اس کی آنکھوں پر۔ اب کون راہ پر لائے گا اسے سوائے اللہ کے؛ سو کیا تم غور و فکر نہیں کرو گے ؟ (۴۵ : ۲۳)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جب عقل پر جذبات غالب آ جاتے ہیں تو پھر عقل ہماری مددگار اور معاون ہونے کی بجائے ہمارے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ لیکن غور فرمائیے یہ قصور بھی تو ہمارا اپنا ہے کہ ہم جذبات کو عقل پر سوار ہونے دیتے ہیں۔ قرآن حکیم کی رہنمائی پر چلنے والی متوازن اور ارتقا یافتہ شخصیت کی عقل جذبات کی رَو میں کبھی نہیں بہہ جاتی۔ بلند کردار اور پختہ سیرت کے انسان اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کو ایک عقلی نظام کے تحت ہم آہنگ اور مربوط بنا لیتے ہیں اور اس طرح عقل ان کو کنٹرول میں رکھتی ہے۔ حیوانی جذبات کو اس عقلی نظام میں دبایا نہیں جاتا بلکہ انہیں ان کے صحیح مقام پر رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا عقل کو بھی، انسانی ذات کی دوسری صلاحیتوں کی طرح تربیت دینے کی ضرورت ہے، تاکہ اس سے صحیح فائدہ اٹھایا جا سکے۔ عقل تو وہی کردار ادا کرے گی جس کے ادا کرنے کا حکم اسے دیا جائے گا۔ جذبات اور عقل کے درمیان تصادم یا کشمکش کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو دبا دیا جائے۔ بلکہ اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ ان دونوں میں توازن پیدا کیا جائے دونوں کو مناسب تربیت دی جائے تاکہ دونوں ہم آہنگ ہو کر "انسانی ذات" کے ارتقا میں ممد و معاون ہوں۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عقل اور جذبات دونوں انسان کے نہایت قیمتی اثاثے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی بالیدگی کا موقع نہ دیا گیا تو انسانی شخصیت لاغر، خمیدہ کمر، ضعیف اور ناتوان رہ جائے گی۔ لہٰذا ہمیں قدرت کے ان دونوں عظیم عطیات کے درمیان باہمی تعاون اور ہم آہنگی کی فضا قائم کرنی ہوگی، اور یہ کام وحیٔ ربّانی کی تربیت یافتہ عقل ہی کر سکتی ہے، کیونکہ جذبات اندھے ہوتے ہیں، اندھیرے میں رہتے ہیں اور اندھیرے ہی کو پسند کرتے ہیں، یہ نہ اپنی رہنمائی کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو راستہ دکھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس عقل خود اپنا جائزہ بھی لے سکتی ہے، اپنا محاسبہ بھی کر سکتی ہے اور اپنی حدود بھی متعین کر سکتی ہے۔ جذبات کو بالکل الگ چھوڑ دیا جائے تو یہ عقل پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن عقل کے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ یہ جذبات کا صحیح مقام متعین کرے اور انہیں اپنے مقام سے اِدھر اُدھر نہ ہونے دے۔

ابھی ہم نے اشارہ کیا تھا کہ عقل کو بھی تربیت دینے کی ضرورت ہے اور یہ تربیت وحیٔ ربّانی کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتی کیونکہ عقل سے بالاتر علم صرف یہی ہے۔ ایسا ہم نے کیوں کہا؟ آیئے اس سوال کا بھی تجزیہ کر لیتے ہیں۔ موجودہ دور کی انتہائی ترقی یافتہ سائنس کا اصرار ہے کہ اس پُراسرار کائنات کے بارے میں جتنا علم بھی ہمیں حاصل ہوا ہے وہ عقل کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ یہ علم کتنا ہی قلیل اور ناکافی کیوں نہ ہو بہرحال بیش قیمت اور قابل قدر ہے۔ سائنسی تحقیقات عقل کی افادیت کا بحدِ کمال اعتراف کرتی ہے۔ سائنس نے واقعی کربناک مصیبتیں جھیل کر اور سخت مشقتیں اٹھا کر آہستہ آہستہ ہمارے ذخیرۂ علم میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس سے یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا سائنسی تحقیقات کے علاوہ علم کا کوئی اور میدان بھی ہے یا نہیں؟ کیا وہ علم ناقص اور بے کار نہیں کہلائے گا جو فطرت کو تسخیر کرتا چلا جائے لیکن اس تسخیر سے جو حاصل ہو اس کا مصرف یا مقصد نہ بتائے؟ انسانیت کو تو ضرورت ہے اس "دانائی" کی جس کا تعلق زندگی کے مقاصد اور ان کی حسن کارانہ تکمیل سے ہو۔ اس گوشے میں عقل ہمیں جو مشورہ دے گی وہ اس علم پر مبنی ہوگا جو اس کے پاس ہے یعنی اگر اس کا علم ناکافی ہے تو یقیناً اس کا مشورہ بھی ناکافی ہوگا۔ عقل کا مشورہ دینے کا "طریقہ" کیا ہے: یہ بھی سن لیجئے۔ جب آپ اس سے پوچھیں گے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ تو یہ کہے گی میرے پاس ایک تجویز ہے اس پر عمل کر کے دیکھ لو۔ آپ نے عمل کیا لیکن تجویز کارگر ثابت نہ ہوئی۔ آپ نے عقل کو پھر طلب کیا: بھئی تمہاری تجویز تو ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اچھا، اس نے جواب دیا تو لیجئے ایک اور تجویز ہے اس پر عمل کر کے دیکھئے۔ اگر یہ مشورہ بھی ناکام رہا تو آپ کی عقل کوئی اور تجویز پیش کرے گی اور اس طرح سہو و آزمائش و خطا (TRIAL AND ERROR) کا صبر آزما اور کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری ہو جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ عقل اس کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ سائنس کی ترقی بھی بار بار کی آزمائش و خطا کی مرہون ہے۔ تاہم زندگی کے مقاصد کے تعین اور ان مقاصد کی تکمیل کے باب میں آزمائش و خطا کا اصول کام نہیں کر سکتا۔ اس میدان میں ذرا سی خطا بھی پوری انسانیت کو تباہی کے کنارے تک پہنچا سکتی ہے۔ ہاں اگر عقل کے پاس یقینی اور صحیح علم ہو تو پھر اس کا فیصلہ بھی صحیح ہو سکتا ہے اور یہ آزمائش و خطا کی مجبوری سے بھی بچ سکتی ہے۔

عقل کے پاس بلاشبہ بعض ایسی باتیں بھی آ چکی ہیں جنہیں بہت حد تک یقینی کہا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جہاں تک مادّی دنیا اور انسانی جسم کے بارے میں اس کے علم کا تعلق ہے عقل کے پاس خاصی مقدار میں معلومات کا ذخیرہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ اب یہ انسانی جسم کے بارے میں تقریباً تمام سوالوں کے جواب دے سکتی ہے اور اس کے یہ جواب قابلِ اعتماد حد تک یقینی بھی ہیں۔ لیکن انسان صرف جسم ہی کا تو نام نہیں ہے، اس کے پاس "انسانی ذات" بھی ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوسری اور زیادہ اہم "شئے" کے بارے میں عقلی علوم کے پاس جو ذخیرہ واقفیت ہے وہ قلیل اور انتہائی ناقص ہے اور یہ ذخیرۂ واقفیت ہمیشہ ایسا ہی رہے گا کیونکہ "انسانی ذات" مقداری ماپ تول کے پیمانوں سے بالاتر ہے اور سائنسی یا عقلی علوم صرف انہی پیمانوں کو استعمال کر جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی ذات کی رہنمائی صرف ابدی صداقتیں کر سکتی ہیں لیکن ابدی صداقتیں عقل کی رسائی سے ماوراء ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ عقل حقیقت کبریٰ کا ادراک کر ہی نہیں سکتی، جبکہ "انسانی ذات" اپنا ادراک صرف حقیقتِ کبریٰ کی رہنمائی سے کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ نفخ من روحہ ہے اور عقل اس کی ایک ممولکہ صلاحیت ہے پس یہی وہ مقام ہے جہاں عقل کو ہدایت ربانی کی ضرورت پڑتی ہے اور جس کے بغیر انسان مٹی کی پستی سے اوپر اٹھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا ہمیں خاک کی پستیوں سے صرف وہی عقل بلند کر سکے گی جو ہدایت ربانی کی روشنی میں فعال رہے اور اسی سے اپنی تنویر کا رابطہ استوار رکھے اس اعتبار سے ہدایت ربانی گویا عقل کی نارسائی کی کمی کو پورا کر دیتی ہے اور اسے اس مقام پر پہنچا دیتی ہے، جہاں یہ اپنے آپ نہیں پہنچ سکتی۔

اس سوال کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ عملی زندگی میں عقل ہماری دو طرح سے مدد کرتی ہے۔ ایک اس طرح کہ ہمیں جن چیزوں کی خواہش ہوتی ہے عقل ہمیں بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں اچھی اور فائدہ مند ہیں اور کون سی بری اور ضرر رساں ہیں۔ یعنی سود و زیاں کے معیارات کو سامنے رکھ کر یہ چیزوں کے حسن و قبح کو پرکھتی ہے وہ چیزیں جو جسم کی بقا یا بنیادی زندگی کی آسائشیں فراہم کرنے کے لئے سودمند اور لذّت بخش ہیں یہ انکو اچھا قرار دیتی ہے اور جو چیزیں مادی زندگی کی خوشگواریوں میں رکاوٹ ڈالنے والی ہوتی ہیں یا جن سے "زیان" کا اندیشہ ہوتا ہے وہ عقل کے ہاں بری تسلیم کی جاتی ہیں۔ گویا نفع و ضرر کا ترازو ہی عقل کا واحد پیمانہ ہے اور نفع و ضرر بھی صرف اسی ایک شخص کا جو اس عقل کا مالک ہے۔ تاہم عقل کا فیصلہ اچھی اور بری چیز کے انتخاب تک محدود رہتا تو بھی کوئی بات تھی۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ عقل انتخاب کے بعد ترغیب کی طرف بھی چل پڑتی ہے اور انسان کو اپنی منتخب کردہ چیز کے حصول پر اکساتی ہے۔ اگر انتخاب مفید اور نقصان دہ چیزوں تک ہی محدود رہتا تو عقل کی پیروی کرنے والے انسان کو کوئی دشواری پیش نہ آتی کیونکہ سائنس نے مادّی اشیاء کی افادیت اور ضرر رسانی کے سلسلے میں ہمیں بے شمار معلومات فراہم کر دی ہیں اور مفید چیزوں کا انتخاب مشکل نہیں رہا۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہمیں انسانی ذات کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں ہم اس "شئے" کی ہلکی سی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور وہ بھی صرف اس وقت جب ہم "اقدار" کے تجربوں میں سے گزر رہے ہوں یا کسی اخلاقی مساعی میں شعوری طور پر سرگرم عمل ہوں۔ انسانی ذات کے بارے میں جو حقائق اب تک ہم جانتے ہیں صرف یہ ہیں کہ:۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۔ انسانی ذات ایک حد تک آزاد ہے

۲۔ اس میں ارتقا حاصل کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے اور

۳۔ یہ اپنے نمو اور اظہار کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے

اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے بلکہ پورا پورا یقین ہے کہ ہمارے "اندر کے اس جوہر" کے سامنے عظیم الشان ارتقائی منازل ہیں جو اس کی ہمت و استقلال کی منتظر ہیں۔ لیکن جب ہم اپنی عقل سے دریافت کرتے ہیں کہ ہماری ان عظیم الشان منزلوں کا صحیح نقشہ کیا ہے تو عقل ناکام اور پریشان ہو کر بیٹھ رہتی ہے۔ اور ہماری ذرا بھی رہنمائی نہیں کر سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہی بتاتی ہے کہ تم ان عظیم الشان منزلوں تک ضرور پہنچ سکتے ہو بشرطیکہ اپنی دنیاوی زندگی مسلمہ ابدی صداقتوں کے مطابق بسر کرو۔ یہ ابدی صداقتیں یا غیر متبدل اصول کیا ہیں عقل ان کے بارے میں خاموشی اختیار کر لیتی ہے کیونکہ یہ اس کی رسائی سے باہر ہیں۔ عقل اندھیروں میں بھٹک بھٹک کر مجبوراً کسی ایسے نور کی آرزو مند رہتی ہے جو زندگی کی ان دور دراز منزلوں کو روشن کر دے اور اسے ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بچالے۔ یہ نور جس کی جستجو اور آرزو میں عقل بیقرار و سرگردان رہتی ہے، یہ نور جو اس کی ان دیکھی راہوں کو جگمگا سکتا ہے یہ نور جو اسے اندھی گلیوں میں بھٹکتے رہنے سے بچا سکتا ہے، یہ نور جو اسے ظن و تخمین (SPECULATION) کی بھول بھلیوں سے نکال کر صراط مستقیم کی تابانیوں تک لا سکتا ہے وحیٔ ربانی کی قندیل کے سوا اور کہیں نہیں ہے "اللہ اس نور کے ذریعے ہر اس شخص کو جو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، سلامتی اور تکمیلِ ذات کے راستوں کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح اسے تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے" (۵:۱۶)۔

عقل کا دوسرا کام اچھائی اور برائی کے مابین تمیز اور انتخاب کرنے کے کام سے ذرا زیادہ مشکل ہے، اب تک جو باتیں ہوئی ہیں وہ اچھائی اور برائی میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے کی باتیں تھیں۔ اب تھوڑی سی پیچیدگی یوں پیدا ہو جاتی ہے کہ بسا اوقات ہمیں زندگی کے روزمرہ کے معمولات کے دوران بھی کچھ ایسے انتخابات کرنے پڑتے ہیں جو اچھائی اور برائی کی بجائے اچھائی اور اچھائی یا برائی اور برائی کے درمیان ہوتے ہیں۔ ایک برائی اور دوسری برائی کے درمیان سخت مجبوری کی حالت میں (کیونکہ ہر برائی سے بچنا ہمارا اولین فرض ہے) عقل کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ کمتر برائی (LESSER EVIL) کو قبول کر لو۔ لیکن جب دو اچھائیوں کا موازنہ درپیش ہو تو بات مشکل بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی نازک موقع ایسا بھی آ سکتا ہے کہ جس میں ہم یا تو اپنی زندگی کو بچا سکتے ہیں یا دولت کو بچا سکتے ہیں۔ عقل جان بچانے کا مشورہ دے گی۔ اب اگر موقع یوں بن جائے یا جان بچا لو یا عزت بچا لو۔ یعنی جان اور عزت دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرو، تو عقل پہلے تو تھوڑی دیر کے لئے ہچکچائے گی۔ لیکن پھر جان دے دینے اور عزت بچا لینے کے حق میں فیصلہ دے دے گی۔ راہِ صداقت میں جان و مال کی جتنی قربانیاں پیش کی گئی ہیں وہ سب کردار کی اسی بلندی کا ثبوت پیش کرتی ہیں اور عقل کے ان صحیح فیصلوں کے خلاف آج تک کسی کو بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ سوائے البتہ ان چند مادہ پرستوں کے جو اپنے جسمانی وجود ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یا جو لکشمی دیوی کے پجاری کی طرح مال و دولت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ مال و دولت کے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۸۔ وحیٔ ربانی

عقل کی فضیلت اور غور و فکر سے کام لینے کی اہمیت کے بارے میں قرآنی احکام ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ عقل اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ناقص رہتی ہے کیونکہ ابدی اور غیر مبدل صداقتوں تک اس کی رسائی نہیں ہے اور اپنی اسی کمزوری کی وجہ سے یہ اس لائق نہیں ہے کہ انسانی ذات کی نشو و نما میں تنہا کوئی مدد کر سکے چونکہ یہ محسوسات کی دنیا سے آگے بہت زیادہ دُور تک نہیں جا سکتی اس لئے یہ انسان کی دوست، معاون، یا ہتھیار تو بن سکتی ہے اس پر حاکم نہیں بن سکتی۔ عقل اگر جذبات سے مغلوب ہو جائے تو یہ اپنی بصارت اور بصیرت دونوں کھو بیٹھتی ہے کیونکہ جذبات اندھے ہوتے ہیں اور اندھوں کی رہنمائی کے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اُن کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ جذبات کی تند و تیز طغیانی کی رو میں بہہ کر انسانی عقل سے ایسے ایسے بھیانک حادثات اور واقعات "سرزد" ہو جاتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر رونگٹے کانپ اٹھتے ہیں۔ ہم لوگ، جنہوں نے اس دنیا کی زمین پر آنکھ کھولی تو ہر طرف پہلی جنگ عظیم کے شعلے بھڑک رہے تھے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ہیروشیما اور ناگاساکی کے لاکھوں انسانوں کو سوکھے پتوں کی طرح جلتے دیکھا اور اب بڑھاپے میں پہنچے ہیں تو دیکھ رہے ہیں کہ دنیا ایک بار پھر دوزخ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ کرب و بلا میں مبتلا انسانیت عقل مفاد پرست کی چیرہ دستیوں کے تصور سے ہی کانپ رہی ہے۔ ہم نے اندھی جذباتیت کی پیروی کرنے والی اندھی عقلیت پرستی کے اس اندھیرے دَور میں نہ صرف ملوکیت کے تخت و تاج کا پائے حقارت سے ٹھکرایا جانا دیکھا ہے، نہ صرف پیشوائیت کے جُبّہ و دستار کی دھجیاں ہوا میں بکھرتی دیکھی ہیں، نہ صرف قارونیت کے صندوقوں کو زمین میں دھنستے دیکھا ہے۔ بلکہ انسان کی فکرِ نارسا کو گرتے پڑتے اور ٹھوکریں کھاتا بھی دیکھا ہے، ٹولی منگولی سوچ کو چند طبقات کی رہنمائی کرتے بھی دیکھا ہے، متضاد نظریات کے عروج و زوال کا بھی مشاہدہ کیا ہے اور ان کے خطرناک تصادمات کے درمیان معصوم انسانیت کے پسنے کا نظارہ بھی کیا ہے۔ ہمارے سامنے کئی تحریکیں جذباتی آندھیوں کی شدت لے کر اٹھیں لیکن تناور درختوں کی قوت مدافعت سے ٹکرا کر گرد و غبار کی طرح بیٹھ گئیں۔ زمین کا کوئی انچ بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں اس زمانہ وحشت میں خون کی ہولی نہ کھیلی گئی ہو یا ابھی تک کھیلی نہ جا رہی ہو۔ اقتدار اور مال و دولت سمیٹ لینے کی ہوس نے کبھی بالشوزم فسطائیت اور نازی ازم کا روپ دھارا ہے تو کبھی سوشلزم، اشتراکیت، جمہوریت اور عسکریت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے، کبھی انفرادیت، اجتماعیت، قوم پرستی اور سرمایہ داری کے فلسفے تراشے ہیں تو کبھی لادینیت، فنڈامنٹل ازم اور وجودیت کا زہر گھول گھول کر انسانیت کو نیم جان بنایا ہے۔ عقلِ مفاد پرست کے لات و منات بھیس بدل بدل کر سامنے آتے رہے ہیں۔ اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جذبات کے چور دروازوں سے داخل ہو کر ذاتِ انسانی کو تاخت و تاراج کرتے رہے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو جتنے "مذاہب" ہم نے اوپر گنوائے ہیں ان سب کی بنیاد ہمیشہ ایک ہی رہی ہے، یعنی ادنیٰ سفلی خواہشات کی غلامی۔ لیکن اس بنیاد پر کھڑی کی جانے والی دیواروں کے بیرونی پلستر اور رنگ و روپ بدل دیئے جاتے رہے ہیں۔ عقل خود بین و مفاد پرست جب کبھی سفلی مقاصد کی غلامی قبول کر لیتی ہے تو انسانی معاشرہ دریائے خون میں نہا جاتا ہے، قومیں قوموں کو چرنا شروع کر دیتی ہیں، دانہ کوئی بوتا ہے فصل کوئی اور کاٹ کر لے جاتا ہے اور ضعیفوں کے ہاتھوں سے روٹی کا ٹکڑا چھین لینا سب سے بڑی عقلمندی سمجھی جاتی ہے۔

جب پہلی بار کسی جسمانی طور پر طاقتور انسان نے اپنے کمزور ساتھی سے کوئی چیز چھین کر رکھ لی تھی اور طاقت کے گھمنڈ میں آکر کہا تھا کہ کوئی ہے جو مجھ سے یہ چیز واپس لے سکے۔ اور پھر کوئی بھی اس سے وہ چیز واپس نہ لے سکا تو پہلی بار "ذاتی ملکیت" کا تصور ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی لاٹھی کو بھی احساس ہو گیا کہ بھینس اُس کی ہے۔ یہ احساس اور زیادہ قوی ہو گیا۔ جب رزق کے سرچشمے زبردستوں کے قبضے میں آگئے۔ اگلے مرحلے پر اوپر والوں کی نہ صرف ضرورت بلکہ خواہشات تک کو کمزور انسانوں کی ضروریات پر ترجیح دی جانے لگی تو کمزور انسان رزق پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے اور طاقتوروں کی نسل بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگی۔ اس کے بعد دوسروں کی کمائی کھانے کا چسکا ایسا پڑا کہ زیادہ سے زیادہ طاقت اور زیادہ سے زیادہ ملکیتیں حاصل کرنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ عقل مفاد پرست نے نئی نئی اقسام کی "برتریاں" ایجاد کیں۔ استحصالی فلسفے ایجاد کئے محکوموں کو صبر، شکر، قناعت، قسمت کی مجبوری، تاریخی وجوب، تقدیر پرستی اور عدم احتجاج کے درس دیئے گئے اور "خاص افراد و طبقات" کو تحفظات فراہم کرنے کے قوانین بنائے گئے۔ وہ عقل جو وحیِ ربانی کی روشنی سے رہنمائی حاصل نہیں کرتی خواہشات کی غلام بن کر اسی طرح سوچتی ہے۔ عقل ویسے بھی جزئیاتی مطالعے (ANALYTICAL STUDY) کے ذریعے مدرکات قائم کرتی ہے، اور اپنی اس کمزوری کی وجہ سے نہ تو جزئیات کے باہمی روابط کو سمجھ سکتی ہے اور نہ کائنات کو من حیث الکل دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کے وضع کئے ہوئے اصول و قوانین، علوم اور فلسفے، نیز نظامہائے معاشرت ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی طرح چونکہ حواس بھی ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں اس لئے جو علم محض حواس کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے وہ بھی تغیر پذیر رہتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جہاں پر حیوانی سطح کی جبلتیں رک جاتی ہیں یعنی "خیر و شر" کی قدروں کو پہچاننے سے قاصر رہتی ہیں وہاں سے آگے انسانی سطحِ زندگی کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بکری کی جبلت ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ خونخوار جانوروں کی جبلت ہے کہ وہ گوشت کھائیں دوسری چیزوں کو منہ تک بھی نہ لگائیں۔ حیوانی سطح کی جبلتیں یہاں آکر رک جاتی ہیں، آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ دوسرے لفظوں میں بکری کی جبلت اس "قدر" کو نہیں پہچان سکتی کہ وہ صرف اپنے مالک کے کھیت کی گھاس کھائے کسی دوسرے کے کھیت کی گھاس نہ کھائے۔ اسی طرح خونخوار جانوروں کی جبلت میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ وہ جانوروں کا شکار نہ کرے بلکہ کمزور ذی حیات مخلوق کو بھی زندہ رہنے کا حق دے۔ یہاں سے "خیر و شر" یا "قدروں" کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ خیر و شر کی ان قدروں کا تعلق انسانیت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے ہے۔ حیوانیت سے نہیں ہے۔ گویا حیوانیت اور انسانیت کے درمیان فرق صرف قدروں کی پہچان کا اور خیر و شر کے معاملات کو سمجھنے کا ہے۔ قرآن حکیم اسی لئے اُن انسانوں کو بھی حیوانوں سے بدتر قرار دیتا ہے جو خواہشات کے غلام بن کر عقل کھو بیٹھتے ہیں اور اس طرح حیوانیت کی سطح پر آن گرتے ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے پاس وہ کونسا معیار ہے جس کے ذریعے وہ خیر و شر کے درمیان واضح طور پر اور تیقّن کے ساتھ تمیز کر سکتا ہے۔ عقل تو ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ خود غرض اور مفاد پرست ہے۔ اور اپنے مالک کی وفاداری کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ خود عقل کو بھی اپنی اس کوتاہ نظری کا علم ہے چنانچہ بعض اہلِ دل مفکرین نے احساسات کو سامنے رکھ کر کچھ معیارات قائم کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں غیر استدلالی علوم کہا جاتا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ غیر استدلالی علوم عقل کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں ان کی حیثیت کیا ہے، اور ان پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ **ضمیر**۔ کہا جاتا ہے کہ ضمیر (CONSCIENCE) کے نام کی ایک قوّت انسان کے "اندر کی آواز" بن کر یا دل کے خاص فیصلے کی صورت میں سامنے آتی ہے اور صحیح اور غلط میں یا جائز و ناجائز یعنی حلال اور حرام میں تمیز کرنا سکھا دیتی ہے۔ نفسِ لوّامہ کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے۔ یہ بُرائیوں سے روکتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ صرف انہی بُرائیوں سے روک سکتا ہے جنہیں یہ بُرائیاں سمجھتا ہے کیونکہ یہ ان عوامل کے اثرات کو قبول کرتا ہے جو انسان کے اندر وراثت، ماحول، تعلیم و تربیت وغیرہ سے شعوری طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو انسانی بچہ پیدائش سے لے کر عہدِ شباب تک بھیڑیوں کے بھٹ میں پرورش پا رہا ہو اس کے "ضمیر" کی آواز چیرنے پھاڑنے اور کچا گوشت کھا جانے کا مشورہ دے گی، دسترخوان پر بیٹھ کر پکا گوشت کھانے پر ملامت کرے گی، اسی طرح وہ انسان جس نے کسی ایسے خطے میں پرورش پائی ہو جہاں انسانیت ابھی تک حیوانیت ہی میں محصور ہے تو اس میں "ضمیر" نام کی کوئی چیز ہو سکتی ہی نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ "ضمیر" ایک ملکہ یا استعداد ہے جو اکتسابی ہے وہبی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر "حق" کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ تاہم یہ اختیار بھی دے دیا ہے کہ چاہے تو نیکی اور استحکامِ ذات کا راستہ اختیار کرے (تقویٰ) اور چاہے تو اپنی ذات کی شکست و ریخت (فجور) کا سامان کرے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نامی گرامی بدمعاش، ڈاکو اور قاتل اپنے سفاکانہ کارناموں پر علانیہ فخر کرتے ہیں اور بھرے بازاروں میں بڑھکیں ہانکتے ہیں۔ اپنے آپ کو سب سے بڑا بدمعاش کہنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ لیکن کوئی اگر ان کے منہ پر یہ کہہ دے کہ تم بدمعاش ہو تو ان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھتا ہے۔ ابھی جس چیز پر وہ فخر کر رہے تھے اُسے اب گالی اور اپنی توہین سمجھ رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے ہے کہ جس معاشرے میں انہوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی ہے وہ معاشرہ "بدمعاش" کو بُرا جانتا ہے۔ اور بدمعاشی، ڈاکہ اور قتل و غارت کو بُرا سمجھتا ہے لہٰذا معاشرے کے معیاراتِ خیر و شر شعوری اور لاشعوری طور پر ان بدمعاشوں کے ذہن پر مرتسم ہیں۔ گویا ان کا یہ جاننا کہ وہ بُرے ہیں اور ان کے کام بھی بُرے ہیں ان کی ابتدائی تربیت، ماحول کے اثرات اور والدین یا دوسرے لوگوں کے خیالات کے اثرات کی وجہ سے ہے، کسی "ضمیر" نام کی چھپی ہوئی اندرونی قوّت کی وجہ سے نہیں ہے۔ "اندرونی آواز" تو بڑی طاقتور ہوتی ہے یہ کبھی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

سفلی خواہشات کا شکار ہو ہی نہیں سکتی۔ اس طاقتور "اندر کی آواز" کو قرآن حکیم نے ایمان کا نام دیا ہے۔ قوت ایمان جیسی رہنے والی (ضمیر کے یہی معنی ہیں) چیز نہیں ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو ہر فکر، ہر قول اور ہر عمل میں ظاہر کرنے والی چیز ہے۔ شائستہ اور تہذیب یافتہ لوگ جس چیز کو ضمیر کا نام دیتے ہیں وہ نفس لوامہ ہی ہے۔ تاہم نفس لوامہ مختلف معاشروں میں مختلف انداز میں پرورش پاتا ہے اور اپنا فیصلہ اسی خاص ماحول اور خاص تعلیم و تربیت کے مطابق صادر کرتا ہے جس میں اس نے پرورش پائی ہے۔ مثلاً جین مذہب کا پیروکار گوشت کھائے تو اسے سخت ملامت کرے گا۔ لیکن مسلمان گوشت کھائے تو اسے کچھ نہ کہے گا۔ مسلمان کسی حرام چیز کا گوشت کھا لے تو اسے برا بھلا کہے گا لیکن یہ جین مذہب والوں کو کچھ نہ کہے گا۔ بلکہ انہیں آمادہ کرے گا۔ راہزنوں کا "ضمیر" انہیں کبھی مسافروں کو لوٹنے اور قتل و غارت کرنے پر ملامت نہیں کرتا۔ اسی طرح موجودہ دور کے قارونوں کو ان کے استحصالی طور طریقوں پر کبھی نہیں ٹوکتا۔ نہ ہی ان خون آشام طبقات کو ملامت کرتا ہے جو پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے بہانے بنا کر مزدوروں کو مشین کے "ڈھیر" کی مقابلے سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ لہٰذا ضمیر یا نفس لوامہ ہر طبقے میں اس وقت تک الگ الگ رہے گا جب تک غیر اسلامی "طبقاتی نظام" دنیا میں موجود رہیں گے۔ ایک امریکی ماہر تعلیم کہتا ہے کہ ہماری تہذیب کا مقصود و منتہیٰ زیادہ سے زیادہ "اوقات فراغت و آرام کوشی" حاصل کرنا ہے اور اس کا دار و مدار محنت کشوں پر ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"Stated succinctly, the good life depends [illegible] consists in leisure.......Labour must always remain the servant of leisure, with one class of people to work and the other to enjoy the fruits of work......and there must be abundance of luxury goods for maximum enjoyment of the leisuring class". (Modern Philosophies of Education, Brubacher. Reprint 1972, P.34)

لہٰذا سرمایہ داروں کی تعلیم و تربیت اُن کی ذہنی ضروریات کے مطابق الگ ہونی چاہیے اور مزدوروں کی تعلیم و تربیت بالکل دوسرے ماحول میں ہونی چاہیے۔ تاکہ اول الذکر طبقے کا ضمیر زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے پر مطمئن ہو اور محنت کش کا ضمیر اپنے آقاؤں کے لئے کم سے کم اجرت لے کر زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانے پر مطمئن ہو۔ اور اس طرح دونوں کا "مخصوص ماحول کا تربیت یافتہ" ضمیر اپنی مخصوص تربیت ہی کے مطابق فیصلہ کرے۔ بعض بنیادی "قدریں" ہزاروں سالوں سے تمام انسانوں میں مشترک آ رہی ہیں۔ لہٰذا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نفس لوامہ کے بعض فیصلے ان بنیادی قدروں کے مطابق ہوں۔ اگر کہیں ایسا ہوتا نظر آئے تو اسے بھی تربیت ہی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ استحصالی طبقات کے مفاد پر مبنی قدروں کے حق میں اُٹھنے والی "اندر کی آواز" کو نچلے طبقے کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ مثلاً نسلی تفاخر، حسب نسب کے خود ساختہ اصول وغیرہ۔

انسان کی فطرت میں یعنی اس کی تخلیق کے قانون میں حق و صداقت قبول کرنے کی صلاحیت تو یقیناً موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان بغیر کسی خارجی رہنمائی کے اپنے آپ حق و باطل میں تمیز بھی کر سکتا ہے اگر ایسا کر سکتا تو اسے کسی تعلیم و تربیت، کسی مصلح و مشورے، کسی راہنمائی اور کسی تزکیۂ نفس کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ ہر شخص پیدائش ہی سے اپنے آپ نیک ہوتا اور برے ماحول بھی اسے برائی کی طرف مائل نہ کر سکتا۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ نیکی اس کی فطرت کی مجبوری بن جاتی، جیسے گھاس کھانا بکری کی اور گوشت کھانا درندوں کی فطری مجبوری ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ لیکن اللہ کی مشیت کو یہ کسی صورت بھی منظور نہیں ہے کہ "انسانی ذات" کے عنصر ترکیبی غیر فعال ہو جائیں۔ اور ان کے ارتقاء و تکمیل کے مواقع ختم ہو جائیں۔ ارشاد ربانی ہے "اگر اللہ نے چاہا ہوتا تو اس نے تم سب کو "امت واحد" بنا دیا ہوتا۔ لیکن وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے اس میں جو اس نے تمہیں دے رکھی ہے" (۵:۴۸)

لہٰذا یہ جو چنگاری مردہ سے مردہ دل انسان کی راکھ میں کہیں دبی رہتی ہے وہ "نفس لوامہ" ہے اور اسے بھی اسی طرح تربیت و تہذیب و تزکیے کی ضرورت ہے جس طرح نفس کی دوسری صلاحیتوں یعنی حواس، علم، عقل، جذبات و رجحانات اور ارادہ وغیرہ کو تربیت دینا ہمارا فرض ہے۔

۲۔ وجدان (INTUITION): ضمیر کے بعد دوسرا غیر استدلالی علم "وجدان" بتایا جاتا ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں "پالینا"۔ اصل میں یہ شدت ذوق کی ایسی خاص کیفیت کا نام ہے جو وہبی ہے، اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی۔ ذوقِ تحسین یا حسِ مذاق (AESTHETIC SENSE OR APPRECIATION OF BEAUTY) کم و بیش ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ بعض طبائع عام لوگوں کے مقابلے میں حسن سے کچھ زیادہ ہی مضبوط ہیجان و خارجی ہیں، بلند پایہ اشعار کی لطافت اور نازک خیالی نغمات سرمدی کا کیف و سرور، نادر روزگار تصویروں، عمارتوں اور فنی شہپاروں کی دلکشی اور رعنائی ہر انسان کو متاثر کرتی ہے۔ تاہم یہ اثر ہر انسان پر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اثر آفرینی اور اثر پذیری کے بھی خاص لمحے ہوتے ہیں۔ چونکہ حسن فطرتاً گریز پا ہے اس سے حسین سے حسین چیز بھی ہر وقت ایک سا تاثر پیدا نہیں کرتی۔ ان سب باتوں سے زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی فنون لطیفہ کی ان چیزوں سے، فطرت کے دلکش مناظر سے یا حسین صورتوں سے متاثر ہوتا ہے وہ اپنی محسوس کردہ کیفیات کو دوسروں تک منتقل نہیں کر سکتا۔ اس طرح اس کا "وجدان" خالصتاً اس کا اپنا ہی وجدان رہتا ہے۔ لیکن جو ذوق یا وجدان دوسروں تک پہنچ ہی نہیں سکتا وہ انسان کی حیات اجتماعیہ کی رہبری کے فرائض کیسے سرانجام دے سکتا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی فطین اور نابغۂ روزگار شخصیتوں کی پیدائش ہے۔ بڑے بڑے فلسفی، بلند پایہ سیاستدان، شہرۂ آفاق سپہ سالار، نامور فاتحین، فقید المثال اہل علم و ادب، نادر الوجود فنکار، عظیم المرتبت مفکرین و محققین سب اسی زمرے میں شامل ہیں۔ آج تہذیب و تمدن جس نقطۂ عروج پر پہنچ چکے ہیں اور انسان کے آرام و آسائش کے لئے جو [illegible] چیزیں بیکار [illegible] ہو چکی ہیں سب انہی گرامی قدر ہستیوں کی ذہانت، فطانت، محنت اور ایثار کا نتیجہ ہیں تاہم [illegible] کے متعلق یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر "نابغہ" جو اپنے کسی خاص فن یا شعبے میں مہارت نامہ رکھتا ہو [illegible] [illegible] یا نیکی بدی کی تمیز میں بھی دسترس رکھتا ہو۔ بلکہ عام مشاہدہ ہے میں جو بات آتی ہے [illegible]

Presented by: Rana Jabir Abbas

بھی جس کی مکمل تائید کرتا ہے یہ ہے کہ جو شخص جتنا بھی زیادہ ذہین اور فطین ہو گزرا ہے کردار کے اعتبار سے اتنا ہی پست درجے کا انسان ثابت ہوا ہے ' بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد ذہنی قابلیت میں بہت آگے ہوتے ہیں ۔ کیونکہ یہ اگر ذہین اور فطین نہ ہوں تو جرائم کے ارتکاب میں کامیاب نہیں ہو سکتے ' یہ بالعموم دہری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی یہ دہری شخصیت ان کی عیاری ' تخریب کاری اور سنگین جرائم کو چھپائے رہتی ہے " ذہانت " پر تحقیقی کام کرنے والے ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ معاشرے کو تباہی کے دہانے تک لا کھڑا کرنے والے افراد کی تین قسمیں ہیں (۱) عصبی مریض (۲) اذیت پسند سفاک اور (۳) غیر معمولی طور پر ذہین اور فطین لوگ ۔ ان کی تحقیقات مزید یہ بتاتی ہے کہ عصبی مریض چھپ کر اور لاشعوری طور پر بغاوت کرتا ہے ' دوسروں کو اذیتیں دے کر خوش ہونے والا ذہنی مجرم کھلم کھلا اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرتا ہے اور انتہائی ذہین یا فطین شخص عوام الناس کو اپنی ذہانت سے مسحور کر کے اور ان کا مکمل اعتماد حاصل کر لینے کے بعد لاشعوری طور پر معاشرے کو اپنی مذموم خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے ۔

فطانت کا تعلق "عقل" سے ہے ۔ یعنی یہ غیر معمولی عقل اور فہم کی تیزی ہے ' لہٰذا اس کی خرابیاں بھی وہی ہیں جن کا ذکر ہم گزشتہ سطور میں کر چکے ہیں ' اپنے سے بالاتر قوت کی رہنمائی کے بغیر فطانت بھی انسانیت کے در حق سودمند ثابت نہیں ہو سکتی ۔ از خود یہ اس قابل نہیں ہے کہ خیر و شر میں تمیز کر سکے بلکہ اپنے غیر معمولی ہونے کی وجہ سے اس کا رجحان شر کی طرف زیادہ رہتا ہے ۔

۳ ۔ باطنی علوم :- غیر استدلالی علوم کی تیسری قسم باطنی علوم کہتے ہیں یہ علوم سب کے سب اکتسابی ہیں یعنی مختلف مشقوں ' ریاضتوں اور توجہ کے ارتکاز سے ان میں مہارت پیدا ہو جاتی ہے ان علوم میں تصوف (MYSTICISM) ' روحانیت (SPIRITUALISM) اور علم لدنی وغیرہ شامل ہیں ۔

تصوف دنیا کی تقریباً ہر قوم میں موجود ہے اور تاریخ انسانی کے قدیم ترین دور سے کسی نہ کسی رنگ میں چلا آ رہا ہے تاہم اس کی جامع اور مانع تعریف آج تک پیش نہیں کی جا سکی ۔ اس کے دائرے میں داخلی تجربے ' کیفیتیں ' احوال و مقامات اور بے شمار مناسک اور شعائر داخل ہیں ۔ دو کیفیات (۱) خدا کے ساتھ براہ راست کلام ' اور (۲) خدا کے ساتھ مل جانا (وصل یا فنا) کو تصوف کی آخری منزل قرار دیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ کیفیات ہر منتہی صوفی کی اپنی اپنی ہوتی ہیں اور ان میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا ۔ نہ ہی کوئی " پہنچا ہوا " ان کیفیات کو کسی دوسرے سے محسوس کرا سکتا ہے یا اسے بتا سکتا ہے یا سمجھا سکتا ہے ' یہ بالکل انفرادی نوعیت کے تجربے ہی علم بالحواس ' اشراقی علم یا عقلی یا بصیرت کی مدد کے بغیر ایک ایسے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں جو کہ دوسروں سے چھپا رہتا ہے ۔ اسی لئے اسے باطنی ذریعہ علم کہا جاتا ہے ۔

اس علم کے حاصل کرنے کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جب نفس انسانی باطن کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو وہاں اس حقیقت کل میں جذب ہو جاتا ہے جو کائنات کے رگ و ریشے میں جاری و ساری ہے ' اس طرح گویا نفس انسانی اور حقیقت مطلقہ (ABSOLUTE REALITY) ایک ہو جاتے ہیں اور انسان براہ راست یعنی کسی ذریعہ یا واسطے کے بغیر حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے چونکہ حقیقت مطلقہ تمام مادی نسبتوں سے پاک ہے اس لئے نفس انسانی بھی اس کے ساتھ اسی صورت میں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پیوست ہو سکتا ہے، جب یہ خود تمام مادی تعلقات سے منزہ ہو جائے۔ اس طرح کی تنزیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ بنیادی لذائذ سے قطع تعلق کرکے قلب و نظر کو آئینے کی طرح صاف بنالے یہاں تک کہ دنیا کے تمام نقوش، تصورات پسندیدگیاں، ناپسندیدگیاں، محبتیں، نفرتیں بلکہ محسوس اشیاء کے خیالات بھی مٹ جائیں۔ ترک دنیا سے شروع کرکے ترک ترک تک کے تمام مراحل طے کرنے کے لئے جانکاہ ریاضتیں اور سخت مجاہدے کرنے پڑتے ہیں۔

تصوّف کی خاص باتیں یہ ہیں:۔

۱۔ خدا اور بندے کے درمیان براہ راست ربط و کلام (باطنی علم)

۲۔ باطنی علم کے مقابلے میں ادراکی علوم کچھ حقیقت نہیں رکھتے کیونکہ یہ سب ظنی اور قیاسی علوم ہیں جبکہ صحیح اور یقینی علم صرف باطنی علم ہے

۳۔ یہ جو کائنات محسوس شکل میں ہمارے سامنے ہے یہ محض فریب اوہام اور "حلقۂ دام خیال" ہے۔ حقیقی وجود صرف خدا کا ہے۔ محسوس کائنات اس حقیقی وجود کا مظہر ہے۔

۴۔ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ نفس انسانی حقیقت کلی میں جذب ہو جائے (یہیں سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ تصوّف یکسر انفرادی اور داخلی کیفیات کا نام ہے)

۵۔ انسان جتنا مادی آلائش سے دور ہوتا چلا جائے گا اس کی "روحانیت" ترقی کرتی چلی جائے گی اس ترقی کا ظہور پیش گوئیوں اور کرامتوں سے ہوتا ہے۔

ظہور اسلام سے پہلے دنیا میں چار بڑے مذاہب موجود تھے یہودیت۔ نصرانیت، مجوسیت اور بدھ مت۔ مجوسیت اور بدھ مت میں وحی ربانی کا کوئی خاص اور نمایاں تصور موجود نہیں تھا۔ لیکن یہودیت اور نصرانیت میں یہ تصور موجود تھا۔ تاہم نبی کی وحی اور صوفی کے کشف و الہام میں تھوڑا سا فرق ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس درجے کا نبی مانتے تھے اس مرتبے کا نبی اپنے دوسرے انبیاء مثلاً یرمیاہ، دانیال، الیاہ اور حزقیل وغیرہ [illegible] کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن کہتے ان سب کو "نبی" ہی تھے۔ ان کے ہاں نبی کا معنی تھا پیش گوئیاں کرنے والا (PROPHET) چونکہ سب کے لئے ایک ہی لفظ تھا اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ وحی ربانی اور ولی کے الہام میں فرق کرتے تھے یا نہیں۔ ان لوگوں کو جنہوں نے انجیلیں مرتب کی ہیں عیسائی سینٹ (SAINT)، سنسکرت، سنت کہتے ہیں۔ تاہم ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم مرتبہ نہیں مانتے، یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقام الوہیت پر فائز ہیں اور اس مقام پر اور کوئی ان کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ انجیلوں کے ان مرتبین کے ہاں "اولیاء" کا [illegible] چلا ہے ان اولیاء کے کشف و الہام اور رسول کی وحی میں فرق صرف اصطلاحی ہے ورنہ نوعیت دونوں کی ایک ہے۔

فلسفہ (عقلیت) اور باطنیت دونوں کی ابتدا یونان سے ہوئی ہے اور قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئی ہے۔ افلاطون کے ہاں آکر یہ دونوں اکٹھے ہو گئے ہیں تاہم افلاطونی فکر کی اہمیت اس کی باطنیت کی وجہ سے زیادہ ہے سب سے پہلے افلاطون ہی نے یہ تصور پیش کیا کہ عالم محسوسات سے بالاتر ایک عالم امثال ہے جس کا وجود حقیقی ہے جبکہ عالم محسوسات کا

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وجود نفس اس کا عکس ہے، عالم امثال یا حقیقی عالم سے متعلق حواس ہمیں کچھ نہیں بتا سکتے۔ اس کا علم صرف باطنی طریق سے ہو سکتا ہے۔ افلاطون کے بعد اس کا ہم خیال فلسفیوں نے افلاطونی فکر کو آگے بڑھایا۔ پھر ہوا یوں کہ فلاطینس نامی ایک فلسفی رومی لشکر کے ساتھ ایران پہنچا۔ وہاں اس نے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی اسی طرح ایک فلسفی اپالونیئس نے ہندوستان کے برہمنوں سے ہندی تصوف سیکھا اور کچھ عرصے کے بعد یونانی فلسفہ ایرانی اور ہندی فلسفوں کے آمیزے سے ایک نیا مذہب بن گیا جسے نو فلاطینی فلسفہ کہتے ہیں۔ اس نئے مذہب کا مرکز سکندریہ تھا۔ یہودی مذہبی پیشوا فیلو (PHILO) نے اپنے اعتقادات اور نو فلاطینی فلسفے کو ملا کر یہودی تصوف کی بنا ڈالی، اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ شریعت موسوی معرفت اور طریقت میں بدل گئی۔ اب تورات کے معنے بھی ظاہری اور باطنی دو قسم کے ہو گئے اور باطنی معنے صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے۔ عقیدہ صرف یہ ہو گیا کہ تورات کے اصل معنے اس کے الفاظ میں نہیں ہیں ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام سے پوشیدہ ہے۔

جب عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا تو تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ آپ کی تعلیم ہر سچے نبی کی تعلیم کی طرح ان یہودی پیشواؤں کے خلاف صدائے احتجاج تھی، اس لئے یہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد عیسائیت خود خانقاہیت کا شکار ہو گئی۔ اور اس کے سینٹوں نے اپنے اپنے مراکز قائم کر کے تصوف کو منظم کیا۔ پھر ہر مقام سے یہ الفاظ دہرائے جانے لگے :" اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھول لو۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا نکھار کرو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے"۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ علائق، ترکِ خیالات اور ترکِ آرزو کو لازمی قرار دے دیا گیا۔ (نوٹ۔ خانقاہی مسلک پر زیادہ تفصیل سے مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ کتابیں مفید رہیں گی، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس، سپرٹ اینڈ اوریجن آف کرسچین مونیسٹی سزم وغیرہ)

تصوف کی طرح روحانیت کی بھی کوئی واضح تعریف نہیں ملتی مشہور یونانی فلسفی فیثاغورث کو روحانیت کے نظریئے کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ ایرانی مجوسیت یزدان اور اہرمن دو خداؤں کو مانتی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، مجوسیوں نے ان دو ابدی اور ازلی خداؤں کو نور و ظلمت سے تعبیر کیا ہے۔ جب یونان میں یہ خیال عام ہو گیا کہ یہ دنیا سراب ہے تو فیثاغورث نے دنیا کی ضد میں ایک ایسا عنصر کا تصور پیش کیا جسے اس نے روح (SPIRIT) سے تعبیر کیا، یہاں سے روح اور مادے کی ثنویت کا خیال ابھرا، پھر یہی خیال ہندی تصوف کی بنیاد بھی تھا۔ جب اس مادی دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے تو پھر کسی حقیقی وجود کا ماننا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ "روحِ کل" (پرم آتما) کا عقیدہ وضع ہوا اور یہ مان لیا گیا کہ انسانی روح بھی اسی پرم آتما کا حصہ ہے جو کسی طرح اصل سے الگ ہو کر مادے کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اب واپس اپنی اصل سے مل جانے (وصل۔ وصال) کے لئے بے چین ہے۔ لہٰذا ترکِ علائق سے مادے کی کثافت کو دور کیا جائے یعنی انسانی روح کا تشخص فنا ہو جائے ۔۔ پھر یہ روحِ حقیقی میں مدغم ہو کر بقا حاصل کر سکتی ہے، یہ روحانیت ہے۔

افلاطون نے بھی یہی کہا تھا کہ مادی پیکر میں آنے سے پہلے انسانی روح بھی عالم امثال میں مقیم تھی اس دنیا میں آئی ہے تو یہاں بھی اس کے اندر عالم امثال کی یاد باقی رہ گئی ہے (مولانا روم کی مثنوی کا پہلا شعر بھی جس میں [illegible] بھی کس دردناک لہجے میں بنسری (نے) اپنے اصل وطن نیستان کے فراق کی داستان کہہ رہی ہے) چنانچہ [illegible] ہے کہ روح

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی اس "یاد" کو تقویت دی جائے تاکہ یہ طاقتور "یاد" روحِ حقیقی کو پہچان لے (پہچان لینا، معرفت۔ عرفان) جس طریقے سے یہ معرفت حاصل ہوتی ہے اسے کشف یا الہام کہتے ہیں۔ چونکہ بقول افلاطون روحِ حقیقی حُسنِ ازلی ہے اس لئے تحسینِ حسن یعنی "عشق" اس معرفت کا ذریعہ ہے۔

اسلام سے پہلے تصوّف اور روحانیت اسی انداز سے نظریاتی لباس میں جلوہ افروز تھے۔ عملی صورتیں البتہ مختلف تھیں اور بعض عناصر نے انہیں انتہائی غلط طریقوں سے پیش کر رکھا تھا۔ وحیِ ربّانی نے تمام سابقہ افکار و نظریات کی تطہیر کر کے انہیں بلندیاں عطا کی ہیں۔ انفرادی بجائے پوری انسانیت کے لئے قابلِ عمل بنا دیا ہے۔ جہاں کہیں انسان کی تذلیل کا خدشہ تھا وہاں اس کو یکلخت رَد کر دیا ہے، جہاں کوئی تصوّر یا نظریہ انسانی فلاح و ارتقا کے لئے مُمد و معاون تھا وہاں اسلام نے اس کو مصفّا ارتقا یافتہ اور تعمیری نتائج کا ضامن بنا کر اپنا لیا ہے، اس وقت ہمارا موضوع یہ نہیں ہے کہ ہم اسلام کی سرزمین میں اس عجمی پودے کی درآمد اور بار آوری کے وجوہات پر بحث کریں۔ کیونکہ ہم صرف اُن غیر استدلالی علوم کا جائزہ لے رہے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کی اجتماعی زندگی کو فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ تصوّف، روحانیت اور علمِ لدُنّی (اس کے معنے ہیں حقائق کا علم قریب ترین زاویئے سے حاصل کرنا) تینوں علوم اکتسابی ہیں وَہبی یا خداداد نہیں ہیں۔ علمِ لدُنّی کا بہت بڑا مدّاح اور مبلغ برگسان اسے فکر ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت سمجھتا ہے۔ اقبالؔ اس علم کو ذہن اور تعقل کی خصوصیت سمجھنے کی بجائے قلب کی "کوئی عجیب سی کیفیت" مانتا ہے۔ اکتسابی علوم کتنے ہی بلند پایہ کیوں نہ ہوں ظن و تخمین کے احتمال سے مُبّرا نہیں ہو سکتے۔ یہ علوم نیچے سے اوپر کو جاتے ہیں یعنی ابتدائی مشقوں میں سے گزر کر تدریجاً ارتقا کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ علمِ الٰہی کی چونکہ کوئی انتہا نہیں ہے اس لئے نیچے سے اوپر کی طرف بڑھنے تدریجاً بڑھنے والے علوم یہ کبھی نہیں جان سکتے کہ ان کی آخری حد کیا ہے، چنانچہ ان علوم کو کوئی ماہر جہاں کہیں پہنچ کر آگے بڑھنے سے رُک جاتا ہے وہ اسی مقام کو اپنی آخری منزل سمجھ لیتا ہے۔ اس کے برعکس وحیِ ربّانی چونکہ اللہ کا کلام ہے جو براہِ راست قلبِ نبی پر نازل ہوتا ہے اس لئے یہ یقینی اور حتمی ہوتا ہے۔ تنزیل من اللہ کے یہی معنے ہیں کہ یہ علم اوپر کی آخری حد (اللہ) سے نیچے آ کر خود قلبِ نبی میں منتقل ہو رہا ہے۔ اللہ جتنا علم چاہتا ہے اتنا عطا کرتا ہے۔ اس لئے نبی کا علم بھی اللہ کے علم کے برابر نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ کوئی اکتسابی علم یہ دعویٰ کرے، بلکہ یہ تو نبی کے علم سے بھی کمتر سطح پر رہے گا۔ تصوّف، روحانیت اور لدُنّی علوم یقیناً علم ابجد سے زیادہ بلند مقام پر ہیں۔ لیکن ان سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ ذاتی مشاہدات کی اساس پر قائم ہونے کی وجہ سے بالکل انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور وہ بھی ایسی جو دوسروں کو منتقل نہیں کی جا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان علوم میں ارادے اور تخیّل کی کار فرمائی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جس کی وجہ سے انسانی شعور پر ایسے پُر اسرار انکشافات ہونے لگتے ہیں جو عام مشاہدے اور تجربے میں نہیں آتے، چونکہ ان مشاہدات کا تعلق واردات قلب سے ہے اس لئے یہ بنیادی طور پر ذاتی اور شخصی چیزیں ہیں۔ "صوفی" اپنی ذاتی اور انفرادی کیفیات میں ہمیشہ مستی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے عالم میں رہتا ہے اور ایک خاص قسم کی دنیا سے بے خودی میں مستغرق رہ کر گویا اس مادی دنیا سے گم ہو جاتا ہے۔ اگر لمحے بھر کے لئے وہ اس دنیا میں واپس آ بھی جائے تو اس کی یہ واپسی عالم انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ اس کی خبر یا اطلاع آگے کسی تک منتقل نہیں ہو سکتی۔ اگر بفرض محال یہ کسی طرح جزوی طور پر ہی کہی منتقل ہو بھی جائے تو صوفی کی اپنی زندگی کے رویّے، روابط اور معمولات اس کی تائید نہیں کرتے اس کے علاوہ اس سوال کا جواب بھی ہمیشہ نفی میں لیا جاتا ہے کہ کیا تصوّف، روحانیت اور علم لدنّی کو ہر فردِ بشر نظام زندگی کی حیثیت سے اختیار کر سکتا ہے؟

ان وجوہ کی بنا پر ایک مکمل ذاتی اور انفرادی کیفیت کو جو نوعِ انسانی کے لئے عالمگیر سطح پر تو کیا فرد کی سطح کے مسائل بھی حل نہیں کر سکتی "رہبرِ انسانیت" کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ارتقا اور تکمیل یعنی "انسانی ذات" کے ممکنات کا حصول اس طرح ممکن نہیں ہے کہ ہر انفرادی وجود دوسری موجودات سے بے نیاز ہو کر دنیا سے الگ تھلگ زندگی گزار دے یا اپنی ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے اجتماعی مفادات کو قربان کر دے بلکہ ذات کی تکمیل اس بات پر موقوف ہے کہ ہر جزو اپنے کل سے تعاون کرے اور اپنے انفرادی اغراض و مقاصد کو کل کے اغراض و مقاصد کے تابع رکھے جب تک ایک انسان اپنی ذات کے آئینے میں دوسرے انسانوں کی ذات کا مشاہدہ نہیں کرے گا۔ جب تک وہ ملت اجتماعیہ کے "نفس واحد" میں گم ہو کر اپنی انفرادی سفلی ہستی کو مٹا نہ دے گا جب تک وہ انسانیت کی ہمہ جہت ربوبیت کی ذمہ داری قبول نہیں کرے گا اس وقت تک وہ اپنی ذات کی تکمیل کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے گا۔ اگر "من رَّوحِہ" کا ارتقا دنیا کے علائق سے منہ موڑ لینے کا ذریعے ممکن ہوتا تو انبیائے کرام کبھی انسانوں کی دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے۔ خواجہ عبدالقدوس گنگوہی نے معراج مصطفوی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس مقام عروج و کمال پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پہنچ کر واپس انسانوں کی دنیا میں تشریف لائے اگر میں اس مقام مقدس پر پہنچ سکتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ اس پر علامہ اقبال نے صحیح تنقید کی ہے کہ ایک صوفی کو یہی کہنا چاہیئے تھا کیونکہ ہر صوفی کی بڑی سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ جس مقام عرفان و وجدان تک وہ پہنچ گیا ہے عمر بھر اسی کی جلوہ سامانیوں میں کھویا رہے۔ وہ حقیقت کی تجلیات دیکھتا ہے تو انہیں اپنی انفرادی ذات تک ہی محدود رکھتا ہے دوسروں کا اس کا حصہ نہیں بنانا چاہتا۔ اور نہ بنا سکتا ہے۔ صوفیانہ عشق کی تابناکیاں اُسے عالم تحیّر میں لے جاتی ہے جہاں کی وارفتگی کا کیف و سرور اس کی اپنی ذات کے لئے بھی زنجیر پا بن جاتا ہے وہ کسی بھی صورت میں واپس انسانی دُنیا کی طرف نہیں آنا چاہتا۔ لیکن نبی کا مقام صوفی کی آخری منزل سے بھی کہیں زیادہ آگے ہے۔ وہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر بھی انسانی دُنیا سے قطع تعلق نہیں کر لیتا۔ وہ حقیقت کبریٰ کو بالعین دیکھتا ہے لیکن نہ اس کی نگاہ متزلزل ہوتی ہے اور نہ اس کا قلب مضطرب ہوتا ہے بلکہ وہ حقیقتوں میں ڈوب کر بھی تحیّر کو اپنے پاس نہیں آنے دیتا یہ اس لئے کہ اُسے پوری نوعِ انسانی کی تطہیر کرنی ہوتی ہے اور اسے نکبت و ادبار کے قعرِ مذلت سے نکال کر آدمیت کے محترم مقام تک لانا ہوتا ہے۔ چونکہ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے "حیات" کی بلند ترین سطح پر ہے اس لئے اُسے رہنمائی بھی ایسی چاہیئے جو اُسے اپنے بلند مقام سے نیچے گرا نہ دے بلکہ لے اور زیادہ بلندیوں کی طرف لے جائے یہ رہنمائی وحیٔ ربانی کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

صورت میں وہ عظیم ترین انسان دیتے رہے ہیں جو علائق کی دُنیا میں قول و عمل کی یک رنگی کا نمونہ اور مثال پیش کر رہتے ہیں ۔

وہ رہنمائی، وہ ہدایت، وہ تعلیم، وہ پیغام اور وہ ضابطۂ حیات جو انبیائے کرام "ذاتِ انسانی" کی تعمیر و تکمیل کے لیئے لاتے رہے ہیں۔ وہ انسان کے اکتسابی علوم اور غیر استدلالی علوم دونوں سے کہیں زیادہ پاکیزہ، اعلیٰ اور ارفع اور یقینی ہوتا تھا۔ اس لیئے اسے قرآن حکیم نے " اَلعِلمُ (THE KNOWLEDGE) یعنی صحیح ترین علم کہا ہے۔ جس طرح اشیائے فطرت کے قوانین انتہائی محکم، دائماً صادق، بے عیب اور بے نقص ہیں اسی طرح نبی کے دیئے ہوئے قوانین و ضوابط بھی لَا رَیبَ فِیہِ اور ہر لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کا سرچشمہ اور منبع و ماخذ ایک ہی خالق اکبر ہے۔ قرآنِ حکیم نے ان تمام قوانین کو جو جمادات، نباتات، حیوانات، انسان بلکہ ارض و سماوات اور ما فیہما میں جاری و ساری ہیں۔ اور جو کائنات کی ہر مخلوق کو اس کی نوعیت ضروریات کے مطابق عطا کیئے گئے ہیں۔ "وحی" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ "وحی" کیا چیز ہے اور اس نے اشیائے فطرت اور انسان کا رشتہ اس کے ساتھ کس طرح جوڑ دیا ہے۔

اللہ کی ذات تو اس وقت بھی تھی جب یہ کائنات وجود میں نہیں آئی تھی اور اس وقت بھی حی و قیوم رہے گی جب اس کائنات کا ذرہ ذرہ بکھر جائے گا۔ لہٰذا اللہ کی دُنیا صرف یہی دنیا ہی نہیں جس میں ہم رہتے ہیں۔ یا جو ہمیں دُوربینوں سے نظر آتی ہے یا جس کی وسعتوں تک ہمارا محدود علم شاید کبھی پہنچ ہی نہ سکے گا جس نظامِ شمسی میں ہماری زمین واقع ہے اس سے کئی گنا بڑے اور نظامہائے شمسی کے وجود کو ہماری سائنسی علوم بھی تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ ان سے ماوراء بے شمار دوسرے عالمین بھی موجود ہو سکتے ہیں جن کی طرف قرآن حکیم کا ارشاد اشارہ کرتا ہے کہ "جان لو اُسی کا ہے عالمِ خلق اور اُسی کا ہے عالمِ امر، اللہ جو تمام جہانوں کا نشوو ارتقا دینے والا ہے۔ بڑا ہی بابرکتوں والا ہے۔ (۷:۵۴)

اس آیت مبارکہ میں عالمِ خلق اور عالمِ امر کا ذکر فرمایا گیا ہے خَلَقَ پہلے سے موجود مسالے سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ مسالے کا پہلی بار بنانا بَدَعَ یا فَطَرَ کہلاتا ہے۔ عالمِ خلق ان تمام جہانوں پر مشتمل ہے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کیونکہ یہ سب عالمین تخلیق کردہ ہیں یا جنہیں ہم عام طور پر کون و مکان، کائنات اور عالمِ زمان و مکان کے نام سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اولین مسالے (PRIMEVAL MATTER) کو اللہ تعالیٰ نے کیسے پیدا کیا یہ ہم کبھی نہیں جان سکتے کیونکہ ہم زمان و مکان کی دیواروں میں مقید ہیں اور اولین مرتبہ مسالے کو وجود میں لانے کا تعلق اس سے ماوراء عالم امر سے ہے۔ "امر" کے معنے حکم کے ہیں۔ مطلق حکم کسی اور حکم کا منتظر یا پابند نہیں ہوتا کیونکہ اَنائے مطلق کے مکمل اور آزاد اختیار و ارادے کی یہاں عملداری ہوتی ہے۔ "یقیناً تیرا رَبّ اپنے ارادے کے مطابق جو چاہے کرتا ہے" (۱۱:۱۰۷) "وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہیے فیصلہ کرتا ہے" (۵:۱) اور جو چاہے کرتا ہے" (۲۲:۱۸) باقی سب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے لیکن اس سے نہیں پوچھا جا سکتا کیونکہ وہ اَنائے مطلق ہے (۲۱:۲۳) لہٰذا عالمِ امر میں اللہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کا ارادہ ہی حکم اور قانون ہے۔ اصطلاحاً ہم اسے مشیئتِ ربّی کہتے ہیں۔ ہم مشیئتِ ربّی کو نہ جان سکتے ہیں اور نہ اس کے بارے کچھ دریافت کر سکتے ہیں۔ کہ ایسا کیوں ہے یا کیوں نہیں ہے۔ ہمارے سامنے جو کچھ بھی ہے وہ عالمِ خلق ہے اور اسی عالمِ خلق پر غور و فکر کرنے سے ہم اللہ کے قوانین کی حکمت اور اس کی حکمت بالغہ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ سمجھنے کے لائق یہ ہے کہ انسانی عقل ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ کائنات کے حرکی افعال اور متواتر و مسلسل تغیرات کے پیچھے کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں۔ قرآن حکیم بار بار اس حقیقت کو دہراتا ہے کہ ارض و سماوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کئے گئے بلکہ ان کی تخلیق میں ایک عظیم مقصد کارفرما ہے۔ اگر کوئی مقصد نہ ہوتا تو اس کا نظام اس قدر پختہ، بے عیب اور بے نقص نہ ہوتا۔ غور سے دیکھو ہر چیز وہ کچھ بن جانے کی دوڑ دھوپ میں مصروف ہے جو یہ بن سکتی ہے، یعنی ہر چیز اپنی ممکنہ صلاحیتوں کی تکمیل میں رواں دواں ہے، تکمیل کے معنے ہوئے اپنے آپ کو پالینا (SELF-REALISATION) یعنی جو بھی امکانات کسی چیز کے اندر ہیں وہ اپنی اپنی امکانی حد تک نشوونما حاصل کر لیں، کوئی صلاحیت غیر مکمل نہ رہ جائے تاہم یہ تکمیل مطلق تکمیل نہیں ہے بلکہ ہر چیز کی اپنی اپنی امکانی حد تک تکمیل ہے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ صلاحیت اور امکان کے درمیان ایک نسبت ہے، اس اعتبار سے اسے اضافی تکمیل کہا جائے گا۔ "ارتقا" اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعے تکمیل حقیقت بن سکتی ہے، چونکہ ارتقا بغیر تغیر کے ناممکن ہے اس لئے کائنات کے اندر ہر جگہ ہر لمحے "تغیر" کو کارفرما دیکھتے ہیں، قرآن حکیم تخلیق کے اس تغیر دار ارتقا کے عمل کی تائید کرتا ہے۔ بیج سے درخت بن جانے تک کے ارتقائی عمل کی مثال ہم دے چکے ہیں۔ اس مثال کو ذہن میں رکھ کر آپ اشیائے کائنات کے تغیر دار ارتقا کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا۔ کہ ہر چیز کی نشوونما کا سلسلہ اسی ربوبیت کے قانون کے مطابق جاری ہے بعض چیزوں کا تغیر اتنا سست رفتار ہوتا ہے کہ ان کے پہلو بدلتے میں کئی صدیاں گزر جاتی ہیں اور بعض چیزیں اتنی تیز رفتار ہوتی ہیں کہ لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہیں۔ ابتدائی تخلیق سے لے کر تکمیل کی انتہائی منزل تک پہنچ جانے کے سارے نظامِ ربوبیت کو قرآن حکیم نے چار عمومی منصوبوں میں سمیٹ کر جامع اور مؤثر انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ

اس اعلیٰ نشوونما دینے والے "اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں لگا رہ جس نے ۱۔ مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق کی ۲۔ پھر ان میں مناسب اعتدال کیا ۳۔ ان کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دیئے ۴۔ پھر ان کی ان راستوں کی طرف رہنمائی کر دی جس پر چل کر انہیں اپنے اپنے پیمانوں کے مطابق کچھ بن جانا تھا۔

نشوونما اور حصول ممکنات کے اس پروگرام کا مشاہدہ ذروں سے لے کر گردوں تک، نودمیدہ شگوفے سے لے کر تناور درخت تک، جرثومۂ حیات سے لیکر عظیم الجثہ حیوانوں اور انسانوں تک، کائنات کی ہر مخلوق میں کیا جا سکتا ہے، ننھا سا ایٹم بھی جس کو ننگی آنکھ تو کیا خوردبین بھی بمشکل دیکھ سکتی ہے۔ اپنی بناوٹ میں توازن و تناسب اور تقسیم کار کا عجب خیز نظام پیش کرتا ہے اس کے اجزاء میں سے جس کسی کو مسلسل گھومتے رہنے کا حکم ہے وہ اس ہدایت کا بندہ ہے جو ن

Presented by: Rana Jabir Abbas

چرا گھوم رہی ہے۔ اسے یہ بھی ہدایت دی گئی ہے کہ کن حالات میں کیا کرنا ہے کوئلے کو ہیرا بننا ہے تو یہ بھی اپنے نشوونما کے مراحل میں سے گزرتے ہوئے ان قوانین سے کبھی روگردانی نہیں کرے گا۔ جو اس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ جمادات کو بے جان کہا جاتا ہے۔ تاہم یہاں بھی تعمیلِ حکم میں کہیں کوتاہی نظر نہیں آتی۔ "زندگی" نباتی حرکت میں اپنا پہلا جلوہ دکھاتی ہے۔ بیج کو ہدایت دے دی گئی ہے کہ جونہی تمہیں مناسب ہوا، پانی، نمکیات اور روشنی وغیرہ میسر آجائیں تمہارے اندر کے درخت کو جاگ اٹھنا ہوگا۔ پھر مرحلہ وار آگے بڑھتے ہوئے اپنے منتہائے کمال تک پہنچ جانا ہوگا۔ پانی کو ہائیڈروجن اور آکسیجن سے تخلیق کیا۔ یہ الگ الگ دو گیسیں تھیں۔ ان کے لطیف ترین اجزا کو دو اور ایک کی نسبت سے آپس میں یوں ملا دیا کہ گرمی ہو یا سردی یہ یکجان و دو قالب ہو کر رہیں۔ اندازے اور پیمانے مقرر کئے کہ حرارت کی مقررہ حد (۱۰۰ اسی گریڈ) پہنچے تو یہ بخارات بن کر اڑ جائے لیکن نہ گیسیں الگ الگ ہوں نہ ان کے اجزا کے تناسب میں فرق آئے، اوپر کی فضا میں پہنچ کر سردی لگے تو پھر پانی بن کر پیاسی اور خشک کھیتوں کو ترو تازہ کر دے یا برودت بہت زیادہ ہو جائے اور درجۂ حرارت صفر درجہ تک پہنچے تو یہ جم کر ٹھوس شکل اختیار کرلے۔ گرمی سے پگھل کر پھر پانی بن جائے اور نشیب کی طرف بہہ نکلے گھاس کے تنکے سے لیکر حیوانوں اور انسانوں تک کے تشنہ لبوں کو حیاتِ تازہ عطا کرنا اس کا فریضہ ہے، اس فریضے کے ادا کرنے میں کبھی کوتاہی یا بخل سے کام نہ لینے کی اسے ہدایت ہے اور یہ اپنی "عبادت" کی پابند ہے۔ یہ تو پانی کی مثال تھی آپ کے ارد گرد کی تمام چیزیں "خَلَقَ فَسَوّٰی قَدَّرَ فَهَدٰی" کے قانون میں بندھی ہوئی ہیں۔ کسی ایک چیز کو بھی اس قانون سے سرتابی کی جرأت نہیں ہے۔ اللہ نے ہر چیز کو ایک تیز اشارے کے ذریعے سمجھا رکھا ہے کہ کس وقت اور کن حالات میں اسے کیا کرنا ہے تیز اشارے کو "وحی" کہا گیا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنے یہ ہیں، حکم دینا۔ لکھی ہوئی چیز۔ جلدی کرنا۔ تیز کرنا، کتابت (لکھنا) ہر وہ چیز جسے کوئی دوسرے تک پہنچائے خواہ اس کے پہنچانے کا طریقہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے اصطلاحی معنے ہیں اللہ کی طرف سے کسی انسان کو براہِ راست علم حاصل ہونا۔ یعنی ایسا علم جس میں انسان کی ذہنی عقل و فکر کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس قسم کا علم صرف انبیائے کرام تک مخصوص تھا۔ اسے وحی کی اصطلاح یا اللہ کے کلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "کلام" اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حیاتیہ میں سے ہے۔ "انسانی ذات" بھی چونکہ اس کی روح میں سے ایک "پھونک" ہے، اس لئے کچھ کلام اسے بھی عطا ہوا ہے۔ اللہ کی اور کوئی مخلوق اس صفت سے متصف نہیں ہے۔ انسان تک اللہ کا عطا کردہ علم کس طرح پہنچتا ہے اسے ہم ذرا آگے چل کر دیکھیں گے۔ پہلے یہ معلوم کریں کہ اشیائے فطرت یعنی ذی حیات اور غیر ذی حیات مخلوق میں وحی کس طرح کارفرما ہوتی ہے۔ جمادات اور نباتات میں جس طرح یہ کام کر رہی ہے یہ آپ نے اوپر کی مثالوں میں دیکھ لیا ہے یعنی اشیائے فطرت اپنے معمولات و فرائض جس قانونِ تخلیق کے مطابق اپنے آپ بغیر کسی خارجی رہنمائی کے سرانجام دیتے ہیں، اور جو قانون ان اشیاء کے اندر رکھ دیا گیا ہے اسے بھی وحی کہا گیا ہے۔ نباتات میں زندگی کی خفیف سی حرکت پیدا ہوئی تھی، حیوانات میں اختیار و ارادے کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ اپنی زندگی کس طرح جبلی تقاضوں کے تحت گزارتے ہیں انہیں بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے؛

تیرے نشوونما دینے والے نے تو شہد کی مکھی کی طرف بھی وحی کر رکھا ہے کہ پہاڑوں میں

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

> اپنا گھر بنالو اور درختوں میں بھی اور وہاں بھی جہاں لوگ ٹٹیاں باندھتے ہیں۔ پھر کھاتی پھرو ہر قسم کے پھل میووں سے۔ اور پھر چلتی چلی جاؤ اپنے نشوو ارتقا دینے والے کے ان راستوں پر جو تابع فرمان ہو چکے ہیں۔ نکلتی ہے ان کے پیٹ سے ایک چیز مختلف رنگوں والی پینے کی۔ اس میں شفا ہے انسانوں کے واسطے۔ بے شک (اس تمام تذکرے میں) نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ (۱۶: ۶۸-۶۹)

شہد کی مکھی وحی کی تکمیل میں جس اطاعت و انقیاد کا مظاہرہ کرتی ہے اس میں اہل خرد و دانش کے لئے واقعی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ مثلاً اس کا منفرد اور پختہ معاشرتی نظام، اس کا شہد جیسی عظیم نعمت کا تیار کرنا اور اسے بلا معاوضہ تقسیم کرتے رہنا، رنگا رنگ پھولوں کی تلاش میں اس کا دور دور تک نکل جانا اور پھر رستوں کا بھولے بغیر سیدھا اپنے چھتے میں واپس آجانا، یہ سب کچھ اس وحی ربانی کی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کا نتیجہ ہے جو اسے "اس کے قانون تخلیق" کے ذریعے ودیعت کر دی گئی ہے۔ ذرا اور قریبی مشاہدے سے واضح ہوتا ہے کہ شہد کی ہر مکھی کا فریضہ بھی الگ الگ ہے، ایک ملکہ مکھی ہے جس کا فریضہ انڈے دینا اور چھتے کے اندرونی نظام کو سنبھالنا ہے، چھتا بنانے والی معمار مکھیاں اور ہیں۔ پاسبانی کرنے والی مکھیاں اور ہیں، شہد تیار کرنے والی ان سے الگ ہیں اور چھتے کی صفائی کرنے والی ان سے بھی الگ ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے کام میں مصروف ہے، نہ کوئی تصادم ہے نہ آپس میں اختلاف، نہ حسد، نہ کینہ، حالانکہ ایک طبقہ مفت خوروں کا بھی ہے، ہر مکھی اپنے صلوٰۃ و تسبیح کو یعنی اپنے فرائض منصبی کو اچھی طرح جانتی اور پہچانتی ہے۔ اور اپنے ذمہ کام کے پورا کرنے میں مکمل انہماک اور تن دہی سے مصروف عمل ہے، اپنے فرائض کو پہچاننا اور اسے اچھی طرح ادا کرنا ایک کام ہے، اطاعت میں تیزی، سرگرمی اور انہماک دوسرا کام ہے، ان دو کاموں کے لئے قرآن حکیم نے دو نہایت جامع الفاظ استعمال فرمائے ہیں، صلوٰۃ و تسبیح۔ سنئے اور غور فرمایئے کس حسین پیرائے میں قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے:

> کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو کوئی بھی ارض و سماوات میں ہے وہ اور پر پھیلائے ہوئے اڑنے والے جانور، سب کے سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں (۲۴: ۴۱)

"صلوٰۃ" کے مفاہیم کی وضاحت آئندہ صفحات میں ایک علیحدہ عنوان کے تحت تفصیل سے پیش کی جائے گی مختصراً یہ کہ صلوٰۃ بہت وسیع المعنیٰ جامع اصطلاح ہے منجملہ اور معنوں کے بنیادی معنی ہیں کسی کی پیروی کرنا۔ اطاعت و اتباع، پیچھے رہنا، راستے کو نہ بھولنا اور نہ ہٹ جانا۔ قرآن حکیم نے پر پھیلائے ہوئے پرندوں کی صلوٰۃ کا ذکر جس خوبصورت انداز میں کیا ہے وہ توجہ طلب ہے۔ جو لوگ سالہا سال سے فصلی پرندوں کی اڑانوں کا سائنسی انداز سے مشاہدہ کرتے چلے آرہے ہیں ان کا خیال تھا کہ ہزاروں میل تک دور نکل جانے اور کئی کئی مہینوں کے بعد واپس سیدھے اپنے آشیانے والے درختوں والے یہ پرندے شاید اجرام فلکی کی مدد سے یا شاید زمینی نشانیوں کو یاد رکھ کر سمت متعین کرتے ہیں۔ لیکن جب تجربات اور مشاہدات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ابر آلود موسم میں بھی وہ آنکھوں پر رنگدار چشمے چڑھا دینے کے باوجود ان کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

"سمت متعین کرنے کی صلاحیت" اور "فاصلوں کا اندازہ لگانے کی استعداد" میں کوئی فرق نہیں آتا تو انہیں مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ان کے اندر "راڈار" کی قسم کوئی نامعلوم سی قوت موجود ہے جو مقناطیسی لہروں کے ذریعے نہ صرف انہیں راستے کی رکاوٹوں سے باخبر دار کر دیتی ہے بلکہ سمت کو، فاصلے کو اور زمین سے بلندی تک کو صحیح صحیح متعین کر دیتی ہے

تسبیح کے لغوی معنے ہیں تیرنا۔ "مُسَبِّح" وہ گھوڑا ہے جس کی ٹانگیں تیز رفتاری کے باعث زمین کو چھوتی دکھائی نہیں دیتیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا میں تیر رہی ہیں۔ چنانچہ یہیں سے لفظ "تسبیح" کا معنیٰ ہو گیا سرگرمی دکھانا، پوری قوت اور شوق سے کوشش اور کاوش کرنا۔ کسی کام کی تکمیل میں سخت جدوجہد کرنا اور تیزی اور ثابت قدمی سے مصروف عمل رہنا۔ صلوٰۃ اور تسبیح کے ان معانی کو ذہن میں رکھ کر جمادات، نباتات، حیوانات اور ارض و سما کے درمیان پر پھیلائے ہوئے پرندوں کی زندگی کا جتنے قریب سے آپ مطالعہ کریں گے اتنا زیادہ آپ "وحی" کے اس پہلو کا مفہوم سمجھ لیں گے جس میں زمین کی اشیاء کے اندر وحیٔ ربانی کی کارفرمائی کی بات کی گئی ہے۔ اب دیکھئے قرآن حکیم آسمانوں کے بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے۔

ہم نے ہر آسمان میں "اس کے امر کو" وحی کر رکھا ہے (۴۱ : ۱۲)

آج کے خلائی دور میں معمولی تعلیم کا انسان بھی سماوات کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ اب ستاروں، سیاروں، شہابیوں اور بعض آسمانی کرّوں کے حالات بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو چکے ہیں تاہم بہت کچھ معلوم کرنا ابھی باقی ہے، کائنات در کائنات کی بے پناہ وسعتوں کے پیش نظر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری معلومات شاید کبھی مکمل نہ ہو سکیں، جو کچھ ہم یقینی طور پر اس وقت جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ تمام اجرام فلکی اپنے اپنے مداروں میں بغیر رستہ بھولے اور بغیر اپنی رفتار کو گھٹائے بڑھائے، پوری اطاعت اور انقیاد کے ساتھ رواں دواں ہیں کسی سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی، کوئی کسی سے متصادم نہیں ہوتا۔ کوئی غفلت نہیں کرتا۔ اور کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان کی صلوٰۃ و تسبیح کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان کو جو "امر" وحی کیا گیا ہے اسے بھی جان سکتے ہیں۔ یہ وحیٔ ربانی کی بجا آوری کا کرشمہ ہے کہ ہم اور آپ اور کون و مکان کی ادنیٰ اور اعلیٰ مخلوق زندہ ہے اور کارخانۂ قدرت میں خالق اکبر کی بے مثال صناعی کی تحسین و توصیف میں سربسجود ہے ورنہ ایک چھوٹا سا ستارہ بھی اپنا رستہ بھول جائے تو خدا معلوم کتنی قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔

حیوانات کے بارے میں بھی ہماری معلومات خاصی وسیع ہو چکی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حیوانات کو اپنے گرد و پیش کے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے یا اپنے مخالفوں سے نبرد آزما ہونے کی غرض سے کچھ جبلتیں بھی عطا کر دی گئی ہیں اور قلیل سی ذہانت بھی انہیں دی گئی ہے۔ جبلت اس فطری قوت کا نام ہے جس کی بدولت حیوانات، اپنی نوع کی خصوصیات کے لحاظ سے بغیر کسی سے سیکھے، از خود عمل اور ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مرغی اور بطخ کے انڈوں کو ایک ہی مرغی کیوں نہ سیتی رہے۔ جب چوزے نکلیں گے تو مرغی کا چوزہ خول سے باہر آتے ہی زمین پر چونچیں مارنا شروع کر دے گا۔ جب کہ بطخ کا بچہ فوراً پانی کی طرف لپکے گا۔ یہ ان کی جبلت ہے۔ گرگٹ اپنی حفاظت کے لئے اردگرد کے ماحول کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ بعض دوسرے جانوروں میں تو اس سے بھی زیادہ کارآمد جبلتیں دیکھنے میں آئی ہیں، سامن مچھلی کے ننھے ننھے بونگے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اپنی اس ندی کو چھوڑ کر جہاں وہ پیدا ہوتے ہیں کھلے سمندر میں جہاں کوئی راستہ یا راستے کا نشان تک نہیں ہوتا ہزاروں میل دور نکل جاتے ہیں۔ مگر جب واپس گھر لوٹتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی راستہ نہیں بھولتا اور ٹھیک اسی ندی میں پہنچ جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ اسی شکل کی بہت سی اور ندیاں ہوتی ہیں اور جہاں سے اور جتنا ہم غور پھر تے نکلتے ہیں۔ گویا ہدایتِ ربانی نے یہاں بھی جبلت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

جبلت حیوانات کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت بھی پیدا کریں اپنے اور اپنے بچوں کی بقا کے لئے بنیادی ضروریات کو بھی پورا کریں۔ اور ان کی محدود صلاحیتوں کی تکمیل کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہوں ان کا بھی مقابلہ کر سکیں، ذی روح اور غیر ذی روح مخلوقات میں جو نظم اور ضبط دکھائی دیتا ہے وہ اسی ہدایتِ ربانی کا کرشمہ ہے۔

اس مختصر سی لیکن ضروری بحث سے جو نتائج اخذ ہوسکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ وحی یعنی ہدایتِ ربانی کائنات کی ہر چیز کو درجہ بدرجہ نشوونما اور ارتقا کے مراحل طے کرا کے اپنے نقطۂ عروج و تکمیل تک لے جا رہی ہے۔

ب۔ ہر چیز کو مجبوراً اسی راستے پر چلنا پڑتا ہے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے، کیونکہ

ج۔ اسی اطاعتِ کاملہ میں اس کی بقا ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ کائنات کی چھوٹی بڑی، بے جان اور جاندار، ہر مخلوق ایک مقررہ قانون کی اطاعت میں ہمہ تن مصروف ہے اور اس کی یہی فرمانبرداری منشائے فطرت یعنی نشوونما کے انفرادی و اجتماعی منصوبے کی با امن و سلامتی تکمیل کو آگے بڑھا رہی ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کے لئے جو اس ساری کائنات کا مرکز و محور ہے، جو ساری مخلوقات میں تنہا ذی شعور ہستی ہے اور جسے تخلیق کے احسن سانچے میں ڈھالا گیا ہے، کوئی قانون نہ ہو؟ کوئی ضابطۂ زندگی نہ ہو؟ کوئی منصوبہ نہ ہو؟ اور اس منصوبے کو تکمیل تک لے جانے کے لئے کوئی سلسلۂ ہدایتِ ربانی نہ ہو؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کے پاس جو صلاحیتیں ہیں یعنی علم اور عقل، جذبات اور احساسات اور اختیار اور ارادہ، یہ بھی تنہا اسے اس مقام تک نہیں لے جا سکتیں جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے پاس جبلتیں بھی ہیں لیکن بہت کم، صرف اتنی جو اس کی حیوانی سطح کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ اگر اسے کچھ اور جبلتیں بھی دی جاتیں تو اس کے اختیار اور ارادے کی آزادی ختم ہو جاتی اور اس کی باقی صلاحیتیں بھی مفلوج ہو کر رہ جاتیں۔ پھر یہ اپنی ان منہ زور جبلتوں کے ہاتھوں حیوانات کی طرح مجبور ہو جاتا۔

انسان نے اپنی "ذات" کی تکمیل کے علاوہ حسنِ کائنات میں اضافہ کرنے کی ذمہ داری بھی لے رکھی ہے۔ اس نے صحراؤں کو گلزاروں میں بدلنا ہے، راکھ کو باغ بنانا ہے، سمندروں اور پہاڑوں کو، ہواؤں اور فضاؤں کو، ستاروں سے آگے دوسرے جہانوں کو اور جو کچھ ارض و سماوات کے درمیان ہے اس کو تسخیر کرنا ہے اور تسخیر کر کے انہیں پوری نوعِ انسان کے لئے فوز و فلاح کی جنت میں تبدیل کر دینا ہے اس نے تعمیر و ارتقا کے خدائی منصوبے کو آگے بڑھانے کا عہد کر رکھا ہے اور امن و سلامتی کی ضمانت دے رکھی ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اس کے لئے ہدایتِ ربانی کے دروازے بند ہوں اور یہ اپنی محدود اور نامکمل صلاحیتوں سے اتنا بڑا کام لے ہی نہ سکے اس عظیم مخلوق کے لئے بھی اللہ کی رحمت کے دروازے اسی طرح کھلے ہیں جس طرح

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

باقی ساری مخلوقات پر کھلے ہیں۔ وحیٔ ربانی اس کی کمی کو بھی اسی طرح پورا کرے گی جس طرح یہ باقی مخلوقات کی کمی کو پورا کردیتی ہے۔ تاہم جس انداز کی باقی مخلوقات کو دی گئی ہے انسان کو اس انداز کی وحی نہیں دی گئی ضرورت یہی تھی کہ اس دانا بینا مخلوق کے لئے وحی کی نوعیت قدرے مختلف ہو۔ یعنی یہ اس طرح کی ہو کہ یہ اس کے جسمانی اور روحانی ارتقا کے تقاضے بھی پورے کرے اور اسے "مجبورِ محض" بھی نہ بنائے۔

انسانی اعمال نہ تو جمادات کے افعال کی طرح اٹل ہیں اور نہ یہ حیوانی جبلت یا اندھی جذباتیت کی کلی تابعت میں ہیں۔ اسے جو محدود اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اس کی وجہ سے یہ غلطی کرنے میں بھی اسی طرح آزاد ہے جس طرح اچھا یا بُرا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ یہ چاہے اپنے لئے ضرر کا راستہ اختیار کرے اور اس کی سزا بھگتے اور چاہے تو نفع کا راستہ اختیار کرکے مستفید ہو۔ مرغی کا چوزہ تالاب یا بہتے پانی کے قریب بھی نہیں بھٹکے گا۔ اس کی جبلت اسے ڈوبنے سے بچا لیتی ہے۔ انسانی بچہ جبلت کی قید سے آزاد ہے اس لئے وہ اس آزادی کی وجہ سے ڈوب بھی سکتا ہے۔ چونکہ جبلتوں کی مجبوری حیوانوں کی پوری رہنمائی کرتی ہے اس لئے انہیں کسی خارجی تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم انسان جو ان حیوانوں کو سدھاتے ہیں تو یہ اپنی ضروریات کے مطابق اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ورنہ حیوانوں کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم انہیں کسی حد تک سدھا سکتے ہیں، انہیں تعلیم و تربیت نہیں دے سکتے۔ انسانی بچہ کو خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے جبلتیں نہیں دی گئیں لہٰذا اسے تعلیم و تربیت اور تہذیب و ترشید کی ضرورت ہے۔ یہ عقل و فہم سے آراستہ کیا گیا ہے اور عقل و فہم کو سدھایا نہیں جاتا بلکہ تعلیم و تربیت کے ذریعے مہذب اور ارشاد یافتہ بنایا جاتا ہے۔ چونکہ تعلیم یافتگی (EDUCABILITY) صرف انسانی خاصہ ہے اس لئے والدین، اساتذہ اور معاشرے کے بہت سے دوسرے افراد بالواسطہ اور بلاواسطہ اس کی یہ ضرورت پوری کرتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ کم و بیش عمر بھر جاری رہتا ہے۔

انسان اور حیوان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں لیکن اختلافات ان اشتراکات سے کہیں زیادہ ہیں۔ مادیت کے پرستار اشتراکات کو اہمیت دے کر اپنے آپ کو حیوانیت سے بلند تر سطح پر نہیں لے جاتے۔ تاہم جن کو اپنی "انسانی ذات" کی قدر و قیمت کا علم ہے اور جو قرآنی تعلیمات کے مطابق "مِنْ رُّوْحِهٖ" کو تمام دوسری چیزوں سے افضل اور اشرف جانتے ہیں وہ اختلافات پر نظر رکھتے ہیں۔ اشتراکات صرف طبعی زندگی میں ہیں۔ اختلافات وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں سے انسانی سطح کی زندگی کے درمیان ایک نمایاں اختلاف ہے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے انسان نے "بالکل نئی مخلوق" کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ انسانی زندگی کے ابتدائی مراحل کے دوران انسانی بچے کے پاس بہت کم ساز و سامان ہوتا ہے جو کشمکشِ حیات میں اس کا یقینی سہارا بن سکے یہاں تک کہ تعلیم پذیری کی خصوصیت بھی اسے امکانی صورت میں دی گئی ہے یعنی اسے اپنی صلاحیتوں کو بھی خود ترقی اور تکمیل کی حد تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو حیوانیت سے نکل کر آگے بڑھ گیا اور اگر ناکام رہا تو حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے گر گیا کیونکہ بعض چیزیں جو حیوانات کے پاس ہیں وہ ان سے محروم ہے۔ گویا ناکامی کی صورت میں حیوان بھی نہ رہا۔ اسفل السافلین کا یہی معنیٰ ہے!

انسان کی امکانی پوزیشن کو ایک اور پہلو سے دیکھئے، سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل کی خاصیت بھی انسانیت سے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تعلق رکھتی ہے کیونکہ انسان کے علاوہ اور کوئی مخلوق صاحبِ کردار شخصیت نہیں ہے یہ صاحب کردار اس لئے ہے کہ یہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ بھی سکتا ہے اور انہیں پورا بھی کر سکتا ہے جبکہ دوسری مخلوقات تفہیم کی صفت سے عاری ہے۔
اب جو یہ صاحبِ کردار شخصیت اگر اچھائی اور برائی میں تمیز نہ کر سکے تو کیا ہوگا ؟ اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانی عقل و تفہیم کسی چیز کے اچھا ہونے کا فیصلہ کرتی ہے انسان اسے اختیار کر لیتا ہے لیکن بعد میں وہ چیز نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کا اچھا ہونا یقینی طور پر معلوم ہو جائے تو اس کا اختیار کر لینا انتخاب کرنے کے مرحلے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ انسان کی صلاحیتوں میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو اسے جبلت کی طرح مجبور کر کے اچھائی کے راستے پر چلائے۔ "ضمیر" کے معنے واضح ہو چکے ہیں۔ اس کے اندر بھی کوئی قوت ایسی نہیں ہے، جو انسان کو نیکی کا پابند بنائے اور برائی کا کام کرنے ہی نہ دے۔ ضمیر صرف مشورہ دے سکتا ہے یا ملامت کر سکتا ہے۔ چونکہ "جبلی مجبوری" کے نام کی کوئی چیز کہیں بھی موجود نہیں ہے اس لئے ہر انسانی قبیلے، ہر چھوٹی بڑی قوم اور ہر خطۂ ارض کے باشندوں نے اپنے اپنے محدود معاشرے کو متوازن رکھنے کے لئے علیحدہ علیحدہ اخلاقی ضابطے بنا رکھے ہیں۔ یہ اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ انسانی عقل نے ابھی تک کوئی عالمگیر ضابطۂ اخلاق وضع نہیں کیا اور نہ ایسا کرنا اس کے بس کی بات ہے کیونکہ اس کی ذاتی دلچسپیاں اور خود غرضیاں معروضی سوچ کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں لہٰذا عقل کو اپنے سے ماورا ہدایت کی ضرورت ہے جو اسے آفاقیت کا معیارِ صداقت بنا دے اور پوری انسانیت کو عالمگیر سطح پر "نفسِ واحد" بنا دے۔ جو قومیں عقل سے بالاتر کسی ہدایت کو تسلیم نہیں کرتیں وہ اخلاقی ضوابط کو بھی اضافی حیثیت دیتی ہیں اور اسے حالات و ضرورت کے مطابق بدلتے رہنے والی چیز سمجھتی ہیں۔ ان کے اس خیال کو تقویت اس لئے بھی حاصل ہے کہ عملی طور پر دنیا کے کسی بھی ایک معاشرے کا وضع کردہ ضابطۂ اخلاق کسی دوسرے معاشرے کے لئے قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ جو کوئی "قدر" کسی ایک معاشرے کے لئے اچھی ہے وہی قدر دوسرے معاشرے میں ناپسندیدہ شمار ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر معاشرتی عقل اپنے مفادات کو دیکھتی ہے دوسروں کی ضروریات سے اس کا کوئی واسطہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا پوری نوعِ انسانی کو نفسِ واحد سمجھنے والی عقل صرف وہی ہو سکتی ہے جو وحیٔ ربانی کی تربیت یافتہ ہو۔ قرآنِ حکیم نے جو یہ چیلنج دیا تھا کہ جن و انس مل کر بھی اس کی کسی آیت کی مثل نہیں بنا سکتے تو اس کے معنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عام انسانی عقل کی رسائی آفاقیت تک ہو ہی نہیں سکتی۔

انسان صاحبِ عقل و دانش بھی ہے اور آزاد بھی۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنے افعال کا آپ ہی ذمہ دار اور آپ ہی جوابدہ ہے۔ اگر اس کے اعمال کے نتائج اچھے نہ ہوں گے تو اسے کسی قسم کی شکایت کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ وہ داخلی اور خارجی پابندیوں سے گھبراتا بھی ہے۔ لہٰذا اُسے خارجی رہنمائی اس قسم کی ملنی چاہیئے جو

۱۔ اس کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔

۲۔ اسے اپنے فیصلے آپ کرنے کے حق سے محروم نہ رکھے۔

۳۔ اُسی طرح پختہ، یقینی اور غیر مبدل ہو جس طرح باقی مخلوقات کو کنٹرول میں رکھنے والی وحی ہے اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۴۔ اس کی صداقت پر عقل بھی ایمان لائے اور اس طرح یہ خارجی ہوتے ہوئے بھی داخلی تصور کی جاسکے۔

ظاہر ہے اس قسم کی وحی ہر انفرادی شخص کو علیحدہ علیحدہ تو دی نہیں جاسکتی تھی لہٰذا رب کریم کے "امر" نے فیصلہ یہ فرمایا کہ انسانوں میں سے ہی ایک نہایت اعلیٰ سیرت و کردار اور بلند ترین صفات کے مالک کو چن لیا جائے اور اسے ایامِ طفولیت سے لیکر شعور کی پختگی کی عمر تک رسالت کے عظیم ترین فریضے کی بہ حسن و خوبی سرانجام دینے کے لئے خاص طور پر تیار کیا جائے۔ جب یہ عالی مرتبت شخصیت مختلف آزمائشوں میں پوری اتر کر اپنی اہلیت کو ثابت کردے اور عوام الناس بھی از خود اس کی پاک دامنی کی شہادت دینے لگیں تو پھر اس پر آہستہ آہستہ "وحی" نازل کی جائے تاکہ وہ بلند پایہ انسان درجہ بدرجہ اس پر عمل کر کے لوگوں کے سامنے نمونہ پیش کرے اور اپنے قول و فعل کی صداقت و امانت سے یہ ثابت کرکے دکھائے کہ وحیٔ ربانی کی رہنمائی سچی بھی ہے، پختہ بھی ہے، قابلِ عمل بھی ہے اور انسانی ذات کی مادی اور روحانی ترقی میں ممد و معاون بھی ہے۔ نیز یہ کسی ایک خاص طبقے یا معاشرے کی بجائے پوری انسانیت پر فوز و فلاح کے دروازے کھول دیتی ہے۔ انبیاء کرام کو کتنی طویل تربیت دے کر اور کتنے ارتقائی مدارج میں گزار کر چنا جاتا تھا اس کا اندازہ قرآن حکیم کی ان آیات سے لگایا جاسکتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں فرمایا:- "اور ہم نے تم پر (اے موسیٰ) ایک اور بار بھی احسان کیا۔ اور ہم نے تیری ماں کو حکم (وحی) بھیجا۔ اس قسم کا کہ ڈال دے تو اسے صندوق میں اور پھر اسے ڈال دے دریا میں پھر دریا اس کو ڈال دے گا کنارے پر اور ایک میرا دشمن اور اس کا بھی اسے اٹھالے گا۔ اور ڈال دی میں نے اپنی طرف سے محبت تجھ پر تاکہ تو پرورش پائے میری آنکھ کے سامنے۔ جب چلنے لگی تیری بہن اور کہنے لگی: میں بتاؤں تم کو وہ جو اس کی پرورش کرے؟ پھر ہم نے تیری ماں کو واپس پہنچا دیا تاکہ اسکی آنکھ ٹھنڈی رہے اور غم نہ کھائے اور تم نے مار ڈالا ایک شخص کو پھر ہم نے بچا لیا تم کو اس مصیبت سے، پھر ہم نے اور بہت سے مواقع میں تم کو پرکھا۔ پھر تم کئی سال مدین کے لوگوں میں رہے پھر اس کے بعد اے موسیٰ تم ہمارے معیار پر پورے اترے اور (اب) میں نے تجھے چن لیا ہے اپنے لئے" (۳۷ تا ۴۱ : ۲۰)

نبوت کیا ہے اس کا اندازہ آپ نے لگا لیا ہوگا۔ نبوت کا منصب دو باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک یہ کہ نبی ایک طرف تو اللہ کی مشیئت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے سبب براہِ راست اللہ سے وحی (ہدایت) حاصل کرتا ہے اور دوسری یہ کہ انسانوں کے ساتھ قریبی روابط کی وجہ سے وہ اللہ سے براہِ راست حاصل کی ہوئی وحی کو انسانوں تک بالکل اسی شکل میں پہنچا دیتا ہے جس شکل میں یہ اسے ملتی ہے۔ لہٰذا درمیانی واسطے کا پاکیزہ اور خالص ہونا خود وحی کے خالص اور پاکیزہ ہونے کی ضمانت ہے۔ وحی کا مقصد انسان کو کسی خاص راستے پر چلانا یعنی اسے یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا نہیں بلکہ یہ بتا دینا ہے کہ کونسا راستہ اس کے نشوونما کا ہے اور کونسا راستہ اس کی "انسانی ذات" کی شکست و ریخت کا ہے۔ راستے کا انتخاب کرکے اس پر چلنا انسان کی اپنی مرضی، اختیار اور ارادے پر ہے۔ کہہ دو یہ تو اللہ کی طرف سے صداقت ہے پس جو چاہے اس کو مان لے اور جو چاہے اس کا انکار کردے (۱۸:۲۹)

نبوت اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے جو وہ اپنے منتخب کردہ خاص انسانوں کو دیتا رہا ہے۔ نبی کی لوحِ قلب و نظر

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تمام نقوش مثلاً موروثیت (HEREDITY) ، ماحول (ENVIRONMENT) اور اکتسابی علوم (ACQUIRED KNOWLEDGE) سے بالکل پاک صاف اور منزہ ہوتی تھی۔ وحی سے پہلے وہ یہ تک نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں (۴۲:۵۲)۔ وحی انسانی فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی (۵۳: ۲-۴، ۵۳ و ۴۳: ۳) اور نہ ہی کسی ریاضت یا ذاتی محنت سے کبھی کو مل سکتی ہے۔ نبی "صداقت" کو "دریافت" نہیں کرتا۔ بلکہ اللہ اسے اس پر منکشف کرتا ہے۔ اسی لئے اس میں نبی کی اپنی کسی خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ جب اسے نبوت کا عظیم مرتبہ تفویض ہوتا ہے تو اس سے پہلے اس کی توقع یا آرزو تک نہیں ہوتی۔ نبی کا منصب یہ ہے کہ وہ وحی ربانی کے احکام و قوانین کے مطابق پوری انسانیت کی رہنمائی کرے اور اس طرح ایک عالمگیر انقلاب لا کر انسانی تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، قرآن حکیم نے اس بہت بڑی ذمہ داری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: کیا ہم نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا، اور ہم نے تجھ سے تیرا بوجھ ہٹا دیا جس نے تیری پیٹھ جھکا دی تھی (۱ تا ۳ : ۹۴)۔

اللہ کا قانون انسان کے لئے مکمل، بے عیب اور بے نقص ضابطہ زندگی کی صورت میں حضرات انبیائے کرام کی وساطت سے بنی نوع انسان کو ملتا رہا ہے۔ اُسے وحی کہا جاتا ہے۔ یہ وحی نبی کے سوا اور کسی کو نہیں مل سکتی۔ چونکہ وحی خود اتر کر نبی تک پہنچتی ہے اس لئے اس میں انسان کی داخلیت (SUBJECTIVITY) کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اس میں یکسر خارجیت یا معروضیت (OBJECTIVITY) ہوتی ہے اور اس کا اطلاق و نفاذ عالمگیر اہمیت رکھتا ہے۔ چونکہ حقیقت انکشاف صاحب وحی پر خود کرتی ہے اور کسی غیر نبی کو اس کا تجربہ نہیں ہو سکتا اس لئے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوتی ہے یا وہ کس طرح ملتی ہے ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا ہوتا ہے کہ وحی نبی کو منجانب اللہ ملتی ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ اللہ انسانوں کے ساتھ تین طریقوں سے ہم کلام ہوتا ہے، دو طریقے حضرات انبیائے کرام کے ساتھ ہم کلام ہونے کے ہیں اور ایک طریقہ غیر انبیاء کے ساتھ ہم کلام ہونے کا ہے۔ انبیائے کرام کو وحی کبھی "اشارہ سریعہ" کے ذریعے ملتی ہے (جیسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مبارک پر جبریلؑ نازل کرتا تھا ۲:۹۷) یا کبھی "من ورائے حجاب" دی جاتی تھی (جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو) غیر انبیاء کو ہمکلامی کا شرف انبیاء کی وحی کی وساطت سے ہوتا ہے۔ یعنی چونکہ انبیائے کرام اللہ سے حاصل ہونے والی وحی (کلام اللہ) جوں کی توں انسانوں تک پہنچا دیتے تھے اس لئے گویا اللہ عام لوگوں سے بھی ہمکلام ہوتا تھا۔ قرآن حکیم میں کہیں براہ راست الناس سے خطاب ہے کہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ارشاد ہوا ہے کہ "تو کہہ"، اور کہیں غائب کے صیغے استعمال کر کے انسانوں کو ہدایت دی گئی ہے۔ تاہم ہر لفظ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ کلام کی ابتدا ہمیشہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے یعنی اللہ انسان سے کلام کرتا ہے (۵۱:۴۲) نہ کہ یہ کہ کوئی انسان جب جی چاہے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دے خواہ وہ کتنا ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو۔ چونکہ "وحی" ہر اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو کسی کی طرف سے بھیجی جائے اور اس طرح اسے اس کا علم کرا دیا جائے یا اس کی طرف حکم بھیجا جائے خواہ اس کی کیفیت یا طریق کچھ بھی ہو اس لئے بعض لوگوں نے قرآن حکیم کے لفظ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

أوحَينَا سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ غیر نبی کی طرف سے بھی انبیائے کرام کی طرف بھیجی جانے والی وحی کی طرح وحی ہو سکتی ہے۔ اَنبَوَحیٰ جس کے معنے اللہ کی طرف سے براہِ راست رہنمائی حاصل کرنے کے ہیں وہ آخری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مل گئی ہے۔ یہ قرآن حکیم کے اندر کتابت شدہ شکل میں محفوظ ہے، اس کے بعد انسانوں کو ان کی رہنمائی کے لئے اللہ کی طرف سے کچھ اور نہیں ملنے کا کیونکہ یہ مکمل ترین رہنمائی اور لاریب فیہ ضابطۂ زندگی ہے جو کوئی اس کا دعوے کرتا ہے وہ یا تو خود فریب خوردہ ہے یا جان بوجھ کر لوگوں کو فریب دیتا ہے اور ختم نبوت کی مہر کو توڑنا چاہتا ہے۔ کشف، الہام، غیب کی خبریں دینا، جوتش، رمل، علم جفر، علم نجوم یا کسی مجذوب کی بات کا اتفاق سے صحیح ہو جانا یا قیاس و قیافہ کے ذریعے آنے والے واقعات کا علم ہو جانا یا سچے خواب دیکھنا وغیرہ، ان میں سے کسی بات کا تعلق اس وحی سے نہیں ہے جو انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست دی جاتی تھی۔ یہ اکتسابی چیزیں ہیں اور اللہ کی ہدایت میں کسی انسانی خیال یا آرزو کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی لئے اللہ نے اسے اَلْعِلْم (THE KNOWLEDGE) ۱۰، کہا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انبیائے کرام کو وحی الفاظ کے ساتھ ملتی تھی، "خیال" الفاظ کے بغیر سوچا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ اللہ کا کلام ہے، چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے ادا ہو کر ہم تک پہنچا ہے، اس لئے یہ قولِ رسول بھی ہے (۸۱:۱۹)

وحی کے متعلق اب تک جو باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں انہیں ایک بار پھر دہرایا جاتا ہے تاکہ منصبِ رسالت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

پہلی بات یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز، خواہ وہ بے جان ہو یا جاندار ہے، اپنے نقطۂ آغاز سے نقطۂ تکمیل تک پہنچنے کی استعداد رکھتی ہے، اور اسی لئے مصروفِ جدوجہد ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر چیز مرحلے پر اس کے تقاضوں کے مطابق رب کریم و تعالیٰ نے اس کی نشو و نما کے لئے "رہنمائی" کا انتظام بھی فرما دیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان اشیاء کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے رہنمائی دینے والی قوت خارج سے اگر نہیں چلاتی بلکہ یہ رہنمائی ان چیزوں کے اندر رکھ دی گئی ہے اور داخلی طور پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ اشیاء کی اپنی فطرت یعنی ان کا اپنا اپنا قانونِ تخلیق ان کو اپنی امکانی صلاحیتوں کے ابھارنے کیلئے فعال رکھتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ انسان کو اختیار اور ارادے کی صلاحیت کی بنا پر کائنات کی ساری مخلوق پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے۔ اس لئے اسے جو ہدایت اللہ کی طرف سے دی گئی ہے وہ اس کی آزاد اور ذی عقل شخصیت کے عین مطابق ہے۔ انسان جو راستہ چاہے اپنے لئے اختیار کرے وحی نہ تو اس کے انتخاب میں حائل ہوگی اور نہ اس کے عمل کی راہ میں رکاوٹ بنے گی۔ اسی طرح اگر یہ وحی کو تسلیم نہ کرنا چاہے تو وحی اسے انکار کرنے کے حق سے محروم نہیں رکھتی۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اپنی ہدایت انسانوں تک پہنچانے کے لئے اللہ انسانوں میں سے ہی ایسی برگزیدہ ہستی کو چن لیتا تھا جو مسلمہ طور پر صحیح اقدار کا محافظ اور بلند قدروں کا امین ہوتا تھا۔ اسے منصبِ نبوت عطا کیا جاتا تھا اور وہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کی حیثیت سے اللہ سے براہِ راست وحی حاصل کرتا تھا۔ اور اسے جوں کا توں دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا تھا۔ جو لوگ اس پیغام کو دل کی پوری رضامندی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں وہ محسوس طور پر دیکھ لیتے ہیں کہ واقعی وہ ایسے راستے پر گامزن ہیں جو انہیں نشوونما کی طرف لے جا رہا ہے اور ان کی صلاحیتوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ جو لوگ وحی کی صداقتوں کا انکار کر دیتے ہیں وہ پست درجے کی حیوانی یا اس سے بھی نچلی سطح کی زندگی گزار دیتے ہیں گویا تسلیم کرنے والوں کا صلہ "انسانی ذات" کی تکمیل (SELF-FULFILMENT) ہے اور انکار کرنے والوں کا فطری نتیجہ جوہرِ انسانیت کا ریزہ ریزہ ہو جانا (DISINTEGRATION) ہے۔ یہ دونوں صلے اختیار اور ارادے کے آزادانہ استعمال کے قدرتی نتائج ہیں، جو اٹل ہیں۔

چھٹی بات یہ ہے کہ وحی واقعی اللہ کا کلام ہے کیونکہ اس میں نبی کے اپنے جذبات، ذاتی پسند ناپسند اور خواہشات وغیرہ کی قطعاً کوئی آمیزش نہیں ہوتی۔

ساتویں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ وحی انسانی عقل و خرد سے بلند و بالاتر تو ہوتی ہے۔ اس کے خلاف نہیں جاتی بلکہ یہ عقل کی ممد و معاون بن کر اس کی "رسائی" میں وسعت اور اضافہ کرتی ہے اور اس طرح انسان کو اُن اعلیٰ اور ارفع منزلوں تک لے جاتی ہے جن تک پہنچنا، بلکہ جن کو تصور تک میں لانا بھی عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔

عقلیت پرستی اگرچہ دم توڑ چکی ہے تاہم عقلی علوم کی بے پناہ کامیابیوں سے متاثر ہو کر بعض لوگ ابھی تک یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ انسانی عقل ہی انسانیت کے تمام مسائل حل کر سکتی ہے۔ اسے کسی وحی یا اللہ کی طرف سے دی گئی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ تو اللہ کے وجود سے بھی انکار کر دیتے تھے۔ آج کے منکرانِ وحی اللہ کے وجود کو تو کسی نہ کسی رنگ میں مانتے ہیں۔ کیونکہ خود سائنس کے انکشافات "عقلِ کل" کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ عقل کی رہنمائی وحی کے ذریعے سے کرتا ہے۔ گویا اب انکار اللہ کے وجود کا نہیں۔ بلکہ منصبِ رسالت کا ہے جس کا فریضہ اپنی آخری اور ارتقائی صورت میں (۱) تلاوتِ آیات اللہ (۲) تزکیۂ انسان (۳) تعلیمِ کتاب اور (۴) تعلیمِ حکمت تھا۔ منصبِ رسالت کا انکار، عقل کی برتری اور کاملیت کا اقرار ہے اور قوانین و ضوابط کی پابندی سے بچنے کے لئے گریز کی ایک راہ ہے جو عقل نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے نکال لی ہے۔ اللہ کے وجود کا انکار اور منصبِ رسالت کے انکار سے عملی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اسے ہم ایک مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کے وجود کا اقرار کرے یا انکار کرے تو اس کے اس ذاتی قسم کے اقرار یا انکار کا نہ افراد کی عملی زندگی پر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے نہ معاشرتی زندگی پر کوئی فرق پڑتا ہے۔ مثلاً "اگر کوئی کہتا ہے کہ خدا ہے اور اس کے جواب میں دوسرا آدمی بھی جو خدا کو نہیں مانتا تھا کہہ دیتا ہے کہ ہاں خدا ہے یا اس کے برعکس یہ دونوں یا پورے کا پورا معاشرہ کہہ دیتا ہے کہ خدا نہیں ہے تو اس اقرار یا انکار سے کسی بھی فرد کی روزمرہ کی زندگی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اپنے گرد و پیش میں نظر ڈالئے آپ کو ہزاروں آدمی ایسے ہی دکھائی دیں گے جو خدا کے وجود پر فقط زبانی کلامی اعتقاد رکھتے ہیں۔ بلکہ خدا کی وحدانیت کے بھی قائل ہیں۔ خدا کو اسی طرح ایک مانتے ہیں جس طرح علمِ ریاضی میں ایک کا عدد ہوتا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس سے آگے بڑھ کر کوئی یہ بھی کہہ دے کہ ساری کائنات کو بھی ایک خدا چلا رہا ہے تو بھی عملی آدمی کی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ کہہ دیتا ہے اچھا بھئی چلا رہا ہے تو پھر کیا؟ اسی طرح نظری بحث کے انداز میں تخلیق پر کائنات کے ایک نہ ایک دن ختم ہو جانے پر یا اللہ کے اختیار و قوتِ ارادی پر گھنٹوں سوال و جواب کرتے رہیئے عملی زندگی پر اثر انداز ہونے والا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو گا۔ فرق اس وقت پڑتا ہے جب گفتگو کا ماحصل "فکر" کو بھی متحرک کرنے لگ جائے یعنی جب یہ کہا جائے کہ "میں قلب کی تصدیق کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہوں کہ کائنات کی ہر چیز کو نشو و نما دینے والے کا قانون مجھ پر جاری ساری ہے اس لئے میں تو اللہ کے قوانین و ضوابط کی پابندی کو اپنے لئے لازمی سمجھتا ہوں، یہ ضوابط مجھے اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے بذریعہ وحی دیئے ہیں۔ میں تو اپنے قول و عمل سے اللہ کے اس قانون اور اس کی مرضی و منشا کے خلاف سرِ مُو بھی انحراف نہ کروں گا۔ جب تک اس دنیا میں رہوں گا صرف وہی کام کروں گا جن کا اللہ مجھے حکم دے گا۔ اور ہرگز وہ کام نہ کروں گا جن سے اللہ نے مجھے روک دیا ہے۔" یہ شخص زندگی کی متعینہ شاہراہ پر گامزن ہونے کا عزم رکھتا ہے۔ اس کی بات وزن دار ہے۔ اسے سن کر ہر شخص یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ قابلِ اعتماد ہے۔

اس کے برعکس وہ شخص جو اپنی عقل سے بالاتر کسی چیز کو نہیں جانتا، بلکہ اپنی خود غرض اور مفاد پرست عقل کی جوئے تند و تیز کو کناروں کی حدود میں پابند رکھنا ہی نہیں جانتا۔ جو اپنے ہر قول و عمل کو مطلقاً آزاد اور بے لگام رکھنا چاہتا ہے تو ایسے مطلقاً آزاد شخص پر کوئی کیا بھروسا رکھ سکتا ہے۔ کیا پتہ اس کی بے لگام "انا" کس وقت کیا رخ اختیار کرے لہٰذا یہ دہرا شخص صرف ناقابلِ اعتماد ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔ خدا کی ہستی پر ایمان لانے کا معنیٰ فکر و عمل کی دنیا میں خدا کے مقرر کردہ قوانین کی پابندی نہیں تو پھر تو کچھ بھی نہیں۔ خرد تو زبان سے لا الٰہ کہہ دے گی لیکن جب تک اس کلمے سے نگاہ مسلمان نہ ہو جائے عمل کی دنیا میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اللہ کے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کا علم ہم صرف وحیٔ ربّانی کے ذریعے سے حاصل کر سکتے ہیں یہ وہ "العلم" ہے۔ جو عقل و خرد کی رسائی سے بالاتر اور اس کی کمی کو پورا کرنے والا ہے۔ پس سوچئے بلکہ دل سے فیصلہ کرنے کی بات ہے کہ کیا اس دنیا میں زندگی گزارنے کا صحیح اور باسلامتی طور طریقہ بغیر وحیٔ ربّانی کے ممکن ہے؟ وحیٔ ربّانی سے کٹ جانے کا مطلب متوازن اور ارتقا پذیر زندگی کی راہوں سے دور نکل جانا ہے اور اپنے اوپر حیاتِ تازہ عطا کرنے والے ان سرچشموں کو بند کر دینا ہے جو انسان کی طبعی اور روحانی دونوں قسم کی نشو و نما کے ضامن ہیں اور جو ابد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قرآن حکیم کے اندر محفوظ ہیں۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

jabir.abbas@yahoo.com

Contact: jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۹۔ دانائے سُبل ختم الرُسُل مولائے کل صلی اللہ علیہ وسلم

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو، آنکہ از خاکش بروید آرزو،
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

ہر انسان کے اندر، روزِ اول سے ہی، یہ بنیادی وصف اس کے قانونِ تخلیق میں رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا رجحان حق و صداقت کی طرف رکھے، دوسرے لفظوں میں حق و صداقت کی قبولیت انسانی سرشت کا جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی غیر متمدن کیوں نہ ہو، حسن سے 'جو حق و صداقت ہی کا دوسرا نام ہے، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نفسِ لوامہ اگر برے کاموں پر ملامت کرتا ہے تو وہ بھی اسی وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اچھائی کو جانتا ہے اور صداقت کو پہچانتا ہے۔ سفاک لوگوں کا اپنے بہیمانہ افعال کے ذکر پر برہم ہو جانا اور عقلی دلیلیں تراش تراش کر اپنے بہیمانہ افعال کو جائز قرار دینے کی کوشش کرنا بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ہر انسان کے تاریک خانۂ دل کے کسی نہ کسی گوشے میں حق و صداقت کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور موجود ہوتی ہے۔ اس کرن کو ہم حق و صداقت کو قبول کر لینے کی استعداد کہہ سکتے ہیں اسی استعداد یا صلاحیت کا دوسرا نام "تعلم پذیری" ہے۔ اگر یہ صلاحیت فطرتِ انسانی میں موجود نہ ہوتی تو وحیٔ ربانی بھی غیر مؤثر ہو کر رہ جاتی کیونکہ "وحی" انسان کو اختیار و ارادے کے استعمال کی آزادی دیتی ہے اسے اپنی نہج پر چلنے کے لئے پابند و مجبور نہیں بناتی۔ قرآن حکیم میں متعدد بار نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ کا کام لوگوں تک "پیغام" کا پہنچا دینا ہے، آپ کو ان پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ انہیں ڈنڈے کے زور سے ایمان لانے پر مجبور کریں، آپ نے نہایت حسن و خوبی سے ان تک پیغام پہنچا دیا ہے۔ اب اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو نہ لائے آپ کیوں فکرمند ہوتے ہیں۔

گزشتہ ابواب میں اللہ اور اولادِ آدم کے مابین طے پانے والے ایک میثاق کا ذکر بھی آیا تھا۔ اس میثاق کی رُو سے انسان کو وہ تمام ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں جو اس نے "امانت" کے طور پر اٹھا رکھی ہیں۔ سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں تاکیداً یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ اے ایمان والو اپنے عقود کو پورا کرو۔ عقود 'عقد' کی جمع ہے جس کے معنے ہیں مضبوط گرہ، عہد پیمان، میثاق وہ عہد و پیمان ہے جو قسموں کے ساتھ مؤکد ہو۔ جن عقود کو پورا کرنے کا حکم مذکورہ آیت میں آیا ہے ان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔ کہ جو ذمہ داریاں ہر انسان کو پوری کرنی چاہئیں ان میں سب سے پہلی ذمہ داری تو وہ ہے۔ جو "ہماری تخلیق کے روحانی قانون" اور اللہ کے ساتھ ہمارے رشتے" کی بنا پر ہم پر عائد ہوتی ہے، اللہ نے ہمیں علم و بصیرت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی صلاحیتیں عطا کیں اور اس کے ساتھ ہی وجدان و تعقل کی استعداد بھی عنایت کی۔ پھر اس نے اس کائنات کو ہماری ضروریات پوری کرنے کے لئے ہمارے تابع فرمان بنا دیا۔ اس کائنات میں اس نے ہمیں اتنی بے شمار نشانیاں دے رکھی ہیں کہ اگر ہم ان پر ادنیٰ سا غور و فکر بھی کر لیں، تو ہماری "اندر کی دنیا" اور اس جہان کی زندگی دونوں پاکیزہ اور تابناک بن سکتی ہیں۔ پھر اس ذاتِ کریم نے کرم یہ کیا کہ اس نے انبیائے کرام کے ذریعے ہمارے لئے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کر دیا تاکہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی معاشرتی زندگی کو سنوار سکیں۔ یہ تمام عطیات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں اور انہیں خلوص و رغبت کے ساتھ پورا کریں۔ میثاق کے پورا کرنے کی توقع بھی اسی سے کی جا سکتی ہے جو ذمہ داریوں کے مفہوم کو سمجھتا ہو۔ اور دنیاوی اغراض و مفادات پر اعلیٰ قدروں کو ترجیح دے سکتا ہو۔ "ایثار" بھی انسانی خاصہ ہے۔ کوئی اور مخلوق اس صفت سے آشنا نہیں ہے اور یہ وہ صفت ہے کہ تعقل پذیری کو اور زیادہ پاکیزہ اور لطیف بنا دیتی ہے۔ انبیائے کرام اسی لطیف صفتِ تعقل پذیری کا تزکیہ، تصفیہ اور اسی کی نشو و نما کرتے تھے۔ اور حق و باطل میں تمیز کرنا سکھاتے تھے۔

حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت کو ابھارنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ باطل اپنے آپ کو ہمیشہ حق کا لبادہ اوڑھ کر پیش کرتا ہے۔ اگر یہ ایسا نہ کرے اور اپنی اصلی حالت میں انسانوں کے سامنے آئے تو کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذہنی سطح کا انسان بھی اسے قبول نہ کرے کیونکہ انسان کی فطرت میں تو صرف حق کی پہچان کا عنصر شامل ہے، باطل کی شناخت کا نہیں ہے، یعنی انسان فطرتاً حق کی جانب رجوع رکھتا ہے، باطل کی طرف متوجہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا باطل کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسان کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے حق کا لباس پہن کر سامنے آئے اور انسان اس کے مصنوعی بہروپ اور ظاہری شکل و صورت سے دھوکا کھا جائے۔ ابلیس نے یہی چیلنج تو دیا تھا کہ "میں اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ انسان پر اس کے دائیں، بائیں آگے پیچھے ہر طرف سے حملہ کروں گا اور اسے دھوکے فریب کے مکر کی چالوں سے، لطائف الحیل سے اور طرح طرح کے حربوں سے مغلوب کروں گا۔" لیکن اللہ کی رحیمیت نے جواب دیا تھا کہ تم جو جی چاہے کرو، میرے وہ بندے جو میری اطاعت گزاری میں پورے خلوص کے ساتھ کوشاں رہیں گے۔ تم ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ پھر آدم سے مخاطب ہو کر فرمایا (۲:۳۸)

> جب کبھی میری طرف سے تمہیں "ہدایت" پہنچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔

"خوف" کسی نقصان پہنچنے سے پہلے کی کیفیت کا نام ہے جس میں ڈر، فکر اور اندیشہ ہائے گوناگوں قوائے عملیہ کو مضمحل بنا ڈالتے ہیں۔ اور پھر اس کی وجہ سے بہت سی ذہنی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

حُزن نقصان پہنچ جانے کے بعد کے رنج و ملال، تاسف و حسرت اور احساسِ ناکامی کو کہتے ہیں یہ وہ جذبات شکست خوردگی ہیں جن سے ذہنوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یاس و ناامیدی کے احساسات مشتعل ہو کر پورے انسانی معاشرے کے امن و سکون کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتے ہیں۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہدایتِ ربانی کا سلسلہ انہی منفی رجحانات کا سدِّباب کرنے کے لئے جاری ہوا تھا کہ ابلیسی قوتیں "انسانی ذات" کے ارتقا کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ یہ قوتیں قدم قدم پر مزاحم ہوتی ہیں۔ لیکن ان مزاحمتوں پر غالب آنے کیلئے وحیٔ ربانی کی ضرورت ناگزیر ہے کیونکہ ابلیسی قوتیں اپنی پُرکشش مکاری سے "عقل" کو پہلے ہی اپنے ساتھ ملا لیتی ہیں۔ مفاداتِ عاجلہ کی خیرگی سے عقل اپنی آنکھوں کو بند کر لیتی ہے پھر اندھیرے میں اس کو کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔

یاس اور ناامیدی کے جذبات کس طرح یک دم بھڑک اُٹھتے ہیں اور امن و امان کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس پر دنیا بھر کے ماہرینِ نفسیات نے بڑی محنت اور کاوش سے تحقیق کی ہے۔ یہ لوگ جس نتیجے پر پہنچے ہیں اسے قرآن حکیم نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے "ابلیس" اور "شیطان" کی دو جامع اصطلاحات کے ذریعے واضح کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ جو تصوّرات ذہنِ انسانی میں پہلے سے موجود تھے خواہ یہ از خود پیدا ہوئے تھے یا انبیائے کرام کی تعلیمات کے نتیجے میں اُبھرے تھے قرآن حکیم انہی تصوّرات کی تطہیر کر کے اور معانی میں وسعت دے کر انہیں آخری شکل عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ابلیس اور شیطان کے قصے سے تصوّرات مختلف اقوام و ملل میں پہلے سے موجود تھے۔ قرآن حکیم نے انہی تصورات کو علامت بنا کر بڑے خوبصورت انداز میں اہلِ علم و دانش کے سامنے اصطلاح کے طور پر پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ آخری شکل میں پیش کی گئی ہیں اس لئے ان کے معانی میں مزید کسی ترمیم یا اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔

مایوسی اور ناامیدی (FRUSTRATION) سے انتقام آمیز بغاوت یا متشددانہ رویّہ (AGGRESSIVENESS) پیدا ہوتا ہے، جب خواہشیں پوری نہیں ہوتیں تو اس سے غیظ و غضب کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ اگر غصہ اپنے اوپر نکلتا ہے تو اسے پریشانی، آفسردگی، رنج و غم کی پژمردگی (WORRY) کہیں گے اگر اس شخص یا چیز کے خلاف نکلے جو خواہشات کی تسکین میں مانع تھے تو یہ انتقام (RETRIBUTION) ہے۔ افسردگی کا انتہائی اقدام خودکشی ہے جو کمزور آدمی کا اقدام ہے۔ جب انتقام "صحیح دشمن" کے خلاف نہ لیا جا سکے تو آدمی دوسری چیزوں پر غصہ اتارنا شروع کر دیتا ہے اور خود بھی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ یہ دیوانگی کی ابتدا ہے۔ غصّے اور پاگل پن کے تعلق کی نشاندہی ہر زبان کے محاورے کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی ایسے ہی "یاس زدہ مجنون" کے ہاتھ میں طاقت بھی آ جائے تو پھر ساری دنیا اس کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ یہاں سے مایوسی اور سرکشی کے باہمی تعلق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ابلیس کے لفظ کا مادّہ ب۔ ل۔ س ہے۔ جس کے معنے ہیں مایوس ہو جانا۔ دہشت زدہ یا متحیّر ہو جانا۔

شیطان کے لفظ کا مادّہ ہے شطَنَ جس کے معنے ہیں بہت دور نکل جانا۔ یہیں سے اس کا مفہوم ہو گیا سرکشی، بغاوت، بھڑک اٹھنا وغیرہ۔ پیاس کی بھڑکی اور "سانپ" بھی اس لفظ کے معنے ہیں۔

قرآن حکیم میں ابلیس اور شیطان کو ایک کی حقیقت کے دو پہلو کے رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ قصۂ آدم میں انکار، تکبّر، سرکشی اور انسان کو بہکا دینے کا چیلنج "ابلیس" کی طرف سے ہے لیکن جب آدم کے لغزش کھا جانے کا ذکر آتا ہے تو اسے "شیطان" سے منسوب کیا گیا ہے۔ کیا ہی خوبصورت انداز ہے ان دونوں کے لطیف فرق کے بیان کرنے کا! گویا "ابلیس" ایک قوت ہے تو شیطان اس قوت کا اندازِ عمل ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں یہ اصطلاحات اکٹھی آئی ہیں انہی لطیف معنوں کے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ساتھ آتی ہیں۔ یعنی "ابلیس" کو یاس اور ناامیدی کا پیکر دکھایا گیا ہے اور "شیطان" کو مشتعل اور منتقم قوت کا طریق عمل ظاہر کیا گیا ہے۔

انسان اللہ سے سرکشی اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے سفلی جذبات اور پست خواہشات کا مغلوب ہو جاتا ہے۔ ان جذبات کو ان ذرائع اور سامان کو جو ان سفلی جذبات کو بروئے کار لاتے ہیں (مثلاً عقل حیلہ جو اور اس کے تراشیدہ حیلے بہانے وغیرہ) ابلیس کہہ کر پکارا گیا ہے۔ چونکہ یہ سرکش ہیں اس لئے استعارۃً کہا گیا ہے۔ کہ اس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے جب تک آدمی زندہ ہے خواہشات و جذبات سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ابلیس کو قیامت تک انسانوں کے ساتھ رہنے کی مہلت دی جانے کا یہی مطلب ہے۔ ناامیدی اور سرکشی وہ رکاوٹیں ہیں جو "انسانی ذات" کی نشوونما میں مزاحم رہتی ہیں۔ اگر "انسانی ذات" ان موانع پر غالب آجاتے تو پتھروں سے ٹکراتی ہوئی پہاڑی ندی کی طرح اس کی قوت، جوش و خروش، زندگی کی امنگ، ذوق نمو اور استحکام میں اضافے ہوتے چلے جائیں گے۔ اور اگر موانع انسانی ذات پر غالب آجائیں تو یہ جوئے کم آب بن کر اور ریت اور مٹی میں جذب ہو کر ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے گی۔ "زندگی" درحقیقت "ابلیس و آدم" کے درمیان اسی کشمکش کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے ساتھ ابلیس کا وجود ناگزیر ہے۔ انسانی ذات کا استحکام اور اس سے آگے بڑھ سکنے کی قوت کا امتحان انہی تصادمات کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اختیار اور ارادے کی آزمائش کے لئے مثبت اور منفی دونوں راہوں کا بیک وقت سامنے کھلا ہونا ضروری ہے۔ ایسے راستے تلاش یا اختیار کرنا جن میں پتھر نہ ہوں اپنی روانی کو آپ ختم کرنا ہے، مسلک خانقاہیت کو اسی لئے قوموں کی خودکشی کہا گیا ہے!

فریب نفس کے ان تمام اندھیروں سے نکلنے کے لئے وحی ربانی کی روشنی کی ضرورت ہے!

نبی کا مقام باقی تمام لوگوں، عالی دماغ انسانوں، غور و فکر کرنے والے مدبروں، ذہینوں، گیانیوں، فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں اور ذہین و فطین عقلمندوں سے اسی لئے بلند ہے کہ نبی جلوۂ حقیقت کی تابانیوں میں گم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے نور کو اپنے سینے میں محفوظ و مجتمع کر کے واپس انسانی دنیا میں آجاتا ہے کیونکہ اسے وحی ربانی کے صحیح ترین علم اور اپنے عمل صالح کی روشنی سے دنیا کے ذرے ذرے کو جگمگا دینا ہوتا ہے۔ نبی کی بعثت کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنی سوچ، قول اور عمل کی وحدت اور اپنے کردار و سیرت کی پاکیزگی میں باقی تمام انسانوں سے بلند تر ہو کر ان کے لئے نمونہ اور مثال بنے کیونکہ دنیاوی کاروبار میں مصروف انسان کو ان کے روزمرہ پیش آنے والے واقعات کے دوران مسائل حل کرنے کے لئے عملی مثال کی ضرورت ہے۔ وعظ و نصیحت، فلسفیانہ بحث مباحثوں، شاعرانہ نازک خیالیوں اور خطیبانہ آتش بیانیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ عوام الناس آپس کے تعلقات، معاشرتی روابط، خالق اور مخلوق کے درمیان رشتے۔ صلح اور جنگ کے حالات میں لائحہ عمل اور ردِ عمل، مفلسی اور امیری، گھریلو زندگی کی ذمہ داریوں، طرزِ زندگی کے فرائض، حاکم اور محکوم کے حقوق و واجبات۔ سکون اور ہلچل کے مواقع میں رویوں، خلوت اور جلوت کے تقاضوں، لین دین کے صحیح طور طریقوں اور اسی قسم کے بے شمار مسائل کے بارے میں اپنے جیسے گوشت پوست کے انسان کے عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس نمونے کے مطابق اپنی زندگی ڈھال کر وہ دنیا و آخرت دونوں کی کامیابیاں حاصل کر سکیں۔ وعظ و تلقین کا اثر اس

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وقت ہوتا ہے جب وعظ و تلقین کرنے والے انسان کا اپنا عمل بھی اس کی تائید کرے اور اس طرح ہم اس مثالی شخصیت کو اس کی پاکیزہ سیرت اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنالیں۔ انسان کی آزاد اور خودمختار انا یونہی کسی کے آگے سرنگوں نہیں ہوتی۔ جب تک کسی شخصیت کو اپنے آپ سے اور ماضی و حال کی دوسری شخصیتوں سے بلحاظ قول و عمل اعلیٰ اور ارفع تر دیکھ نہ لے گی اس وقت تک یہ "تقلید" کی پابندی ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ دیکھنا جسمانی آنکھ سے بھی ہوتا ہے اور چشم بصیرت سے بھی ہوتا ہے۔ تاہم بصیرت کی اطلاعات چشم بصارت کی اطلاعات سے کہیں زیادہ یقینی واضح اور لطیف ہوتی ہیں۔ جب مثالی شخصیت کا اعلیٰ کردار چشم بصیرت کے راستے سے عقل و فہم پر نقش ہو جاتا ہے تو پھر متابعت بھی خلوص اور محبت و احترام کے سانچے میں ڈھل کر لافانی ہو جاتی ہے۔

انسان کو اپنے علم و ذہانت کے نقائص دور کرنے کے لئے "ہدایت ربانی" کی ضرورت ہے اور جذبات و اختیار و ارادے کی کمزوریوں کو رفع کرنے کے لئے "انسانی سیرت و کردار" کی نہایت واضح عملی مثال کی ضرورت ہے یہ دونوں صورتیں انبیائے کرام باحسن طریق پوری کرتے رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں سلام و صلوٰۃ کی مستحق ہیں یہ عظیم ہستیاں جنہوں نے ہماری ذات انسانی کو لغزش ہمارے اندر کے انسان کو اپنے مقام انسانیت سے نیچے نہیں گرنے دیا، جنہوں نے ہمارے ناقص علم کی کمی کو پورا کر دیا، جنہوں نے ہمارے جذبات اور اختیار و ارادے کے لئے متوازن اور صحیح سمت کو جانے والی شاہراہیں دکھائیں اور جنہوں نے ہمارے ذوق عمل کو بے راہ نہیں ہونے دیا۔ ان مکرم و محترم برگزیدہ انسانوں نے امراض قلب کا شافی علاج کیا۔ ہماری شخصیت کو اعتدال اور حسن تناسب عطا کیا اور اس طرح ہمیں بے شمار سجدوں اور لاتعداد غلامیوں سے نجات دلا کر صحیح آزادی سے روشناس کرایا۔ سوچ، قول اور عمل کی صداقت کا اگر کوئی عملی نمونہ ہے تو صرف انبیائے کرام علیہم السّلام کے علم صحیح اور عمل صالح میں ہے۔ اور کہیں نہیں۔

ان پاک شخصیتوں کے ذمے دو طرح کے فریضے تھے۔ ایک یہ کہ اپنے علم و عمل کا نمونہ پیش کر کے عوام النّاس کو بتائیں کہ رب رحیم کے مقرر کئے ہوئے اصول و قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کیا کیا خوشگواریاں اور سرفرازیاں نصیب ہوتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان ابدی سچائیوں کی خلاف ورزی انسان کے لئے کیا کیا ذلتیں اور خواریاں بلکہ جسم و جان کی تباہیاں لاتی ہے۔ خوشخبریاں سنانے کے اعتبار سے ان عالی مقام انسانوں کو "بشیر" کہا گیا ہے اور تنبیہ کرنے اور تباہیوں سے ڈرانے کے اعتبار سے یہ "نذیر" ہیں۔ گویا ہر نبی اللہ کی طرف سے بشیر اور نذیر بن کر مبعوث ہوا ہے۔ یہ دو اعلیٰ صفات تمام انبیائے کرام میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور ہونی بھی چاہیئے تھیں کیونکہ انسان کا تعلم پذیری کا صرف یہی دو صفات متحرک اور فعال بنا سکتی ہیں۔

انبیائے کرام کا بشیر اور نذیر ہونا تو سب کا ایک جیسا تھا لیکن ان کی دوسری اعلیٰ صفات میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا اور یہ فرق بھی صرف ان صفات کے مدارج میں تھا یعنی کوئی نمایاں طور پہ ایثار کا پیکر تھا، کوئی تعمیل حکم میں بے مثال تھا۔ تو کسی نے واضح طور پر جوشِ توحید کو اپنی عظمت کی خصوصیت بنا لیا تھا۔ کسی اور کا دلولۂ حق عروج پہ تھا تو کوئی عفت میں، کوئی اعترافِ قصور میں، کوئی زہد اور پارسائی میں اور کوئی شوکت و سطوت میں سربرآوردہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تھا۔ "انسانیت" ابھی طفولیت میں تھی اور لمحہ بہ لمحہ شباب کی طرف بڑھ رہی تھی جس طرح بچے کو اس کی جسمانی ضروریات اور استعداد کے مطابق نرم غذا سے شروع کرکے نسبتاً زیادہ ٹھوس غذا کی طرف لایا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے ہاضمے کی استعداد میں اضافہ کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح انسانیت کو بھی تدریجاً روحانی غذا دی جاتی رہی یہاں تک کہ وقت آپہنچا کہ تمام اعلیٰ قدریں اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں انسانیت کے سامنے رکھ دی جائیں اب انسانیت شعور کی پختگی تک پہنچ چکی تھی اور کوئی اعلیٰ قدر ایسی باقی نہ رہی تھی جو کسی نہ کسی وقت "انسانیت" کے علم و عمل میں نہ آچکی ہو۔ یہ جو قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ دنیا کے ہر خطے اور ہر انسانوں کی ہر قوم میں وقتاً فوقتاً انبیائے کرام آتے رہے ہیں۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ کوئی انسان "قدروں" سے ناآشنا نہ رہ جائے۔

انسانیت کو عہدِ طفولیت سے عہدِ شباب تک پہنچنے کے لئے نہ صرف زمانی فاصلوں میں سے گزرنا پڑا بلکہ شعور کے ارتقائی مدارج کی مسافتیں بھی طے کرنی پڑیں۔ ارتقا کے تقاضے تاریخ کے ہر دور میں مختلف ہوتے ہیں چنانچہ "انسانیت" کے اندر انہی ارتقائی تقاضوں کے مطابق سیرت و کردار کے خصائص پیدا کئے جانے ضروری تھے، مختلف اقوام کو اسی انداز کی ہدایت ربانی ملتی رہی اور اس طرح عقل و شعور کی تہذیب و ترتیب کا پروگرام درجہ بدرجہ آگے بڑھتا رہا۔

عہدِ طفولیت سے عہدِ شباب تک پہنچنے کے استعارے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ کیونکہ اسکی صحیح تفہیم پر ختم نبوت کی تفہیم کا دار و مدار ہے۔ نرم غذا سے آہستہ آہستہ ٹھوس غذا کی طرف لانے کے عمل کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اب حرکات و سکنات کی تربیت کی مثال کی طرف آیئے۔ "انسانیت" کو بالکل بچوں کی طرح پہلے ہاتھ پاؤں ہلانا سکھایا گیا۔ یعنی اس کی انفرادی اور اجتماعی سوچ کو بیدار کیا گیا۔ پھر گھٹنوں چلنے کی مشق دی گئی۔ یعنی ارد گرد کے ماحول میں کام کرنے والی قوتوں کا مشاہدہ کرنے کی ہدایت دی گئی پھر سہاروں کے ذریعے دو پاؤں پر کھڑا ہونا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھانا سکھایا گیا۔ سحر و ساحری، دیوتاؤں کی پوجا وغیرہ اسی دور کے تراشیدہ سہارے ہیں، دو چار قدم چلنے کے بعد یہ گر پڑتی تھی تو دوبارہ کھڑا ہونے کے لیے کمزور عارضی سہاروں کو پکڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس دور کی نشانیاں توہم پرستیوں کی صورت میں اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ گر پڑنے پر اسی انتظار میں رہتی تھی کہ کوئی آکر اس کی مدد کو پہنچے اور اسے دوبارہ کھڑا کرد ے۔ یہ جو کسی آنے والے کا تصور ابھی تک بعض ذہنوں میں موجود ہے یا کسی سازش کے تحت ذہنوں میں پیدا کر دیا گیا ہے اسی عہدِ اضمحلال کی یادگار ہے، پھر اسے انگلی پکڑ کر چلنا پھرنا سکھایا گیا تاہم جب کبھی اسے تنہا چھوڑ دیا جاتا تو یہ نئے ماحول سے گھبرا جاتی۔ یاد کیجئے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے تو کس طرح ان کی قوم کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ اجنبیت سے خوف زدہ ہو کر پھر کسی کے دامنِ عاطفت سے چمٹ جانے کی کوشش کرتی۔ پھر علم عقل، جذبات اور اختیار و ارادے کے اس کے سامنے کئی راہیں کھول دیں ان میں کا ہر راستہ دلفریب اور پرکشش تھا۔ لیکن تھوڑی دور جاکر تنگ و تاریک ہوتا چلا جاتا تھا۔ اور آخر بند ہو جاتا تھا۔ "انسانیت" دو چار قدم ان خوشنما لیکن اندھے راہوں پر چلتی اور پھر نڈھال اور مایوس ہو کر بیٹھ رہتی۔ راہ تکتی رہتی کسی ایسے رہبر کامل کی جو اسے ادھر ادھر کے غلط راستوں

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پر بھٹکنے سے بچالے اور اسے "خوف و حزن" سے نجات دلا کر آخری بار سیدھے راستے پر لا کھڑا کر دے۔ جی ہاں! ..... آپ پوچھتے ہیں آخری بار کیوں؟ تو سنیئے۔ آخری بار اس لئے کہ ہر بچہ جوانی میں قدم رکھتے ہی مزید سہاروں کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اب وہ بچہ نہیں رہتا، پختہ قوائے جسمانی کا مکمل جوان ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اسے گود میں لینے کی کوشش کرے تو مرنے مارنے پر تل جائے گا۔ کوئی اس کی انگلی پکڑ کر چلانا چاہے تو اس کے ہاتھ کو سختی سے جھٹک دے گا۔ گر بھی پڑے تو اپنے آپ اٹھنے کی کوشش کرے گا۔ سہارے لیکر اٹھ کھڑے ہونے کو اپنی ہتک سمجھے گا۔ روحانی سطح پر بھی اس کی انسانی ذات کی صلاحیتیں اتنی قوی ہو چکی ہیں کہ اب یہ "جوان" اپنی منزلیں آپ طے کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ "انسانیت" لاکھوں سالوں کی طفولیت کے بعد اب عہدِ شباب کو پہنچ چکی تھی۔ اب اسے انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ گرتے ہوئے کو اٹھا کھڑا کرنے والے کسی امدادی کی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ ہی کسی ایسے رہبر کی ضرورت تھی جو اسے جبراً کسی ایک شاہراہ پر گھسیٹتا ہوا لے جائے۔ کشاں کشاں تو بچوں کو لے جایا جاتا ہے یا حیوانوں کو لے جایا جاتا ہے یا کم عقل کو لے جایا جاتا ہے یا غلاموں کو لے جایا جاتا ہے۔ اب انسانیت بالغ العقل اور آزاد تھی۔ بالغ العقل اور آزاد شخصیت کو صرف سائن پوسٹوں (SIGN-POSTS) اور علاماتِ منزل کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ بالغ العقل اور آزاد انسانیت کے پختہ شعور کو اب ایسی رہنمائی کی ضرورت تھی جو سابقہ تمام رہنمائیوں سے قدرے مختلف ہو۔ جو زندگی کی متعدد شاہراہوں کے چوکوں (CROSS-ROADS) پر نصب شدہ پختہ عقل و شعور کی مالک اور شباب کی دہلیز پر قدم رکھ چکنے والی انسانیت کو اب رہنمائی صرف اس شکل میں دی جا سکتی تھی کہ اب تک جو اعلیٰ صفات تدریجاً دی جا چکی تھیں، انہیں انسانیت کے ذہنی فروغ کے مطابق ارتقا دیا جائے۔ ان سب کو یکجا کر لیا جائے اور پھر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے مکمل صورت میں محفوظ کر لیا جائے تاکہ قیامت تک کسی اور سائن پوسٹ کی ضرورت نہ رہے۔ مستقل قدروں میں کوئی ردّ و بدل نہ ہو سکے۔ اور یہ قدریں "الحق" بن کر وقت کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دے سکیں، اس کے علاوہ ایک جامع صفاتِ عالیہ، کامل انسان کا عملی نمونہ بھی انسانیت کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ انسانی عقل ان دونوں کے نورِ لازوال کے پیچھے پیچھے چل کر آخری رشد و ہدایت کے غوامض کو سمجھ سکے، پرکھ سکے اور ان کے مطابق عمل کر کے اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کو سنوار سکے۔

اگر یہ ممکن ہوتا کہ کوئی فرد طبعی عمر کے لحاظ سے پوری انسانیت کی ارضی زندگی تک کا ساتھ دے سکتا تو شاید ایک ہی ہادیٔ برحق کافی ہوتا۔ لیکن ایسی صورت میں لوگ اسے اپنی جنس سے بالاتر مخلوق سمجھنے پر مجبور ہو جاتے اور اس کی پیروی کو اپنے لیئے ضروری سمجھنا چھوڑ دیتے۔ واجب تقلید شخصیت صرف وہی ہو سکتی ہے جو عام انسانوں کی طرح بشریت کے تقاضے پورے کرے۔ انہی کی طرح چلے پھرے، اٹھے، بیٹھے، کھائے پیئے، خوشی غمی، صلح، جنگ، باہمی لین دین اور کاروبارِ زندگی میں برابر کا شریک ہو۔ عام اور خاص دونوں طبقات کے لوگ اسی رنگ میں اسے دیکھیں، جانچیں، پرکھیں، مشاہدہ کریں، مطالعہ کریں اور پھر یک زبان ہو کر خود ہی یہ فیصلہ کریں کہ یہ شخص دیانت میں، امانت میں، صداقت میں، اعلیٰ سیرت میں، بلند کردار میں، علم صحیح میں اور عمل صالح میں ہم سب سے بلند بلکہ کہیں زیادہ بلند ہے۔ پس یہی ہمارا مکمل نمونہ اور آئیڈیل ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

چنانچہ یہی ہوا جب "انسانیت" نے شباب کی دہلیز پر قدم رکھا تو عہدِ طفولیت کی رہنمائیاں اس کے ذہن میں صرف دھندلی دھندلی سی باقی رہ گئی تھیں۔ اردگرد کے ماحول پر ہر طرف تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں انبیائے کرام کی تعلیمات فراموش ہو چکی تھیں۔ ساری دنیا جہالت، بدعملی، ظلم، باہمی استحصال اور عداوتوں کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جزیرہ نما عرب بھی ہر قسم کی اخلاقی انحطاط، بے راہ روی، ظالمانہ عادات و اطوار اور جاہلیت کی تاریکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم اس خطے کے بسنے والوں میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ ان خوبیوں کی ہلکی سی کرن گویا نورانی تعلیمات کو قبول کر سکنے کی ایک موہوم سی علامت تھی جو سارے کرۂ ارض پر اور کہیں موجود نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ سرزمین اُس وقت کی معلوم دنیا میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ ربِ رحیم و رحمٰن نے میثاقِ رحمت کو پورا کرتے ہوئے سیدھے راستے سے بھٹکی ہوئی انسانیت کی آخری رہنمائی کے لئے اسی سرزمین کا انتخاب فرمایا اور سید الکونین والثقلین، سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعٰلمین اور خاتم النبیین بنا کر اور تمام صفاتِ عالیہ سے متصف کر کے جو اس مرتبۂ عالی کے لئے ضروری تھیں ایک ایسی لازوال تعلیم کے ساتھ بھیجا جس کی تا قیامت حفاظت ضروری تھی کیونکہ یہ آخری ہدایت تھی اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ پاک نے لے لی تھی، اس طرح نبوت کا سلسلہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اور ہدایتِ ربانی کا نزول قرآن حکیم پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے الفاظ میں "پیغمبرِ اسلام ہمیں قدیم اور جدید دنیا کے بین وسط میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ جہاں تک وحی کے منبع و ماخذ کا تعلق ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیائے قدیم سے وابستہ ہیں۔ لیکن جونہی ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی روح کا اور تعلیمات و پیغام اور عمل کی ماہیت کو سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جدید ترین دنیا میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام کی پیدائش در اصل استقرائی فکر کی پیدائش ہے۔ کیونکہ "زندگی" حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ آگے بڑھنے اور نئی راہیں نکالنے کے لئے علم کے اور ذرائع بھی دریافت کر سکے۔ چنانچہ اسلام میں نبوت کا منصب اپنے انتہائی عروج و کمال کو پہنچ جاتا ہے جب اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ اب وحی کے سلسلے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا چاہیے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے فرزند جلیل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر انسانیت کی وحدت کے مرکز خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو آپ نے بارگاہِ رب العزت میں بصد عجز و خلوص یہ التجا کی کہ "اے میرے نشو و ارتقا دینے والا۔ تو ان لوگوں کے درمیان ایک ایسا رسول مبعوث فرما دے جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے، ان کو قانون خداوندی (کتاب) کی تعلیم دے، ان کو حکمت سکھائے اور ان کو ارتقا یافتہ پاک صاف بنا دے، بیشک تو بہت طاقت والا حکمت والا ہے" (۲:۱۲۹) اس کے کئی صدیوں بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انسانی ذہن کے تا آں زماں نا پختہ ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے لوگوں سے کہا "ابھی مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں لیکن ابھی تم ان کے سننے کی تاب نہیں رکھتے (۱۳۔ یوحنا) لہٰذا اب میرا چلا جانا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو تمہارے پاس فارقلیط (احمد) نہیں آئے گا اور اگر میں چلا جاؤں تو تمہارے پاس فارقلیط کو بھیج دوں گا۔ (۱۸ یوحنا)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دعائے ابراہیمی اور نویدِ مسیحائی پوری ہوئی، دنیا جس انسانِ کامل کی متلاشی اور جس ہادی برحق کی منتظر تھی وہ آیا۔ اس شانِ زیبائی و یکتائی سے آیا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے نورِ علم و عمل کی تابانی سے جگمگا اٹھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس میں وہ تمام خوبیاں اپنے انتہائی حسن و کمال تک پہنچا دی گئی تھیں جو سابقہ انبیائے کرام میں علیحدہ علیحدہ نمایاں تھیں۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ ابدی صداقتوں کا عملی نمونہ اور انسان کی امکانی صلاحیتوں کے ارتقا کی زندہ و پائندہ مثال ہر طبقے، ہر عمر کے انسان، ہر ملک، ہر فکر، ہر طبیعت اور ہر زمانے کے افراد کے سامنے بصارتاً اور بصیرتاً موجود ہے۔

انسانِ کامل کے جانچنے اور پرکھنے کے کچھ معیارات ہیں جو عقلیت پسندوں نے وضع کر رکھے ہیں پہلا معیار یہ ہے کہ کامل انسان کی زندگی کے جو بھی واقعات دوسروں کے سامنے بطور نمونہ پیش ہوں، ان میں افسانوی یا دیو مالائی عناصر (MYTHOLOGICAL ELEMENTS) نہ ہوں بلکہ ان واقعات کو مستند تواریخوں سے تائید اور مسلّمہ حقیقت کی حیثیت حاصل ہو۔ معجزے، الف لیلوی واقعات اور غلو سے بھرپور واقعات اور سوانح خواہ کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں، ذہنوں پر کوئی پائیدار نقوش نہیں چھوڑتے۔ لوگ انہیں فوق الفطرت جان کر قابلِ تقلید یا ممکن العمل نہیں مانتے جس واقعے کو تاریخی شہادت حاصل ہو وہی لائق یقین اور واجب تقلید ہے۔

دوسرا معیار یہ ہے کہ کامل انسان کی زندگی کا ہر دور، ہر حصہ اور ہر پہلو خواہ اس کا تعلق ذاتی یا نجی معاملات سے ہو خواہ بیرونِ خانہ (PUBLIC OR PRIVATE) ہو، وہ کسی شخص سے بھی پوشیدہ نہ ہو یعنی کامل انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پوری انسانیت کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہو۔ ولادت سے لیکر وفات تک کا کوئی ثانیہ بھی پردۂ اخفا میں نہ رہے ورنہ لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوں گے اور وہ شخصیت قابلِ تقلید نہ بن سکے گی۔ افراد کے قول و عمل کے پرکھنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی کسوٹی نہیں ہے۔

تیسرا معیار یہ ہے کہ جس طرح قرآنِ حکیم نے ہر زمان و مکان کے انسان سے کہہ دیا ہے کہ میرے اندر تمہارا ہی ذکر ہے (۲۱ : ۱۰) اسی طرح انسانِ کامل کی سیرت اور اس کے کردار کے مرقّعے میں ہر وہ تصویر موجود ہو جس کی ضرورت انسانی معاشرے کے مختلف طبقات کو ہو سکتی ہے، تاکہ وہ ہر طبقے، ہر خیال اور ہر عمر کے لوگوں کے لئے واجب تقلید نمونہ بن سکے۔ کیونکہ اسے تو ہر طرح کے انسان کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے، معاشرتی زندگی میں جتنے بھی رابطے اور رشتے، فرائض اور واجبات اور حقوق کے دوطرفہ تعلقات ہیں ان سب میں انسانِ کامل کی زندگی کا عکس موجود ہونا چاہیئے۔ تاکہ دریائے رحمت کی سیرابی سے عالمین میں سے کوئی ایک بھی محروم نہ رہے۔

چوتھا معیار یہ ہے کہ کامل انسان کی سوچ، اقوال و عمل میں کہیں بھی کوئی تضاد نہ پایا جائے بلکہ ان تینوں میں مکمل ہم آہنگی اور یکسانی ہو۔ جو پیغام وہ دوسرا تک پہنچاتا ہے، جو تعلیم وہ لوگوں کو دیتا ہے۔ جس قانون اور ضابطے کو وہ انسانوں پر نافذ کرتا ہے اور جس دانائی کا درس وہ عوام الناس کو دیتا ہے اور جو اعلیٰ قدریں وہ انسانیت کو عطا کرتا ہے، ان کے ایک ایک حرف پر وہ خود عمل پیرا ہو تاکہ ان چیزوں کی چھوٹی سی چھوٹی شق کو بھی ناقابلِ عمل نہ سمجھا جا سکے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

مثلاً جو شخص غصے کو پی جانے کی یا دشمن کو معاف کر دینے کی تعلیم دیتا ہے اگر اس کا کبھی دشمنوں سے واسطہ ہی نہیں رہا یا اسے کبھی دشمنوں پر فتح ہی نہیں پائی تو وہ دوسروں کو معاف کر دینے کا سبق کیسے دے سکتا ہے یا اگر کسی نے عمر بھر شادی ہی نہیں کی تو وہ عائلی زندگی کے نازک رشتوں کے بارے میں کیا ہدایت دے سکتا ہے یا جو خود ساری عمر غلام رہا ہو، وہ حاکموں کی کیا رہنمائی کرے گا۔

ان معیارات کو سامنے رکھ کر دنیا کا کوئی بھی شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مبارکہ کا جائزہ لے تو اسے ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عظیم شخصیتوں میں صرف ایک ذاتِ گرامی ایسی نظر آئے گی جو ان تمام معیارات پر ہر اعتبار سے پوری اترے گی۔ اور وہ ذاتِ گرامی ہے رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، فخرِ موجودات، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اپنی یکتائی میں ہمیشہ بے مثال رہے گی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے ہم اس کی روشنی میں ہر زمانے اور ہر تقاضے کے انفرادی اور اجتماعی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ اور صرف اسی کی پیروی سے ہمیں دنیاوی و آخروی سعادتیں نصیب ہو سکتی ہیں۔ یہی وہ مثالی اسوۂ حسنہ ہے جس کی اتباع سے انسانیت امن و سلامتی اور فوز و فلاح کی راہوں پر گامزن ہو سکتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ اور سیرت پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور جب تک انسانی دنیا قائم ہے لکھی جاتی رہیں گی۔ کیونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ جاوید کارنامے نہ صرف لاثانی اور بے مثل ہیں۔ بلکہ ہر مدبر اور مفکر کے لئے تحقیق اور تجسس کی نئی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔ جدید زمانے کے عمرانی علوم اور علم نفسیات کے ماہرین اب آہستہ آہستہ مقامِ نبوت کی تفہیم کے قریب آ رہے ہیں۔ یہ بات ہم نے یونہی یا اعتقاداً نہیں کہہ دی، بلکہ علم نفسیات کی تحقیقات کے نتائج کو دیکھ کر کہی ہے اگرچہ ماہرین نفسیات اب بھی اس حقیقت کے منکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے منتخب کر کے کسی اعلیٰ ذہن، بلند کردار اور پاکیزہ سیرت کی شخصیت کو اپنا پیغام دے کر دنیا میں لوگوں کو ہدایت دینے کے لئے بھیجتا رہا ہے، لیکن اسی چیز کو وہ دوسرے نکتہ نظر سے یوں پیش کرتے ہیں۔

> بعض ایسے انسانوں میں عقل اور فہم و فراست اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ عام انسان تو کیا بڑے بڑے مشاہیر مفکرین بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہوتے ہیں۔ ایسی نادرِ روزگار شخصیت کا نام انہوں نے جینیس (GENIOUS) یا نابغہ رکھا ہوا ہے۔ یہ نابغہ صدیوں کے بعد ظہور میں آتا ہے اور اس کی پیدائش کا کوئی مقررہ قاعدہ قانون نہیں ہے یعنی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں کس طرح کے گھر میں اور کن حالات میں پیدا ہوگا۔ نابغہ عقل و فہم کی انتہائی آخری حد پر ہوتا ہے۔

یہاں تک تو انسانی علم آ پہنچا ہے، تاہم نابغے کی اخلاقی گراوٹ اور خطرناک اقدامات کے بارے میں ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں لہٰذا نابغے کی اس کمی کو اگر ہدایت ربانی کا نور پورا کر دے تو کیا ہی بات ہے! بہرحال اس دوسرے حصے کو بھی انسانی عقل بہت جلد تسلیم کرے گی کیونکہ حقیقت زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی۔ نفسیات کے ماہرین

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کچھ اصول وضع کر رکھے ہیں کہ اگر کسی نابغے کے کارناموں کو جانچنا اور پرکھنا ہو تو یہ دیکھا جاتے کہ:

اوّل :۔ اس نابغے کو کامیابی تک پہنچنے کے لئے کیا وسائل اور ذرائع حاصل تھے اگر کامیابیاں بہت بڑی ہیں اور ان کے حصول کے ذرائع اور وسائل بہت کمزور اور قلیل ہیں تو کامیابیاں حاصل کرنے والا شخص واقعی نابغہ ہے

دوم :۔ نابغے کے سامنے مقاصد کتنے پاکیزہ، بلند اور وسیع تھے اور ان میں آفاقیت کا عنصر کتنا تھا، یعنی یہ مقاصد کسی ذاتی غرض پر مبنی تھے یا ان میں کسی خاص قوم یا طبقے یا پوری انسانیت کی فلاح کا جذبہ تھا۔ اگر محقق کے سامنے ذاتی مفادات کا شائبہ بھی آجائے تو "نابغہ" اپنے مقام سے گر جائے گا۔

سوم :۔ کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے نابغے کی جد وجہد اور سعی و کاوش کی نوعیت کیا تھی؟ یعنی کیا اس میں صداقت اور خلوص تھا، اگر تھا تو کس قدر، تھا وہ کس غرض کے لئے تھا؟

چہارم :۔ نابغے کی جد وجہد سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ کس حد تک واضح اور روشن ہیں یعنی کیا یہ محض فرضی قصے کہانیاں ہیں یا ٹھوس تاریخی حقائق ہیں۔ اگر یہ ٹھوس تاریخی حقائق ہیں تو کیا عارضی اور ہنگامی ہیں یا دوامی، مستقل اور عالمگیر ہیں؟

یاد رکھیے کہ ہر نبی نابغۂ روزگار بھی ہوتا ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ بلند بھی اس کی بلندی کا راز اس حقیقت میں ہے کہ حقیقت کبریٰ کا صحیح ترین علم خود اتر کر اس کے پاس آتا ہے وہ تمام دوسرے انسانوں کی طرح اس علم تک کسی اکتساب کے ذریعہ نہیں پہنچتا۔ اس کے اس "منزل من اللہ" علم میں اس کی اپنی کوئی کاوش تھا، فکر اور تخیل یا محنت وغیرہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا تاہم ہم نابغہ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی "انسانی ذات" ارتقاء کے عروج پر ہوتی ہے اور اس کی انسانی صلاحیتوں میں حد درجے کا توازن و تناسب ہوتا ہے تمام انبیائے کرام بشیر اور نذیر تھے لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان دو صفات عالیہ کے علاوہ "سراجاً منیراً" بھی تھے، رحمۃ للعالمین بھی تھے اور خاتم النبیین بھی تھے خلقِ عظیم بھی تھے لہٰذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ کو انسانی عقل کے وضع کردہ معیارات کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنے سر پیچھے حضور پاک کی سیرت مقدسہ میں تلاش کریں۔ یوں تو سارا قرآن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مراتب عالیہ کا حسین ترین مرقع ہے تاہم سورۂ والنجم میں جو رب رحیم کی زبانی "توصیف" بیان ہوئی ہے اس پر کسی کی کیا مجال ہے کہ کوئی اضافہ کر سکے ایک طرف یہ مقام کہ حقیقتوں کا بے نقاب مشاہدہ کر کے بھی نہ نگاہ تحیر میں کھو کر ادھر ادھر بھٹکتی ہے اور نہ قلب مضطرب ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقتوں میں گہرائیوں تک اترتا چلا جاتا ہے اور کمال تقرب قاب قوسین سے بھی کہیں زیادہ نزدیکی تک پہنچ جاتا ہے، دوسری طرف وہ خود کو "بشر" سے الگ نہیں سمجھتا اور نہ کسی اور کو سمجھنے دیتا ہے، جب وہ نورِ حقیقت سے اپنے ماحول پر نظر ڈالتا ہے تو اسے انسانی دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے اصلی مقام پر نظر نہیں آتی۔ وہ اپنی قوتِ نبوغ و قوتِ نبوت سے ہر چیز کو اس کا اپنا اصلی مقام عطا کر دیتا ہے، اور اس طرح اس کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جو معیاراتِ بنوع اوپر دیئے گئے ہیں ان کے مطابق بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کامیابیوں کو جانچئے اور پرکھئے پھر پوری ایمانداری سے ہیمر مائن کے اس سوال کا جواب دیکھئے جو اس نے اپنی کتاب "ہسٹارز دی لائٹ کائنٹ" میں دنیا کے ہر مفکر، ذی شعور نقاد اور عادل سوانح نگار سے پوچھا ہے۔ کہ دنیا میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑا انسان کوئی اور بھی ہوا ہے؟ (جلد اول صفحہ ۲۷۶)

اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے اور تا قیامت نفی میں رہے گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بے عیب پاکیزہ ترین اور مطہر زندگی کے اوراق پلٹتے چلے جائیے آپ کو خود بخود یہ احساس ہوگا کہ اس نورانی کتاب کا ایک ایک حرف اور ایک ایک نقش دائم قائم رہنے والا ہے، چند لمحات کے لئے عصبیتوں کے گرد و غبار سے اٹی ہوئی آنکھیں بند کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتاب زندگی پر بصیرت کی نگاہ ڈالئے ایک یتیم، بے نوا، غریب، ان پڑھ انسان آپ کو زندگی کے عام معمولات میں مصروف نظر آئے گا۔ کہ اچانک حقیقت کبریٰ اپنا نقاب الٹ کر بے حجابانہ اس کے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ انسان اپنے آپ کو عالمگیر انسانی برادری کا فرد سمجھتے ہوئے ماحول کو دیکھتا ہے۔ حقیقت کا نور اس کے اندر کامل یقین بن کر جاگزین ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ہر بگڑی ہوئی چیز کو اس کی اصلی حالت پہ واپس لائے گا۔ اس کا عزم بالجزم انسانیت کے ہر شعبے میں انقلاب لانا چاہتا ہے لہٰذا ساری دنیا اس کی دشمن بن جاتی ہے۔ وہ اس وسیع اور عریض اور ہنگاموں بھری دنیا میں اپنے آپ کو بالکل تنہا پاتا ہے۔ کوئی بھی اس کی سوچ میں شریک نہیں، کوئی اس کی بات تک نہیں سنتا، بلکہ کوئی اس کے پاس کھڑا ہونے تک کو تیار نہیں ہوتا۔ کوئی اس کا دکھ درد بانٹنے والا نہیں ہے، کوئی ہمخیال نہیں ہے کوئی محرم راز نہیں ہے، وہ اپنی آواز کو بلند کرتا ہے تو اس کی آواز کو دبا دینے کے لئے ہر طرف سے ایک شور قیامت برپا ہو جاتا ہے۔ شور مچانے والے چاہتے ہیں کہ اس کی آواز کسی ہوشمند تک نہ پہنچے لیکن یہ اپنی پکار کو دردناک اذیتیں سہہ سہہ کر بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔ کوئی ساز و سامان نہیں، کوئی وسائل اور ذرائع نہیں صرف یقین کامل کی قوت ہے جو بڑے بڑے کوہ پیکر "چٹانوں" سے بھی ٹکرا جاتی ہے۔ استقلال اور ثابت قدمی رنگ لانا شروع کر دیتی ہے چند سلیم الطبع لوگ پاک طینت اور سنجیدہ افراد اس کی دعوت کی سچائی کو دیکھ لیتے ہیں۔ پھر حق و صداقت پر ایمان لانے والے ایک ایک دو دو، تین تین پروانوں کی صورت میں اس شمع ہدایت کے گرد جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ تیئیس سال اسی جد و جہد میں گزر جاتے ہیں (مدت وحی تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ اور ۱۴ دن ہے) اس سارے عرصے میں حق و صداقت کی طرف بلانے والے کی زندگی کھلے صحراؤں کی طرح ہر راہ نورد شوق کے سامنے بے نقاب رہتی ہے، کوئی راز نہیں، کوئی پردہ نہیں کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، کوئی خفیہ سازش نہیں، ہر بات واضح، صاف، کھلی کتاب کی طرح ہے لین دین میل جول، رہن سہن سب اسی طرح جس طرح دوسرے انسانوں کا ہے۔ تاہم ایک فرق کے ساتھ اور وہ فرق ہے۔ با ہمہ اور بے ہمہ ہونے کا فرق!

دشمن کے ساتھ لڑائی ہو تو اس کی پوری تیاری کی جاتی ہے، تلوار، ڈھال، زرہ، سواری ہر چیز کا انتظام کیا جاتا ہے جنگ کے میدان میں کامیابیاں بھی ہوتی ہیں ناکامیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن کامیابیاں مستقل بن جاتی ہیں اور ناکامیاں عارضی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر ناکامی پہ غور و فکر کر کے کمزوریوں کا ازالہ کر لیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جماعت المومنین کی تنظیم بھی جاری ہے، تعلیم اور تربیت کا اہتمام بھی ہے۔ کردار سازی پر بھی پوری توجہ دی جا رہی ہے، احباب کی سیرت کو برابر پاکیزہ اور پختہ بنایا جا رہا ہے۔ بالآخر یقین محکم، سعیِ پیہم اور خلوص مقصد کے سامنے مخالفین کی لاکھوں کی قوت ٹوٹ جاتی ہے، حق کی طرفدار مٹھی بھر جمعیت میں اضافہ شروع ہو جاتا ہے، اور صداقت کا نظام سورج کی کرنوں کی طرح ہر تاریک کونے کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے اور باطل کی ہر قوت پس پا ہونے لگتی ہے ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ پرستی، غلامی، شخصیت پرستی، نسلی افتخار، قومیتوں کی بنا پر انسانوں کی تقسیم وغیرہ نظام کہن کے جتنے بھی بت تھے سب پاش پاش ہو کر قدموں میں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ قزاقی، غارتگری، درندگی، خونخواری قمار بازی، شراب نوشی، تعصب، انتقام، ظلم، جہالت، بداخلاقی، بدکرداری اور انسانیت کی توہین و تذلیل کی ہر روش ملیامیٹ ہو جاتی ہے پھر آخر وہ وقت آن پہنچتا ہے کہ اب اس "مقصد عظیم" کے پایۂ تکمیل تک پہنچ جانے کا اعلان کر دیا جائے جس کا آغاز انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں کیا گیا تھا۔

دنیا میں اور بھی بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں، جنہوں نے انسانیت کی قابل قدر خدمت کی ہے۔ اور عظیم کارنامے سر انجام دیئے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا، کہ ان تمام بلند مرتبہ شخصیتوں کے کارناموں کی نوعیت مادی قوت کی تخلیق کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ ان نامور ہستیوں نے یا تو اسلحہ پیدا کیا، یا قانون بنائے یا سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں یا جسمانی آرام و آرائش کے سامان ایجاد کئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان کے کارنامے اکثر اوقات ان کی آنکھوں کے سامنے خاک میں مل گئے، اور دوام حاصل نہ کر سکے۔ ان کے برعکس آپ دیکھیں گے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صرف جانباز لشکروں، قانون سازی کے مستقل اداروں، وسیع سلطنتوں، طاقتور خاندانوں کو ہی متاثر اور متحرک نہیں کیا بلکہ کروڑوں انسانوں کو بھی جھنجوڑ دیا ہے، زاویۂ نگاہ کو بدل دیا ہے اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی سوچ کے دھارے کا رُخ تبدیل کر دیا ہے۔

اعتقادات صحیح ہوں یا غلط، ایک دفعہ دل و دماغ میں راسخ ہو کر بیٹھ جائیں یا وہ رسمیں اور رواجات نیز روایتیں جو باپ دادا کی قدیمی روش کا لازمی حصہ بن جائیں یا وہ ثقافتی عناصر جو کسی تہذیب کی پہچان بن جائیں۔ بلکہ ہر وہ ذہنی یا جسمانی عمل جو کسی فرد یا قوم کی عادت مستمرہ کی شکل اختیار کر لے تو پھر یہ تمام چیزیں ایسی اکھڑ اور سخت جان بن جاتی ہیں کہ ان سے گلو خلاصی تو کیا ان کے خلاف آواز اٹھانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیا یہ انتہائی کمال نہیں ہے، کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایمان و یقین کی قوت نے نہ صرف صدیوں سے پوجے جانے والے دیوتاؤں اور معبودوں کو تہس نہس کر ڈالا بلکہ پوجا پاٹ کے مفہوم کو، پرستش کے طور طریقوں کو، قربان گاہوں کو، مذہبی رسوم اور رواجات کو، توہم پرستیوں کو، بد اعتقادیوں کو انسانیت کی تذلیل کے آستانوں کو بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیا؟ انسانیت کو قبائلی معاشرت کے تنگ اور محدود حصاروں سے نکال کر اس کے لئے ایک ایسا عالمگیر مضبوط اور مستحکم قلعہ تعمیر کر دیا جس کی قوت رنگ، نسل، وطن اور زبان کی محبت کو بھی وسیع ترین معانی کے دائرے میں لے آتی ہے، اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پوری انسانیت کو اخوت، عدل و مساوات اور باہمی احترام سکھا کر "نفس واحد" کا مرتبہ عطا کرتی ہے اس عالم گیر قومیت کی بنیاد اس مفاد پرست عقلیت پر نہیں رکھی گئی جو اپنے سوا کسی دوسرے کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ بلکہ اس کی اساس حکمتوں والی کتاب پر رکھی گئی ہے جس کا ایک ایک لفظ اٹل قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ جو ہر زمانے کی ضرورتیں پوری کرتی ہے۔ جو قومیت کے بجائے "ابنیت آدم" کا اصول مقرر کر کے انسانی امت میں ڈھال دیتا ہے، جو ہر قسم کے امتیازات سے پاک ہے اور جس کے اجزائے ترکیبی "مستقل قدریں" ہیں یہ ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عظیم کارنامہ۔ وہ عظیم کارنامہ جس کی تکمیل میں بے شمار انبیائے کرام نے حصہ لیا ہے اور جس کو بچشم خود دیکھنے کی آرزو ہر نبی کے دل میں مچلتی رہی ہے۔ اس عظیم کارنامے کے علاوہ کئی کئی خود ساختہ قربانیوں کی غلامی میں پھنسی ہوئی انسانیت کی گردن کو چھڑانا اور لا تعداد خداؤں کی پرستش کی بجائے ایک خدا کی اطاعت کا ذوق و شوق پیدا کر دینا بھی ایسا بہت بڑا کام ہے جس کی مثال تاریخ کے صفحات پیش نہیں کر سکتے۔ جو کامیابیاں ہزارہا سال تک پھیلے ہوئے زمانے میں مفکرین، مدبرین، فاتحین، قانون دان بلکہ انبیائے کرام کو نصیب نہ ہوئی تھی وہ ایک ایسے پاک سرشت انسان کو صرف تیئس سالوں میں حاصل ہو گئیں جو دنیاوی پیمانوں کے لحاظ سے بے آسرا تھا۔ یتیم تھا، مفلس تھا، امی تھا۔ اور تن تنہا تھا۔ دیومالائی خداؤں کے جلوس بیکروں کے انبوہ میں (MYTHOLOGICAL) ایک اور صرف ایک اللہ کا تجریدی تصور پیش کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے اتنا بڑا معجزہ کہ اس کی عظمت نے ابھی تک انسانی عقل کو متحیر کیا ہوا ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی صداقت کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل جس کو سن کر تمام مورخین کی زبانیں بند ہو گئی تھیں، یہ پیش کی تھی کہ میری زندگی کا طویل حصہ اور اس کا ایک ایک لمحہ تمہارے درمیان میں گزرا ہے، تم مجھے انتہائی قریب سے جانتے ہو، میری ساری کی ساری زندگی کھلی کتاب کی مانند ہے اسے دیکھو اس میں صداقت اور امانت کے علاوہ کوئی اور لفظ لکھا ہوا ہے؟ بولو، کوئی ہلکا سا داغ، کوئی دھبہ، کوئی حرف مکرر کسی صفحے یا سطر پر تم نے دیکھا ہے؟ اس سے بڑھ کر صداقت کا کوئی اور ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اپنی کتاب زندگی کو جس میں خاص پرائیویٹ لمحات بھی ہیں اور کون اپنی سچائی کی شہادت میں پیش کر سکتا ہے، اور پھر ازواج مطہرات کو حکم "اے جائز نہیں ہے" تم میری نجی زندگی میں جو بھی کوئی خرابی دیکھو اسے کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر باآواز بلند لوگوں کو سناؤ۔ اللہ اللہ! کتنا اونچا معیار ہے صداقت کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی "آبشاروں کے سے مصفا" پانیوں کی طرح شفاف زندگی کا ایک ایک لمحہ خواہ وہ نبوت سے پہلے کا ہے خواہ نبوت کے بعد کا ہے آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے اور پوری تفصیلات کے ساتھ موجود ہے، بلکہ ماضی اور حال کی کوئی اور شخصیت ایسی نہیں ہے جس کے حالات زندگی اس قدر تفصیل کے ساتھ محفوظ کئے گئے ہوں۔ اور جنہیں دوستوں اور دشمنوں دونوں نے جمع کیا ہو۔ ان لمحات کے تسلسل سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ترسٹھ سالہ ارضی زندگی کی جو کتاب مرتب ہوتی ہے اس میں خاص ذکر و فکر اور پاکیزہ عبودیت کے ابواب ملیں گے۔ صداقت اور امانت کی خوش رنگ تصویریں ہوں گی۔ دنیا کی مصروفیتوں میں بھی بے ہمگی اور باہمگی کے مضامین ہوں گے۔ فکر، فہم، تدبر اور عدل و انصاف کے فیصلے ہوں گے بجی اور بے لوث دعاؤں اور پاکیزہ تمناؤں کے مرقعے ہوں گے۔ توہم پرستی کے خلاف جرأتمندانہ اقدامات

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے عنوان ملیں گے، سرکش قوتوں کے ساتھ کامیاب معرکہ آرائیوں کی تفصیلات ہوں گی۔ متکبر گردنوں کی اکڑ اور اقتدار کے نشے میں چور بدمست دماغوں کے خلاف جد وجہد کے واقعات ملیں گے۔ غیظ وغضب کے مقابلے میں انتہائی صبر وتحمل اور بردباری کے نقشے دیکھنے میں آئیں گے۔ شدید سے شدید مصیبتوں اور آزمائشوں میں سے گزرنے کے۔ اور استقلال واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کے واقعات ملیں گے۔ منافقوں کی نت نئی سازشوں، دشمنوں کی جنگی چالوں، قدم قدم پر مشکلات پیدا کرنے والوں کی تدبیروں کے خلاف ثابت قدمی، خلوص مقصد اور یقین کامل کے سوانح ہوں گے فتح ونصرت کی تفصیلات ہوں گی۔ اَلدین کے عملی نفاذ کی سعی وکاوش کا ذکر ہوگا۔ غرض انسانی زندگی کا ہر وہ واقعہ مندرج ہوگا جو بنی نوع انسان کے کسی طبقے کے سامنے اور تاریخ کے کسی بھی زمانے میں انفرادی یا اجتماعی طور پر رونما ہوسکتا ہے۔ اور جس کے لئے فرد اور جماعت کو قابل تقلید عملی رہنمائی کی ضرورت پیش آسکتی ہے

العــــرض

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انتھک دعوت وتبلیغ
مسلسل جد وجہد
اپنے پاکیزہ مقصد کی کامیابی پر یقین کامل
دل کا اطمینان اور حوصلہ
فتح اور کامیابی کے بعد کا تحمل اور قابو میں آئے ہوئے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی عطائے معافی
یہ سب کچھ کسی سلطنت شاہی کے قائم کرنے
کے لئے نہیں بلکہ اعلیٰ ترین الوہیاتی مقصد کی تکمیل کے لئے
آرزوؤں اور تمناؤں کی بلندی
اطاعت وتسلیم رضا کے وجد وسرور
عبادتیں اور دعائیں
دنیاوی زندگی۔ طبعی وفات کے بعد عالمگیر مقبولیت اور اثر آفرینی
یہ ساری حقیقتیں کس قسم کی زندگی کی گواہی دیتی ہیں؟
ایک ایسے انسان کی زندگی کی جس کی شان اقدس میں
ارشاد ہوا کہ
انسانیت اور الوہیت کے درمیان قاب قوسین کا
بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ باقی
رہ گیا

ہزاروں لاکھوں سلام وصلوٰۃ ہوں اس ذات والا تبار صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ جس نے ایمان کی بنیاد اللہ کی توحید

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور تنزیہہ پر رکھی توحید۔ یہ بتانے کے لئے کہ اللہ کیا ہے اور تنزیہہ اس بات کی وضاحت کے لئے کہ اللہ کیا نہیں ہے! وہ "الا" ہے، یہ "لا" ہے، آئیڈیالوجی کا ایک حصہ باطل آقاؤں کو مٹا دیتا ہے اس کا دوسرا حصہ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے مسندِ جلال کو قائم کرتا ہے!

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

بہت بڑا مفکر

اعلیٰ پائے کا خطیب

بلند مرتبت پیغمبر

بہترین مقنن

بے مثال سپہ سالار

تصورات اور اعتقادات کا فاتح اعظم

زندگی کے صحیح نصب العین کو علم اور عقل کی بصیرت کے زور سے منوانے والا مصلح

انسانیت کے ہر طبقے کا سچا راہنما

ایک ایسے نظام عدل کا بانی جس میں تقوے کے علاوہ اور کوئی فضیلت نہیں ہے۔

غریبوں اور بیکسوں کا نگہبان، یتیموں کا مولیٰ، محتاجوں کا ملجا و ماوا بے آسروں کا سہارا۔ کونین کا والی

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جوہر انسانیت کی تکمیل و ارتقا کا قائم الدائم نمونہ!

---

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۰۔ نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق ہر مسلمان کے لئے ان پانچ بنیادی حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے

۱۔ اللہ پر ۲۔ ملائکہ پر ۳۔ قرآن حکیم اور سابقہ کتب پر

۴۔ انبیائے کرام علیہم السلام پر اور ۵۔ یوم آخرت پر ۔

ایمان کے معنے ہیں ماننا یقین کرنا، سچے ہونے کا اقرار کرنا (قول وعمل سے)، اعتماد کرنا، بھروسا رکھنا اور سر تسلیم خم کر دینا۔ مندرجہ بالا پانچ حقیقتوں میں سے کسی ایک کا انکار باقی سب کے انکار کے مترادف ہے (۲۱۱:۷۷) ایمان کے ان معانی کی رُو سے اللہ پر ایمان لانے کے معنے ہوئے: اس کی ہستی پر یقین، اس کی ہر بات پر اعتماد، اس کے ہر حکم کی تعمیل اور اس کے ہر قانون کے سچا ہونے کا قولاً و فعلاً اقرار کرنا۔ ملائکہ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ کائناتی نظام کو اللہ کے قوانین و احکام کے مطابق چلانے کے لئے مخفی قوتیں سرگرم عمل ہیں، یہ قوتیں وہی کچھ کرتی ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ ان قوتوں کو انسان کے آگے جھکا دیا گیا ہے۔ اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انبیائے کرام کو انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی ملتی رہی ہے وہ بالکل سچی اور صحیح تھی، اور انبیائے کرام اس وحی کے مطابق اپنے عمل کے ذریعے جو ضابطہ زندگی انسانوں تک پہنچاتے رہے ہیں وہ اللہ ہی کا مقرر کردہ راستہ تھا۔ ان سابقہ انبیا کے ذریعے انسانوں تک پہنچنے والے احکام و قوانین برحق تھے۔ ان کی تعلیم دین اسلام ہی کی تعلیم تھی قرآن حکیم ان سابقہ کتب سماوی کی آخری کڑی ہے اس میں وہ تمام باتیں ارتقا یافتہ صورت میں اکٹھی کر دی گئی ہیں جو انبیائے سابقہ کو متفرقاً ملی تھیں۔ انبیائے کرام پر ایمان لانے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی عقلی و فکری استعداد اور دوسری اعلیٰ صفات کے باوجود شاہراہ زندگی پر، جو جسمانی موت کے بعد بھی آگے بڑھ جاتی ہے، سلامت روی کے ساتھ نہیں چل سکتا کیونکہ عقل اور دوسری صلاحیتیں محدود ہیں اور نامکمل ہیں۔ انہیں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور یہ رہنمائی صرف اللہ کے منتخب انسانوں کے ذریعے ہی ملتی رہی ہے جنہیں نبی اور رسول کہا جاتا ہے یہ برگزیدہ اشخاص ہر زمانے میں مختلف قوموں کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے ہیں اب یہ سلسلہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ہے، کیونکہ انسانی شعور انبیائے کرام کی تعلیمات کی بدولت پختگی کی اس سطح پر پہنچ چکا ہے کہ اب یہ عالمگیر حکمات کا متحمل ہو سکتا ہے، اور اس قابل ہے کہ ہر زمانے کے لئے صحیح ثابت ہونے والی رہنمائی پر عمل کر سکے۔ یوم حساب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس حقیقت پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ زندگی کی جوئے رواں طبعی زندگی کے بعد بھی جاری ہے اور ہر انسان کو اس دنیا کے اعمال کا بدلہ پورے انصاف کے ساتھ مل کر رہے گا۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

قرآن حکیم تمام سابقہ کتابوں کا مُصَدِّق ہے اور ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم ان پر ایمان لائیں۔ مصدِّق کے معنے ہیں سچ کر دکھانے والا، سچا ثابت کرنے والا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے انبیائے کرام پر نازل ہونے والی تمام کتابیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری کی پیش گوئیاں کرتی رہی ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قرآن حکیم بالکل اسی طرح آئے جس طرح ان سابقہ کتابوں بالخصوص تورات اور انجیل نے پہلے سے خبر دے رکھی تھی۔ لہٰذا آنحضور کی بعثت اور قرآن حکیم کے نزول نے تورات اور انجیل کو سچ کر دکھایا۔ قرآن حکیم سابقہ اہل کتاب سے کہتا ہے کہ جو کچھ بھی غیر آمیزش شدہ وحی تمہارے پاس موجود ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

اس وقت دنیا میں جتنے بھی مذاہب رائج ہیں ان میں اخلاقی اصُول و ضوابط تو اکثر و بیشتر وہی ہیں جو قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کے پاس بھی ان اخلاقی اصولوں کو مشہود کرنے کا کوئی عملی نظام نہیں ہے یعنی لازمی تعلیم کا کوئی ایسا پروگرام نہیں جس سے یہ ضوابط عملاً نافذ ہو سکیں۔ ان اخلاقی قدروں کی حیثیت ان تمام مذاہب و مکاتب فکر میں محض نظریاتی اور تصوراتی ہے۔ قرآن حکیم نے ان تمام ابدی حقیقتوں اور مستقل قدروں کو واضح اور مکمل نظام دے کر گویا ان کو بھی سچ کر دکھایا ہے لہٰذا اس لحاظ سے بھی اللہ تعالےٰ کی یہ آخری وحی سابقہ تمام سچائیوں کی مُصَدِّق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیائے سابقہ کی کوئی بھی کتاب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں رہی۔ ان تمام کتابوں میں مختلف لوگ اپنی خود غرضیوں کے تحت ردّ و بدل، حک و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کرتے رہے ہیں لہٰذا ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اس دستبرد سے محفوظ رہی ہو۔ اور جو پورے وثوق کے ساتھ وحیٔ ربّانی کا دعویٰ کر سکے اسی لئے قرآن حکیم نے بَیْنَ یَدَیْہِ یعنی جو کچھ بھی ان کے پاس ہے اور مَعَکُمْ یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے کے الفاظ استعمال کئے ہیں کتابوں کا نام نہیں لیا۔ بلکہ اس عظیم کتاب نے تو واضح طور پر تورات اور انجیل میں انسان کی طرف سے کی گئی تحریفات کی نشان دہی کر دی ہے اور آج کی تحقیقات سے کئی صدیاں پہلے بتا دیا ہے کہ جن کتابوں کو تم نے آسمانی کتاب سمجھ رکھا ہے ان میں بیشمار ملاوٹیں ہیں۔ مثال کے طور پر فرمایا ہے کہ "جو کتاب موسیٰ لائے تھے وہ تو نور و ہدایت تھی، لیکن تم نے انسانوں کے دکھاوے کے لیے اس کو علیٰحدہ علیحدہ ورقوں میں بانٹ رکھا ہے اور تم اس کے بہت سے مندرجات کو چھپائے ہوئے ہو" (۶ : ۹۱) یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی لیکن اس کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے" (۱۱ : ۱۱۰) ان کے ایک گروہ نے اللہ کے کلام کو سُنا اور پھر جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دی" (۲ : ۷۵) افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کی طرف سے ہے۔ ایسا کرنے سے یہ لوگ بہت قلیل سا مفاد حاصل کر لیتے ہیں" (۲ : ۷۹) "اے اہل کتاب! تم کیوں سچائی کے ساتھ جھوٹ کو ملا دیتے ہو۔ اور جان بوجھ کر سچائی کو چھپا دیتے ہو" (۳ : ۷۱) "اور یاد رکھو اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ وہ اسے (یعنی وحیٔ ربّانی کو) لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کرتے رہیں گے۔ اور اسے چھپائیں گے نہیں لیکن انہوں نے (اس عہد کو) پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور اس طرح محض قلیل سا مفاد حاصل کر لیا۔ کتنا بُرا سودا کیا ہے انہوں نے؟" (۳ : ۱۸۷) یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو الفاظ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ (۴ : ۴۶) یہودیوں نے اللہ کے کلام کے الفاظ میں ہیر پھیر کر دیا تھا۔ انہیں ان کے مقام

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے بدل دیا تھا (۱۳:۵) اور اپنی کتاب کے اکثر حصوں کو چھپا دیا تھا۔ (۱۵:۵)

آسمانی کتابوں میں کسی غیر اللہ کے کلام کو ملا دینا تحریف اور شرک ہے، حق اور باطل کا آمیزہ دین کے لئے حجت اور سند نہیں بن سکتا۔ لہٰذا جن سابقہ کتابوں کو خود قرآن حکیم تحریف شدہ اور غیر خالص قرار دے رہا ہے وہ ان کے سچا ہونے کی تصدیق کس طرح کر سکتا ہے۔ ہاں سچی تو وہ وحی تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام کو ملتی رہی اور جس کے مطابق وہ اپنی اپنی امتوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتے رہے۔ قرآن حکیم کی مندرجہ بالا آیات سے یہ حقیقت واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے وقت کوئی بھی آسمانی کتاب بغیر آمیزش کے موجود نہ تھی۔ اگر موجود ہوتی تو بھی یہ "مکمل ضابطۂ زندگی" نہ بن سکتی تھی۔ کیونکہ ان تمام کتابوں میں ابدی صداقتیں متفرق دی گئی تھیں۔ اور وہ بھی مخصوص اقوام اور خاص زمانے کے لیے۔ نیز صد امتوں کو اپنی آخری ترقی یافتہ صورت میں بھی نہیں دیا گیا تھا۔ ان کی حیثیت ابتدائی تربیتی کورس کی سی تھی۔ قرآن حکیم میں ان تمام کتب ہائے سابقہ کی متفرق تعلیمات کو نہ صرف ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے بلکہ انہیں مزید ارتقائی شکل دے کر "اکمل" بھی بنا دیا گیا ہے تاکہ یہ کتاب ہُدیٰ قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی صحیح رہنمائی کرتی رہے اور اس میں کسی خاص قوم، خاص زمانے اور خاص حالات کے تقاضوں کے پیش نظر ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ انسان کی ترقی پذیر شعور اور علم کا "ہر زمانے میں" ساتھ دے سکے نیز اس کا پیش کردہ نظام حیات عالمگیر سطح پر پوری انسانیت کے لئے قابل قبول ہو۔ لہٰذا جب قرآن حکیم ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم پہلی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لاؤ تو اس کا مطالبہ ان معنوں میں ہے کہ تم دل سے تسلیم کرو کہ انبیائے سابقہ پر بھی اللہ ہی کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہی ہے نہ کہ یہ کہ جن کتابوں کو لوگ اس وقت موجودہ صورت میں الہامی کہتے ہیں یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں کہتے تھے انہیں لفظ بہ لفظ اللہ کی وحی سمجھو تو اس میں تو قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق بہت کچھ آمیزش ہو چکی ہے۔

سابقہ کتب سماوی کے سلسلے میں عام طور پر یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ جن انبیائے کرام کی کتابوں کے نام واضح طور پر قرآن حکیم میں دیئے گئے ہیں یعنی توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن، ان کو تو مذکورہ کتابیں دی گئی ہیں۔ لیکن باقی نبیوں کو کتابوں کی بجائے صحیفے دیئے گئے ہیں اور صحیفوں سے مراد متفرق اوراق یا مختصر سے حکم نامے لئے جاتے ہیں کتابوں اور صحیفوں کی یہ تفریق علمی حد تک شاید جائز بھی جا سکے ورنہ کتب اور صحائف یا صُحُف یا زُبُر مترادف با ہم معنی الفاظ ہیں سوائے البتہ اس بات کے کہ کتاب کے لفظ میں شیرازہ بندی، سیے جانے یا کسی چیز کو محفوظ کر دینے کا مفہوم لازماً شامل ہے اُن سیلے متفرق اوراق کو کتاب نہیں کہا جا سکتا۔

لگے ہاتھوں "کتاب" کے معنے بھی جان لینے چاہئیں، کیونکہ قرآن حکیم الکتاب ہے اور اس میں کتاب کا لفظ بطور اسم اور فعل بہت سے معنوں میں آیا ہے، امام راغب اصفہانی کی "مفردات القرآن"[۲] اور دوسری کتب لغت سے معنے اخذ ہوتے مختصراً یہ ہیں: عرب کے لوگ اپنی اعلیٰ نسل کی اونٹنیوں کے رحم میں لوہے کے چھلے ڈال دیتے تھے تاکہ یہ عام اونٹنیوں کی طرح حاملہ نہ ہو جائیں، اسے كَتَبَ النَّاقَة کہتے تھے، اسی طرح یہ اونٹنیوں کے تھنے بھی چمڑے کے باریک تسمے سے سی دیتے تھے تاکہ یہ اپنے بچے کو سونگھ نہ سکیں اسے بھی کَتَبَ کہتے تھے۔ مشکیزے یا بوری وغیرہ کے منہ کو سی

jabirabbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کر بند کر دینے کے لئے بھی کُتُب بولتے تھے۔ یہیں سے لفظ کتاب "مشتق" ہوا ہے۔ اس سے مراد منتشر اوراق کی حلقہ بندی کر کے انہیں اس طرح یکجا جمع کر لینا تھا جس طرح بوری کا منہ بند کر کے اوپر سے سی دیا جاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن حکیم نے اپنے آپ کو "کِتَابٌ" کہا تو اس وقت یقیناً قرآن پاک منتشر اوراق یا کھجوروں کے پتوں یا ہڈی کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا نہیں تھا (جیسا کہ مخالفین نے مشہور کر رکھا ہے) بلکہ ایک سلے ہوئے مجموعے کی شکل میں مرتب و مدوّن تھا۔ ہر تازہ وحی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق اپنے مقام پر سی لی جاتی تھی۔ منتشر صورت میں اسے کتاب کہا ہی نہیں جا سکتا۔ چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ہی جمع کیا جا سکتا ہے اس لئے "کُتُبٌ" کے معنے لکھنا ہو گئے (کَتَبَ = اس نے لکھا) لکھی ہوئی بات پکی، محفوظ اور مستقل ہوتی ہے اس لئے اس کے معنے حکم اور فیصلے کے بھی ہیں کُتِبَ عَلَیْکُمْ کے معنے ہیں تم پر فرض اور لازمی قرار دیا جاتا ہے لازمی اور ضروری احکام اور فیصلے قانون کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے مجموعۂ قوانین و ضوابط کو "کتاب" کہا جاتا ہے۔ مفتی محمد عبدہ اپنی تفسیر "المنار" میں لکھتے ہیں کہ کتاب "بمعنی مکتوبٌ" ہے اور یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ ذٰلِکَ الْکِتَابُ (۲:۲) سے اشارہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اور صرف قرآن حکیم کے لکھنے کا حکم فرمایا تھا اس کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں دیا تھا لہٰذا مکتوب صورت میں صرف قرآن حکیم ہی موجود تھا جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اَلصَّحِیْفَۃُ کی جمع اَلصَّحَائِفُ اور اَلصُّحُفُ آتی ہے۔ یہ لکھے ہوئے کاغذ کو کہتے ہیں عام طور پر یہ لفظ چہرے کے لئے اور کتاب کے ورق کے لئے بولا جاتا ہے۔ دراصل یہ ہر پھیلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اَلْمُصْحَفُ، میم کی تینوں حرکتوں کے ساتھ متعدد لکھے ہوئے اوراق کا مجموعہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتے تھے۔ (۹۸:۲) یعنی قرآن پاک کے لکھے ہوئے اوراق کی تلاوت فرماتے تھے۔ اسی طرح خود قرآن حکیم کے بارے میں ہے کہ یہ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ میں ہے یعنی بلند مرتبہ، پاکیزہ، مقدس اور خالص، یا اُن کاغذوں میں لکھا ہوا جو واجب الاحترام نیک اور دیانت دار لوگوں (۸۰:۱۳ تا ۱۶) کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی کتابوں کو بھی صحف کہا گیا ہے (۸۷:۱۹)

سابقہ پیغمبروں کی کتابوں کے لئے "زُبُر" کا لفظ بھی آیا ہے (۲۶:۱۹۶)۔ ہر وہ کتاب جو موٹے خط میں لکھی ہوئی ہو "زَبُور" کہلاتی ہے۔ تاہم عرف عام میں زبور کا لفظ اس آسمانی کتاب کے لئے مخصوص ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ یہ کتاب نغماتِ داؤد (THE PSALMS OF DAVID) کے نام سے مشہور ہے اور اس وقت بھی موجود ہے۔ لیکن اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کی موجودہ شکل اس کی اصل شکل سے مختلف ہو چکی ہے کیونکہ اس میں بعض نغمے ایسے بھی ہیں جو یقیناً حضرت داؤد علیہ السلام کے نہیں ہیں۔ تاہم اس کتاب کے وجد آفریں اور کیف آور نغمات میں نہایت اعلیٰ درجے کی شاعری ہے۔

تورات :- ان وضاحتوں کے بعد تورات اور انجیل کے بارے میں ہماری معلومات بالکل صاف اور واضح ہو جانی چاہئیں کیونکہ قرآن حکیم نے ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اور بڑے احترام اور تکریم کے ساتھ فرمایا ہے کہ اصلی اور خالص شکل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی سچی وحی تھی۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی لیکن قرآن حکیم میں موسیٰ علیہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

السلام کی کتاب کا نام خصوصیت کے ساتھ نہیں بتایا گیا۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تورات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد (۳ : ۶۵) بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بھی بعد (۳ : ۹۳) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے (۵ : ۴۶) نازل ہوئی تھی۔ یہ یہودیوں کے لئے نور و ہدایت تھی۔ اسی کے مطابق انبیائے بنی اسرائیل اور علماء و مشائخ معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ ان ارشادات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "تورات" کتابوں کے اس مجموعے کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ آج بھی اسی مجموعے کو "عہد نامہ عتیق" کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح عیسائیوں کی وضع کردہ ہے جسے وہ یہودیوں کی کتابوں کو باقی کتابوں یعنی عہد نامہ جدید سے الگ رکھنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک فرقے اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ عہد نامہ عتیق کے صحیفوں کی تعداد کتنی ہے۔ تورات کے یہ صحیفے ابتداءً تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ (۵ : ۴۴) اور ان پر احکام و شرائع درج تھے۔

تورات عبرانی کے لفظ تورہ کی جمع ہے جس کے معنے حکم اور شرع کے لئے جاتے ہیں۔ اس میں ۳۹ صحیفے ہیں اور ہر صحیفہ اپنے نبی کے نام سے منسوب ہے۔ ایک صحیفہ "اسفار موسیٰ" کے نام سے بھی شامل ہے جسے قرآن حکیم نے صحفِ موسیٰ (۸۷ : ۱۹) اور کتاب موسیٰ (۴۶ : ۱۲) سے تعبیر کیا ہے۔ عہد نامہ عتیق کو کتب خمسہ یا (PENTATEUCH) بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس کا اطلاق عہد نامہ عتیق کے ۳۹ میں سے پہلے پانچ صحیفوں پر ہوتا ہے' ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) جینیسس (GENESIS) (۲) ایگزوڈس (EXODUS) (۳) لیویٹیکس (LEVITICUS)

(۴) نمبرز (NUMBERS) (۵) ڈیوٹرونومی (DEUTERONOMY)

ان کتابوں میں آغاز تخلیق سے لے کر یہودیوں کے ارض موعود تک کے نیم تاریخی واقعات اور افسانوی بیانات درج ہیں اور کچھ نہایت خوبصورت انداز میں دیہاتی زندگی اور رومانی ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے تاہم ان کا بیشتر حصہ مکر و فریب اور ظلم و تعدی کے قصوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان افعال رذیلہ کی کہیں بھی مذمت نہیں کی گئی۔ حالانکہ آسمانی کتابوں کی تعلیمات کا ہمیشہ سے جہادی انہی خیانت کے خلاف رہا ہے۔ شریعت موسوی کا بیشتر حصہ انہی بیانیہ قصوں پر مبنی ہے۔

اگرچہ ان پانچ کتابوں کو روایتہً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے تاہم یہ بات یقینی ہے کہ یہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنی تصنیف ہیں اور نہ آپ کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں۔ بلکہ آپ کے زمانے کے قریبی عہد میں بھی نہیں لکھی گئیں جس صورت میں یہ آج موجود ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف شدہ ہیں جب یہودی بابل کی قید سے رہا ہو کر واپس مصر میں آئے تھے قیصر (CYRUS) کے جاری کردہ پروانہ رہائی کی تاریخ ۵۳۶ قبل مسیح ہے لیکن اس مجموعے کی بعض کتابیں مثلاً ہگائی (HAGGAI) زکریاہ (ZECHARIAH) اور ملاچی (MALACHI) تو زمانہ اسیری کے بھی بعد کی ہیں' آخری کتاب کی تاریخ تصنیف ۴۴۴ تا ۳۹۷ قبل مسیح ہے

کتب خمسہ کے مؤلفین نے ان کتابوں کو مرتب کرنے میں جن قدیمی حوالہ جات اور دستاویزات سے استفادہ کیا ہے ان میں سے بعض کا تو انہوں نے نام بھی لکھ دیا ہے جس سے ان کتابوں کی تحریر کا زمانہ ٹھیک ٹھیک متعین ہو جاتا ہے ان میں جو مصری یا کلدانی اصطلاحات یا تلمیحات ملتی ہیں وہ مقامی رنگ اور اپنے زمانے کے مروجہ تہذیبی آثار کا پتہ دیتی ہیں۔ اسی طرح ان کتابوں میں کچھ ایسی فروگذاشتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلفین کو ان حوالجاتی دستاویزات پر

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

بھی پورا عبور حاصل نہیں تھا جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے، موجودہ دور کے محققین اور نقادوں نے ان تحریروں کے ماخذ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے، ایک حصے کو یہوداہی (JEHOVISTIC) کہتے ہیں اور دوسرا ایلوہائی (ELOHISTIC) کہلاتا ہے تاہم ان دونوں میں زمانہ مابعد کے اضافے بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے ان میں بے حد تکرار اور تناقض پایا جاتا ہے مثال کے طور پر استثنا موسیٰ میں جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کہا جاتا ہے خود موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور اس کے بعد کے حالات بھی درج ہیں

عہد نامہ عتیق کے موجودہ مجموعہ کتاب میں کم و بیش گیارہ ایسی کتابوں کا حوالہ بھی ملتا ہے جو اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مجموعہ نامکمل ہے۔ اعلاوہ ازیں اس وقت تک یہ بھی بالتحقیق ثابت نہیں ہو سکا۔ کہ ابتداً یہ مجموعہ کس زمانے میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اور ان کے مؤلفین کون تھے، جو بات یقینی طور پر معلوم ہے وہ یہ ہے، کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے شہنشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا اور تورات کی تختیوں کو جلا ڈالا جب یہودی بابل کی قید سے واپس اپنے شہر یروشلم میں آئے تو انہیں اپنے معدوم صحیفوں کو از سر نو مرتب کرنے کا خیال آیا چنانچہ عزیر نے مذکورہ پانچ کتابوں کو تصنیف در تیار کیا اور واقعات کو نیم تاریخی حیثیت سے افسانوی رنگ میں پیش کر دیا۔ عزیر کا زمانہ بابل کی تباہی کے تقریباً ایک سو سال بعد یعنی ۴۴۴ تا ۴۵۸ قبل مسیح تسلیم کیا جاتا ہے یہ نئی تصانیف کس طرح وجود میں آئیں اس کے متعلق خود عزیر لکھتا ہے:

"دوسرے دن ایک آواز نے مجھے بلایا اور کہا: اے عزیر! تم اپنا منہ کھول لو۔ اور جو میں تجھے پینے کیلئے دیتا ہوں اسے پی لو۔ سو میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ پھر دیکھو اس نے مجھ تک ایک پیالہ بھیج دیا جس کا رنگ آتشیں تھا۔ میں اسے لے کر پی گیا۔ پھر میرے فہم و فراست اور سینے میں بصیرت پیدا ہو گئی، اور میری روح نے میرے حافظے کو تیز کر دیا۔ پھر جو میری زبان کھلی تو بند نہ ہوئی۔ اور لکھنے والے چالیس دن تک بیٹھے لکھتے رہے میں دن بھر لکھاتا رہتا۔ وہ رات کو کچھ کھا لیتے۔ میری زبان رات کو بھی بند نہ ہوتی تھی، چالیس دنوں میں ۲۰۴ کتابیں لکھ ڈالیں (کتاب عزیر ۲۔ ۱۴ تا ۴۴)

یہ بیان کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے۔

تاریخی اعتبار سے مندرجہ ذیل حقائق بہت اہم ہیں

۱۔ بخت نصر نے جب تورات کی تختیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا، یہ واقعہ اور یہودیوں کی قید کئے جانے کا واقعہ ۵۸۶ ق م میں پیش آیا۔

۲۔ یہودیوں کو اس کے پچاس برس بعد ۵۳۶ ق م میں رہائی ملی۔ اس کے ۱۷ سال بعد تک یہودی واپس یروشلم آتے رہے اور اس طرح ان کی واپسی ۵۲۰ ق م میں مکمل ہوئی۔

۳۔ عزیر نے اس کے بھی ۷۶ سال بعد یعنی ۴۴۴ ق م میں "جل کر راکھ ہو جانے والی" تختیوں کو از سر نو مرتب کیا اور جس طرح کیا وہ اس کے اپنے بیان سے واضح ہے، تاریخی اعتبار سے ان تختیوں کی یہ تالیف نو ان کے جل کر راکھ ہو جانے کے ۱۴۲ سال بعد ہوئی۔ عزیر نے نہ تو اصل تختیوں کو کبھی دیکھا تھا۔ نہ پڑھا تھا۔ اور نہ سنا تھا۔ چنانچہ یہ کہنا کہ "حافظے" کی مدد سے کتابیں دوبارہ مرتب ہوئیں، ناممکن ہے۔ خود عزیر کا بیان ہے کہ اس نے ۲۰۴ کتابیں لکھوائیں اس کی تغلیط کرتا ہے۔

Presented by: Rana Jabir Abbas
Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عزیر کے بعد ایک اور شخص نحمیاہ بھی ہے جس نے کچھ اور کتابوں کی تالیف کی ہے۔ لیکن پھر ہوا یہ کہ انطاکیہ کے یونانی بادشاہ اینٹونس نے ۱۶۸ ق م میں ایک بار پھر یوروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور عزیر اور نحمیاہ دونوں کی مرتب کردہ کتابوں کو جلا کر مٹا دیا۔ اس طرح ایک بار پھر یہ کتابیں صفحۂ دنیا سے ناپید ہو گئیں۔ تاہم ایک شخص یہودا مقتابی نامی نے پھر مرتب کرکے ان کو مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے یہ کتابیں مکمل کئے ہی تھے کہ ۷۰ سال کے اندر رومیوں نے یلغار کر دی اور ٹائٹس نے یوروشلم کو پہلے کی طرح تباہ کر دیا۔ اس نے ان تیسری مرتبہ تالیف ہونے والی کتابوں کو ضائع کر دیا البتہ انہیں اپنے ساتھ لے گیا تاہم اس کے اس بڑے پیمانے پر حملے کے بعد یہودی دنیا میں کسی جگہ بھی اپنا ٹھکانہ نہ بنا سکے۔ منتشر ہو کر بھی ان کے علماء اور مشائخ نے سنی سنائی باتیں اکٹھی کر کے ایک بار پھر اپنی کتابیں مرتب کر لیں۔ بہر حال یہ تھے وہ واقعات و حادثات جو صدیوں تک ان کتابوں کو پیش آتے رہے۔ قطع نظر ان واقعات کے جو کچھ "تورات" کے نام سے تسلیم کی جانے والی کتابوں" کے ساتھ خود مؤلفین اور مرتبین کے ہاتھوں ہوا ہے، اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں عیسائی مورخ رینان (RENON) اپنی کتاب لائف آف جیسس (LIFE OF JESUS) میں لکھتا ہے کہ زمانہ قبل مسیح میں تورات کے اندر بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ بعض بالکل نئی کتابیں تصنیف ہوئیں مثلاً کتاب استثنا۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کو موسیٰ علیہ السلام کی اصلی شریعت کہا جاتا ہے، حالانکہ سابقہ کتابوں سے ان کی روح تک مختلف تھی۔ (صفحہ ۴۰)

اپنی غلط سلط کتابوں کو الہامی منوانے کے لئے یہودیوں نے ایک عقیدہ یہ بھی رائج کر دیا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تورہ شبکتب (یعنی وحی مکتوب یا وحی متلو) اور دوسری تورہ شبعلفہ یعنی (وحی غیر مکتوب یا غیر متلو) اسی عقیدے کے تحت انہوں نے روایات کو اور سینہ بہ سینہ چلی آنے والی باتوں کو بار بار جمع کر کے اسے بھی تورات کا درجہ دے دیا ہے، اگرچہ کہتے وہ اسے مستثنیٰ ہی ہیں۔ ان بار بار جمع ہونے والی کتابوں کی تفسیریں بھی لکھ ڈالی گئی ہیں، ان تفسیروں کو "جمارا" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مستثنیٰ اور جمارا دونوں کے مجموعے کو "تالمود" کہا جاتا ہے پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ تالمود بھی دو ہیں ایک شامی تالمود دوسری بابلی تالمود، یہ دونوں مجموعے پانچویں صدی عیسوی کے مرتب شدہ ہیں۔

ایک بات اور توجہ طلب یہ بھی ہے کہ یہودیوں کی زبان عبرانی تھی، بابل کی قید سے رہائی پانے کے بعد ان کی زبان "ارامی" ہو گئی۔ لیکن یہودیوں کی کوئی ایک کتاب بھی نہ عبرانی میں ہے اور نہ ارامی میں ہے، اور نہ کبھی تھی۔ جن کتابوں سے دنیا تورات کے نام سے روشناس ہوئی ہے۔ وہ سب کی سب یونانی زبان میں تھیں۔ کہتے ہیں کہ "اسفار موسیٰ" کا ترجمہ یونانی زبان سے ارامی زبان میں ہوا تھا جس کا ایک نسخہ اسکندریہ کی لائبریری میں موجود تھا۔ لیکن عیسائیوں نے اس نسخے کو بھی جلا دیا۔ پھر ۳۹۴ء میں سینٹ جیروم نے رومی ترجمہ شائع کیا۔ جو اب وُلگیٹ (VULGATE) سے مشہور ہے لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اسے کونسی زبان سے رومی زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔

اس وقت تورات کے نام سے جو نسخے دنیا میں موجود ہیں، ان میں پہلا نسخہ ۱۴۸۸ء کا شائع شدہ ہے، اس کے ۲۶۲ سال بعد جب ۱۷۵۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں اور پہلے ایڈیشن کے نسخے میں بارہ ہزار اختلافات تھے۔ اب یہی دوسرا ایڈیشن والا نسخہ "تورات" یا "عہد نامہ عتیق" کہلاتا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

رینان نے تو ان اختلافات کی بنا پر یہ تک کہہ دیا ہے کہ خود موسیٰ علیہ السلام بھی فرضی اور دیو مالائی شخصیت ہیں تاہم ہمارا ایمان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مامور من اللہ سچے پیغمبر تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دی گئی تھی جو نور و ہدایت تھی لیکن یہ کتاب محفوظ نہ رہ سکی ضائع ہو گئی۔ اگرچہ یہودیوں نے اس کتاب کو بار بار مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم اللہ کے کلام کو زبانی روایات اور سنی سنائی باتوں سے مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ یہ ثابت بھی نہیں ہے کہ کسی دور میں اصلی کتاب کو من و عن یاد رکھنے والے حفاظ بھی تھے یا نہیں، لہٰذا تورات کے نام سے جو مجموعہ اس وقت دنیا میں موجود ہے وہ اصل وحیٔ ربانی سے بہت دور ہے۔ اصل وحیٔ ربانی تو ظہور اسلام بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بہت پہلے معدوم ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں شریعتِ موسوی کا جو بھی کوئی بھی نسخہ موجود تھا اس میں محض روایات پر مبنی تحریریں تھیں، جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے اور بعد کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے۔

رینان اپنی دوسری کتاب ہسٹری آف دی پیپل آف اسرائیل، کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ یہودیت کی حتمی تشکیل عزیر کے زمانے سے ابتک زبانی ہے۔ عیسائیت کے قدماء دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ یہودیت نواز تھا۔ جو عیسیٰ علیہ السلام کے مشن کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہودی شریعت اور رواج کو اپنانا چاہتا تھا۔ دوسرا گروہ جس کا قائد سینٹ پال تھا یہودی شریعت اور دستور سے کٹ گیا تھا، تاہم یہ دونوں فریق عہد نامۂ عتیق کو اسی حالت میں کہ جس حالت میں یہ تھی مقدس کتاب تسلیم کرتے تھے۔ بالآخر پال کا گروہ غالب آگیا اور اس طرح "مذہب پولوسیت" رائج ہو گیا۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ مذہب پولوسیت اور رائج الوقت انجیلوں کی اصلیت کیا ہے۔

موجودہ اناجیل و اس وقت جس مذہب کو عیسائیت کا نام دیا جاتا ہے وہ در اصل پولوسیت ہی ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب "انجیل" کا حشر بھی تورات کے حشر سے کم نہیں ہے! موجودہ عیسائیت یا مسیحیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیش کردہ دین نہیں ہے ان کا پیش کردہ دین تو اسلام ہی تھا لیکن بعد میں جیسا کہ تمام انبیائے کرام سے پیروکار کرتے چلے آئے ہیں، اصل دین کی صورت کو مسخ کر دیا گیا۔

اس وقت "انجیل" کے نام سے جو کتاب پیش کی جاتی ہے وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی وحی نہیں ہے۔ اصل وحی نہ عہد جدید میں ہے اور نہ ان چار انجیلوں میں ہے جنہیں چرچ مستند کتابوں کے طور پر پیش کرتا ہے "روح القدس" (جبریل) کے ذریعے نازل ہونے والی "وحی" جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ضابطۂ زندگی کے طور پر پیش کیا تھا اور جسے وہ اپنے حواریوں کو دے کر گئے تھے اس کا اب کہیں پتہ نشان بھی نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت عرصہ بعد جب مسیحی کلیسا یہودیوں و غیر یہودیوں کی باہمی آویزش کی آماجگاہ بن گیا تو مختلف عقائد کے فرقوں نے اپنی اپنی علیحدہ انجیلیں مرتب کرنی شروع کر دیں۔ محققین نے اس زمانے میں مرتب ہونے والی کم از کم ۴۴، انجیلوں کا کھوج لگایا ہے، تاہم یہ انجیلیں بھی حضرت عیسیٰ کی سوانح حیات پر مبنی ہیں۔ اور ان سوانح کو بھی عام روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان آرامی تھی لیکن سوائے ایک انجیل کے جو اس وقت معدوم ہے۔ باقی سب کی سب یونانی زبان میں ہیں۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۔ چار انجیلیں: متی، لوقا، مرقس، یوحنا۔ ان میں مختلف اقسام کی باتیں ہیں۔

۲۔ (THE ACTS OF APOSTL) جنہیں غالباً لوقا نے لکھا ہے اور جن کا مقصد حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بعد سے ۶۱ء تک ہونے والی مسیحی ترقی کا ذکر ہے جو سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کی قیادت میں ہوئی۔

۳۔ اکیس خطوط جن میں سے بیشتر سینٹ پال نے مختلف چرچوں یا شخصوں کو لکھے ہیں۔ یا دوسرے حواریوں کے لکھے ہوئے ہیں اور عام نوعیت کے ہیں۔

۴۔ کتاب وحی یا (APOCALYPH) جسے سینٹ یوحنا سے منسوب کیا گیا ہے اس میں کچھ ایسی پیشین گوئیاں بھی درج ہیں جن کے مفہوم کو سمجھنا دشوار ہے۔

پروفیسر ایف سی برکٹ اپنی کتاب "کینن آف دی نیو ٹسٹامنٹ" میں لکھتا ہے کہ یہ کتاب اِدھر اُدھر کی متفرق باتوں کا عجیب و غریب مرقع ہے، اس میں یسوع مسیح کی چار سوانح عمریاں ہیں جن میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو دوسری سے بے نیاز یا بے تعلق ہو۔ یہاں تک کہ اگر انہیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھا جائے تو یہ سب کی سب غیر متوازن اور غیر متناسب دکھائی دیں گی۔ ان میں سے ایک تو اپنے اختتامی حصے پر پہنچ کر بھی بالکل ناقص دکھائی دیتی ہے اور کسی دوسری بڑی کتاب کا تمہیدی حصہ معلوم ہوتی ہے، غیر مربوط ادب کا یہ سارا سرمایہ نوعیت کے اعتبار سے بھی محض سطحی سا ہے، شاید یہ اس وجہ سے ہے کہ ابتدائی دور کے عیسائی دنیا کے بہت جلد ختم ہو جانے کے منتظر تھے

ان چاروں انجیلوں کی تاریخ تصنیف کے بارے میں صرف اتنی بات معلوم ہے کہ یہ دوسری صدی کے اواخر میں موجود تھیں۔ لوقا اور مرقس حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حواریوں میں سے نہیں تھے۔ یوحنا کی انجیل کے مصنف اور کتاب کی تاریخ تصنیف کے بارے میں بھی شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بات بھی پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ ایک ہی آدمی کی لکھی ہوئی ہیں یا نہیں۔ کلیمنٹ آف روم میں جو ۹۷ء کی تحریر ہے اور پالی کارپ میں جو ۱۱۲ء کی تحریر ہے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بعض ایسی باتوں کا بھی حوالہ ہے جو موجودہ چاروں انجیلوں سے مختلف ہیں۔ چنانچہ متفرقات کے اس ملغوبے کو صاف کرنے اور کھنگالنے کی غرض سے ۳۲۵ء کی نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی اس کونسل کے سامنے یہ تمام لٹریچر رکھا گیا۔ چنانچہ طویل تفتیش اور چھان پھٹک کے بعد اس کونسل نے صرف ان چار انجیلوں کو منتخب کیا اور باقی تمام لٹریچر کو جعلی قرار دے دیا۔ تاہم تعجب کی بات یہ ہے آج دنیا میں ان چار منتخب شدہ انجیلوں میں سے کوئی ایک بھی اپنی اصلی شکل و صورت میں، یعنی جس میں کہ وہ منتخب ہوئی تھی موجود نہیں ہے، قدیمی نسخوں میں سے اس وقت دنیا میں صرف تین انجیلیں موجود ہیں ایک ویٹیکن میں ہے۔ دوسری برٹش میوزیم میں ہے اور تیسری وہ ہے جسے روس نے انگلستان کے پاس فروخت کیا ہے۔ پہلے دونوں نسخے پانچویں صدی عیسوی کے ہیں، روس والا نسخہ چوتھی صدی کا ہے تاہم ان میں ۳۲۵ء میں منتخب ہونے والا نسخہ کوئی بھی نہیں ہے۔

سینٹ جیروم نے چوتھی صدی عیسوی میں ان کا ترجمہ یونانی زبان سے لاطینی میں کیا ہے۔ یہی ترجمہ شاہ جیمز کے زمانے میں شائع ہونے والے ترجمے کا ماخذ ہے اور یہی مستند مانا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ اشاعت ۱۶۱۱ء ہے، اس کے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۲۵۹ سال بعد ۱۸۷۰ء میں عیسائیوں کے ۲۷ علماء کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ یہ ترجمہ بھی ناقص ہے۔ اس لئے ایک اور ترجمہ شائع کیا جائے۔ چنانچہ یہ دوسرا ترجمہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن کہلاتا ہے۔ اور اب اسی کو مستند سمجھا جاتا ہے لیکن اس وقت دنیا میں جو ترجمے موجود ہیں وہ اس ترجمے کے بھی عین مطابق نہیں ہیں۔ بائیبل سوسائٹیوں سے شائع ہونے والا ہر ترجمہ پہلے ترجمے سے مختلف ہوتا ہے، جرمنی کے ڈاکٹر میل نے عہد نامہ جدید کے چند نسخے جمع کر کے ان کا مقابلہ کیا، تو تیس ہزار اختلافات ظاہر ہوئے پھر جب جلاچیمز نے ذرا اور تحقیق سے کام لیا تو دس لاکھ اختلافات سامنے آ گئے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہ تبدیلیاں کسی بھول چوک کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ جان بوجھ کر اور ثواب کا کام سمجھ کر کی گئی ہیں۔ خود سینٹ پال کا بیان ہے کہ "اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے ظاہر ہوئی تو مجھ پر ایک گنہگار ہونے کا کیوں حکم لگایا جاتا ہے (رومیوں کے نام خط ۳/۷)

ڈاکٹر جوڈ کی کتاب "گاڈ اینڈ ایول" کے یہ الفاظ بڑی تلخ نوائی کے مظہر ہیں کہ "جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک ہے وہ حضرت عیسٰی کا کیریکٹر ہے جو یہ انجیلیں پیش کرتی ہیں۔" ذرا سوچئے کہ جب قرآن حکیم نے یہ ارشاد کیا کہ انجیل تحریف شدہ ہے اور پھر حضرت بی بی مریم اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے سوانح پیش کر دیئے تو یہ عیسائیوں پر کتنا بڑا احسان تھا!

الغرض جس انجیل مقدس کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے اور جو قرآن سے پہلے انسانوں کے لئے ہدایت کا موجب تھی (۳:۳) اور جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دی گئی تھی (۲۹:۵ - ۲۷:۵۷) وہ نہ تو ان چار انجیلوں پر مشتمل ہے اور نہ عہد نامہ جدید ہے (جس کی تاریخی اہمیت اور حیثیت اوپر بیان کر دی گئی ہے) پھر بھی ہم مسلمان ان دونوں تحریف شدہ کتابوں یعنی تورات اور انجیل کا بصورتِ موجودہ بھی احترام کرتے ہیں کیونکہ ان میں اصلی وحیٔ الٰہی کے مفہوم کے ساتھ ملتا جلتا کوئی نہ کوئی بیان اب بھی مل جاتا ہے مثال کے طور پر قرآن حکیم کی آیات نمبر ۷۷ : ۲ اور ۶۷ : ۷ اور انجیل کا مجلہ نمبر جس کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ قرآن حکیم تو ہمیں یہاں تک حکم دیتا ہے کہ تمام دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں تک کو عزت کی نگاہ سے دیکھو اور ان کی حفاظت کرو (۲۲:۳۹-۴۱) اس کے علاوہ ہم اسی لئے بھی ان کو متبرک اور مقدس کتابوں کا درجہ دیتے ہیں کہ ان میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری بحیثیت نبی آخر الزمان اور بطور رحمۃ للعالمین کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ اگرچہ تحریف کرنے والوں نے بہت کچھ رد و بدل کرنے اور اصل الفاظ کو مٹا دینے کی کوشش کی ہے۔ تاہم صداقت ان تمام تحریفوں اور کوششوں کے باوجود کسی نہ کسی رنگ میں برقرار رہی ہے اور آئندہ بھی اپنے دوامی اور پائیدار ہونے کا ثبوت پیش کرتی رہے گی۔ مثال کے طور پر انجیل یوحنا کی آیات ۱۴:۱۵ - ۱۹:۷ - ۱۵:۲۶ - ۱۲ : ۱۶ (اگڈ نیوز بائیبل ۱۹۷۶ء ایڈیشن صفحات ۱۳۹ و ۱۴۰) میں ایک لفظ (HELPER) ملتا ہے جو چند سال پہلے کی انجیلوں میں (COMFORTER) لکھا ہوا تھا۔ یہ لفظ اصل میں یونانی زبان کا (PARACLETOS) تھا (فارقلیط) جس کے معنے ہیں وکیل، دوسروں کے کام سنوارنے والا، وہ جو دوسروں کی مدد پر مامور کیا جائے۔ اصل وحی میں یہ لفظ (PERICLYTOS) تھا جس کا ترجمہ عربی زبان میں محمد یا احمد کے سوا اور کسی لفظ سے ہو ہی نہیں سکتا۔ پہلے تو اصل لفظ کے ساتھ ملتے جلتے لفظ کو لکھا گیا۔ پھر اس لفظ کے کئی ترجمے کئے گئے مثلاً

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

(HELPER) COUNSELLOR, STRENGTHENER, ADVOCATE, INTERCESSOR, STANDBY, COMFORTER وغیرہ (دی ایمپلیفائیڈ نیو ٹسٹامنٹ ۱۹۵۸ ایڈیشن)

تاہم جو نیا لفظ بھی ترجمے میں لایا گیا ہے اس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی نہ کوئی صفاتی نام ہی سامنے آتا ہے ایک ترجمہ (MERCY FOR ALL CREATURES) کیا گیا۔ یہ عربی میں رحمۃ للعالمین ہے

عہد قدیم میں جس شکل میں آج موجود ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک پیش گوئی اب بھی موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

(GOD) WILL SEND YOU A PROPHET LIKE ME FROM AMONG YOUR OWN PEOPLE AND YOU ARE TO OBEY HIM (DEUT 18:15) SO THE LORD SAID TO ME (MOSES).....I WILL SEND THEM PROPHET LIKE YOU FROM THEIR OWN PEOPLE; I WILL TELL HIM WHAT TO SAY, AND HE WILL TELL THE PEOPLE EVERYTHING I COMMAND". (DEUT, 18:18, Good News BIBLE, P109)

ترجمہ:- تمہارا رب تمہارے درمیان تمہی بھائیوں میں سے ایک نبی مبعوث کرے گا۔ جو میری مانند ہوگا۔ تب رب نے موسیٰ سے کہا، میں ان کے پاس ایک پیغمبر بھیجوں گا جو تمہاری مانند ہوگا۔ وہ لوگوں کو ہر وہ چیز بتا دے گا جس کا میں اسے حکم دوں گا میں اُسے بتاؤں گا اُسے کیا کہنا ہے۔

اب محققین متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی تین انجیلیں جن کو سائینا پٹک گاسپلز کہا جاتا ہے ایک اور انجیل سے نقل کی گئی تھیں جو اب معدوم اور نامعلوم ہے۔ کھوج لگانے والوں نے اس نامعلوم انجیل کا نام کیو (Q) رکھ دیا ہے گمان غالب ہے کہ یہ نامعلوم Q انجیل برنباس کی انجیل تھی چار تسلیم شدہ انجیلوں میں سے قدیم ترین انجیل کا مؤلف جان مارک برنباس کا بھانجا تھا۔ برنباس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تین سالہ تبلیغ کے دوران آپ کے ساتھ رہا تھا۔ اس نے وعظ بھی سنے تھے اور تمام واقعات کو بچشم خود دیکھا تھا۔ جبکہ مروجہ انجیلوں کے مرتب کرنے والوں میں سے کسی نے، اور نہ ہی سینٹ پال نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا ہے برنباس نے جو انجیل مرتب کی وہ اس کے بلاواسطہ مشاہدے اور مجالس وعظ و تبلیغ میں شمولیت کے تاثرات پر مبنی تھی۔ اگرچہ دوسری انجیلوں کی طرح یہ بھی تراجم اور ترامیم وغیرہ کے مراحل سے گزرتی رہی ہے تاہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے چشم دید واقعات کا اس میں ہونا بڑی اہمیت کی بات ہے۔ یہ انجیل ۳۲۵ء تک سکندریہ کے چرچوں میں تسلیم شدہ انجیل تھی، مگر جب سینٹ پال کا تثلیثی مذہب غالب آگیا تو وہ ہر انجیل جو تثلیث کی بجائے توحید کو پیش کرتی تھی تلف کر دی گئی اور جس کسی کے پاس سے کوئی ایسی انجیل نکلتی تھی اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ عبرانی زبان میں لکھی ہوئی انجیلوں کو بھی تلف کر دیا گیا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہوتا ہے وہ انسانوں کی سخت کوشش کے باوجود ہو کر رہتا ہے۔ ۴۷۸ء میں برنباس کی قبر کو تلاش کر کے کھودا گیا تو اس کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی انجیل اس کے سینے کے ساتھ بندھی ہوئی ملی۔ اس کو دیکھ کر بعض محققین کو مزید

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نسخے تلاش کرنے کا خیال آیا۔ کئی نسخے ترجمہ بھی ہوئے لیکن نہایت پُراسرار طریقوں سے انہیں غائب کر دیا جاتا تھا۔ اٹلی میں محفوظ ایک قلمی نسخے سے انگریزی ترجمہ کینی اور مسز رَگ نے کیا لیکن سارے کا سارا ایڈیشن غائب کر دیا گیا اتفاق سے دو نسخے بچ گئے۔ جن میں ایک برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس میں ہے۔ اس دوسرے نسخے کی مائیکرو فلم حاصل کر کے عائشہ باوانی ٹرسٹ کراچی نے شائع کر دیا ہے، برنباس کی انجیل کی ایک اہمیت تو وہ ہے جو اوپر بیان کر دی گئی ہے یعنی یہ مؤلف کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے' دوسری اہمیت یہ ہے کہ اس میں توحید کی تعلیمات ہیں جو تثلیث اور پولوسیت کے اضافہ کردہ عقائد کے بالکل برعکس ہیں نیز اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر خیر بڑی کثرت سے ہے اور ان تمام پیش گوئیوں پر محیط ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بارے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلیں اور جنہیں برنباس نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے قلمبند کیا ہے۔ ان ارشادات میں ایک کو یہاں نقل کیا جاتا ہے (باب ۴۴ انجیل برنباس صفحہ ۵۰)

"I therefore say unto you that the messenger of
God is a splendour that shall give gladness to
nearly all that God hath made, for he is adorn-
ed with the spirit of understanding and of coun
sel, the spirit of wisdom and might, the spirit
of fear and love, the spirit of prudence and
temperance, he is adorned with the spirit of cha
rity and mercy, spirit of justice and piety, the
spirit of gentleness and patience, which he hath
given to all his creatures. O blessed time, when
he shall come to the world! Believe me that I
have seen him and have done him reverence even as
every prophet hath seen him: seeing that of his
spirit God giveth to them prophecy. And when I
saw him My soul was filled with consolation, say
ing: O Muhammad God be with thee, and may He
make me worthy to untie thy shoe-latchet, for, by
obtaining this I shall be a great prophet and a
Holy one of God. And having said this, Jesus ren-
dered his thanks to God.

(ترجمہ) "پس تم سے میں یہ کہتا ہوں کہ خدا کا یہ پیغمبر عظیم الشان ہے جو تقریباً ہر اس چیز کو خوشیاں عطا کریگا جو خدا نے بنائی ہے کیونکہ اُسے آراستہ کیا گیا ہے، وعظ و تفہیم کی روح سے' خوف اور محبت کی روح سے، حلم اور بردباری کی روح سے اور اسے رحم و سخاوت کی روح سے سنوارا گیا ہے، عدل اور تقویٰ کی روح سے مزین کیا گیا ہے، صبر اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نرم دلی کی روح سے سجایا گیا ہے اور یہ تمام صفات خدا نے باقی تمام مخلوق سے تین گنا زیادہ دی ہیں، کیا ہی مبارک گھڑی ہوگی وہ جب وہ دنیا میں تشریف لائے گا۔! مجھ پر یقین کرو کہ میں نے اُسے دیکھا ہے اور اسے تعظیم پیش کی ہے جیسا کہ ہر پیغمبر نے اُسے دیکھا ہے کیونکہ اس کی تجلی سے خدا نے ان کو نبوت دی ہے جب میں نے اسے دیکھا تو میرا دل تشفی سے بھر گیا۔ اے محمد! اللہ تیرے ساتھ ہو۔ اور مجھے اس لائق بنائے کہ میں تیرے جوتوں کا تسمہ کھول سکوں۔ اگر یہ موقع مجھے نصیب ہو جائے تو میں بہت بڑا پیغمبر اور خدا کا پاک بندہ بن جاؤں" یہ کہہ کر عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حضور ہدیۂ شکر پیش کیا۔

تورات اور اناجیل کے بارے میں جدید ترین تحقیقات کا خلاصہ مختصر طور پر پیش کیا گیا ہے تاکہ صحیح صورتحال سامنے آجائے۔ قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق دُنیا کے ہر خطے اور ہر قوم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر انبیائے کرام تشریف لاتے رہے ہیں، اور انسانیت کو اللہ کا پیغام ہدایت پوری دیانتداری سے پہنچاتے رہے ہیں لیکن ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بعض مفاد پرست لوگ وحیٔ الہٰی میں اپنی مرضی کے مطابق اور اپنی اغراض کے حصول کے لئے ردو بدل اور تنسیخ و ترمیم کر دیتے تھے۔ اس طرح کوئی بھی کلام ربانی اپنی اصلی شکل وصورت میں محفوظ نہیں رہ سکا۔ مشیت ربانی بھی یہی تھی کیونکہ انسانی شعور ابھی ناپختہ تھا کسی عالمگیر نظام کی اعلیٰ قدروں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود کہ اصل ہدایات دنیا کے کسی مذہب کی مقدس کتابوں میں نہیں ہیں پھر بھی یہ کتابیں واجب احترام ہیں۔ تورات میں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابۂ کرام تک کی نشانیاں دی گئی ہیں، تاہم یہ امر یقینی ہے کہ دنیا کے تمام آسمانی کتب ہیں (قبل از قرآن) یا جو آسمانی ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں بصورت موجودہ قطعاً وحیٔ الہٰی نہیں ہیں۔ تورات اور انجیل کی نسبت ان انبیائے کرام سے ہے جو بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اب آیئے چند حقائق دوسرے مذاہب کی کتابوں کے بارے میں بھی معلوم کر لیں۔

مجوسیت: دوسرے مذاہب کی فہرست میں سب سے پہلا نام پارسیوں کے مذہب مجوسیت کا آتا ہے، اسے مذہب زرتشت بھی کہتے ہیں۔ زرتشت (ZOARASTER) کے بارے میں صحیح تاریخی معلومات کہیں نہیں ملتی افلاطون نے ۷۰۰ ق م میں اس کا ذکر کیا ہے مشہور محقق رینے گینان (RENEGUENON) کا خیال ہے۔ کہ زرتشت بہت سے گزرے ہیں۔ آخری زرتشت کا زمانہ ۶۰۰ ق م ہے۔ اس کا مذہب باختر سے ایران آیا اور گرد و نواح میں پھیل گیا اس نے بابل کے راستے یہودیوں کو متاثر کیا۔ پھر یہ ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان کے بھری نواس جی مدتوں زرتشت کے پاس رہے، ان کی تعلیمات کو لیکر واپس ہندوستان آئے اور انھوں نے ہندو دھرم کی بنیاد رکھی، مذہب زرتشت کی کتاب ژند زبان کی اَوستا ہے، تاہم ژند اب مردہ زبان ہے۔ اور اَوستا کا بھی کوئی نسخہ ژند زبان میں موجود نہیں ہے۔ پانچویں صدی ق م میں اَوستا کے مختلف نسخے موجود تھے۔ ارتخت شاہ نے ایک مستند نسخے کی ترتیب کا حکم دیا مجلس منعقد ہوئی پھر ایک نوجوان مغ نے طاقتور شراب کے زیر اثر آسمانوں کی سیر کی اور اَوستا کا نسخہ مرتب کر دیا جسے مقدس تسلیم کر لیا گیا۔ یہ نسخہ سکندریہ کے حملے کے دوران ضائع ہو گیا۔ پھر زرتشت کے متفرق اقوال جمع کئے گئے اور ان میں وقتاً فوقتاً تغیر تبدل کیا جاتا رہا۔ ساسانیوں کے عہد میں انہیں یکجا کر لیا گیا۔ اس کا ایک حصہ پارسی اپنے ساتھ ہندوستان لائے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اب یہی اوستا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ دساتیر کا مجموعہ بھی جو متعدد اشخاص کے خطوط پر مشتمل ہے مقدس سمجھا جاتا ہے ان تمام کتابوں میں کہیں کہیں ابدی صداقتوں کے دو دو گوہر بھی مل جاتے ہیں لیکن یہ سب کثیف مٹی میں ملے ہوئے ہیں۔ اہرمن اور یزدان دو خداؤں کے ساتھ میترا کی پرستش بھی ہے اور ایک آنے والے کا تصور بھی بنیادی عقیدے کے طور پر موجود ہے۔ اس تصور نے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کو متاثر کیا ہے، تاہم مذہب زرتشت میں اب آتش پرستی کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ ہندومت: اس مذہب کے بارے میں بنارس یونیورسٹی کی کورٹ کونسل اور سینیٹ کے ممبر مسٹر گووِنداس کا یہ بیان جو ان کی کتاب موسومہ ہندو ازم کے صفحہ ۴۵ پر درج ہے غور طلب ہے: کہا ہے کہ ہندو دھرم کی کوئی بیانیہ تعریف (DEFINITION) ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی آج تک مقرر نہیں کی گئیں۔ اس مت یا دھرم کی بنیاد در اصل علم الانسان پر تھی جسے بدقسمتی سے مذہب کا نام دے دیا گیا ہے۔ ویدوں سے شروع ہو کر اور چند قبائل رسوم اور رواجات کو لے کر یہ آگے بڑھا۔ پھر برف کے گولے کی طرح لڑھکتے لڑھکتے یہ اپنا حجم بڑھاتا چلا گیا اور جس جس قوم یا قبیلے سے اس کا واسطہ پڑا یہ اس کی رسوم اور خیالات اپنے اندر جذب کرتا چلا گیا۔ اور اس وقت تک بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ "مذہب" ہر چیز پر حاوی اور محیط ہونے کی وجہ سے ہمہ گیر بھی بن گیا ہے یعنی ہر ایک کو اپنے اندر جذب کر لینے والا، سب کچھ برداشت کر لینے والا، ہر ایک کو مطمئن کر لینے والا اور ہر ایک کے ارشادات کی تعمیل کرنے والا "مذہب" ہے۔

پنڈت نہرو کی کتاب "دی ڈسکوری آف انڈیا" (صفحہ ۵۳) سے یہ اقتباس بھی توجہ چاہتا ہے: "ہندو ازم ایک عقیدے کے لحاظ سے بالکل مبہم، غیر متعین اور بہت پہلو دار ہے اس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کی بات مل جاتی ہے اس کی کوئی بیانیہ تعریف (DEFINITION) ممکن نہیں ہے۔ بلکہ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں۔ یہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں بہت سے عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے۔ جو اعلیٰ سے اعلیٰ بھی ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ بھی ہیں اور آپس میں مختلف اور متضاد بھی ہیں۔"

تقریباً دو ہزار سال کے عرصے میں ہندوستان کے باشندوں نے مختلف علوم و رسوم و رواجات سے متعلق جو کچھ جمع کیا اس سارے مجموعے کا نام وید ہے۔ زمانے کے اعتبار سے اور اسلوب بیان و موضوعات کے لحاظ سے ویدک لٹریچر کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) سمہت یعنی گیتوں کا مجموعہ (۲) براہمن (۳) آرن یک اور (۴) اپنشد۔ یہ سارے کا سارا لٹریچر قدیم زمانے میں ایسا مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اس کا لکھ لینا بھی سخت گناہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ برہمنوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ اسی اعتبار سے اس سارے لٹریچر کو "سرتی" یعنی روایت یا سنی ہوئی باتیں کہا جاتا ہے سمہت کو چار ویدوں میں تقسیم کیا گیا ہے، رگ وید، سام وید، یجروید اور اتھروید۔ رگ وید کو سب سے قدیم مانا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ رشی ویاس جی نے ایک ہی وید کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ تاہم اس تقسیم سے پہلے یہ وید بالکل ضائع ہو چکا تھا۔ لیکن ایک رشی سرسوت نامی نے اسے زبانی یاد رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے آگے منتقل کر دیا۔ مسٹر گووِنداس کہتا ہے کہ وہ کتابیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں ویاس جی کے مرتب کردہ نسخے کے مطابق نہیں ہیں کیونکہ روایت کے مطابق

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ویاس جی بھی کئی ہو گزرے ہیں۔ اور ویدوں کو ترتیب دینے والے اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ ہمت کا جو لٹریچر ہمارے پاس ہے وہ اس مجموعے کا پانچواں حصّہ بھی نہیں جو ۲۲۰۰ سال پہلے مہابھارت کے زمانے میں موجود تھا۔

ویدوں کے بعد دوسرے نمبر پہ برہمن لٹریچر ہے جو ویدوں کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ اس تشریحی لٹریچر کو بھی الہامی سمجھا جاتا ہے۔ برہمن لٹریچر کے بعد آرن یک کا درجہ ہے۔ یہ ان رشیوں کے حالات کا مجموعہ ہے جو بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے، یہ چونکہ وہاں قربانیاں نہیں کر سکتے تھے اس لئے تصوری تصور میں مذہبی رسوم و فرائض ادا کرنے لگ گئے، رشی کسے کہتے ہیں یا اس کا منصب اور مقام اور حیثیت کیا ہے یہ بھی متعین نہیں ہے۔ جس طرح برہمن لٹریچر گھر گرہستی لوگوں کے لئے ہے اسی طرح آرن یک کو بن باس اختیار کرنے والوں کا لٹریچر سمجھ لیجئے۔ اور اُپنشد ان لوگوں کے لئے ہیں جو جنگلوں کی زندگی سے ذرا آگے بڑھ کر "سنیاس" کی زندگی شروع کردیں۔ جس میں "مراقبوں"، "توجّہ کے ارتکاز" اور تصورات کو قائم کرلینے کی صلاحیت حاصل کر کے ایشور گیان یا خدا کی معرفت تک پہنچ جاتا ہے۔ ویدانت کا سارا فلسفہ انہی اُپنشدوں میں ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے زندگی ایک "نیند کی سی" حالت کا نام ہے تاہم ایسی حالت جس میں خواب تک نہ آئے، یعنی انسان زمان اور مکان کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو جائے۔ اور برہما سے پھر جا کر مل جائے جس سے وہ جُدا ہو گیا تھا۔ ویدانتی استغراق اور محویت کے عالم میں یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ انسان زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو چکا ہے، یہ لمحۂ آزادی گویا اس کا "وصال" ہے۔ اگر یہ لمحہ مستقل ہو جائے تو وصال بھی مستقل ہو جائے گا۔ اسی چیز کو ملیی نیند کہا جاتا ہے جس میں خواب تک نہ ہو گویا تصوری تصور میں ویدانت کا فلسفہ انسان کے ذہن میں ایک نئی دنیا بسا دیتا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ فلسفے کے عام لٹریچر کو شاستر کہا جاتا ہے۔ اس فلسفے کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ناستک دوسرا آستک، ناستک فلسفے کی رُو سے وید غلطیوں سے پاک نہیں ہیں، نہ ہی یہ سند ہیں۔ اس فلسفے کے ماننے والوں میں بدھ مت، جین مت اور چارواک شامل ہیں، ان سب کو ہندو سمجھا جاتا ہے۔ آستک فلسفے کے ماننے والوں کے چھ مذاہب یا مکاتبِ فکر ہیں اور ان سب کی الگ الگ کتابیں ہیں جو شاستر کہلاتی ہیں۔ یعنی

۱۔ کپل کا سانکھیہ شاستر۔ یہ مکتبِ فکر خدا کی ہستی کا منکر اور محض عقل کی رُو سے نجات کا حامی ہے اس مکتبِ فکر کا تمام لٹریچر اب ضائع ہو چکا ہے۔

۲۔ پاتنجلی کا یوگ شاستر۔ اس مکتبِ فکر کی رُو سے ایشور (خدا) کو روح سے اور روح (آتما) کو خدا سے الگ مانا جاتا ہے۔ سانس کا روک رکھنا (پرانایام) یا حبسِ دم بہترین عمل ہے جس سے ایسی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انسان ہوا پر اڑ سکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، لوگوں کے دلوں کی بات معلوم کر سکتا ہے وغیرہ

۳۔ ویاس جی کا اُتر مانسا۔ ویدانت کی ساری تعلیم اور اُپنشدوں کا نچوڑ اسی میں ہے، اور یہی سارے فلسفے کی بنیاد ہے اس کی رُو سے کائنات کی ہر شے برہما ہے۔ یعنی جو نسبت مٹی کو برتن سے یا موج کو دریا سے ہے وہی نسبت موجودات کو خدا سے ہے۔ انسان کا منتہائے کمال یہ ہو گا کہ وہ مادّہ کو ترک کر کے برہما کے اندر

Presented by: Rana Jabir Abbas

جذب ہو جائے۔

۴۔ جیمی جی کا میمانسا یا پورب میمانسا شاستر۔ اس میں قربانی سے متعلق احکام ہیں اور انسان کو صاحب اختیار و ارادہ تسلیم کیا گیا ہے اور یہ اس حد تک کہ خدا کا بھی انکار کر دیا جاتا ہے۔ منوسمرتی کے ذات پات کی تقسیم کے قوانین جو ہندو "ملا" کی حیثیت رکھتے ہیں اسی شاستر سے ماخوذ ہیں۔

۵۔ گوتم یا نیائے شنک کا نیایا شاستر: اس میں انسان کو مجبور محض بتایا گیا ہے اور منطق کو ایک خاص حیثیت دی گئی ہے۔

۶۔ کناد کا ویشیشک شاستر: اس میں طبقاتی اور ماوراء الطبیعاتی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

ان شاستروں کی تعلیمات کا تصوف کے عناصر سے مقابلہ کر کے خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اس فلسفے سے بڑے بڑے عظیم مذاہب تک کس طرح متاثر ہوئے ہیں۔ مذکورہ تمام فلسفوں میں جو مشترک بات ہے وہ یہ ہے کہ دُنیا مصائب کا گھر ہے ہر خوشی جو بظاہر خوشی دکھائی دیتی ہے دراصل غم ہی کا پیش خیمہ ہے، اصل خوشی خواہشات کے ترک کر دینے میں ہے۔

ان تمام کتابوں کے علاوہ پُران بھی ہندوؤں کی مقدس کتابیں ہیں، کہا جاتا ہے کہ شروع میں وید کی طرح پُران بھی ایک تھا جسے ویاس جی نے ویدوں کے بعد تصنیف کیا۔ اس کے شاگردوں نے اس ایک پُران سے چار پُران مرتب کئے، پھر یہ چار سے اٹھارہ اٹھارہ سے چھتیس اور چھتیس سے چوّن اور اخیر میں ساٹھ ہو گئے۔ "ہندوازم" کا مصنف لکھتا ہے کہ پران اپنی موجودہ شکل میں سب کے سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بلکہ متضاد ہیں یہاں تک کہ کسی دو پُرانوں کے نسخے بھی آپس میں نہیں ملتے، یہ اُن عجیب و غریب افسانوں کے مجموعے ہیں جن میں دس دس ہزار اور ساٹھ ساٹھ ہزار سال کی عمر کے انسان عام طور پر ملتے ہیں۔"

رامائن اور مہابھارت بھی جن میں دو لڑائیوں کا ذکر ہے بڑی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی تصنیف کی تاریخ کا تعین بھی ناممکن ہے۔ رامائن مختلف مصنفوں نے لکھی ہے تاہم ویاس، کالیداس اور ہیم چندر کی رامائنوں کے مقابلے میں والمیکی کی رامائن زیادہ مشہور ہے لیکن بقول مصنف "ہندوازم" اس میں پہلا اور ساتواں باب بعد کا اضافہ ہے۔ "متن کی حالت یہ ہے کہ اس میں بے حد رد و بدل ہو چکا ہے۔ اگرچہ اتنا نہیں جتنا مہابھارت میں ہوا ہے یہ بھی یاد رہے کہ یہ محض شاعری ہے، تاریخ نہیں"۔ (صفحہ ۴۱-۴۲)

رامائن اور مہابھارت دونوں کے متعلق پنڈت جواہر لعل نہرو نے لکھا ہے کہ یہ کتابیں سینکڑوں برس کے عرصے میں جا کر متشکل ہوئیں اور اس کے بعد بھی اس میں اضافے ہوتے رہے (ڈسکوری آف انڈیا صفحہ ۷۵) مہابھارت کے بارے میں "ہندوازم" کا مصنف لکھتا ہے کہ موجودہ نسخوں میں بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں، تین مختلف مرتب شدہ کتابوں کا ذکر تو خود مہابھارت کے اندر موجود ہے (صفحہ ۱۴۱)۔

مہابھارت میں بھگوت گیتا بھی شامل ہے جسے سری کرشن جی مہاراج سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ ان نصیحتوں کا مجموعہ ہے جو مہاراج کرشن نے ارجن کو میدان جنگ میں دیں۔ اس کتاب میں یوگ کا اور ہندو ویدانت سے پیدا ہونے والے جمود

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور تعطل کا رد عمل ہے۔ یعنی اس میں حرکت و عمل کی تعلیم دی گئی ہے۔ شری کرشن جی کو بھی خدا کا اوتار سمجھ کر قابل پرستش سمجھا جاتا ہے۔

بدھ مت: اس کے بانی گوتم بدھ قریباً ۵۰۰ ق م میں پیدا ہوئے ان کا مذہب برہمنوں کے ظلم و تشدد کے خلاف ردعمل تھا۔ بدھ کی سب تعلیم زبانی تھی وفات کے وقت انہوں نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ ان کی وفات کے سینکڑوں سالوں بعد ان کی تعلیمات کو ترتیب دے کر تین مجموعے بنائے گئے۔ (۱) سُتّا: یہ اعتقادات سے متعلق ہے (۲) وِنایا: یہ بھکشوؤں کی زندگی کے قواعد و ضوابط کے بارے میں ہے۔ (۳) اَبھی دھّما: یہ اعتقادات کا علمی اور فنی انداز کا مجموعہ ہے یہ تینوں کتابیں پالی زبان میں ہیں اور تیسری صدی ق م کی تصنیف ہیں۔ یہ شمالی فرقے کی کتابیں ہیں۔ جنوبی فرقے کی کتاب کا نام لَیتیا وِستَرا ہے جو ۲۰۰ ق م میں بھی موجود تھی۔ ان تمام کتابوں میں تضادات ہیں۔

چونکہ یہ مذہب دنیا کے بہت بڑے حصے میں پھیلا ہوا ہے اس لئے اس کے اعتقادات وغیرہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننا ضروری ہے۔ ہم چیمبرز انسائیکلوپیڈیا ۱۹۶۳-۶۴ء ایڈیشن سے یہ مختصر سا نوٹ یہاں نقل کرتے ہیں

The result of his meditations are condensed in the four noble truths which are: (1) that existence is unhappiness, (2) that unhappiness is caused by selfish desire or craving; (3) that desire can be destroyed by following the noble eight-fold path whose steps are: right doctrine, right purpose, right speech, right conduct, right lowliness, right purity, right thought and right concentration. The more man acquires merit by following these rules in his chain of lives, the sooner is Nirvana attained. He loses his individuality, not by annihilation, but as the dewdrop that slips into the shining sea by merging with the universal life.

Budhism therefore preaches freedom from attachment and the law of Karma___ that a man's actions control his destiny after death as inevitably as cause follows effect, so that his future is solely in his own keeping.

ترجمہ: مہاتما بدھ کے طویل مراقبے کے نتائج اس کی "چار پاکیزہ صداقتوں" میں اس طرح ظاہر ہوئے۔ (۱) "وجود" سراسر دکھ درد اور غم و اندوہ ہے (۲) دکھ درد اور غم و اندوہ کا باعث خود غرضانہ خواہشات ہیں۔ (۳) خواہشات کو کچلا جا سکتا ہے (۴) خواہشات کو ختم کرنے کے یہ آٹھ پاکیزہ طریقے ہیں۔

(i) صحیح قوانین و ضوابط (عقائد) (ii) صحیح مقاصد (iii) صحیح گفتار
(iv) صحیح کردار (v) صحیح عجز و انکساری (vi) صحیح زہد و پاکیزگی
(vii) صحیح فکر و فہم (viii) صحیح ارتکاز توجہ

انسان اپنی "زندگی کے چکروں" کے دوران جتنا زیادہ ان اصولوں پر کاربند رہے گا اتنا جلدی نروان حاصل

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کر سکے گا۔ نروان کا مطلب اپنی انفرادیت کو کھو دینا ہے۔ لیکن فنا ہو جانے سے نہیں بلکہ جس طرح شبنم کا قطرہ چمکتے سمندر میں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے اسی طرح آفاقی حیات میں مدغم ہو جانے سے!

بدھ مت کی تعلیم کے دو پہلو ہیں: ایک اخلاقی سے رستگاری، دوسرا قانون کرما یعنی انسان کے افعال ہی اس کے بعد از مرگ تقدیر کو متعین کرتے ہیں۔ جس طرح اسباب نتائج کو متعین کرتے ہیں۔ اسی طرح افعال کے بعد از مرگ تقدیر کا متعین ہونا بھی اٹل ہے اس سے ثابت ہوا کہ انسان کا مستقبل اس کے اپنے بس میں ہے۔ بدھ مت میں خدا کا نہ انکار ہے نہ اقرار بلکہ عقیدے کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

جین مت: برہمنیت کے خلاف صدائے احتجاج کے طور پر مہاتما بدھ ہی کے دور میں ایک اور مذہب پیدا ہوا جسے جین مت کہتے ہیں۔ اس کا بانی مہاویر ہے۔ جینیوں کا عقیدہ ہے کہ جین مت ازلی ہے اور یہ پیغام مختلف زمانوں میں "ترتھنکروں" کی معرفت آتا رہا ہے۔ مہاویر آخری ترتھنکر ہے۔

جین مت میں بھی خدا کا انکار ہے۔ لیکن ان ترتھنکروں کو خدا سمجھ کر پوجا جاتا ہے۔ اس مت کے دو فرقے ہیں سفید کپڑے پہننے والے "سوتمبر" اور ننگے رہنے والے "ڈگمبر" کہلاتے ہیں۔ سوتمبر دعوے کرتے ہیں کہ مہاویر کی اصلی تعلیم ان کے پاس ہے جبکہ ڈگمبر کہتے ہیں کہ اصلی تعلیم تو ضائع ہو چکی ہے تاہم ان کے عقائد اور رسوم و رواج اصلی ہیں۔ جینی اپنی ۴۵ کتابوں کا ذکر کرتے ہیں کہ ۱۲ پروا اور ۱۱ انگ ان کی مقدس کتابیں تھیں جو سب ضائع ہو گئی ہیں۔ اب صرف ایک پرو باقی ہے جو سوتمبر فرقے کے پاس ہے۔ لیکن ڈگمبر فرقہ کہتا ہے کہ یہ اصلی نہیں ہے۔ سوتمبروں کا خود ساختہ ہے اس "مت" کے مطابق سادھو کی زندگی سب سے اچھی زندگی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ضروریات زندگی میں سے کچھ اپنے پاس نہ رکھے بھیک مانگ کر گزارا کرے، ستر پوشی کے کپڑے، کمبل، کشکول، جھاڑو اور منہ پر باندھنے کے لئے ایک کپڑے کے ٹکڑے کے سوا اور کوئی چیز نہ ہو۔ منہ اس لئے باندھ کر رکھتے ہیں کہ سانس کے ذریعے کوئی کیڑا وغیرہ اندر نہ چلا جائے۔ جاندار کا مارنا بہت برا ہے۔ ڈگمبر تو کپڑوں سے بھی بے نیاز رہتے ہیں ان کی ریاضتیں بڑی سخت ہوتی ہیں یہاں تک کہ سونے کے لئے بھی صرف تین گھنٹے کی اجازت ہے۔

سکھ مت: اکبر کے زمانے میں گورو نانک تلونڈی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سکھ مت کی بنیاد ڈالی۔ ان کے قول اور ابیات وغیرہ کو جمع کر کے "گرو گرنتھ" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی گئی ہے جسے مقدس سمجھا جاتا ہے ابتدا میں یہ مذہب فقیری اور درویشی کا مذہب تھا پھر اسے عسکری رنگ دے کر علیحدہ فرقے کے طور پر منظم کیا گیا۔

ہندوستان کی بڑی بڑی "مذہبی اور مقدس" کتابوں کے بارے میں ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ جو کچھ اوپر بیان کیا ہے وہ ان کتابوں کے ماننے والوں کی تحقیقات سے ماخوذ ہے۔ کلام الٰہی اگر کہیں تھا بھی تو وہ زمانے کی دستبرد سے نہیں بچ سکا۔ تاہم ہندوستان میں بعض چھوٹی چھوٹی قومیں ایسی بھی آباد ہیں جن کے عقائد یا رسومات یا مذہبی کتابوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ یہ قومیں یا قبیلے باقی لوگوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ ہیں اور اکثر اوقات اپنے عقائد وغیرہ کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان میں سے بعض کے پاس پرانوں کی قسم کی پستکیں یا صحیفے ہیں

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بھی موجود ہیں لیکن وہ انہیں مخفی رکھتے ہیں۔ دوابہ گنگا جمنا کے علاقے میں ایسی ہی قوم آباد ہے جو خود کو کلنگی اوتار کی پیروکار کہلاتی ہے' ان کے پاس جو پستک ہے اسے وہ کلنگی پران کہتے ہیں۔ اس کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں جو پیشین گوئی درج ہے' وہ کچھ اس طرح سے ہے:

"کلجگ کے ستے میں سانبل دیپ کے دیش میں جگت گرو پیدا ہوں گے۔ باپ کا نام وشنو بھگت (عبداللہ) اور ماں کا نام سومتی (آمنہ) ہوگا۔ جنم دن ۱۲ بیساکھ سوموار دو گھڑی دن چڑھے' پہلے باپ کی پھر ماں کی وفات ہوگی۔ سانبل دیپ کی رانی سے بیاہ کرے گا۔ ایک پہاڑ کی کھوہ میں تپیا کرے گا۔ پُرش رام (روح القدس) کی معرفت علم لے گا۔ بستی میں آکر تبلیغ کرے گا۔ تو لوگ تکلیفیں دیں گے۔ جگت گورو پہاڑوں کی طرف چلا جائے گا وہاں سے تلوار لے کر واپس اس بستی میں آجائیگا۔ جگت گورو کا ایک گھوڑا ہوگا۔ بجلی سے زیادہ تیز۔ اس پر سوار ہو کر جگت گورو زمین اور آسمانوں کی سیر کرے گا۔"

اس قسم کی پیشین گوئیاں بعض دوسرے پرانوں (مثلاً بھوشیا پران۔ پرتی سرگ حصہ III۔ مطبوعہ وینکٹیشور پریس بمبئی) اور اتھروید (کنتپ سکت) میں بھی درج ہیں تاہم اس وقت ہمارا موضوع یہ نہیں ہے' لہٰذا ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے دنیا کے چند دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کے بارے میں تحقیق کی آزمائش کرتے ہیں۔

تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے چین دنیا کا قدیم ترین ملک شمار ہوتا ہے اس ملک میں تین مذاہب رائج ہیں۔

(۱) بدھ مت (۲) کنفیوشس ازم اور (۳) تاؤ ازم' بدھ مت کی جو اصلیت باقی رہ گئی ہے وہ بیان ہو چکی ہے۔ کنفیوشس ازم: اس مذہب کا اپنا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ اس کی تعلیمات کسی وحی یا الہام پر مبنی ہیں تاہم لیجی نے کنفیوشس کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے' دیباچے میں وہ لکھتا ہے کہ چین کا سب سے بڑا مذہب کنفیوشس ازم ہے اسے پانچویں چھٹی صدی قبل مسیح کے ایک مرد پارسا کنفیوشس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے' درحقیقت نہ تو کنفیوشس اس مذہب کا بانی ہے اور نہ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس کے احکام نافذ کئے یا اس کے رسوم و رواجات کو رائج کیا۔ اس نے اپنے متعلق خود لکھا ہے کہ "میں تو آگے منتقل کرنے والا ہوں' خود بنانے والا نہیں ہوں۔ مجھے اسلاف سے محبت بھی ہے اور عقیدت بھی"

اس مذہب کی چھ کتابیں یہ ہیں۔

۱۔ شو کنگ: یہ تاریخی کتاب ہے جس میں ۷۲۲ ق م سے لے کر ۴۸۱ تک کے خاندانوں کے منظوم حالات ہیں

۲۔ زی کی: یہ واقعات اور حادثات کی سب سے پرانی کتاب ہے اس کا سن تالیف ۱۱۴۳ ق م بتایا جاتا ہے کنفیوشس نے کہا تھا کہ "اگر میری عمر میں کچھ اضافہ ہو جائے تو میں پچاس برس زی کی کے مطالعے کے لئے وقف کر دوں اور اس کے بعد بڑی بڑی غلطیوں سے بچ جاؤں۔"

۳۔ اینالیکٹ: اس کتاب میں نقشوں کی مدد سے فالنامے دیئے گئے ہیں۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۴۔ لیسکی، رسومات کی تفاصیل ہیں کِن خاندان کی سرکاری کتاب ہے
۵۔ کھُن کھیو، بہارِ خزاں، یہ کنفیوشس کی اپنی کتاب ہے جس میں اس نے سلطنت کے ۷۲۲ ق م سے لے کر ۴۸۱ ق م تک کے حالات لکھے ہیں۔
۶۔ ہیسکو کنو: کنفیوشس کا ہی مختصر سا رسالہ ہے جس میں والدین کے حقوق و فرائض درج ہیں۔

کنفیوشس کی بنیادی تعلیم دو عناصر پر مشتمل ہے، اطاعتِ والدین بلکہ پرستش اور اسلاف پرستی کنفیوشس ازم عام اخلاقیات میں عمل پر بہت زور دیتا ہے۔ لیکن اس کے عقیدے سب کے سب توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ آسمان کی اور چھوٹے چھوٹے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے، اور مندروں میں کنفیوشس کے نام کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔
مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ چار اور کتابوں کو بھی مقدس مانا جاتا ہے۔ پہلی کتاب لن یو ہے جس میں کنفیوشس کے مقالات اور مباحثات ہیں۔ دوسری کتب منیکیئس ہے جو کنفیوشس کے بعد اسی نام کے ایک فلسفی کی کتاب ہے، تیسری کتاب کا نام ہیسکو ہے جو ایک اور فلسفی تنگ زی کی تصنیف ہے، چوتھی کتاب کنگ یینگ ہے جو کنفیوشس کے پوتے سے منسوب ہے۔

تاؤ ازم:۔ اس مذہب کے بانی کا نام لوزے (LOOTZEY) ہے جو ۶۰۴ ق میں پیدا ہوا۔ لوزے کے معنے ہیں بڑا فلسفی۔ یہ کاؤ خاندان کا لائبریرین تھا اور یہ نام اسے کنفیوشس نے دیا تھا۔ جب کاؤ خاندان زوال پذیر ہوا، تو لوزے دل برداشتہ ہوگیا اور اس نے دنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن دارالخلافہ شہر نے اسے روک لیا کہ مجھے کچھ لکھ کر دیتے جاؤ۔ چنانچہ اس نے تاؤ تھنگ کنگ کتاب لکھ کر دی۔ یہی کتاب اب تاؤ ازم کی مقدس کتاب ہے اس میں تاؤ (خدا) کا ذکر صرف ایک جگہ آیا ہے اور کہا ہے کہ "میں نہیں جانتا تاؤ کس کا بیٹا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے بھی پہلے موجود تھا"

تاؤ ازم یوگ اور گیان دھیان کی شکل کی ریاضتوں کا نام ہے اس میں انسان خارجی دنیا سے قطع تعلق کرکے اندھا، بہرہ اور گونگا بن جائے اور اس کا نام عالم بالا کی کیفیت رکھ لے۔ گیان دھیان کے فلسفے کی ان کتابوں میں مجذوبانہ باتیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً "تاؤ کچھ نہیں کرتا اس لئے ایسا کوئی کام نہیں جسے وہ نہیں کرتا" اس مذہب میں علم و عقل کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے، دنیا سے نفرت اور اسلاف پرستی کے ساتھ ساتھ توہمات پر مبنی عقائد ہیں
شنتو ازم وہ زمانۂ قبل از تاریخ میں جاپان پر جو خاندان حکمران تھا وہ سورج کی پرستش کرتا تھا اور اس کے گرد ہزاروں دیوی دیوتا اور بھی تھے۔ اس کے علاوہ اسلاف پرستی بھی ہوتی تھی پھر اس نے مذہب کی شکل اختیار کر لی جسے شنتو ازم (دیوتاؤں کا راستہ) کہتے ہیں۔ اب جاپان میں یہ صرف مذہب ہی نہیں بلکہ قومی تمدن بھی ہے۔ روایت ان کے ہاں یہ مشہور ہے کہ سورج کی دیوی نے اپنے پوتے یعنی جاپان کے سب سے پہلے شہنشاہ کو آسمانی تحائف، تلوار، آئینہ اور جواہر پارہ دیئے تھے جو اس خاندان میں محفوظ چلے آتے ہیں۔
چھٹی صدی عیسوی میں بدھ مت جاپان میں آیا تو اس نے شنتو ازم کو بھی متاثر کیا۔ اور ایک نیا مذہب

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پیدا ہوگیا۔ لیکن ۱۸۶۸ء کے قومی انقلاب کے وقت اسے خارجی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ پانچویں صدی عیسوی سے پہلے جاپان میں لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے شنتوازم زبانی روایات تک محدود رہا۔ آٹھویں صدی میں ادھر ادھر بکھری ہوئی روایات کو یکجا کر کے دو کتابیں "کوجیکی" اور "نی ہونگی" مرتب ہوئیں۔ کامی کا معنیٰ خدا ہے، ان کتابوں میں شہنشاہ، اسلاف، پرندے، سمندر، پہاڑ، پودے، شیر، لومڑی، بھیڑیا سب کامی ہیں۔

دونوں مذہبی کتابوں میں اخلاق کے متعلق کوئی تعلیم نہیں ہے، مندروں میں کنواری لڑکیاں پروہت بنا کر رکھی جاتی ہیں۔ جب ان پر ہسٹریا کی غشی کا دورہ پڑتا ہے تو جو کچھ ان کے منہ سے نکلتا ہے اسے الہامی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جادو کا بہت زور ہے، بادشاہ کی بدرجۂ خدا پرستش شنتوازم کا لبِ لباب ہے۔

الغرض۔ یہ ہیں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب جو اسلام کے علاوہ اس وقت رائج ہیں، ان مذاہب کے پاس جو کتابیں ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کے بارے میں خود پیروکاران یہ دعویٰ کر سکیں کہ ان کی کتاب غیر محرف ہے یا بالکل اسی طرح ہے جس طرح یہ اپنی تصنیف کے وقت تھی۔ بلکہ دو ہزار سال سے یہی صورتِ حال قائم ہے۔ کوئی ایک مذہب بھی یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ وہ "خدائی رہنمائی" کی پیروی کر رہا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اگر دنیا کے تمام مذاہب اپنی اپنی کتابوں پر کاربند ہو جائیں تو تسلیم کر لیا جائے گا کہ وہ سچائی کے راستے پر ہیں، جب خدا کی طرف سے دی ہوئی تعلیم اور ہدایت کسی کے پاس ہے ہی نہیں تو وہ اس پر کاربند کیسے ہوں گے، جو کچھ ان کتابوں میں ہے اس کا لبِ لباب ہم نے پیش کر دیا ہے، اسے دوبارہ سامنے لائیے، کیا ان میں سے کا کوئی ایک فلسفہ بھی اس وقت قابلِ عمل ہے؟ یا کبھی آئندہ قابلِ عمل ہو سکے گا؟ یہ امتیازی فضیلت صرف اور صرف قرآن حکیم کو حاصل ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تک بالکل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا اور جو وحی ہوتے ہی فوراً لکھ لیا جاتا تھا حفظ یا ذکر لیا جاتا تھا۔ اور لکھے ہوئے کی توثیق کر لی جاتی تھی۔ اس ناقابلِ تردید حقیقت پر خود غیر مسلم محققین بلکہ مخالفین بھی متفق ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ اس عظیم کتاب کا کوئی شوشہ تک تبدیل نہیں ہوا۔

(۲)

آج کے دور میں کوئی بات تنقید اور تحقیق کے بغیر تسلیم نہیں کی جاتی۔ اس حقیقت پر کہ قرآن حکیم ہمارے پاس حرف بحرف اسی شکل و صورت میں محفوظ ہے جس صورت میں یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوا تھا۔ وہ لوگ بھی متفق ہیں جو اس کتاب پر ایمان نہیں رکھتے یا جو صدیوں سے اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح وہ اسے انسانی تصنیف ثابت کر سکیں۔ انہوں نے متعدد اعتراضات کیے اور اپنی طرف سے اس عظیم کتاب کی اہمیت گھٹانے پر بڑا زور لگایا لیکن اس کے غیر محرف ہونے کے خلاف وہ ایک حرف بھی زبان پر نہیں لا سکے۔ یورپ کے اربابِ فکر و نظر نے ہر قسم کی شہادتوں کا جائزہ لینے کے بعد اس حقیقت کا بارہا اعلان کیا ہے کہ قرآن حکیم میں ایک شوشے تک کی بھی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر ہورٹ وگ ہرشفیلڈ اپنی کتاب ......

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

(New Researches in the Composition and Exegesis of the Holy Qur'an)

میں لکھتا ہے کہ "عہد حاضر کے نقاد اس حقیقت پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصل نسخے کا ہو بہو عکس ہیں جسے زید نے لکھا تھا۔ اور قرآن کا متن بالکل وہی ہے جسے محمد نے دیا تھا۔" اور تو اور سر ولیم میور جیسا متعصب مؤرخ بھی اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتا ہے کہ "یہ یقینی بات ہے کہ قرآن جس شکل میں اس وقت ہمارے پاس موجود ہے یہ بعینہٖ اسی شکل میں ہے جس شکل میں محمد کی زندگی میں جمع اور مرتب ہو چکا تھا۔" چند سال پہلے کی بات ہے سر جان ہمرٹن کے زیر اہتمام گیارہ جلدوں میں یونیورسل انسائیکلوپیڈیا کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس میں "قرآن" کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔

"یہ کتاب پیغمبر محمد پر ان کی زندگی کے آخری تیئس (۲۳) سال میں مکہ اور مدینہ میں نازل ہوتی رہی اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق کلام الٰہی ہے۔ بخلاف حدیث کے جو مجموعہ کلام رسول ہے۔ قرآن پیغمبر کی زندگی ہی میں، اور انہی کی زیر ہدایت و نگرانی ضبطِ تحریر میں آ گیا تھا۔ اور ان کے صحابیوں نے بھی اسے حفظ یاد کر لیا تھا۔ اور یہ معمول آج تک جاری ہے چنانچہ صدہا مسلمان کلام پاک کے حافظ ہیں۔ اور اسے سارے کا سارا بغیر کسی ایک غلطی کے دہرا سکتے ہیں......... اس کی عبارت کا غیر محرف ہونا ثابت ہے۔"

شیعہ حضرات کے نامور فاضل محقق شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء کی کتاب کا اردو ترجمہ "اصل و اصولِ شیعہ" کے نام سے رضا کار بک ڈپو۔ لاہور نے شائع کیا تھا اس میں فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ:۔

وہ کتاب جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگار عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا اور جس کے ذریعے احکام دین کی تعلیم دی۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی۔ جو لوگ تحریف کا الزام لگاتے ہیں وہ خطا پر ہیں۔" (صفحہ ۱۵۱)

دشمنان اسلام کے سوچے سمجھے اور بظاہر خوشنما لیکن بباطن سخت خطرناک منصوبوں سے متاثر ہو کر بعض نادان دوستوں کی طرف سے اکثر و بیشتر یہ مشورے پیش ہوتے رہتے ہیں کہ عربی زبان چونکہ ہماری مادری زبان نہیں ہے اس لئے قرآن حکیم کا متن، نمازوں میں اس کی تلاوت اور دوسرے اوراد و وظائف اور زندگی کے معمولات میں آیات قرآنی کی بجائے اردو یا دوسری علاقائی زبانوں میں تراجم استعمال کئے جائیں، یہ سازش اس لئے کی جا رہی ہے کہ تراجم در تراجم سے جو حشر دوسری آسمانی کتابوں کا ہوا وہی (معاذ اللہ) قرآن حکیم کا بھی ہو۔ اور بغیر متن عربی کے تراجم جب مقبول ہو جائیں گے، تو عربی متن کو بھی مشتبہ بنایا جا سکے گا۔ قرآن حکیم کے تراجم ضرور ہونے چاہئیں، بلکہ دنیا کی ہر زبان میں اللہ کے آخری اور مکمل پیغام کو پہنچنا چاہئے۔ لیکن عربی متن کی پوری صحت کے ساتھ۔ بغیر عربی متن کے نہیں۔

وحی ربانی اور اس کے صحیح ترین علم ہونے کے بارے میں ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اس کی روشنی میں اہل ایمان کے دل میں تو کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ قرآن حکیم واقعی کلام ربانی ہے اعلم ہے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نور و ہدایت ہے۔ اور قطعاً انسانی تصنیف نہیں ہے۔ تاہم چونکہ "وحی" کا تجربہ ہر شخص نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی ماہیت کو سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس کا شرف صرف انبیائے کرام کو حاصل رہا ہے اس لئے تشکی طبیعت کے لوگوں کو دلائل کی ضرورت پڑتی ہے، خود قرآن پاک نے اپنے مُنزل من اللہ ہونے کی جو دلیل دی ہے وہ یہ ہے:

"اگر یہ اللہ کی بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً اس میں بہت سے اختلافات ہوتے" (۴:۸۲)

حقیقت اور صداقت کے پرکھنے کا یہ بہت بڑا معیار ہے۔ انسانوں کی علمی تصنیفات اور ادبی تخلیقات کا بہت بڑا انبار آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اتنا بڑا انبار کہ جس کی بلندی اور وسعت کو کوہ ہمالیہ سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے اس سارے انبار میں سے کوئی ایک شہکار کتاب بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جو موضوع کے اعتبار سے یا اسلوب نگارش کے لحاظ سے اختلافات اور تضادات سے پاک ہو، اگر کسی ایک ہی مصنف کی بہت سی کتابیں ہیں تو ہر کتاب دوسری کے معیار سے مختلف ہوگی۔ بلکہ اس کے متعدد ابواب تک میں بھی ایک ہی معیار قائم نہ رہا ہوگا۔ یہ اعجاز صرف قرآن حکیم کا ہے کہ وقفے وقفے کے بعد تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ ۱۴ دن تک نازل ہوتے رہنے کے باوجود ہر قسم عیوب و نقائص سے مبرا ہے اس کی کسی بھی آیت کی مثال یا نظیر نہ اس وقت پیش کی جا سکی تھی اور نہ کبھی آئندہ پیش کی جا سکے گی۔

یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا اسے پیدا کر سکے۔ اس کے برعکس یہ تو سچ کر دکھانے والا ہے اس کا جو اس سے پہلے آچکا ہے۔ یہ تو "تفصیل" ہے کتاب کی۔ اس میں نہ کوئی شک و شبہ ہے اور نہ کوئی نفسیاتی اُلجھن ہے، یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنا لیا ہے؟ ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی ایک ہی سورۃ اس کی مانند لے آؤ! اور بلا لو (اپنی مدد کے لئے) جس کسی کو بلا سکو سوائے اللہ کے (۱۰:۳۸،۳۷)

یہی ایک چیلنج بھی جو قیامت تک کے لئے برقرار رہنے والا ہے صاحب عقل و علم اور طبع سلیم کے لئے کافی ہے۔ تاہم جو لوگ عقلی دلائل چاہتے ہیں ان کے لئے مندرجہ ذیل حتمی ثبوت پیش کئے جاتے ہیں تاہم اس شرط کے ساتھ کہ آئینہ عقل و خرد کو پہلے سے قائم کردہ تعصبات سے پاک کر لیجئے کیونکہ وہ گرہیں جو مضبوط ہو چکی ہوں مشکل ہی سے کھلا کرتی ہیں۔ اس کے لئے بھی توفیق الٰہی کی ضرورت پڑتی ہے

قرآن حکیم کے وحیِ ربانی ہونے کے ثبوت ۔ پہلا ثبوت، جس زبان میں اللہ کی یہ عظیم المرتبت کتاب نازل ہوئی ہے اس زبان کے اعلیٰ سے اعلیٰ ادبی شہپارے بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے، شروع سے لے کر آخر تک اس کا کوئی جملہ بلکہ کوئی لفظ ایسا نہیں جو ادب عالیہ کے معیار پر پورا نہ اترے۔ آپ کسی بھی آیت سے ایک لفظ اٹھا لیں اور اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھنے کی کوشش کریں یہ کبھی وہاں صحیح نہیں بیٹھے گا اور مجبور ہو کر آپ کو واپس وہی لفظ لانا پڑے گا جو آپ نے اٹھایا تھا۔ الفاظ اور تراکیب کو موقع محل کی صحیح ترین موزونیت اور مناسبت سے انتخاب کیا گیا ہے۔ فصاحت اور بلاغت کا کوئی بھی پہلو کہیں بھی کمزور نہیں رہا، املا، انشاء، محاورہ، روزمرہ، لسانی قواعد سب کے سب بے نقص ہیں،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور الفاظ کے استعمال میں کہیں بھول نہیں ہے ،

دوسرا ثبوت :- دنیا کی ہر زبان میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ پرانے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں یا انہیں فرسودہ سمجھ کر غیر فصیح قرار دے دیا جاتا ہے۔ پچاس ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جانے والے عام انسان بھی ان الفاظ کو دوبارہ سننے کے لئے ترستے رہ جاتے ہیں جو انہوں نے بچپن میں روزمرہ کی گفتگو میں سنے تھے۔ سو ڈیڑھ سو سال میں تو زبانوں کا حلیہ بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے لیکن کمال ہے قرآن حکیم کے اعجازِ زبان و بیان کا کہ نہ تو اس کا کوئی ایک لفظ تک متروک گردانا گیا ہے اور نہ اسے غیر فصیح سمجھا گیا ہے۔ بلکہ جو اسلوب بیان اور طرز ادا اس کتاب مجید نے مقرر کر دیا ہے اسی کو آخری معیار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ الفاظ کی برجستگی سے ہر علمی سطح کا آدمی بھی مستفید ہو سکتا ہے۔ بلکہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے قرآن حکیم کے الفاظ کے معانی و مطالب اس سطح سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ چونکہ اس اعلیٰ معیار فصاحت تک نہ کوئی پہنچ سکا ہے اور نہ کوئی آئندہ پہنچ سکے گا، کیونکہ یہ انسانی سعی و فکر سے بہت بلند ہے پس فصاحت کا یہی معیار تا قیامت برقرار رہے گا۔ اور ہر ادیب، شاعر، دانش ور اور خطیب اسی معیار کو اپنا آئیڈیل بنائے گا۔ غیر از کلام خدا ایسی صفت کا پایا جانا ناممکن ہے۔ ایسی زندہ و پائندہ زبان صرف اسی کی ہو سکتی ہے جو خود حی و قیوم ہو۔

تیسرا ثبوت :- قرآن حکیم کی کسی ایک سورہ کی مانند کوئی دوسرا صوری و معنوی ادب پارہ بنا لانے کا جو دوامی چیلنج ہے اس سے مراد صرف ادبی سٹائیل ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں نفس مضمون، ہمہ گیر علم، وسعت موضوعات اور عالمگیر نظام زندگی کے مستقل اصول پیش کرنے کے لحاظ سے بھی اس مرتبے کی کوئی ایک سورۃ بھی پیش کر دی جائے اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ پہلی اور آخری کتاب ہے جو تمام ادبی محاسن رکھتے ہوئے بھی نوع انسانی کے افکار و اطوار، تہذیب و اخلاق، طرز معاشرت، تاریخ، فلسفے، اقتصادیات بلکہ ریاضی اور طبعیات جیسے خشک مضامین پر بھی پوری گہرائی اور گیرائی سے حاوی ہے۔

شومیٔ قسمت سے ہمیں اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے آج ہم قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے راستے سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ جن علمی حقیقتوں اور صداقتوں کو ہمیں اہل دنیا کے سامنے قرآن حکیم کی حقانیت کے ثبوت میں بطور "فسٹ ہینڈ نالج" کے خود پیش کرنا تھا۔ انہی حقیقتوں کو اب ہمیں یورپ کے محققین سے مانگ کر "اپنوں" کے سامنے پیش کرنا پڑ رہا ہے۔ ڈاکٹر مارس بوکائے فرانس کے رہنے والے شہرہ آفاق سرجن، سائنسدان، ادیب اور مصنف ہیں۔ صف اول کے سائنسدان ہونے کی بنا پر انہیں مرینپتاہ (فرعون) کی حنوط شدہ لاش کو درست کرنے کے اہم کام پر مامور کیا گیا۔ سعودی عرب کی سیاحت کے دوران انہیں بتایا گیا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ فرعون کی لاش کو آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر بوکائے کو عیسائی مذہب کا پیروکار ہونے کی حیثیت سے علم تھا کہ انجیل کی روایت کے مطابق فرعون موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ قرآن حکیم کے اس انکشاف پر وہ حیران رہ گیا۔ کیونکہ اس فرعون کی لاش کے محفوظ ہونے کا "یقینی علم" صرف تھوڑا سا عرصہ پہلے ہی دنیا والوں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو ہوا ہے۔ اس پر ڈاکٹر بوکائے نے قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کی، اور عربی زبان میں مہارت پیدا کرلی، پھر بحیثیت سائنسدان ان سائنسی معلومات کا تقابلی جائزہ لیا جو قرآن حکیم اور انجیل میں پیش کی گئی ہیں۔ اس کی اس طویل بے لوث غیر جانبدارانہ اور معروضی تحقیقات کا نتیجہ ایک کتاب کی صورت میں دنیا کے سامنے آچکا ہے جس کا نام ہے "دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس"۔ پھر فرینچ اکیڈمی آف میڈیسن کے اجلاس میں، جس میں دنیا بھر کے سائنسدانوں نے شرکت کی، ایک لیکچر دیا جس کا عنوان تھا "قرآن اور جدید سائنسی علوم"۔ اس لیکچر کے چند اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ "دوسروں" کے علاوہ "اپنوں" کو بھی معلوم ہوجائے کہ کلام الٰہی کس طرح اپنی حقانیت کو منوا رہا ہے اور بار بار یہ اعلان کر رہا ہے کہ صرف یہی وہ کتاب ہے جس نے اپنی اسی منفرد تعلیمات کی بدولت انسانی ذہن کو فکر و شعور اور علم راسخ کے نئے نئے آفاق عطا کئے ہیں۔

یہ اقتباسات ڈاکٹر بوکائے کے لیکچر کے پہلے اور آخری پیراگرافوں پر مشتمل ہیں:

On the 9th of November, 1976, an unusual lecture was given at the French Academy of Medicine. Its title was "Physiological and Embryological data in the Qur'an". I presented the study because of the existence in the Qur'an of certain statements concerning physiology and reproduction. My reason was because our knowledge of these disciplines is such that it is impossible to explain how a text produced at the time of the Qur'an could have contained ideas that have only been discovered in modern times.

For the first time, I spoke to members of a learned medical society on subjects whose basic concepts they all knew well, but I could, just as easily, have pointed out statements of a scientific nature contained in the Qur'an on other subjects to specialists from other disciplines. Astronomers, Zoologists, Geologists and specialists in the history of the earth would all indeed have been struck just as forcibly as docters, by the presence in the Qur'an of reflections on natural phenomena. These reflections are astonishing because a thorough knowledge of the history of science leads us to the conclusion that they are a challenge to human explanation.

A totally objective examination of it in the light of modern knowledge leads us to recognise the agreement between the two, as has already been noted on repeated occasions. It makes us deem it quite unthinkable for a man of Muhammad's time to have been the author of such statements, on account of the state of knowledge in his day. Such considerations are part of what gives the

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

Qur'nic Revelation its unique place and forces the impartial scientist to admit his inability to provide an explanation which calls solely upon materialistic reasoning. Such facts as I have had the pleasure of exposing to you today, do indeed, appear to me to represent a genuine challenge to human explanation.

ترجمہ: میں نے ۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو فرنچ اکیڈمی آف میڈیسن ، لندن کے سامنے ایک غیر معمولی لیکچر دیا جس کا عنوان تھا "عضویاتی ساخت اور جنین کے بارے میں قرآنی معلومات" میں نے یہ مقالہ دو وجوہات کی بنا پر پڑھا۔ اوّل یہ کہ قرآن حکیم نے عضویاتی ساخت اور عملِ تولید سے متعلق بہت سی باتیں بیان کی ہیں ، دوم یہ کہ ان موضوعات پر ہماری آج کی معلومات بالکل جدید دَور کی دریافتیں ہیں ، یعنی بالکل حال ہی میں سامنے آئی ہیں اور اس نوعیت کی ہیں کہ ان کا 'اس زمانے میں جاننا جب قرآن نازل ہو رہا تھا کسی انسان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔

علم طب کے فاضل ترین ماہرین کے اجتماع میں پہلی مرتبہ ان خاص موضوعات پر گفتگو اس لئے بھی کر رہا ہوں کہ فاضل شرکاء ان کے بنیادی تصورات سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ ورنہ عام سائنسی حقائق جو قرآن پاک نے بیان کئے ہیں ماہرین کے سامنے پیش کرنے کے لئے میرے پاس خاصہ بڑا ذخیرہ ہے جو میں بڑی آسانی کے ساتھ پیش کر سکتا ہوں۔ علم فلکیات ، علم الحیوانات ، علم الارض اور زمین کی تاریخ کا خصوصی مطالعہ رکھنے والے ماہرین سب کے سب اسی طرح مجبور ہو کر حیران رہ جاتے جس طرح آج علم طب کے ماہرین ہو رہے ہیں ۔ یہاں یہ ہے کہ قرآن حکیم میں فطری عوامل کے بارے میں بھی ایسے ہی حقائق بیان کئے گئے ہیں ۔ قرآنی حقائق واقعی حیران کن ہیں کیونکہ سائنس کی تاریخ کا علم ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ یہ تمام معلومات انسانی تشریح و توضیح کے لئے ایک چیلنج سے کم نہیں ۔

جدید علوم کی روشنی میں اگر ہم قرآن حکیم کا بالکل غیر جانبدارانہ اور معروضی مطالعہ کریں تو ہمیں آج کی سائنسی معلومات اور قرآنی ارشادات میں مکمل اتفاق نظر آتا ہے ۔ اور یہ حقیقت کئی بار دہرائی جا چکی ہے ۔ آج کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں جس کے علم کی سطح ہم سب کو معلوم ہے کوئی انسان اس قسم کی سائنسی معلومات بیان کر سکتا ہو ۔ یہ تمام باتیں قرآن حکیم کو وحی کو سب سے منفرد مقام عطا کرتی ہیں ۔ اور ایک غیر جانبدار سائنسدان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی کم علمی کا اعتراف کرے کیونکہ اس کی سوچ مادیت میں پھنسی ہوئی ہے اور اس سے باہر جا ہی نہیں سکتی ۔ آج میں نے جو صداقتیں آپ کے سامنے پیش کی ہیں یہ واقعی ایسا چیلنج ہیں جس کی تشریح کوئی انسان نہیں کر سکتا ۔"

قرآن حکیم تاریخ کی کتاب نہیں ، فلسفے کی کتاب نہیں ریاضی اور طبیعات کی کتاب نہیں ، ہیئت اور فلکیات کی کتاب نہیں ، اخلاقیات کی کتاب نہیں لیکن ان تمام اور بہت سے دیگر علوم پر جو مباحث اس میں آئے ہیں وہ علم کے ہر شعبے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے ماہر کو دائمی بصیرت عطا کرتے ہیں۔ اس عظیم کتاب کی آیاتِ متشابہات کو سمجھنے کے لئے دنیا بھر کے علوم سے واقفیت ضروری ہے۔ انہیں راسخون فی العلم ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

چوتھا ثبوت:۔ اگر کوئی پوچھے کہ اتنی بڑی کتاب کا موضوع کیا ہے تو اس کا جواب صرف ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے "انسان"! ارشادِ ربانی ہے کہ (اے انسانو) بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ہی تو ذکر ہے! کیا پھر بھی تم نہیں سوچتے؟" (۱۰:۲۱)

قرآن حکیم کا موضوع انسان ہے، ہر زمانے کا انسان، ہر خطے کا انسان! یہ کتاب اپنی تمام تشریحات و توضیحات کو خواہ ان کا تعلق تاریخ یا آثارِ قدیمہ کے ابواب سے ہو، خواہ یہ مثالوں کے ذریعے پیش کی گئی ہوں۔ سب کی سب کو انسان اور اس کے عروج و زوال، نشو و ارتقا، اور اس کی حیاتِ تازہ و افسردگی وغیرہ کے حوالے سے سامنے لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مکان اور زمان دونوں کی حدوں پر مسلط اور حاوی ہے۔ انسانی سوچ کی لغزشیں، اس کے پیدا کردہ مسائل علم کے نقائص، اختیار و ارادے کی خرابیاں، معاشرتی مفادات کے تصادم سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، ان سب کا صحیح اور آخری حل اسی کتاب میں ملے گا اور اس مربوط انداز میں ملے گا کہ اس کے ذریعے ایک جامع، قابل عمل اور ہمہ گیر نظامِ زندگی مرتب ہوتا چلا جائے گا۔ جہاں انسانی عقل و فہم کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں سے اس عظیم کتاب کی رہنمائی شروع ہوتی ہے۔

پانچواں ثبوت:۔ جوں جوں انسانی علم و عمل کی راہیں وسیع اور روشن تر ہوتی چلی جا رہی ہیں قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے عالمگیر اصولوں کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج ساری دنیا کا فکر پھر پھرا کر قرآن حکیم کی طرف ہی لوٹ رہا ہے۔ کیونکہ انسانی تجربے پر صحیح اترنے والے حقائق نے اس عظیم کتاب کے اصولوں کو ہر لحاظ سے مکمل اور بہترین ثابت کر دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتابِ ہدایت نے انسان کو علمی اور عقلی اعتبار سے بھی جو رہنمائی دی ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق دی ہے، وہ انتہائی معقول، حقیقت پسندانہ اور لطیف و پاکیزہ ہے ایسی ہدایت صرف وحیٔ ربانی ہی دے سکتی ہے، مفادات میں گھری ہوئی عقلیت نہیں دے سکتی۔

چھٹا ثبوت:۔ قرآن حکیم ایک دائماً زندہ انقلاب اور حرکت و عمل کا نام ہے، دنیا نے اس انقلاب اور زندہ و فعال حرکت و عمل کی جھلک تیئیس سال کے مختصر سے دورانیے میں دیکھ لی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی انسان نے اتنی مدت تک کسی اجتماعی تحریک کی قیادت کی ہو۔ مختلف حیثیتوں سے احکام جاری کئے ہوں اور مختلف مواقع کے مطابق ہدایات دی ہوں اور اس کے احکامات اور ہدایات میں تضاد نہ ہو؟ یہ ناممکن ہے، ذرا سوچئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی طبعی عمر کے ہر لمحے میں خاص طور پر عہدِ رسالت میں، کبھی ایک ناصح مشفق کی صورت میں جلوہ گر نظر آتے ہیں، کبھی معلمِ اخلاق کی شکل میں سامنے آتے ہیں، کبھی ناظم الامور ہیں کبھی ایک کمزور اور نہتی جماعت کے سربراہ ہیں، کبھی تن تنہا آلام و مصائب جھیلتے دکھائی دیتے ہیں، کبھی جنگ آزمودہ سپہ سالار کی حیثیت سے مجاہدین کی صف آرائی کر رہے ہیں، کبھی فاتح بن کر مفتوحہ علاقے میں داخل ہو رہے ہیں کبھی ایک پوری سلطنت کے سربراہ ہیں، کبھی ثالث نادر

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

منعت ہیں کبھی تاجر ہیں کبھی مزدور ہیں، کبھی قانون کی باریک گتھیاں سلجھا رہے ہیں اور کبھی عبادت و عبودیت کے آداب کی تشریحیں کر رہے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان اتنے طویل عرصے تک اتنی متنوع حیثیتوں سے باتیں کرتا رہے اور پھر جب اس کی باتوں کو جمع کرکے پہلو بہ پہلو رکھا جائے تو ان میں کوئی تضاد نہ ہو؟ کوئی تناقض نہ ہو؟ کوئی ناہمواری نہ ہو؟ یہ بھی دیکھئے کہ فتح، شکست، ہجرت، قتل کی سازشوں، منافقین کی ریشہ دوانیوں، ظلم اور اذیت کے بار بار ذاتی تجربوں، افلاس اور فاقہ کشی کے اندوہناک لمحات میں سے گزرنے والا انسان کبھی اپنے جذبات اور خیالات کو ہموار اور یکساں نہیں رکھ سکتا۔ ان میں آثار چڑھاؤ کا پایا جانا ناگزیر ہے اس کی سوچ میں، اقوال و اعمال میں ممکن ہی نہیں کہ تضاد و تباین نہ ہو۔ لیکن قرآن حکیم ان تمام خرابیوں سے یکسر پاک ہے۔ اس کی یک مقصدیت اور اس کا تطابق و توافق ثابت کرتا ہے کہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اپنی تصنیف نہیں بلکہ کسی بھی انسان کی نہیں ہو سکتی خواہ وہ علم و حلم کے کسی بھی بلند مقام پر کیوں نہ ہو یہ کتاب ہر اعتبار سے انسانی فکر و کاوش سے بہت بلند و بالا ہے اور حتمی طور پر کلام الٰہی ہے۔

ساتواں ثبوت: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ساری زندگی جو معاشرے کے ہر طبقے کے ساتھ گھل مل کر بسر ہوئی ہے ایک کھلی کتاب کی مانند ہے، لوگ آپ کے طرز کلام اور انداز گفتگو کے علاوہ آپ کے آداب و عادات و اطوار اور مزاج اور افتاد طبع کو اس طرح جانتے تھے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ علمیت کا آدمی بھی آپ کی بات چیت کی زبان اور وحی ربانی کی زبان کے فرق کو بخوبی پہچان سکتا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جونہی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو پاس بیٹھے ہوئے صحابی پکار اٹھتے تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے حتیٰ کہ مخالفین بھی کہنے لگتے کہ یہ جادو ہے یا کسی جن کی سکھلائی بات ہے۔ یعنی اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام تو کیا کسی انسان کا کلام بھی تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اسے کسی ماورائی قوت سے منسوب کرتے تھے، یہ فرق آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمودات کا ایک بڑا ذخیرہ آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ ان کی زبان میں اور قرآن کی زبان میں جو واضح فرق ہے وہ عربی زبان کا ادنیٰ سا طالب علم بھی بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

آٹھواں ثبوت: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعلان نبوت تک جو چالیس سال کا عرصہ ہے کسی فرد بشر کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی سے طریق نوشت و خواند سیکھا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک "امی" کو علم کے ہر گوشے پر اتنا عبور حاصل ہو جائے اور اتنی وسعت نظر پیدا ہو جائے کہ اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے دنیا بھر کے بڑے بڑے مفکرین صدیوں تک سر دھنتے رہیں اور پھر بھی یہ علم "ان کی تفہیم سے ہمیشہ آگے نکل جائے"۔

نواں ثبوت: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سچائی اور دیانتداری کا اعتراف بلا استثنا دشمن تک بھی ہے آپ کو جمہور عرب نے اس وقت امین و صادق کا لقب دیا جب اس آنکھوں دیکھی چیزوں پر ایمان لانے والی قوم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اچھی طرح پرکھ لیا اور ہر معیار پر جانچ لیا۔ حضور کی صداقت و امانت قبل از نبوت، بعد از نبوت اور بعد از وفات آج تک شک و شبہ سے بالاتر رہی ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب کو اپنی تصنیف کہہ کر پیش کیا ہوتا تو کون آپ کے اس دعوے کو جھٹلا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر معاملے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہیں اور ہر وقت صادق اور امین رہتا ہے ۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی ایک بات میں تو صادق ہو اور دوسری بات میں کاذب ہو۔ جھوٹے شخص کا جھوٹ ، زود یا بدیر کھل جاتا ہے ، زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا ۔ لہٰذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہی کافی ہے کہ " اللہ تمہارے اور میرے درمیان گواہ ہے کہ یہ قرآن مجھ پر وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے ۔ تاکہ میں تمہیں متنبہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے " (۱۹ :)

کہتے ہیں کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان ۔ یعنی اپنی تصنیف کو مصنف ہی بہتر طریقے سے بیان کر سکتا ہے ۔ تو آیئے دیکھتے ہیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے بارے کیا ارشاد فرمایا ہے ۔

۱— یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی فروگزاشت نہیں ہے (۶ : ۳۸)

۲— نہ ہی اس میں کوئی رد و بدل کیا جا سکتا ہے (۶ : ۱۱۵)

۳— یہ " الکتاب " ہے جس کی ہر بات شک و شبہ سے پاک ہے (۲ : ۲) اور متقین کیلئے ہدایت ہے (۲:۲)

۴— جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی کیا وہ جوں کا توں اس میں محفوظ ہے (۶:۱۹)

۵— اس میں اللہ کی طرف سے رہنمائی اور تعلیم مکمل طور پر آ گئی ہے اور کوئی بھی اس میں رد و بدل نہیں کر سکتا (۶:۳۴)

۶— اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے (۴:۸۲) بلکہ تمام اختلافات اس سے دور ہو سکتے ہیں (۴۲:۱۰)

۷— یہ نور ہے (۵:۱۵) اور اس لئے دیا گیا ہے کہ لوگ اس کی روشنی میں زندگی کا سفر طے کریں (۴۲ : ۵۲)

۸— قرآن پاک کی مثل کوئی چیز نہیں (۴ ۱۹ ۵)

۹— یہ سابقہ تمام کتابوں کا مہیمن ہے (۵ : ۴۸)

۱۰— قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ پاک نے لے رکھا ہے (۱۵ : ۹)

آج تنقید نگاری کو دنیا کی ہر زبان اور ہر ادب کا ضروری حصہ سمجھا جاتا ہے ۔ اس فن کے ذریعے نظم و نثر کے شہپاروں کا علمی اور ادبی مقام متعین کیا جاتا ہے ۔ نقاد کے سامنے تحسین اور تنقیص کے مقررہ معیارات ہوتے ہیں ۔ جن کو ملحوظ رکھ کر ادب پاروں کے حسن و قبح پر غیر جانبدارانہ بحثیں کی جاتی ہیں ۔ تاہم چند سال پہلے تک کوئی بھی نقاد آپ کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ دنیا کی عظیم کتابوں کو پرکھنے کے اصول کیا ہیں ۔ امریکہ کے ایک دانشور ادیب ڈاکٹر مارٹیمر ایڈلر نے حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے : گریٹ آئیڈیاز فرام گریٹ بکس ' اس فاضل مصنف نے بعض اہم مسائل کے بارے میں اہل مغرب کے بڑے بڑے مفکرین کے خیالات جمع کر دیے ہیں ۔ ایک مضمون میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ دنیا کی عظیم کتابوں میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں ۔ پھر اس کا جامع جواب اس طرح دیا ہے کہ دنیا کی عظیم کتابوں کو جانچنے اور پرکھنے کے کچھ اصول وضع کر دیے ہیں ۔ اگرچہ اس کے بنائے ہوئے پیمانے انسانی تصنیفات کے پرکھنے کے لئے ہیں کیونکہ اہل مغرب ابھی تک وحی ربانی کی ماورائیت اور انفرادی نوعیت کو سمجھ ہی نہیں سکے اس سوال میں بھی جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے کیونکہ ان کے خیال میں عظیم کتابیں تو ہو سکتی ہیں لیکن ایک عظیم ترین کتاب کا ہونا شاید ناممکنات میں سے ہے ۔ بہر حال ایڈلر کے بنائے ہوئے اصولوں کو دیکھ کر اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ انسانی عقل ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی یہی ،

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پہنچنا آخر انہی راہوں پر ہے جن کی نشاندہی قرآن حکیم نے کر رکھی ہے۔ دنیا کی چند عظیم کتابیں تو شاید ایڈلر کے مقررہ کردہ اصولوں پہ پوری اتر آئیں گی۔ لیکن ان عظیم ترین کتابوں میں سے ایک اور صرف ایک کتاب کا انتخاب کرنا تو اس کے لئے رہنما اصول صرف وہی ہوں گے جو قرآن حکیم کے لیئے "اسماء" میں مضمر ہیں یہ وہ "اسما" ہیں جو دنیا کی ہر کتاب کو قرآن حکیم سے پیچھے بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان "اسمائے قرآن" کی تشریح سے پہلے ایڈلر کے اصولوں کو دیکھ لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ عظیم کتابوں میں

۱۔ اعلیٰ پائے کی ایسی حکمت کی باتیں ہونی چاہیئں جن پر انسانی ذہن بار بار غور و فکر کرے اور ہر مرتبہ اس کی تعبیر تفہیم اور دانائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ ایسی کتابیں گویا مسلسل اور متواتر فکری روایات کا سرچشمہ ہونگی۔

۲۔ عظیم کتابیں دوبارہ نہیں لکھی جا سکتی کیونکہ یہ مستقل اور دوامی حسن و خوبی کی نایاب، نادر اور مکمل ترین شاہکار ہوتی ہیں انہیں آزاد اور غیر وابستہ علوم ([illegible]) پر حرفِ آخر ہونے کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ عظیم کتابوں کے انمول خزانے ان کی معانی آفرینی میں پنہاں ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے مفاہیم اور مطالب ہر سطح کے انسانی ذہن کو تسکین عطا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیروں، تشریحوں اور وضاحتوں کی کوئی حد و انتہا نہیں ہوتی۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کتابوں کے معانی ادق یا پیچیدہ اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ معانی کی ہر نئی تشریح پہلی تشریحوں میں اضافہ کرتی ہے اور انہیں تکمیل کی طرف لے جاتی ہے۔ یا یوں سمجھیئے کہ یہ قاری کو متنوع نقطہ ہائے نظر فراہم کرکے کتاب کی فطری وحدت کے دریافت کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ہمیں عام کتابوں کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت اس لئے نہیں رہتی کہ جو کچھ ان کتابوں کو کہنا ہوتا ہے وہ ایک ہی بار اور پہلے مطالعے میں کہہ ڈالتی ہیں۔ لیکن عظیم کتابیں ہمیں ہر مطالعے کے دوران اور زیادہ گہرائی میں لے جاتی ہیں۔ اور ہر مرتبہ ہمارے ذہن پر نئے نئے معانی ابھر آتے ہیں جو پہلے معانی کے نقیض نہیں ہوتے بلکہ ان کا تکملہ ہوتے ہیں۔ گویا بصیرت افروزی کا سرچشمہ ہونے کے اعتبار سے عظیم کتابیں کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔

۴۔ عام کتابیں انسانی تاریخ کے کسی خاص زمانے یا خاص مقام و ماحول تک ہی محدود رہتی ہیں یعنی ان میں وہ آفاقیت نہیں ہوتی جو ہر مقام پر اور ہر زمانے میں پیش آنے والے انسانی مسائل پر بحث کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور بحث بھی ایسی جسے ہر زمان اور مکان کا آدمی بآسانی سمجھ سکے۔ عظیم کتابیں ان حدود اور قیود سے بلند و بالا ہو کر آفاق گیر ہو جاتی ہیں اور اس طرح ہر زمانے اور ہر مقام کا انسان صدیوں تک انکی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۵۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ عظیم کتابوں کو وقت کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیئے۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے۔ تاہم وقت کی آزمائش پہ پورا اترنا کوئی اتنا بڑا معیار نہیں ہے کیونکہ عظیم کتاب تو اس وقت بھی عظیم ہوتی ہے جب یہ پہلی مرتبہ وجود میں آتی ہے اور اس وقت بھی عظیم رہتی ہے جب اس پر کئی صدیاں بیت جاتی ہیں۔ امتدادِ زمانہ ان کو عظمت نہیں دیتا۔ بلکہ اس عظمت پہ مُہر تصدیق ثبت کرتا ہے، پھر جب مختلف ادوار بلکہ متضاد اور برعکس زمانے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بھی اس کی عظمت کا یکزبان ہو کر اقرار کرلیں تو یہ عظمت نقشِ دوام بن جاتی ہے۔

۸۔ ان سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ عظیم کتابوں کو ہر شخص پڑھنا چاہتا ہے یقیناً ہر شخص! لیکن کوئی بھی اسے صحیح معنوں میں پڑھ لینے پر قادر نہیں ہوتا۔ لوگوں کے اندر اس کے پڑھنے کی خواہش اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ اس میں فکرِ آزاد کا انمول خزانہ ہوتا ہے جو انسان کو کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن لوگ اس کے پڑھنے سے گھبراتے اس لئے ہیں کہ اس کا مطالعہ ان کے فکر و تدبّر کو متحرک کرتا ہے اور فکر و تدبّر کا متحرک ہو جانا ایسا محنت طلب کام ہے جس سے عام آدمی کی تساہل پسند طبیعت گریز چاہتی ہے۔ چونکہ عظیم کتابیں فکر انگیز ہوتی ہیں اس لئے انہیں بار بار پڑھنا پڑتا ہے۔ لیکن بار بار پڑھنے کے باوجود عظیم کتاب کہیں نہ کہیں ہماری عقل و فہم سے بلند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہی وہ بلندی ہے جو ان کتابوں کو عظمت عطا کرتی ہے:

یاد رہے کہ صرف وہی چیز ہمیں بلندیوں کی طرف لے جائے گی جو خود بلند ہو گی۔ عظیم کتابیں انسانی مسائل کا کبھی آخری اور مکمل حل خود پیش نہیں کریں گی، بلکہ انسانی سوچ کے لئے گنجائش باقی رہنے دیں گی۔ بحث و تحیص کو ابھاریں گی۔ فکر کو نئی راہیں دکھائیں گی، اور مزید تحقیقات کے دروازے کھول دیں گی۔ اگر عظیم کتابیں ہر معاملے میں حتمی فیصلہ صادر کر دیں تو پھر انسانی عقل کی فعالیت ختم ہو جائے گی اور فکر و تدبّر کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ یہ صورتِ حال کسی بھی عظیم کتاب کو پسند نہیں آسکتی۔

ڈاکٹر مارٹیمر ایڈلر کے وضع کردہ یہ اصول حتمی نہیں ہیں ان میں ترمیم و اضافہ ہو سکتا ہے۔ تاہم جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ اصول انسانی تصانیف کو ذہن میں رکھ کر بنائے گئے ہیں اگر ان کے مطابق ہی قرآن حکیم کی عظمت کا جائزہ لیا جائے تو بھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ صرف قرآن حکیم ہی دنیا کی واحد کتاب ہے جو ان اصولوں پر پوری اترتی ہے اور ان سے بہت آگے بھی نکل جاتی ہے ان اصولوں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھئے اور اگر کہیں سے کوئی اور معیارات بھی لا سکتے ہوں تو لے لیجئے اور پھر اَن اسماءُ القرآن پر بھی غور و فکر کیجئے جو رَبِّ رحیم و کریم یعنی "الکتاب" کے مصنف نے اپنی کتاب کا تعارف کرانے کے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ آپ کی طبعِ سلیم خود ہی پکار اُٹھے گی کہ یہ کتاب نورٌ و ہدایت واقعی ایک بہت بڑی نعمت ہے جو انسان کو ازراہِ کرم عطا ہوئی ہے۔ اب دیکھئے اسماءُ القرآن اور ان کے دُوررس مضمرات کو اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ دنیا کی عظیم ترین کتاب کی معیاری صفات کیا ہیں۔

۱۔ "الکتاب" کا پہلا صفاتی نام "لَا رَیْبَ فِیْهِ" بیان ہوا ہے۔ کتاب کے معنے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ الف لام کی علامتِ تخصیص کے لگ جانے سے اس کے معنے ہوں گے "وہ خاص منضبط اور محفوظ صحیفہ جس میں احکام و قوانین، اوامر و نواہی، اور انسانی زندگی کو نشو و ارتقا دینے والے اصول و ضوابط بحدِ تکمیل درج ہیں۔ رَیب کے معنے ہیں شک و شبہ، تذبذب، اضطراب اور ذہنی و نفسیاتی اُلجھن جو پریشانی اور عدمِ اطمینان کا باعث بنتی ہے، انسان کے قلب کو کامل سکون اور اطمینان صرف صحیح اور واضح علم ہی دے سکتا ہے۔ ظن اور گمان یا غیر واضح اور غیر یقینی علم نہیں دے سکتا کیونکہ اس پر کوئی اعتماد نہیں ہوتا۔ الکتاب میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جو علمِ صحیح کے منافی ہو یا اندھی عقیدتوں اور توہمات

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پر مبنی ہو یا جو کسی قسم کی ذہنی الجھن اور بے یقینی پیدا کرے

۲ — یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ یعنی ان لوگوں کو سیدھا اور صحیح راستہ دکھلانے والی کتاب ہے جو غلط راہوں کے خطرات سے بچنا چاہتے ہیں۔ اور راہ سفر اختیار کرکے منزلِ مراد تک پہنچنے کے آرزومند ہیں۔ وہ لوگ جو کسی منزل پر پہنچنا ہی نہیں چاہتے اُن کے لئے کسی رہنمائی کے ہونے یا نہ ہونے یا اس کے صحیح یا غلط ہونے کے کوئی معنے ہی نہیں ہیں رہنمائی صرف اسی کے کام آسکتی ہے جو منزل تک پہنچنے کے عزم کے ساتھ ساتھ دل میں یہ تمنا بھی رکھتا ہو کہ وہ راستے سے بھٹک جانے کے خطرات سے محفوظ رہے۔ ایسے شخص کے لئے رہنمائی مشکل راہوں کو بھی آسان بناتی چلی جائے گی۔ اور رہنمائی کی پیروی کرنے والا مسافر قدم بہ قدم اطمینان اور سکون کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ متقی وہ شخص ہے جو دل میں بے راہ روی کا اور غلط راہ پر بھٹک جانے کا خوف رکھتا ہو۔ اور خطرناک نتائج سے بچ کر رہنا چاہتا ہو۔ ہدایت راستہ دکھانا ضد کو کہتے ہیں۔ یہ قرآن حکیم ہر فرد بشر کو امن و سلامتی، نشوو ارتقا اور انفرادی و اجتماعی فلاح کا صحیح اور متوازن دکھاتا ہے۔

۳ — یہ فُرْقَان ہے یعنی واضح اور صاف رہنمائی ہے جو غلط اور صحیح میں، حق اور باطل میں، اور جھوٹ اور سچ میں، فرق بتا کر انہیں الگ الگ کرکے دکھا دیتی ہے۔ قرآن حکیم حق و صداقت کا ایسا صحیح اور یقینی معیار ہے جو خیر و شر کی واضح اور صاف صاف حدیں مقرر کر دیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان کسی مصلحت یا مصالحت کا خطہ قائم نہیں کرتا۔ اس کی پاکیزہ تعلیمات کی رو سے "شرکت میانۂ حق و باطل" کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھائی اور برائی کی پہچان ہر آنے والے دور میں صرف قرآن حکیم کے دوامی راہنمائی ہی سے ہو سکے گی۔

۴ — یہ مُبِيْن بھی ہے اور مُبَيِّن بھی ہے یعنی یہ تمام چھپی ہوئی حقیقتوں کو ظاہر اور الگ الگ کر دینے والا ضابطہ زندگی ہے اور ایسا مجموعۂ قوانین ہے جس میں تمام حقائق صاف صاف بیان کر دیئے گئے ہیں بین کے معنے الگ الگ کرنا ہیں لہٰذا اَلْبَيَانُ ہے کسی چیز کا مکمل کر سامنے آجانا واضح ہو جانا۔ نمودار ہو جانا۔ جن حقائق کا تعلق محسوسات کی دنیا سے ماوراء ہے ان کا معلوم کر لینا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں ہے، انہیں اللہ تعالیٰ نے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری پیغام کی صورت وحی کر دیا ہے "اور ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے تُو اسے لوگوں پر ظاہر کر دے اور تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں"

۵ — یہ مُصَدِّق ہے یعنی سچ کر دکھانے والا۔ بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے انبیائے کرام کا جو طویل سلسلہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچ کر ختم ہوا ہے اس کا منبع و ماخذ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس لئے تمام انبیائے کرام برحق تھے۔ ان کی تعلیم لوگوں کی صحیح رہنمائی کے لئے تھی اور ان کا پیغام ایک ہی صداقت کا حامل تھا۔ دوسری بات یہ کہ زندگی گزارنے کے لئے جو سچے اصول پہلی کتابوں میں بیان کئے گئے تھے، قرآن انہیں سچ کر دکھلانے والا آخری پیغام ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری اور ہدایت کی تکمیل کے متعلق جو پیشین گوئیاں پہلی کتابوں میں بیان ہوئی تھیں وہ پوری ہو کر رہیں۔ قرآن حکیم نے سابقہ تعلیمات کے صحیح اور درست ہونے پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۶۔ یہ مُہَیمِن ہے۔ یعنی یہ دائمی صداقتوں اور عالمگیر قوانین و ضوابط کی اس طرح حفاظت کرنے والی کتاب ہے جس طرح خطرے کے وقت مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپا کر حفاظت کرتی ہے، قرآن حکیم باطل کو کسی طرف سے بھی اپنی صداقتوں پر حملہ آور نہیں ہونے دیتا اور خود بھی اس طرح محفوظ ہے کہ آج تک اس کے زیر زبر تک میں فرق نہیں آیا اور نہ کبھی آئندہ آئے گا۔

۷۔ یہ بلاغ ہے۔ یعنی ایسا "واحد" ذریعہ ہے جو انسان کو اپنے مقاصد حیات کی حد تک پہنچا دیتا ہے "واحد" اس لئے کہ اس کے بغیر حقائق کی گہرائیوں تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ کیونکہ انسانی عقل بھی جو بہت بڑی قوت ہے پیچھے رہ جاتی ہے۔ "بلاغ" بہت خوبصورت لفظ ہے۔ ابلاغ، بلیغ، بلاغت، تبلیغ، مبلغ وغیرہ سب اسی سے نکلے ہیں، عرب کے صحراؤں میں کہیں کہیں کنوئیں تو ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پانی کی سطح برسات اور خشک سالی کی وجہ سے اونچی نیچی ہوتی رہتی ہے۔ اکثر اوقات کنوئیں کی منڈیر پر رکھا ہوا ڈول پانی کی سطح تک نہیں پہنچ سکتا۔ بادیہ نورد جو مسلسل سفر میں رہتے ہیں ہمیشہ ایک دو گز لمبی رسی اپنی کمر کے گرد لپیٹے رکھتے ہیں۔ وہ اس ٹکڑے کو ڈول کی رسی سے باندھ دیتے ہیں۔ تو ڈول پانی کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ گویا ایک یقینی ذریعہ ہے جو مقصد کے حصول کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ رسی کے اس ٹکڑے کو تبلغہ کہتے ہیں۔ یہیں سے بلاغ۔ تبلیغ، ابلاغ وغیرہ کے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ ان معانی کی روشنی میں "بلاغ" وہ چیز ہوئی جو اتنی کافی ہو کہ اس کے ذریعے مقصد کی گہرائیوں تک یا آخری سرے تک پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ پہنچا جا سکے اور کسی اور ذریعے، واسطے یا ساز و سامان کی ضرورت نہ رہے۔ لہذا قرآن حکیم وہ "کافی" ذریعہ ہے جو انسان کو زندگی کی آخری ارتقائی منزل تک لے جاتا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور ذریعے یا واسطے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاہم "ذریعہ" بھی اُس وقت منزل مقصود تک پہنچاتا ہے جب اسے استعمال کیا جائے "ہدایت" بھی کسی کو راہ چلنے پہ مجبور نہیں کرتی، صرف راستہ دکھا دیتی ہے اور راستے کے خطرات، پیچ و خم اور نشیب و فراز سے آگاہ کر دیتی ہے، راستے پر چلنا چلانا انسان کا اپنا کام ہے کسی صاحب عقل و شعور اور صاحب اختیار و ارادہ ہستی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مجبور کرنا اس کی ان صلاحیتوں کا انکار ہو گا۔

۸۔ یہ مُبارک ہے۔ برکت زیادتی اور افزونی کو کہتے ہیں۔ قرآن حکیم وہ مکمل اور بے عیب ضابطہ حیات ہے جس سے انسان کے شرف کو ثبات اور استحکام ملتا ہے جس میں دائمی خیر و برکت ہے۔ جو انسانی ذات کو نشو و ارتقا عطا کرتا ہے۔ جو انفرادی اور اجتماعی حیات انسانیہ میں حسن و ارتقا پیدا کرتا ہے اور جو اسے متوازن اور ارتقا بردوش راہوں پر آگے ہی آگے بڑھاتا رہتا ہے چونکہ صرف قرآن حکیم کے اصول و قواعد کی اطاعت سے ہی انسان کی مضمر صلاحیتیں پھلتی پھولتی اور تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہیں اس لئے قرآن حکیم مبارک ہے، برکتوں والا ہے!

۹۔ یہ مفصّل ہے۔ فصل دو چیزوں کے درمیان کی روک کو کہتے ہیں جو یہ بتاتی ہے کہ یہاں پہلی چیز ختم ہو گئی اور یہاں سے دوسری چیز شروع ہو گئی۔ گویا ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کر دینا تاکہ ان کے درمیان فرق واضح ہو جائے یہ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں مبین اور فرقان کے الفاظ بھی اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن ایک لطیف

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

فرق کے ساتھ، مبین ظاہر اور نمایاں ہونے کو کہتے ہیں۔ یعنی ایسی صاف چیز جسے ہر شخص خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ فرقان سچ کو جھوٹ سے اور صحیح کو غلط سے الگ الگ کر دینے والی چیز ہے مفصل وہ چیز ہوئی جو متضاد باتوں کی حد جدا جدا مقرر کر دے اور جس میں کوئی الجھن نہ ہو۔

۱۰۔ یہ بالحق ہے۔ حق کے معنے ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود، واقع اور ثابت ہونا کہ اس سے انکار نہ کیا جا سکے۔ اس لفظ کے اندر صحت، ثبات اور استحکام کے تینوں مفاہیم شامل ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ بن کر سامنے آجانا "حق" ہے۔ اعمال کے محکم اور تعمیری نتائج کو بھی حق کہا گیا ہے۔ لہٰذا "حق" ذہنی، نظری یا تصوراتی اور محض عقیدے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ نظریاتِ زندگی کے ٹھوس نتائج کا نام ہے۔ قرآن حکیم میں ظن، گمان یا انکل پچو مفروضات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس طرح سورج اپنی دلیل آپ ہے اسی طرح قرآن حکیم بھی اپنی صداقت کا ثبوت آپ ہے کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے یہ زمانے کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے اور اس کے قوانین مستقل اور دوامی ہیں جن کے نتائج ٹھوس شکل میں سامنے آ کر رہے ہیں۔

۱۱۔ یہ ذکر ہے۔ ذکر کے بہت سے معنے ہیں مثلاً یاد رکھنا۔ بھلا نہ دینا، ہر وقت سامنے رکھنا۔ محفوظ کر لینا ضائع نہ ہونے دینا۔ احوال کا ریکارڈ۔ محفوظ کئے ہوئے واقعات وغیرہ کسی کے متعلق اچھی بات کہنا بھی ذکر ہے عبرت بھی ذکر ہے۔ موعظت بھی ذکر ہے اور وہ کتاب بھی ذکر ہے جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے عروج و زوال کے قوانین محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ قرآن حکیم اس لئے ذکر ہے کہ اس میں شرفِ انسانی کی باتیں ہیں عبرت و موعظت ہے، عمل پیرا ہونے کے لئے قوانین و ضوابط ہیں۔ اور اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت ہے اس کے علاوہ یہ اس لئے بھی ذکر ہے کہ یہ اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے عوامل بتانے اور تاریخی یادداشتوں کو محفوظ رکھنے والی کتاب ہے۔

۱۲۔ یہ موعظت ہے۔ کسی کام کے اچھے یا برے نتائج سے آگاہ کرنے کو وعظ کہتے ہیں۔ اس لفظ میں حکم، ڈراوے اور نصیحت کے ذریعے دلوں کو نرم کرنے کے تینوں مفاہیم شامل ہیں۔ قرآن حکیم اس لئے موعظت ہے کہ ان لوگوں کو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں غلط کاموں سے حکماً روکتا ہے۔ اور جو لوگ امن اور سلامتی کے اس دائرے سے باہر ہیں انہیں ان کی غلط روش سے ڈراتا ہے، گویا اس کے اندر "حکم اور حکمت" دونوں مؤثر اور دل نشین انداز میں سمو دیئے گئے ہیں۔

۱۳۔ یہ "علم" ہے۔ علم، کسی چیز کو کما حقہ، جاننا، پہچاننا، حقیقت کا ادراک کر لینا، یقین حاصل کر لینا۔ محسوس کرنا۔ اور محکم طور پر معلوم کرنا ہے۔ حواسِ خمسہ کے ادراکات اور تجریدی تصورات دونوں علم کی ذیل میں آتے ہیں جو کوئی حقائق کا اس طرح ادراک کرے اسے عالم کہتے ہیں جس کی جمع عالمون آتی ہے۔ گہرا اور پختہ علم رکھنے والے کو علیم کہتے ہیں جس کی جمع علماء ہے، علم کا مرتبہ معرفت اور شعور سے زیادہ بلند ہے، اسی وجہ سے اللہ کو عالم اور علیم تو کہہ سکتے ہیں لیکن عارف اور شاعر نہیں کہہ سکتے۔ معرفت کسی چیز کے آثار و قرائن میں غور و فکر کر کے اس کے ادراک کر لینے کا نام ہے، نیز یہ لفظ اکثر ایسے موقعے پر بولا جاتا ہے جب کوئی چیز ادراک کے بعد دلطیان سے اتر جائے اور پھر دوبارہ اس کا ادراک ہو۔ علم میں یہ صورت نہیں ہوتی۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسانی بچہ آہستہ آہستہ محسوسات کو پیچھے چھوڑ کر تجریدات کی طرف آگے بڑھتا ہے اور اس طرح انسان کا تمام تر علم اپنی آخری شکل میں تجرید پر پہنچ کر مکمل ہو جاتا ہے۔ ابتدائی مراحل میں حقائق کی جان پہچان میں حواس ہی انسان کی مدد کرتے ہیں۔ پھر جوں جوں علم میں ترقی ہوتی جاتی ہے مقرون اشیاء پیچھے ہٹتی جاتی ہیں۔ اگر انسان محسوسات میں پھنس کر رہ جائے تو یہ اس کے علم کی حیوانی سطح ہوگی۔ اگر قرآنی ارشادات کے مطابق قلب کو بھی ذرائع علم میں شامل کر لیا جائے تو اس علم کو انسانی سطح کا علم کہا جائے گا۔ کیونکہ قلب کا تعلق جذبات اور احساسات سے اور حیوان ان صفات سے محروم ہیں۔ وہ علم جو حواس تک ہی محدود رہ جائے اور قلب کی گہرائیوں سے واسطہ نہ رکھے طاغوتی علم تو ہو سکتا ہے لاہوتی علم نہیں ہو سکتا۔ بنی نوع انسان کی اجتماعی فلاح کے لئے ایسا علم ناکافی ہی نہیں ضرر رساں بھی ہے۔ کیونکہ انسانی عقل صرف اپنے ذاتی مفادات کو دیکھ سکتی ہے دوسروں کے دکھ درد سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ احساس کرنا عقل کا نہیں قلب کا کام ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے حواس اول تو خود ہی بہت ناقص ہیں پھر ان کے ذریعے سے صرف مادی چیزوں کا ادراک ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان کے ذریعے سے حاصل کیا ہوا علم ہمیشہ ناقص رہتا ہے۔ عقل کی اس کمی کو پورا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے رہنمائی کا سلسلہ جاری فرمایا، جو اب قرآن حکیم کے اندر ہر لحاظ سے ارتقا یافتہ اور مکمل صورت میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم علم ہی نہیں اَلْعِلْم ہے۔

۱۴۔۔ یہ برھان ہے۔ روشن، واضح اور بیّن دلیل کو برہان کہتے ہیں۔ قرآن حکیم کا ہر دعویٰ دلیل و برہان پر مبنی ہے۔ یہ اندھی عقیدت مندیوں اور بے سروپا توہم پرستیوں سے واسطہ نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ یہ اپنے مخالفین سے بھی دلائل طلب کرتا ہے (۲۰ : ۱۱) اسے اپنی صداقت پر اتنا یقین ہے کہ ان سے کہہ دیتا ہے کہ شرک کی تائید میں تمہارے پاس کوئی دلیل ہو ہی نہیں سکتی (۲۳ : ۱۱۷)۔ قرآن حکیم کے پیش کردہ تمام اصول و قوانین کو اور حقائق و دعاوی کو علم و بصیرت کی روشنی میں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

۱۵۔۔ یہ حکمت ہے۔ فلسفے کو قرآن حکیم سے پہلے تمام علوم کی ماں کہا جاتا تھا۔ غیر مسلموں میں اسے اب بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ فلسفے کی یونانیہ تعریف میں کہا گیا ہے کہ یہ علم اور دانائی سے محبت رکھنے کا نام ہے۔ علم اور دانائی دو الگ الگ چیزیں ہیں اگرچہ ان کا آپس کا تعلق بہت گہرا ہے۔ علم دانائی میں اضافہ کرتا ہے اور دانائی "علم" کو صحیح راہ عمل دکھاتی ہے۔ یورپ کے لوگ، علم اور دانائی کی ثنویت میں پھنس کر رہ گئے ہیں چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی تعلیمی معاشرتی اور سیاسی نظریات میں کبھی صرف "معلومات" پر زور دیا جاتا ہے اور کبھی "دانائی" کو آگے بڑھایا جاتا رہا ہے۔ اہل یورپ فلسفے کو (SPECULATIVE PHILOSOPHY) یعنی ظنی یا تخمینی علم بھی کہتے ہیں قرآن حکیم (SPECULATION) یعنی ظن و تخمین کو علم کا درجہ نہیں دیتا۔ اس عظیم کتاب نے جس طرح بہت سے دوسرے تصورات (CONCEPTS) کی تطہیر کر کے ان کو معانی کا ارتقا عطا کر دیا ہے اسی طرح اس نے فلسفے کے مفہوم کو بدل کر اسے "حکمت" کا نام دے دیا ہے۔ حکمت کے معانی پیشتر ازیں بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس میں بنیادی مفہوم ہے "روک دینے کا"

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور روک دینا کسی کو اس کی آزادی کی آخری حد بتا دینا ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ یہی چیز "قانون" کی اساس ہے۔ قانون اور حکم کا فیصلہ ہر ایک کے حقوق و واجبات متعین کر دیتا ہے اور کسی کو اس کی مقرر حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتا کیونکہ یہ عدل کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے اور یہی حکمت ہے۔

حکمت جہالت اور نادانی کو روکتی ہے۔ اسے رائے بالقوت بھی کہا گیا ہے یعنی صحیح فیصلہ کرنے اور اسے مؤثر انداز سے نافذ کرنے کی صلاحیت۔ "قرآن" کو حکیم اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ ہر چیز کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو بھی ان حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔

۱۶۔۔۔ یہ رحمت ہے۔ رحمت اس عطیئے کو کہتے ہیں جو کسی کی ظاہری یا باطنی کمی کو پورا کر دے۔ عطیہ بلا طلب اور بے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ یہ واپس نہیں لیا جاتا۔ اس اعتبار سے رحمت وہ سامانِ نشوونما ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں طبعی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مفت، بے طلب اور بے معاوضہ عطا کر دیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی ارتقا کے لئے جو قوانین، اصول و ضوابط اور قدریں عطا کی ہیں ان سے مادی نشوونما بھی ہوتی ہے اور جوہرِ انسانیت کو بھی نمود و نمو ملتا ہے۔ اس لئے قرآنِ حکیم رحمت ہے۔

۱۷۔۔۔ یہ بصائرُ للنّاس ہے۔ بصر قوتِ بینائی کو کہتے ہیں جس میں روشنی اور چمک کا پہلو مضمر ہے۔ نظر صرف دیکھ لینا ہے۔ جبکہ بصر میں کسی چیز کے دل میں اتر جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس اعتبار سے بصائر کے معنے ہوں گے حق بینی کے ذرائع۔ روشن دلائل۔ واضح نشانات، دانشمندی کے اسباب۔ کھلی ہوئی حقیقتیں۔ تیر کی نوک پر جو تھوڑا سا خون لگ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شکار کو لگ گیا ہے۔ اسے بصیرۃ کہتے ہیں۔ اس کے معنے یہیں سے قوتِ ادراک، ذہانت و فطانت ہو گئے۔ حجت اور دلیل بھی اس کے معنے ہیں۔ نیز یقین، ارادہ، عبرت، موعظت بھی۔ قرآنِ حکیم ایسی روشن اور واضح دلیل ہے جو حقیقتوں کی گواہی دیتی ہے یہ کھلی ہوئی واضح صداقت ہے اور دانشمندیوں کا سبب ہے۔ اس کی ہر آیتِ جلیلہ بڑی صداقتوں کی حامل ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم پوری انسانیت کے لئے بصیرتوں کا مرقع ہے۔

۱۸۔۔۔ یہ نور ہے۔ نور کے معنے روشنی کے ہیں۔ روشنی کی خاصیت یہ ہے کہ یہ از خود واضح اور ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی اسے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ روشنی کا کام ہی دوسری چیزوں کو ظاہر کرنا اور دکھا دینا ہے۔ اندھیرے میں چیزیں چھپ جاتی ہیں ان کا اصل مقام بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر قسم کے اندھیروں پر صادق آتی ہے۔ یعنی اندھیرے خواہ روشنی کے فقدان کی وجہ سے ہوں خواہ تمثیلی معنوں میں جہالت کے ہوں غلط اعتقادات کے ہوں، جذبات کے غلبے کے ہوں یا توہم پرستیوں کے ہوں چیزوں کے اصل مقام کو چھپا لیتے ہیں۔ نور اندھیروں کو دور کر کے ہر چیز کا اپنا اصلی مقام ظاہر کر دیتا ہے۔ قرآن حکیم انسانی زندگی میں دخیل ہونے والی اور اس کے عروج و زوال پر اثر انداز ہونے والی ہر چیز کی قدر و قیمت، اصلیت، ماہیت اور صحیح مقام واضح کر دیتا ہے۔ صحیح اور غلط کا فرق بھی بتا دیتا ہے۔ اس لئے یہ نور ہے۔

چونکہ یہ عظیم کتاب ہر زمان اور ہر مکان کے انسان کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے اس لئے یہ پائیدار امن و سلامتی کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

روشن قندیل بھی ہے۔ اللہ کا یہ نور گویا ارض و سموات کا نور ہے، تمام پستیوں اور بلندیوں کا نور ہے۔

حیاتِ اُخروی کی سعادتوں اور خوشگواریوں کی منزل تک پہنچنے کا راستہ" بھرے بازاروں کے عین درمیان میں سے ہوکر گزرتا ہے جہاں انسانی روابط کی چہل پہل رہتی ہے۔ قطع علائق کی تگدنڈیاں کسی منزل تک نہیں لے جاتیں، لق و دق صحراؤں میں گم ہوجاتی ہیں۔ باہمی روابط اور معاشرتی تعلقات کی گتھا گتھی میں قوانین و احکام الٰہی کی اطاعت کو فراموش نہ کرنا مستقل قدروں کو زندہ و تابدار رکھنا اور الصلوٰۃ و الفلاح کے پروگرام کو قائم رکھنا "اَلدِّین" ہے اور الدین سوائے قرآن حکیم کے اور کہیں موجود نہیں ہے۔

۱۹۔ یہ شِفا ہے اشفا کے معنے بیماری سے اچھا ہونے کے ہیں۔ قرآن حکیم دلوں کے روگ کا علاج ہے، دل کے روگوں کو آجکل کی اصطلاح میں نفسیاتی اُلجھنیں کہتے ہیں۔ معاشرے کے عدم توازن کے کم نصیب افراد کے اندر جو احساس محرومی پیدا ہوتا ہے وہ ذہنی کرب کی صورت اختیار کرکے جنون و دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ ذہنی پیچیدگیاں نفسیاتی امراض بن جاتی ہیں جن سے معاشرہ "فساد" میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ قرآن حکیم چونکہ معاشرتی توازن میں بگاڑ پیدا نہیں ہونے دیتا اس لئے نفسیاتی امراض کا شافی علاج سوائے قرآن حکیم کے اور کہیں نہیں، خوف اور حزن دونوں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ قرآن حکیم کی مستقل قدروں کو اپنا لینا ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم ہر اعتبار سے شفا ہے۔

۲۰۔ یہ عظیم ہے۔ انسانی اور حیوانی جسم میں "ہڈی" بنیادی حیثیت رکھتی ہے، ہڈی کو عربی زبان میں عظم کہتے ہیں بَل کی وہ چوڑی سی لکڑی بھی عظم کہلاتی ہے جس کے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے اور جس کے بغیر "ہل" وجود میں نہیں آسکتا۔ اس اعتبار سے عظمت کے معنے ہیں 'قوی' 'بنیادی' اور اہم حیثیت رکھنا۔ قرآن حکیم تمام سابقہ ہدایت ربانی کی جامع کتاب ہے۔ جملہ علوم کی حامل ہے۔ حریتِ انسانی کا اعلان عام ہے۔ جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت اور اہمیت بنیادی ہے۔ یہ حیاتِ اجتماعیہ کی سطح پر ایک مکمل اور یقینی انقلاب کی دعوت ہے۔ جو نکہ قرآن حکیم ہمیں پستیوں سے نکال کر بلندیوں کی طرف اور اندھیروں سے نکال کر اُجالوں کی طرف لے آتا ہے اور محض تصورات ہی پیش نہیں کرتا بلکہ فکر و عمل میں اتحاد و یگانگت پیدا کرکے ایک عملی نظام بھی پیش کرتا ہے جس کے ذریعے "مدارج"، ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں اس لئے قرآن حکیم لفظاً اور معناً عظیم ہے۔ جونکہ گوشت، پوست، رگ و ریشے اور اعصاب کا نظام ہڈی کے بغیر نہیں ٹھہر سکتا، اس لئے احادیث، تفاسیر، روایات وغیرہ بھی جب تک قرآن حکیم کو اپنا مرکز و محور نہ بنائیں از خود نہیں ٹھہر سکتے۔

۲۱۔ یہ خیر ہے۔ تمام وہ چیزیں جن کے لئے ہر شخص کے دل میں رغبت ہو اور وہ فائدہ رساں بھی ہوں خیر کہلاتی ہیں۔ وہ اچھائی جو بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی پر خوشگوار تعمیری اثرات مرتب کرے خیر ہے۔ قرآن حکیم کی متابعت کرنے سے حال اور مستقبل کی نعمتیں بھی میسّر آتی ہیں اور خود "زندگی" کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے اس لئے یہ سراپا خیر ہے۔

۲۲۔ یہ اَحسن ہے۔ احسن کے معنے سمجھنے کے لئے ایک نکتہ یاد رکھیئے کہ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیئے اگر وہ وہیں ہے تو یہ تناسب ہے اور جس چیز کو مقدار کے لحاظ سے جتنا ہونا چاہیئے وہ اتنی ہے تو یہ توازن ہے جب چیز کے اندر تناسب اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

توازن کی دونوں صفات موجود ہوں، اُس چیز کو ہم حسین کہتے ہیں۔ اگر کسی چیز میں یہ صفات اپنے انتہائی معیار پر پہنچی ہوئی ہوں تو وہ چیز سب سے زیادہ خوبصورت یعنی "احسن" ہوگی۔ اسی لفظ کا صیغہ تانیث حسنیٰ ہے

چونکہ انسان کی اپنی تخلیق احسن تقویم میں ہوئی ہے اس لئے وہ اپنی تخلیق کے قانون یعنی اپنی فطرت کے اعتبار سے صحیح تناسب اور صحیح توازن کو پہچان بھی سکتا ہے حسن کو تخلیق بھی کر سکتا ہے اور اس سے روحانی کیف و سرور بھی حاصل کر سکتا ہے کائنات کی باقی ساری مخلوق اس اعلیٰ صفت سے محروم ہے کیونکہ کسی کی بھی تخلیق احسن تقویم پر نہیں ہوئی۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ اے انسانو! چونکہ صرف تم ہی "حسن" کو پہچان سکتے ہو اس لئے جہاں کہیں کائنات کے اندر تناسب اور توازن بگڑ جائے تم اسے پھر سے درست کر دو، پھر سے سنوار دو، کیونکہ تم حسن تخلیق بھی کر سکتے ہو۔ اور دوسری کوئی مخلوق یہ کام نہیں کر سکتی۔ تمہارے معاشرے کی اعلیٰ قدروں کو پامال کرنے کے لئے دیدہ اور نادیدہ، اندرونی اور بیرونی دونوں قوتیں سرگرم عمل رہتی ہیں من الجنۃ والناس تمہاری دنیا اور تمہاری جنت ارضی کے حسن کو اس کے توازن و تناسب کو بگاڑنے کے درپے ہیں۔ تخریب کاری کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ اور اگر کہیں "اعلیٰ قدریں" ٹوٹنے لگیں یا معاشرے میں اونچ نیچ اور ناہمواری کے آثار پیدا ہونے شروع ہو جائیں یا کہیں سے بھی توازن اور تناسب بگڑنے لگے تو اے اعلیٰ قدروں کے پہچاننے والے انسانو! تم پوری جدوجہد کر کے ہر بگڑی کو بنا دو، ہر ناہمواری کو دور کر دو، ہر بدصورتی کو حسن سے بدل دو، ہر خرابی کو دور کر دو۔ اور اپنی ہمہ جہت سعی و کاوش سے "حسن" کو دوبارہ تعمیر کر دو۔

قرآنی تعلیمات "انسانی ذات" کے اندر بھی حسن و اعتدال پیدا کرتی ہیں۔ اور اس کی خارجی کائنات کے حسن میں بھی اضافوں کا حکم دیتی ہے، اس لئے قرآن پاک احسن الکلام اور احسن الکتاب ہے

ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انسانی عقل از خود حسن کا معیار قائم نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کی نگاہ ظاہر بین ہے سطحیت پسند ہے۔ ہر چمکدار چیز کو سونا سمجھ لیتی ہے۔ باہر کے خوشنما لیبل پر فریفتہ ہو جاتی ہے، بوتل کی خوبصورت وضع قطع پر مرمٹتی ہے اس کے اندر کی چیز کو جاننے کی کوشش نہیں کرتی۔ اور اپنی اسی کمزوری کی وجہ سے اکثر دھوکا کھا جاتی ہے۔ اس کوتاہ نظری سے "حسن کی پہچان کا فطری جذبہ" بھی مبتلائے فریب ہو جاتا ہے، اس دنیا میں قدم قدم پر دام ہائے تذویر بچھے ہوئے ہیں۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست، لہٰذا حسن و قبح میں تمیز کرنے کے لئے انسانی عقل کو خارجی معیارات کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ خارجی معیارات ہمیں قرآن حکیم نے اسماء الحسنیٰ کی صورت میں عطا کر دیئے ہیں ان توازن در کنار و تناسب بدوش احسن ناموں کی روشنی کو اپنے اندر جذب کرتے چلے جایئے پھر دیکھئے کہ آپ کی سیرت و کردار کا آئینہ کس طرح اسماء الحسنیٰ کے نور کو منعکس کر کے دنیا کے ذرّے ذرّے کو جگمگا دیتا ہے

۲۴— یہ عزیز ہے۔ عزیز کے معنے ہیں طاقتور، صاحب اقتدار و غلبہ۔ اللہ تعالیٰ اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کا مالک ہے۔ صاحب قوت و قدرت۔ اس کا کلام بھی قوی اور طاقتور ہے اس کے اندر باطل یعنی کوئی غیر واقعی یا غیر حقیقی بات، کسی طرح سے بھی دخیل نہیں ہو سکتی۔ کوئی غلط فلسفہ، کوئی جھوٹا نظریہ، کوئی بظاہر دلفریب تصور اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کوئی کاذب نظام اس کی اصل حقیقتوں اور پختہ اصولوں کی قوت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ باطل قوتیں جتنا بھی چاہیں زور لگائیں اس کی غیر متبدل قدروں کو جھٹلا نہیں سکتی۔ قرآن حکیم کے حروف اور الفاظ وغیرہ بھی قوی ہیں اور اس کے معانی اور مفاہیم بھی قوی ہیں۔ محکم ہیں۔ رفیع اور اعلیٰ ہیں اس لئے یہ عزیز ہے۔

۲۴۔ یہ میزان ہے، قرآن حکیم میں وزن کا لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کسی چیز کی مقدار معلوم کرنی ہو یا اس کے ہلکے اور بھاری پن کا اندازہ کرنا ہو تو ہم اسے ترازو میں ڈال کر تولتے ہیں عام زبان میں تولنے کے عمل کو وزن کرنا بھی کہتے ہیں وزن کے بنیادی معنے ہیں۔ استقامت، اعتدال اور تناسب، وزن کرنا گویا دو چیزوں کے بوجھ کو برابر کر دیتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کائنات کا سارا نظام توازن کے اصول پر ہی قائم ہے اس کے توازن میں ذرہ بھر بھی بگاڑ پیدا ہو جائے تو سارے کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ انسان دانا و بینا ہستی ہونے کی حیثیت سے اور اس کائنات کے نظام کا بالارادہ فعال رکن ہونے کی بنا پر اس کائنات کا جزو اعظم ہے۔ اس کی تمدنی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں بھی توازن کے اصولوں کا کارفرما ہونا ضروری ہے۔ تاہم معاشرے کا توازن صرف قانون بنا دینے سے یا لوگوں کو اصول و ضوابط بتا دینے سے قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قانون اور اصول و ضوابط کے نفاذ کی ضرورت ہے۔ اور نفاذ بھی ایسا جو افراد کے اندرون قلب سے پیدا ہونے والے "ضبط" کی بنیادوں پر قائم و استوار ہو۔ اس قسم کے نفاذ کے لئے ایک پختہ اور مکمل نظام ضروری ہے۔ جو توازن کے برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہوگا یہی وہ حکمت تھی جس کے پیش نظر ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ضابطۂ قوانین یعنی الکتاب ہی کو نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ المیزان کو بھی نازل کیا ہے۔ یہ "المیزان" وہ معیارات ہیں جو ہر چیز کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں ہر چیز کا "وزن" بتاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کے اندر بالعموم اور دنیائے ارضی کے اندر بالخصوص توازن برقرار رکھنے کی تمام تر ذمہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ اکلوتی ہستی ہے جو صاحب عقل و شعور و اختیار و ارادہ ہے، کائنات کا توازن ان مستقل قدروں کی پیروی سے برقرار رہ سکتا ہے جو قرآن حکیم نے بنی نوع انسان کی عالمگیر وحدت اور فلاح کے لئے اپنے اندر محفوظ کر رکھی ہیں مستقل قدروں کے علم کے ساتھ ساتھ انسان کو یہ آگہی بھی عطا کی گئی ہے کہ ان قدروں کی پیروی میں ذرا بھر بھی انحراف ہوا تو اس سے ساری دنیا میں ہلاکت اور تباہی آسکتی ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم وہ ازلی اور ابدی قانون ہے جو ہر زمانے کے انسان کی راہنمائی ہی نہیں کرتا بلکہ خود زندگی کو بھی متوازن اور حسین بناتا ہے۔

چونکہ قرآن حکیم کی ساری تعلیم "توازن" کے قیام پر ہی مرکوز ہے اس لئے اس لفظ کے قریبی ہم معنیٰ الفاظ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ یہ الفاظ ہیں عدل، انصاف اور قسط۔ قرآن حکیم نے جہاں امتناعی یعنی (PROHIBITIVE) احکام دیئے ہیں کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو، دوسروں کی چیزوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ توازن میں بگاڑ پیدا نہ کرو۔ وغیرہ۔ وہاں مثبت اقدامات کرنے کے (POSITIVE DIRECTIVES) احکامات بھی دیئے ہیں۔ مثلاً وزن کو عدل کے ساتھ قائم رکھو (۵۵:۹) ناپ تول کو پورا رکھو (۸۵:۱۱) یا جس کسی کا پلڑا بھاری ہوگا وہی فلاح پانے والوں میں ہوگا (۱۰۱:۶-۷)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ان مثبت اقدامات کے احکام میں باکثر قسطاس کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قسطاس سونا اور قیمتی جواہرات کو تولنے والے نہایت صحیح ترازو کو کہتے ہیں۔ اب تو پنسل سے لگائے ہوئے نقطے تک کا وزن بتا دینے والے ترازو ایجاد ہو چکے ہیں۔ قسط گویا عدل پر مبنی حصہ ہے۔ عدل دو آدمیوں کے درمیان برابر سلوک کرنے کا نام ہے اور انصاف کسی چیز کے نصف نصف کر دینے کو کہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے انسانی اعمال کے حسن و قبح کے جانچنے کے لئے توازن، تناسب، عدل، ترازو، میزان اور قسطاس وغیرہ کے الفاظ کو تمثیلی انداز پر استعمال فرمایا ہے۔ ترازو اور قسطاس کی تمثیل سے اور بعض دوسرے مذاہب سے مستعار لئے تصورات سے بعض لوگ غلط فہمیوں کا شکار بھی ہو گئے ہیں۔ مثلاً شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی شر انگیز" یعنی ضرورت یا مصلحت کے تحت جھوٹ بول دینا اس سچائی سے بہتر ہے جس میں کوئی شر پیدا ہوتا ہو۔ یہ بات قرآن حکیم کی تعلیم کے منافی ہے اور بالکل برعکس ہے، اول تو سچائی کبھی شر انگیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر شر سے مراد کوئی وقتی یا عارضی بے چینی ہے تو قرآن حکیم اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ صداقت اس کے نزدیک مستقل قدر ہے جو کسی صورت میں بھی پامال نہیں کی جا سکتی۔ واضح الفاظ میں حکم ہے کہ عدل کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو خواہ اس کی زد تمہارے اپنے اوپر پڑتی ہو، تمہارے باپ بھائی یا کسی اور قریبی رشتہ دار پر پڑتی ہو۔ عیسائی گناہ کو لازمہ حیات سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ہر انسانی بچہ اپنے والدین (آدم و حوا) کا اولین گناہ (ORIGINAL SIN) اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس مفروضے سے متاثر ہو کر ہمارے بعض مفسرین نے گناہ کو لازمہ حیات قرار دے دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قیامت کے دن جب اعمال تولے جائیں گے تو ترازو کے ایک پلڑے میں نیکیاں ڈال دی جائیں گی اور دوسرے پلڑے میں گناہ ڈال دیئے جائیں گے۔ چونکہ قرآن حکیم میں ترازو کی ڈنڈی کو سیدھا رکھنے کا حکم ہے، اس لئے گناہ ضرور کرو اور اتنے کرو کہ نیکیوں کے برابر ہو جائیں تاکہ ترازو کی ڈنڈی سیدھی رہے۔ ان خود غلط قسم کے لوگوں کو قرآن حکیم کی اُن آیات کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے جن میں حبط اعمال کا ذکر ہے۔ یعنی ایسے اعمال جن کا کوئی وزن ہی نہ ہو گا۔ اگر ترازو ہی کی مثال سے بات کو سمجھنا ہے تو یوں کہیئے کہ قرآنی معیارات کو ایک پلڑے میں ڈالا جائے گا اور اعمال کو دوسرے پلڑے میں ڈالا جائے گا۔ قابل قبول اعمال وہی ہوں گے جو قرآنی معیارات کے عین مطابق ہوں گے (معیار کسوٹی اور باٹ کو کہتے ہیں) اس قسم کی غلط فہمیوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاذ اللہ گناہ کرنے کا حکم بھی خود اللہ نے دے رکھا ہے۔

رہی مصلحت آمیز جھوٹ کی بات، یعنی اگر جھوٹ بولنے سے کسی خونخوار، وحشی، قاتل کی جان بخشی ہوتی ہے تو جھوٹ بول کر اس کی جان بچاؤ۔ اس مصلحت بینی کو قرآن حکیم نے ایک جامع لفظ "مداہنت" سے تعبیر کیا ہے، اور اس کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ دُہن کے معنے چکنائی کے ہیں، مداہنت اپنے موقف سے پھسل جانا ہے۔ درمیانی راستہ نکالنے والے لوگ بلبل اور صیاد دونوں کو راضی رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رویہ گویا حق و باطل کے درمیان مصالحت اور سمجھوتا کرا دینے کے مترادف ہے جو حق و صداقت کو کبھی قبول نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ "دو اور دو چار ہوتے ہیں" ایک ناقابل تردید صداقت ہے۔ اس مسلمہ صداقت کے خلاف باطل کہتا ہے کہ دو اور دو سات

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہوتے ہیں۔ پھر مصالحت اور سمجھوتے کے طور پہ یہ کہتا ہے کہ نہ تمہاری بات نہ میری بات' آؤ دونوں تسلیم کر لیتے ہیں کہ دو اور دو چھ ہوتے ہیں۔ چلو پانچ ہی مان لو۔ کیا حق و صداقت یہ بات مان لے گا؟ کبھی نہیں۔ کیونکہ حق "ایک" ہوتا ہے دوئی یا کثرت کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ حق اگر اپنے موقف سے تِل برابر بھی ہٹ جائے تو حق نہیں رہے گا۔ باطل بن جائے گا۔ باطل دو اور دو کے مجموعے کو سات کہے یا پانچ کہے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن حق اگر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اس سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے لہٰذا حق اپنے موقف میں نرمی کر سکتا ہے نہ بیشی کر سکتا ہے یہ نہ پونے چار کی طرف آئے گا نہ سوا چار کو تسلیم کرے گا۔ اس کا راستہ مستقیم رہے گا۔ مداہنت کی چکنائی اسے پھسلا نہیں سکتی حق اور باطل دو مختلف' متضاد اور متبائن چیزیں ہیں۔ جس طرح نور و ظلمت میں باہمی اختلاط اور امتزاج ناممکن ہے اسی طرح حق و باطل بھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ نیکی اور بدی بھی اسی طرح دو الگ اور متضاد چیزیں ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نمازیں بھی پڑھ لیں' روزے بھی رکھ لئے' حج بھی ایک کی بجائے کئی کئی کر لئے' خیرات کے نام پہ ہر ہفتے دیگیں بھی پکوا کر بانٹ دیں اور چور بازاری بھی جاری رکھی' اور ذخیرہ اندوزی بھی کرتے رہے بڑیائی کو "کاروبار" کا نام دے کر فروغ دیتے رہے' جھوٹ' فریب' رشوت اور استحصالی ہتھکنڈوں سے کالا دھن بھی سمیٹتے رہے۔ یاد رکھئے کہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کا یہ تصور عقل حیلہ جُو کا پیدا کردہ ہے' جو "مفادات" کی خاطر گریز کی راہیں ڈھونڈتی رہتی ہے اور گناہ اور بدکاری کے خفیہ دروازے کھولتی رہتی ہے۔ اس غلط سوچ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر قانون شکنی' ہر خلاف ورزی' ہر گناہ چھوٹا یا بڑا' انفرادی یا اجتماعی' نہ صرف جائز قرار پاتا ہے بلکہ لازمی بھی بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم اس کے برعکس یہ ہے کہ گناہ کے اثرات و نتائج کسی کفارے سے نہیں مٹ سکتے کائنات کے نظم و نسق میں مکافاتِ عمل کا اٹل قانون بغیر کسی استثنیٰ کے جاری و ساری ہے جس طرح بلندی سے گرنے سے چوٹ آجاتی ہے یا تیز دھار آرے سے زخم ہو جاتا ہے یا آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جاتی ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنے سے' دھوکہ دینے سے' ظلم کرنے سے' دوسروں کا حق مار لینے سے' اور گناہ کا ارتکاب کرنے سے بھی اثرات فوری طور پہ مرتب ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی قسم کی قانون شکنیوں کے اثرات چونکہ جسمانی ہیں اس لئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ جبکہ گناہ کا تعلق چونکہ روح سے ہے اور اس کے اثرات جسم کی بجائے روح پر مرتب ہوتے ہیں اس لئے یہ دیکھے نہیں جا سکتے۔ اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ گناہ کا تو کوئی نتیجہ برآمد ہی نہیں ہوا۔ جو صرف آنکھوں دیکھی چیزوں کو مانتے ہیں' ان کی سوچ انہیں اسی قسم کی تاویلات کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں وہ مکافاتِ عمل کے قانون پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ہر عمل کا نتیجہ برآمد ہو کر رہتا ہے۔ جس نے مثقال کے برابر بھی نیکی کی ہوگی تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔ عمل چھوٹا ہے یا بڑا' اچھا ہے یا برا' نتیجہ اس کے عین مطابق ہوگا۔ اس سے مختلف نہ ہوگا یہی عدل ہے اور یہی مکافاتِ عمل ہے۔ القرآن نے حق و باطل کا فرق واضح کر کے انسان کو وہ "معیارات" بھی بتا دیئے ہیں جن پر اچھے اور برے اعمال کو تولا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مکمل اور صحیح ترین ضابطۂ زندگی نے ان نتائج کی بھی پوری تفصیل بتا دی ہے جو انسانی اعمال سے مرتب ہوتے ہیں۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ارشادِ ربانی ہے کہ جن لوگوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے آمنے سامنے آنے (CONFRONTATION) کا انکار کیا ہے۔ ہم ان کے اعمال کا وزن ہی قائم نہیں کریں گے (۱۸ : ۱۰۴-۱۰۵) ان کے اپنے زعم میں ان کے اعمال نیک تھے لیکن یہ قرآنی معیارات پر پورے نہیں اترے تو یہ بالکل بے وزن ہیں۔ گویا گناہوں کا کوئی وزن ہی نہیں ہوگا۔ یہ ہُوا سے بھی ہلکے ہوں گے۔ کیوں کہ ہُوا کا بھی وزن ہے۔ اب خود ہی بتایئے کہ کیا کوئی بے وزن چیز کسی وزن دار چیز کو تول سکتی ہے؟ وزن صرف ان اعمال کا ہوگا جن کے لئے امر بالمعروف کا فرمان ہوا ہے اور بے وزن اعمال وہ ہیں جن سے لئے نہی عن المنکر کا حکم ہے۔ ترازو کے پلڑے کو نہایت چھوٹی سی نیکی بھی جھکنے کی طرف مائل کر سکتی ہے کیونکہ یہ وزن دار ہے لیکن سنگین سے سنگین گناہوں کا انبار بھی جنبش نہ دے سکے گا۔ کیوں کہ یہ "بے وزن ہوگا"۔ قرآن حکیم "المیزان" ہے یہ زندگی کے قدم قدم پر متنبہ کرتا رہتا ہے کہ پلڑے کے جھکاؤ کو دیکھتے رہو اور کوئی بے وزن عمل پلڑے میں نہ ڈالو کیونکہ جس کے اعمال وزنی ہوں گے وہی قسطاس کو متوازن رکھ سکے گا۔

رہی بات اللہ کی رحمت کی، عفو کی، مغفرت کی، تو جس طرح جسمانی قانون شکنیوں کے نتائج کے لئے اللہ رحیم و کریم نے سامانِ شفا مہیا کر رکھا ہے اسی طرح اُس ارحم الراحمین نے گناہوں یعنی روحانی قانون شکنیوں کے نتائج کے لئے بھی مغفرت اور توبہ کے دروازے کھول رکھے ہیں، اور انسانی ذات" کو آگے بڑھانے کے لئے ہر قسم کے مواقع بڑی فراوانی سے مہیا کر دیئے ہیں، ارتقاء کے قرآنی اصول میں "عفو" کا ایک خاص مقام ہے۔ اپنے ہاں کی ایک مثال پر غور کیجئے، ہمارے تعلیمی ادارے طالب علموں کی کامیابی کے لئے فی صد نمبروں کا قانون بنا لیتے ہیں۔ جو طالب علم سو میں سے صرف تینتیس نمبر حاصل کر لیتا ہے اسے اگلے درجے میں ترقی دے دی جاتی ہے۔ گویا اس کی سڑسٹھ فی صد کمی کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ ارتقائے ذات میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ اگر کسی کے اندر آگے بڑھنے کی تھوڑی سی صلاحیت بھی ہے تو معاف کرتی ہے فطرت بھی اس کی تقصیریں۔ اس کی ستر فی صد تک کی لغزشیں "عفو" کر دی جاتی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے کہ اچھے اعمال غلط اعمال کے اثرات کو مٹا دیتے ہیں۔ (۱۱ : ۱۱۵) نیک اعمال میں چونکہ وزن ہے اس لئے بے وزن اعمال ان کے نیچے دب جاتے ہیں یعنی ان کے منفی نتائج کو ارتقاء کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

اگر نیکی اور بدی کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کا مفروضہ صحیح ہوتا تو پھر کسی پیغمبر اور رسول کی ضرورت ہی نہ رہتی نہ ہی وحیٔ ربانی اور ہدایت و رہنمائی کی اہمیت محسوس کی جاتی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سیاہ کاریوں کے بدترین دور میں بھی قلیل تعداد میں ہی سہی، نیک لوگ موجود رہے ہیں۔ فطرتاً انسان آزاد اور خود مختار ہے اور نیکی بدی کے امتیازات سے محض کورا ہے۔ لہٰذا اگر اسے ان دونوں کے درمیان فرق کرنے کے معیارات معلوم نہ ہوں تو بھی محض اتفاقاً وہ بعض ایسے اعمال کر گزرے گا جو نیکی کی تعریف میں آتے ہیں۔ اور ایسے بھی کر گزرے گا جو برائی یا گناہ کی تعریف میں آتے ہیں اس طرح "حادثۃً" یا محض اتفاقیہ طور پر بھی اُس کی بدیوں اور نیکیوں کے پلڑے برابر ہو سکتے ہیں۔ یا جو لوگ قرآن حکیم کو اپنے اعمال کی کسوٹی یا میزان یا حیاتِ آخروی کا صحیفۂ ہدایت تسلیم نہیں کرتے ان سے بھی نیکی اور بدی میں مقداری برابری کی توقع کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جا سکتی ہے۔ اس صورت میں کسی تعلیم اور کسی ہدایت اور کسی خارجی رہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی لیکن یہ مفروضہ غلط ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی عقل اپنے آپ صحیح راستہ تلاش نہیں کر سکتی، یہ سعی و خطا کا راستہ جانتی ہے، لہٰذا اسے وحیٔ ربانی کی رہنمائی کے بغیر صحیح راستہ مل ہی نہ سکتا۔

مادیت کے پرستار مستقل قدروں کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک ہر وہ کام اچھا ہے جس سے خواہشوں کی آگ بجھتی ہو۔ یا تن کی آسائش کا سامان پیدا ہوتا ہو۔ جو اعمال تسکینِ خواہشات کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہوں وہ برے ہیں۔ مادہ پرستوں کے کئی مکاتبِ فکر ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے نیکی اور بدی کی اپنی اپنی تعریفیں وضع کر رکھی ہیں۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ تعریفیں اور یہ معیارات بھی تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر جھوٹ اور بد دیانتی سے خواہشات کی دوزخ کا ایندھن مہیا ہوتا ہے تو جھوٹ اور بد دیانتی بھی نیکی ہے اگر سچائی اور دیانتداری سے یہی مقصد حاصل ہوتا ہے تو سچائی اور دیانتداری بھی نیکی ہے اہم چیز "قدریں" نہیں بلکہ مقصد براری ہے اس مقصد براری کے لئے ذریعہ جو بھی استعمال کیا جائے وہ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے انسانی عقل کے پیدا کردہ یہ "باٹ" انسانی اعمال کو بالحق نہیں "تول" سکتے۔ لہٰذا نیکی کا ہر وہ تصور باطل ہے جسے قرآن حکیم کی سند حاصل نہیں ہے کیونکہ عالم گیر سطح پر بنی نوع انسان کے اعمال کے نیک و بد کا جائزہ لینے کے لئے یہی ایک مستقل اور دائمی معیار ہے اگر کسی کی نیکیاں بھی غیر قرآنی ہیں تو ان کا کوئی "وزن" قائم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ محض حادثاتی یا اتفاقیہ نیکیاں ہیں ان میں ارادے اور یقینِ محکم کی قوت نہیں ہے۔

یہ تھے چند صفاتی اسماء جو الکتاب کے مصنف خالقِ ارض و سموات نے اپنی گراں عظمت کتاب کے بارے میں بطور تعارف ارشاد فرمائے ہیں۔ اسماءُ القرآن اور بھی ہیں مثلاً روح، نعمت، بشریٰ، تنزیل، حبل اللہ، تذکرۃ، مرفوعۃ مطہرۃ، عبرت، عجب، قیّم، مجید، کریم وغیرہ ہم انہیں قارئین کرام کے ذوقِ جستجو کو بیدار کرنے کیلئے بلا تشریح چھوڑ رہے ہیں۔ ویسے اعجاز القرآن ایک علیحدہ موضوع ہے جس کے کئی پہلو ہیں۔ محققین کو مسلسل اور متواتر قرآنی تعلیمات کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کرتے رہنا چاہیئے۔ اور اہلِ دنیا کو دلائل و براہین کے ذریعے سمجھانا چاہیئے کہ اس سے بڑھ کر عظیم کتاب کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

قرآن حکیم ایک زندہ معجزہ ہے۔ معجزے کا تنقیدی جائزہ جس کسی معیار سے بھی لیا جائے گا وہ معجزہ ہی رہے گا۔ کیونکہ انسانی عقل صرف جزئیات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ حسن کے من حیث الکل معیارات تک پہنچنے کے لئے اسے خود سے بالاتر خارجی رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تنقید نگاری کے تمام اصول اپنی بے بسی اور ناکامی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا رہے گا عقل و شعور میں بھی ترقی ہوتی رہے گی اور ذہن انسانی میں بھی وسعتیں آتی جائیں گی۔ اس وقت کا فکر و تدبر مفروضات کی بجائے ٹھوس آفاقی حقیقتوں کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکے گا۔ قرآن حکیم کے گہرے معانی بھی زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمک اٹھیں گے۔ چونکہ اس عظیم کتاب کا موضوع انسان ہے اور اس کا خطاب "اَلنَّاس" سے ہے اور النّاس میں ہر ذہنی سطح کے لوگ شامل ہیں اس لئے قرآن حکیم ہر شخص کا قرآن ہے۔ اس میں جو احکام ہیں، قوانین و ضوابط ہیں، مستقل قدریں ہیں، دلائل و براہین ہیں یا حیاتِ اجتماعیہ کے اصول ہیں انہیں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اسی لئے ہر انداز میں دہرایا گیا ہے کہ یہ ابدی پیغام کسی ایک ذہنی افق کے طبقے کے لوگوں کے لئے مخصوص اور محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ قرآن حکیم تو ہر شخص کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اُسے بھی جسے محاورۃً موٹی عقل کا انسان کہتے ہیں اور اسے بھی جو دُور رس نکات کی باریکیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس صحیفۂ حریّتِ فکر نے یہ اعلان بھی کر رکھا ہے کہ اس کا سمجھنا ہر اس شخص کے لئے آسان بنا دیا گیا ہے جو خلوصِ نیت سے اسے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ ایک حدیث کے الفاظ میں ہے کہ "احسن حدیث کتاب اللہ ہے، فلاح اسی نے پائی جس کے دل کو اللہ نے آراستہ کیا، اور کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا۔ انسانوں کی حدیث کو چھوڑ کر اللہ کے کلام کو پسند کیا کیونکہ بے شبہ وہ احسن الحدیث ہے اور نہایت بلیغ ہے۔ کبھی تم کو اللہ کے کلام سے اور اس کے ذکر سے تمہارا دل اس کی طرف سے سخت نہ ہو جائیں۔"

قرآن میرا قرآن ہے، آپ کا قرآن ہے، ہم سب کا قرآن ہے، عالم فاضل کا قرآن ہے۔ تو جاہل کا بھی قرآن ہے۔ مسلم دنیا کا قرآن ہے۔ تو افریقہ کے تاریک گوشوں میں بسنے والوں کا بھی قرآن ہے۔ یورپ کے جگمگاتے شہروں کے باشندوں کا قرآن ہے۔ پوری نوعِ انسانی کا قرآن ہے۔ ہر زمانے کا قرآن ہے۔ یہ کائنات کے دل کی دھڑکن ہے، ارض و سموات کے روح کی آواز ہے۔ ملائکہ کا نغمۂ سرمدی ہے اور انسانوں کی حیاتِ اجتماعیہ کا رہبر و ہادی ہے امراضِ قلوب کے لئے شفا کامل ہے، ہر دکھ اور ہر درد کا علاج ہے۔ خوف و حزن کا دافع ہے اور فوز و فلاح کا ضامن ہے۔ حق و باطل کا فرقان ہے۔ اندھے کی لاٹھی ہے، ڈوبتے کا سہارا ہے، راہ گم کردہ مسافر کے لئے خضرِ راہ ہے۔ متلاشیٔ امن و سلامتی کے لئے سکون و راحتِ قلب ہے، جمالِ صداقت ہے، حسنِ فطرت ہے، توازنِ کون و مکان ہے، تناسبِ عناصرِ حیات ہے سرچشمۂ تجلیات ہے، خزینۂ حکمت و دانش ہے۔ کلامِ ابلاغت نظام ہے، اور وہ بھی ایسا کہ جس میں کوئی ابہام نہیں، کوئی شک نہیں۔ کوئی شبہ نہیں۔ کوئی ذہنی الجھن نہیں۔ کوئی نفسیاتی پیچیدگی نہیں، کوئی علم و عمل کی دشواری نہیں کوئی فلسفیانہ ظن و گمان نہیں۔ یہ حکمت کے آبدار موتیوں کی مالا ہے۔ اور ابدی صداقتوں کے گہر ہائے آبدار کی لڑی ہے۔ اس کی تعلیمات ہر خطے اور ہر زمانے کے انسان کی فلاح کی ضامن ہیں۔ اس کا ادب اعلیٰ سے اعلیٰ محاسن کا حامل جس میں کوئی ہزل نہیں۔ کوئی کج بحثی نہیں، کوئی گنجلک نہیں، محض دل بہلانے کا ادب نہیں بلکہ جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ ادب کی چاشنی موجود ہے۔ یہ وہ عظیم ترین واحد کتاب ہے جس کا پڑھنا آسان ہے، حفظ یاد کرنا سہل ہے، سمجھنا اور عمل کرنا اور بھی باسہولت ہے۔ جو واضح ہے، صاف ہے، بلیغ ہے، فصیح ہے۔ سچ ہے جسے وڈیروں اور سرداروں پر نہیں اتارا گیا۔ جو کسی کاہن کی سوغات نہیں۔ کسی شاعر کی لایعنی بات نہیں۔ جو نورِ مبین ہے۔ العلم ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف اور شوشہ تک محفوظ ہے۔ جس کی قیامت تک حفاظت کی ذمہ داری خود خالقِ ارض و سموات نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ جو ہماری سانس ہے، ہماری روح ہے، ہماری زندگی ہے اور ہماری عزیز ترین متاعِ حیات ہے، نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن! سورۂ القمر میں چار مرتبہ ارشاد ہوا۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ پس ہے کوئی نصیحت لینے والا؟

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دنیا میں "قانون" سے متعلق جتنی کتابیں ہیں ان سب میں ایک حصہ پری ایمبل (PREAMBLE) کہلاتا ہے اس حصے میں قانون کی غرض و غایت بیان کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کی پیروی سے فلاں فلاں نتائج برآمد ہوں گے۔ قرآن حکیم کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس نے ہر حکم کے ساتھ اس کا پری ایمبل بھی دے دیا گیا ہے جو حکم کی غایت، علت اور نتیجے کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً روزے رکھنے کا حکم ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ شعار بن جاؤ۔ یہ دوسرا حصہ "تاکہ تم تقویٰ شعار بن جاؤ" پری ایمبل ہے اسے قرآن حکیم نے "حکمت" کہا ہے اور کتاب کے ساتھ اسے بھی من اللہ نازل ہونے کا ارشاد فرمایا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ہر حکم کے ساتھ اس کی حکمت بھی خود ہی بیان کر دی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ ہم ہر لمحے اپنے اعمال کا آپ جائزہ لیتے رہیں اور دیکھیں کہ قانون کا منشا پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر قانون کی متابعت سے مقصدِ قانون کی تکمیل ہو رہی ہے اور وہی نتائج برآمد ہو رہے ہیں جن کا ذکر حکمت کے باب میں لکھ دیا گیا ہے تو یقین کر لیجئے کہ آپ صحیح معنوں میں اس قانون پر عمل کر رہے ہیں۔ اور اگر آپ کے اتباع سے موجودہ نتائج سامنے نہیں آرہے تو جان لیجئے کہ آپ کے اتباع میں خرابی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حکمت میں کوئی کمی بیشی نہیں آسکتی۔ اس کا مقرر کردہ قانون اور اس کی حکمت دونوں غیر مبتدل ہیں۔

اگر ہماری صوم و صلوٰۃ سے وہ نتیجے برآمد نہیں ہو رہے جو ان فرائض کی پابندی سے از روئے قرآن پیدا ہونے چاہئیں تو ہماری متابعت صحیح نہیں ہے۔ بلاشک و شبہ اس میں کہیں نہ کہیں کوئی نقص اور خرابی ضرور پیدا ہو چکی ہے ہم نے شاید قانون کی رسم پوری کی ہے لیکن اسے اپنی زندگی کا اصل الاصول اور لائحۂ عمل نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کے مکمل اتباع سے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل ہونی چاہئیں اور آخرت کی بھی۔ زندگی کے تسلسل اور حیات بعد الممات پر یقین رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اس دنیا میں آپ کے اعمال نتیجہ خیز نہیں ہیں تو آخرت میں بھی نہیں ہوں گے۔ اس بات پر دل کو تسلی دے کر بیٹھ رہنا کہ یہاں خوشگواریاں نصیب نہیں تو کیا ہوا اگلے جہان میں سب کچھ مل جائے گا بہت بڑی خود فریبی ہے۔ قرآن حکیم یہاں کی زندگی اور آنے والی زندگی دونوں کے لئے ایک مکمل اور یقینی ضابطہ ہے۔ یہ دونوں زندگیاں الگ الگ نہیں ہیں۔ بلکہ باہم منسلک ہیں۔ زندگی ایک مسلسل رواں دواں ندی کی مانند ہے جس میں طبعی موت ایک "موڑ" سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس عظیم کتاب و حکمت نے اپنے نزول کی علت و غایت ہی یہ بتائی ہے کہ اس کے اتباع سے فلاح نصیب ہوگا اور کسی کے لئے کوئی خوف و حزن باقی نہیں رہے گا۔ ہمیں دعا بھی یہی سکھائی گئی ہے کہ اپنے رب سے ہر وقت فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً طلب کرتے رہیں کیونکہ اس دنیا کے اندھے کو اگلی دنیا میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔ اگر ہمیں فلاح کے وعدے کی صحت پر پورا یقین ہے تو ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنے تمسک بالقرآن کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا۔ اپنے اعمال کے نتیجہ خیز ہونے یا نہ ہونے کا محاسبہ کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم نے کتاب اللہ سے اپنی گرفت کو کہیں ڈھیلا تو نہیں چھوڑ دیا۔

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا اعلان ہے یہ عظیم ضابطۂ زندگی ایک مکمل اور بے مثال چارٹر آف لبرٹی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یعنی منشورِ آزادی ہے جو انسان کو ہزاروں لاکھوں غلامیوں سے نجات دلاتا ہے۔ یہ ہر زمانے اور ہر ملک اور خطے میں بنی نوعِ انسان کی عظمتوں کا اعلان ہے۔ اِقراء کے ایک معنے "اعلان کرنے" کے بھی آتے ہیں۔ اس لفظ کے دوسرے معنے "پڑھو" اگر اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ کی آیت (۱:۹۶) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی پہلی آیت ہے تو اس وقت تو کوئی لکھی ہوئی چیز موجود نہیں تھی جس کے پڑھنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ لہٰذا اقرأ کے معنے "اعلان کرنے" لئے جائیں گے تو یہ زیادہ بہتر ہیں اس اعتبار سے سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات کا ترجمہ یہ ہوگا "آج اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اعلان کر دے اپنے پروردگار کی صفت ربوبیت (اسم) کا کہ جس نے تخلیق کیا۔ تخلیق کیا انسان کو جونک جیسی ایک چیز سے۔ اعلان کر دے کہ تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا یا قلم کے ذریعے اور انسان کو علم سکھایا جو کوئی بھی پہلے نہ جانتا تھا۔" خالق اکبر کی ربوبیت کی ایک جھلک بیج کے پھوٹنے سے اس کے کامل بار آور درخت بن جانے کے عمل میں دیکھی جا سکتی ہے یا جب ننھا سا کوئی انڈہ پھوٹتا ہے اور اس میں سے ذی روح مخلوق باہر آ کر نشو و ارتقا کے مختلف مدارج میں سے گزرتی ہوئی اپنی طبعی تکمیل تک پہنچتی ہے تو اس کے عروج تک پہنچنے کی داستان بھی اللہ کی ربوبیت کا مظہر ہوتا تذکرہ ہے۔ لیکن اللہ کے کلام اوّلین کا مخاطب چونکہ نباتات اور حیوانات سے بلند تر مخلوق "انسان" سے ہے۔ اس لئے اس آیت مبارکہ میں اس کی تخلیق اور تکمیل کا ذکر جونک کے ابتدائی مرحلے سے لے کر علم کے انتہائی مرحلے تک "نہایت جامعیت" کے ساتھ کیا گیا ہے اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے "اِقراء" کے بنیادی معنے اس طرح صحیح بیٹھتے ہیں جس طرح انگوٹھی میں نگینہ۔ یہ بنیادی معنے کیا ہیں۔ غور سے سنئیے۔ اِقراء کا مادہ ہے ق۔ ر۔ ا۔ اور اس کے معنے ہیں جمع کرنا۔ لیکن جمع کرنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس میں چیزیں الگ الگ بھی موجود رہتی ہیں اور یکجا بھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً گندم کے دانوں میں جَو یا چاول ملا دیے جائیں تو اس آمیزے میں ہر چیز علیٰ حالہٖ رہے گی۔ اس پر دوسری چیز کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ انہیں پھر سے الگ الگ بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا جمع کرنا وہ ہے جسے ہم عام محاورے میں شیر و شکر ہونا کہتے ہیں۔ گلاب کے پھولوں میں چینی ملا کر دھوپ میں رکھ دیں تو یہ گلقند بن جائے گی یعنی نہ پھول کی پتیاں الگ ہو سکیں گی اور نہ چینی کے دانے۔ یہ ایسے مل سکیں گے۔ اس قسم کے ملاپ سے "تخلیق" وجود میں آتی ہے۔ نر اور مادہ کے کروموسوم جب یکجان ہو کر بڑھنے لگتے ہیں تو جونک نما چیز بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے جمع کرنے کو عربی زبان میں ق۔ ر۔ ا کے مادہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ لفظ قرآن بروزن فعلان اس مادہ کا مصدر رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے اندر ان تمام ابدی اور غیر مبدل صداقتوں کو جمع کر رکھا ہے۔ جن کے مطالب علم انسانی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ابھرتا چلا جاتا ہے۔ قرأت کے معنے پڑھنا اس لئے ہیں کہ مختلف حروف کو باہم اس طرح ملا دیا جاتا ہے کہ "لفظ" تخلیق ہو جاتا ہے اور لفظوں کے اجتماع سے جملہ تخلیق ہو جاتا ہے۔ جو فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے لہٰذا القرآن وہ خاص چیز ہے پڑھنے کی، سمجھنے کی، غور و فکر کرنے اور عمل کرنے کی جو انسان کو سلامتی کی راہ دکھاتی ہے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو اس کے احکام و ضوابط سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں، انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتی ہے۔

ہمیں اپنی دنیاوی زندگی میں جن کتابوں سے واسطہ رہتا ہے وہ دو طرح کا لٹریچر پیش کرتی ہیں۔ ۱۔ تفریحی ادب ۲۔ سنجیدہ یا کاروباری ادب۔ تفریحی ادب میں قصے کہانیاں، ناول، طنز و مزاح، نظمیں، غزلیں، گیت، ڈرامے، انشائیے وغیرہ کی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں جن میں تخیل سے زیادہ اور حقیقتوں سے کم مدد لی جاتی ہے۔ سنجیدہ ادب میں علوم و فنون

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی کتابیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ریاضی، طب، کیمیا، طبیعات، فلسفہ، نفسیات، علم ہیئت، معاشیات، معاشرتی علوم اور ٹیکنالوجی کی کتابیں وغیرہ۔ بعض لوگ اس دوسری قسم کے سنجیدہ یا کاروباری ادب کو ادب ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو پہلی قسم کے تفریحی ادب کو فضول اور لایعنی ادب سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک وہ ادب جو محض تفریح کے لئے تخلیق کیا جائے انسانی زندگی کے لئے ارتقائی راستہ متعین کرنے کا اپنے اندر کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ ایک مکتب فکر ادب برائے ادب کا حامی ہے تو دوسرا ادب برائے زندگی کا قائل ہے تاہم ایک بات جو واضح طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ انسانی تخلیق کی ہر کتاب، خواہ وہ ادب برائے ادب کے تقاضے پورے کرتی ہو یا ادب برائے زندگی کی ذیل میں آتی ہو، ایک محدود اور متعین موضوع کے محور پر گھومے گی، ہمہ گیر نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا کی قسم کی کتابیں بھی۔ جن کی تدوین و ترتیب میں سینکڑوں عالی دماغ انسانوں اور کئی خودکار مشینوں کی محنت صرف ہوتی ہے، اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان کتابوں کے لئے ہزاروں کی تعداد کا مستقل عملہ متواتر ردّ و بدل اور ترمیم و تنسیخ کے کام پر مامور رہتا ہے۔ ایسی کتابوں کا ہر باب ایک جامع کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی اعتبار سے انسائیکلوپیڈیا کو جو کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوتا ہے، ایک چھوٹی سی لائبریری سمجھ لینا چاہیئے۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ یہ انفرادیت اور کمال صرف قرآن حکیم کو حاصل ہے کہ یہ کسی ایک خاص علم کی کتاب نہ ہونے کے باوجود دنیا بھر کے علوم کو چند غیر مُبدّل بنیادی حقائق کے تحت منضبط کر دینے والی کتاب ہے اور ایسا "العلم" ہے کہ اس کی ایک ایک آیت کی تشریح و توضیح میں کئی کئی انسائیکلوپیڈیا مرتب کئے جا سکتے ہیں اور کائنات کے ہر علم کی شمع اسی "العلم" کے لازوال نور سے روشن ہے اور جب تک دنیا قائم ہے ہر علم اسی نور سے مستنیر ہوتا رہے گا۔

موجودہ زمانے کے بعض "راہ گم کردہ" مفکرین کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے "مطلق حق" یعنی (ABSOLUTE TRUTH) کہا جا سکے یا جو مطلق خیر (ABSOLUTE VIRTUE) ہو۔ ان کے خیال کے مطابق ہر چیز ہر لمحے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ چونکہ مادّہ شکلیں بدلتا رہتا ہے، کسی ایک وضع پر قائم نہیں رہتا اس لئے حق و باطل کے معیارات بھی بدلتے رہنے چاہئیں یعنی جس صفت کو آج ہم خیر یا اچھائی کہتے ہیں کل کو وہی چیز شر یا برائی بن جاتی ہے اس لئے قدروں کا کوئی دائمی یا مستقل وجود نہیں ہے۔ بلکہ کوئی بھی حقیقت ابدی نہیں ہے اس خیال کے لوگوں سے صرف اتنا پوچھ لینا چاہیئے کہ آپ کی یہ بات کہ دنیا میں مطلق حق و صداقت کا وجود نہیں ہے "کہاں تک درست ہے۔ کیا یہ بالکل سچی یقینی مطلق صداقت پر مبنی بات ہے یا اس میں بھی تبدیلی آ سکتی ہے؟ اگر یہ کلیہ دائماً صحیح اور درست ہے تو پھر آپ نے گویا اقرار کر لیا کہ صداقت مطلق یا (ABSOLUTE TRUTH) کا وجود ہے۔ اور آپ نے جو بات کہی ہے وہ غلط ہے۔ اور اگر آپ کا مؤقف یہ ہے کہ آپ کی بات میں بھی تبدیلی آ سکتی ہے تو پھر آپ کی بات محض مفروضہ اور ظن و تخمین ہے جو اہل علم کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن کو دیکھنے والی عینکیں ہی نہیں نگاہیں بھی بدلتی رہتی ہیں، مختلف زاویئے سے مشاہدہ کرنے والوں کی آراء مختلف بھی ہو سکتی ہیں، اور متضاد بھی ہو سکتی ہیں لیکن اس سے حسن کے وجود کی نفی تو نہیں ہو جاتی۔ "سولزنیٹسن" مادّی اشیاء سے الگ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتی۔ یہ حسین چیزوں کے پیچھے بھاگتی رہتی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

لیکن حسن کو نہیں دیکھ سکتی۔ احساس سے قدرے ماوراء چیز کو کلچر کہتے ہیں۔ کلچر مادی اشیا سے گزر کر تجرید کی آنکھ سے حسن کا ادراک کر لیتی ہے۔ ہیولا ئزڈ انسان کہتا ہے حسن کہاں ہے؟ کلچرڈ انسان کہتا ہے حسن کہاں نہیں ہے؟ تمدن اور تہذیب کا یہی فرق قدروں کے تعین میں اختلاف کا باعث بنتا ہے۔

آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے "مدنیت" کو آگے بڑھا کر "تہذیب" کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایک طرف جسمانی آرام و آسائش کے لئے بیشمار دروازے کھول دیئے ہیں تو دوسری طرف شکوک و شبہات اور فکری انتشار پیدا کر کے روحانی دنیا میں حبس کی سی فضا پیدا کر دی ہے۔ شک و شبہات یقین اور ایمان کی ضد ہیں۔ عدم اطمینانی نئے نئے نظریات کو جنم دیتی ہے۔ آج کسی ایک سائنسی نظریئے کو برحق مانا جا رہا ہے تو کل اس کی پرزور تردید ہو رہی ہے۔ متفکرین کے سامنے تغیر کا فلسفہ اتنی شدت اور تیز رفتاری کے ساتھ آ رہا ہے کہ اب کوئی قاعدہ "قاعدہ کلیہ" نہیں رہا۔ ہر خیال محض ایک مفروضہ سمجھا جاتا ہے جو کسی بھی وقت غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مسلسل تغیر کے احساس کے ساتھ ذہنی اضطراب، خوف، عدم اطمینان اور مایوسی کی آمیزش نے استحکام اور دوام کے تصور کو ہی مٹا دیا ہے۔ اب چونکہ ان کے نزدیک کوئی چیز، کوئی نظریہ، کوئی قاعدہ، کوئی قانون، کوئی اصول مستقل اور دائمی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے خدا کو بھی ابدی حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے تصور کے اس طرح ختم ہو جانے سے مذہب کا تصور بھی مٹ گیا۔ مذہب نہ رہا تو اخلاقی ضابطے بھی بے معنی ہو کر رہ گئے۔ ابدی صداقتوں اور مستقل قدروں کے انکار سے ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کو جواز مل گیا جس کے ہاتھ میں مادی وسائل پر مکمل کنٹرول کی لاٹھی آ گئی اسی کے تصرف میں اصول و ضوابط اور اسی کے قبضے میں اخلاقیات کی تشریحیں بھی آ گئیں۔

اشیا اور تصورات اضداد سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ سفید کا تصور سیاہ سے قائم ہوتا ہے اور روشنی کا وجود اندھیرے سے قائم کیا جاتا ہے۔ چیزیں ٹھوس اس لئے ہیں کہ ان کے مقابلے میں مائعات اور گیسیں بھی ہیں۔ سچائی کو جھوٹ سے اور جھوٹ کو سچائی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار اپنے آپ مقابل کی دوسری چیز کے انکار کو ثابت کر دیتا ہے۔ سفیدی کا تصور نہ رہے تو سیاہی کا تصور خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر حق و صداقت کا تصور باطل ہے۔ تو باطل کا تصور از خود باطل ہو گیا۔ نفی کی نفی اثبات کے مترادف ہوتی ہے۔ اس لئے باطل کا باطل ہو جانا حق کا قائم اور ثابت ہو جانا ہے۔ جن لوگوں کو تغیر ہی تغیر دکھائی دیتا ہے اور قیام و ثبات دکھائی نہیں دیتا وہ دراصل اپنے عقلی اور مادی علوم سے بھی پر خلوص اور وفادار نہیں ہیں۔ اس وقت تسخیر کائنات کے فریضہ انسانی کی ادائیگی میں علم طبیعات سب سے آگے ہے۔ علم طبیعات کا وجود علم ریاضی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ وہ علم ہے جسے صحیح ترین علم کہا جاتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ریاضی کی بنیاد ہی چند موضوعہ اصولوں اور بدیہیات (AXIOMS AND POSTULATES) پر رکھی گئی ہے۔ اعداد نقطے، خطوط، دائرے بلکہ قوت، وقت اور فاصلے وغیرہ کے تصورات بھی محض وجدانی ہیں جنہیں ہم بغیر کسی ثبوت کے صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ بغیر ثبوت کے صحیح تسلیم کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ مذکورہ خاصیتیں رکھنے والی چیزوں کو ہمارے اسلاف نے بھی ہمیشہ اسی طرح دیکھا، جانا اور پہچانا ہے۔ ہم بھی انہیں اسی طرح جان اور پہچان رہے ہیں۔ اور ہماری آئندہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

آنے والی نسلیں بھی تاقیامت انہیں اسی طرح جانیں اور پہچانیں گی۔ نقطے، دائرے، مقادیر وغیرہ کے تصورات اور ان کی خصوصیات میں ازل سے ابد تک کوئی فرق یا کوئی تغیر نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ ابدی مستقل، دائمی اور غیر مبدّل صداقتیں ہیں یعنی مطلق Absolute سچائیاں ہیں۔ پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ دنیا میں صرف تغیر ہی تغیر ہے دوام اور ثبات نہیں ہے وہ جھوٹا ہے اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اور سائنس کی بھی تغلیط کر رہا ہے، وہ ایسا صرف اپنی ذاتی اغراض و مقاصد کو فروغ دینے کے لئے کر رہا ہے اور اس کا مطلوب و مدعا استحصالی طور طریقوں کے لئے جواز و تحفظ مہیا کرنا ہے۔ گردشِ زمانہ، دنیا کی بے وفائی کی باتیں، مایا کے دھوپ چھاؤں ہونے کا تصور، تقدیر پرستی، تاریخی وجوب کا فلسفہ، اپنی قسمت پر شاکر و صابر رہنے کی تلقین، غریبی کے حق میں وضعی روایات، فنڈامینٹل ازم کی جدید ترین تحریک جو انسانی فکر کو اسلاف پرستی اور آرتھوڈاکسی یعنی روایات سے چمٹے رہنے کی بند کوٹھڑیوں میں مقید کر دیتی ہے اور قرآن حکیم پر غور و تدبّر کرنے کو گناہِ عظیم سمجھتی ہے، یہ سب سازشیں اور تحریکیں اسی "انکارِ دوام و ثبات" کے فلسفے سے ابھرتی ہیں۔ مستقل قدروں کا انکار قرآن حکیم کے انکار کے مترادف ہے۔ اس انکار کے پیچھے اور بھی بہت سے مقاصد کارفرما ہیں۔ مثلاً

۱ــــ توحید کے قرآنی مفہوم میں شکوک و شبہات کی آمیزش کر دی جائے۔

۲ــــ فضول اعتقادی بحثوں کو ہوا دی جائے تاکہ فرقہ پرستی کے اختلافات اور زیادہ شدید ہوں۔ اور ملتِ مسلمہ قرآن حکیم کے ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہو سکے۔

۳ــــ شبہات کی آمیزش سے ایمان اور یقین کی قوت کو کمزور بنا دیا جائے تاکہ

۴ــــ ملتِ اسلامیہ اپنے "نفسِ واحد" ہونے کے کھوئے ہوئے تشخص کی بازیافت کے لئے جدوجہد نہ کر سکے

۵ــــ سائنس اور ٹیکنالوجی کی برتری قائم رہے اور کوئی قوت اس کی مدمقابل نہ بن سکے۔

۶ــــ "سب مذاہب سچے ہیں۔ ایک ہی خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔ کوئی رام کہے، رحیم کہے، خدا کہے، واہگرو کہے گا ڈ کہے یزدان کہے بات ایک ہی ہے۔ اسی ایک خدا کی پوجا اور پرستش مطلوب ہے جو جس طریقے سے کرے کرتا رہے" اس خیال کی ہیبتی پر پانی کی طرح روپیہ بہا دو تاکہ اللہ کا اور عبادت کا جو تصور قرآن حکیم نے دیا ہے، وہ ختم ہو جائے۔

۷ــــ توحیدِ قرآنی کے مقابلے میں ثنویت کو ابھارا جائے لیکن محتاط طریقوں سے۔ یعنی ثنویت کو توحید ہی کا لباس پہنا دیا جائے تاکہ موحدین دھوکا کھا جائیں۔ ثنویت کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ کسی چیز کی انفرادیت اور یکتائی کو ختم کرنا ہے تو دوسری چیزوں پر اسی سے ملتا جلتا لیبل لگا دو اور اس متبادل نمونے کو خوب آراستہ و پیراستہ کر کے ناپختہ شعور کے سامنے پیش کر دو۔ اگر ناپختہ شعور اسے قبول نہ بھی کرے گا تو فکر نہ کرو وہ شک میں مبتلا ضرور ہو جائے گا۔ ایمان کو اپنے مقام سے ہٹا دینا، اسے متزلزل کر دینا اور شبہات پیدا کر کے اس کی بنیاد کو ہلا دینا بھی تو بڑی کامیابی ہے

۸ــــ اس کامیابی کے حاصل کرنے کے لئے کٹ ملائیت کو ابھارو، روپے کی ریل پیل کر دو۔ ان کی شاعرانہ اور جذباتی تقریروں کے کیسٹ تیار کر کے مفت تقسیم کرو۔ ہوائی جہازوں کے سفر کراؤ۔ فائیو سٹار ہوٹلوں میں ان کے قیام و آسائشوں پر

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

خاص توجہ دو، انہیں شاہانہ کر دو فرسے ری سپیش دو اوران کی معرفت اپنے مقاصد کو تکمیل تک پہنچاؤ۔ تاکہ حقیقت خرافات میں اور اُمّت روایات میں اُلجھی رہے اور قرآن کی طرف سے آنکھیں بند کرے۔

اسی سازش کی ایک بہت بڑی کڑی یہ بھی ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ یورپ زدہ نوجوان جو مارکسیت، فرائڈ کی جنسیت، ژاں پال سارتر کی فرزدیت اور ہیگلے کے بے خدا مذہب کے فلسفہ سے مرعوب ہو کر آجکل یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ قرآن حکیم واقعی ایک سچی کتاب تھی جو عرب قوم کے لئے مخصوص تھی۔ اس نے عرب قوم کو بام عروج تک پہنچا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے قیصر وکسریٰ کے تاج اس خانہ بدوش، اَجڈ اور بے سروسامان قوم کے پاؤں تلے روندے گئے۔ یہ سب کچھ صحیح اور درست ہے لیکن قرآن حکیم کی تعلیمات اُس وقت اور اُس ملک کے لئے تھیں۔ ابدی یا دائمی اور مستقل نہیں ہیں۔ آج ڈیڑھ ہزار سال گزر جانے کے بعد جبکہ علم، فلسفہ، طرزِ معاشرت، وسائلِ آمد و رفت، ابلاغ عامہ کے ذرائع، انسانی روابط کی نوعیت وغیرہ سب بدل چکے ہیں تو قرآن حکیم کے فرسودہ اصول وضوابط فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اور موجودہ دور کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتے۔ آیئے اس اعتراض کا جو دوام اور ثبات کے انکار کا ہی شاخسانہ ہے حقیقت پسندانہ انداز سے جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ اعتراض یہ ہے کہ اگر قرآن حکیم واقعی ابدی، دائمی اور مکمل ترین ضابطۂ زندگی ہے تو اس نے چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود مسلمانوں کی تقدیر کو کیوں نہیں بدلا۔ اگر اب تک یہ ان کی قسمت کو نہیں بدل سکا تو آئندہ کیا بدلے گا۔ جبکہ اس پر سے مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ جس نظام زندگی کو آپ قرآن کہتے ہیں وہ عملی صورت میں اس وقت کہاں ہے؟ تاریخی اعتبار سے بھی قرآنی معاشرہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس سال تک قائم رہ سکا تھا جبکہ سرمایہ داری، ملوکیت، پیشوائیت اور انسانوں کو طاقت کے زور سے مطیع اور محکوم رکھنے والے تمام دوسرے نظام ہائے زندگی صدیوں تک جاری رہے ہیں اور اب بھی انہی کا بول بالا ہے۔

قرآن حکیم نے اس قسم کے تمام متوقع اعتراضات کے جواب پہلے ہی دے رکھے ہیں۔ ہم ان جوابات کو دہرانا نہیں چاہتے۔ علمی دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ معترضین کو پہلے قرآن حکیم پڑھ لینا چاہیے تھا۔ اور اسلامی نظام کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر ان پر تنقید کرنی چاہیے تھی۔ موجودہ اعتراض عالمانہ نہیں بلکہ محض جذباتی ہے۔ قرآن حکیم کا چیلنج اب بھی اسی طرح برقرار ہے کہ میرے پیش کردہ عالم گیر نظام زندگی سے بہتر یا کم از کم اسی کے مقابل کا کوئی نظام زندگی کسی کے پاس ہے تو وہ پیش کرے تاکہ عقل و تجربے کی کسوٹی پر دونوں کو پرکھا جا سکے۔ دنیا میں بڑے بڑے فلسفی، قانون دان، معاشرتی علوم کے ماہرین اور مفکرین معاشیات و اقتصادیات پچھلے چودہ سو سالوں سے قرآنی نظام حیات کے خدوخال کا بغور مطالعہ کرتے آرہے ہیں لیکن کسی ایک نے بھی اس کے کسی کمزور گوشے کی نشاندہی نہیں کی۔ بلکہ اس کے مکمل اور بے عیب ہونے کا اقرار کیا ہے۔ چودہ سو سال کی تاریخ عالم شاہد ہے کہ پرانے نظام کو بدلنے والی جتنی بھی اصلاحات جہاں کہیں بھی ہوئی ہیں ان کا منبع اور ماخذ سوائے قرآن حکیم کے اور کہیں نظر نہ آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن حکیم کی ابدی صداقتیں اپنے آپ کو اپنی حقانیت کے زور سے منواتی آرہی ہیں۔ قرآن حکیم کا خطاب "انسان" سے ہے۔ جو کوئی بھی اسکی تعلیمات

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو اپنائے گا، دائمی فوز و فلاح سے سرفراز ہوگا۔ قرآن حکیم نے انسانیت پر کیا کیا عظیم احسانات کئے ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس پر مسلم اور غیر مسلم مؤرخین بہت شہادتیں پیش کر چکے ہیں۔ اور آئندہ بھی پیش کرتے رہیں گے۔ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جسے اسلام نے اپنی تابانیوں سے منور نہ کیا ہو۔

قرآنی نظام زندگی کو ناقص قرار دینے کی یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ اس وقت کہیں بھی نافذ العمل نہیں ہے یا یہ کہ صرف بیس پچیس برس تک نافذ العمل رہا اور پھر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے برعکس اس دلیل سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیس پچیس برس کے قلیل ترین عرصے کے نفاذ نے بھی وہ عظیم الشان نتائج پیدا کر کے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دکھا دیئے جو دوسرے نظام صدیوں سے نافذ رہنے کے باوجود پیدا نہیں کر سکے۔ ہدایت قرآنی پر عمل کرنا یا نہ کرنا انسان کے اپنے اختیار و ارادے کے ہاتھ میں ہے۔ اختیار اور ارادے کا غلط استعمال غلط نتائج ہی پیدا کرے گا۔ انسان کے اختیار اور ارادے کی صلاحیت کو سلب کر لینا اور اپنی کتاب کو جبراً نافذ کرنا اللہ کو کسی صورت میں بھی منظور نہیں ہے۔ قرآنی صداقتیں اپنے آپ کو منوا کر رہیں گی۔ وقت ان کے تابع ہے۔ یہ وقت کے تابع نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے ماننے والوں سے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ اگر تم میری کتاب پر عمل کرنا چھوڑ دو گے تو میں کوئی اور قوم پیدا کر دوں گا جو میرے احکام کی کماحقہٗ پیروی کرے گی اور تعمیر و ارتقائے انسانیت کا فریضہ اسے سونپ دیا جائے گا۔

یہ کہنا کہ قرآن حکیم چودہ سو سال کی عمر کو پہنچنے کی وجہ سے اب "بوڑھا" ہو چکا ہے اور نئی نویلی جوان سال "زندگی" کا ساتھ نہیں دے سکتا" اس لئے بھی غلط ہے کہ جس چیز کو ہمیشہ زندہ و پائندہ رہنا ہو وہ شب و روز اور ماہ و سال کے پیمانوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو خیر کلام اللہ ہے بعض مادی اشیاء بھی ایسی ہیں جن کی جدیدیت اور قدامت کا فیصلہ گردش لیل و نہار کا پیمانہ نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اس ستارے کو آپ جدید کہیں گے یا قدیم جس کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن ابھی یہاں تک نہیں پہنچی یہ روشنی زمین کی پیدائش یعنی گردش لیل و نہار کے پیمانے کے وجود میں آنے سے پہلے نجانے کب روانہ ہوئی تھی۔ مذکورہ رفتار سے سفر طے کر رہی ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ زمین پر کب پہنچے گی۔ البتہ یہ طے ہے کہ جس دن اس کی پہلی کرن کا طلوع زمین پر ہو چکا اسی دن سے اس ستارے کی عمر آپ کے ماہ و سال کے پیمانوں کے حساب سے شمار ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں آپ کا "مبلغ علم" زمین سے بھی زیادہ قدیم چیز کو جدید ترین کہے گا۔ یاد رہے کہ اجرام فلکی پھر بھی مادی اجسام ہیں جو زمان و مکان کے محتاج ہیں۔ ان سے ماوراء وہ حقیقت کبریٰ ہے جو ابد اور ازل کی بھی خالق ہے۔ اور جس کے حضور پیش ہو کر خود زمانہ طلب گار دوام ہوتا ہے!

قرآن حکیم اسی حقیقت کبریٰ کا کلام ہے۔ یہ زمانے کا محتاج نہیں زمانہ اس کا محتاج ہے۔ اور اسی وجہ سے ہر زمانے کے لئے ہادی اور رہنما ہے، رہنما ہمیشہ آگے چلتا ہے۔ پیروکار اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ لہٰذا ہر دور، ہر زمانہ اور ہر عہد اس رہنمائے برحق کے پیچھے چلنے پر مجبور ہے۔ خواہ یہ کتنا ہی تیز رفتار کیوں نہ ہو۔ دائمی و قائم صداقتیں نہ سال خوردہ ہو سکتی ہیں اور نہ ان پر فرسودگی، کہنگی یا قدامت یعنی انحطاط پذیری کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ ہمیشہ جدید ہی رہیں گی۔ کوئی قوم ان

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پر عمل کرے یا نہ کرے یہ اس قوم کے اختیار وارادے میں ہے۔ انہیں چھوڑ دے یا ان سے روگردانی کرے تو وہ خود ہی ذمہ دار ہوگی اُن نتائج کی جو ان کے ترک کر دینے سے لازماً برآمد ہوتے ہیں۔ جو قوم ان ابدی صداقتوں کو پھر سے اپنائے تو وہ یقیناً ان کامیابیوں سے سرفراز ہوگی، جو ان سے تمسک رکھنے کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ دونوں قسم کے نتائج ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی مشہود صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہر غیر قرآنی آئینِ حیات ارتقا کے خانی ہوتا کیونکہ یہ وقت کا سامنا نہیں کر سکتا۔ لیکن قرآن حکیم کی مستقل قدریں انتہائی متوازن و متناسب ہیں۔ عالمگیر صداقتوں پر مبنی ہیں پوری انسانیت کے لئے عدل و مساوات، اخوت و حریت اور احترامِ آدمیت کا پیغام ہی نہیں عملی نظام بھی رکھتی ہیں اس لئے دائمی ہیں۔ حیّ و قائم ہیں اور ہر دم جواں ہیں۔

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن چودہ سو سال پرانی کتاب ہے، آجکل کے تمدّن اور معاشرت کے لحاظ سے اس کے اصول و قوانین و ضوابط از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ موجودہ زمانے میں "جدید ترقی یافتہ" اصولوں کی ضرورت ہے جو زمانے کے ارتقا کا ساتھ دے سکیں وہ نہ تو قرآنی تعلیمات پر عبور رکھتے ہیں اور نہ "قانونِ ارتقا" کو سمجھتے ہیں۔ ارتقائی فطرت اور اس کے قوانین کا بغور مطالعہ کرنے سے ایک بات جو واضح طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ ارتقا کے قوانین اس صورت میں تبدیل ہوتے ہیں جب ارتقائی عمل کو کوئی نیا مرحلہ پیش آئے، ارتقا کا عمل اُس وقت تک کوئی نیا قانون وجود میں نہیں لاتا جب تک وہ اپنا ایک مرحلہ پورا نہیں کر لیتا۔

جب کائنات بالکل بے جان تھی تو اس وقت اس میں محض مادّی فطرت کے قوانین ہی جاری تھے۔ مثلاً قانون جذب و دفع (LAW OF ATTRACTION AND REPULSION) وغیرہ۔ اس قانون کا مطلب ہے کہ مادّی اجسام میں جو تغیرات آتے ہیں وہ کسی نہ کسی خارجی قوت کے تحت ہوتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی چیز ایک جگہ پڑی ہے تو وہیں پڑی رہے گی، جب تک خارج سے اُسے حرکت نہ ملے۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے اور طبعی و کیمیاوی قوانین ہزاروں اور لاکھوں برس تک جاری رہے۔ یعنی ان کی حکمرانی اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ کائنات میں نباتی زندگی کے نئے مرحلے کا ظہور نہیں ہوا۔ لاکھوں سال کے اس طویل عرصے کے دوران کوئی اور قانون طبعی اور کیمیادی قوانین کے علاوہ وجود میں نہیں آیا۔ کیونکہ فطرت کو کوئی نیا مرحلہ درپیش نہیں تھا۔ تاہم جونہی نباتی زندگی وجود میں آئی عمل ارتقا نے نئے قوانین بھی پیدا کر دیئے جو عضوی زندگی (ORGANIC LIFE) کو کنٹرول کرتے تھے۔ اور عضوی زندگی کی نشو و نما میں مدد دیتے تھے۔ عضوی زندگی رکھنے والے اجسام میں داخلیت (INTERNALITY) پائی جاتی ہے۔ شاخ کو تراش دیں تو تراشیدہ شاخ پھر سے بڑھ آتی ہے۔ یہ عمل غیر ذی حیات اشیاء میں نہیں ہوتا۔ ان نئے قوانین سے پہلے والے قوانین ختم نہیں ہوئے بلکہ ان کی حیثیت حکمرانہ کی بجائے ذیلی اور ماتحتانہ ہو گئی۔ نباتی قوانین ہزاروں لاکھوں سال تک حکمرانی کرتے رہے تا آنکہ زندگی نے ایک اور کروٹ لی اور فطرت کے سامنے حیوانی زندگی کا نیا مرحلہ آ گیا۔ اس سارے عرصے کے دوران حسبِ سابق کوئی نیا قانون نہیں آیا کیونکہ جو قوانین موجود تھے وہ نباتی زندگی کے لئے کافی تھے اور اس سطح کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ اب زندگی ایک قدم اور آگے بڑھی۔ اور حیوانی زندگی ظہور میں آ گئی۔ اس نئے مرحلے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے وجود میں آتے ہی مادی اور نباتی قوانین کے علاوہ نئے قوانین سامنے آ گئے اور طبعی، کیمیاوی و نباتی قوانین کی حیثیت ضمنی و ماتحتانہ ہو گئی جس طرح نباتی قوانین کی حکمرانی کے دوران طبعی اور کیمیاوی قوانین ذیلی اور ماتحتانہ ہو گئے تھے۔ پھر جب تک حیوانی زندگی کے ارتقا کی منزل ختم نہیں ہوئی کوئی نیا قانون وجود میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ زندگی انسانی سطح تک پہنچ گئی۔ انسان کے ظہور کے ساتھ ہی نئے قوانین کا اضافہ ہوا۔ ان کے قوانین کے آنے سے طبعی، کیمیاوی اور حیوانی قوانین معطل نہیں ہوئے بلکہ پہلے کی طرح ان سب کی حیثیت ضمنی، ذیلی اور ماتحتانہ ہو گئی کیونکہ عمل ارتقا کا یہی قانون ہے، زندگی کے ارتقائی تاریخ میں انسان کا ظہور ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ انسانی سطح پر جو قوانین ظاہر ہوئے اُن میں اور مادی، نباتی اور حیوانی سطح کے سابقہ قوانین میں بہت بڑا فرق ہے تمام سابقہ سطحوں پر کائنات کی بے جان مادی چیزیں اور ذی حیات اجسام کے اندر متعلقہ قوانین از خود کارفرما رہتے تھے، اور مذکورہ اشیاء ان قوانین کی پیروی پر مجبور و پابند تھیں لیکن انسان کو اس قسم کی فطری مجبوری سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ اب جدید انسانی سطح کے قوانین کا علم انسان کو اس طریقے سے عطا ہونے لگا جسے ہم علم بالوحی کے عنوان کے تحت بالوضاحت بیان کر چکے ہیں۔ ان قوانین ارتقا کے جدید ترین Latest اور آخری The Last مجموعے کا نام قرآن حکیم ہے۔ قانون ارتقا کو آپ نے سمجھ لیا ہے کہ جب تک کوئی ایک مرحلہ پورا نہیں ہو جاتا قانون ارتقا کوئی نیا قانون وجود میں نہیں لاتا جب تک انسانی سطح کی زندگی برقرار رہے گی اور کائنات کے سامنے ارتقا کا کوئی نیا مرحلہ نہ آئے گا یہ قوانین جاری و ساری رہیں گے۔ جب تک انسانیت کا ارتقائی دور پورا نہیں ہو جاتا جس کے لئے حسب سابق لاکھوں سال بھی شاید تھوڑے ہوں اس وقت تک ان قوانین میں کوئی رد و بدل، کوئی ترمیم یا کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہ عمل ارتقا کا بنیادی قانون ہے ہر مرحلے کے قوانین چودہ پندرہ صدیاں کیا لاکھوں سال تک جاری رہتے ہیں۔

---

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۱۔ میرے سجدہ ہائے جبینِ شوق

پرویز نامی ایک نوے سالہ نومسلم بزرگ نے اپنی سوتیلی ماں کے مظالم کی طویل داستان سنائی اور کہا کہ میرے ہندو باپ نے بھی مجھے شفقتِ پدری سے محروم کر کے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ پچیس تیس سال تک آلام و مصائب سہتے سہتے ہمت ٹوٹ گئی تو ایک دن شہر کے مشہور پنڈت جی کے پاس چلا گیا اور گزارش کی کہ مہاراج! اپنے وید، دھرم شاستر اور پستکیں کھنگال کر مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ بدبخت انسانوں کے "ماتھے کے لیکھ" کسی طور مٹ بھی سکتے ہیں یا نہیں! پنڈت جی میرے سوال پر حیران رہ گئے۔ کہا: ایک ہفتے کے بعد آنا۔ ہفتے کے بعد پہنچا۔ پنڈت جی آسن جمائے مستغرق تھے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں مجھے دیکھا۔ کہا: تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے: "ماتھے کے لیکھ" "مٹ جاتے ہیں" ماتھے کو اس "ایک" کے حضور سجدے میں گرا دینے سے"۔ پرویز نے آبدیدہ ہو کر کہا: پنڈت جی اگر آپ کی پستکوں کا یہی حکم ہے تو پھر اس خاکسار کی جبینِ شوق اس ایک سجدے" میں اس نیازمندی سے گرے گی کہ سجدے سے سر اٹھانے کو اب توہینِ انسان سمجھوں گا"۔

ہزاروں سجدوں سے نجات دینے والا ایک سجدہ حضوری کہ لب لرزاں پر بصد شیرینی پھیلتی ہوئی دعائے نیم شبی، سوز و گداز آرزومندی اور لذتِ آہ و سحر گاہی کو دانشِ برہانی اپنے حیطۂ ادراک میں نہیں لا سکتی۔ جہاں علم اور عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں سے آگے دانشِ نورانی کی اقلیم شروع ہوتی ہے جس کا راہ نما "جذبۂ عشق" ہے۔ انسانی فکر اپنے عروج تک پہنچ جانے کے بعد اگر عمل کی طرف قدم نہ بڑھائے اور وہیں رک جائے جہاں یہ پہنچا ہے تو "حیرت کی فراوانی" کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تاہم اگر فکرِ صحیح کو عمل میں ڈھل جانے کے لئے ایک پختہ اور بے عیب نظام بھی مل جائے تو اس کے اندر ایک ایسی زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کے آگے ارض و سماوات اور ان کے نظم و نسق کی چلانے والی تمام مخفی قوتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں اور عالمگیر پیمانے پر انسانی فلاح کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس زبردست قوت کو "جو فکر و عمل کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے" قوتِ ایمان و یقین کہتے ہیں۔ عشق بھی اسی چیز کا شاعرانہ نام ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے کہیں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مذہب کو جس نظریاتی، فکری، علمی اور عملی رنگ میں اسلام نے ارتقا دے کر اپنے عالمگیر سطح پر پوری انسانیت کے لئے ضابطۂ زندگی بنا کر پیش کیا ہے اور اسے "مذہب" کی سطح سے بلند کر کے "الدین" کی شکل دے دی ہے اس رنگ میں اسے دیکھنے کے لئے سائنس، فلسفہ اور علوم نفسیات آج بھی بیقرار ہیں، ان علوم نے "مذہب" کو آفاقی قدروں کے آئینے میں آج تک دیکھا ہی نہیں، "مذہب" عربی زبان کا لفظ ہے لیکن قرآن نے اسے استعمال نہیں کیا اس کی بجائے اس نے "الدین"

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو وسیع المعانی اور جامع مفاہیم ہونے کے اعتبار سے اور جس مکمل نظام کو وہ پیش کرتا ہے اس اعتبار سے "مذہب" کی آخری اور انتہائی ترقی یافتہ صورت ہے، ارتقا کے اس عمل کو سمجھنے کے لئے ہم "مذہب" اور "الدین" میں فرق و امتیاز کا جائزہ اس طرح لیں گے کہ

۱۔ "مذہب" فرد کی ذاتی اور داخلی تجربے یعنی (SUBJECTIVE EXPERIENCE) تک محدود رہ جاتا ہے اور یہ "خدا اور انسان" کے درمیان شخصی رابطے کا نام ہے۔ جبکہ "الدین" اس مقام سے آگے بڑھ کر معروضی (OBJECTIVE) صورت اختیار کر لیتا ہے، اور اجتماعی زندگی کا ایک وسیع تر نظام بن جاتا ہے جس میں فرد اور جماعت دونوں کی آرزوؤں کو تکمیل ملتی ہے۔

۲۔ "مذہب" کے ہر پیروکار کو اپنے طور پر یہی تسکین کافی ہوتی ہے کہ اس نے خدا کے ساتھ ربط قائم کر لیا ہے، لہٰذا ہر "فرد" کے سامنے اپنی ذاتی نجات کا مقصد ہوتا ہے، جبکہ "الدین" کے پیروکاروں کے سامنے پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا مقصد رہتا ہے۔ الدین میں معاشرے کی تشکیل جن خطوط پر ہوتی ہے ان سے اور معاشرے کے مخصوص کردار و عمل سے یہ پتہ چلتا رہتا ہے کہ قوانینِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے یا نہیں۔

۳۔ "مذہب" ہمیں کوئی معروضی معیارات فراہم نہیں کرتا جن کے ذریعے ہم یہ معلوم کر سکیں کہ ہمارے اعمال سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں یا نہیں۔ الدین کے تحت جو معاشرتی نظام قائم ہوتا ہے اس میں اجتماعی متوازن اور متناسب زندگی ہمیں ٹھیک ٹھیک بتا دیتی ہے کہ افرادِ معاشرہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں یا نہیں۔

۴۔ "مذہب" عقلیت کو پسند نہیں کرتا اس لئے علمی تحقیق و جستجو کے مخالف ہوتا ہے اور اسلاف پرستی اور تقلید کو ترجیح دیتا ہے تاکہ یہ بغیر کسی رکاوٹ کے پھلتا پھولتا رہے اور اسے اندھی عقیدت کی مدد حاصل رہے، جبکہ الدین میں فکر و تدبر کو اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ الدین علم اور عقل کے ارتقا میں معاون رہتا ہے اور دلائل و براہین کی بنیاد پر حقائق کو تسلیم کرنے یا انہیں مسترد کر دینے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ بلکہ مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کرنے اور قوانینِ فطرت کی دریافت و تحقیق کو حکماً ابھارتا ہے تاکہ تسخیرِ کائنات سے حاصل شدہ توانائیوں کو مستقل اقدار کے تابع رکھ کر پوری انسانی زندگی کی راہوں کو جگمگایا جا سکے۔

۵۔ "مذہب" لوگوں کی جذباتیت اور عصبیتوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور جذباتی طغیان کو عزیز رکھتا ہے، جبکہ الدین بردباری سے کام لے کر لوگوں کو زندگی کی ایسی ٹھوس راہوں پر چلاتا ہے جو واقعیت سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

۶۔ "مذہب" کی عصبیت پروری کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسے لوگوں کی توجہ کو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے ہٹانے کے لئے ہر زمانے میں نئے نئے "معبود" تراشنے پڑتے ہیں، اس کے برعکس الدین قدیم اور جدید سب بتوں کو توڑ دیتا ہے اور اپنے محکم اصولوں میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔

۷۔ "مذہب" لوگوں کے دلوں میں ایک مستقل خوف کا احساس پیدا کئے رکھتا ہے۔ اور اس خوف کی بنیاد پر لوگوں سے بُت پرستی کی تائید حاصل کرتا ہے۔ الدین کے نزدیک "خوف" شرک ہی کی ایک قسم ہے اس لئے یہ لوگوں کو باحوصلہ جرأت مند

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور خود اعتماد بنانے کی سعی کرتا ہے۔

۸۔۔۔ "مذہب" لوگوں کو ہر قسم کے اقتدار کے سامنے جھک جانے کا درس دیتا ہے خواہ یہ اقتدار کسی مذہبی وڈیرے کا ہو یا دنیاوی سردار یا حاکم ہو۔ الدین جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا درس دیتا ہے، عزت نفس سکھاتا ہے۔ اور خود اعتماد بنا کر سر اونچا رکھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

۹۔۔۔ "مذہب" زندگی کی کشمکش سے فرار اور کنارہ کشی کی راہیں دکھاتا ہے۔ اگر خواہی سلامت بر کنار است لیکن الدین کا مطمح نظر ہی یہ کہ بدریا غلط و با موجش بآویز۔ حیات جاودانی در ستیز است۔ جینے کی حقیقتوں سے صرف نظر نہ کرو۔ بلکہ مشکلات کے سامنے پہاڑ بن کر ڈٹ جاؤ

۱۰۔۔۔ "مذہب" مادی دنیا کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور انسانوں کو ترک علائق کا حکم دیتا ہے جب کہ الدین اس دنیا کی حسنات اور آخرت کی دنیا کی حسنات دونوں کے حصول کے لئے جدّ و جہد کرنے کا حکم دیتا ہے۔

۱۱۔۔۔ "مذہب" تقدیر پرستی کو ہوا دے کر انسان کی قوتِ عمل کو مضمحل بنا دیتا ہے اس طرح زندگی کے معاملات سے گریز کر جانے سے "جوہر انسانیت" کی نشو و نما رک جاتی ہے، الدین انسان کے عزم کو قوت لازوال عطا کر دیتا ہے اور وہ جوئے کوہسار کی طرح راستے میں حائل ہر چٹان سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے

۱۲۔۔۔ "مذہب" "مشیت ربی"، رضائے الٰہی، تقدیر اور توکل کے معانی کو غلط رنگ دے کر کمزوروں اور بیکسوں کو مظلوموں اور پس افتادہ افراد اور اقوام کو ظلم و استبداد سہتے رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ صبر اور شکر کو منفی معنی دے کر استحصالی قوتوں کا شکار ہونے والوں کو جمود، تعطل اور بے عملی کا درس دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مجاہد کفار کے خلاف مسلح جہاد کرنے کی دعوت دے تو مذہب کے ٹھیکیدار پشت پر اپنی قلم سے لکھ دیتا ہے کہ فقیر اس وقت تسبیح گردانی اور اوراد و وظائف (یعنی گدی سازی) کے جس جہاد میں مصروف ہے وہی اس وقت کے لئے بہتر ہے اس کے برعکس الدین نام ہی حریتِ فکر و عمل کا ہے، یہ عدل و مساوات کا داعی بن کر ہر قسم کے ظلم و استبداد، ہر قسم کی ناانصافی، ہر شکل کے استحصال کے خلاف ہر وقت علم جہاد بلند کرتے رہنے کا حکم دیتا ہے۔

۱۳۔۔۔ "مذہب" "پرستش" کے نام پر تسبیح گردانی یا ذکر کی حلقے بازی، مراقبوں پر زور دیتا ہے اور حال و وجد و سرور کی خود فریبیوں میں مبتلا رہ کر انسان کے قوائے عملیہ کو ماؤف کر دیتا ہے، جبکہ الدین میں حکومت الٰہیہ کے قیام و استحکام کے لئے جہاد بالسیف کو مستقل رکن دین کی حیثیت دی جاتی ہے کیونکہ الدین میں پرستش نہیں عبادت ہے جس کے معنے ہیں اللہ کے احکام و قوانین کی مکمل اطاعت!

۱۴۔۔۔ "مذہب" حسن کے ہر شاہکار اور آرٹ کے ہر فن پارے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جبکہ الدین زندگی کی تمام خوشگواریوں کو اور ان چیزوں کو جنہیں خلاقِ اکبر اور خالق اصغر نے انسان کے فائدے کے لئے "نعمات" میں اضافے کے لئے اور قلب و نظر کی تحسین کے لئے تخلیق کیا ہے، حاصل کرنے کا درس دیتا ہے۔

۱۵۔۔۔ "مذہب" اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے "بدعت" ([illegible]) کو گناہ تصور کرتا ہے جبکہ الدین کا حکم

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یہی یہ ہے کہ فطرت کے حسن میں نئے سے نئے اضافے کرتے چلے جاؤ، بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھو، اور تغیرات کو قبول کر کے ارتقا کی طرف بڑھتے رہو۔ تاہم ان مستقل قدروں میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا جو عالمگیر معیارات کے طور پر ہدایت ربانی نے انسان کو عطا کئے ہیں۔ دوام و ثبات کے بیرونی دائرے کے اندر رہ کر ہر تبدیلی اور ہر جدت جائز اور درست ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔

ویسے مذہب کسی بھی مکتب فکر کو کہہ سکتے جبکہ دین راہِ حیات اور طریق زندگی ہے، جبکہ اَلدِّین اسلام کے علاوہ اور کسی مکتبِ فکر اور طریقِ زندگی کو نہیں کہا جا سکتا۔

اَلدِّین زندگی کو اس کے ہر نشیب و فراز سمیت، قبول کرتا ہے اور اس کی ہر دعوت پر "ہاں" کہتا ہے، مذہب "زندگی" کو مسترد کر کے اس کی ہر دعوت پر "نہیں" کر دیتا ہے۔ اسلام اَلدِّین ہے اس لئے یہ زندگی کو اس کی ٹھوس حقیقتوں سمیت لبیک کہتا ہے۔ گریز اور فرار کی راہیں نہیں نکالتا اور نہ ہی انسان پر عمل اور ارتقا کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ جتنے بھی انبیائے کرام فلاحِ انسانیت کے لئے ہدایت ربانی لیکر اس دنیا میں تشریف لائے ہیں، ان سب نے اسلام ہی کو پیش کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کی تعلیمات بھلا دی جاتی رہیں، ان کا لایا ہوا پیغام اپنی اصلی صورت میں نہ رہا۔ مفاد پرستوں نے اس میں ترامیم اضافے کرا دیئے۔ ملتیں انتشار اور پراگندہ خیالی کا شکار ہو گئیں۔ اور دین پھر مذہب کی صورت اختیار کر گیا۔ وہ طاغوتی قوتیں جن کے خلاف دین اجتماعی صف آرائی کا حکم دیتا ہے بار بار ابھر آتی رہیں۔ دین کو مذہب کی سطح تک رکھنے اور اسے آگے نہ بڑھنے دینے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ لیکن چونکہ قرآن پاک ہمارے پاس حرفاً حرفاً اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور ہر قسم کے ردّ و بدل سے ہمیشہ مامون و محفوظ رہے گا اس لئے اَلدِّین تمام مخالف قوتوں پر غالب آ کر رہے گا اور انسانیت تمام غلامیوں سے آزاد ہو کر عدل و مساوات اور حریت و اخوت کے عالمگیر نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی، کہا جاتا ہے کہ جب ہر مذہب ایک ہی قسم کی سچائیوں کا پرچار کرتا ہے پھر اَلدِّین یعنی اسلام کیوں اختیار کیا جائے، برہمو سماج کی تحریک اسلام کے خلاف اسی نظریے کو لے کر اٹھی تھی۔ بھارت کے راشٹرپتی ابوالکلام کا بھی یہی مسلک تھا۔ ان کی تفسیر ترجمان القرآن کے صفحہ نمبر ۲۵۲ پر لکھا ہے کہ "تمام مذاہب سچے ہیں۔ کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے اور سب کو دیا گیا ہے، لیکن تمام پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کر دی ہے اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنالی ہیں اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آ جائیں اور اپنے اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جائیں تو مذاہب کی تمام نزاعات ختم ہو جائیں گی۔ ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اس کی راہ بھی "اصلاً" وہی ہے جو اور تمام گروہوں کی راہ ہے۔ قرآن کہتا ہے، تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت اَلدِّین ہے یعنی نوعِ انسانی کے لئے حقیقی دین اور اسی کو وہ اَلاسلام کے نام سے پکارتا ہے۔"

قرآن حکیم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ رائج الوقت تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ تمام مذاہب اپنے اپنے وقت پر سچے تھے۔ لیکن انبیائے کرام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان مذاہب میں اس قدر ملاوٹیں ہو گئیں کہ کوئی ایک مذہب بھی سچائی پر نہ رہا۔

ابوالکلام آزاد صاحب نے جو شرط مذاہب کے نزاعات ختم کرنے کے لئے عائد کی ہے اسے ہم نے خط کشیدہ کر دیا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اسے دوبارہ پڑھیے۔ اور دُنیا کی آسمانی کتابوں والے باب کے مندرجات کو ملحوظ رکھ کر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ جب سوائے دعویانِ اسلام کے اور کسی کے پاس الہامی کتاب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہے، بلکہ چودہ سو سال پہلے نزولِ قرآن حکیم کے وقت بھی موجود نہیں تھی تو "لوگ اپنے اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیم پر" کیسے کاربند ہو سکتے ہیں؟ آزاد صاحب کو کہنا یہ چاہیے تھا۔ کہ اب صرف قرآن حکیم ہی وہ واحد کتاب ہے جو (۱) تمام سابقہ مذاہب کی تعلیمات کی جامع ہے، (۲) جس نے ان سابقہ تعلیمات کو اور زیادہ نکھار کر اور ترقی دیکر محفوظ کر لیا ہے اور (۳) جس کا ایک ایک حرف اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور آئندہ بھی رہے گا اس لیے اپنے اپنے حادث شدہ مذاہب کو چھوڑ کر خالص الدین کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ صرف اسی طرح "مذاہب کی تمام نزاعات ختم ہو جائیں گی۔ ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اس کی راہ بھی اصلاً وہی تھی" جو اور تمام گروہوں کی راہ تھی" اور جو راہ قرآن حکیم کی راہ ہے۔ اور قرآن حکیم کے علاوہ اور کسی کی راہ نہیں۔

آج بھی کبھی کبھی یہی نقطہ نظر سیاسی نعرے کی شکل میں سننے میں آتا ہے کہ "ایک خدا کے ماننے والو متحد ہو جاؤ" یہ نعرے بظاہر خوشنما اور دلکش ہیں لیکن ان کے پیچھے جو گہری سازش کام کر رہی ہوتی ہے اس پر لوگوں کی تو کیا ہمارے علماء کی نگاہ بھی نہیں پڑتی۔ اسلام کے عقیدۂ توحید میں اور دوسرے مذاہب کے عقیدۂ توحید میں بڑا فرق ہے اسلام کا خدائے واحد لاشریک زندہ و فعال صاحبِ اقتدارِ کل ہستی ہے جس کی زندگی کے ہر قدم پر اطاعت کی جاتی ہے جبکہ دوسرے مذاہب کا خدا کاروبارِ حیات انسانی میں دخیل نہیں ہوتا۔ بلکہ پوجا پاٹ سے خوش ہو جاتا ہے، اسی طرح کے اور بہت سے اہم نکات ہیں جو اللہ کے قرآنی تصور کو دوسرے مذاہب کے تصورِ الوہیت سے متمیز کرتے ہیں پس یہاں بھی صورت وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ مختلف مذاہب کے اتحاد کی اور ان کے درمیان اختلافات کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ قرآن حکیم کو مکمل ضابطۂ زندگی تسلیم کرکے اسی کی آواز پر لبیک کہا جائے۔ اب آئیے اس سوال کی طرف کہ جب ہر مذہب ایک ہی قسم کی تعلیمات پیش کرتا ہے تو پھر اسلام ہی کیوں اختیار کیا جائے کوئی اور مذہب کیوں نہ اختیار کر لیا جائے، کیونکہ بقول ابوالکلام آزاد مذاہب تو سب کے سب سچے ہیں، اس سوال کا جواب "مذہب اور الدین" کے درمیان جو فرق ہم نے سطورِ بالا میں پیش کیے ہیں، ان پر غور کرنے سے خود بخود آپ کے ذہن میں آجائے گا۔ مزید برآں تمام مذاہب کی یکساں بات کرنے والوں کے سامنے مذہب کا صرف وہ حصہ رہتا ہے جسے اخلاقیات کہتے ہیں۔ ان کے سامنے اسلام کی پیش کردہ مستقل قدریں نہیں جنہیں "الدین" نے اپنے عملی نظام کا جزو لاینفک بنا لیا ہے اور اس نظام کے چلانے میں ادنیٰ سی غفلت کو بھی ناقابلِ معافی گناہ قرار دے دیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہر مذہب یہی تلقین کرتا ہے کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو، قتل و غارت نہ کرو، بد دیانتی نہ کرو، دوسروں کا حق نہ مارو۔ ظلم نہ کرو وغیرہ۔ اور ایجابی صفات پیدا کرنے کے لئے کہتا ہے کہ آپس میں پیار محبت سے رہو، انسانیت کا احترام کرو۔ عدل کرو، مساوات اور اخوت کو قائم رکھو۔ لباس، جسم اور دل کی صفائی کا خیال رکھو، اپنے جذبات کو قابو میں رکھو باہمی روابط کو مودت کی بنیادوں پر آگے بڑھاؤ وغیرہ، لیکن ذرا سوچئے، کہ بتائیے کہ یہ تمام مذاہب ان صفاتِ عالیہ کو صرف وعظ و تلقین تک ہی محدود رکھتے ہیں یا ان کو عمل میں لانے کے لئے ان کے پاس کوئی نظام بھی ہے؟ اخوت، مساوات اور آزادی کے دعوے تو مغربی جمہوریت نے بھی بڑھ چڑھ کر کر رکھے ہیں لیکن کیا عملی زندگی میں سفید فام اور سیاہ فام یا سرمایہ دار اور مزدور کے

jabir.abbas@yahoo.com
Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

البتہ ان تین صفات کی کوئی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے؛ سابقہ تمام مذاہب اکثر و بیشتر وعظ و نصیحت تک ہی محدود رہے ہیں۔ کہیں کوئی نظام تھا بھی تو وہ ایک آدھ "قدر" کو مشہود کرنے کے لئے تھا۔ جامع اور مکمل نظام نہ تھا۔ اسلام نے مستقل اقدار کو تحفظ دینے کے فریضے کو عملی نظام میں اس طرح سمو دیا ہے کہ معاشرے کے اندر اچھائیاں از خود راسخ ہو جاتی ہیں۔ الدین کی عملی تشکیل کے لئے قرآن حکیم نے ہمیں "اقامت الصلوٰۃ" کی ایک جامع اصطلاح دی ہے جس میں اسلام کے باقی ارکان زکوٰۃ، حج، جہاد، روزہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی آجاتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں نظام الصلوٰۃ کیا ہے!

کسی گھڑ دوڑ میں جب دوسرے نمبر کا گھوڑا پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کی کنوتیاں پہلے کی سرین کے ساتھ چھوتی رہیں تو پہلے گھوڑے کو سابق، اور اس دوسرے گھوڑے کو المصلّی کہتے ہیں۔ یہیں سے صلوٰۃ کا لفظ نکلا ہے۔ یعنی جو آگے چل رہا ہے اس کے ساتھ ملے ہوئے قدم بہ قدم پیچھے آنا۔ اہل لغت نے اس لفظ کی وضاحت میں جو معنے لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔ کسی کے ساتھ لگے رہنا، چمٹے رہنا۔ احکام الٰہی کی لفظ بہ لفظ پیروی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا۔ کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ تسبیح کے معنے پہلے ہمارے سامنے آچکے ہیں یعنی تیزی کے ساتھ سعی و عمل کرنا، گھوڑے کا اس طرح تیز دوڑنا کہ اس کی ٹانگیں زمین کی بجائے ہوا کو پھلانگتی دکھائی دیں۔ تیرنا۔ تعمیل احکام میں انتہائی سرگرمی دکھانا۔ فطرت کی ہر ذی روح مخلوق اپنی صلوٰۃ و تسبیح کو از خود جانتی اور پہچانتی ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی طرح کا اختیار و ارادہ نہیں رکھتی۔ انسان چونکہ صاحب اختیار و ارادہ ہے اس لئے اسے اس کی صلوٰۃ و تسبیح بصورت جبلت نہیں بتائی گئی بلکہ بذریعہ وحی اس کا علم دیا گیا ہے یا اپنی طبعی ضروریات کا علم تو عقل و فکر اور تجربے سے حاصل کر سکتا ہے لیکن جوہر انسانیت اور اس کو تحفظ و نشو و ارتقاء دینے کا علم اسے صرف وحی ربانی کے ذریعے مل سکتا ہے لہٰذا انسان کو اپنی صلوٰۃ و تسبیح جاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ وحی ربانی سے چمٹا رہے، اس کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرے۔ اور اسی کی متابعت میں سرگرم عمل رہے۔ اسے قرآن حکیم نے اقامت صلوٰۃ (۲۰۳) کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

وحی ربانی کے دیئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا یعنی "اقامت الصلوٰۃ" فرداً فرداً ممکن نہیں ہے، یہ صرف اجتماعی نظام سے منسلک ہو کر ہی ہو سکتا ہے۔ مذہب ذاتی اور نجی تعلق تھا بندے کا اپنے رب کے ساتھ۔ الدین میں یہی تعلق نظام سے وابستہ رہنے سے قائم کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی اقامت الصلوٰۃ کا ذکر آیا ہے وہاں جمع کے صیغے آئے ہیں یہاں تک کہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ

> "مومنین وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہو جائے گا (یعنی ان کے قدم جم جائیں گے) تو یہ صلوٰۃ قائم کریں گے، ایتائے زکوٰۃ کو منظم کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے" (۲۲:۴۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ وہ اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پاتے ہیں (۴۲:۳۸)

ایک اور مقام پر اقامت الصلوٰۃ کو تمسک بالکتاب کے ساتھ ملایا گیا ہے (۷:۱۷۰) لہٰذا اقامت الصلوٰۃ کا مطلب ہوا ایسا نظام قائم کرنا جس میں معاشرے کا ہر فرد وحی ربانی کے احکام و قوانین کی مکمل متابعت کرتا چلا جائے اور اس طرح کتاب اللہ سے چمٹا رہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حضرت شعیب علیہ السلام سے ان کی قوم نے کہا: کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آتے ہیں ہم اسے چھوڑ دیں؟ اور کیا اپنے مال و دولت کو بھی ہم اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں؟" (۸۷:۱۱) یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ یہ کیسی صلوٰۃ ہے جو معاشیات تک کو اپنے دائرے میں لے آتی ہے! الصلوٰۃ کا دائرہ فی الحقیقت بہت وسیع ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو الصلوٰۃ کی احاطت سے خارج ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائیگا کہ زندگی کے ہر شعبے میں قوانینِ ہدایتِ ربانی کی متابعت کرنے کا نام اقامت الصلوٰۃ ہے۔ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی خواہشات اور جذبات کے تحت کرنا چاہتا ہے یا وحیٔ ربانی کے مطابق؟ اگر وہ اپنی خواہشات کی پیروی کریگا اور اپنے جذبات کے پیچھے پیچھے چلتا رہے گا تو اس کی حیوانی سطح کی زندگی تو شاید اچھی بسر ہو جائے گی لیکن انسانی سطح کی زندگی، جو حیوانی سطح کی زندگی سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے، بالکل مرجھا جائے گی۔ اور اس قابل نہ ہو سکے گی کہ زندگی کے اعلیٰ تر ارتقائی مرحلے کی طرف بڑھ سکے۔ تاہم اگر انسان اپنے تمام معاملات تو وحیٔ ربانی کے تحت رکھتا ہے تو اسے اس دنیا کے حسنات بھی مل جاتے ہیں اور آخرت کے حسنات بھی حاصل ہو جاتے ہیں یعنی اس کے جوہرِ انسانیت کو اتنی تاب و توانائی حاصل ہو جائے گی کہ وہ اقطار السموات کو بھی عبور کر کے زندگی کی آئندہ بلند تر سطوح پر چلنے کے قابل بھی ہو سکے گا۔ وحیٔ ربانی کی اطاعت کا راستہ ہی سیدھا اور صحیح راستہ ہے۔ اس سیدھے اور صحیح راستے پر چلنا اقامت الصلوٰۃ ہے۔

سورۂ مریم میں اقامتِ الصلوٰۃ اور "پیروی جذبات" کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر اس مضمون کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے فرمایا ہے کہ انبیائے کرام کے بعد "ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور وہ اپنی خواہشات و جذبات (شہوات) کے پیچھے چل پڑے"۔ (۱۹:۵۹) اس سے ثابت ہوا کہ خواہشات اور جذبات کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کا ضائع کر دینا ہے، اور وحیٔ ربانی کے پیچھے چلنا صلوٰۃ کو قائم کرنا ہے۔ سورۂ انعام میں آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو محافظین صلوٰۃ کہا گیا ہے (۶:۹۳) ابن قتیبہ کے قول کے مطابق اقامت صلوٰۃ دراصل اقامت دین ہے۔

الدین کے بارے میں آپ جان چکے ہیں کہ یہ مذہب کی سطح کی ذاتی "نجی" یا انفرادی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اجتماعی طریقِ زندگی کا ایک بے عیب اور مکمل نظام ہے جس میں فرد اور ملت ایک ہو جاتے ہیں۔

دین کے لفظ کے بہت سے معنے ہیں۔ مثلاً غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم و نسق، فیصلہ، محسوس نتیجہ، جزا و سزا، بدلہ وغیرہ کے علاوہ اطاعت اور فرمانبرداری، روش، طریقہ، ملت، تدبیر اور عادت بھی ہیں، قرآن حکیم نے اس لفظ کو ان تمام معنوں میں استعمال کیا ہے۔ تاہم زندگی کی اس خاص روش کے معنوں میں جس پر قرآن حکیم انسان کو چلانا چاہتا ہے یہ لفظ سورۂ بقرہ میں آیا ہے جہاں ربّ العالمین کے احکام و قوانین کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کو الدین کہا گیا ہے (۲:۱۳۱-۱۳۲) اسی کو (۳:۱۸) میں الاسلام کا نام دیا گیا ہے جس کے معنے ہیں تسلیم و رضا، اطاعت، سلامتی امن و امان وغیرہ، حقیقت یہ ہے کہ الدین ایک ایسا جامع لفظ ہے جو آجکل کے تمام مروجہ اصطلاحات مثلاً ضابطۂ زندگی نظام معاشرت، قانون حکومت، آئینِ مملکت، سماجی عدل وغیرہ پر محیط ہے۔ الدین ہی ہمارا نظام زندگی ہے، الدین ہی قانون حکومت ہے، الدین ہی آئین مملکت ہے اور الدین ہی ہر قسم کے عدل و انصاف کا طریقہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کہ الدین کی رُو سے انسانوں کی آزادی اور پابندی کی حدیں مقرر کرنے کا مکمل اختیار انسانوں کی بجائے اللہ کو حاصل رہتا ہے۔ اور اللہ کا یہ اختیار و اقتدار اس کی وحی آخریں یعنی کتاب اللہ کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ گویا اسلامی مملکت میں اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) قرآن حکیم کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ حکومت یا مملکت، ذریعے یا واسطے یا ایجنسی کا کردار ادا کر کے قرآنی احکام و قوانین کو نافذ کرتی ہے اور اس طرح ایک مکمل بے عیب اور بے نقص نظام قائم ہو جاتا ہے ان تمام مستقل قدروں کے مشہود کرنے کا جنہیں باقی مذاہب نے صرف وعظ و تلقین یا جزوی طریق زندگی تک محدود رکھا ہے اور کسی پختہ معاشرتی نظام کے سانچے میں نہیں ڈھالا۔ یہی چیز یعنی مذہب کا ارتقائی صورت اختیار کر کے الدین بن جانا ہی اسلام کی تمام دوسرے مذاہب پر وجہ فوقیت ہے اور اسی کی بنا پر اسلام کے سوا کوئی اور مذہب قابل قبول نہیں ہے چونکہ انسانی اعمال کے غلط اور صحیح ہونے کا معیار بھی قرآن حکیم ہی ہے اس لئے جزا و سزا بھی اسی کی رُو سے متعین ہوتے ہیں کیونکہ مالک یوم الدین بھی اللہ ہی ہے۔ گویا اس مقام پر نظام معاشرت اور نظام مملکت باہم ایک ہو کر نظام عدل بھی بن جاتا ہے اور یہ ایک اور وجہ امتیاز ہے اسلام کی دوسرے مذاہب پر۔ واضح رہے کہ نظام عدل کو الدین صرف عدالتوں تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے زندگی کے ہر شعبے تک پھیلا دیتا ہے۔ الدین کا مقصود ہی توازن و تناسب کو برقرار رکھنا ہے اس لئے معاشرتی کاروبار، حکومتی فرائض، جزا اور سزا کے فیصلے سب کے سب مستقل قدروں کی حدود کے اندر سر انجام پاتے ہیں۔

الغرض ۱۔ اسلام نے اول تو اخلاقی قدروں کے معانی کو وسعت دے کر انہیں اس آخری حد تک پہنچا دیا کہ اس سے آگے انسانی عقل جا ہی نہیں سکتی۔

۲۔ اس کے بعد اس نے تمام مستقل قدروں کو ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک کر کے مصلحتوں اور مصالحتوں کے دروازے بند کر دیئے اور

۳۔ ان اعلیٰ صفات کو وعظ و تلقین تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہیں مشہود کرنے کیلئے عملی نظام میں منسلک کر دیا۔

ہر نظام کو مستحکم اور مضبوط رکھنے کے لئے چند محکم اور تقویت پہنچانے والے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح وسیع عمارتوں کی چھتوں کو ستونوں کا سہارا دیتے ہیں۔ "رُکن" کسی چیز کے قوی ترین پہلو کو کہتے ہیں۔ اسلام کے ارکان یہ ہیں: (۱) نماز (۲) روزہ (۳) حج (۴) زکوٰۃ (۵) جہاد اور (۶) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ قرآن حکیم میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ اکثر مقامات پر اکٹھے آئے ہیں اِقَامَتِ الصَّلٰوۃ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قوانین خداوندی کے اتباع کے لئے نظام معاشرت کا قائم کرنا ہے تاکہ نوع انسانی کی طبعی زندگی کی پرورش کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے۔ اس اہم ترین مقصد کو ایتائے زکوٰۃ کی ایک اور جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایتاء کے معنے ہیں دینا۔ زکوٰۃ کا مادہ ز۔ک۔و ہے جس کے بنیادی معنے ہیں۔ پھلنا پھولنا۔ بڑھنا، نشوونما پانا۔ آسودہ و خوشحال ہونا، سرسبز و شاداب ہونا وغیرہ۔ چونکہ گوڈی اور شاخ تراشی اور صفائی وغیرہ کرنے سے پودے زیادہ بڑھتے اور پھلتے پھولتے ہیں اس لئے اس کے معنے پاکیزگی کے بھی ہیں۔ تاہم یہ معنے بنیادی نہیں، ثانوی ہیں۔ قرآن حکیم میں اَزْکٰی اور اَطْہَرُ علیحدہ علیحدہ آئے ہیں (۲/۲۳۲) اَطْہَرُ تو پاکیزگی کے لئے ہے۔ اَزْکٰی نشوونما کے لئے ہے۔ صفائی اور پاکیزگی (طہارت) سلبی صفت (NEGATIVE VIRTUE) ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

خرابیوں سے دُور رہنا یا نقص کو دُور کرنا جبکہ زکوٰۃ (نشوونما) ایجابی صفت (POSITIVE VIRTUE) ہے۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ایک تو اقامتِ الصلوٰۃ ہے دوسرا ایتائے زکوٰۃ ہے یعنی افراد و معاشرہ کا سامانِ نشوونما مہیا کرنا، ایک دوسرے مقام پر ہے کہ مومنین وہ ہیں جو لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْنَ (۲۳:۴) رہتے ہیں یعنی جو زکوٰۃ (نشوونمائے نوعِ انسانی) کے لئے سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔

اَب سوال پیدا ہوتا ہے کہ الدّین یعنی مملکتِ اسلامی یا نظامِ الٰہیہ نوعِ انسانی کی نشوونما کے عظیم فریضے کو کس طرح سرانجام دے، ظاہر ہے کہ اوّلاً پیداواری ذرائع اور رزق کے سرچشمے مملکت کی تحویل میں ہوں تاکہ رزق کی تقسیم افراد کی ضروریات کے مطابق ہو سکے۔ ثانیاً افرادِ معاشرہ جو کچھ کمائیں وہ اپنی ضروریات کے (خواہشات نہیں) پورا کرنے کے بعد باقی ماندہ رزق کو اس طرح کھلا رکھیں کہ مملکت جس قدر ضروری سمجھے اس میں سے لے لے اور مذکورہ فریضے پر خرچ کرے۔ اس مقصد کے لئے قرآن حکیم نے کوئی شرح یا نصاب مقرر نہیں کیا۔ سوال چونکہ ضرورت پوری کرنے کا ہے اس لئے اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جتنا بھی افراد کی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچ جائے عندالضرورت سارے کا سارا مملکت کی تحویل میں دے دیا جائے (۲:۲۱۹)۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو اسلامی مملکت کی تمام آمدنی "ایتائے زکوٰۃ" کے مقصد پورا کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ لیکن اسلامی نظام کے قیام تک کے عبوری دور کے لئے چندے، عطیے یا ہنگامی ٹیکس عائد کئے جائیں گے، جنہیں قرآن حکیم نے صدقات کہا ہے۔

سورۂ وَالنّجم میں ایک وارننگ ہے کہ "تم اپنے متعلق خود ہی یہ فیصلہ نہ کر لو کہ تمہارے نفس کا تزکیہ یعنی تمہاری انسانی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے (۵۳:۳۲)۔ اس کیلئے بھی ایک معیار اور قانون ہے اور وہ یہ ہے کہ تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو دے دیتا ہے۔ (۹۲:۱۸)۔ ڈارون نے کہا تھا کہ بقاء اس نوع کیلئے ہے جو سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور (FITTEST) ہوگی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ بقاء اسی نظام کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہے (۱۳:۱۷) اور وہ نظام یہی ہے۔ جس میں مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی کو اساس بنایا گیا ہے!

صَام کے معنی ہیں رُک جانا۔ ٹھہر جانا۔ باز رہنا۔ قرآن حکیم نے صِیَام کو فرض قرار دیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ صبح سے رات تک کھانے پینے اور جنسی اعمال سے مجتنب رہنے کا نام ہے (۲:۱۸۷) یہ رمضان کے روزے ہیں جس میں قرآن حکیم نازل ہونا شروع ہوا تھا۔ (۲:۱۸۵) جو شخص مقیم ہو یعنی سفر میں نہ ہو اور تندرست ہو یعنی مریض نہ ہو اور اس کی طبعی حالت ایسی ہو کہ اسے روزہ رکھنے میں مشقت نہ اٹھانی پڑے (۲:۱۸۴) تو اس پر روزہ فرض ہے۔ مسافر سفر سے واپسی پر اور مریض شفایاب ہونے کے بعد گنتی پوری کرے۔ (۲:۱۸۴) لیکن جو بمشقت روزہ رکھ سکتا ہو وہ اس کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا دے (۲:۱۸۴)

روزے درحقیقت جماعت مومنین کو جہاد کی مشقت انگیز زندگی کا خوگر بنانے کے لئے سالانہ عسکری ٹریننگ یا ریفریشر کورس کے مترادف ہیں۔ ان کا مقصد قرآن حکیم نے خود واضح کر دیا ہے، فرمایا کہ یہ اس لئے ہیں تاکہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے قابل یعنی تقویٰ شعار بن سکو (۲:۱۸۳) تاکہ تم قرآن حکیم کی روشنی میں قوانینِ خداوندی کو

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور نظام ہائے زندگی پر غالب کر سکو (۲:۱۰۵) اور تاکہ تمہاری کوشش بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔ صائم "روزہ رکھنا والا یا اپنے آپ کو غلط راستوں سے روک لینے والا اپنے آپ پر کنٹرول رکھنے والا اور حدود اللہ کے اندر رہنے والا ہے۔

حج عالم اسلام کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو اس امت کے مرکزِ محسوس یعنی کعبہ میں اس غرض کے لیے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل و حجت کی رو سے تلاش کیا جائے اور اس طرح یہ امت اپنے فائدے کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے۔ (۲۲:۲۸) نظام کے قیام کے لیے مرکزی اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ اجتماعی خود احتسابی کا عمل، باہمی اخوت و مودت کی تجدید، روابط پیدا کرنا، تجارت و صنعت و حرفت کا فروغ، بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ، اپنے مسائل پر تبادلۂ خیالات اور دوسرے باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کے لیے سال میں ایک دن مقرر کر دینا اور اسے الدین کا ضروری رکن قرار دینا اللہ کی بڑی نعمت اور رحمت ہے۔ اس زمانے میں جب مطلق العنان بادشاہوں کی ہیبت ساری زمین پر چھائی ہوئی تھی باہمی مشاورت کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور آج اس کی جو اہمیت ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

ہر نظام، ہر مملکت اور ہر حکومت کا ایک مرکز ہوتا ہے جس کی طرف تمام افرادِ معاشرہ کی نگاہیں اٹھتی ہیں جو ان میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرتا ہے، یہ درحقیقت علامت ہوتی ہے اس نظام یا حکومت کی جسے ہر وقت پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھنے سے مقصود اس نظام یا حکومت سے اپنی وابستگی اور وفاشعاری کا اظہار ہوتا ہے۔ کعبہ جو دنیا کے بتکدوں میں اللہ کا پہلا "گھر" ہے اسے تمام اقوامِ عالم کے لیے رہنمائی کا نشان بنایا گیا تھا اور یہ ارشاد ہوا کہ اس میں جو بھی داخل ہو گیا اسے دنیا جہان کی آغوش سے امان حاصل ہو گئی۔ قبلے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے اتباع کو دین کا اتباع کہا گیا ہے۔ قبلہ درحقیقت دین کا محسوس نشان ہے۔ چنانچہ جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی کونے میں ہوں، وہ اپنی توجہات کو اپنے دین کے اسی مرکز کی طرف مرکوز رکھیں۔ "تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اسی طرف رکھو"۔ (۲:۱۵۲) تمہارا نصب العین ہو تاکہ نصب العین حیات کی وحدت ملت کی بنیاد قرار پائے۔ اسی کی محسوس شکل ہے اجتماعاتِ صلوٰۃ میں کعبے کی طرف رخ کرنا کیونکہ وہ نظام جس کی علامت کعبہ ہے تمہاری وفاشعاریوں کا مرکز بھی ہے۔ حج کے مناسک میں سے ایک حجرِ اسود کے گرد سات چکر لگانا (طواف) بھی ہے، یہ بھی وحدتِ فکر و عمل کی مرکزیت پر قربان ہو جانے کا عہد ہے۔

جہد کے معنی تکلیف اور مشقت اور کسی کام کو اس کی انتہا تک پہنچا دینے کے ہیں۔ جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی طاقت اور وسعت کا پورا پورا صرف کر دینا اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔ قرآن حکیم میں قاعدین کے مقابلے میں مجاہدین کا لفظ آیا ہے۔ (۴:۹۵) قاعدین کے معنی بیٹھے رہنے والے یا سستی کرنے والے ہیں۔ لہٰذا مجاہدین کے معنی ہوئے جد و جہد کرنے والے، حصولِ مقاصد کے لیے پوری پوری کوشش کرنے والے خواہ اس میں جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ قرآن حکیم کی رو سے زندگی کا راز جہد و جہد اور سعی و کوشش میں ہے۔ لہٰذا مرد مومن جو زندگی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور عمل کا پیکر ہوتا ہے۔ ساری عمر مجاہد رہتا ہے۔ یعنی مصروف سعی و عمل۔ اسلام جنگ میں پہل کرنے کا حکم نہیں دیتا اس کی ہر جنگ دفاعی ہوتی ہے۔ اور اس کے بھی کچھ ضوابط مقرر ہیں۔ جب کفار کے مظالم حد سے بڑھ جائیں اور جنگ کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہے تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ مسلح جہاد میں حصہ لے۔ چونکہ "زندگی" نام ہی حرکت و عمل کا ہے اس لئے یہ ہمہ وقت موت کی گھات میں لگی رہتی ہے۔

(۲)

صلوٰۃ کے کچھ معنے ہمارے سامنے آچکے ہیں، اس لفظ کے مزید معنے یہ ہیں۔ نقائص کو رفع کرنا۔ جھکانا۔ کسی کو اپنی طرف مائل کرنا۔ تعظیم دینا۔ دعائے خیر و برکت وغیرہ۔ یہاں ان معنوں کا خصوصی جائزہ لینا چاہتے ہیں، جن میں یہ لفظ خاص قسم کے اجتماعات کے لئے قرآن حکیم میں آیا ہے یا جنہیں ہم عام زبان میں اجتماعات نماز کہتے ہیں۔ ویسے عمومی لحاظ سے آپ زندگی کے جس گوشے میں بھی اللہ کے قوانین کی متابعت کر رہے ہیں وہ اقامت صلوٰۃ ہی ہے اور اس کے لئے وقت، مقام یا شکل کا تعین نہیں ہے۔ تاہم خصوصی لحاظ سے ایک خاص عمل کے لئے بہت سی آیات میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جس کے لئے اوقات بھی مقرر ہیں اور شکل و صورت بھی متعین ہے۔ ویسے "نماز" پہلوی زبان کا لفظ ہے جو فارسی کے توسط سے ہمارے ہاں آیا ہے۔ یہ آتش پرستوں کی پوجا پاٹ کے خاص طریقے کے لئے بولا جاتا تھا جس میں آگ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھتے تھے اور اگنی دیوی کی تعریف میں بھجن گاتے تھے۔ سنسکرت میں یہ لفظ نمستے اور نمستے ہے۔ ہندوپاکستان میں گزشتہ ایک ہزار سال سے یہ لفظ اہل اسلام کے اجتماعات صلوٰۃ کے لئے یہاں کی تمام زبانوں میں رواج پا گیا ہے۔

انسان اپنے جذبات کا اظہار بعض اعضائے جسمانی کی مخصوص حرکات سے بھی کرتا ہے یہ حرکات گویا دل کے احساسات اور زبان سے ادا شدہ الفاظ میں شدت خلوص پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ بعض حرکات ایسی بھی ہیں جو دنیا کے ہر خطے کے انسانوں کے لئے ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں۔ مثلاً سر کو آگے پیچھے خفیف سی حرکت دینے کا مطلب اقرار و رضامندی ہے اور اسے دائیں بائیں ہلانا انکار اور نارضامندی ہے۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ذرا سا جھکا دینا تسلیم اور قبولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ خاموش اور ساکت کھڑے ہو جانا احترام کے جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ جبین نیاز کو زمین پر رکھ دینا یا اسے کمر تک جھکا دینا، دوزانو ہو جانا انتہائی نیازمندی اور عجز و انکسار کی علامت ہے۔ غم و غصہ، خوشی، تعجب، ارادے، انکار، اقرار، پسند، ناپسند وغیرہ کے جذبات زبان سے کم حرکات سے زیادہ اور مؤثر تر اظہار پاتے ہیں۔ پھر آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ خموشی معنے دارد کہ در گفتن نمی آید۔ تاہم ان سب معنی خیز حرکات و اشارات (GESTURES) کا کمال یہ ہے کہ یہ تمام حرکات لاشعوری طور پر خود بخود سرزد ہوتی ہیں۔ تعظیم کے لئے انسان خود بخود کھڑا ہو جاتا ہے اپنے آپ ہاتھ باندھ لیتا ہے آنکھیں نیچی کر لیتا ہے۔ اور ساکت اور خاموش کھڑا ہو جاتا ہے۔ اطاعت کا اظہار "سر تسلیم خم" کر دینے سے ہوتا ہے اور بڑی بے ساختگی سے ہوتا ہے۔ قرآن حکیم اگرچہ عمل کے خلوص اور نتائج کی واقعیت پر نگاہ رکھتا ہے اور ظاہر پرستیت (FORMALISM) کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن جہاں کسی جذبے کی شدت کا اظہار ضروری ہو وہاں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اظہار کی جسمانی صورت (FORMS) کو روکتا بھی نہیں۔ بشرطیکہ اسی صورت کو ہی اصل مقصود نہ بنا لیا جائے یا اس کے پیچھے جو خلوص ہے اسے ضائع نہ کر دیا جائے صلوٰۃ کے سلسلے میں کھڑا ہو جانا۔ سربسجود ہو جانا یا دو زانو بیٹھا کر ساکت بیٹھ جانا وغیرہ تمام عملی شکلیں ہیں اسی مقصد کی۔ چونکہ ہماری تمام عبادات اجتماعی ہیں اس لئے جسمانی حرکات کا ایک نظم و نسق میں منضبط ہو کر جذبات کا اظہار کرنا اور بھی زیادہ اثر آفرین اور رقت انگیز ہوتا ہے۔ کیونکہ اجتماع کی ہم آہنگی بجائے خود ایک بہت بڑا ڈسپلن ہے، اجتماعی نظام کو تعلیم پذیری کا جزو اعظم قرار دیا جاتا ہے کیونکہ دوسروں کو وہی کام کرتا دیکھ کر جو آپ کر رہے ہیں آپ کے دل کو اطمینان اور تائید ملتی ہے اور بظاہر ایک بے معنی کام کے بھی معنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کا اجتماعی عمل فرد کے عمل میں بھی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتا ہے۔

اگر ہمارے دل و دماغ میں اللہ کی ہستی کا قرآنی تصور راسخ ہو جائے یعنی ہم یقینِ کامل کے ساتھ دل کی زبان سے پکار اٹھیں کہ "اللہ وہ عظیم و بلند و بالا ہستی ہے جس کو کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی جس کی ماہیت کا ادراک کر لینا کسی عقل کے بس کی بات نہیں ہے، جس کی ملکیت کائنات کے ذرّے ذرّے پر محیط اور حاوی ہے جس کے حکم اور قانون کی تعمیل و اطاعت میں ہر چیز سرگرم عمل ہے، جو صفات ربانیہ اور افعال کونیہ میں واحد اور لاشریک ہے۔ جو اپنی مخلوقات کا پہلا آخری اور یقینی سہارا ہے۔ جو سرچشمۂ خیر و خوبی ہے اور جس کی انتہائی مکمل ذات اپنی تمام جمالی اور جلالی صفات کے ساتھ انسان کی نامکمل مگر امکانات بدوش ذات کے لئے واحد مثالی نمونہ ہے" تو پھر عبادت کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ مردہ خودساختہ خداؤں کی پرستش کی جاتی ہے زندہ و فعال ہستی کی اطاعت کی جاتی ہے۔ پھر "عبد" کی زندگی کا مقصد کسی انوہیاتی قوت کی خوشامدیں کر کے اس سے اپنے چھوٹے موٹے مفادات طلب کرنا نہیں رہ جاتا۔ بلکہ حاکم اور مالک اور آقا کے احکام کی تعمیل میں "تکمل اور ارتفع اقتدار" کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھ کر ایک ابدی اور غیر مبدّل معیار کا اپنی سیرت و کردار کو پرکھتے رہنا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی چیز کو ذکر کہا ہے یعنی ہر وقت یاد رکھنے اور کبھی نہ بھلائی جانے والی چیز۔

الدین میں صلوٰۃ و دعا اور عبادت کو تمام ادنیٰ اور غیر معقول عناصر سے پاک کر دیا گیا ہے، دنیا کے جھمیلوں، زندگی کی گہما گہمی، شہر و بازار کے شور و شغب، جذبات کی کشمکش اور مفادات کے تصادمات ہیں۔ نیز کسی فوری خواہش کے زبردست دباؤ کے زیر اثر اس بات کا شدید امکان رہتا ہے کہ انسان اپنے آئیڈیل سے غافل ہو جائے۔ ایمان کا صرف دعویٰ یا دستدہ سازبانی اقرار کافی نہیں ہوتا، ایمان کا عمل سے بھی ثبوت دینا پڑتا ہے۔ لہٰذا تشکیلِ سیرت کے لئے ضروری ہے کہ آئیڈیل تک پہنچنے کی سعی و کاوش کو "عادت" میں ڈھال لیا جائے اور اسے زندگی کا جزوِ لاینفک بنا لیا جائے۔ اسلام سے پہلے پرستش کا جو تصور تھا وہ اس سے زیادہ نہیں تھا کہ اس سے پجاری کو مفروضہ تسکین مل جاتی تھی۔ اور شدتِ ذوقِ طلب کو انجماد مل جاتا تھا۔ خود پجاری کو اس بات کا یقین نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی پوجا پاٹ نتیجہ خیز ثابت ہو رہی ہے یا نہیں۔ اطاعت گزینی اور منشائے رب قدیر سے ہم آہنگ ہو جانے کی صورت میں یہ بے یقینی والی بات نہیں رہتی کیونکہ احکام جن کی تعمیل کی جاتی ہے وہ بھی بالکل واضح اور غیر مبہم ہیں، اور جو کوئی ان کی تعمیل کرتا ہے وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وہ کس کے حکم کی کیسے تعمیل کر رہا ہے اگر اس کے عمل کا نتیجہ بالکل اسی طرح اس کے سامنے نہیں رہا جس طرح کہ بتایا گیا ہے، کہ فلاں حکم کی تعمیل سے ایسا ہوگا۔ تو اطاعت گزار (عابد) فوراً اپنے عمل کا جائزہ لے کر اس کی اصلاح کر لیتا ہے، اور ایسا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مطلوبہ نتائج ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس انداز کی بلند پایہ عبادت گویا حسن و خوبی اور خیر و صداقت کے اصل الاصول کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ کسی لامحدود قوت کی خوشامد نہیں کہ اس سے مراعات حاصل ہو جائیں گی۔ نہ یہ کوئی "اسباب و علل میں جکڑی ہوئی دُنیا" میں کسی فوق الفطرت مداخلت یا اعجاز طلبی کی قسم کا کوئی کام ہے۔ عبادت تو رُوحِ زندگی کے حضور خود سپردگی اور اطاعت و تسلیم و رضا کا عملی مظاہرہ ہے، ایک اللہ کی غلامی قبول کر کے ہزاروں دوسری غلامیوں کا طوق گلے سے نکال پھینکنے کا نام ہے، اور "ایک اللہ" ہمیں جو ہمیں زندگی عطا کرتا ہے۔ ہماری ربوبیت کا سامان مہیا کرتا ہے اور ہماری نشو و نما میں معاون و مددگار رہتا ہے جب ہم اس حقیقت پر اپنے یقین کو مستحکم کر لیتے ہیں کہ اللہ ہمارے نظامِ اخلاق کا سرچشمہ ہے اور ہر خیر و خوبی کا منبع و ماخذ بھی ہے تو پھر ہم عدل اور محبت دونوں کو اسی کی ذات میں مرتکز کر لیتے ہیں۔ اس طرح یہ وجودِ مطلق، ہمارے آئیڈیل کی حیثیت سے زندگی کی تمام اعلیٰ قدروں کا جامع بن جاتا ہے۔ پھر اسی اور صرف اسی کی فرمانبرداری ہم پر فرض ہو جاتی ہے اور اسی ایک کے آگے سجدہ ریز ہو جانا ہمارا مقصد و مطلب بن جاتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اپنی جبلتوں کو اپنے آئیڈیل کے تابع رکھنے کی بجائے خود جبلتوں کے تابع ہو جائیں گے۔ اور اس طرح ہماری زندگی ہمارے اپنے ہاتھوں طغیان و فساد کا محشرستان بن جائے گی۔ اس نکتے کو اس طرح سمجھیے کہ فرض کیا ہم نے مال و دولت یا قوت و اقتدار کی پرستش شروع کر دی تو اس طرح گویا ہم نے محض "تن آشنا" حیوانیت کے آگے سر کو جھکا دیا۔ یا اگر ہم دوسرے انسانوں کی محکومی اختیار کر لیں (کسی خوف کی وجہ سے یا کسی مادّی مفاد کی خاطر) تو اس صورت میں ہم نے اپنے ہی بنائے ہوئے مادی یا غیر مادی خداؤں کی پرستش شروع کر دی تو یہ بھی اُس فضیلت کی توہین ہے جو خالقِ اکبر نے ازروئے قانونِ تخلیق ہمیں باقی ساری مخلوقات پر عطا کر رکھی ہے۔ پس صحیح آزادی صرف آئیڈیل کی بے چون و چرا فرماں برداری کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔

مزید غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ "دعا" کا اصل مقصد زیادہ بہتر طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اجتماعی صورت میں مانگی جائے۔ کتنی بصیرت افروز حقیقت ہے کہ اسلام میں الصلوٰۃ کی رُوح تک معاشرتی اور اجتماعی ہے ماہرینِ نفسیات کا فیصلہ ہے کہ گروہ کے اندر اگر عام سطح کے آدمی کے ادراک میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کی قوتِ ارادہ کو اتنی فعالیت حاصل ہو جاتی ہے جو اسے فردیت کی تنہائیوں میں کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسلام میں اجتماعی صلوٰۃ کے ذریعے روحانی تنویر کا اس طرح جماعتی نظام کی صورت اختیار کر لینا خاص اہمیت رکھتا ہے، دعا و صلوٰۃ، انفرادی ہو یا اجتماعی، دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ایک شدید آرزو ہے جو کائنات کی بھیانک خاموشیوں میں "جواب" کی منتظر رہتی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ "دریافت" کا انوکھا اور منفرد سائل ہے جس کے ذریعے ہماری محوِ جستجو انا اپنے آپ کو عین اس لمحے پا لیتی ہے جب یہ اپنی ہی نفی کرنے کے دہانے تک پہنچ چکی ہوتی ہے، اپنے آپ کو اس طرح پا لینا اس کیلئے اپنی قدر و قیمت کا جواز بن جاتا ہے اور اسے اس یقین سے ہمکنار کر دیتا ہے کہ تیرا ہی وجود اس کائنات کی زندگی میں متحرک اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

فعّال حقیقت ہے۔

دل کے مختلف رجحانات کو جسمانی حرکات و سکنات اور اشارات سے جو اظہار ملتا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی عبادت میں ایک خاص سمت کا تعیّن جماعت کے اندر احساس کی وحدت کو مضبوط تر بنا دیتا ہے اور نماز ادا کرنے کا جو مجموعی طریقہ ہے اس سے معاشرتی مساوات کو بے حد تقویت ملتی ہے۔ انائے مطلق کی وحدت سے جو ہر دوسری انا کا خالق پروردگار اور ارتقا دہندہ ہے پوری انسانیت کی وحدت کا تصوّر اُبھرتا ہے اور یہی اسلام کا مقصود و منتہائے نظر ہے اسلام کا طریقِ نماز وحدتِ انسانیت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک ایسی عملی تربیت ہے جس کے ذریعے تعصبات کی وہ تمام دیواریں منہدم ہوجاتی ہیں جو بعض اوقات ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان حائل رہتی ہیں۔

آئیے اب نظریاتی بحث کی بجائے ایک مسلم عابد کے شب و روز کا قریب ترین زاویئے سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اُفقِ مشرق پر ابھی نور کی سیماتی کرن نمودار نہیں ہوئی، ساری کائنات پر سکوت کا عالم طاری ہے۔ ہوائے صبح کے ہلکے ہلکے جھونکے گل و یاسمین کی کلیوں سے سرگوشیاں کر رہی ہیں، شبنم کے قطرے پھولوں کو موتیوں کی مالا پہنا رہے ہیں۔ مرغانِ سحر ننھی منی چڑیوں کو، شہد کی مکھیوں کو، اور بھنوروں کو اور رنگ برنگی تتلیوں کو بیداری کا پیغام دے رہے ہیں۔ نیم خوابی اور نیم بیداری کے ان سحر آفریں لمحات میں عبادت گزار کے کان میں ایک وجد آفریں اور موسیقی سے لبریز آواز پڑتی ہے کہ اس بے حد و کنار کائنات کی پہنائیوں میں سب سے بڑی طاقت، سب سے عظیم قوت اور سب سے بلند و بالا حیّ و قائم اور بیدار و فعّال ہستی کا نام اللہ ہے ا ہر قوت، ہر اقتدار، ہر حاکمیت اور ہر بڑائی اور بزرگی سے بزرگ تر "اللہ"! میں گواہی دے رہا ہوں اس بہت بڑی صداقت کی کہ اللہ کے سوا اور کوئی وجود حاکمیت کے لائق نہیں ہے جس کے آگے جھکا جائے۔ میں اس صداقت کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچّے پیغمبر ہیں۔ پس آؤ سب کے سب اور زندہ رکھو نظام الصلوٰۃ کو اپنی عملی شرکت کے ذریعے ہاں زندہ رکھو سب کے سب آؤ اس نظامِ فلاح کی طرف۔ نظامِ الصلوٰۃ میں عملاً و قولاً شرکت کرنا بہتر ہے نیند کی مستی سے۔ اللہ سب سے بڑا ہے، سب سے بڑا!

اللہ کی سپریم حاکمیت کا اعلان، ہر مسجد سے، خود ساختہ خداؤں کی غلامی سے نجات کا پیغام بن کر گونج رہا ہے عابد کے قلب نے تصدیق کی اور زبان نے دہرایا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ الٰہی حاضر ہوں میں آیا" اور جسمانی طور پر بیدار، روحانی طور پر ہوشیار اور ذہنی طور پر تیار ہو گیا ہے اور اس عزم راسخ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہے کہ اُسے فلاحِ انسانیت کے پروگرام کو دن بھر کے باقی اوقات میں اپنے قول و عمل سے مشہود بنانا ہے۔ یہی مقصود و منتہا اس کے جسم و جان کیلئے حیاتِ تازہ کا حکم رکھتا ہے۔ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر وہ مسواک اور غسل کرتا ہے اور پھر اعضائے جسمانی کے اُن حصوں کو تین تین مرتبہ دھوتا ہے جو روزمرہ کے کاروبار کے دوران عُریاں رہتے ہیں۔ پھر پاک لباس پہن کر مسجد کی طرف دوڑتا ہے کیونکہ یہ مقام علامتی مرکز ہے وحدتِ جماعت کا۔ اخوت کا۔ مساوات کا، ڈسپلن کا اور حُرّیت کا۔ شاہ و گدا، امیر و غریب، مزدور اور آجر، محتاج و غنی سب تیز تیز قدم اُٹھائے آرہے ہیں کہ وقت کی پابندی لازمی ہے، امام صلوٰۃ ایک ثانیہ بھر کے لئے بھی کسی کا انتظار نہیں کرے گا۔ لو جماعت کھڑی ہو گئی۔ صفیں عسکری طرز سے سیدھی کر لی گئیں۔ جہاں جس کو جگہ ملی ہے وہیں کھڑا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہو گیا ہے۔ کسی کے لئے کوئی مقام ریز و در نہیں ہے۔ سب زبانیں خاموش ہیں۔ سو پچاس کا اجتماع بھی نفسِ واحد کی طرح ساکت اور ہمہ تن متوجہ ہے۔ ہر ایک کے دل میں ایک ہی خیال ہے، ایک ہی آرزو ہے، ایک ہی ذوق و شوق ہے، ایک ہی فکر ہے۔ کندھے سے کندھا ملائے پاؤں کے پنجوں کو ایک ہی سیدھ میں رکھے، نظریں مقام سجدہ پر گڑی ہوئی، ہاتھ ناف سے اوپر عجز و انکساری سے باندھے ہوئے، جسم ساکت و صامت، احکم الحاکمین کی حضور میں بصد احترام کھڑے ہیں اپنی اطاعت و انقیاد اور خود سپردگی کا اعادہ کرتے ہوئے ہر قلب کی گہرائی سے ایک ہی آواز نیت بن کر اٹھ رہی ہے کہ "میں نے متوجہ کر لیا اپنا رخ خلوص کے ساتھ اس ایک کی طرف جس نے زمین اور آسمانوں کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے" امام نے کہا: اللہ اکبر اور نماز شروع ہو گئی۔ "اے اللہ تو تمام علائق سے پاک ہے، تیری ذات حمد کے لائق۔ تیرا نام برکتوں والا، تیری شان بلند کوئی صاحب اقتدار نہیں تیرے سوا۔ میں شیطان مردود کے خلاف اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور آغاز کرتا ہوں اپنی بندگی کا اللہ کے نام سے جو الرحمان بھی ہے اور الرحیم بھی ہے۔

اب امام نے بآواز بلند کہنا شروع کیا: حمد خاص صرف اللہ کے لئے ہے جو کل جہانوں کا ربّ ہے الرحمان ہے الرحیم ہے جزا کے دن کا مختارِ کل ہے۔ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے استعانت چاہتے ہیں۔ ہماری راہنمائی کر ہموار سیدھے اور ارتقا بدوش رستے پر چلنے کی اس راستے کی جو اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تیرے انعامات کی بارشیں برستی ہیں۔ نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جو تیرے غضب سے معتوب ہوئے اور نہ اُن کا جو راہ گم کردہ ہیں۔ سب نے مل کر کہا ہاں ایسا ہی ہو۔ پھر امام نے قرآن حکیم میں سے کوئی سی سورۃ پڑھی۔ مقتدی ہمہ تن گوش ہیں۔ سورۃ ختم ہوئی امام نے عسکری کاشن کے انداز میں کہا: اللہ اکبر اور سب کے سب فوراً اس حکم کی تعمیل میں اللہ کے حضور جھک گئے۔ گھٹنوں پر ہاتھ مقام سجدہ پر نظر جمائے زبان حال سے کہہ رہے ہیں پاک ذات ہے میرے ربِّ عظیم کی۔ تین مرتبہ کہا۔ امام پکارا اللہ نے سن لی ہے اس کی جس نے اُسے پکارا ہے، مقتدیوں نے اعادہ کیا: اے ہمارے پروردگار، حمد تیرے ہی لئے ہے، امام نے پھر کاشن دیا۔ اللہ اکبر اور تمام کے تمام عبادت گزار سجدے میں گر گئے۔ ہتھیلیاں اوندھی ہیں، ماتھا اور ناک زمین کو چھو رہا ہے۔ بندہ اپنی معبودیت کی معراج کو پہنچ کر پھر زبان حال سے اقرار کر رہا ہے۔ پاک ہے میرا ربِّ اعلیٰ۔ امام کی اللہ اکبر کی آواز پر سب اُٹھ بیٹھے۔ دونوں ہتھیلیاں زانو پر اُلٹی رکھی ہیں۔ ایک سجدے سے دوسرے کے درمیان کا وقفہ ہے، امام کی اللہ اکبر کی آواز پر پھر ایک بار سجدہ ریز ہو گئے۔ تین مرتبہ کہا پاک ذات ہے میرے ربِّ اعلیٰ کی۔ امام نے اللہ اکبر کہا۔ ایک رکعت نماز ختم ہوئی، دوسری کے لئے پھر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ پھر ویسا رکوع ہو گا، اور پھر ویسی سجود ہو گا۔ امام کے حکم پر سب گردنیں اللہ کی حضوری میں جھک جائیں گی، سب کی سب ایک ساتھ، سر پر غرور بھی، تاجدار بھی، غنی بھی، محتاج و نادار بھی، تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

نماز کی ہر دعا اجتماعی ہے، ہر آرزو اجتماعی ہے۔ ہر جسمانی حرکت اجتماعی ہے اور روحانی کیفیت و سرور بھی اجتماعی ہے گویا فرد جماعت کے لئے اور جماعت فرد کے لئے ہے۔ پھر دونوں یکجان ہو کر ایک اللہ کی حضوری میں گم ہیں۔

حکم ہے کہ نماز کے ختم ہوتے ہی اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی روزی کمانے کے جس کام میں لگے ہوئے ہو اس میں محنت کرو کوئی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور انہماک سے مصروف ہو جاؤ۔ اور جس سیدھے، متوازن اور ارتقا بدوش انعامات والے راستے پر چلنے کی آرزو کی تھی اسی پر گامزن ہو جاؤ کیونکہ فوز و فلاح اور خوف و حُزن سے امن و حفاظت کا راستہ دنیاوی کاروبار کی گہماگہمی کے عین درمیان میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ دنیاوی معاملات تمہارے کردار اور سیرت کی آزمائش کے لئے ہیں۔ تمہیں درمیان قعرِ دریا، کر بھی تر دامنی سے بچنا ہے۔ قدم قدم پر امتحان ہوگا۔ جگہ جگہ پر ہوس نے دام تذویر بچھاتے ہوں گے۔ شرِ ما خلق، شرِ شیطان اور شرِ انسان سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے، صداقت، امانت، دیانت اور مستقل قدروں کو مطمع نظر بناکر بے خطر آگے بڑھتے جاؤ۔ اللہ سے جو پیمان کیا ہے اسے حافظے سے محو نہ ہونے دو، یہاں تک کہ سایہ ڈھل جائے۔ لو سنو! اللہ اکبر کی صدا پھر گونجی۔ کاروبار بند کر دو۔ کھانا کھاؤ دن بھر کے تھکے ہوئے ہو۔ وضو کر کے تازہ دم ہو جاؤ، دوسری نماز کا وقت آن پہنچا ہے۔

شکاگو کے مزدوروں کے ساتھ بظاہر جذباتی لیکن بباطن سیاسی لگاؤ رکھنے والے سوچیں کہ دنیا کے ہر طبقے کو عملی نمونہ پیش کرنے والے انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے آٹھ گھنٹے کے اوقاتِ کار کو الدین کے خود کار نظام کا حصہ نہیں بنا دیا تھا۔ نمازِ فجر اور نمازِ ظہر کے درمیان پورے آٹھ گھنٹے کا وقفہ ہے، تاہم ایک فرق کے ساتھ اور وہ فرق یہ ہے کہ شکاگو کے مزدوروں نے اپنے حقوق اور مطالبات کا شور تو مچایا لیکن اپنے فرائض کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ نہ محنت کی بات کی، نہ خلوص اور دیانتداری کی اور نہ دوسروں کے حقوق کی پاسداری کا عہد کیا۔

دوسری نماز آرام آرام سے پڑھنے کی نماز ہے۔ صبح کی طرح دل میں پھر خشوع اور خضوع لیکر حاضر ہونا ہے، خشوع اس بات کا کہ علی الصبح اللہ کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا۔ کاروبار کے آٹھ گھنٹے کی ریل پیل میں کہیں دانستہ یا نادانستہ، خطا نسیاناً کوئی کوتاہی نہ ہو گئی ہو۔ خضوع یعنی عجز و انکسار اس لئے کہ انسان ضعیف البنیان ہے۔ پھسل جانے کا ہر وقت احتمال رہتا ہے، اس لئے اللہ اکبر کے حضور پھر پیش ہونے کا وقت آگیا ہے۔ اے اللہ تو نیتوں تک کو جانتا ہے اگر اس دوران کوئی خطا مجھ سے ہو گئی ہے تو اس سے درگزر فرمایا اور مجھے مستقیم رہنے کی توفیق بخش دے!

کچھ دیر آرام بھی کر لو، ایک ڈیڑھ گھنٹے کا تھوڑا سا وقت دنیاوی کاروبار کے نمٹانے کیلئے ابھی ہے آٹھ گھنٹوں کے دوران کوئی کام ادھورے رہ گئے تھے تو انہیں پورا کر لو۔ آج کا کام کل پہ نہ چھوڑو۔ تیسری نماز کا بلاوا ابھی آئے گا۔ یہ مختصر سی نماز ہوگی تاکہ اس کے بعد شام تک تم اپنے دن بھر کا سارا کام سمیٹ سکو۔ شام کی نماز بھی زیادہ طویل نہیں ہوگی۔ تمہیں کھانا کھانا ہے۔ گھر کے معاملات میں سلجھے رہنے ہیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں جو ظہر اور عصر کے وقفوں کے دوران تم مکمل نہ کر سکے تھے، رات کی نماز قدرے طویل ہوگی۔ یہ خود احتسابی کا وقت بھی ہے دن بھر میں مادی طور پر اور روحانی طور پر کیا پایا کیا کھویا، کیا نہیں کر سکے جو کرنا چاہیے تھا ان سب باتوں کا جائزہ لو اور نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے نمازِ وتر میں اس طرح طلب گارِ رحمت بنو۔

اے اللہ ہم تجھ سے استعانت چاہتے ہیں اور تجھ سے ہی تحفظ طلب کرتے ہیں۔ تجھ پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ تیری اعلیٰ ثنا کرتے ہیں اور تیری نعمتوں کے شکرگزار ہیں اور

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تیرا کفر نہیں کرتے۔ جو کوئی تیرے اس نظام سے ٹوٹ جائے ہم اس سے الگ ہیں۔ ہم اسے چھوڑتے ہیں۔ اے اللہ ہم تیری ہی اطاعت گزاری کرتے ہیں، اور تیری ہی صلوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور تیرے ہی حضور سجدہ ریز ہیں۔ تیری ہی طرف ہماری دوڑ دھوپ ہے اور تیری ہی خدمت میں ہم سرگرم عمل ہیں۔ تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے خوفزدہ ہیں بے شک تیرا عذاب تیرا انکار کرنے والوں کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔

مسجد وحدتِ فکر و عمل کا سرچشمہ ہے، باہمی مشاورت و معاونت کا مرکز ہے۔ تعلیم و اصلاح کے عملی نفاذ کا منبع و ماخذ ہے۔ آپس کے اختلافات رفع کرنے اور تنازعات فیصل کرنے کی عدالت گاہ ہے۔ لہٰذا دین اور دنیا دونوں کے آفاق کو یہیں پر آ کر ملنا چاہیئے۔ یہ ادب گاہِ جوہرِ انسانیت ہے جہاں سوائے حق و صداقت کے اور کوئی چیز راہ نہیں پا سکتی۔ لہٰذا عدل و مساوات اور حریتِ فکر کے انوار یہیں سے پھوٹنے چاہیئں۔ اس مقامِ محترم کی عظمتوں کو بلند رکھو اور اس کے تقدس کو کسی صورت میں بھی پامال نہ ہونے دو۔ اسلام مومن کے شب و روز کو اتنا مصروف رکھتا ہے۔ اور ذکر و فکر کے دائرے کو اتنا وسیع بنا دیتا ہے کہ اہلِ مغرب جسے فرصت کے اوقات (LEISURE HOURS) کہتے ہیں ان کی بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے۔ فارغ اوقات اور ان کے موثر انداز سے گزارنے کے مسئلے ایسے معاشروں میں پیدا ہوتے ہیں جن میں اونچے نیچے طبقوں کی تفریق جان بوجھ کر قائم رکھی جاتی ہے تاکہ ایک طبقہ ہمیشہ محنت کرتا رہے اور دوسرا طبقہ ان کی محنت کا پھل سے اڑائے اور اس طرح عیش کرتا رہے۔ جو نظام سماجی عدل اور مساوات کے اصولوں پہ قائم ہوگا۔ اس میں کسی بھی قسم کی طبقاتی تقسیم پیدا نہیں ہو سکتی۔

نماز جن اہم ترین صفات و فوائد کی حامل ہے انہیں مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱ ــــ صحیح جمہوریت کے لئے عوام الناس کو عملی تربیت سوائے نماز کے اور کوئی نظام نہیں دے سکتا۔

۲ ــــ اللہ کے حضور دن میں پانچ مرتبہ حاضر ہو کر وقت کی پابندی، اخوت، مساوات، اطاعتِ امیر، جسمانی اور قلبی صفائی، عجز و انکسار، ڈسپلن، وحدتِ فکر و عمل اور فرد و ملت کے روابط کی جو ٹریننگ ملتی ہے وہ مسجد کے باہر بھی برقرار رہتی ہے۔ یہ اوصافِ حمیدہ رفتہ رفتہ عادتِ ثانیہ بن کر سیرت و کردار کی پاکیزگی میں ڈھل جاتے ہیں۔

۳ ــــ نماز کے اندر حرکات و سکنات میں ہم آہنگی پوری جماعت کے اندر موافقت اور مودّت اور یکسوئی کی فضا پیدا کر دیتی ہے، اطاعتِ امیر اجتماعی نظم و نسق اور قانون کے احترام کے لئے انتہائی ضروری صفت ہے۔ سعی و عمل میں باہمی معاونت کا درس بھی یہیں سے ملتا ہے۔

۴ ــــ جب پورے کا پورا اجتماع ہم مقصد ہو کر مشترکہ آرزوؤں کا طلب گار ہو تو اس میں روحانی کیفیات میں سرور، پاکیزگی اور رفعت کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔

۵ ــــ وقت کی پابندی فرائض ادا کرنے کے ذوق و شوق میں اضافہ کرتی ہے۔ نمازیں چونکہ صبح سے لے کر رات گئے تک پھیلی ہوئی ہیں اس لئے ہر قسم کی مصروفیات، مشاغل اور دلچسپیوں کو چھوڑ کر دعوتِ صلوٰۃ پہ لبیک کہنے کو ترجیح دینا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بہت بڑی آزمائشوں میں سے گزرتے رہنا ہے۔ یہی وہ آزمائشیں ہیں جو جوہر انسانیت کو توانائی اور استحکام عطا کرتی ہیں۔ جب اس طرح ترجیح دینے کی عادت راسخ ہو جاتی ہے تو پھر صداقت کی ہر پکار باطل قوتوں کی کشش اور ترغیب پر غالب آجاتی ہے اور عقلِ حیلہ جو کے پاس بھی گریز کی کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

۶ــــ اسلام میں کسی پیشہ ور پادری، پجاری، پروہت، برہمن وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس میں وراثت کو دخل ہے۔ حکم یہ ہے کہ حاضر اجتماع میں جو کوئی بھی علم اور عمل صالح میں افضل ہے وہی نماز کی امامت کرے۔ دن میں پانچ مرتبہ انتخاب امیر کی عملی تربیت پوری جماعت کے جمہوری اور سیاسی شعور کو کن بلندیوں تک پہنچا دے گی اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ ہر نماز کے لئے امام کا انتخاب لیڈر شپ کی ایسی ٹریننگ ہے جس کی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ یہ ٹریننگ ہر شخص کے لئے آگے بڑھنے اور صحت مندانہ مسابقت کے مواقع مہیا کرتی ہے

۷ــــ پانچ مرتبہ جسم کے کھلے ہوئے حصوں کی صفائی اور لباس کی پاکیزگی کا خیال جذبات اور احساسات کی تطہیر کا باعث بھی بنتا ہے۔ جسم کی صفائی کے جو عام فائدے ہیں وہ اپنی جگہ اہم ہیں۔

۸ــــ قیام، رکوع، سجود اور قاعدے کے جو طریقے مخصوص ہیں وہ خاص جسمانی ورزش کا مقام رکھتے ہیں ان سے کتنی بیماریوں کو شفا ملتی ہے یا ان کا سدباب ہوتا ہے اس پر بعض طبی ماہرین نے تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ پھر کمال یہ ہے کہ سات سال کی عمر کے بچے سے لے کر سو سال کے بوڑھے تک یہ ورزشیں نہایت آسانی کے ساتھ کر لیتے ہیں۔

۹ــــ کعبۃ اللہ پوری انسانیت کی وحدتِ فکر و عمل کی علامت ہے اس زمین پر انسان جہاں کہیں بھی بستے ہیں اپنی ہر نماز میں اسی ایک مرکز کی طرف منہ کر لیتے ہیں۔ یہ عملی مظاہرہ ہے اس پختہ اعتقاد کا کہ اللہ ایک ہے، اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے مسلمان کی گردن سوائے اس ایک خدا کے اور کسی کی اطاعت میں نہیں جھک سکتی، پوری انسانیت نفسِ واحد کی طرح ہے اور وحدتِ قومیت کی بنیاد نظریاتی ہم آہنگی کے علاوہ اور کچھ نہیں جس کسی نے بھی اپنا رخ قبلے کی طرف کر لیا یعنی نظریاتی ہم آہنگی میں شامل ہو گیا وہ بین الاقوامی مسلم برادری کا ممبر بن گیا۔ اور پھر بھی ایسا کہ نسل، وطن، زبان، رنگ وغیرہ کے امتیازات بھی اس قومیت پر غالب نہیں آسکتے۔ قرآن حکیم نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو خواہ وہ کسی بھی خطۂ ارض، نسل یا قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں اِخْوَۃ کہا ہے۔ قریب ترین رشتہ حقیقی بھائیوں کے رشتے کو کہا جاتا ہے۔ بھائیوں کے بعد ایک ہی نسل کے لوگوں کو "برادری" کا لقب دیا جاتا ہے یعنی انہیں بھی بھائی سمجھا جاتا ہے لیکن ذرا دور کے بھائی۔ اس کے بعد دوستی کے رشتے کو زیادہ مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اسے بھی بھائی کے لفظ سے تشبیہ دی جاتی ہے گویا بھائی کا لفظ خون کے رشتے سے لے کر دور کی برادری یا بھائی چارے کی محبت، مودّت، موافقت اور میل ملاپ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایک رواج ہے اور عربوں میں بھی تھا کہ زمین میں گڑھا کھود کر اس میں لوہے کا تار کسی مضبوط اور بھاری پتھر وغیرہ سے باندھ کر ڈال دیتے تھے، اور گڑھے کو مٹی سے اس طرح بھر دیتے تھے کہ تار کا ایک حلقہ سا زمین کی سطح کے باہر نکلا رہتا تھا۔ اس حلقے کے ساتھ بڑا سرزور جانور بھی باندھ دیا جائے یا بہت سے جانور ایک ساتھ باندھ دیئے جائیں تو بھی یہ حلقہ نہیں ٹوٹتا۔ اس حلقے کو عربی زبان میں

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اُخِیّۃ“ کہتے ہیں۔ اس بندھن کو کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی اور جو کوئی بھی اس حلقے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں وہ ایک دوسرے کے اِخْوَان ؓ ہیں۔ نماز اُخِیّۃ ؓ کے اس حلقے کو دن میں پانچ مرتبہ مضبوط سے مضبوط تر بناتی ہے ؛ ہے کہیں دنیا کا کوئی اور عملی نظام جو اخوت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے اس سے بہتر نظام کے طور پر پیش کر سکے واضح رہے کہ نماز مقصود بالذات عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے فرد اور جماعت کے روحانی ارتقا کا، اور اس مقصد کے حاصل کرنے کا جو آفاقی قدروں کو تحفظ دینے میں پوشیدہ ہے۔ اور جس سے انسانی ذات مستحکم اور توانا ہو کر زندگی کی بعد از موت اگلی سطح پر فعال و زندہ رہ سکتی ہے، نماز کی لازمی عملی تربیت سے بلاشبہ اجتماعی اخلاق سنور جاتے ہیں۔ شائستگی اور عادات و اطوار کی پاکیزگی میں نکھار آجاتا ہے اور جمہوری انداز پر ایک دوسرے کی اصلاح اور ترقی میں مدد ملتی ہے۔ استقلال اور استقامت کامیابی کے لئے ضروری عناصر ہیں۔ نماز کی پابندی اور باقاعدگی ان صفات کو فطرتِ ثانیہ بنا دیتی ہے،

۱۰۔ اسلام کی عالمگیر حریت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نماز کے لئے کسی خاص مکان کو یا ساز و سامان کو بھی لازمی قرار نہیں دیا گیا۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے تو جہاں بھی کوئی ہے، ریل میں، کشتی میں، ہوائی جہاز میں، صحراؤں میں، جنگل میں، پہاڑوں میں، سمندروں میں وہیں سربسجود ہو سکتا ہے، پانی میسر نہیں تو پاک مٹی سے تیمم کرے، دو آدمی ہیں ایک امام دوسرا مقتدی بن جائے، بیمار ہے تو بستر پر لیٹے لیٹے ہی اشاروں سے نماز پڑھ لے۔

غور فرمایئے جس قوم کی عبادت کے بارے میں یہ تصور ہو کیا اُسے خاص تنظیموں کی، جماعتوں کی، مجلسوں کی، سوسائٹیوں کی، اداروں کی، کلبوں کی یا انجمنوں کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ جہاں ”نظام الصلوٰۃ“ کیا سیاست، کیا معیشت، کیا تعلیم، کیا اصلاحِ معاشرہ، کیا عدالتی نظام، کیا روزمرہ کی زندگی کے کاروبار، کیا تجارت، کیا بین الاقوامی روابط اور کیا باہمی افہام و تفہیم، غرض زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہو جس میں ہر بات کھلم کھلا آزادانہ ماحول میں ہوتی ہو، جہاں عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کو ہر دوسری بات پر مقدم رکھا جاتا ہو، جس کی بنیاد ہی احترام آدمیت کی بنیادوں پر رکھی گئی ہو۔ جہاں مرکزیت سے کٹ جانا کفر کے مترادف ہو۔ وہاں کسی قسم کی الگ پارٹیاں بنانا کیا معنے رکھتا ہے۔ نماز کا یہ پختہ اور کامل نظام عدل و حریت کا ضامن بن کر باہمی ضبط و تعاون، اعتماد و اخوت کو اتنی تقویت دیتا ہے کہ کسی دوسری تنظیم کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ نظامِ صلوٰۃ خود اتنا سادہ، آسان اور قابلِ عمل ہے کہ ہر شخص اس کو دوام اور استحکام دینے میں فرحت محسوس کرتا ہے۔ خواہ اس کا اپنا سماجی مقام کچھ بھی ہو۔ نماز نے انفرادی طور پر بھی ہر شخص کو براہ راست اپنے رَبّ سے شرفِ تکلّم عطا کر دیا ہے ”مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا“ ارشاد باری تعالیٰ ہے، لہٰذا کسی انسان کسی دیوی، دیوتا یا کسی فرشتے کے درمیانی واسطے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس اعتبار سے ”اسلام“ زندگی کا مذہب ہے جس میں کسی قسم کے ماورائی اسرار و رموز، خفیہ راز دارانہ باتوں اور توہماتی یا طلسماتی منتروں جنتروں کی کارفرمائی نہیں ہے الدین کی اساس عقلیت پر ہے۔ جاہلانہ رسوم پر نہیں ہے، حقائق پر ہے فرضی ڈھکوسلوں اور خیال آفرینیوں پر نہیں ہے زندگی کی منظم دانائیوں اور حکمتوں پر ہے ظن اور گمان اور بے تکی باتوں پر نہیں ہے، اس کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی ٹھیک کرنے کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

چیز ہے انکار کرنے کی چیز نہیں۔ اسے ضبط و نظم کے سادہ اور آسان اصولوں کی پابندی میں آکر گزارنا چاہیئے نہ کہ شتر بے مہار کی طرح انفرادی بے راہ روی یا منتشر خیالی اختیار کرے۔ اس دین کا ہر حکم انسان کی اپنی فلاح اور نشوونما کے لئے کسی بالاتر ہستی کی خوشامد کے لئے نہیں۔ نظام صلٰوۃ پوری انسانیت کے عروج و ارتقا کی آرزو کی تکمیل کا یقینی ذریعہ ہے، اور اسی میں اس کی انفرادیت اور تمام دوسرے مذاہب پر فوقیت و فضیلت کا راز مضمر ہے!

یہ ہے میرے سجدہ ہائے جبینِ شوق کا مقصود و مطلوب وہ نظام الصلٰوۃ جو ظاہری و باطنی، انفرادی اور اجتماعی عبادات نماز، روزہ، حج، زکٰوۃ، جہاد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ارکان کو توحید کی آئیڈیالوجی کے تحت مربوط کر کے عملاً اللہ کی کبریائی کو قائم (ESTABLISH) کر دیتا ہے اور اس طرح بے عیب، بے نقص اور مکمل انداز میں آنکھوں کے سامنے لاتا ہے کہ خود اللہ گواہی دیتا ہے، ملائکہ گواہی دیتے ہیں اور عادل اہل علم جو بے تعصب ہیں اور انصاف پر قائم رہ کر معروضی مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ نتائج کو اپنی آنکھوں سے مشہود ہوتا دیکھ کر (PRAGMATICALLY) گواہی دیتے ہیں کہ واقعی اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو لفظاً معناً اور عملاً اسی طرح قائم و نافذ کیا جا سکتا ہے (۳ : ۱۸)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۲۔ ہماری انفرادی دعائیں

دعا مانگنے، دعا کے منظور ہونے، نامنظور ہونے یا اس پر توجہ نہ دیئے جانے کا مسئلہ فلسفے کی دنیا میں نہایت پیچیدہ اور دشوار مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ دشواری کی بنیاد ان تنقیحات پر ہے جو ایک مفروضہ مثال کو سامنے رکھ کر ذہن میں ابھرتی ہیں۔ مثال یہ ہے کہ فرض کیا زید اور بکر کے درمیان عدالت میں ایک مقدمہ چل رہا ہے جس میں زید مدعی ہے اور بکر مدعا علیہ ہے۔ زید دعا مانگتا ہے کہ یا اللہ مقدمے کا فیصلہ میرے حق ہو جائے۔ اب اس مفروضہ مثال سے جو تنقیحات پیدا ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ اگر انسانوں کے معاملات کے فیصلے اللہ کے ہاں پہلے سے ہی طے ہو چکے ہیں تو کیا زید کی دعا فیصلہ شدہ شکست کو فتح میں بدل دے گی؟

۲۔ اگر بدل دے گی تو کیا اللہ اپنے فیصلوں کو انسانوں کی خواہش کے تابع رکھ کر بیٹھا رہتا ہے؟ کیا اللہ انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ہے؟

۳۔ اگر زید اپنے دعوے میں جھوٹا ہے تو کیا اللہ نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر کے سچے کو اس کے حق سے محروم نہیں کر دیا؟

۴۔ اگر زید سچا ہے تو اسے دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اللہ اپنے آپ سچے کے حق میں فیصلہ نہیں کرے گا؟

۵۔ اس دنیا میں انسان کو ہر کامیابی کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ مقدمہ سچا ہو تو بھی اس کی سچائی کو گواہوں کے ذریعے دلائل و براہین کی مدد سے اور دوسرے شواہد پیش کر کے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زید جو سچا ہے اگر صرف دعا مانگے اور اپنے مقدمے کی پیروی نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائے گا؟ اگر جیت جائے گا تو وہ جو سعی و کوشش کے احکام بار بار دیئے گئے ہیں ان کا کیا فائدہ؟ اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کے کیا معنی؟

۶۔ کہا جاتا ہے کہ دعا بھی ضروری ہے اور دوا یعنی سعی و کوشش بھی ضروری ہے یہ ٹھیک ہے تو پھر اگر دونوں فریق دعا اور دوا میں کمی نہ کریں تو فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ کسی ایک کے حق میں ہوگا۔ تو کیا دوسرے کی دعا اور دوا دونوں اکارت چلی گئیں۔

اس قسم کے بہت سے سوالات ہیں جو عقل پیدا کرتی رہتی ہے لیکن کہیں سے معقول جواب نہیں پاتی۔ اس سے پہلے کہ ہم اس سوال کو عقلیت کی بجائے کسی اور زاویئے سے دیکھیں، خلیفہ ثانی فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول سن لیجئے:

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

فرمایا: "لوگو! مجھے خلافت کا فریضہ اس لئے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اللہ تک پہنچنے سے روک دوں"! اللہ اللہ کیا حقیقت افروز بات سادہ سے چند الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے۔ یہ ان کا قول تھا۔ اب عمل بھی دیکھیے، موافق اور مخالف ہر مؤرخ نے یہ لکھا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رات کو بھیس بدل کر شہر اور نواح کی گشت کیا کرتے تھے۔ اس طرح سے وہ عوام سے ملتے ان کے حالات معلوم کرتے اور انتظامات کو بہتر سے بہتر بناتے چلے جاتے۔ اس پھرنے پھرانے سے بہت سی باتیں انہیں اپنے بارے میں بھی معلوم ہو جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ راستے میں ایک بڑھیا ملی۔ پوچھا کیا حال ہے؟ بولی میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ جیسے تیسے گزر بسر کر رہی ہوں۔ تم بتاؤ خلیفہ عمر کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟" بڑھیا نے حضرت عمر کو نہیں دیکھا ہوا تھا۔ اس لئے نہ پہچان سکی۔ حضرت عمر نے جواب دیا "وہ آج ہی شام کے دورے سے واپس آیا ہے اور مدینے میں ہے" بولی اللہ انہیں سنبھالے رکھے، حضرت عمر نے پوچھا: کیوں کیا بات ہے بڑی بی۔ تم ان سے خفا معلوم ہوتی ہو" بڑھیا نے کہا وہ خلیفہ تو بن بیٹھے ہیں یتیموں، بیواؤں، محتاجوں اور بیکسوں کے وظیفے بھی جاری کر دیئے ہیں۔ لیکن مجھ غریب کو پوچھا تک نہیں حضرت عمر نے کہا بڑی بی تمہارا حال اسے معلوم نہ ہوا ہوگا" بڑھیا نے چیخ کر جواب دیا۔ خوب! مسلمانوں کا خلیفہ بنا پھرتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی مملکت میں کون کس حال میں ہے؟" حضرت عمر بڑھیا کے اس جواب پر کانپ گئے۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ بڑی عاجزی سے کہا: اماں۔ تم اگر اپنی فریاد میرے ہاتھ بیچ دو تو میں تمہیں اس کا معقول معاوضہ بھی دوں گا اور خلیفہ سے تیرا وظیفہ بھی مقرر کرا دوں گا"۔ بڑھیا بڑی مشکل سے بیس درہم پر راضی ہوئی۔ حضرت عمر نے دو گواہ کر لئے کہ اب یہ بڑھیا اللہ تعالیٰ سے میرے خلاف داد خواہ نہ ہوگی"

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اسلامی مملکت کی جو خلافت علیٰ منہاج نبوت ہوتی ہے، ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اور انفرادی دعاؤں کا اللہ تک پہنچنے سے روک دینے کا مطلب کیا ہے۔

انفرادی طور پر مظلوموں اور بیکسوں کو اللہ سے دعا مانگنے کی ضرورت اُس غلط معاشرے میں پیش آتی ہے جس میں عدل اور انصاف کی دھجیاں اڑتی ہیں۔ کوئی بات قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہر شعبے میں دھاندلیاں ہی دھاندلیاں ہوتی ہیں حقدار کو اس کا حق نہیں ملتا۔ غیر مستحق لوگ ناجائز وسائل اور ذرائع استعمال کر کے سب کچھ لے اڑتے ہیں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی معاشرے میں تنہا اور بے سہارا رہ جائے تو اس کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوتا۔ غنڈہ گردی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کسی کی جان، عزت اور مال محفوظ نہیں ہوتا۔ اور نفسا نفسی اس حد کی کہ اگر کوئی چلتے چلتے گر پڑے تو سب اسے روندتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی تو یہ خیال تک نہیں آتا کہ کس کے بچے بھوکے سو گئے ہیں۔ کون صبح کی فکر میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ رہا ہے کون جان بلب دوائی کے ایک قطرے کے لئے ترس رہا ہے۔ کس کے تن پر کپڑا تک نہیں ہے، مریض ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس لئے مر جاتے ہیں کہ مفت علاج کی دعویدار ہسپتالوں میں بھی داخل ہونے کے لئے ان کے پاس پیسہ نہیں ہوتا۔ جہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مفلسی اور ناداری کی دیواریں حائل ہوتی جاتی ہیں جہاں حرص و ہوس کے زیر اثر بہنوں اور بیٹیوں کو جائداد سے محروم رکھنے کی کئی کئی بھیانک تدبیریں سوچی جاتی ہیں جہاں انصاف بکتا ہے علم بکتا ہے۔ علاج بکتا ہے، بہنیں اور بیٹیاں بکتی ہیں۔ عزتِ نفس کو داؤ پر لگا دیا جاتا ہے۔ حمیت اور غیرت کو لعنت سے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

خارج کر دیا جاتا ہے اور اخلاقی قدروں کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے، ایسے جنگھٹے اور بھیڑ بھاڑ کی قسم کے معاشرے میں ہر لمحے آہوں کے دھوئیں اُٹھتے رہتے ہیں۔ فریادوں کی گھٹائیں چھائی رہتی ہیں، ہر طرف سے الغیاث اور الامان کی پکاریں آسمانوں سے ٹکرا ٹکرا کر فضاؤں میں تحلیل ہوتی رہتی ہیں۔ مظلوموں اور بیکسوں کو "دُعا" کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ یہی ایک آخری سہارا اور آسرا بچ جاتا ہے، ان روندے اور کچلے ہوئے انسانوں کے پاس جسے سینے سے لگائے وہ ایک ایک آستانے پر جا کر آنسوؤں کا ہدیہ نچھاور کر کے پیش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ——— نہ کہیں سے آسمان پھٹتا ہے۔ نہ زمین میں کہیں دراڑ پڑتی ہے "اللہ کبھی تو ہماری بھی سنے گا" ایک لمبی ٹھنڈی سانس کے ساتھ ان الفاظ کو شامل کر کے "امید موہوم" محروم اور شکستہ خاطر انسانوں کو تھپکیاں دے دیکر سلا دیتی ہے اور ہر نئی صبح، روزانہ کے معمول کی طرح، نت نئی مایوسیوں کے جلو میں طلوع ہوتی رہتی ہے۔ ہوتا ہواتا کچھ بھی نہیں! ایسا کیوں ہے؟

قرآنی معاشرے میں جس کی ہلکی سی جھلک چشم فلک نے ایک بار دیکھی ہے اور جس کے دوبارہ دیکھنے کی آرزو میں یہ چودہ سو سال سے محو انتظار ہے، اس قسم کی ناہمواریوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس میں فرات کے کنارے اگر کسی کی بکری کا بچہ گم ہو جائے تو سربراہ مملکت کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ عدل و مساوات اور اخوت و حریت کی قدریں کتابوں کے صفحات سے نکل کر بازاروں اور گلیوں کوچوں میں آجاتی ہیں۔ ہر حقدار کو اس کا حق کسی پریشانی اور تردد کے بغیر اپنے آپ مل جاتا ہے، نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ کہیں کوئی دھاندلی ہوتی ہے، قانون کے آگے چھوٹے بڑے سب برابر کے جوابدہ ہوتے ہیں کسی کے دل میں اضطراب، کسی کے ہونٹوں پر آہ، کسی کی آنکھ میں آنسو اور کسی کے ہاتھوں پر کپکپی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ توازن اور تناسب کی حسن کاری ہر لمحے اور ہر جگہ تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ افراد کے مابین فاصلے ختم ہو جاتے ہیں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اور نہ بے سہارا محسوس کرتا ہے ایسے معاشرے میں جہاں زندگی کی ہر بنیادی ضرورت خود بخود پوری ہوتی رہے جہاں ہر فرد معاشرے کی پیداواری استعداد کو بڑھانے کے لئے بیتاب ہو۔ جہاں انصاف، تعلیم اور صحت ہر شہری کے دروازے پر آ کر دستک دے اور جہاں صلاحیتیں ابھر ابھر کر جوہر انسانیت کو تکمیل و ارتقا کی طرف لے جا رہی ہوں۔ وہاں انفرادی طور پر کسی کو خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ مرکز ملت ہی سمیع و بصیر و علیم بن جاتا ہے اور مرکز ملت ہی ربوبیت عامہ کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیتا ہے۔ نہ کوئی بے بس اور لاچار ہوتا ہے اور نہ کوئی خدا سے داد خواہی چاہتا ہے۔ مملکت ہر ایک کی فریاد کو خرید لیتی ہے۔ اور ہر دعا کو خدا تک پہنچنے سے روک لیتی ہے۔

آج ہم بے انصافیوں کے اتنے عادی ہو چکے ہیں اور اسلام کے دعویداروں نے اپنے قول اور عمل کے تضادات سے اتنا مایوس کر دیا ہے کہ ہم روشنی کو بھی اندھیرا سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں یقین ہی نہیں آتا کہ جس قرآنی معاشرے کا مندرجہ بالا تصور ہمارے ذہنوں میں موجود ہے کیا واقعی یہ متشکل ہو بھی سکتا ہے۔ مایوسیوں کی انتہا ہے کہ ظلمتوں کے چھٹ جانے اور صبح نور کے طلوع ہونے کو ہم حلقہ دام خیال سمجھتے ہیں اور اسے تمنائے خام کی تصوراتی منظر کشی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے تاریخ یہی مشاہدہ کرتی آتی ہے کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بیکس و بے بس، یتیم اور بینوا، بے آسرا اور بے سہارا لوگ لمبی لمبی دعائیں رو رو کر اور چیخ چیخ کر مانگتے ہیں لیکن ان کی کوئی تکلیف رفع نہیں ہوتی بلکہ مصیبتیں اور

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ ان کی آہ و فغان پر بھی تازیانے برستے ہیں۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے سہتے کٹ جاتی ہے لیکن کوئی ان کی فریاد کو نہیں پہنچتا۔ کوئی ان کی داد رسی نہیں کرتا۔ لہٰذا ان ٹھوس شواہد کے ہوتے ہوئے اب کون یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوگا کہ اللہ ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے۔ اگر کوئی جرأت کرکے حرفِ شکایت زبان پر لائے بھی تو اس کی زبان یہ کہہ کر بند کر دی جاتی ہے کہ میاں! اللہ سنتا سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو تمہارے لئے بہتر ہوتا ہے۔ چپ کرکے مصیبتیں سہتے رہو کیونکہ یہی تمہارے حق میں اچھا ہے! اللہ جس حال میں رکھے اسی میں خوش رہو۔ شب سمور بھی گزر جائے گی اور شب تنور بھی گزر جائے گی۔ اگلے جہان میں حور و قصور سب تمہارے لئے ہیں۔

آہ کتنا بڑا فریب ہے جس میں ناداروں کو مبتلا رکھا جاتا ہے! اس خود فریبی کی آڑ میں باور یہ کرایا جا رہا ہے کہ یہ جو ظلم و ستم تم پر ڈھائے جا رہے ہیں یہ اللہ کی منشا اور مرضی کے عین مطابق ہیں۔ اس لئے نہ ان کے خلاف لب کشائی کرو اور نہ اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچو۔ انسان کے تین ازلی دشمنوں کا ذکر پہلے آچکا ہے ان کا ناپاک حلقہ اسی قسم کے عقیدے وضع کرکے سادہ لوح لوگوں میں پھیلاتا رہتا ہے۔ دورِ ملوکیت میں یہ بات ذہنوں میں بٹھا دی گئی تھی کہ بادشاہ زمین پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے (عیدین کے خطبے میں اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ کے الفاظ ابھی تک دہرائے جا رہے ہیں) چنانچہ زمین پر جس قسم کا "سایہ" لوگوں نے مختلف سلطانوں کا دیکھا انہوں نے اسی وضع قطع اور مزاج و طبیعت و عادات و اطوار والے "اصل" کو آسمانوں پر تصور کر لیا۔ یعنی یہاں کے سلاطین (بادشاہ، سردار، وڈیرے، حاکم وغیرہ) کی طرح اللہ بھی مطلق آمر ہے۔ جس کا نہ قاعدہ قانون ہے نہ کوئی اصول جس کو چاہے بیگناہ پکڑ لے جس کو چاہے نواز دے۔ اس کا بھی دربار ہے جس میں حاجب ہیں، مصاحب ہیں، امراء و وزراء ہیں۔ کسی کو یہ اجازت نہیں کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطانِ معظم تک پہنچا سکے، درمیانی واسطوں کو نذر و نیاز دے کر راضی کرو وہ سفارش بھی کریں گے اور درخواست بھی پہنچا دیں گے یا منظور کرا دیں گے۔ راہبانیت یعنی پیشوائیت نے اپنی گدیوں کو تحفظ دیتے ہوئے یہ عقیدہ پھیلایا کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا صرف اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے جس طرح کسی بااختیار حاکم تک رسائی دربانوں، چپڑاسیوں، اردلیوں وغیرہ کے بغیر نہیں ہو سکتی اسی طرح خدا تک بھی جو تمام حاکموں کا بھی حاکم ہے۔ پیروں اور فقیروں کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا۔ پھر ان پیروں، فقیروں کے اختیارات کو اتنا بڑھا چڑھا کر بتایا گیا اور انہیں تصرفات کا نام دیا گیا کہ اہلِ توحید الامان پکار اٹھے۔ یہاں تفصیل تو نہیں دی جا سکتی صرف ایک کتاب ارشاداتِ فریدی کے حوالے سے ان پیروں فقیروں کے دو اختیارات بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "جب کوئی شخص اس قدر بیمار ہو جائے کہ بچنے کی کوئی امید نہ رہے تو کوئی اور شخص اپنی زندگی کا کچھ حصہ دے کر اس کی جان بچا سکتا ہے۔ ملک الموت کے نزول ہونے سے پہلے شیخ وقت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ بغیر عوض اور بدل کے بھی مرنے والے کو زندگی دے سکتا ہے صفحہ ۴۹۳

۲۔ ایک اور چیز حیات ضمنی بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا اجل آچکا ہے شیخ اسے اپنے ضمن میں لے لیتا ہے۔ یعنی اگرچہ درحقیقت وہ مر جاتا ہے لیکن وہ زندوں کی طرح رہ جاتا ہے۔ شیخ کی توجہ ہٹانے سے وہ زندہ نما مردہ گر پڑے گا۔ اور مر جائے گا۔" (۴۹۴)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ان عقائد نے جو گل کھلائے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لوگ قرآن حکیم کا یہ واضح ارشاد تک بھول گئے کہ:

"جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں
میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں . . . . . لیکن شرط یہ ہے کہ . . . . . تم بھی
میری باتوں کا جواب دو۔ مجھ پر پورا پورا یقین رکھو۔ اس طرح کامیابی کا راستہ تمہارے سامنے
آ جائے گا" (۲:۱۸۶)

ذرا عقل عامہ کو استعمال کر کے اتنی سی بات بتا دیجئے کہ جو خدا انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہو (۵۰:۱۶) اس تک پہنچنے کے لئے بھی کسی "درمیانی واسطے" کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟

اللہ کے لفظ سے، اس کے معنی اور مفہوم سے اہلِ قریش اور کفارِ عرب بخوبی واقف تھے۔ وہ بتوں کی پوجا اس لئے کرتے تھے کہ ان کے نزدیک یہ اللہ کے زیادہ قریب تھے۔ لہٰذا ان بتوں کے توسط سے وہ اپنی مرادیں پوری کرانا چاہتے تھے۔ اسلام نے براہِ راست اللہ سے رابطہ قائم کر کے اللہ اور بندے کے درمیان حائل ان درمیانی واسطوں کو نکال ڈالا۔ اور پیشوائیت، ملوکیت اور قارونیت کی جڑ کاٹ ڈالی۔ لیکن افسوس اس کٹی ہوئی جڑ کو جونہی مجوسیت، فلاطونیت، عیسائیت اور ہندو فلسفے کی مٹی، پانی اور ہوا ملی مردہ اصنام کی جگہ زندہ اصنام وجود میں آ گئے اور تجسیم کی شائق عقل تجرید سے ہٹ کر پھر متعددین کی طرف لوٹ آئی۔

دعائیں قبول ہوتی ہیں اور ضرور قبول ہوتی ہیں۔ لیکن کن کی؟ صرف ان کی جو خدا پر ایمان بھی لاتے ہیں اور عمل صالح بھی کرتے ہیں (۴۲:۲۶) اور عمل صالح "عملیات" نہیں بلکہ وحی ربانی کی لفظ بلفظ پیروی ہے۔

جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے (ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی) وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے (۴۰:۶۰)

اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (۷:۵۵)

قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرنے والوں کی دعائیں بے کار جاتی ہیں (۴۰:۵۰)

جو لوگ سچے دل سے ایمان لاتے ہیں ان کی پہچان یہ ہے کہ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کئے جاتے ہیں تو وہ فوراً ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں، اور پھر خدا کی صفتِ ربوبیت کو وجہِ حمد بنانے کے لئے پوری جد و جہد کرتے ہیں اور کسی بھی حالت میں اطاعتِ خداوندی سے سرکشی اختیار نہیں کرتے۔ یہ لوگ اس سعی و عمل میں راتوں کی نیند اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں اور اس طرح بیم و رجا کی دونوں حالتوں میں اللہ کو پکارتے ہیں اور جو رزق بھی اللہ نے ان کو دے رکھا ہے اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں (۳۲:۱۵،۱۶)

جب عابد کا رشتہ بے لوث اطاعت اور بے چون و چرا فرماں برداری کے ذریعے اپنے معبود کے ساتھ تسلیم و رضا کی حد تک قائم ہو جاتا ہے تو پھر دعاؤں کا انفرادی رنگ بھی غائب ہو جاتا ہے آرزوئیں "میں" اور "میری" سے آگے بڑھ کر "ہم" اور "ہماری"

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے مرکز پر جم جاتی ہیں ۔ اور پھر جو حرفِ تمنا دُعا بن کر ہونٹوں تک آتا ہے وہ یہ صورت اختیار کرتا ہے۔

اے ہمارے نشوو ارتقا دینے والے! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے نقصان دہ نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا۔ ہماری چھوٹی چھوٹی تقصیروں اور تدبیری غلطیوں کے اثرات مٹاتے رہنا۔ ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کر جن کے سامنے زندگی کی راہیں کھل چکی ہیں۔

اے ہمارے نشوو ارتقا دینے والے! تم نے ہمیں اپنے رسولوں کے ذریعے جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کر رکھا ہے ان سے ہمیں بہرہ یاب کیجو۔ اور ایسا کیجو کہ جس وقت اعمال کے نتائج ظاہر ہوں اس وقت ہم دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جائیں، ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کرتا (۱۹۳ تا ۱۹۴ : ۳)

دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا، دعاؤں کی قبولیت کی شرائط کو بھی آپ نے سمجھ لیا۔ آرزوؤں کی رُوح سے بھی آپ شناسا ہو چکے ہیں اب دیکھیے اللہ ان پکاروں کا جواب کس طرح دیتا ہے۔

(ہم نے تمہاری دعاؤں کو سن لیا ہے) لیکن یاد رکھو کہ "ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں (۳:۱۹۴)

یہ دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط ہے جب تک صفا اور مروہ کی پہاڑیوں اور بلندیوں اور پستیوں میں ایک اضطرابی کیفیت دل کے اندر لے کر آپ دوڑیں گے نہیں جب تک پاؤں مار مار کر آپ زمین کا سینہ چیر نہیں دیں گے آپ کی تمناؤں کے زمزم کا چشمہ نہیں پھوٹے گا۔

قرآن حکیم میں مومنین کی بہت سی دعائیں درج ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی انفرادی مقصد کی دعا نہیں ہے، سب کی سب اجتماعی دعائیں ہیں، مثال کے طور پر یہاں چند دُعائیں درج کی جاتی ہیں۔ ان کو دیکھیے اور مومنین کے مقاصد اور تمناؤں کی گہرائیوں میں اتر کر انسانیت کی عظمت کو پہچانیے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پہچان زید اور بکر کے درمیان مقدمے بازی کی مثال جو شروع شروع میں ہم نے پیش کی تھی اس کے سمجھنے میں بھی آپ کی کوئی مدد کرے۔

مومنین کی قرآنیہ دُعاؤں کے چند نمونے یہ ہیں :۔

۱۔۔۔ رب العالمین سے سیدھی ہموار راہ پر چلنے کی دعا (۱:۵-۷)

۲۔۔۔ (ربنا) دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا کر اور آخرت میں بھی (۲:۲۰۱)

۳۔۔۔ (ربنا) بھول چوک سے اگر ہمارا قدم غلط سمت کو اُٹھ جائے تو اس کے نقصان سے ہماری حفاظت کر دے ہماری قوتوں میں ایسا اضافہ کر دے کہ ہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں ہماری نشوونما کا سامان عطا کر دے اور ہمیں ان لوگوں پر غلبہ اور نصرت عطا کر دے جو تیرے قوانین سے انکار کرتے ہیں (۲:۲۸۶)

۴۔۔۔ (ربنا) صحیح راستہ مل جانے کے بعد ہمارے دل غلط سمت کو نہ مڑ جائیں ہمیں سامانِ نشوونما ملتا رہے (۳:۷)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۵۔ مجاہدین کی دعائیں، (ربنا) سہواً لغزشوں کے نقصانات سے حفاظت، ثابت قدمی اور کفار پر کامیابی (۲:۱۴۶)
اس طرح انہیں دنیا اور آخرت کی خوشگواریوں میں حصہ مل گیا (۲:۲۵۰)۔ (۳:۱۴۷)

۶۔ مومنین کی دعائیں جو کارگہ کائنات میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (۳:۱۹۱-۱۹۴)۔ دعا کی قبولیت یہ کہہ کر کہ میں کسی کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتا (۳:۱۹۴)

۷۔ جلب منفعت اور دافع مضرت میں خدا کو پکارنا۔ یہ لوگ اپنے رزق کو دوسروں کی ضروریات کے لئے عام رکھتے ہیں (۳۲:۱۶) یہ لوگ قوانینِ خداوندی سے سرتابی نہیں برتتے (۳۲:۱۵-۱۶)

۸۔ صالحین کے زمرے میں شامل ہونے کی آرزو (۵:۸۳) قوم ظالمین کے ساتھ شمار نہ ہو (۷:۴۷)

۹۔ سہواً لغزش کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ رکھنے کی دعائیں۔ ان مومنین کی خصوصیات (۳:۱۵-۱۶) مومن خدا کو پکارتے تھے۔ یہ جنت میں ہوں گے۔ (۵۲:۲۸)

۱۰۔ مکہ کے مظلوم مسلمانوں کی پکار کہ ہمیں اس بستی سے نکال لے اور ہماری مدد کر، اس کے جواب میں مدینہ کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے (۴:۷۵)

۱۱۔ حضرت عیسیٰ کی دعا کہ انہیں خدا اپنی طرف سے رزق عطا کرے۔ انہیں رزق کے لئے انسانوں کا محتاج نہ ہونا پڑے نظام ایسا متشکل ہو کہ رزق کے لئے کسی انسان کی محتاجی نہ رہے (۵:۱۱۴-۱۱۲)

"دعا" آرزو کی بیداری کا نام ہے۔ جتنی گہرائی اور شدید تمنا اتنی پُرخلوص دعا۔ جتنی قوی اور عمیق آرزو اتنی پرکیف پکار اور پھر جس قسم کی آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی اور جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اسی قسم کا زاویہ نگاہ!

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اپنے گرد و پیش نئے زاویہ فکر پر نظر ڈالو ساری دنیا بدلی ہوئی دکھائی دے گی۔ دل کے اندر نورانی قمقمے جگمگا رہے ہیں تو ساری دنیا مہر منور کی طرح رخشاں و تاباں نظر آئے گی۔ ظلمت کدۂ دل میں اندھیرے دل کے پردے پڑے ہوئے ہیں تو ہر طرف سیاہی ہی سیاہی روح پر گھیرے ڈالتی دکھائی دے گی۔ آرزو میں جس قدر ارتکاز بڑھتا جائے گا اسی قدر اس کی قوت اور توانائی میں اضافہ بھی ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ پھر عشق کی ایک ہی جست زمین اور آسمان کی بے کرانیوں کو طے کر جائے گی انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن حکیم نے صحیح آرزو کا جو معیار رکھا ہے وہ یہ ہے:

"تم وہی چاہو جو اللہ چاہتا ہے" (۸۱:۲۹)

تسلیم و رضا اور عبودیت و اطاعت کی معراج اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ "عبد" بھی اسی رنگ میں ڈوب جائے جو اس کے معبود کا رنگ ہے۔ معبود بے رنگ ہے تو عبد بھی بے رنگ ہو جائے۔ معبود کی جو مرضی ہو عبد کی بھی وہی رضا ہو۔ جسے محبت یا عشق کہتے ہیں اس کے کوئی اور معنے تو نہیں ہیں۔ عبد تیر پھینکے تو معبود کہے تم نے نہیں پھینکے تھے۔ میں نے پھینکے تھے۔ قرآن حکیم جو ایک بے عیب اور اکمل ضابطۂ زندگی ہے اپنی متابعت کرنے والے کو وہی کچھ بتاتا ہے جو اللہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

چاہتا ہے اور اللہ کیا چاہتا ہے؟ اللہ انسان کی فوز و فلاح چاہتا ہے، اس کے لئے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً چاہتا ہے۔ اور فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً چاہتا ہے۔ اس کی انسانی ذات کی تکمیل چاہتا ہے جو اسے زندگی کے آئندہ مدارجِ ارتقا طے کرنے کے قابل بنا سکے۔

انسانی سیرت و عمل کا نقطۂ آغاز ہی یہ ہے کہ اس کے دل میں وہی آرزوئیں پیدا ہوں جو منشائے ربی کے عین مطابق ہوں۔ کیونکہ ارتقائے ذاتِ انسانی کا راستہ صرف صفاتِ ربانی کو اپنے اندر جذب کرتے چلے جانا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انسانی ذات کو صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ یعنی علم، عقل، جذبات اور ارادہ، انسان ان کا مالک ہے، غلام نہیں ہے۔ اگر یہ ان غلاموں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے تو اس کی آرزوئیں بھی بدل جائیں گی اور اس کی دعائیں بھی ذاتی اور انفرادی نوعیت کی ہو جائیں گی۔ یہ وہی کچھ چاہنا شروع کر دے گا جو علم اس کے لئے چاہے گا، یا عقل اس کے لئے چاہے گی یا جذبات اس کے لئے چاہیں گے یا اختیار و ارادہ اس کے لئے چاہے گا۔ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ علم اس کا ناقص ہے، عقل سہو و آزمائش کا دلدادہ ہے، جذبات سرکش ہیں، اختیار و ارادہ محدود ہے۔ پس جب یہ کامل، پختہ اور یقینی، عدیل اور علیم اور رحمان اور رحیم ذاتِ لامحدود سے رشتہ کاٹ کر اپنے ہی کمزور غلاموں سے جوڑ دے گا تو پھر انفرادی طور پر ذاتِ انسانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی۔ کیونکہ ان غلاموں میں جو اس کے آقا بن گئے ہیں وحدتِ عمل کا فقدان ہے، اور اجتماعی طور پر معاشرہ نفسا نفسی میں بٹ جائے گا۔ کیونکہ یہ چاروں "آقائے بے فہم" اسی فرد سے خلوص اور وفاداری رکھتے ہیں جس کی ملکیت میں یہ ہیں۔ نفسا نفسی کا مطلب یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں افراد بھی باوجود ہم رنگ، ہم وطن اور ہم نسل ہونے کے محض ایک انبوہِ کثیر کی حیثیت رکھیں گے اور قوم یا ملت نہ بن سکیں گے۔ اس کے برعکس قرآنی معاشرے میں چونکہ ہر فرد کی آرزو اور طلب مشیتِ ربی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اس لئے مومن جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، جو مانگتا ہے وہی پاتا ہے۔ اس کے سینے میں مقدس آرزوؤں کا وفور ہوتا ہے، نگاہوں کے سامنے واضح نصب العین، قلب کے اندر حصولِ مقصد کی تڑپ، بازوؤں میں سعی و عمل کی بے چینی، قدموں میں استقلال و استقامت اور علم و عقل، جذبات اور ارادے میں متابعت کی یکجہتی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی ہے وہ مقام جہاں انسانی ذات صفاتِ ربی کی آئینہ بن جاتی ہے۔ اس کے خیالات، مقاصد، آرزوئیں ارادے، زاویہ ہائے نگاہ اور سعی و عمل سب ایک مرکز پر جمع رہتے ہیں۔ نہ کوئی خواہش غیر تسکین یافتہ رہ کر لاشعور کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور نہ کوئی ذاتِ انسانی کا توڑ پھوڑ کرنے والی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ مومن کی "دعا" زندگی کے دوراہے پر قانونِ خداوندی کو آواز دینے کا نام ہے۔ رحمان اور رحیم کے اسم سے استمداد طلب کرنے کا نام ہے اور رَبِّي قَرِيبٌ کو چشمِ حقیقت بین سے دیکھ لینے کا نام ہے، اللہ کا کلام آپ کے پاس موجود ہے جو کوئی اس زندہ اور دائم پائندہ کلام کو علم، بصیرت اور تطہیرِ فکر و نظر سے سمجھنے اور اسے دل کی گہرائیوں میں پیوست کرنے کی پُرخلوص کوشش کرتا ہے تو وہ اس زندہ و پائندہ کلام کی بارگاہ سے اپنی دعاؤں کا جواب بھی پا لیتا ہے اسی لئے تو اس کلام کو قرآنِ ناطق کہا گیا ہے۔

اب آئیے دعا کے فلسفے کو ایک اور انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"دعا" منطقی نتیجہ ہے اس ایمان اور یقین کا کہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

١۔ اللہ کا نور ہی ارض و سماوات کا نور ہے
٢۔ اللہ ہی اس کائنات کی زندگی ہے
٣۔ ہم میں سے ہر شخص کا وجود، اس کی زندگی اور اس کا عمل اسی قادرِ مطلق کی ہستی سے وابستہ ہے اور
٤۔ ہر وہ چیز جو وجود رکھتی ہے، خواہ یہ وجود کسی بھی قسم کا ہو، اُسی کے امر کے تابع ہے

اگر "زندگی" محض ایٹمی ذرات سے اتفاقی حادثات کے نتیجے میں ظہور پذیر نہیں ہوئی بلکہ اس کے پیشِ نظر ایک واضح مقصد اور متعینہ منزل ہے اور زندگی کا دریائے تند و تیز حقیقتِ کبریٰ ہی کے سرچشمے سے جاری ہوتا ہے تو پھر اس مقصد کا شعور رکھنا بھی لازمی ہو جاتا ہے تاکہ "زندگی" اپنے آپ کو اسی مقصدیت کے سانچے میں ڈھال کر ہموار اور متوازن راہوں پر چل نکلے۔ انسان ایک کل کا جزو ہے کوئی جزو اپنے کل کے اغراض و مقاصد اور عوامل و عواطف سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے طبعی جسم پر غور کیجئے اس کے تمام اعضاء و جوارح اسی وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک ان کی فعالیت پورے جسم کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ رہتی ہے اگر کوئی عضو، یعنی کل کا جزو، بھی اپنے جسم، یعنی کل کے مقاصد سے منحرف ہو جائے تو اس کی اپنی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ تاہم انسان صرف طبعی جسم یا اعضاء و جوارح کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک اور کل کا بھی جزو ہے جو جسمانی نظام سے ماورا روحانی یا اخلاقی نظام ہے۔ یہ نظام حواسِ خمسہ کے ادراک سے تو ماوراء ہوتا ہے لیکن کائنات کے عقلی مشاہدے سے اس کا سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ فرد کا تعلق انسانی معاشرے سے وہی ہے جو کسی نامیاتی جزو کا اپنے کل سے ہوتا ہے کیونکہ فرد اپنی ذہنی اور اخلاقی زندگی اسی کل سے حاصل کرتا ہے، جنگل میں کوئی راستے کے دائیں کنارے چلے، بائیں کنارے چلے یا عین وسط میں چلے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن معاشرتی زندگی میں ضوابطِ شاہراہ کی پابندی کرنے پر مجبور ہے: اسی سے اس کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کی دوسری قدروں کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ قدریں اسے اپنے کل سے ملتی ہیں۔ اگر ہم فرد کو معاشرے سے الگ کر کے دیکھیں تو اس کی انفرادی حیثیت سے ہم اس کے ٹھوس وجود کو کبھی ثابت ہی نہیں کر سکیں گے۔ یہ صرف تجریدی تصور ہی رہ جائے گا۔ لہٰذا فرد کی زندگی کی اصل حقیقت کو ہم ماورائے محض ہی کہہ سکتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ انسان جسمانی طور پر بھی ایک "کل" کا "جزو" ہے اور روحانی یا اخلاقی قدروں کے اعتبار سے بھی معاشرے نام کے ایک اور کل کا جزو ہے۔ ذرا مزید غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے وجود کے جتنے متنوع پہلو ہیں ان میں ہر پہلو اپنی نوعیت کے کسی اور کل کا جزو ہے، تاہم ان سب سے بڑا "کل" جس میں تناسب اور توازن اپنے عروج پر پہنچا ہوا ہے اور جس کے پختہ قوانین کی گرفت سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی آزاد نہیں ہے مادی اور اخلاقی دونوں اعتبارات سے پوری کائنات ہے جسے قرآنِ حکیم نے اقطار السموات کہا ہے، ہر انسان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس مادی کائنات کے کل کا بھی قریب زاویئے سے مطالعہ کرے، اس کے قوانین کو پرکھے اس کے اندر تخلیق و ارتقا کے جو قوانین جاری ہیں ان کو جانے اور پہچانے اس کے اغراض و مقاصد کا علم حاصل کرے اور ان کے ساتھ مکمل ہم آہنگی پیدا کرے۔ ارتقا اور تخلیق کے قوانین سے ہم آہنگی پیدا کرنا بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم جسمانی صحت برقرار رکھنے کے لئے تندرستی کے قوانین اور نشوونما کے اصولوں سے ہم آہنگ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کوشش سے ہمیں اچھی صحت، توانائی اور زندگی کی خوشگواریاں مل جاتی ہیں۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جسم کے کل اور اعضاء کے جزو، معاشرے کے کل اور فرد کے جزو، نیز کائنات کے کل اور وجود انسان کے مختلف پہلوؤں کے جزو ہونے کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ہر کل اور جزو کا تعلق "باہمی لین دین" کے اصول پر قائم ہے یعنی جزو اگر کل سے کچھ لیتا ہے تو اسے دیتا بھی ہے آیت (۲:۱۸۶) کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔

"اور اے پیغمبر جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو)
میں تو تمہارے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا
ہوں۔ پس ان کو بھی لازم ہے کہ میرے احکام مانیں۔ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ صحیح رستہ پائیں۔"

وہ کیسا غلام ہے جو آقا سے مانگتا رہے اس سے بیشمار نعمتیں حاصل کرتا رہے لیکن آقا کی اطاعت نہ کرے اس کا حکم نہ مانے اس کے تابع فرمان نہ رہے؟ ہم اپنے ہاں بھی ایسے ملازم کو نمک حرام، کام چور، مفت کی روٹیاں توڑنے والا، بے فرمان اور سرکش کہتے ہیں۔ اور اس کی کسی بات کو وقعت نہیں دیتے۔ جزو اور کل کے تعلقات جو اب تک ہمارے سامنے آئے ہیں ان کی صورت کچھ یوں بنتی ہے

ایک سطح پر ہم مادی کائنات کے جزو ہیں
دوسری سطح پر ہم حیاتیاتی نظام کے جزو ہیں
تیسری سطح پر ہم معاشرتی کل کے جزو ہیں
چوتھی سطح پر اس روحانی کل سے وابستہ ہیں جو مادی اور روحانی تمام موجودات کی حیات فعال ہے

یعنی اللہ" جو تمام نظامات کی حیات جاوید ہے۔ ہم بحیثیت افراد اپنا وجود، اپنا تشخص اور اپنے افعال و اعمال بھی وجود واجب سے حاصل کرتے ہیں۔

جزو اور کل کے روابط کے سلسلے میں دوسری بات جو مشاہدے میں آئی ہے یہ ہے کہ جب کوئی جزو یا عضو بیمار پڑ جاتا ہے تو "کل" کی تمام حیات بخش قوتیں اس کی مدد کو دوڑ پڑتی ہیں۔ گویا عضو وہی صحیح معنوں میں زندہ ہے جو اپنے آپ کو اپنے پورے جسم یعنی کل سے پیوستہ رکھے۔ جو شاخ اپنے درخت سے کٹ کر علیحدہ ہو جاتی ہے وہ سوکھ جاتی ہے۔ ہم انسان بھی اگر اپنے روحانی ماخذ و منبع سے منقطع ہو جائیں (اطاعت نہ کریں) تو ہماری روح بھی شاخ بریدہ کی طرح مرجھا جائے گی۔ باہمی لین دین کا جو قانون جسم کے اندر جاری ہے، فرد اور فرد کے درمیان جاری ہے، فرد اور معاشرے کے مابین جاری ہے، وہی انسان اور اس کے "کل"، یعنی سرچشمۂ خیر و خوبی کے درمیان بھی جاری ہے اور جاری رہنا چاہیے۔

دعا اس حقیقت کے شدید احساس کا نام ہے کہ ہم اللہ کی حیات میں ہی زندہ ہیں اس سے الگ نہیں ہیں۔ اس احساس سے ہمیں صحیح پرورش مل سکتی ہے کیونکہ اللہ پرورش اور نشو و نما دینے والا ہے۔ لیکن اس کا عطا کردہ سامان پرورش و بالیدگی ہمیں اس وقت نشو و نما دے سکے گا جب ہم اس کے ساتھ پیوستہ و مربوط رہیں گے کل کی زندگی میں وہی جزو شراکت کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو کل کی وحدت میں ضم سمجھے۔ اس شراکت اور انضمام کے نتائج ہمارے وجود کے ہر حصے سے ظاہر ہونے چاہئیں دعا کا تعلق اس روحانی نظام کی "زندگی" سے ہے جو شدید آرزو کے تخلیق سے ربط قائم رکھنے والے افراد کو سہارا دیتی ہے،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور انہیں زندگی عطا کرتی ہے۔ دعا اظہار کا ایسا انداز یا طور (MODE OF EXPRESSION) ہے جس کے ذریعے محدود غیر محدود کے ساتھ رابطہ قائم کرتا ہے قرآن حکیم کے ان الفاظ کا کہ "اللہ نے انسان کے اندر اپنی روح پھونک دی ہے" مطلب یہی ہے کہ روحانی نظام کی مرکزی قوت کی حیات نے فردِ بشر کے ساتھ گہرا اور اہم رشتہ استوار کر لیا ہے۔

اگر ہم انسانوں کا وجود بھی دوسری مخلوقات کے وجود کی طرح بے شعور ہوتا تو ہماری ہستی اللہ کی ہستی میں اسطرح ہوتی جسطرح جنین رحمِ مادر میں ہوتا ہے اور اپنی ربوبیت خودکار نظام کے تحت اپنے آپ حاصل کرتا رہتا۔ بالفاظِ دیگر اس میں ہماری اپنی ارادت کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ہم شعور اور اختیار وارادے کے مالک ہیں حیوانوں کی زندگی محض جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے تک محدود رہتی ہے، لیکن انسانی ذات اس قسم کی زندگی سے بالاتر مقام کا تقاضا کرتی ہے، اگر انسان اس تقاضے کے مطابق زندگی کی نمو کا خواہشمند رہتا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کے ہر فعل اور ہر عمل سے انسانی سطح کی زندگی کا اظہار ہو تو اسے "روحِ کائنات" کے ساتھ اپنے رشتے کو فی الواقعہ محسوس کرنا ہوگا کیونکہ ہی او صرف اسی رشتے کی بدولت وہ زندگی اور روشنی حاصل کر سکتا ہے۔

ہر صحیح اور ترقی یافتہ علم معروضِ اشیاء سے پیچھے چھوڑ کر مجرد تصورات کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ اسی کو تہذیبِ دانش کہتے ہیں۔ حیوانات کی سطح پر رہنے والی "غیر مہذب" اقوام اپنے جذبات، بیم و رجا کو متعدد پیکر عطا کرکے انہیں اپنا "خدا" بنا لیتی ہیں پھر ان کا تخیل ان خداؤں کو قسم قسم کی قوتوں سے آراستہ و پیراستہ کر دیتا ہے۔

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے، جو اپنی پست خواہشات کو اپنا معبود بنا لیتا ہے؟" (۲۵:۴۳)

چنانچہ اس سوال کا جواب کہ کون کس قسم کی دعا مانگتا ہے۔ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ خدا کے بارے میں اپنے ذہن میں کیا تصور رکھتا ہے۔ اگر وہ خدا کو عام دنیاوی بادشاہوں کی طرح مطلق العنان آمر اور جابر بادشاہ سمجھتا ہے تو وہ دنیاوی درباروں کی طرح اس کے دربار کو بھی تخت و تاج، مصاحبین، درباریوں، دربانوں، خوشامدیوں اور خاص رسائی رکھنے والوں سے سجائے گا اور خود بھی وہی کچھ کرے گا جو وہ سائلین اور فریادیوں کو ان درباروں میں کرتے دیکھتا ہے بلکہ احمد اور محمود کے فیصلے میں بھی وہی سوالات اُبھریں گے جو ہم نے اوپر درج کئے ہیں۔ اس سطح پر سوچنے والے ذہن کو "دعا" سے جھوٹی نفسیاتی تسلی سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔

بعض قبائل میں تو یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ بار بار کی منت سماجت، خوشامد اور چڑھاوے چڑھاتے رہنے کے باوجود بھی اگر کسی مجسّم خدا نے ان کی مطلوبہ چیز کی خواہش پوری نہیں کی تو پجاری نے اُس "خدا" کی گردن میں رسی ڈال کر اُسے پٹخ دیا اور سرِعام اسے بُرا بھلا کہا۔ گویا اس سطح کے ذہن کے انسان کا خدا صرف وہی خدا ہے جو اس کی ہر قسم کی خواہش پوری کرتا رہے۔ اس طرح ناپختہ روحانی رجحانات کے بعض لوگ اس کے باوجود کہ وہ خدا کو قادرِ مطلق بھی مانتے ہیں اور حاضر و ناظر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ سمیع و بصیر، رحیم اور علیم اور قاضی الحاجات ہے پھر بھی اس سے چھوٹے چھوٹے مادی مفادات مانگتے رہتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ خدا ان کے عارضی، لمحہ بہ لمحہ بدلنے والی خواہشات اور انفرادی نوعیت کے مفادات کی خاطر قانونِ فطرت کے مقررہ راستوں کو بدل دے۔ اگر خدا ایسی تمام دعاؤں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پوری کرے تو انسانی زندگی بھی دُو بھر ہو جائے اور وجودِ عمومی کا سارا انتظام تلپٹ ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ انسان کی ذاتی خواہشات نہ تو مستقل ہوتی ہیں، نہ باہم مربوط ہوتی ہیں اور نہ قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہوتی ہیں جس کی یکسانی اور ہمواری پر خود زندگی کا دارومدار ہے۔ لہٰذا ایمان کامل کو ایسی چیزیں طلب کرنا نہیں سکھایا گیا جو صرف اس کی اپنی ذات کے لئے ہوں یا جنہیں وہ اپنے طور پر صحیح سمجھتا ہو۔ اگرچہ ایسی چیزیں مانگنے سے منع بھی نہیں کیا گیا جن کے صحیح ہونے کا مانگنے والے کو یقین ہو لیکن جو دعا مقرر کر دی گئی ہے اور جسے ہم دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں کم از کم اڑتالیس مرتبہ دہراتے ہیں۔ صرف صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کی دعا ہے۔ انسان کی خواہشات اور مقاصد کی قدر و قیمت ہمیشہ کم و بیش ہوتی رہتی ہے اس لئے کوئی بھی پورے وثوق کے ساتھ مطلوبہ چیزوں کے صحیح ہونے کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ارشاد ربانی ہے:

"ہو سکتا ہے کہ تم جس چیز کو ناپسند کرتے ہو وہی تمہارے لئے اچھی ہو اور جس چیز کو تم مرغوب سمجھتے ہو وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہو" (۲:۲۱۶)

"دُعا" کا نفسیاتی پہلو ایک یہ بھی ہے کہ جس حاکمِ اعلیٰ، واحد اور لاشریک ہستی کو انسان اپنی آرزوؤں کا آخری ملجا و ماوا سمجھتا ہے اور اسی ایک کے حضور سربسجود رہنے کو اپنا مقصود و منتہا جانتا ہے اگر وہ اسی سے اپنی مرادوں کی تکمیل کی دعا کرتا ہے تو یہ انسان کی اپنی عظمت کی دلیل ہے۔ کتنا اونچا ہو جاتا ہے اس شخص کا جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ یہ کہتا ہے۔ کہ "اے اللہ! میں بڑے بڑے دعویداران عطا و بخشش کو چھوڑ کر صرف تیرے در پہ مرادوں کا کشکول لے کر آیا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صرف تیری عطا بے حد و بے غایت و بے لوث ہے۔ دنیا کے تمام سخیوں کو میں آزما چکا ہوں، ماں کی ربوبیت، محبت اور رحمت کو بھی غرض کے شائبے سے پاک نہیں دیکھا۔ باپ، بھائی، بہن، اقربا، جگری دوست، رفاقت کا دم بھرنے والے، خیر خواہی کا دعویٰ کرنے والے، بڑے بڑے سخی داتا فقیروں سے لیکر بادشاہوں تک سب کے سب کسی نہ کسی چھوٹی بڑی غرض مندی میں مبتلا ہیں۔ میں ان تمام آستانوں کو چھوڑ کر صرف تیرے درِ رحمت کی دریوزہ گری کرتا ہوں۔ اور تیرے ہی آگے دامنِ طلب پھیلاتا ہوں۔ مجھے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی عطا کر دے۔ اور آخرت کی سرفرازیاں بھی بخش دے، تیرے سوا اور کوئی منعمِ حقیقی نہیں ہے۔"

اللہ سے دعا مانگنے کے خلاف بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اللہ کسی ایک فرد کو راضی کرنے کے لئے قانونِ فطرت کو تو نہیں بدلے گا کیونکہ کلمات اللہ (اللہ کے قوانین) اور سنت اللہ (اللہ کا طریق کار) دونوں غیر مبتدل ہیں۔ نہ اس میں کوئی ترمیم کرے گا۔ اور نہ اس کا رخ موڑ دے گا۔ ہر واقعہ اسباب و علل کے قانون کے تحت رُونما ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مقصد کے حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان اسباب و علل کا علم حاصل کیا جائے۔ جس کے نتیجے میں مطلوبہ مقاصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ . . . اور پھر اس علم کی روشنی میں سعی و عمل جاری رکھا جائے۔ یہ نقطۂ نظر بہت حد تک درست ہے۔ تاہم استدلال میں قانونِ اسباب و علل کو صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ "فوق الفطرت" کی بحث کے دوران ہم نے دیکھا تھا کہ "وجود" کے ہر مرتبے اور ہر سطح کے لئے اس قانون کی نوعیت میں تبدیلی آ جاتی ہے اور یہ حقیقت ہمارے روزمرہ کے مشاہدے سے ثابت ہے۔ مثلاً جب "زندگی" مادے پر اثر انداز ہوتی ہے تو مادی اسباب و علل

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض حالات میں تو نچلی سطح کی "زندگی" کا قانونِ علت بالاتر زندگی کے قانونِ علت کے تابع ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کا علم، عقل، جذبہ اور اختیار و ارادہ کائنات کی ادنیٰ سی چیز کو بھی اپنے تابع فرمان نہ کر سکتا۔ بالا اور زیریں سطح کے قوانین کا عمل اور ردِ عمل بھی مقررہ اور عالمگیر قانون کے تحت ہوتا ہے۔ اور یہ قوانین ہر نوع کے اسباب و علل کے تعلقات پر محیط رہتے ہیں۔ لہٰذا دعا کے مؤثر ہونے کی راہ میں کوئی چیز حائل اور مانع نہیں ہو سکتی۔ اگر فوق العقل (SUPRA-RATIONAL) قوتوں کو ارتکازِ توجہ اور طلبِ استمداد کی شدت کے ذریعے نچلی سطح پر حائل بے عمل کر دیا جائے۔ تاہم یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب یہ بلند تر تصورات کو مشہود کرنے کے معاون میں ہو۔ اور یہ نچلے درجے کے اسباب و علل کے منافی بھی نہ ہو۔ نیز ایسا کرنا اعلیٰ مقاصد کے لئے ضروری ہو۔ مثلاً اگر ہم اپنے عارضی مقاصد کے لئے فطرت کے راستوں کو بدل دینا چاہیں تو اس قسم کی دعا کرنا فضول ہے۔ لیکن اگر عالم انسانی فلاح مقصود ہے اور کسی نیک مقصد کا حاصل کرنا منظور ہے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ بلند تر قوتیں مائل بہ اجابت ہو جائیں بشرطیکہ پُر خلوص روحانی سعی و کوشش کی جائے۔ فطرت کا راستہ کوئی اٹل بے لچک یا مشینی انداز کا مقرر نہیں کیا گیا کہ انسانی اختیار و ارادہ یا اس سے زیادہ بلند تر اختیار و ارادہ یکسر غیر مؤثر ہو جاتے اور کسی ناگزیر ضرورت کو بھی پورا نہ کر سکے۔ تاہم بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ اگر بلند تر قوتوں کی استمداد طلب کرنا ضروری ہے تو اس کے یہ مقاصد بھی بلند ہونے چاہئیں۔ بے ہودہ خواہشات کی تکمیل کے لئے جن کی بنیاد ہی خود غرضی اور جہالت پر ہو اللہ کو پکارنا بجائے خود بہت بڑی گستاخی ہے۔ اگر انسان اپنے کام آپ نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ خدا اس کے کام آکر کر دے تو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ خدا اس کی کاہلی، بے عملی اور جہالت میں اضافہ کرنے کے لئے اس کی کوئی مدد کرے گا۔ اس نے واضح طور پر اپنا اٹل قانون بنا رکھا ہے کہ "انسان کے لئے کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس کے جس کے لئے وہ کوشش کرے گا" گویا ضروری ہے کہ پہلے انسان اپنا صحیح اور درست مقصد والا کام خود کرے اور پھر نتائج کے صحیح اور درست برآمد ہونے کے لئے اللہ پر بھروسا رکھے۔

اہلِ ایمان کو جو سب سے پہلی دعا سکھائی گئی ہے اس کی جامعیت پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ آپ کے ارد گرد کائنات کا ذرہ ذرہ شاہکارِ حسن و خوبی ہونے کی زندہ شہادت پیش کر رہا ہے۔ اللہ کی ربوبیتِ عامہ کا عالمگیر قانون ہر چیز کو اس کے نقطۂ آغاز سے درجہ بدرجہ آگے بڑھاتا ہوا اوج و کمال کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس کی رحیمی اور رحمانیت نئے سے نئے تقاضوں کے مطابق از خود سامان نشوونما مہیا کر رہی ہے۔ یہ ایک عملی پروگرام ہے، جو انتہائی تکمیل یافتہ نظام کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اس نظام کا خالق ہے وہی ہر قسم کے اقتدار کا مالک ہے۔ اور اعمال کے نتائج بھی اسی ایک کے ناقابلِ تغیر قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے مرتب ہوتے ہیں۔ ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہر لمحے اور ہر مقام پر زبان و قلب پر اللہ سے طلبِ استعانت ہی کی دعا رہے۔ یہ طلبِ استعانت اس لئے ہے۔ کہ ہماری زندگی کو بھی نشوونما و ارتقاء حاصل ہو اور ہم بھی زندگی کے بالاتر مدارج تک پہنچنے کے قابل ہو سکیں۔ دنیاوی زندگی کے عام کاروبار میں انسان ایک دوسرے کی خدمت بھی کرتے ہیں، تعاون بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر معاشرتی زندگی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بسر نہیں ہو سکتی۔ لیکن رُوح کی بالیدگی اور زکاتِ نفس کے لئے ابتداً اور صرف اللہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ اور صرف اللہ کی اطاعت اور محکومیت اختیار کی جا سکتی ہے۔ اور صرف اُسی سے استمداد اور استعانت مانگی جا سکتی ہے استعانت کے معنے ہیں اپنی ذات کی نشوونما میں حسنِ اعتدال کی آرزو رکھنا اور اس کیلئے کسی کی مدد چاہنا۔ اللہ اسی نہج سے اَلْمُسْتَعَانْ ہے۔ کہ ہم صرف اللہ ہی سے اپنی انسانی ذات میں حسن و اعتدال برقرار رکھنے کے لئے مدد چاہتے ہیں اطاعت یعنی صلوٰۃ اور استقامت یعنی صبر سے پختگی اور اعتدال طلب کرنے کا حکم (۲:۴۵) میں آیا ہے، اعانت کسی کی مدد کرنے کو کہتے ہیں۔ تعاون ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے اور استعانت مدد چاہنا ہے۔ دُعا کے لئے اس سے زیادہ اچھا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی کے لئے روشنی مانگیں تاکہ اس کے ذریعے ہم صحیح اور سیدھے راستے کو پہچان کر اس پر گامزن ہو جائیں اور یہ راستہ ہمیں اس منزل تک لے جائے جو ہمیشہ سے نیک، صالح اور قابلِ فخر زندگی گزارنے والوں کی منزل رہی ہے۔

اللہ ہماری رُوح کی رُوح اور ہماری زندگی کی زندگی ہے۔ ہم اس سے نامیاتی طور پر منسلک و وابستہ ہیں۔ وہ ہماری شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، وہ ارض و سماوات کا نور ہے تاہم نور سے استفادہ صرف آنکھ ہی کر سکتی ہے اگر ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں تو عین دوپہر کے وقت بھی ہمارے سامنے اندھیرا رہے گا۔ دُعا ہماری روح کے بند دریچے کھول کر اسے نور کی کرنوں سے بھر دیتی ہے۔ نور ہماری زندگی ہے جس طرح رات کے اندھیرے میں ہم مصنوعی روشنیوں کے ذریعے تھوڑی سی دُور تک دیکھ لیتے ہیں بالکل اسی طرح عقل اور جبلی قوتوں کی مدھم سی لَو کی روشنی میں ہم زندگی کی راہوں پر بھی دُور تک چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب ہم دعائے استعانت طلب کرتے ہیں تو گویا ہم اپنے سارے شعوری وجود کا رُخ اُس "سورجوں کے سورج" کی طرف پھیر دیتے ہیں جو ہر روشنی اور ہر زندگی کا سرچشمہ اور منبع و ماخذ ہے۔ اس رابطے سے جو روشنی اور قوت ہمیں حاصل ہو جاتی ہے اس کی مدد سے ہمیں راستہ تلاش کرنے کے لئے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ ہم سیدھے اُس شاہراہ کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جو یقینی کامیابیوں کا راستہ ہے۔

مادّی نظریات رکھنے والے عقلیت پرست کہتے ہیں کہ دُعا کی مؤثریت کا کوئی دیدنی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ بیشمار چیزوں کے حصول کے لئے دعائیں مانگتے ہیں لیکن زندگی انہیں جو چیز عطا کر دیتی ہے ان کی تعداد نامنظور تمناؤں کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ روحانی صداقتیں نہ تو منطقی دلائل سے ثابت کی جا سکتی ہیں اور نہ ان کا مشاہدہ تجرباتی طور پر لیبارٹریوں میں ہو سکتا ہے۔ الدّین میں شدتِ آرزو ہی سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہوتا ہے۔ اور اسی کو ایمانِ کامل کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ ہماری دُنیاوی خواہشوں کی حیثیت زندگی کے بحرِ ناپیدا کنار کی سطح پر حلقہ ہائے موج سے پیدا ہونے والے چند حبابوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ سطحی موجیں سمندر کی گہرائیوں میں سے کوئی آبدار موتی اچھال کر نہیں لا سکتیں۔ ہماری انفرادی خواہشیں وہ مدوجزر بھی پیدا نہیں کر سکتیں جو انسانوں کے روابط میں تلاطم پیدا کر دے۔ تاہم آرزو کو اگر اجتماعاً ایک قلب میں ڈھال لیا جائے کہ اے ربّ العالمین

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہمیں سیدھے اور متوازن راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما تو پھر اس پُرخلوص آرزو کی تکمیل میں کارخانۂ قدرت کو بحسن و خوبی چلانے والی قوتیں بھی معاون و مددگار بن جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ یہ قوتیں انسان کے اپنے اندر بھی موجود ہیں۔ پُرخلوص آرزو کی شدت ان قوتوں کو ایک ہی مرکز پر مجتمع کر کے شخصیت کے اندر ایسی زبردست طاقت پیدا کر لیتی ہے جس کا اندازہ مادّی عقل نہیں لگا سکتی۔ لہٰذا دُعا کیا ہے؟ بقول شخصے یہ

"سازِ فطرت کے نغمۂ ازل سے ہم آہنگ رہنے کی ایک حسین تمنّا ہے۔ عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا و جاں نواز کی دلکش رعنائیوں سے یکرنگ ہوجانے کی مچلتی ہوئی آرزو ہے۔ چکور کے سینے میں چاند کو اپنے اندر اُتار لینے کی والہانہ امنگ ہے۔ پروانے کے دل میں شمع فروزاں کے انداز و اسلوب جذب کر لینے کی وجد آفریں خواہش ہے انسانی خودی کا اپنی متناہیت کو لامتناہیت سے بدل دینے لینے کا والہانہ جذبہ ہے"

بہ نظرِ تعمق دیکھئے تو ایمان، دُعا اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی پھول کی پتیاں ہیں۔ ایمان اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگ رہنے میں پوشیدہ ہے دُعا اس ہم آہنگی اور یکرنگی کی شدید تڑپ ہے اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ ہے اور اس کے حصول کے لئے سعیٔ پیہم ہے۔ چنانچہ آرزو بھی جب اس نقطۂ عروج پر پہنچ کر مشیّت ربّی سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے، جب یقین کا نقطۂ ارتکاز چاہتا ہی وہی کچھ ہے جو اس مشیّت کے عین مطابق ہے، جب طلب ہی عطا کے ہمرنگ ہوجاتی ہے اور جب سعی و عمل بھی اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور انسانی فکر اور تدبیر کے لئے اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا تو دُعا آخری سہارا بن کر بے سہاروں کے ملجا و ماوا کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بے آسروں کی تکیہ گاہ بن جاتی ہے۔ گویا دُعا

ہر مایوس کے لئے اُمید کی کرن ہے، ہر قلبِ پریشان و مضطر کے لئے سامانِ راحت و تسکین ہے، ہر بے نوا کے لئے مونس و غمخوار رفیق ہے، ہر راندہ و درماندہ کی آخری پناہ گاہ ہے اور ہر ضعیف و ناتواں کے لئے تقویت و طمانیت ہے۔

---

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۳۔ زندگی کی عالمگیر دوامی اور ناقابلِ تغیر قدریں

آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے مفکرِ اسلام علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مدراس میں انگریزی زبان میں کچھ لیکچر دیئے تھے۔ جنہیں بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا کتاب کا نام ہے (THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOS THOUGHT IN ISLAM)

اس کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی صاحب نے تشکیلِ الٰہیاتِ جدیدہ کے نام سے کیا۔ لیکن عام طور پر یہ کتاب خطباتِ اقبال کے نام سے مشہور ہے۔ آخری لیکچر میں اقبال نے مذہب کے الدین تک کے ارتقائی سفر کا جائزہ لے کر کہا ہے کہ

"تاریخ مذاہب پر گہری نظر رکھنے والے اربابِ فکر و دانش جانتے ہیں کہ اگر مذہب کا نفسیاتی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو انسان کی مذہبی زندگی کو جو صدیوں کے طویل عرصے تک پھیلی ہوئی ہے تین نمایاں ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور بلا شبہ ایسی عقیدتوں کا دور ہے جس میں انسان انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے مقصد اور غایت پر غور و فکر کیے بغیر انضباطی احکام کی تعمیل کرتا رہا ہے اس دور میں اس کا شعور ابھی اتنا پختہ نہیں تھا کہ وہ ضبط کے مقصد کو یا انضباطی احکام کی حکمت کو سمجھ سکتا۔ لہٰذا مقررہ اصولوں کو بلا چون و چرا تعمیل کرنا ہی اس کا فرض تھا۔ چنانچہ وہ مشینی انداز سے ہی ہر رسم، ہر ولج اور ہر حکم کی پابندی کرتا تھا کیونکہ اسی غیر مشروط تعمیل پر ہی اس کے وجود کے تحفظ اور بقا کا دار و مدار تھا اور اسی سے اس کی شخصیت کا توازن اور تناسب وابستہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مذہبی زندگی اس اوّلین دور میں قوموں کی سیاسی اور سماجی تاریخ تو متاثر ہو سکتی ہے لیکن اس سے انسان کی انفرادی شخصیت میں کوئی ارتقا یا وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نظم و ضبط کی اس اندھی پیروی کے دور کے بعد عقلی تفہیم کا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں انسان اس قوت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو اقتدار اور اختیارِ کل کا ماخذ و منبع ہے اور جہاں سے نظم و ضبط کے بالمقصد اور بالارادہ احکام جاری ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں مذہبی زندگی اب کسی ایسی مضبوط اور مستحکم بنیاد کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے جو اس کے مادّی دنیا کے تصورات سے ماورا ہو کر اور جو اس کی چشمِ حقیقت جو کے سامنے منطقی طور پر کوئی مربوط نظارہ بھی پیش کر سکے۔ گویا اس کا ترقی یافتہ شعور اب حقیقتِ کبریٰ یعنی خدا کو دنیا ہی کے ایک اہم حصے کی حیثیت سے جاننا اور پہچاننا چاہتا تھا۔

تیسرے اور آخری ارتقائی دور میں مابعد الطبیعاتی فکر کی جگہ نفسیاتی فکر پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

> اب مذہبی زندگی حقیقتِ کبریٰ کے محض نظارے کی آرزو تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اپنی اس تمنا کو آگے بڑھا کے حقیقتِ کبریٰ کے ساتھ براہِ راست رابطہ اور تعلق پیدا کرنا چاہتی ہے۔ مذہب کے لیے یہی منتہائے عروج ہے جہاں وہ زندگی اور قوت دونوں کے شخصی انجذاب (PERSONAL ASSIMILITION) کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر فرد کی اپنی شخصیت آزاد ہو جاتی ہے لیکن اس آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ نظم و ضبط کے قوانین سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ان قوانین کے اصل سرچشمے کا کھوج اپنے شعور کی گہرائیوں میں لگانا چاہتا ہے"

اس آخری جملے کا مفہوم یہ ہے کہ فرد کو کچھ ایسی مستقل قدریں (INVIOLABLE PRINCIPLES) مل جائیں جو اس کے اپنے شعور کے اندر موجود ہوں تاکہ ان ناقابلِ تغیّر اصولوں کی پیروی اس کی شخصیت کے عناصر کو منتشر ہونے سے بچا لیں اور اس کی "ذات" کے اجزا کو ایک مرکز پر مجتمع کر دیں تاکہ اس کی انسانی ذات مستحکم اور مضبوط ہو جائے۔ یہ مستقل قدریں "الدین" نے فرد اور جماعت کو فراہم کر دی ہیں۔ اور نہ صرف نظریات یا تصوّرات کی صورت میں فراہم کی ہیں بلکہ انہیں ایک عملی نظام کی شکل میں مربوط بھی کر دیا ہے جس کے ذریعے نہ صرف فرد بلکہ پوری نوعِ انسانی فوز و فلاح تک پہنچ سکتی ہے۔ مزید برآں اس نظام کو عملاً نافذ بھی کر کے دکھا دیا گیا تاکہ تصورات حقیقی نمونے کی صورت بھی اختیار کر لیں جب تک "مذہب" نے الدین کی ترقی یافتہ صورت اختیار نہیں کر لی اس وقت تک یہ عالمگیر سطح پر پوری انسانیت کے لئے مکمل ضابطۂ زندگی نہیں بن سکا۔ ابدی صداقتیں ہر مذہب کے پاس تھیں لیکن ایک تو محض ابتدائی شکل میں تھیں، دوسرے ان کا نفاذ بھی جزو جزو ہو سکا تھا یعنی کہیں ایک صداقت نافذ کی گئی اور کہیں دوسری صداقت کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچے کو نرم غذاؤں سے تدریجاً ٹھوس غذاؤں کی طرف لایا جاتا ہے۔ ان ابدی صداقتوں کے پیغمبر اپنی سیرت اور کردار کے نمونے بھی پیش کرتے رہے لیکن علیحدہ علیحدہ خصائص اور خصائل کی صورت میں کیونکہ اس مقدس گروہ کے ہر ذی شان فرد نے اپنے اپنے وقت، اپنے اپنے علاقے اور اپنی اپنی قوم کے سامنے اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معیار اور نمونہ پیش کیا۔ کسی نے صبر، کسی نے ایثار، کسی نے جوشِ توحید، کسی نے ولولۂ حق، کسی نے تسلیم و رضا، کسی نے اطاعت، کسی نے عفت، کسی نے زہد، غرض ہر ایک نے زندگی کی اندھیری راہوں کو منور کرنے کے لئے ایک ایک مینارِ نور قائم کر دیا جس سے صراطِ مستقیم کا پتہ لگ سکے۔ مگر اخلاقِ عالیہ کی ان مستقل قدروں کو باہم مربوط کر کے اور انہیں انسان کی زندگی کا عملی حصہ بنا کر جامع اور انتہائی مکمل صورت میں ایک قابلِ عمل نظام کی صورت میں کسی بھی دائمی مذہب نے پیش نہیں کیا تھا۔ کیونکہ انسانیت، جیسا کہ پہلے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے، ابھی ذہنی بلوغ کو نہ پہنچی تھی۔ چنانچہ معلمینِ انسانیت اپنی سیرت و کردار کا بھی نمایاں پہلو ہی عوام الناس کی پیروی کے لیے پیش کرتے رہے یا پھر سابقہ وعظ و نصیحت کو اپنی تعلیمات کا جزو بنا کر اپنی پاکیزہ شخصیت کی اثر آفریں قوت کے ذریعے بطور اعادہ منواتے رہے۔ اس طرح صدیاں گزر گئیں۔ انسانیت قدم بقدم ذہنی بلوغ کی طرف بڑھتی رہی تاآنکہ وہ وقت آن پہنچا کہ ان تمام صداقتوں اور قدروں کو بدرجۂ اتم تکمیل تک پہنچا دیا جاتے اور انہیں ایک نظام کے تحت اس طرح

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

منتظم و مربوط کر دیا جائے کہ اب زمان و مکان کے فاصلے ان پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ بالفاظ دیگر "مذہب" نے آخری ارتقائی منزل تک پہنچ کر علم بڑھایا اور حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی وساطت سے یہ اَلدّین کی صورت میں پوری انسانیت کے لئے ایک مکمل ضابطۂ زندگی بن کر سامنے آ گیا ہے۔ زندگی کی وہ عالمگیر، دوامی اور ناقابلِ تغیّر قدریں جن کے لئے انسانی ذہن کے بلوغ کا انتظار تھا۔ حرف بحرف قرآن حکیم کے اندر محفوظ ہیں اور ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ یہ قیامت تک اسی طرح رہیں گی جس طرح نازل ہوئی ہیں۔

اسلامی نظام جن بنیادوں پر قائم ہے انہیں آجکل کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بنیادی تصوّرات ہر شخص کے لئے الگ الگ نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر کوئی شخص جنگلوں یا پہاڑوں کی غاروں میں دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنا چاہے، تو اُسے کسی خارجی قاعدے قانون کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ قوانین و ضوابط کی ضرورت اُن انسانوں کو پڑتی ہے۔ جن کو مل جل کر رہنا ہوتا ہے۔ جب انسان مل جل کر کسی خاص قوانین و ضوابط کے پابند ہو جاتے ہیں تو اسے نظام یا سسٹم کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ایسے ہی بین الاقوامی نظام یا سسٹم کے لئے "اَلدّین" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس خصوصی اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی اسلام "مذہب" سے کہیں زیادہ بلند و بالا نظر آئے گا۔

اَلدّین کی عمارت جن بنیادی تصوّرات پر قائم کی گئی ہے اسے آپ فلسفۂ زندگی، نصب العین، منزلِ مقصود وغیرہ کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں ان بنیادی باتوں کے لئے ایک نہایت چھوٹی سی مگر بڑی جامع اور بلیغ اصطلاح "کلمۂ طیّبہ" کے نام سے دی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے اس پاک آئیڈیالوجی کو استعارے کے رنگ میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ یہ ایک پاکیزہ درخت ہے، جس کی جڑیں مضبوط اور محکم ہیں، شاخیں انتہائی بلندیوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اور یہ ہر زمانے میں ثمرات سے لدا پھندا رہتا ہے۔ کلمۂ طیّبہ کی بنیادوں پر قائم ہونے والا معاشرہ اور عالمگیر انسانیت پرور نظام ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر تازہ بہ تازہ نتائج سامنے لاتا رہے گا۔ اور کبھی کہنہ یا فرسودہ نہ ہو گا۔ درخت ہی کی مثال سامنے رکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی درخت اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ نقطۂ عروج و ارتقا تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اُس کے بڑھنے اور پھیلنے پھولنے کی صلاحیت کو مناسب زمین، پانی، ہوا اور روشنی وغیرہ کی مدد سے ابھارا نہ جائے۔ اور اسے موسموں کی شدّت یا جانوروں کی یورش سے محفوظ نہ رکھا جائے بالکل یہی صورت قرآنی آئیڈیالوجی کی ہے۔ اس کے بنیادی تصوّرات جنہیں نہایت ہی عمدہ بیج کہا جا سکتا ہے اس قدر پاکیزہ اور ارتقائے دوامی کی صلاحیت رکھنے والے ہیں۔ کہ کوئی دوسری آئیڈیالوجی اس جیسی بے عیب اور مکمل پیش نہیں کی جا سکتی۔ جونہی اس کی نشو و نما شروع ہوتی ہے اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی ہوئی پاتال تک اتر جاتی ہیں۔ اور اس کی شاخیں نہ صرف انتہائی بلندیوں کو چھونے لگتی ہیں بلکہ زمان و مکان تک کو اپنی احاطت میں لے لیتی ہیں۔ اور پھر اس کے پھل اور پھول ہر موسم میں، ہر جگہ پر اور ہر انسان کے لئے صحت بخش اور جانفزا ثابت ہوتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ اس کی نشو و نما کے ذرائع ہیں۔ عبادات کے پروگرام اس کو محفوظ اور مامون رکھنے کے عملی اقدامات ہیں اور اوامر و نواہی کی اطاعتیں اس کو پانی اور ہوا اور روشنی وغیرہ مہیا کرنے کے سرچشمے ہیں۔

کلمۂ طیّبہ کو اجمالاً بیان کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسان وہ اشرف المخلوق شخصیت ہے جو کسی بھی دوسرے انسان، شخص، وجود، تصوّر، خیال، توہّم، رسم ورواج، قوّت، اقتدار، حاکمیّت وغیرہ کے آگے، کسی بھی نفع یا ضرر کی اُمید یا خوف سے مرعُوب ہو کر نہیں جُھک سکتی سوائے اس بلند و بالا منبعِ قدرت و اختیار، نشو و ارتقاء دینے والے "اللہ" کے، کہ جس عظیم ترین ہستی کا ادراک ہمیں بشری اِمکانات کی حد تک اُس کے بھیجے ہوئے کامل انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے توسّط سے اس پر وحی کے ذریعے نازل ہونے والی کتاب "القرآن" ضابطۂ قوانینِ ہدایت کی معرفت ہو سکتا ہے۔

کلمۂ طیبہ کو تفصیلاً بیان کیا جائے تو قرآن کا ایک ایک لفظ اس کی تشریح اور توضیح ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد جسم اور روح "دونوں کو متوازن اور متناسب یعنی حسین بنانا اور ارتقاء دینا ہے۔ اس مقصد کے حصول کا طریقہ یہ ہوگا،

۱۔ انسان اپنی اجتماعی زندگی کا نظام اس طرح مرتب کرے کہ اس میں اس کی جسمانی ضروریات (نہ کہ خواہشات) بھی بآسانی پوری ہوتی رہیں اور "انسانی ذات" کی نشو و نما کے مواقع، اسباب اور ذرائع بھی سب کو میسر ہوں۔

۲۔ اس مقصد کے لئے کائنات کی تمام خارجی قوتوں کو انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے سامنے جھکا دیا گیا ہے، تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر ان قوتوں کو مسخر کرے اور تسخیر کے ماحصل سے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کو عام کرتا چلا جائے تاہم یہ سب کچھ ایک پختہ عالمگیر نظام کے تحت ہو سکتا ہے۔ چند افراد کے ہاتھ میں اتنا بڑا پروگرام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انسانی قدروں کا تحفظ عدل اور مساوات کا عملی نفاذ اور ذاتی اغراض کی تادیب صرف ایک عالمگیر نظام کے تحت ممکن ہیں۔

۳۔ اس نظام کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کا بندوبست کرے اور اس کے ساتھ ہی "انسانی ذات" کی نشو و نما کے لئے ذرائع اور اسباب فراہم کرے۔ "انسانی ذات" کی نشو و نما میں دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں شامل ہیں۔

"انسانی ذات" کو صفاتِ ربانی کے آئیڈیل کا ہم رنگ بناتے چلے جانے کا مقصد سابقہ مذاہب میں ممکن نہ تھا، کیونکہ ان کے پاس کوئی واضح نظام اس سطح کا موجود ہی نہ تھا، یہاں تک کہ ان کی عبادتیں بھی انفرادی تھیں۔ اور خدا کے ساتھ انسانی رشتے کو بھی اسی انفرادی نقطۂ نظر سے سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب نے نیکی اور بدی کی تشریحات تو تفصیل سے بتائی ہیں۔ مگر حقائق کو عملی جامہ پہنانے کا یہ کوئی منضبط پروگرام پیش نہیں کر سکے۔ اسلام نے تمام سابقہ بیان کی ہوئی سچائیوں اور قدروں کو نہ صرف مکمل اور اپنی آخری حد تک ارتقاء یافتہ بنا دیا ہے بلکہ ان کے عملاً اور نتیجۃً سامنے آجانے کا ایک جامع اور یقینی پروگرام بھی دے دیا ہے، اس کے علاوہ اس نظام کو چلانے کی ذمہ داری بھی حکومتِ الٰہیہ کے سپرد کر دی ہے چنانچہ قرآن حکیم کی رُو سے اسلامی مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اسی ذمہ داری کو نبھانے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

طریق پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ قرآنی نظام حکومت و معاشرت کا قیام ان شرائط کے تابع ہے۔

۱۔ اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ ہے اس میں اور کوئی شریک نہیں ہو سکتا

۲۔ اطاعت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے یہ اطاعت اللہ کے عطا کردہ قانون کی حرف بحرف پابندی کے ذریعے ہو سکتی ہے،

۳۔ چونکہ اللہ کی اطاعت کرنے والے بھی انسان ہوں گے لہٰذا ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُن ذمہ داریوں کو بھی پورا کریں جو اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لی ہیں مثلاً رزاقیت، ربوبیت رحیمیت وغیرہ، اللہ کی اطاعت کا یہی وہ واسطہ ہے کہ جو فرد اور معاشرے کے باہمی روابط کو دائماً قائم رکھ سکتا ہے یعنی مملکت اُن تمام وعدوں کو پورا کرتی چلی جائے جو اللہ نے اپنے بندوں سے کر رکھے ہیں اور بندے پوری تن دہی، انہماک اور خلوص سے اللہ تعالیٰ کے احکام مملکت کے توسط سے مانتے چلے جائیں۔

قرآن حکیم نے جو قوانین "انسانی ذات" کی نشو و نما کے لئے عطا کئے ہیں اُن میں اور مادی زندگی کے ارتقا کے قوانین میں اصولاً وحدت اور یکسانی پائی جاتی ہے یعنی یہ قوانین بھی ہر لحاظ سے مکمل، اٹل اور ناقابلِ تغیر ہیں، اسلامی مملکت ان ہی مستقل قدروں کے مطابق قائم ہوگی۔ ان ہی کے مطابق چلائی جائے گی، اور ان ہی کی حفاظت کے لئے مملکت کو مضبوط اور پائیدار رکھا جائے گا۔ قانون کی کار فرمائی صرف اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے جب ہر شخص کو معلوم ہو کہ فلاں بات میں قانون کیا ہے نیز اُسے اس بات پر کلی اعتماد ہو کہ اس قانون کو کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔ قرآنی مملکت میں جزئی تفاصیل تو مرتب ہو سکتی ہے لیکن مستقل اصولوں میں حک و اضافہ یا ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ اللہ کی حکمرانی کے معنی ہی کتاب اللہ کی حکمرانی کے ہیں۔ یہ مستقل اقدار کیا ہے؟ ان کی تفاصیل سارے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تاہم یہاں چند ایک کا تعارف اس لئے ضروری دکھائی دیتا ہے کہ دُنیا کے دوسرے مذاہب اور مکاتب فکر ان سے نظریاتی یا کتابی حد تک تو واقف ہیں لیکن ان کے عملی پہلو سے ناآشنا ہیں۔ مثال کے طور پر کہنے کو تو سبھی لوگ کہتے ہیں کہ سب انسان برابر ہیں لیکن مساوات انسانی کا صحیح مفہوم کیا ہے، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ بعض لوگ اسے جمہوریت یا آزادی رائے کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ بعض اسے اقتصادی اور معاشی نقطۂ نظر سے متعین کرتے ہیں، کوئی اسے عدل و انصاف کے معیار سے پرکھنا چاہتا ہے اور کوئی اسے سماجی اصولوں میں دیکھنا پسند کرتا ہے، مساوات کو خالص انسانی ذات کی بنیاد پر صرف اسلام نے پیش کیا ہے، یہ وہ بنیاد ہے جس پر زندگی کے ہر پہلو کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے، قرآن حکیم "انسانی ذات" کے ارتقا کا منشور ہے، اس کے تمام احکام و قوانین انسان ہی کے محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس لئے روح اور جسم کے اس ناقابلِ افتراق مجموعے کے نشو و نما کیلئے اس صحیفۂ فطرت کی پہلی مستقل قدر "تکریم انسانیت" کے عام اعلان پر مبنی ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ۔ ہم نے آدم کی اولاد کو واجب تکریم قرار دیا ہے۔ ہر انسانی وجود صرف اور صرف اس وجہ سے واجب تکریم ہے کہ وہ آدم کی اولاد ہے۔ تکریم کے معنے ہیں کہ کوئی انسانی ذات کسی دوسری ہستی کے مقصد کے حصول کا آلہ کار نہیں بن سکتی۔ یعنی کوئی فرد اپنے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے کسی دوسرے فرد کو بطور ذریعہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی حکومت ایسا کر سکتی ہے۔ تکریم انسانیت کے اس اٹل قانون نے ہر قسم کی غلامی کو، خواہ یہ جسمانی ہو یا ذہنی، اقتصادی ہو یا سماجی بہ یک قلم منسوخ کر دیا ہے تاہم یہ آزادی اتنی مطلق بھی نہیں کہ افراد کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق اور واسطہ ہی نہ رہے اور دنیا کے کاروبار رک جائیں۔ تمدنی زندگی باہمی انحصار کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لہٰذا آزادی کے ساتھ تعاون کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ جو لازمی تعلیم کے پروگرام "امر بالمعروف و نہی عن منکر" کا اہم ترین جزو ہے اس حکم پر عمل کرنا فرد اور مملکت دونوں کا فرض ہے۔ مقصد جب اجتماعی ہو اور پوری نوع انسان کی فلاح اور منفعت کو پیش نظر رکھتا ہو تو پھر باہمی تعاون ہی اس کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ کوئی ایک انسان تن تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام افراد ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھیں اور تکریم انسانیت کے سنہری اصولوں پر عمل کر کے ارتقا کی تمام منزلیں طے کرتے چلے جائیں۔ اصول تکریم جس میں گورے کالے، چھوٹے بڑے، امیر غریب، عالم جاہل، غنی محتاج کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی۔ ہر انفرادی استعداد کو اطمینان بخشتا ہے، اور باہمی تعاون انسان کے "مقام انسانیت" کو تحفظ عطا کرتا ہے۔ ان قدروں کے برعکس جو بھی کوئی اور طریق کار اختیار کیا جائے وہ استحصالی ہوگا۔ اور انسانیت کی تذلیل کا باعث بنے گا —— اور قرآن حکیم کے نزدیک تذلیل انسانیت سب سے بڑا جرم ہے!

عدم تعاون سے یا استحصالی طریق کار سے انسانیت کی تذلیل کس طرح ہوتی ہے یہ ایک باریک نکتہ ہے جسے ہم ایک مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ جب ہم گھوڑے کو ریڑھے میں جوت لیتے ہیں یا ٹریکٹر کو زمین میں ہل چلانے پر لگا دیتے ہیں تو اس میں گھوڑے اور ٹریکٹر کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا جس کے پورا کرنے کی خاطر یہ کام کرتے ہیں مقصد صرف ہمارا ہوتا ہے۔ اور گھوڑا اور ٹریکٹر ہمارے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ گھوڑے کو صرف اتنی خوراک دی جاتی ہے جس سے یہ ہمارا مقصد زیادہ سے زیادہ پورا کر سکے، ٹریکٹر کو بھی اسی غرض کی خاطر "فٹ" رکھتے ہیں۔ جب یہ دونوں چیزیں کثرت استعمال کی وجہ سے ہمارے مقصد کے حصول کے لائق نہیں رہتیں تو ہم انہیں ناکارہ کہہ کر کنڈم کر دیتے ہیں، جب انسان کو بھی اسی طرح استعمال کیا جائے گا تو انسان انسان نہ رہے گا۔ بلکہ مقام انسانیت سے گر کر حیوان یا مشین کی سطح پر آ جائے گا۔ حیوان اور مشین ایسی چیزیں ہیں جن کو "ذات" عطا نہیں کی گئی۔ لہٰذا انسان کو حیوان یا مشین کی سطح پر لے آنا، خواہ یہ کسی بھی شکل میں ہو "انسانی ذات" کا انکار ہے اور یہ انکار انسانیت کی سب سے بڑی تذلیل ہے۔ یہ آیت کریمہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ کا بھی عملاً انکار ہے اور قرآن حکیم کی آیت یا کسی ایک حکم کا انکار کفر ہے۔ تکریم انسانیت قرآنی قدر ہے۔ مستقل اور عالمگیر قدر ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے، ہمیں انسانی معاشرے میں اکثر و بیشتر ایسے انسان دکھائی دیتے ہیں جو دوسروں کے مفادات اور مقاصد کے حصول کا ذریعہ بننے پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ انسانی شرف و امتیاز رکھنے کے باوجود دوسروں کا "آلہ کار" بن کر خاموشی سے کام کئے جا رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایک انسان دوسروں کے مفادات کے حصول کا ذریعہ کیوں بنتا ہے؟ ایک ملازم گالیاں کھا کھا کر بھی صبر کا گھونٹ پیتا اور دوسروں کے کام کرتا چلا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ یہ سارا

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پھر اسی لئے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو بھوکوں مرجائے گا۔ اس کی بنیادی اور اشد ضرورتیں بھی پوری نہ ہو سکیں گی وہ اپنی انہی ضرورتوں کے ہاتھوں بے بس ہے، احتیاج نے اُسے شرفِ انسانی کے بیچنے پر مجبور کر دیا ہے، بنیادی ضرورتوں سے محرومی کا خوف مستقل فکر مندی کے عارضے میں مبتلا کر دیتا ہے، راتوں کی نیندیں اُچاٹ ہو جاتی ہیں اسی فکر میں کہ "چہ خورد بامداد فرزندم"۔ غیر اسلامی معاشرے میں ایسا ہی ہوگا۔ جو فلسفے، مکاتب فکر، نظریئے اور مذاہب فرد اور معاشرے کے قرآنی ربط سے انکار کرتے ہیں۔ یا جو کبھی افراد کی اہمیت کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ اور کبھی معاشرے کے گیت گانا شروع کر دیتے ہیں۔ یا جو ایک کو دوسرے کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسا ہی کریں گے کیونکہ اسی عدم تعاون میں اُن کا فائدہ ہے، ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہے گی کہ بعد افراد دوسروں کے دست نگر رہیں اور احتیاج کی گرفت سے کبھی آزاد نہ ہو سکیں۔ اس کے برعکس قرآن حکیم اس بنیادی علت کو ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ جو اُنائے انسانی کے شرف کا کسی بھی صورت میں عملاً انکار کرے یا جو فرد کی تذلیل کا باعث بن جائے۔ اس کے عطا کئے ہوئے نظام کے تحت حکومت کا پہلا فرض ہی یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرے اسلامی نظام میں "دولت" کی تقسیم اس اصول پر نہیں ہوتی کہ وہ افراد سے محنت تو اپنے مقاصد کے مقررہ پیمانوں سے کرائے یعنی (FROM EACH ACCORDING TO HIS ABILITY) ہر ایک سے اس کی بھرپور صلاحیتوں کے مطابق لے لو لیکن جب واپس کرنے لگو تو معاوضہ اپنی صوابدید کے مطابق اُس مقدار کی نسبت سے دو جس مقدار میں اس نے پیداوار میں اضافہ کیا ہے یعنی (TO EACH ACCORDING TO HIS CONTRIBUTION) خواہ اس کی بنیادی ضروریات پوری ہوں یا نہ ہوں۔ اسلام کا اصول یہ ہے، کہ استعدادِ محنت میں فطری کمی بیشی کے باوجود بنیادی ضروریات تمام افراد کی غیر مشروط طور پر یکساں پوری ہوتی رہیں خواہ کسی کی دولت پیدا کرنے کی استعداد کسی ناگزیر نقص کی وجہ سے کم ہی کیوں نہ ہو، گویا ہر فرد کو احتیاج کے چکر سے آزاد رکھنا مقصود ہے۔ گویا ہر ایک کو اُن کی ضروریات کے مطابق دینا۔ یعنی (TO EACH ACCORDING TO HIS NEEDS) اس نظام کا اولین فریضہ ہے اور اسی پر غیر طبقاتی معاشرے (CLASSLESS SOCIETY) کے قیام کا انحصار ہے:

ہر معاشرے میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جن میں رزق کمانے کی استعداد، ہنر، ذہانت یا صحت وغیرہ کی بدولت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے، مغرب میں غیر معمولی صلاحیت والے افراد کو پرستش کی حد تک اہمیت دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے ذہن میں غرور اور نخوت کی ہوا بھر جاتی ہے۔ اور معاشرے کو ان کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم تفاوتِ استعدادِ افراد (INDIVIDUAL DIFFERENCES) کو باعث کبر و افتخار نہیں بننے دیتا۔ بلکہ اسے یک مقصدیت اور باہمی تعاون کی بنیاد پر معاشرے کے لئے باعثِ رحمت قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق "انسانی ذات" کی نشو و نما کی بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مفادات کو اپنے مفادات پر ترجیح دے اور ایثار کو اپنا شعار بنا کر اپنی فیض رسانیوں کو عام کرتا چلا جائے۔ سب کچھ اپنے لئے محفوظ کر لینے کا وطیرہ تو جانوروں کا ہے۔ جو اپنے بچوں کو بھی گھرلی کے قریب نہیں آنے دیتے۔ انسانی شعور اس سے بلند تر مقاصد کو پیش نظر رکھتا ہے جو شخص

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اپنی محنت سے حاصل کئے ہوئے رزق کو جتنا زیادہ دوسروں کی نشو و نما کے لئے کھلا رکھے گا۔ اتنا ہی زیادہ وہ اپنی "ذات" کی نشو و نما کر سکے گا۔ اس عظیم حقیقت کو قرآن حکیم نے مختلف پیرایوں سے بیان کیا ہے۔ کہیں ناہمواریوں کو ہموار کرنے کا حکم دیا ہے۔ کہیں اس طرح سے خرچ کی جانے والی دولت کے واپس آجانے کا ذکر ہے (ثواب کے یہی معنے ہیں) اور کہیں کمی کو پورا کر دینے کا ارشاد ہے۔ خود رزق کا لفظ اس قدر جامع مفاہیم کا حامل ہے کہ اس میں وہ تمام چیزیں شامل نظر آتی ہیں، جو انسانی جسم اور روح دونوں کی نشو و نما میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس "رزق" کو انفاق کے عالمگیر نظام کے تحت پھیلاتے چلے جانا قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم ہی نہیں بلکہ تقوے کی لازمی شرط بھی ہے۔

غیر قرآنی معاشرے کو ایسے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جو رزق کمانے کی استعداد سے کسی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یا جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ یا جو اپنی صلاحیتوں کو وسیع تر مقاصد کی تکمیل میں بنی نوع انسان کی عام فلاح و بہبود کے لئے وقف کئے رہتے ہیں اور اپنی ہمہ وقت مصروفیت کی وجہ سے چل پھر کر اپنی روزی آپ نہیں کما سکتے۔ ان معاشروں کے نزدیک یہ ان حاجتمندوں کا ذاتی معاملہ ہے جس سے وہ جس طرح چاہیں خود نمٹیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سابقہ مذاہب نے اہل حاجت، یتامیٰ، بیوگان، مساکین، معذور اور لاچار انسانوں کے مسائل کو تسلیم تو کیا لیکن ان کا کوئی جامع اور مستقل حل پیش نہیں کیا۔ "مذہب" چونکہ ہے ہی انفرادی چیز اس لئے اس کی سوچ انفرادی "دان پن" یا ذاتی نوعیت کی اختیاری سخاوت سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی اس قسم کے "دان پن" کے پیچھے انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تذلیل بھی دو طرفہ ہوتی ہے یعنی ایک طبقہ ہاتھ پھیلا کر در بدر منعموں کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے اور شرف انسانی سے محروم رہ جاتا ہے تو دوسرا طبقہ کبر اور افتخار کا مرتکب ہو کر اپنے انسانی جوہر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں "انسانی ذات" کی نشو و نما کے منافی ہیں۔ الدین کسی ایسی بات کو جائز قرار نہیں دیتا۔ جس سے انسانی ذات کی ذرا بھر بھی تذلیل یا تحقیر ہو۔ چنانچہ ان مسائل کا یہ ایسا حل بتاتا ہے جو مستقل نظام کی صورت میں رائج ہو کر افراط و تفریط دونوں کے مابین عدل اور توازن قائم کر دیتا ہے۔ اور معاشرے کو کہیں بھی ناہموار نہیں ہونے دیتا۔ اس کے نزدیک "دان پن" یا خیرات وغیرہ کا انفرادی طریقہ ہنگامی حالات میں تو جائز قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ بیماری کا مستقل علاج نہیں ہے۔ مستقل علاج وہ نظام ہے جو انفاق فی سبیل اللہ کے تحت قائم ہوگا۔ اسلام نے اس مستقل حل کے ساتھ ساتھ عدل و احسان کا حکم دے کر معاشرے کو اور بھی زیادہ حسن و توازن بخش دیا ہے۔ اس مستقل قدر سے ایک طرف ظلم یعنی حدود سے تجاوز کر جانے کا استیصال ہو جاتا ہے تو دوسری طرف بگڑا ہوا توازن پھر سے درست ہو جاتا ہے۔ عدل کے معنے ہیں برابر دینا۔ جو کسی کا واجب ہے اسے دے دینا۔ احسان کے معنے ہیں حسن یعنی توازن اور تناسب پیدا کرنا جہاں کوئی بدصورتی پیدا ہونے لگے وہاں اسے درست کر دینا۔ بگڑی کو بنا دینا۔ اونچ نیچ کو ہموار کر دینا۔ نقائص دور کر دینا۔ گویا یہ مستقل قدریں یعنی عدل احسان، محروم کا حق ادا کرنا۔ انفاق کے ذریعے "رزق" کو گردش میں رکھنا، باہمی تعاون، ایثار وغیرہ سب تکریم انسانیت ہی کے مختلف عملی پہلو ہیں۔ قرآن حکیم کا ہر حکم "انسانی ذات" کی نشو و نما کے لئے ہے۔ کسی ایک حکم کا بھی انکار

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کرنا۔ اس سے مُنہ موڑ لینا یا اسے پسِ پُشت ڈال دینا۔ اس سے گریز کی راہ نکالنا اسے محض وعظ و نصیحت سمجھ کر عملی زندگی کے لئے غیر ضروری یا ناممکن العمل تصوّر کر لینا سارے قرآن کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ صداقت ایک ہی ہوتی ہے۔ اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ قرآن حکیم کی عطا کی ہوئی مستقل قدریں آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے مان لینے کے بعد کسی دوسری کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی ذات کی نشوو نما کا دار و مدار انہی قدروں کے اپنانے یعنی انہیں اپنی سیرت و کردار کا جزو بنا لینے پر ہے۔ ان کا سرچشمہ، جیسا کہ پیشتر ازیں کہا جا چکا ہے اسماء الحسنیٰ پر ہے۔ اسماء الحسنیٰ کے بیان میں ہم نے بعض مستقل قدروں کا استنباط کیا تھا۔ مثلاً ربوبیت، رحیمی، رازقیت، تخلیق، حاکمیت، جباریت، قہاریت۔ غفاری، توبہ، استغفار، انتقام وغیرہ تکریم انسانیت اور اس کے ساتھ عدل اور احسان پر بھی گفتگو کی تھی، بعض اور مستقل قدریں یہ ہیں۔

تعیینِ مدارج

معاشرے میں مدارج کا تعیین ہر فرد کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی رو سے ہو گا (۱۹:۴۶) جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔ وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہو گا (۱۳:۴۹)

کائنات بالحق پیدا ہوئی

یہ نظریہ کہ کائنات بالحق پیدا ہوئی ہے ایک مستقل قدر ہے۔ بالحق کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ یہ تعمیری نتائج کے لئے پیدا کی گئی ہے، یہ فریبِ تخیل سراب یا مایا نہیں ہے (۸۵:۱۵) (۱۶:۲۱)۔ (۳۸:۴۴) کائنات کی کوئی شے باطل (رائیگاں یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کی گئی، (۱۹۰-۱۸۹:۳) یہ سارا سلسلہ، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے، ان قوانین میں (جنہیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے) کوئی تبدیلی نہیں ہوتی (۷۷:۱۷) انسان ان تمام قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے (۳۱:۲) ان قوانین کا علم حاصل کرنے سے انسان اس قابل ہو سکے گا کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکے۔ قصہ آدم میں ملائکہ کے سجدہ سے یہی مراد ہے (۳۴:۲) اس میں زمین کی قوتیں اور فضائی قوتیں سب شامل ہیں۔ (۱۳:۴۵) ان علوم کے ماہرین کو علماء کہا جاتا ہے (۲۸-۲۷:۳۵) ان کی ریسرچ سے جوں جوں کائنات کے رازہائے سربستہ بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے، قرآن کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچتا جائے گا (۵۳:۴۱)

عملِ تخلیق

خدا کی ایک صفت بدیع السمٰوات والارض (۲:۱۱۷) یا فاطر السمٰوات والارض (۱۴:۶) ہے یعنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے والا اس صفت میں تو کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کی دوسری صفت ہے، خالقیت، عام طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں موجود عناصر میں خاص ترکیب و ترتیب سے ایک نئی چیز پیدا کر لینا۔ ان معنوں میں انسان، خدا کی صفت خالقیت میں شریک ہو سکتا ہے اسی نہج سے خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے (۲۳:۱۴) خدا اپنی تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا ہے (۱:۳۵) لہٰذا انسان کے لئے عملِ تخلیق بھی ایک مستقل قدر ہے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عمل تولید (PROCREATION) خدا کا عمل نہیں۔ (۱۳ : ۱۴) اس میں انسان بھی منفرد نہیں۔ انسان اور حیوان سب اس میں شریک ہیں۔ لیکن حیوانی عمل تخلیق میں شریک نہیں۔ لہٰذا وجہ شرفِ انسانیت عمل تخلیق (CREATION) ہے

نعمائے حیات

جب تسخیر فطرت اور عمل تخلیق مستقل اقدار ہیں، تو ظاہر ہے کہ نعمائے کائنات (پرورش آسائش و آرائش کی چیزوں) سے متمتع ہونا بھی ایک مستقل اصولِ حیات ہے۔ اس کی قرآن نے بڑی تاکید کی ہے۔ (۱ : ۶-۷)-(۸ : ۲۶)-(۱۴ : ۲۴)-(۱۶ : ۲۰)-(۱۶ : ۷۲)-(۲ : ۱۴۳)-(۲۲ : ۴۱)-(۲۴ : ۵۵)-(۲۸ : ۵-۶)-(۳۴ : ۲۷)۔ نعمائے زندگی میں عام سامانِ آسائش و آرائش سے لے کر حکومت و سطوت تک سب شامل ہیں۔ اشیائے زینت کے متعلق قرآن نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ انہیں کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا (۷ : ۳۲)۔(۱۰ : ۶۰)۔ یہ چیزیں انسان کے لئے حسنِ عمل کے مواقع بہم پہنچاتی ہیں (۱۸ : ۷) لہٰذا رہبانیت (دنیا سے نفرت یا ترکِ مادہ) قرآنی تعلیم کے خلاف ہے (۵۷ : ۲۷)

علم وعمل

خدا سمیع و بصیر اور علیم و حکیم ہے (۲ : ۳۲)۔(۲ : ۱۱۰)۔(۲ : ۱۲۷)۔(۳۱ : ۳۴)۔ اس کا علم وسیع ہے (۲ : ۱۱۵) لہٰذا انسان کے لئے صاحبِ علم و عقل۔ خبیر و حکیم ہونا مستقل اقدار ہیں علم بذریعہ حواس حاصل کیا جاتا ہے۔ اور قوتِ فکر سے صحیح نتائج تک پہنچا جاتا ہے (۱۷ : ۳۶) علم و عقل سے کام نہ لینے والے جہنمی ہیں (۷ : ۱۷۹) (۱۰ : ۶۷) تفکر و تدبر بنیادی خصوصیت ہے (۴۶ : ۲۴) خدا نے مومن کی خصوصیت یہ بتائی ہے۔ کہ اور تو اور اگر اس کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جائیں تو وہ انہیں بھی اندھا بہرہ بن کر قبول نہیں کرتا۔ (۲۵ : ۷۳) کسی بات کو محض تقلیداً مان لینا اس کے نزدیک شرفِ انسانیت سے محرومی ہے (۲ : ۱۷۰)

جذبات

جذبات عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان کے لئے بڑی گراں قدر متاع ہیں۔ قرآن ان کی تنقیص نہیں کرتا۔ لیکن کہتا یہ ہے کہ انہیں بے باک نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ وحیٔ خداوندی کے مطابق کارفرما ہونا چاہیئے (۲۸ : ۵۰) انہیں اپنا الٰہ نہیں بنالینا چاہیئے۔ (۴۵ : ۲۳) جذبات سے مغلوب ہوجانے والوں کی عقل ماؤف ہوجاتی ہے (۴۶ : ۲۰) اس لئے صحیح طریق کار یہ ہے کہ جذبات کو عقل کے تابع رکھا جائے اور عقل وحی کی راہ نمائی میں چلے۔ اس قسم کی جدوجہد سے زندگی کی نئی نئی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں (۲۹ : ۶۹) وحی کاروانِ انسانیت کے لئے منزل کا تعین کردیتی ہے اس کے بغیر انسان محض اپنے جذبات کی تسکین کے لئے مختلف وادیوں میں مارے مارے پھرتا ہے۔ اسے قرآن "شاعرانہ مسلک حیات" سے تعبیر کرتا ہے جس میں انسان کی تمام توانائیاں ضائع ہوجاتی ہیں (۲۶ : ۲۲۵) جب منزل کا تعین ہوجائے تو انسان کا ہر قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے۔ اور یوں آوارگی، سفر میں بدل جاتی ہے۔ "آوارگی" نہیں رہتی (۲ : ۱۵۰)۔(۲ : ۱۴۳) تاہم یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب جذبات وحی کی زیرِ نگرانی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے ماتحت ہو جائیں۔

آزادی

قرآن آزادی کو بڑی اہمیت دیتا ہے وحی کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہر نوع کی غلامی سے آزادی دلائے (۷:۱۵۷)۔ (۱۳:۹۰)۔ لیکن آزادی کے معنی "مادر پدر آزادی" نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف قوانینِ خداوندی کا مطیع رہے اور کسی کی اطاعت نہ کرے (۱۰:۲۶)۔ (۱۸:۵۰) خدا کی حکومیت اختیار کرنے کا عملی طریق یہ ہے کہ اس کتاب (قرآن کریم) کی اطاعت کی جائے (۵:۴۴-۴۸)

جس نظام میں احکامِ خداوندی کی کارفرمائی ہو اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ یعنی خدائے احکم الحاکمین (۹۵:۸) کے احکام کو نافذ کرنے کی ایجنسی۔ اس کو استخلاف فی الارض سے تعبیر کیا جاتا ہے (۲۴:۵۵) اس کے بغیر، دین کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ (۲۲:۴۱)

لا اکراہ فی الدین

قرآن کی رو سے کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس نظام میں داخل ہو (۲:۲۵۶)۔ نہ ہی کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ جس نظام کو اس نے اختیار کیا ہے وہ طوعاً و کرہاً اس کے اندر ہی رہے (۱۰:۹۹)۔ (۱۸:۲۹)۔ دین کے معنی نظامِ خداوندی کو دل و دماغ کی کامل رضامندی سے اختیار کرنا ہے، اس کا نام نفسیاتی تبدیلی ہے جس کے بغیر خارجی معاشرہ میں تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی۔ (۸:۵۳)۔ (۱۳:۱۱)

قرآنی تصورِ زندگی

قرآنی تصورِ زندگی کی ساری عمارت قانونِ مکافاتِ عمل پر استوار ہوتی ہے یعنی یہ قانون کہ انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے۔ تفصیل اس کی 'مکافاتِ عمل' کے عنوان میں ملے گی۔

عدل و احسان

مستقل اقدار ہیں۔ عدل کے معنی ہیں ہر شخص کو اس کا حق پورا پورا دینا اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی پورا کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھنا (۱۶:۹۰)

وحدتِ امت

وحدتِ امت بھی ایک مستقل قدر ہے' اختلاف اور تفرقہ شرک ہے (۳۰:۳۱-۳۲) اور خدا کا عذاب (۳:۱۰۴)

وحدتِ انسانیت

دین کا مقصد نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہے (۲:۲۱۳)۔ (۱۰:۱۹)۔ یہ برادری آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک کی بنا پر وجود پذیر ہو گی (۲:۶۲) حسنِ عمل کا معیار یہ ہے کہ وہ کام 'عالمگیر انسانیت' کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے (۱۳:۱۷)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہر فردِ بشر کسی نہ کسی اعتبار سے منفرد اور یکتا ہے۔ جسمانی، ذہنی اور روحانی ساخت اور استعداد کے لحاظ سے بھی وہ بے عدیل (UNIQUE) ہے۔ یعنی کہ جیسا کچھ وہ ہے اُس جیسا کوئی اور انسان حال، ماضی اور مستقبل میں نہیں ہے، ذرا غور کیجیے تو اس کی یہ انفرادیت بھی اُسے واجب تکریم بناتی ہے۔ اس کی انفرادیت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اس سے اپنا حکم نہ منوا سکے۔ اس پر اپنی حکومت یا حاکمیت مسلط نہ کر سکے۔ اسے اپنی متابعت پر مجبور نہ کر سکے ورنہ اس کی انفرادیت کچلی جائے گی، اس کی عزتِ نفس زخمی ہو جائے گی اُس سے اُس کی آزادی کا شرف چھن جائے گا۔ اور اللہ نے یکتائیت کا جو امتیاز اُسے دے رکھا ہے اس سے بھی یہ محروم ہو جائے گا۔ قرآن حکیم نے اس عظیم حقیقت کو بھی مستقل قدر کی حیثیت دے دی ہے۔ ارشاد ہوا ہے

کسی انسان کو اس بات کا حق نہیں ہے، خواہ اللہ اُسے کتاب، حکمت اور نبوت تک بھی عطا کر دے، کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کی بجائے میری محکومی اختیار کرو (۳:۷۸)

یعنی نبی بھی اطاعت کرائے گا تو اپنی ذاتی نہیں بلکہ ان احکام کی اطاعت کرائے گا جو اسے "کتاب" کی صورت میں اللہ سے ملے ہیں۔ لہٰذا اطاعت "اللہ اور اس کے بھیجے ہوئے" کے لیے مخصوص ہے کسی انسان کے اپنے ذاتی احکام کی نہیں۔ وہ انسان جسے بہ حیثیتِ صاحب امر مومنین میں سے چنا جائے گا وہ بھی "اللہ اور اُس کے بھیجے ہوئے" کی اطاعت کا پابند ہوگا۔ کسی سے "اپنے" بنائے ہوئے یا دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت نہیں کرا سکے گا۔ معاشرہ میں نظم و ضبط صرف ایسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ جس طرح انسانی جسم کی نشو و نما کے قوانین اُس کے اپنے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اسی طرح اس کی "روح" کی نشو و نما کے قوانین بھی اُس کے اپنے بنائے ہوئے نہ ہوں۔ انسان کا اپنا بنایا ہوا قانون کبھی مستقل حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ دنیا کے مشہور مقنن حمورابی کے قوانین کا آج نام تک کوئی نہیں جانتا۔ انسانی قوانین زمان و مکان کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ ہی نہیں دے سکتے۔ ان میں ہر لمحے ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے۔ حتےٰ کہ یہ بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔ دوام اور عالمگیریت صرف ان قوانین کو حاصل ہو سکتی ہے جو انسانی عقل سے ماورا تو ہوں لیکن اس کے منافی نہ ہوں۔

قرآن حکیم قانون ہی کی بنیاد پر تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بناتا ہے جو نظام تمام انسانوں کو ایک وحدت میں ڈھلنے کا متمنی ہو وہ باہمی افتراق کے تصورات کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اس کے نزدیک تو پوری انسانیت نفسِ واحد شمار ہوگی۔ تاہم اقرار و انکار کی بنا پر اسے دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یہ تقسیم بھی دائمی نہیں ہوگی کیوں کہ جو لوگ آج ابدی صداقتوں سے کسی غلط سوچ یا کوتاہ نظری کے سبب انکار کرتے نظر آتے ہیں انہیں جب اپنے افکار کی کجروی کا احساس ہو جائے گا اور سچائی اپنے نورانی پیکر میں ان کی چشمِ دانش و بینش کے سامنے جلوہ گر ہو جائے گی۔ تو یہ بھی اقرار کرنے والوں کی صف میں آ جائیں گے۔ اس وقت تک وہ لوگ جو قرآنی حقائق کی ابدی صداقتوں پر یقین رکھ کر انہیں اپنی زندگی کا نصب العین بناتے ہیں، ایک قوم ہیں اور جو ان حقیقتوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور اس کے برخلاف انسانوں کے اپنے وضع کردہ قوانین کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، دوسری قوم ہیں۔ قومیت کے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس معیار کے علاوہ اور کوئی معیار نہیں ہے، تاہم اس معیار سے بھی ایک امتیازی شان جھلکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح آج ہر قوم اپنے اپنے مفادات کے تحفظ میں یکسو ہو کر اس طرح لگی رہتی ہے کہ اسے دوسروں کے مفادات سے ذرا بھر غرض یا دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ اگر کسی دوسری قوم کا مفاد اس کے اپنے مفادات سے ٹکرا جائے تو وہ اپنی اغراض کی خاطر دوسروں کے نقصان کی بھی کوئی پروا نہیں کرے گی۔ اسلام میں ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اس میں تمام انسان آدم کی اولاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر واجب تکریم ہیں حقدار مساوات ہیں اور ان تمام مراعات کے مستحق ہیں، جو مستقل اقدار کی رو سے ان کو بطور استحقاق ملتے ہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ تم ہمیشہ عدل کرو۔ کیونکہ یہی چیز تقوے کے قریب ہے (۵:۹ - ۴:۱۳۵)
قوموں کی بقا کا یہ اصول نہیں کہ جو قوم سامان زیست زیادہ اکٹھا کر سکے گی وہی زندہ رہے گی۔ ڈارون کا طبعی موزونیت (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا نظریہ جسے بقائے اصلح کا نام دیا جاتا ہے نہایت ہی شر انگیز ہے کیونکہ اس سے استحصالی ذہنیت کو تقویت ملتی ہے، انسان سے کمتر سطح کی انواع پر بھی یہ اصول سو فیصد صحیح ثابت نہیں ہوتا، چہ جائیکہ اس کا اطلاق صاحب شعور اور صاحب سیرت و کردار شخصیت پر کیا جائے جو ایثار، ہمدردی، باہمی تعاون، محبت اور خلوص وغیرہ کی اعلیٰ صفات سے بھی متصف ہے۔ قرآن حکیم کے نزدیک قانون یہ ہے کہ بقا اور دوام اسی کے لئے ہے جس کی نفع بخشیاں تمام عالم انسانیت کے لئے ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔ اس قانون کو ہم کہیں گے (SURVIVAL OF THE MOST HUMANITARIAN) اور اس "بقائے باہمی عطائے باہمی" کا نفاذ قرآن حکیم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے اپنا لینے ہی سے ممکن ہے۔ اس قانون کا استنباط اس آیت جلیلہ سے ہوتا ہے "جو شئے جو نظریہ، جو عمل، عالمگیر انسانیت کے لئے نفع بخش ہے وہی باقی رہ سکتا ہے" (۱۳:۱۷)

اس اہم نکتے کے سمجھ لینے کے بعد کہ اسلام "الدین" ہے، عام مکاتب فکر کی طرح کا مکتب فکر (مذہب) نہیں ہے اور نہ ہی یہ چند عقیدوں یا مذہبی رسوم کا مجموعہ ہے، ہم اب اس پوزیشن میں ہیں کہ اسلام کے معانی، اس کی خصوصیات اور اس کے قائم کردہ نظام کو سمجھ سکیں۔ اسلام کے لفظ کا مادہ س۔ ل۔ م بہت وسیع المعانی ہے اگر صرف بنیادی معنے ہی سامنے رکھے جائیں۔ تو حسب ذیل آٹھ مفاہیم سامنے آتے ہیں۔

۱۔ جھک جانا۔ مان لینا۔ خود سپردگی، فرماں پذیری، اطاعت۔ (اَلسِّلْمُ وَ السَّلَامُ)
۲۔ عیوب اور نقائص سے پاک ہو کر اس طرح مکمل ہو جانا کہ کوئی خامی نہ رہ جائے (سَلِمَ)
۳۔ ہر قسم کے خطرات اور حوادث سے محفوظ رہنا۔ خود سلامتی حاصل کرنا اور دوسروں کو بھی سلامتی میں رکھنا۔ (مُسَلِّمٌ دوسروں کو سلامتی دینے والا۔ مُسَالِمٌ دوسروں سے سلامتی لینے والا۔ لغت تاج العروس) صحت اور عافیت۔ اللہ نے تمام مخلوق کو اختلال سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ اللہ السلام ہے۔
۴۔ حسن اور خوشنمائی (اَلسَّلِمُ)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۵۔ اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا اور فضول بیہودہ باتوں سے بچا رہنا۔
۶۔ وہ ذرائع جن سے با حفاظت بلندیوں تک پہنچا جائے (اَلسُّلَّمُ ۔ سیڑھی)
۷۔ صلح صفائی (اَلسِّلْمُ)
۸۔ پروان چڑھنا، بڑھنا، پھلنا۔ پھولنا، بار آور ہونا (اِسْتَلَمَ النَّبْتُ)

ان تمام معانی کو زیرِ نظر رکھیے۔ ان کی رُو سے اَلْاِسْلَامُ وہ نظامِ زندگی ہوا جس میں۔

۱۔ نوعِ انسانی کے ہر فرد کی صلاحیتیں پوری نشو و نما پاتی ہیں اور اس کی ہر کمی پوری ہو جاتی ہے
۲۔ زندگی کے ہر نشیب و فراز، ہر خطرے اور ہر آفت سے تحفظ مل جاتا ہے
۳۔ "انسانی ذات" ارتقا کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی ممکنہ بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے
۴۔ ہر فرد خود بھی سلامتی میں رہتا ہے۔ اور دوسروں کی سلامتی کا بھی ضامن بن جاتا ہے۔
۵۔ اطاعت صرف اللہ کے قوانین کی کرتا ہے اور اسی کے سامنے جُھک کر رہتا ہے اسی کے سپرد اپنے آپ کو کر دیتا ہے۔
۶۔ مکمل اعتدال، توازن اور تناسب ہے۔ افراط و تفریط نہیں۔ تخلیقِ حُسن ہر فرد کا فریضہ ہے۔
۷۔ ہر شخص کی کوشش بار آور ہوتی ہے اور کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی۔ اور
۸۔ اس کی اپنی ذات میں بھی حُسن پیدا ہوتا ہے۔ اور پورا معاشرہ بھی حسین بن جاتا ہے۔

کائنات کے اصولِ ارتقا کو ایک بار پھر سامنے لایئے۔ ہر چیز اپنے قانونِ تخلیق کے آگے سجدہ ریز ہے۔ پوری اطاعت اور فرماں برداری سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے اور اس طرح امکانی طور پر جو کچھ اسے بننا ہوتا ہے وہ بن رہی ہے۔ گویا یہ سارے کا سارا نظام اسی اطاعت اور انقیاد کی بدولت امن و سلامتی اور حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ اس طریقِ اطاعت گزاری اور سعی و عمل کو جس پہ قدرت کا کارخانہ عمل پیرا ہے۔ اسلام کہا گیا ہے۔ کُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ تمام کے تمام اسی کی اطاعت گزاری میں ہیں۔ ارشاد ہے کہ "کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جو چیز بھی اللہ نے تخلیق کی ہے، وہ جس کے سائے ڈھلتے ہیں دائیں طرف اور بائیں طرف، اللہ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اور وہ جو عجز و انکسار میں ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین ہے جاندار اور ملائکہ سب اللہ کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں اور کوئی بھی تکبر نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو اس سے بالا تر جان کر اپنے پروردگار کا خوف رکھتے ہیں۔ اور وہی کچھ کرتے ہیں جو انہیں کہا جاتا ہے۔" (۴۸ تا ۵۰: ۱۶)۔

جس طرح کائنات کے اندر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے قوانین و ضوابط مقرر کر دیئے ہیں اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی بنیادی اصول مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ جس طرح کائنات کے اندر قوانین کی پابندی میں کوتاہی برتنے سے یا تجاوز کرنے سے تباہی آ سکتی ہے اسی طرح انسانی زندگی میں بھی بنیادی اصولوں سے انحراف، اغماض اور تجاوز، تباہی اور بربادی کا موجب ہے جس طرح کائنات کی ہر شے اپنے اپنے قوانین کی اطاعت سے اپنی امکانی انتہائی منزل تک پہنچ رہی ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی مقررہ بنیادی اصولوں کی اطاعت سے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ارتقا کی منزلیں طے کر سکتی ہے۔ انسانی زندگی کے لئے اللہ کے مقرر کردہ اصولوں اور قواعد وضوابط کا نام "الدین" ہے اور ان کی عملی پیروی کو اور اطاعت و انقیاد کو "الاسلام" کہا گیا ہے۔

"اطاعت" کا مادہ ہے طاع جس کے معنے ہیں کسی چیز کا وسیع ہو جانا۔ قوانین خداوندی کی پیروی دل کی پوری رضامندی، وسعت اور کشادگی سے کرنا یعنی حدود و قیود کو اپنے دل کی مرضی سے قبول کر کے اختیار کرنا اسلام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت کسی سے زبردستی یا اندھے طور پر نہیں کرائی جا سکتی۔ قرآن حکیم نے کتاب (یعنی قانون) کے ساتھ حکمت (یعنی اس کی علت غائی، اس کے نتائج) کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی عقل کی روشنی میں آپ دیکھ لے کہ ان حدود و قیود کی پابندی میں کیا کیا فوائد ہیں۔ اور پھر دل کی پوری رضامندی کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو جائے۔ قرآن حکیم جس جماعت کے ہاتھوں نظام اسلام کے انقلاب عظیم کو لانا چاہتا ہے اس جماعت کے ہر فرد کی اولین خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اس انقلاب اور اس نظام کی غایت کو سمجھ کر، بہ طیب خاطر اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا سکے محض دیکھا دیکھی، کسی کے کہنے سننے سے، کسی کے خارجی دباؤ یا جبر و اکراہ سے اس جماعت میں نہ آئے۔ اکراہ تین طرح کا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کے گلے پر چھری رکھ دی اور اپنی بات منوالی۔ آجکل جابر قومیں ایسا ہی کر رہی ہیں۔ اور قسم کی جبر یا استعمال کر رہی ہیں۔ یا مثلاً کسی کو تشدد سے دبا کر اس کا ذہن ماؤف کر دیا اور اپنی بات تسلیم کرالی۔ آجکل اس طریقے میں بھی ترقی ہو چکی ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ تمدنی، ثقافتی اور رسمی باتیں معاشرے کی روایات بن کر مدتوں سے چلی آ رہی ہیں۔ یا جو خیالات، نظریات اور اعتقادات باپ دادا سے متوارث ہو کر چلے آ رہے ہیں۔ اور جن کے لئے کوئی عقلی سند ہمارے پاس نہیں ہے۔ انہیں تعلیم و تربیت کا جزو بنا کر ذہنوں میں راسخ کر دیا جائے، یہ تیسری قسم کا اکراہ سب سے زیادہ سنگین ہے، قرآن حکیم کی شرط یہ ہے کہ دین اسلام میں صرف وہی شخص داخل ہو سکتا ہے جو اکراہ کی ان تینوں قسموں سے پاک اور آزاد ہو۔ قرآن حکیم اپنی ہر بات کو دلائل اور براہین سے پیش کر کے دل و دماغ کے کامل اطمینان سے منواتا ہے۔ قلب و نظر کے اس کامل جھکاؤ کا نام ایمان ہے، ایمان کی یہی قوت ارض و سموات کو مسخر کر لیتی ہے اور انسانی ذات کو اتنا مضبوط، توانا اور مستحکم بنا دیتی ہے کہ زندگی کی آئندہ بلند تر سطح پر اسے جسم کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ از رُوئے قرآن دین اسلام کی چند خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔۔۔ گروہوں اور ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنا دینا (۲:۲۷-۲:۲۱۳، ۲۱)

۲۔۔۔ یہ کسی خاص قوم، نسل یا گروہ کا دین نہیں ہے اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے (۲:۶۲ وغیرہ)

۳۔۔۔ اس میں مشرق و مغرب کا کوئی امتیاز نہیں (۲:۱۱۵)

۴۔۔۔ یہ اللہ کی رہنمائی کے مطابق چلنے کا نام ہے (۲:۱۲۰)

۵۔۔۔ یہ اللہ کی صفات میں رنگے جانے کا نام ہے۔ (۲:۱۳۸)

۶۔۔۔ دنیا اور آخرت دونوں کی اچھائیاں حاصل کرنے کا نام ہے (۲:۲۰۱-۳:۱۴۷)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۷۔۔۔ یہ انسانی زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔ (۲:۸۵-۲:۲۰۸)

۸۔۔۔ یہ دنیا کی تمام مظلوموں اور کمزوروں کی مدافعت کرنے والا ہے (۲:۲۵۱)

۹۔۔۔ اس میں کسی قسم کی زبردستی نہیں ہے (۲:۲۵۶)

۱۰۔۔۔ احکام ربانی کی متابعت سے خود "انسانی ذات" میں وسعت پیدا ہوتی ہے (۲:۲۸۶)

۱۱۔۔۔ یہ دنیاوی زینت و آرائش اور ساز و سامان سے تمتع حاصل کرنے کے خلاف نہیں (۳:۱۴)

۱۲۔۔۔ اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ اور صرف اللہ ہے (۳:۷۸)

۱۳۔۔۔ اسلام میں فرقہ بندی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ شرک ہے (۶:۱۶۰-۳۰:۳۲)

۱۴۔۔۔ اسلام میں ذات پات یا پیشے کے امتیاز کو کوئی دخل نہیں۔ اصل شئے ایمان ہے (۲۶:۱۱۱)

۱۵۔۔۔ اسلام خانقاہیت کا مذہب نہیں ہے (۲۸:۷۷)

۱۶۔۔۔ غور و فکر انتہائی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ مومن بھی احکام ربانی کے سامنے اندھے بہرے بن کر نہیں گر پڑتے (۲۲:۴۶-۲۵:۷۳)

۱۷۔۔۔ اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے (۳۶:۵۳،۵۴)

۱۸۔۔۔ دین کا نظام باہمی مشاورت سے قائم ہوگا۔ (۴۲:۳۸)

۱۹۔۔۔ کتاب (ضابطہ قانون) میزانِ عدل اور فولادی قوت دین اسلام کے اجزائے لاینفک ہیں (۵۷:۲۵)

۲۰۔۔۔ نسل پرستی نہیں ہے (۲:۱۴۲)

۲۱۔۔۔ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ذریعہ اور واسطہ نہیں ہے (۲:۱۸۶)

۲۲۔۔۔ دنیا اور آخرت دونوں میں تفکر کرنے کا حکم (۲:۲۲۰)

۲۳۔۔۔ سابقہ انبیا کو بھی یہی تعلیم دی گئی تھی (۲:۱۲۸)

۲۴۔۔۔ اُمت مسلمہ اُمتِ وسطیٰ ہے، اقوام عالم کی نگرانی اور محاسبہ اس کا فریضہ ہے (۲:۱۴۳)

۲۵۔۔۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والی قوم (۳:۱۰۴)

۲۶۔۔۔ وہ قوم جسے پوری نوع انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے (۳:۱۰۹)

۲۷۔۔۔ ربط و ضبط باہمی سے اُمت کی قوت اور جمعیت قائم رہ سکتی ہے (۳:۱۹۹)

اسلامی نظام اس نظام کے سلسلہ میں اس اصولی حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے حق میں جن ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیا ہے مثلاً رزق بہم پہنچانا، ان کا پورا کرنا اسلامی نظام کی ذمہ داری ہوتا ہے اور جب وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے تو پھر افراد معاشرہ سے اسلامی احکام کی اطاعت کرتا ہے اس میں اطاعت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے۔ اس نظام کو سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس نظام کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ لہٰذا، اس نظام کی اطاعت کو "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ وسلم کے بعد حضورؐ کے جانشین اس نظام کی مرکزی اتھارٹی قرار پائے، اس لئے ان کی اطاعت بہ منزلہ اطاعتِ خدا و رسول تھی۔ یہ وہ ہے جو قرآنِ کریم نے "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کے ساتھ اس کی صراحت کردی ہے وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (۸:۲۰) درآنحالیکہ تم سن رہے ہو۔ لہٰذا اطاعت ایک زندہ محسوس اتھارٹی کے ذریعہ ہوگی جس کے احکام سنے جاسکیں لیکن احکام وہ خدا ہی کے ہوں گے۔ اسلامی نظامِ مملکت' درحقیقت قرآنی احکام و قوانین و اقدار و اصول کے نفاذ کی ایجنسی ہوتا ہے۔ بہ حیثیتِ مجموعی اسلامی نظام خدا کی ان صفات کا مظہر ہوتا ہے جن کا تعلق انسانوں سے ہے،

۱۔ جس نظام میں حمدیت، ربوبیت اور رحمت پائی جائے اسی کو اقتدار کا حق حاصل ہوتا ہے۔ (۱:۲-۴) اور اسی کی اطاعت اختیار کی جاسکتی ہے۔ (۱:۴) یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کا نتیجہ انعامات خداوندی ہے۔ (۱:۶)۔ جو روش اس کے خلاف ہوگی اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا۔ (۱:۷)

۲۔ الکتاب پر ایمان، صلوٰۃ و زکوٰۃ کا قیام، یہ اس نظام کی بنیاد ہے اور اس کا نتیجہ فلاح۔ (۲:۱-۵)

۳۔ یہ نظام وحی کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ خوف اور حزن کا ختم ہو جانا ہے یعنی انسانی معاشرہ خوف و حزن سے محفوظ و مامون اسی نظام کے تابع رہ کر ہو سکتا ہے (۲:۳۸)

۴۔ سوسائٹی میں ایسی حالت پیدا کر دینا کہ ایک طبقہ محتاج اور مصائب کا شکار ہو جائے اور اس کی امداد کو کارِ ثواب سمجھنا، باطل کا نظام ہے۔ (۲:۸۵)

۵۔ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصّہ پر عمل کرنا اور دوسرے حصہ کو چھوڑ دینا، ذلت و خواری کا موجب ہے (۲:۸۵)

۶۔ اسلامی نظام کا مرکز، تمام عالمِ انسانیت کے لئے امن کا موجب ہوگا۔ (۲:۱۲۵-۱۲۶) اس میں سامانِ زیست کی فراوانیاں ہوں گی (۲:۱۲۶)

۷۔ اس نظام میں وراثتی اقتدار نہیں ہوگا۔ معیار جوہرِ ذاتی ہوگا۔ (۲:۱۲۴)

۸۔ اس نظام کی علمبردار امّت، تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگران ہوگی اور اس کی نگرانی مرکز کرے گا (۲:۱۴۳)

۹۔ اس نظام کا مرکز کعبہ، تمام امت کا واحد مرکز ہوگا۔ (۲:۱۴۴، ۱۴۸) اس سے خدا کی نعمتوں کا اتمام ہوگا (۲:۱۵۰)

۱۰۔ افرادِ معاشرہ کو ضابطۂ خداوندی کی تعلیم دینا، علم و بصیرت کی رُو سے اس کی غرض و غایت سمجھانا، ان کی طبیعی زندگی اور ذات کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا، یہ اس نظام کا فریضہ ہوگا۔ (۲:۱۵۱)

۱۱۔ باطل کا نظام یہ ہے کہ باتیں حیرت انگیز ہوں (یعنی وعدے بڑے تعجب انگیز کرے) لیکن جب اقتدار حاصل ہو جائے تو رزق کے سرچشموں اور نسلِ انسانی کو تباہ کرنے کی کوشش کرے اور ملک میں ناہمواریاں پیدا کر دے (۲:۲۰۴-۲۰۵)

۱۲۔ یہ نظام پورے کا پورا اختیار کیا جائے گا، نہ اسے ادھورا چھوڑا جائے گا، نہ کسی اور نظام کو اس کے ساتھ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

طلایا جائے گا۔ (۲:۲۰۸)

۱۳۔ اس نظام کا مقصد نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ لیکن یہ اسی طرح ممکن ہے کہ الکتاب، یعنی ضابطۂ خداوندی کو اپنا آئین تسلیم کیا جائے۔ اس سے اختلافات مٹ سکتے ہیں (۲:۲۱۳)

۱۴۔ قانون نافذ کرنے سے پہلے کا جرم، جرم نہیں ہوتا۔ بعد کا ہوتا ہے (۲:۲۷۵)

۱۵۔ قانون کی دانستہ خلاف ورزی "خدا و رسول" (نظام) کے خلاف اعلانِ جنگ ہے (۲:۱۷۹)

۱۶۔ "اطاعتِ خدا و رسول" (یعنی نظامِ خداوندی کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت) کی تاکید (۳:۱۳۱) نیز افسرانِ ماتحت کی اطاعت (۴:۵۹) ان کے خلاف مرکز میں اپیل کی جاسکتی ہے۔ (۴:۵۹)

(۸:۲۰) (۸:۴۶) (۲۴:۵۱-۵۴) (۳۳:۷۱) (۴۷:۳۳)

۱۷۔ نہ رسول کو اس کا حق حاصل ہے اور نہ کسی اور کو جسے حکومت ملے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔ اسے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا چاہیئے (۳:۷۹)

۱۸۔ اس نظام میں ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی (۲:۲۵۶)

۱۹۔ اس نظام کی اجتماعیت قرآن کریم سے وابستہ رہنے سے قائم ہوگی اور باقی رہے گی۔ اسی سے اس امت کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا ہوگی جو اجتماعیت کی بنیادی شرط ہے (۳:۱۰۲)

۲۰۔ اس میں تفرقہ قطعاً نہیں ہوگا۔

۲۱۔ اس نظام کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوگا۔ یعنی جن باتوں کو قرآن پسندیدہ قرار دیتا ہے ان کا قائم کرنا اور جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے ان سے روکنا (۳:۱۰۹)

۲۲۔ اس نظام کا قیام تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے ہوگا۔ (۳:۱۰۹)

۲۳۔ اس نظام میں غیر مسلم (یعنی جو اس آئین و قوانین کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے) مملکت کے رازداری کے امور میں شریک نہیں کئے جاسکیں گے۔ انہیں عام حقوقِ انسانیت حاصل ہوں گے لیکن وہ شریک حکومت نہیں ہوسکیں گے۔ جس نظام کی بنیاد آئیڈیا لوجی پر ہو اس میں وہ لوگ کیسے شریک کئے جاسکتے ہیں جو آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں۔ (۳:۱۱۷-۱۲۰)۔(۵:۵۱)-(۴:۴۲-۴۳)۔ (۵۸-۲۲) (۶:۱۴)

۲۴۔ اسلامی نظام شخصیتوں کے سہارے قائم نہیں ہوتا۔ خدا کے غیر متبدل ضابطہ کی رُو سے قائم رہتا ہے اس سے دور کیا، خود رسول اللہ کی وفات سے بھی اس پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا (۳:۱۴۳)

۲۵۔ یہ نظام امت کے باہمی مشورہ سے چلایا جاتا ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ کو بھی مشاورت کا حکم تھا (۳:۱۵۸) (۴۲:۳۸)

۲۶۔ یہ نظام افرادِ ملت کے ربط باہمی سے قائم رہ سکتا ہے (۳:۱۹۹)

۲۷۔ غیر خداوندی نظام سے معاملات کے فیصلے کرانا کفر ہے (۴:۱۶۰)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۲۸۔۔۔ اس نظام میں ذمہ داری کے امور ان کے سپرد ہوں گے جو ان کے اہل ہوں۔ (۴:۵۸)

۲۹۔۔۔ ہر اختلافی معاملے میں اپنی مرکزی اتھارٹی کو حکم بنانا چاہیئے۔ اس کے فیصلوں کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی نہیں گزرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں گے (۴:۶۵؛۱۰۵؛۵۹)

۳۰۔۔۔ جب کوئی بات سنو تو اسے پھیلانے کے بجائے حکومت کے ذمہ دار افراد کی طرف پہنچاؤ۔ تاکہ وہ تحقیق کرکے کسی نتیجہ تک پہنچیں (۴:۸۳)

۳۱۔۔۔ جہاں اسلامی نظام قائم ہو یا اس کے قیام کے لئے حالات زیادہ سازگار ہوں، اس مقام کی طرف منتقل ہو کر آجانا ضروری ہے۔ اسے خدا اور رسول کی طرف ہجرت کرنا کہتے ہیں۔ ایسے حالات کی موجودگی میں غیر اسلامی نظام کے تابع زندگی بسر کرنا اور یہ سمجھ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لینا کہ ہم اپنے طور پر خدا کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں اور یہی کافی ہے سنگین جرم ہے (لیکن یہ سب امور اسلامی نظام سے مشورہ کے ساتھ طے ہوں گے۔ (۴:۹۷-۱۰۰)

۳۲۔۔۔ رسول اللہ سے کہا گیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو (۴:۱۰۵)

۳۳۔۔۔ ہدایت آجانے کے بعد رسول کی مخالفت اور جماعت مومنین سے الگ کسی اور راہ کا اختیار کرنا جہنم کا موجب ہے (۴:۱۱۵)

۳۴۔۔۔ یہ نظام بر و تقویٰ کے کاموں میں دوسروں سے تعاون کرے گا۔ اثم و عدوان کے کاموں میں تعاون نہیں کریگا (۵:۲)

۳۵۔۔۔ اس نظام میں دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔ (۵:۲)

۳۶۔۔۔ اس نظام کی اطاعت اس عہد پر مبنی ہے جو ہر عبدِ مومن اپنے خدا سے کرتا ہے اور وہ اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کرے گا۔

۳۷۔۔۔ اسلامی نظام کے خلاف جنگ (بغاوت) کی سزا (۵:۳۳)

۳۸۔۔۔ جو ما انزل اللہ (کتاب اللہ) کے مطابق معاملات کے فیصلے نہیں کرتا وہ ظالم ہے۔ فاسق ہے بلکہ کافر ہے (۵:۴۴؛۴۵؛۴۷)

۳۹۔۔۔ رسول اللہ کو حکم کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں۔ (۵:۴۹)

۴۰۔۔۔ اسلامی نظام کا مرکز (کعبہ) نوع انسان کے قیام کا موجب ہے (۵:۹۷)

۴۱۔۔۔ جو کچھ دین سے متعلق تھا وہ اصولی طور پر قرآن میں آگیا ہے۔ جو بات اس میں نہیں دی گئی اس کے متعلق خواہ مخواہ کرید نہیں کرنی چاہیئے۔ اصولی احکام کی جزئیات اسلامی مملکت کو خود متعین کرنی چاہئیں (۵:۱۰۱)

۴۲۔۔۔ اسلامی نظام میں حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے یعنی حکومت، کتاب اللہ پر عمل کرنے کے لئے قائم کی جائے گی (۶:۵۷)۔(۶:۶۲)

۴۳۔۔۔ اس نے مفصل کتاب (ضابطۂ قوانین) دے دی ہے اس کے علاوہ کسی اور حکم نہیں تسلیم کرنا چاہیئے۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

(۶:۱۱۵) اتباع اسی کتاب کا ہوگا۔ اکثریت کے فیصلوں کا نہیں (۶:۱۱۷)
۴۴۔۔۔ قانون کے الفاظ اور روح دونوں کی پابندی لازمی ہے (۶:۱۲۱)
۴۵۔۔۔ حکومت اس لئے ملتی ہے تاکہ دیکھا جائے کہ تم اختیارات کا استعمال کس طرح کرتے ہو (۶:۱۶۶)
۴۶۔۔۔ بغیر حق کے بغاوت جائز نہیں (حق سے مراد قرآن کے مطابق" ہے) (۷:۳۳)۔(۴۲:۴۲)
۴۷۔۔۔ اسلامی نظام' انسانوں کی خود ساختہ پابندیوں کو توڑتا ہے اور اس طرح انسانوں کو صحیح آزادی عطا کرتا ہے (۷:۱۵۷)
۴۸۔۔۔ آزاد خطۂ زمین' اقتدار' فراوانی رزق' حکومت کا مل جانا خدا کا فضل ہے۔ (۸:۲۶)
۴۹۔۔۔ اسلامی نظام سے خیانت نہ کرو۔ اور جو امور تمہیں تفویض کئے جائیں انہیں امانت سمجھو۔ اور ان میں بھی خیانت نہ کرو (۸:۶۲-۶۴)
۵۰۔۔۔ مال و دولت اور اولاد کی کشش تمہیں اپنے نظام سے خیانت پر آمادہ نہ کر دے (۸:۲۸)
۵۱۔۔۔ قوانین خداوندی اور جماعتِ مومنین کی تائید و نصرت کافی ہے۔ لیکن اسی جماعت کی جس کے افراد کے دلوں میں اختلاف (۸:۶۲-۶۴)
۵۲۔۔۔ اسلامی نظام کے مراکز مسجدیں کہلاتی ہیں۔ یعنی وہ مقامات جہاں قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان کی آبادی صرف مومنین سے ہوتی ہے۔ مشرکین سے نہیں (۹:۱۷-۱۸)
۵۳۔۔۔ دنیا کی کوئی شئے بھی نظام خداوندی سے زیادہ عزیز نہیں ہونی چاہیئے (۹:۲۴)
۵۴۔۔۔ جو کچھ اسلامی نظام کی طرف سے ملے اس سے راضی ہو جانا چاہیئے۔ (۹:۵۸-۵۹)
۵۵۔۔۔ مرکز (رسول) تک ہر ایک کی رسائی ہونی چاہیئے۔ (۹:۶۱)
۵۶۔۔۔ مخالفین چاہتے ہیں کہ افراد مملکت کو راضی کریں۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ نظامِ مملکت کو راضی کرنا چاہیئے افراد کے لئے جائز نہیں۔ کہ وہ نظام کے بغیر براہ راست مخالفین سے بات چیت کرنے لگ جائیں (۹:۶۲)
۵۷۔۔۔ نظامِ مملکت کی مخالفت کرنے والوں کے لئے جہنم (۹:۶۳)
۵۸۔۔۔ اسلامی نظام ایک معاہدے پر مبنی ہوتا ہے' افرادِ معاشرہ اپنی جان اور مال نظام کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں اور وہ اس کے عوض جنت عطا کر دیتا ہے (۹:۱۱۱)۔(۴۸:۱۰)۔(۶۱:۱۰)
۵۹۔۔۔ جو حدود خدا نے مقرر کر دی ہیں ان کی حفاظت کرنی ضروری ہے (۹:۱۱۲)
۶۰۔۔۔ تقسیم عمل یوں ہونی چاہیئے کہ کچھ لوگ مرکز میں آکر ٹریننگ حاصل کریں اور واپس جاکر دوسروں کو اس سے آگاہ کریں (۹:۱۲۲)
۶۱۔۔۔ اقتدارِ اعلیٰ (حقِ حکومت) صرف خدا کے لئے ہے (۱۲:۴۰)
۶۲۔۔۔ قمیض یا یوجی کے ساتھ وابستہ رہنے سے قوم زندہ و پائندہ رہتی ہے اس سے انکار کر دینے سے تباہ ہو جاتی ہے (۱۴:۱۸-۲۲)
۶۳۔۔۔ ایک وہ جسے کوئی اقتدار حاصل نہیں دوسرا وہ جو عدل کے ساتھ حکومت کرتا ہے دونوں برابر نہیں ہو سکتے (۱۶:۷۶)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۶۴ــــ صراطِ مستقیم، صرف ایک خدا کی حکومیت اختیار کرنے کا نام ہے (۱۹:۳۶)

۶۵ــــ اسلامی نظام کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہوں گے لیکن ظلم کرنے والا عذاب کا مستحق ہوگا (۲۲:۲۵)

۶۶ــــ اسلامی نظام کا فریضہ، تمام مذاہب کی آزادی، ان کے معبدوں کی حفاظت، امر بالمعروف نہی عن المنکر
نظامِ صلوٰۃ کا قیام، نوعِ انسان کے لئے سامانِ نشوونما کی فراہمی (۲۲: ۳۹-۴۱)

۶۷ــــ الحق، لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہیں کرتا۔ لہٰذا اسلامی نظام کے سب فیصلے قرآن کے تابع ہوں گے (۲۳:۷۰)

۶۸ــــ صرف خدا کو مان لینا کافی نہیں، الحق (قرآن) کا ماننا بھی ضروری ہے (۲۳: ۸۴-۹۰)

۶۹ــــ اپنے تمام فیصلے نظامِ خداوندی سے کرانے اور ان سے سرتابی نہ برتنا یہ اسلام ہے (۲۴: ۴۷-۴۹)

۷۰ــــ نظامِ مملکت کے لئے کتاب اللہ کافی ہے (۲۹:۵۱)

۷۱ــــ استخلاف فی الارض، ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ حکومیت صرف
خدا کی اختیار کی جائے۔ اسی کا نام دین کا تمکن ہے۔ (۲۴:۵۵)

۷۲ــــ جب اسلامی نظام کسی اجتماعی معاملے کے لئے بلائے تو بلا اجازت چلے نہیں جانا چاہیئے (۲۴:۶۲)

۷۳ــــ حکومت میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اسلامی نظام خالص قرآن کے مطابق قائم ہوگا (۲۵:۲)-(۲۸:۷۰)

۷۴ــــ خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے بعد کسی کو اختیار باقی نہیں رہتا۔ آخری فیصلہ نظام کی مرکزی اتھارٹی کا ہے (۳۳:۳۶)

۷۵ــــ معاملات کے فیصلے الحق (قانونِ خداوندی) کے مطابق کرو اپنے جذبات کا اتباع کرو (۳۸:۲۶)

۷۶ــــ نظام مشاورتی ہوگا (۴۲:۳۸)

۷۷ــــ بعض امور میں بھی غیر اللہ کے فیصلے قبول کرنا، باطل کا نظام ہے (۴۷:۲۶)

۷۸ــــ ہر معاملے میں نظام کے فیصلوں کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اپنے فیصلوں کو نظام کے فیصلہ پر مقدم نہیں کرنا چاہیئے (۴۹:۱-۲)

۷۹ــــ جب فاسق کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ (۴۹:۶)

۸۰ــــ اگر رسول اکثر معاملات میں تمہاری بات ماننے لگ جائے تو تم مصیبت میں پھنس جاؤ (۴۹:۷)

۸۱ــــ جب مسلمانوں کی دو جماعتوں میں لڑائی ہو جائے تو مرکز ان میں صلح کرا دیگا۔ اور اس کے بعد جو زیادتی کرے گا
تو اس سے عند الضرورت جنگ کرے گا۔ (۴۹:۹)

۸۲ــــ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں (۴۹:۱۰)

۸۳ــــ ضابطۂ قوانین، میزانِ عدل اور شمشیرِ خارہ شگاف۔ یہ چیزیں اسلامی نظام کے لئے ضروری ہیں (۵۷:۲۵)-
کسی قانون کی دانستہ خلاف ورزی کرنا درحقیقت نظام کے خلاف اعلانِ جنگ ہے (۵۸:۵-۲)

۸۴ــــ اگر نظام، واقعی نظامِ خداوندی ہو تو اس کا غالب رہنا یقینی ہے (۵۸:۲۱)

۸۵ــــ اطاعت "معروف" میں ہوگی یعنی ان معاملات میں جنہیں نظام قانون کی حیثیت سے نافذ کرے پرائیویٹ
معاملات میں افراد کو آزادی ہوگی (جیسے قصہ حضرت زیدؓ میں مذکور ہے (۳۳:۳۷)-(۶۰:۱۲)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۷۹ــــ اطاعت قرآن کی کرو کسی "آثم و کفور" کی اطاعت مت کرو۔ (۷۶:۲۴)۔ (۱۹:۹۶)

۸۰ــــ مومنین کا شعار "تواصوا بالحق اور تواصوا بالصبر" ہے۔ استقامت کے ساتھ حق کی اطاعت کرنے کی [illegible] رہنا اسی سے کامیابی ہو سکتی ہے (۱۰۳:۳-۲)

[illegible] ہر قوم کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری قوم سے آگے بڑھ جائے اسلامی نظام تو [illegible] جاتا ہے۔ (۱۱:۹۲)

[illegible] اسلامی نظام کو شکست نہیں دے سکتا (۴:۲۹)

[illegible] خدا کی طرف رجوع کرتے [illegible] یعنی ہر معاملہ میں کتاب اللہ سے فیصلہ لیتا ہے (۱۵:۴۱)

[illegible] درجات کا تعین اعمال اور جوہر ذاتی کے مطابق ہوتا ہے (۱۹:۴۲)۔ (۴۹:۱۳)

[illegible] بڑائی اور کبریائی چاہنا غلط ہے (۷:۱۴۶)

[illegible] اسلامی نظام کے قیام و استحکام کے لئے صاحب دولت اپنی دولت دیں اور صاحب لوگ اپنی محنت پیش کریں [illegible] ہے (۹:۷۹)

۹۴ــــ اسلامی نظام لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے تابع نہیں ہوتا۔ وہ صرف وحی خداوندی (قرآن) کے تابع ہوتا ہے۔ اگر حق، لوگوں کے خیالات کے تابع ہو جائے تو کائنات میں فساد برپا ہو جائے (۲۳:۷۱)

۹۵ــــ خدا کے سوا کوئی حکم نہیں ہو سکتا (۶:۵۷)

۹۶ــــ اسلامی نظام میں امت میں مختلف پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ پارٹیاں صرف دو ہوتی ہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان (۵۸:۱۹-۲۲)۔ مذہبی فرقے ہوتے ہیں۔ (۳:۱۰۴)۔ (۶:۱۶۰)۔ (۳۰:۳۲)

۹۷ــــ اس نظام میں عدل ہوتا ہے۔ عدل سے مراد ہے ان قوانین کے مطابق فیصلہ جو وحی خداوندی (الحق) پر مبنی ہوں (۷:۱۵۹)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۴۔ کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

موجودہ زمانے کا انسانی علم اس حقیقت پر متفق ہے کہ ہمارے اردگرد کے ماحول یعنی زمین، کرۂ ہوا، خلاء، چاند، تارے، سیارے اور سورج وغیرہ کو جسے ہم کائنات کہتے ہیں، انسانی منفعت کی سطح تک پہنچنے کے لیے بیشمار ارتقائی مراحل میں سے گزرنا پڑا ہے۔ قرآن حکیم نے چودہ سو سال پہلے، جب کسی انسان کے تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی، کہہ دیا تھا کہ شروع شروع میں آسمان اور زمین سے جڑے ہوئے تھے۔ پھر انہیں جدا جدا کر دیا گیا (۲۱:۳۰)۔ یہ ایک ہیولیٰ تھا۔ اس میں توڑ پھوڑ ہوئی اور مختلف کرّے وجود میں آگئے۔ ارتقاء کے ان مراحل میں صرف ان تبدیلیوں کو برقرار رکھا گیا جو انواع مخلوق کی بقا کے لئے مفید تھیں۔ زمین کو انسان کے لئے "مستقر اور مستودع" بنایا جانا تھا۔ لہٰذا اسے بھی بہت سے مراحل سے گزارا گیا۔ حتیٰ کہ یہ انسان کی طبعی اور روحانی دونوں زندگیوں کے مقاصد پورا کرنے کے قابل ہو گئی۔ اگر اسے قدرے زیادہ گرم یا قدرے زیادہ سرد رہنے دیا جاتا تو انسان کب کا مفقود ہو گیا ہوتا جس طرح اس کی بیشتر مخلوق معدوم ہو چکی ہے۔ چنانچہ کئی صدیوں کے بعد پیدا ہونے والے اعتدال، تناسب اور توازن کی صحیح موزونیت نے زمین کو اس قابل بنا دیا ہے کہ اس پر بسنے والا انسان آج نہ صرف زندہ ہے، بلکہ اپنے انسانی جوہر کے ارتقا کے لئے بھی اپنے ماحول کو اپنی مدد پر مجبور کر رہا ہے، اور کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں عقل و دانش کی قوت کو آگے بڑھا رہا ہے۔ بلکہ اب تو اپنے طبعی ماحول کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے پر بھی قادر ہو چکا ہے۔ یعنی اس طرح گویا اپنے وجود کی بلند تر سطح کا خود ثبوت مہیا کر رہا ہے۔ تاہم تسخیر فطرت کی طرف اس کا قدم بڑھانا تو صرف چند صدیوں کی بات ہے اس سے پہلے ہزاروں سال تک انسان فطرت کی قوتوں کے ہاتھوں پریشان رہا ہے۔ قدیم زمانے کا انسان سمجھتا تھا کہ وہ ایسی مخالف قوتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے جو اسے نیست و نابود کر دینے کے درپے ہیں۔ لہٰذا اس کی بقا اسی میں ہے کہ وہ ان قوتوں کو خوش اور راضی رکھنے کے لئے ان کی خوشامد اور دلجوئی کرے۔ پس اس نے ان قوتوں کی تجسیم کر کے انہیں دیوی دیوتا بنا لیا۔ احساس کمتری اور ناامیدی سے گھبرا کر اس نے خیریت اسی میں جانی کہ ان خداؤں سے رحم کی "بھیک" مانگی جائے۔ چنانچہ اس نے تیز اور تند طوفانوں، بپھرے ہوئے دریاؤں اور گرجتی کڑکتی بجلیوں کو رام کرنے کے لئے وہی طریقے استعمال کئے جو اس نے کسی غضبناک یا غیظ و غضب میں آتے ہوئے کسی اور انسان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے استعمال کئے تھے۔ تاہم جیسے جیسے اس کے علم اور تجربے میں اضافہ ہوتا گیا انسان اپنے دنیاوی ماحول سے مطابق یہ ابتدائی نظریہ بھی تبدیل ہوتا گیا۔ اب "دیوی پوجا" کی جگہ جادو اور ٹونے ٹوٹکوں نے لے لی۔ یہ تبدیلی گویا عقلیت کی طرف پہلا قدم تھی کیونکہ خارجی قوتوں کی گرفت سے آزاد ہونے اور اپنی داخلی قوتوں کی طرف رجوع کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ زمانہ سحر کے انسان نے اپنے آپ کو نسبتہً زیادہ محفوظ جانا پھر اس نے فطرت پر قابو پانے کے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

متعلق بھی سوچنا شروع کردیا۔ چنانچہ اس عہد کے تھوڑے ہی عرصے بعد انسان کی عقل نے فطرت کو اسباب و علل کے قانون کے ذریعے سمجھنے کی کوشش شروع کردی۔ اب جسمانی بیماریوں کا علاج بھی جڑی بوٹیوں کی مدد سے ہونے لگا۔ اور "بوٹینی" جو بعد میں سائنس بن گیا۔ جڑی بوٹیوں کے علم کے طور پر پیدا ہو گیا۔

اس قدر ترقی کے باوجود ابتدائی اطباء، "وید" حکیم اور فلسفی کے ذہن پر یہ بات بدستور مسلط رہی کہ فطرت انسان کی دشمن ہے۔ افلاطون نے عقلیت پر زور دینے کے باوجود ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس نے پوری دنیا کو آج تک متاثر کر رکھا ہے۔ کہا اس نے یہ کہ انسانی عقل جن صوری اشکال اور خیالات پر محیط ہو سکتی ہے ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ دنیا بہت کوتاہ دامن ہے اس لئے اصل دنیا کہیں اور ہے۔ یہ دنیا جو ہمارے حواس کے سامنے ہے اس مثالی اور حقیقی دنیا کی محض ایک نقل یا عکس ہے۔ اس نظریئے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا سے نفرت کی جانے لگی۔ اور ان دیکھی مثالی دنیا کی طرف رغبت پیدا ہو گئی۔ افلاطون نے اہل فکر و دانش سے کہہ دیا کہ تم ابدی اشکال صوری اور خیالات میں مستغرق رہو۔ اور اس عارضی اور نقلی دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔ کسی شخص حتیٰ کہ اس کے قابل ترین شاگرد ارسطو کے ذہن میں بھی یہ بات نہ آئی کہ وہ اس سے کہتا "دیکھئے یہاں ہم نقلی انسانوں کو اپنی نقلی دنیا سنوارنے دو، وہاں کے اصلی انسان اپنی اصلی دنیا کو سنوار لیں گے۔" چونکہ قرآن حکیم سے پہلے فطرت کو تسخیر کرنے کا تصور ہی کہیں نہیں اور نہ کوئی عظمت و حرمت آدم کی قدر سے واقف تھا اس لئے افلاطون کی عالم امثال والی بات چل نکلی اور دنیا بھر کے مذاہب و مکاتب فکر اسی ایک بات کی دلدل میں پھنس کر رہ گئے۔ اس مثالی دنیا یا اسے افلاطونی فلسفے کی بازگشت قدرے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں نو فلاطونی مکتب فکر میں ملتی ہے جو ہر قسم کے تصوف کا منبع اور ماخذ ہے، آج بھی پکا اور سچا صوفی طبعی دنیا اور اس کے ماحول کو بنیادی طور پر "شر" سمجھتا ہے۔ اور اس کے ترک کر دینے کو اپنا عین فرض جانتا ہے، وہ اس فرض کی ادائیگی میں غلو کی اس حد تک چلا جاتا ہے کہ دنیاداری کی کسی بھی چیز کے قریب نہیں جاتا کہ اس کا دامن کہیں اس دنیا کی کثافتوں سے آلودہ نہ ہو جائے۔ وہ طبعی دنیا سے ہر قسم کے تعلقات کاٹ ڈالنے کو ہی اپنا ذریعہ نجات سمجھتا ہے اس کے علاوہ صوفیا افلاطون کے نظریۂ علم کی بھی تائید کرتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ حواس ہمیں دھوکہ دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعے سے حاصل کیا ہوا علم قابل اعتماد نہیں ہے۔ حواسی مدرکات سے کسی حد تک رائے تو قائم کی جا سکتی ہے لیکن ان سے صحیح علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح علم کے حصول کا ذریعہ صرف عقل ہے۔ لہٰذا فطرت کا مشاہدہ کرنے کی بجائے ہمیں ماورائی حقیقت پر اپنی نگاہیں مرکوز رکھنی چاہئیں۔ چنانچہ صوفیا تنہائی کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ محو استغراق رہ سکیں۔ یہ لوگ اپنے آپ میں گم رہ جانے کی وجہ سے فطرت اور انسانی معاشرے دونوں سے منقطع رہتے ہیں۔ انہیں معاشرتی مسائل اور ان کے حل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہر سماجی نظام خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو ان کے لئے ایک جیسا یعنی نہ اچھا نہ برا ہوتا ہے۔ عام انسان کی زندگی کو بہتر اور زیادہ خوشگوار بنانے کا مقصد ان کے نزدیک بے معنی ہے کیونکہ یہ ترک دنیا و ترک علائق ہی کو مثالی زندگی سمجھتے ہیں لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اشتراک عمل کرنا، باہمی مودت و تعاون وغیرہ ان کے لئے سخت ناپسندیدہ باتیں ہیں چونکہ اپنی داخلیت میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے یہ دوسری دنیا کے تصور میں کھوئے رہتے ہیں۔ اس لئے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

معاشرتی بہبود کے منصوبے ان کے ذوقِ عمل کی راکھ میں کوئی چنگاری نہیں ڈھونڈ سکتے۔ اسی طرح ان کے فہم میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ فطرت کے قوانین کو سمجھ لینے اور اس کی قوتوں پر قابو پا لینے سے ان کی اپنی نشوونما میں کہیں زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ علم فطرت کے حاصل ہو جانے سے انسان اپنے آپ کو بھی زیادہ اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کو بیشمار صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے، لیکن یہ صلاحیتیں سب کی سب قابلِ شہود امکانات (REALIZABLE POTENTIALITIES) کی صورت میں ہیں ان صلاحیتوں کو معاشرے سے الگ ہو کر نہیں پرکھا اور آزمایا جا سکتا۔ انہیں جانتے پہچاننے اور آزمانے کے لئے ہمیں انسان کا مطالعہ اس کے طبعی ماحول کے حوالے سے ہی کرنا ہوتا ہے کیونکہ انسانی جوہر کی نمود صرف ماحول اور انسانوں کے عمل اور ردِ عمل سے ہو سکتی ہے۔ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اور تکمیل کے لئے فطرت سے بھی تجربہ آزمائی ضروری ہے۔ جس چیز کو یہ لوگ رُوحانیت کا نام دیتے ہیں یا جسے رُوح کا ارتقا کہا جاتا ہے وہ اگر جسمانی اور عقلی و ذہنی نشوونما سے ہٹ کر کوئی چیز ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ انسانی وجود "روح اور جسم" دونوں کے امتزاج کا نام ہے، اکیلے جسم یا اکیلے رُوح کا نام نہیں۔ انسانی سطح کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں کبھی ایک پہلو کو دوسرے پہلوؤں پر ترجیح دے کر یا انہیں نظر انداز کر کے ترقی کرنا حسن و توازن کے خلاف ہے۔ انسان کو جسمانی۔ ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی ہر اعتبار سے اپنی شخصیت کو مکمل کرنا چاہیے۔ تارک الدنیا صوفی معاشرے کے ساتھ تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے تکمیلِ ذات کے عظیم انسانی فریضے کی ادائیگی میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم دُنیا سے اس طرح کی بیزاری اور بیگانگی کو پسند نہیں کرتا۔

یہ رُہبانیت پھر بھی قابلِ برداشت ہے کیونکہ گنتی کے چند آدمی اسے اختیار کر لیتے ہیں اور ارض و سموات سے رشتہ کاٹ کر خالقِ ارض و سموات سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان چند انسانوں کی روش کا کوئی اثر دوسرے انسانوں کی زندگی پر نہیں پڑتا۔ تاہم جدید رہبانیت کی وہ قسم انتہائی خطرناک ہے، جو انگریز حاکموں نے وراثت کے طور پر اپنے سابقہ غلام ملکوں کو آزاد کر کے افسریت کے نام سے عطا کی ہے۔ یہ جدید رہبان ارض و سموات سے منقطع رہنے کے علاوہ خالقِ ارض و سماوات سے بھی رشتہ کاٹ لیتے ہیں۔ اور جب ان کی خود نگر رہبانیت میں حاکمیت کا تصور بھی شامل ہو جاتا ہے۔ تو خود نگری ان کی داخلیت کو اور زیادہ عمیق اور سنگین بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ بیوی بچوں۔ بہن بھائیوں اور خویش و اقارب کے درمیان بھی حاکمیت کا خول پہنے رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر کہیں یہ خول اترنے لگے تو یہ فوراً اپنے گرد اہنی فصیلیں تعمیر کر لیتے ہیں۔ انگریز نے تو ان عمالِ حکومت کو "خادمانِ خلق یعنی پبلک سرونٹ کہا تھا کیونکہ یہ عوامی خزانہ سے تنخواہیں پاتے تھے۔ لیکن بعد میں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد چھوٹے چھوٹے ملازم بھی اپنے آپ کو سرکاری عہدیدار یا گورنمنٹ سرونٹ کہلواتے ہیں اور عوام الناس سے جو لفظی حد تک اس کا رابطہ تھا۔ یہ اسے بھی گوارا نہیں کرتے۔ ان رہبانوں کی ایک پوری کی پوری کھیپ ہے جو شہروں کے اندر رہتے ہوئے شہروں سے بہت دور اپنی داخلیت کے حصاروں میں پرورش پا رہی ہے، اور عملاً اس نظام کی نفی کر رہی ہے جو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت نے قائم کر دکھایا تھا۔

فطرت کی انسان دشمنی کا خیال ابھی تک بعض انسانوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ اور اس کی صدائے بازگشت بھی بعض قنوطی مفکرین کی طرف سے سُنائی دیتی ہے۔ ہارڈی، شوپن ہار، مہاتما بدھ، نطشے اور ژاں پال سارتر وغیرہ نے زندگی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو اسی یاسیت کے پس منظر میں دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک امن و سکون صرف اسی صورت میں نصیب ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے وجود کو ختم کر دے یا اس کے رابطے کو تمام دنیا سے منقطع کر دے۔ اس خیال کے سپر پہلو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ "فطرت" کو انسان یا اس کے مقاصد سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انسان کامیاب ہو یا ناکام رہ جائے فطرت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ ارتقائے کائنات میں انسانی کارناموں کی تاریخ چند لمحاتی واقعات سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ آج انسان سطحِ زمین سے غائب ہو جائے تو بھی یہ زمین اپنے محور پر سورج کے گرد صدیوں تک گھومتی رہے گی۔

قرآن حکیم ان دونوں نظریات کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فطرت انسان دشمن نہیں دوست ہے، اس کی عقل و خرد کی ہر پکار کو مثبت جواب دیتی ہے۔ اور اس کے اخلاقی سعی و عمل سے ہمدردانہ رویہ رکھتی ہے۔ فطرت اور انسان دونوں کو ایک ہی خالق نے تخلیق کیا ہے۔ لہٰذا بنیادی طور پر انسان اور فطرت کے درمیان کسی تضاد اور کشمکش کے عناصر نہیں ہیں۔ انسان اپنی نشوونما فطرت کی مدد اور استعانت کے بغیر کر ہی نہیں سکتا۔ تاہم یہ مدد اور استعانت اسے صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان فطرت بارے علوم حاصل کرے۔ پھر ان معلومات کے ذریعے فطرت کے بے پناہ خزانوں کو اپنے قبضے میں لے اور ان خزانوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق پوری انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لئے استعمال میں لا کر اپنی اخلاقی قدروں کو آگے بڑھاتا چلا جائے۔ یہی وہ مقصد ہے کہ جس کے پیش نظر فطرت کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ "اللہ وہ ہے جس نے ارض و سماوات کو تخلیق کیا۔ اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے تمہارے لئے میووں اور پھلوں کا رزق نکالا اور تمہارے تابع فرمان کر دیا۔ دریاؤں کو، اور تمہارے تابع فرمان بنا دیا سورج اور چاند کو جو برابر ایک ہی روش پر چل رہے ہیں اور تمہارے تابع فرمان بنا دیا رات کو اور دن کو، اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے مانگی اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو کبھی پورے نہ آ سکو گے۔ بے شک انسان بڑا ہی ناشکرا حد سے بڑھ جانے والا ہے۔" (۱۴ : ۳۲، ۳۴) جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے سب کے سب کو تمہارے تابع فرمان کر دیا گیا ہے اللہ کی طرف سے بے شک اس بات میں نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو سوچ بچار کرتے ہیں۔" (۴۵ : ۱۳)۔

سوچ بچار کرنے والوں کو اس مادی کائنات میں جو سب سے بڑی نشانی نظر آتی ہے یہ ہے کہ اس سارے کارخانۂ قدرت میں ایسے قوانین کارفرما ہیں جو انتہائی محکم ہیں اور جن میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ دوسری نشانی یہ ملتی ہے۔ کہ ان قوانین کے دریافت کر لینے سے ہم ہر اس چیز پر قابو پا سکتے ہیں جو اس قانون کی پابند ہے پھر اس طرح قابو پا لینے سے ہم اسے اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں۔ لہٰذا انسان کی تقدیر فطرت سے فرار نہیں بلکہ فطرت کی تسخیر ہے۔

دنیا اور ما فیہا سے بے خبری کا فلسفہ جو افلاطونی فکر کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے ہمیں چند اور مکاتب فکر میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کے نزدیک مایا چھایا ہے یعنی دنیا پرچھاؤں یا سایہ جس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہے ایشور (خدا) نے ایک لیلا (یعنی سٹیج شو) رچا رکھی ہے جس کا نٹ راجن (بڑا ایکٹر) وہ خود ہے۔ اس لیلا کا مقصد کوئی نہیں ہے سوائے دل خوش کرنے کے۔ مہاتما بدھ کی منفی تعلیم بھی اس دنیا کو چھوڑ دینے کا حکم دیتی ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک خواہش ہی تمام مصیبتوں کا باعث ہیں۔ ویدانت یعنی ہندی تصوف اور افلاطونی فلسفے کی رُو سے کائنات کو محض فریب سمجھ لیا جاتا ہے،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور خانقاہیت کے مسلک کو اختیار کر لینے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس مسلک کے خلاف قرآن حکیم نے صاف صاف ارشاد فرمایا ہے۔ کہ دین اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے زوردار الفاظ میں نہ صرف قرابیت کے ان تمام مذاہب و مسالک کی تردید کی ہے بلکہ مغربیت کے نظریۂ مادیت کو بھی غلط قرار دیا ہے۔ جس کی رُو سے زندگی محض طبعی زندگی تک ہی محدود ہے۔ اور اس سے آگے نہیں چلتی۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ "ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو یوں کھیل تماشا کے طور پر تخلیق نہیں کیا۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے۔ اور اسے ایک اہم پروگرام کی تکمیل کی خاطر وجود میں لایا گیا ہے (۲۱ : ۱۶)" اگر ہمیں اپنے لئے کوئی کھیل تماشا بنانا ہوتا تو ہم ایسا بھی ضرور کر ڈالتے اور اپنے دل بہلاوے کی کوئی چیز بنا لیتے" (۲۱ : ۱۷) لیکن ہم نے کائنات کو اس طرح نہیں بنایا۔ ذرا دیکھو اس میں کیا ہو رہا ہے؟ ہو یہ رہا ہے کہ تعمیری قوتیں (حق) تخریبی قوتوں (باطل) پر برابر کاری ضرب لگاتی رہتی ہیں جن سے یہ تخریبی قوتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ اور تعمیری سلسلہ قدم بہ قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ (۲۱ : ۱۸) گویا ارتقائی مراحل کا اس طرح طے کرتے چلے جانا کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے۔ جو چیز محض کھیل تماشے کے طور پر بلا مقصد و بلا منزل بنا لی گئی ہو اس کی یہ صورت نہیں ہوا کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی۔ چہ جائیکہ وہ کائنات کے پورے نظام کو یونہی عبث تخلیق کرتا۔ آپ تخلیق کائنات پر جتنا زیادہ غور و فکر کریں گے اتنی زیادہ یہ حقیقت آپ پر واضح ہوتی چلی جائے گی کہ یہ دنیا اور یہ کائنات عکس یا سایہ یا فریبِ نظر یا محض دل بہلاوے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اور بامقصد ہے۔ "بے شک سماوات اور ارض کی تخلیق میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ جو کھڑے، بیٹھے اور پہلو پہ لیٹے، اللہ کو سامنے رکھتے ہیں اور سماوات اور ارض کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں اور پھر پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سارا کچھ عبث نہیں بنایا۔ تو پاک ہے سب عیبوں سے۔ پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے (۳ : ۱۹۱) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان کے درمیان میں ہے اسے بیکار نہیں بنایا۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ ہیں کفر کرنے والے (۳۸ : ۲۷) "اللہ نے تو آسمانوں کو اور زمین کو ٹھوس سچائی کے ساتھ تخلیق کیا ہے (۲۹ : ۴۴ ، ۳۸-۳۹ : ۴۴)

واضح رہے کہ کائنات کے اندر ایسی بہت سی قوتیں ہیں جو ہماری آنکھوں سے اوجھل اپنا کام پوری مستعدی سے کر رہی ہیں۔ ستاروں کی گردش، ان کے اندرونی اور بیرونی عوامل، سورج کے گرد زمین کی کروڑوں سالوں سے برابر چلتی رہنے والی گیسیں روشنی۔ ہوا، پانی، بجلی۔ ایٹمی نظام، مقناطیسی لہریں، اشعۂ نور، کشش ثقل، رتق فتق کا عمل مسلسل، اور خدا جانے کیا کیا کچھ اس سارے نظام کو قاعدے اور قانون کے مطابق چلا رہا ہے۔ کوئی نظام اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس نظام کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی اپنے فرائض میں کامل اطاعت کا مظاہرہ نہ کرے۔ انسان کی بنی ہوئی کسی مشین ہی کو لیجئے اس میں وہ نٹ بولٹ بھی اہم ترین فریضہ ادا کر رہا ہے۔ جو بظاہر ساکن، بے حرکت اور بظاہر بیکار دکھائی دیتا ہے۔ اس نٹ بولٹ کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ جائے تو ساری مشینری کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس طرح کامل اطاعت اور فرض منصبی کی کماحقہٗ ادائیگی کے لئے عربی زبان میں "سجدہ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی معنے ہیں جھک جانا، جیسے کھجور پھل کے بوجھ سے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جھک جاتی ہے یا جیسے اونٹ سر اور گردن جھکا دیتا ہے کہ آپ اس پر بوجھ لاد دیں۔ اس طرح جسمانی طور پر جھک جانے کا مطلب "تسلیم و رضا" ہے۔ انسان کے ارادے اور اس کے جسم کی حرکت میں ایک گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ سر جھکا دینا، گردن اکڑا لینا، منہ پھیر لینا یا ہاتھ، آنکھ اور چہرے کے اشاروں سے معنی خیز باتیں کر لینا سب اسی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ "سجدہ" سر جھکا دینے کے ظاہری عمل کو اطاعت اور فرماں برداری کے باطنی عمل سے مربوط کرتا ہے

> کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کوئی بھی جاندار ہے، یا ملائکہ فرشتے ہیں سب کی سب اللہ کے سامنے سربسجود ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی تکبر اور سرکشی نہیں کرتا (۱۶ : ۴۹) بلکہ یہ تو وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے (۱۶ تا ۵۰)

گویا کامل اطاعت شعاری ارض و سماوات کی ہر چیز کا وطیرہ ہے اور اسی وطیرے کی بدولت یہ بے نقص اور بے عیب نظام تکمیل مقاصد کی طرف آگے بڑھ رہا ہے، رہا یہ سوال کہ یہ مقاصد کیا ہیں تو اس نکتے کا ایک حد تک جاننا اور پہچاننا اور سمجھنا صرف اسی ذی شعور ہستی کے ذمے لگا دیا گیا ہے جسے "انسان" کہتے ہیں۔ اور جسے اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتیں صرف اسی لئے عطا کی ہیں کہ وہ ان کی مدد سے کائنات کی ہر چیز کو اپنا تابع فرمان بنا کر اس سے منفعت حاصل کرے۔ اور اس منفعت کو عدل و مساوات کے اصولوں پر دوسروں میں بانٹ کر اپنی انسانی ذات کو ارتقائی منازل کی طرف بڑھاتا چلا جائے

BLACK UNIVERSE

کائنات کے اسرار و رموز آہستہ آہستہ انسانی علم پر کھلتے جا رہے ہیں۔ اگر کائنات محدود، جامد اور ساکن ہوتی یا اس میں نت نئے اضافے نہ ہوتے تو اب تک اس کے سارے راز ہائے سربستہ منکشف ہو چکے ہوتے اور انسان کے علمی تجسس کے لئے کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن قدرت کاملہ کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز ہر لمحے اک نئی آن اور اک نئی شان کے ساتھ جلوہ نمائی کرتی رہتی ہے اور اس طرح انسانی علم کو ہمیشہ تگ و تاز میں رہنے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اسی نہج سے "انسانی ذات" کے ارتقا کی سرحد بھی غیر منتہی بن جاتی ہے۔ ——— یہ ہے ہمارا تعلق سماوات سے۔

(۲)

اب کائنات کے اس حصے کی طرف آیئے جسے ہم ارض، زمین یا اپنی دنیا کہتے ہیں۔ "دنیا" قریب ترین چیز کو کہتے ہیں۔ (یہ مؤنث ہے، اس کا مذکر ہے ادنیٰ) چونکہ ہماری زمین کائنات میں ہم سے زیادہ قریب ہے اس لئے اسے دنیا کہا گیا ہے۔ تاہم محاورے میں اس کے معنے مال و دولت، زر، اشیائے زیست سے محبت کے ہیں۔ قرآن حکیم نے حیٰوۃ الدنیا کو آخرۃ کے مقابلے میں کم قیمت قرار دیا ہے۔ ایسا کیوں کیا ہے۔ ہ آئندہ سطور میں اسی نکتے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جن مذاہب یا مکاتب فکر میں روح اور مادے کو الگ الگ تصور کر لیا گیا ہے ان میں دنیا اور اس کے لوازمات کو قابل نفرت قرار دے دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں کے بعض لوگ بھی اس سے متاثر ہو کر دنیا کو قابل حقارت سمجھنے لگ گئے ہیں۔ چنانچہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں دنیا کا لفظ آخرۃ کے مقابلے میں آیا ہے نہ کہ دین کے مقابلے میں۔ ہم یہ حقیقت کئی بار دہرا چکے ہیں۔ کہ دین کی شاہراہ دنیا سے گزرتی ہے جہاں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

انسانی روابط بنتے بگڑتے اور سلجھتے الجھتے رہتے ہیں۔ اور قدم قدم امتحانوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم نے مومنین کو فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا اور فِی الْاٰخِرَةِ کے حسنات طلب کرنے کی دعا سکھائی ہے (۱۵۶ : ۷) ایک جگہ ارشاد ہوا ہے "کفار نے تقویٰ اختیار کرنے والوں سے پوچھا کہ تمہارے رب نے تم پر کیا نازل کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا "خیر" ہمارے پروردگار نے خیر نازل کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو حسن و خوبی پیدا کرتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی اچھائیاں ہیں اور آخرت میں بھی خیر والا گھر ہے۔ کیا ہی نعمتوں والا گھر ہے یہ متقین کے لئے!" (۳۰ : ۱۶) حسنِ عمل کا نتیجہ آخرت کے علاوہ اس دنیا کی خوشگواریاں بھی ہیں۔ بلکہ قرآن حکیم نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو اس دنیا میں اندھا رہا ہے وہ اگلی دنیا میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا ——— اور بالکل راہ گم کردہ!" (۷۲ : ۱۷)

اس آیتِ جلیلہ کے دوسرے ٹکڑے "بالکل راہ گم کردہ" نے اندھے کے مفہوم کو کھول کر بیان کر دیا ہے ظاہر ہے کہ یہاں "اندھا" سے مراد جسمانی آنکھ سے محروم شخص یا قوم نہیں بلکہ وہ شخص یا قوم ہے جو اللہ کے احکام و قوانین سے منہ پھیر لیتی ہے۔ انہیں پس پشت ڈال دیتی ہے۔ اور ان میں اغماض برتتی ہے۔ شاہراہِ زندگی سے بھٹک جانے والا صحیح راستے سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ اور اسے بھوک پیاس خستگی اور درماندگی جیسی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے زندگی کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے اور پھر اسے محرابِ حیات میں کوئی نشانِ راہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اس آیت کی مزید وضاحت آیت (۱۲۴ : ۲۰) میں کی گئی ہے جہاں ارشاد ہوا ہے کہ "جو میرے قانونِ حیات سے اعراض برتے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے" اس آیت جلیلہ میں لفظ ذِکْرِیْ (میرا ذکر) کا ترجمہ ہم نے "میرے قانونِ حیات کیا ہے، اس ترجمے پر وہ لوگ معترض ہو سکتے ہیں جو ذکر سے مراد زبان سے اللہ اللہ کہنا اور اسے تسبیح کے دانوں پر گنتے رہنا لیتے ہیں یا جو خانقاہیت کی پیروی میں اس کا مطلب قلب پر اللہ ہو کی ضربیں لگانا سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اللہ کے ذکر کا مطلب ہے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ہر وقت اور ہر قدم پر، زندگی کے سفر کے ہر موڑ پر کاروبارِ گیہاگہی کے ہر مرحلے پر اللہ کے عطا کردہ قوانین، احکام اور اصولوں کو سامنے رکھنا اور ان سے ذرا بھر بھی انحراف نہ کرنا۔ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ "ذِکر" کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔ ذکر، تذکار کے معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ کر لینا، کسی بات کو یاد رکھنا، حفاظت کرنا۔ ضائع نہ کرنا۔ تذکرہ کے معنی ہیں وہ جس سے کسی کو کوئی بات یاد دلائی جائے، شہرت، عزت، شرف۔ عبرت، موعظت کو بھی ذکر کہتے ہیں اور اس کتاب کو بھی ذکر کہا جاتا ہے جس میں دین کی تفصیلات اور راستوں کے قوانین درج ہوں۔ لہٰذا یہ لفظ قانون کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ذکر اللہ سے مراد اللہ کے وہ قوانین ہیں جن کی پیروی سے شرف و عزت اور غلبہ و قوت حاصل ہوتی ہے اقوام سابقہ کے وہ تاریخی شواہد بھی ذکر ہیں جن سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم اور وحیٔ ربانی بھی ذکر ہے، قرآن حکیم میں ذکر ان سب معنوں میں آتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں "ذِکْرِیْ" (میرا ذکر) سے مراد مقرر کردہ قوانینِ زندگی" مراد لینا انسب ہے۔ مومنین ہر وقت جو دعا مانگتے ہیں۔ یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی عطا فرما۔ اور آخرت کی خوشگواریاں بھی اور ہمیں اَلنّار کے عذاب سے بچا لیجیو!

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تاہم قرآن حکیم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں متاعِ دُنیا کو قلیل اور دُنیا کی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے متاع کے معنے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہ وہ سامان ہے جس کے بغیر زندگی کے سفر کا طے ہونا ممکن نہیں ہے اور اگر یہ سامان زیادہ ہو جائے تو راہرو کی کمر توڑ دیتا ہے۔ اور سفر ادھورا یا بے منزل رہ جاتا ہے، لہو ایسے کام کو کہتے ہیں جو اصل مقصد سے ہٹا دے۔ اور لعب وہ فعل و عمل ہے جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو یا جو بے فائدہ، رائگاں اور اکارت چلا جائے دنیا کو لہو و لعب کیوں کہا گیا ہے؟ اس کے سمجھنے سے پہلے قرآن حکیم کے دو الفاظ آخِرۃ اور عاجلہ کے معنے سمجھ لینے ضروری ہیں۔ کیونکہ دنیا کو لہو و لعب آخِرۃ کے مقابلے میں کہا گیا ہے

آخِرۃ ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی پہلے آنے والی چیز کے بعد آ رہی ہو لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آئے۔ گویا آخِرۃ کسی سلسلے کی اگلی NEXT کڑی ہے جس کے بعد پھر اُس جیسی کڑیاں نہیں آتیں تاہم یہ ضروری نہیں کہ یہ آخری LAST کڑی ہو۔ لہٰذا اس دنیا کی زندگی کی آخری کڑی کا نام آخرت ہے یعنی یہ زندگی ہے جو موجودہ زندگی کے تسلسل میں آئے گی اور اس سے اس دنیا میں طبعی اسباب سے شروع ہونے والی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور ایک نئے انداز کی زندگی شروع ہو جائے گی۔ انسان کی تخلیق کے سلسلے میں خَلقاً آخر کے لفظ استعمال ہوئے ہیں جن کے معنے ہیں ایک بالکل نئی مخلوق جو پہلی مخلوق کی اگلی کڑی تھی اور پہلے سے مختلف تھی۔

جو لوگ اس آنے والی دوسری زندگی کے بارے میں موجودہ زندگی کے طبعی قوانین کے مطابق سوچتے ہیں انہیں اس بات کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے کہ اس نئی زندگی کی صورت کیا ہوگی۔ لیکن وہ اہل علم و دانش جو طبعی قوانین سے ہٹ کر ان تبدیلیوں کا بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جو کارخانۂ قدرت میں اچانک نمودار ہو جاتی ہیں۔ اور ان انقلابات پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ جو دل و دماغ کی کیفیات میں اچانک وارد ہوتے ہیں۔ وہ آخرت پر یقین رکھنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کرتے ان کے نزدیک یہ وہ مستقبل ہے جو دفعتہً پیدا ہونے والے انقلاب (EMERGENT EVOLUTION) کے ذریعے ظہور میں آتا ہے۔ اور جو فطرت کے قوانینِ تخلیق کا انوکھا مگر مستمر انداز ہے۔ ہر آغاز کا انجام ضرور ہوتا ہے لیکن چونکہ زندگی جوئے آب کی صورت میں مسلسل رواں دواں ہے اس لئے یہاں ہر آغاز انجام پاتے ہی ایک نئے آغاز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم یہ نیا آغاز کولھو کے بیل کی دوری حرکت سے نہیں بلکہ مسلسل آگے بڑھتے رہنے سے سامنے آتا ہے۔ زندگی صراطِ مستقیم پر چلتی ہے دائرے میں چکر نہیں کاٹتی رہتی کہ ہر انجام اسے پھر سے پہلے والے نقطۂ آغاز پر لے آئے

حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ آخروی کے اس فرق کو سمجھ لینے کے بعد "عاجلہ" کا مفہوم سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ بھی آخرت کے مقابلے میں آیا ہے (۱۰:۱۶-۱۸) آپ دو کسانوں کی مثال سامنے رکھیں جن کے پاس فرض کیا ایک ایک من اناج ہے جو انہوں نے بیج کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ یہ بھی فرض کریں کہ دونوں کے ہاں خوراک کی تنگی کے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ اب ان میں ایک داشت اور استقامت کا دامن چھوڑ دیتا ہے اور جھٹ سے بیج کے دانے پسوا لاتا ہے۔ چند گھنٹوں میں اس کے گھر میں روٹیوں کے انبار لگ جاتے ہیں وہ خود بھی مزے سے کھاتا ہے اور دعوتیں کر کے مہمانوں کو بھی کھلاتا دیتا ہے، دوسرا کسان صبر و تحمّل سے کام لیتا ہے تنگی کو جوں توں برداشت کر لیتا ہے، دوستوں کو دعوتیں نہ دینے کے طعنے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بھی سہہ لیتا ہے اور اناج کو زمین میں بو کر چھ سات مہینے سختی سے گزار لیتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے گھر میں دانے ہی دانے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ آئندہ کی زندگی خوشحالی اور فارغ البالی سے بسر کرتا ہے پہلے کسان نے عجلت سے کام لیا۔ اس کی نگاہ مفادِ عاجلہ پر تھی یعنی ایسے مفاد پر جو فوری طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرے کسان کی نگاہ "آخرۃ" پر تھی جو زیادہ فراواں اور زیادہ یقینی تھا۔ لیکن ابتدا میں تھوڑی تکلیف برداشت کرنا پڑتی تھی۔ بس یہی "عاجلۃ" اور "آخرۃ" میں فرق ہے، عاجلہ مفاد فوری مل جاتا ہے لیکن مستقبل کی خوشگواریاں نہیں ہوتیں (١٨: ١٧)

"کوئی کہتا ہے، اے ہمارے پروردگار! ہمیں اسی دنیا میں دے دے، اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور کوئی ان سے کہتا ہے اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی عطا کر اور بچا ہم کو آگ کے عذاب سے، ان لوگوں کے واسطے حصہ ہے اپنی کمائی سے" (٢: ٢٠١-٢٠٢)

جو لوگ مستقبل کی خوشگواریوں پر نگاہ رکھتے ہیں ان کو پہلے تو کچھ محنت کرنی پڑتی ہے لیکن تھوڑی سی تکلیف کے بعد ان کا مستقبل بھی درخشندہ ہو جاتا ہے اور ان کا حال بھی خوشگوار بن جاتا ہے۔ (١٩: ١٧) انسانی زندگی کے مستقبل میں دو چیزیں شامل ہیں۔ (١) دنیاوی زندگی میں موجودہ نسل کے بعد آنے والی نسل اور (٢) دنیاوی زندگی کے بعد آنے والی اگلی زندگی
قرآن حکیم انسانوں کو ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جس کے ذریعے ان دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔

انسان کو اگر صرف عقل کے بھروسے پر چھوڑ دیا جائے تو تجسس کی جلد بازی اور کرگزر کی بے چینی سے مجبور ہو کر وہ مفادِ عاجلہ کے پیچھے لگ جائے گا۔ ہدایتِ ربانی عقل اور علم کی عجلت پسندی کو روک دیتی ہے۔ اللہ کی رہنمائی میں شاہراہِ حیات پر آگے قدم بڑھانے والا اپنی نگاہ مستقبل پر رکھتا ہے۔ عقلِ مفاد پرست کی سیمابی فطرت اس لئے بھی بے چین رہتی ہے کہ اعمال کے نتیجے فوراً برآمد نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھول جاتی ہے ہر تعمیر وقت چاہتی ہے جبکہ تخریب میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ نتائج برآمد ہونے کے سلسلے میں اللہ کے ہاں ایک اور قانون بھی ہے جسے قانونِ مہلت کہا گیا ہے۔ مثلاً بیج کے پھوٹنے سے کر تناور درخت بن جانے اور اس کے بار آور ہونے تک کے لئے خاصہ وقفہ درکار ہے، ہمارے اعمال کے نتائج بھی اسی قانون کے تحت کچھ دیر کے بعد برآمد ہوتے ہیں۔ خاص طور پر غلط اور ممنوعہ اعمال کے نتائج کا فوری طور پر سامنے نہ آنا تو اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور نعمت و کرم کا ثبوت ہے، ورنہ اگر مثال کے طور پر جھوٹ بولتے ہی زبان ٹیڑھی ہو جاتی چوری کرتے ہی ہاتھ کٹ کر الگ ہو جاتا یا کسی پر ظلم کرتے ہی آدمی پتھر بن جاتا تو "زندگی" ایک قدم پر بھی آگے نہ بڑھ سکتی، اللہ کے قانونِ مہلت کی غرض و غایت اس عظیم حقیقت کی ترجمان ہے۔ کہ غلط اعمال پر گرفت کا اولین مقصد "سزا" نہیں بلکہ "اصلاح" ہے۔ یعنی واپس آنے کا موقع فراہم کرنا۔ باز آمدن، رجعت الی الحق اور توبہ عملی اقدامات ہیں، جن سے غلط کاموں کے نتائج کو روک لیا جاسکتا ہے۔ تاکہ تلافیٔ مافات کی گنجائش پیدا ہو سکے۔ غلطی کا احساس اس احساس کے بعد غلط روش سے اجتناب اور پھر صحیح روش پر گامزن ہو جانا "اصلاح" کے ضروری عناصر ہیں۔ فرد اور ملت دونوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے یہی طریقہ کار ہے۔ قصہ آدم میں بھی انسان کو اسی صلاحیت باز آفرینی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ آدم کو حکم دیا گیا کہ "مشاجرت" کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔ لیکن اس نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ ابلیس کو حکم دیا گیا۔ کہ وہ آدم کو

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سجدہ کرے لیکن اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ آدم نے بھی معصیت کی، ابلیس نے بھی معصیت کی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے ندامت سے سر جھکا کر کہا "اے ہمارے پروردگار! ہم سے بھول ہو گئی ہے ہم اپنے کیے پر نادم ہیں۔" آدم نے اپنی ذمہ داری اور خطا کو قبول کر لیا اور ندامت کا اظہار کیا۔ لہٰذا اس کے اندر "بازآفرینی" کی گنجائش تھی اس بنا پر اس کی توبہ بھی قبول ہو گئی۔ لیکن جب ابلیس سے پوچھا گیا کہ تم نے نافرمانی کیوں کی؟ تو اس نے کہا جب تیرے حکم کے بغیر ایک پتا تک نہیں ہل سکتا پھر میں کون ہوتا ہوں معصیت کرنے والا؟ تو نے ہی مجھے گمراہ کیا ہے، اس بنا پر اس کے تکبر پر اسے کہا گیا تو اپنی ذمہ داری ہی قبول نہیں کرتا اور نہ اپنے کیے پر نادم ہوتا ہے اس لئے تو بازآفرینی سے بہت دور ہے تیری اصلاح نہیں ہو سکتی، تو ہمیشہ مردود رہے گا۔

بات ہو رہی تھی مستقبل پر یقین رکھنے اور نہ رکھنے کی، اور ہم نے دو کسانوں کی مثال دے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ جو کسان بیج کے لئے رکھے ہوئے اناج کو پسوا کر استعمال کر لیتا ہے اس کی "آج کی بھوک" تو مٹ جاتی ہے لیکن آخرت کے طویل "کل کی بھوک" اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ لیکن جو کسان تھوڑی سی تکلیف، محنت اور صبر کی کوفت کو برداشت کر لیتا ہے اس کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے اور جب یہ سلسلہ تواتر سے چل نکلتا ہے تو پھر اس کا "آج" بھی خوشگوار اور "کل" کا مستقبل بھی آسودہ ہو جاتا ہے۔ یہ اسلام کا پیش کردہ اجتماعی اصول ہے جس کی طرف شہر اور دیہات کے کرنے کونے سے روزانہ دن میں دس مرتبہ بلایا جاتا ہے کہ "فلاح" کے اس اجتماعی نظام کو زندہ رکھو، اسی کی طرف آؤ اور متاعِ حیات کو مسلسل اور متواتر گردش میں رکھو، رزق کے چشمے لگاتار جاری رہنے چاہئیں۔ نہ ان کے آگے بند باندھے جائیں نہ ان کا رخ اپنے ذخائر کی طرف موڑا جائے، ان نمازگزاروں پر بھی "ویل" ہے جو "ماعون" یعنی رزق کے بہتے سرچشموں کو روک لیتے ہیں (یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ)

رزق کے بہتے سرچشموں کو روکنے کے بےشمار طریقے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دنیا اور اس کے لوازمات کو قابلِ نفرت قرار دے دیا جائے۔ دنیاوی زندگی کو قابلِ حقارت سمجھا جائے اور تسخیرِ فطرت کے فریضے کو دوسروں کے سپرد کر دیا جائے۔ قرآن حکیم سے ہدایت یابی کی شرط تقویٰ ہے اور متقین وہ لوگ ہیں جو (۱) غیب پر ایمان رکھتے ہیں، (بہت سے غیبوں میں سے مستقبل بھی ایک غیب ہے) (۲) نظامِ الصلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں (۳) جو رزق ہم نے انہیں عطا کر رکھا ہے اسے عام ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ (۴) جو کتاب تم پر نازل ہوئی ہے، اے پیغمبر اس پر اور جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ان پر ایمان لاتے ہیں اور جو (۵) آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اب جو شخص اللہ کے عطا کردہ رزق کو ٹھکرا دیتا ہے، یعنی اسے نفرت اور حقارت سے دیکھتا ہے اور حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ نہیں کرتا اس کے اپنے پاس کچھ نہیں ہو گا۔ تو وہ اسے دوسروں کی ربوبیت کے لئے کھلا کیسے رکھے گا۔ یا اس میں سے "انفاق" کیا کرے گا۔ اللہ کے فضل (زندگی کی خوشحالیاں اور معاشی فارغ البالیاں) کے حاصل کرنے اور ان کے تلاش کرنے کا حکم تو یہاں تک ہے کہ "اے ایمان والو! جب جمعے کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اگر سمجھو تو یہ تمہارے لئے بھلائی ہے پھر جب نماز ہو چکے تو پھیل جاؤ زمین میں اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو، اور اللہ کا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بہت ذکر کرو تاکہ تم فلاح پانے والا ہو جاؤ" (۹-۱۰ : ۶۲)۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے "یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے کھلی رکھیں تو اس کے جواب میں کہا قُلِ الْعَفْوَ (۲۱۹ : ۲) یعنی جس قدر تمہاری ضروریات (نہ کہ خواہشات) سے زائد ہے وہ سب کا سب دے دو، اب جو شخص دنیا کو ہی قابل نفرت سمجھ لے وہ محنت کیا کرے گا، زمین سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور فضائے عداوندی کے دوسرے خزائن سے دامن کیا بھرے گا۔ اور اپنی ضروریات سے زائد سامان زیست کا "انفاق" کیا کرے گا۔

" اور وہی ہے جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور (موتی وغیرہ) نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔ اور اس لئے بھی (دریا کو تمہارے اختیار میں کیا کہ) تم خدا کے فضل (معاش) کو تلاش کرو تاکہ تم اس کے شکر گزار بن جاؤ" (۱۶ : ۱۴)

ہم زمان اور مکان کی حدود میں گھرے ہوئے انسانوں کے لئے یا ماضی ہے یا مستقبل ہے۔ ان دونوں کے قریب ترین حصوں کو کاٹ کر ہم نے اپنے لئے "حال" بنا رکھا ہے۔ ورنہ اس دنیا میں "حال" کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو زمان و مکان کا بھی خالق ہے۔ ماضی اور مستقبل نہیں ہیں۔ اس کا زمانہ "ابدی حال" (ETERNAL NOW) ہے دنیا میں قومیں تا دیر زندہ وہی رہتی ہیں اور ارتقاء کی طرف بڑھتی رہتی ہیں جن کے سامنے مستقبل کا بہبود ہوتا ہے۔ عاقبت پر نظر رکھنے والی یہ قومیں ابتداءً تھوڑی سی تکلیف ضرور اٹھاتی ہیں لیکن اس کے بعد یہ "غیر ممنون" نعمتوں کی مالک بن جاتی ہیں۔ ایک فرد کی زندگی میں تو ہر آنے والا سانس مستقبل ہے، اجتماعی سطح پر آنے والی نوع انسانی کی پوری نسل اس کا مستقبل ہے، اس سلسلے میں قرآنی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ۔

۱۔ صرف اپنے حال ہی کو مدنظر نہ رکھیے بلکہ مستقبل کو بھی سوچیے۔

۲۔ صرف موجودہ نسل کی بہبود پر قانع ہو کر نہ بیٹھ جایئے بلکہ آنے والی نسلوں کی خوشحالی کو بھی ملحوظ رکھیے اور

۳۔ زندگی صرف اس دنیا کی زندگی کو ہی نہ سمجھ لیجیے بلکہ جسمانی موت کے بعد کی اگلی زندگی پر بھی یقین رکھیے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن حکیم نے دنیا اور اس کے لوازمات کو کیوں لہو و لعب قرار دیا ہے۔ جو لوگ مفادِ عاجلہ (IMMEDIATE GAIN) کو ہی مقصود و منتہیٰ بنا لیتے ہیں اور مستقبل کی خوشگواریوں سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں وہ "زندگی" کے اصل مقاصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے مشاغل میں پھنس جاتے ہیں جن کا کوئی ٹھوس اور تعمیری نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ قریبی فائدے کی خاطر مستقبل کی دائمی تابناکیوں کو ضائع کر دینا دانشمندی نہیں ہے، اسلام چاہتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی سے کوئی ایک بھی نظر انداز نہ ہو۔ اس لئے جہاں یہ تصور غلط ہے کہ دنیا کی متاع قابل نفرت ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ "زندگی" صرف اسی دنیا تک محدود ہے۔ صحیح نظریہ یہ ہے کہ اس دنیا کے حسنات بھی حاصل ہوں اور "انسانی ذات" بھی نشو و نما پا کر آنے والی اگلی اور بلند ترین سطح کے حسنات سے بھی متمتع ہو سکے۔

اس مقصد کو باحسن طریق تکمیل تک پہنچانے کے لئے قرآن حکیم نے انسان کے لئے چند قدریں متعین کر دی ہیں۔ یعنی اسے بتا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دیا گیا ہے۔ کہ چیزوں کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس کے بعد قرآن حکیم کا ارشاد یہ ہے۔ کہ بلند "قدر" والی چیز کے لئے پست "قدر" والی چیز کو قربان کر دو۔ دنیاوی ساز و سامان کا بھی ایک مقام ہے اس کی بھی قدر و قیمت ہے لہٰذا اسے متاع کے طور پر استعمال کرو اور ضرور کرو لیکن اس کی محبت میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔ اس کی وہی قیمت لگاؤ جو قرآن نے مقرر کر دی ہے، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔ یہ مہنگی پڑ جائے گی لہٰذا اس متاع کو حاصل کرو، اس کے لئے دوڑ دھوپ کرو، محنت کرو اور اللہ کا رزق تلاش کرو۔ کیونکہ "انسانی ذات" کی نشوونما اور ارتقاء کے لئے زمین ہی کو مستقر اور مستودع بنایا گیا ہے لیکن قرآنی اصولوں کو ہر وقت پیش نظر رکھ کر متاعِ حیات الدنیا کے حصول کے لئے سعی و محنت کرو۔ اگر کوئی موقع ایسا آ جائے کہ دنیاوی زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے ارتقا کے کسی تقاضے میں تصادم ہو جائے تو اس دوسرے بلند تر مقصد (قدر) کی خاطر طبعی زندگی کے کمتر مفاد (قدر) کو قربان کر دو۔ کیونکہ جوہر انسانیت کی نگہداشت بہت ضروری ہے۔ یہاں یعنی اس تقابلی صورت میں دنیا کی متاع آخرت کی متاع سے کم قیمت ہے۔ طبعی زندگی نہیں ختم ہو جائے گی۔ موت کے بعد کی زندگی طبعی یا حیوانی زندگی سے بالاتر ہے کیونکہ یہ ابدی اور مرگ ناآشنا ہے اگر ان دونوں کے مفادات میں کہیں تصادم پیدا ہو جائے تو طبعی زندگی کے تقاضوں کو چھوڑ دینا ہے۔ یہی کیریکٹر ہے۔

جو لوگ دنیاوی زندگی کے جمالیاتی پہلو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے بارے میں بڑی سختی سے ارشاد ہوا ہے کہ "ان سے کہہ دو کہ کون ہے جو آرائش اور زیبائش کی ان چیزوں کو اس کے بندوں پر حرام کرتا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں" (۷:۳۲)۔ اللہ تعالیٰ تو یہاں تک حکم دیتا ہے کہ "میری تمام اطاعت گزاریوں میں حسن و زیبائش کو اختیار کرو" (۷:۳۱)۔ قرآن حکیم نے آرائش و زیبائش کی چیزوں کو کسی مخصوص دائرے میں محدود نہیں کیا بلکہ ارشاد کیا ہے کہ "جو کچھ زمین میں ہے سب اس کے لئے زینت ہے" (۱۸:۷) کسی چیز کی ممانعت نہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ چیزیں زندگی کا نصب العین نہ بن جائیں" (۱۸:۴۶)

(۳)

انسان کے لئے ہر قسم کے سامانِ زیست کا سرچشمہ زمین ہے۔ قرآن حکیم نے زمین کے لئے "ارض" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنے ہیں "نچلی چیز"۔ سما بلندی کو کہتے ہیں اس اعتبار سے جتنی بلندیاں ہوں گی اتنی پستیاں ہوں گی۔ زمین سے متعلق ارشادِ ربانی ہے کہ "ہم نے اس کے اندر تمہارے لئے معائش رکھ دیئے ہیں۔ معایش "رزق" کے تمام وسائل اور ذرائع کو کہتے ہیں۔ اَلْمَعِیْشَۃُ کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں ہیں جن پر زندگی بسر کی جاتی ہے۔ یعنی سامانِ زیست۔ اس لفظ کی جمع مَعَایِشُ ہے جنہیں ہم آجکل کی اصطلاح میں وسائل پیداوار (MEANS OF PRODUCTION) کہتے ہیں وہ سب ارض کے اندر آ جاتے ہیں۔ عِیْشَۃٌ زندگی اور طریق بود و باش کو کہتے ہیں۔ معاش، اسباب زندگی تلاش کرنے کے مواقع کا نام ہے۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی کا تقاضا سامانِ زیست کا حصول ہے، تاہم اس تقاضے کو پورا کرنا باہمی مقابلے اور نتیجۃً فساد کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس مسئلے کا حل یہ بتایا ہے کہ "جو ضابطہ قوانین اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے اس کی پیروی کرو۔ رزق کی فراوانی ہو جائے گی۔ جو قوم ہمارے اس ضابطہ قوانین سے منہ موڑے گی اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور ہم اسے قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے۔" (۲۰: ۱۲۴-۱۲۶) اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ معاشی نظام تسخیر فطرت کے ماحصل کو عام ربوبیت کے لئے گردش میں رکھتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس نظام کو انفاق کہا گیا ہے۔ نَفَقٌ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں۔ اَلنَّفِقَۃُ جنگلی چوہے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے ایک سوراخ کو کہتے ہیں جس پر وہ مٹی کی باریک سی پپڑی جما کر اسے بند رکھتا ہے۔ اور اسے اس وقت سر مار کر کھول لیتا ہے جب کوئی دشمن اسے بل کے اندر پکڑنے کی کوشش کرے۔ نَیْفَق شلوار وغیرہ کا نیفہ ہے جس کے دونوں کنارے کھلے ہوتے ہیں۔ نَفَقَتِ السُّوْقُ بازار گرم ہوگیا۔ یعنی ادھر سے مال آرہا ہے اور ادھر سے ہاتھوں ہاتھ اس کی نکاسی ہو رہی ہے۔ مُنَافِق وہ شخص ہے جو کسی نظام میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھے کہ اس سے باہر نکلنے کا رستہ کون سا ہے! ان معانی کے پیش نظر انفاق کے معنے مال و دولت کو "خرچ کرنا" کی بجائے مال و دولت کو کھلا رکھنا، گردش میں رکھنا یا اس طرح چلتا رکھنا کہ یہ ایک طرف سے آرہی ہو۔ تو بلا توقف دوسری طرف اس کا نکاس ہو رہا ہو۔ بہتر معلوم ہوتے ہیں، فاضلہ دولت Surplus Money جو سرمایہ داری نظام کی بنیاد ہے سب کی سب عام ربوبیت کے لئے گردش میں رہنی چاہیے۔ اگر تھوڑی سی دیر کے لئے بھی کہیں رک گئی تو ان تمام طبقاتی برائیوں کی بنیاد بن جائے گی جو آج سرمایہ داری نظام نے پیدا کر رکھی ہیں۔

انفاق قرآنی معاشی نظام کا بنیادی نقطہ ہے۔ مومن کی ہمیانی کے دونوں سرے کھلے ہوتے ہیں۔ اور یہ ہمیانی نظام کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہر فرد اپنی محنت کا ماحصل اس میں ڈالتا جاتا ہے اور نظام قرآنی اسے نوع انسانی کی ہر قسم نشو و نما پر صرف کرتا جاتا ہے۔ چونکہ ہر فرد کی تمام ضروریات، صرف روٹی، کپڑا، مکان نہیں بلکہ صحت، تعلیم، انصاف صلاحیتوں کو ابھارنا، انسانی ذات کو نشو و ارتقاء کے مواقع مہیا کرنا غرض مادّی اور روحانی تمام ضروریات کا بھرپور انداز سے پورا کرنا نظام قرآنی کی ذمہ داری ہے اس لئے کسی فرد کو کچھ بچا کر رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی نہ ہی اسے اپنے یا اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق کوئی خدشہ یا اندیشہ ہوتا۔ کیونکہ یہ تمام ذمہ داریاں نظام کے سر ہوتی ہیں جو قوانین قرآنی پر قائم ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ معاشی زندگی کو قرآن حکیم کے ضوابط حیات سے الگ کر لیا جائے تو زندگی اس پست سطح کی رہ جاتی ہے۔ جو طبعی ضروریات کو پورا کر لینے سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس سطح پہ عاجلہ مفادات تو حاصل کئے جاتے ہیں لیکن انسانی سطح کی زندگی کا بلند نصب العین حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھئے کس خوبصورتی سے اس نکتے کو بیان کیا گیا ہے (۷: ۱۷۶)

ہم تو چاہتے ہیں کہ اس کا رتبہ بلند ہو جائے لیکن یہ تو چمٹ گیا ہے اَلْاَرْض سے!
اور اس نے اپنی خواہشات کی متابعت شروع کر دی ہے!

جس کی متابعت اور اطاعت کی جائے، جس کے اقتدار کے آگے جھک جائے، جس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا جائے یعنی جس کے ہر حکم کی تعمیل ضروری سمجھ لی جائے اسے اِلٰہ کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی خواہشات کو اِلٰہ بنا لیتے ہیں اور اللہ کے احکام کی بجائے ان ہی کی پیروی شروع کر دیتے ہیں" توحید" کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں ایک خدا کا قانون چل رہا ہے جسے قانون تسلیم و رضا کہتے ہیں، ہر چیز ایک اند

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

صرف ایک اللہ کی اطاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔ تو کیا انسان جسے تھوڑا سا اختیار اور ارادہ دیدیا گیا ہے اپنے اس ارادے کو آزاد رکھ کر اللہ کی بجائے دوسرے خداؤں کی متابعت شروع کرے گا؟ کیا وہ زمین کے معایش پر بھی اللہ کے قوانین چھوڑ کر اپنے جذبات کے خداؤں کے بنائے ہوئے قوانین کا اطلاق کرے گا؟ اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ "توحید" نہ ہوگی شرک ہوگا کیونکہ زمین میں بھی اللہ صاحبِ اقتدار ہے اور آسمانوں میں بھی اسی کا قانون چلتا ہے۔ (۴۳ : ۸۴)۔ لہٰذا اگر انسان زمین پر جو اس کے معایش کی امین ہے، اللہ کے قوانین کی بجائے اپنے جذبات کے وضع کردہ قوانین نافذ کرے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اس نے یہاں اور خداؤں کی حکومت مان لی ہے۔

"کیا انہوں نے زمین سے لئے اور خدا ٹھہرا لئے ہیں۔ جو ان کو اٹھا کھڑا کریں گے؟ اگر ان دونوں (ارض و سماوات) میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا" (۲۱ : ۲۱)

پس ثابت ہوا کہ معاشی زندگی کے لئے اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرنا یا انہیں تسلیم کرنا شرک ہے اور یہ بہت بڑا جرم ہے۔

معاشی زندگی کے لئے اللہ کے قوانین کیا ہیں، ان کا ذکر گزشتہ اوراق میں مختلف مواقع پر کیا جاتا رہا ہے، جذبات کی پیروی کرنے والے بعض مصلحت کوش لوگوں نے اللہ کے ان احکام و قوانین کی کیا کیا تاویلیں کی ہیں ہم ان کا ذکر یہاں نہیں کرنا چاہتے۔ حقیقت ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اقبال نے اس بارے میں کہا ہے کہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ ایسا محکم ضابطہ اور پختہ قانون ہے کہ کسی کے بدلنے سے بدلا نہیں جا سکتا۔ ملوکیت۔ قارونیت اور پیشوائیت کا حلقہ مذموم ملکیت ہی کے تصور پر زندہ رہتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔ حالانکہ یہ جانتا ہے کہ انسان تو اپنے جسم تک کا مالک نہیں ہے اپنے سانس پر اختیار نہیں رکھتا اور تو اور بالوں یا ناخنوں کے بڑھنے بلکہ چھینک پر تک کنٹرول نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ اللہ کی چیزوں کا مالک بن جائے جو اس کے لئے صرف متاع کی حیثیت رکھتی ہیں "وجہ زینت تو بنا دیا گیا ہے انسانوں کے لئے چاہت کی چیزوں کو مثلاً بیویاں اور بیٹے اور سونے چاندی کے ڈھیر، اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی باڑی (تاکہ لوگ انہیں حاصل کریں) لیکن یہ تو صرف متاعِ حیاتِ الدنیا ہے۔ انجام کا حسن تو اللہ کے پاس ہے (۳ : ۱۴) یعنی ان سب چیزوں کی حیثیت "متاع" یعنی استعمال اور انتفاع کے علاوہ کچھ نہیں

اَلْاَرْض کی حیثیت جو کتابِ ربّانی نے متعین کر دی ہے اسے پھر سامنے لائیے یعنی: (۷ : ۱۰)

"ہم نے تمہیں زمین میں متمکن کیا اور اس میں ہم نے تمہارے لئے معایش رکھ دیئے۔ لیکن تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو" اور پھر تھوڑی دور آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ زمین میں "تمہارے لئے کچھ وقت کے لئے ٹھکانا اور زندگی بسر کرنے کا سامان ہے۔ درمیان کی چودہ آیات میں قصہ آدم بیان ہوا ہے اور پھر ارشاد ہوا ہے کہ زمین میں ہی تمہارا جینا ہوگا اسی میں مرنا ہوگا۔ اور اسی سے (۷ : ۲۴) نکالا جانا ہوگا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سارا خطاب کس کو کیا گیا ہے یعنی زمین میں معایش کس کے لئے رکھے گئے ہیں؟ زمین میں کچھ دیر کے لئے رہنا اور معایش سے تمتع حاصل کرنا کس سے لئے ہے؟

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

زمین میں مرنا، جینا اور زمین سے نکالا جانا کس کے لئے ہے؟ کسی ایک گروہ یا مخصوص طبقے یا قوم کے لئے ہے؟ طاقت ور لوگوں کے لئے ہے؟ یا پوری انسانیت کے لئے ہے، یعنی بنی آدم کے لئے ہے یا جو معاش کو محنت کرکے حاصل کرے اُس کے لئے ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام خزائن کو خواہ وہ زرعی پیداوار کی صورت میں ہیں، خواہ معدنی ذخائر ہیں، خواہ مصنوعات کی شکل میں ہیں۔ یعنی تسخیرِ ارض و سماوات کا ماحصل ہیں، پوری انسانیت کی نشوونما کی خاطر اولادِ آدم کے حوالے کیا ہے۔ تفسیر موضح القرآن میں لکھا ہے کہ "بسیط زمین پر بنی آدم کو آباد کرنا اور اسے کائنات کی سب چیزوں پر مسلّط کر دینا اور پھر قدرتی چیزیں، جیسے پھل، ترکاری، غلہ وغیرہ اور معیشت کے متعلق کئی شکر، کپڑا وغیرہ (یعنی مصنوعات) ان کے لئے مہیا کر دینا ایک ایسا احسان ہے کہ اولادِ آدم اس سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی...۲"۔ لہٰذا جو چیز پوری انسانیت کے استعمال کے لئے ہو اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کیسے ہوسکتی ہے؟ ہوا، پانی اور روشنی پر کون ذاتی ملکیت کا دعویدار ہے؟ زمین اور ان چیزوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ زمین کا سینہ چیر کر معاش نکالنے پڑتے ہیں، جبکہ ہوا اور پانی وغیرہ سب کو از خود مل جاتے ہیں۔ یعنی فرق تقسیم نعمت کے طریق کار میں ہے۔ مقصد و غایت میں نہیں ہے ارض کی نعمتوں کی تقسیم کا کام اولادِ آدم کے سپرد کر دیا گیا ہے کیونکہ "انسانی ذات" کی نشوونما صرف اسی طرح ممکن تھی۔

سورۂ رحمٰن آیت نمبر ۱۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے زمین کو "انام" کے لئے بچھایا ہے۔ انام کے معنے جن و انس سمیت تمام مخلوق کے ہیں۔ لہٰذا زمین کی چیزیں اللہ کی ساری مخلوقات کے تمتع کے لئے ہیں۔ اس کی وضاحت سورۂ عبس میں اس طرح کی گئی ہے کہ "انسان ذرا اپنے طعام ہی کو دیکھ لے۔ ہم نے اوپر سے گزرتا ہوا پانی ڈالا پھر ہم نے زمین کو پھاڑ کر چیرا اور پھر اس میں اناج اُگا دیا اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور میوے اور گھاس سب تمہارے فائدے کے لئے (متاع) اور تمہارے جانوروں کے لئے (۸۰: ۲۴ تا ۳۲)

زمین کی پیداوار کے متعلق ارشاد ہے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ہے۔ مقوین ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کا پیٹ اور توشہ دان خالی ہو۔ یا وہ لوگ جو ایسے بے برگ و گیاہ میدانوں میں اُتریں جہاں کھانے کو کچھ بھی نہ ہو۔ اسی بات کو (۴۱: ۱۰) میں یوں دہرایا گیا ہے کہ "زمین کی پیداوار سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ ہے، یعنی طلب کرنے والوں کی ضروریات کے عین مطابق۔ لیجئے ساری بات صاف ہوگئی۔ زمین سے متاع حاصل کرنا معاشرے یعنی نظامِ قرآنی کی ذمہداری ہوگئی، یہ نظام افرادِ معاشرہ کو ان کی محنت صلاحیتوں کے مطابق حصول متاع کے مختلف شعبوں پر لگا دے گا یعنی کوئی زراعت کرے گا، کوئی معدنیات نکالے گا، کوئی مصنوعات تیار کرے گا، علیٰ ہٰذا سب لوگ تسخیرِ ارض و سماوات کے فریضے کی تکمیل میں لگ جائیں گے۔ ان تمام کے ماحصل کی تقسیم نظامِ قرآنی کے سپرد ہوگی، ہر فرد کی جملہ ضروریات اسی طرح از خود پوری ہوتی رہیں گی جس طرح ہوا، روشنی اور پانی کی ضروریات از خود پوری ہوتی رہتی ہیں۔ ایک متاع کے پیدا کرنے والے دوسری متاعات کے لئے مُقوین اور سائلین شمار ہوں گے کیوں کہ ان کے پاس یہ چیزیں نہیں ہوں گی، اور یہ مُقوین ہوں گے لیکن ان کی طلب ان سب کو ہوگی اس لئے یہ سائلین بھی ہوں گے۔ تقسیم کا اصول سَوَاءً نے واضح کر دیا۔ یعنی برابر [illegible] کے عین مطابق ۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

زمین کے اندر ہم نے مضبوط پہاڑ گاڑ دیئے جو اس سے اونچے۔ اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور چار موسموں کے مطابق زمین میں خوراکوں کے پیمانے مقرر کر دیئے۔ یہ سب طلب کرنے والوں کے لئے برابر ہیں (۴۱:۱۰)

ملکیت ہی کے سلسلے کا ایک لفظ "وارث" بھی قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے۔ مشہور لغت نویس "ابن فارس" لکھتے ہیں کہ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا کسی کی عارضی ملکیت میں ہونا ہے اور پھر اس کے پاس سے دوسروں کی طرف منتقل ہو جانا۔ اس میں اصل مالک کی ملکیت اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ منتقل صرف "تمتع" یا استعمال کا حق ہوتا ہے یہ امانت کی طرح ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ زمین کا وارث اللہ ہے تو اس سے مالک حقیقی اللہ قرار پائے گا۔ اور انسان کی حیثیت بہ اعتبارِ نوع نہ کہ بہ اعتبار افراد، امین ہوگی۔ امین کے لئے ضروری ہے کہ وہ امانت کو انہی ہدایات کے مطابق استعمال کر سکتا ہے جو امانت سپرد کرنے والے نے اسے دے رکھی ہیں۔ زمین کے خزائن کو استعمال میں لانے کی ہدایات قرآن حکیم نے بار بار اور تاکیداً دے رکھی ہیں۔ لہٰذا قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ "الارض" کے خزائن کو ان ہدایات کے مطابق استعمال میں لائے۔ ارض کی ملکیت صرف اور ہمیشہ اللہ کی رہے گی۔ وراثتِ ارض دی جاتی ہے "عباد الصالحون" کو (۲۱:۱۰۵ ـــ ۷:۱۲۸) الارض للہ

نظام کی بجائے افراد کے ہاتھوں رزق کی تقسیم سے قرآنی قدریں تکریم آدمیت، عدل و مساوات اور حریت جس طرح پامال ہوتی ہیں اس کا نقشہ اقبال نے یوں کھینچا تھا کہ

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی ۔۔۔ اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

قرآن حکیم اس قارونی ذہنیت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: جن لوگوں کو رزق کمانے کی استعداد زیادہ دی گئی ہے وہ اپنے کمائے ہوئے رزق کو اپنے زیر دستوں کی طرف واپس نہیں لوٹاتے (اور نہیں لوٹانا چاہتے) کہ اس طرح یہ زیر دست سب اس میں برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ کیا یہ اللہ کی نعمت سے انکار کرتے ہیں؟ (۱۶:۷۱) معاشرے کے مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی استعداد کم و بیش ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ زیادہ استعداد والے اپنے ماحصل کو اپنے ہی لئے مخصوص کر لیں اور قارون کی طرح یہ دلیل دیں کہ یہ مال و دولت میں نے اپنی ہنر مندیوں سے حاصل کیا ہے اس لئے ہم اس کے مالک ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اس آیت میں "رَادّی" کا لفظ غور طلب ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ زائد از ضرورت دولت کو زیر دستوں میں بطور خیرات بانٹ دو۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ یہ زائد دولت ہے ہی انہی کی، اس لئے اسے لوٹا دو ان کی طرف جن کی یہ ہے۔ اس لفظ "رادی" کے مفہوم "واپس کرنے، لوٹا دینے" سے قرآنی نظام معیشت کی تشریح ہو جاتی ہے۔

خانہ کعبہ اللہ کا گھر ہے یہ کسی انسان کی ملکیت نہیں ہے قرآن حکیم نے اس کے لئے جو لفظ ارشاد فرمائے ہیں وہ ہیں "وُضِعَ لِلنَّاسِ" یعنی یہ پوری انسانیت کے لئے ہے۔ بالکل یہی الفاظ زمین کے لئے استعمال ہوئے ہیں "وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ" یعنی یہ ساری مخلوقات کے لئے ہے۔ پھر اس پر ملکیت کیسی؟ رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۵ ۔ فرد و ملت، جوہر آئینہ میں

انسانی زندگی دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس میں انسان طبعی قوانین کے تابع رہتا ہے اور جبلّی تقاضوں کے خلاف سرتابی نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی زندگی میں انسان اور حیوان کے درمیان فرق بہت کم پایا جاتا ہے۔ دوسری زندگی وہ ہے۔ جس میں جسمانی تقاضے پیچھے رہ جاتے ہیں اور اقدار سامنے آجاتی ہیں۔ اس سطح پر زندگی حیوانیت سے بلند تر ہو کر مرتبۂ انسانیت میں جلوہ نما ہوتی ہے اور اعلیٰ تجریدی صداقتوں کی پابندی یا نافرمانی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہ دوسری سطح کی زندگی انسان کے لئے باعث شرف و امتیاز ہے۔ کیونکہ یہی اس کے ارتقا کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ حیوان اپنی جبلی ضرورتیں مثلاً بھوک پیاس تحفظِ ذاتی وغیرہ کے پورا کرنے پر مجبور ہے اور ان فطری تقاضوں پر بآسانی قابو نہیں پا سکتا۔ لیکن انسان حیوانی سطح کے بعض تقاضوں پر بھی قابو پا سکتا ہے۔ اور انتہائی ضبط اور برداشت سے کام لے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر انسانی ذات کی صلاحیتوں یعنی علم، عقل، جذبات اور ارادہ کے علاوہ کچھ ایسے خصائص بھی ہیں جو عام حیوانوں میں نہیں ہیں، مثلاً ذوقِ تجسّس، ہمدردی۔ ایثار، حسنِ تناسب، حفظِ مراتب، ضبط و صبر، توجہ، تخیل، غیرت، حمیت، جذبۂ مسابقت، مشکل پسندی۔ مہم جوئی، تجسّس۔ خودداری، پسند ناپسند، اشتراکِ عمل، غم، خوشی، احساسِ ندامت وغیرہ، یہ خصائص کمتر سطح کی مخلوق میں یا تو بالکل ناپید ہیں یا بہت ہی معمولی سطح پر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیوانوں کو مختلف طریقوں سے محض سدھایا جا سکتا ہے یا ایک خاص حد تک مشقیں دی جا سکتی ہیں لیکن انہیں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ تعلیم شخصیت کی اندرونی صلاحیتوں کو باہر لانے اور انہیں نمو پذیر کرنے کے عمل کا نام ہے۔ چونکہ حیوانوں میں شخصیت نہیں ہے اور نہ ہی ان میں یہ صلاحیتیں ہیں۔ لہٰذا ان کی صفات کو اُبھارنے یا نشوونما دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تعلّم پذیری کی نعمت صرف انسان کو عطا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ارتقا کا دارومدار تغیّر پر ہے اور تغیّر کے اثر کو صرف انسان ہی قبول کر سکتا ہے۔ اس لئے تعلّم پذیری کی بدولت ارتقا کے مراحل بھی صرف انسان ہی طے کر سکتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ جو انسان اپنی ان صفات کو تعمیری خطوط پر نہیں اُبھارتا وہ جوہرِ انسانیت کے امانتدار ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ انسان کی قوتِ اختیار و ارادہ کا رُخ تعمیری شاہراہوں کی طرف موڑنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تعلیم ایسی "ہدایت" کے تحت ہو جو عقل سے بالاتر ہو۔ کیونکہ اسے عقل کو بھی صحیح راستے پر لگانا ہوتا ہے۔ یہ تمام صفات جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یا تو عقل کے تابع ہیں یا اس کی مددگار اور معاون ہیں۔ لہٰذا ان کی تربیت ایسے اصول و ضوابط کی روشنی میں کی جائے گی جو ماورائے عقل ہوں گے۔ تو پھر عقل کے فیصلے بھی صحیح ہوں گے اور ان کے نتیجے میں انسانی اعمال میں بھی حسن کارانہ تعمیر و اصلاح پیدا ہو جائے گی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جامد اور منصوب (FIXED) خصائص کو کسی بھی طریقے سے ارتقا کی طرف نہیں موڑا جا سکتا لہٰذا اگر انسان وحیٔ ربانی کی پیروی نہ کرے اور اپنے اختیار و ارادے کو تعمیری راہوں کی طرف موڑنے کی بجائے صرف طبعی زندگی تک محدود کرے تو وہ اپنی "فطرت" کو حیوانی سطح پر گرا دینے کا مرتکب ہوگا۔ اور یہ وہ جرم ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس سے انسانی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ عقل نشانِ راہ ضرور ہے لیکن منزل نہیں ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم کا یہ ارشاد نہایت معنی خیز ہے کہ جس نے اپنے جوہرِ انسانیت (نفس) کو نشوونما ارتقاء دیا اس نے فلاح پائی اور جس نے اسے مٹی میں دبا دیا، دفن کر دیا یا چھپا لیا وہ ناکام اور نامراد ہوا (۱۰-۹۱:۹)

فطرت کو "زندگی" بہت پیاری ہے۔ ذرا کہیں شگوفہ پھوٹتا ہے، کوئی ننھا سا انڈا ٹوٹتا ہے یا شعوری حرکت کی انگڑائی کی نمود ہوتی ہے تو اس کی ضروریات مہیا کرنے والی تمام قوتیں دوڑ کر اسے اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیتی ہیں تاکہ "نومولود" اپنی تمام صلاحیتوں کو، جو وہ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی لایا ہے ممکن حد تک ابھار سکے فطرت کے اس نومولود اور انسانی نومولود میں فرق صرف اتنا ہے خارجی کائنات کی اشیاء کی فطرت متعین اور منصوب کر دی گئی ہے اور اسی وجہ سے تعلم پذیر نہیں ہے اسی لئے قابلِ تغیر ہے لیکن اس کے برعکس، انسان کو چونکہ ارتقائے حیات کی آخری منزل تک پہنچانا مقصود تھا اس لئے اس کے انسانی جوہر کو جامد اور ناقابلِ تغیر نہیں بنایا گیا۔ بلکہ اس کی تراش خراش میں لچک رکھ دی گئی ہے تاکہ یہ حیوانی سطح سے آگے بڑھ کر انسانی اقدار کی زندگی میں داخل ہو جائے چنانچہ اس کی تعلم پذیری کی ابتدا وہاں سے جہاں اس کی جبلتیں ختم ہو جاتی ہیں اور اقدار کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی جبلتوں کی مجبوری کو بھی تعلیمی عمل کا حصہ بنایا جا سکے۔ انسان کی امکانی صلاحیتیں ہی اس کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان صلاحیتوں کے ابھارنے اور انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق استعمال کرنے کا نام تعلیم و تربیت ہے۔ اور یہ عمل دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے بغیر ناممکن ہے۔ طبعی تقاضوں کو بہ حسن و خوبی پورا کرنے کے علاوہ

۱۔ کائنات کے بے رنگ تصویر میں رنگ بھرنا
۲۔ ممکناتِ وجودیہ کی تکمیل
۳۔ تعمیرِ خودی یعنی ارتقائے ذاتِ انسانی
۴۔ ارتقائے انسانیت
۵۔ اعلائے کلمۃ الحق
۶۔ باطل قوتوں کے خلاف جہادِ مسلسل
۷۔ ذاتی مفادات کی کشمکش اور ترغیب و تحریص سے دامن بچا کر عالمگیر ربوبیت کے پروگرام کو آگے بڑھانا۔
۸۔ عملیاتِ ربانی یعنی علم، عقل، جذبات اور اختیار و ارادہ کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھنا۔
۹۔ اخلاقِ عالیہ کا نمونہ پیش کرنا اور
۱۰۔ مستقل قدروں کو عملاً نافذ کرنا۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

—— تمام ایسے فرائض ہیں جو معاشرے کے ربط و ضبط سے ہی باحسن طریق ادا ہو سکتے ہیں۔ کائنات کی تمام مخفی اور ظاہر قوتوں کو انسان کے آگے سجدہ ریز بنا دیا گیا ہے۔ تو اسی لئے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے اور اپنے آپ کو احسن تقویم ہونے کے شرف کا اہل ثابت کر سکے۔

انسان طبعاً اجتماعیت پسند ہے۔ تنہائی میں اس کی طبیعت کا کوئی جوہر نہیں کھل سکتا۔ گروہی زندگی میں خوش رہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ مشکل وقت میں کوئی اس کا مونس و غمخوار ہو، کوئی صلاح مشورہ دینے والا ہو۔ کوئی اُسے غلط کاموں سے روکے کوئی اچھے کاموں پر داد دے، حوصلہ بڑھائے، اس سے تعاون کرے۔ اچھے کاموں کی تلقین کرے۔ کوئی اس کے دکھ درد میں شریک ہو۔ اس کی مسرتوں کا حصہ دار ہو۔ کوئی اس سے مدد کا طالب ہو، کوئی اس کی مدد کرے۔ کوئی اُسے چاہے۔ کسی پر یہ فدا ہو۔ کوئی اس کا ہم خیال ہو۔ کوئی اس کے خیالات کی تردید کرے۔ مدنیت انسان کی حیوانی جبلت کا بھی تقاضا ہے۔ اس تقاضے کے پورا ہونے سے حصول خوراک، تحفظِ ذات، بقائے نسل اور بعض دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں یہ تمام ضرورتیں اسے اجتماعی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مہارتیں بھی معاشرہ عطا کرتا ہے اور خداداد قابلیتوں کو جلا بھی معاشرہ ہی دیتا ہے۔ لہٰذا طبعی اعتبارات کے پیشِ نظر بھی فرد اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فرد معاشرے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو معاشرہ بھی فرد کے وجود سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اس نکتے کو بنیاد بنا کر اسلام نے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی۔ معاشرہ اُن افراد کا مجموعہ ہے جو کسی مخصوص یا دائمی مقصد کے لئے وجود میں آیا ہو۔ ان میں فکری ہم آہنگی پائی جائے کیونکہ جب تک افراد کے اندر یک نظری اور یکجہتی نہ ہوگی افراد کے باہمی تعلقات کبھی خوشگوار اور دوستانہ نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے پارٹی بازی اور فرقہ بندی کو اس لئے شرک قرار دیا ہے (۱۲ : ۳۰ ؛ ۳۲) کہ اس طرح یک مقصدیت اور ہم آہنگی پارہ پارہ ہو جاتی ہے پھر پارٹیوں کے اندر انفرادی اختلافات اُبھر آتے ہیں۔ اور اس طرح سارا معاشرہ نفسا نفسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے کے سامنے عارضی مقاصد زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس معاشرے کے ہر فرد کے سامنے ایک ہی مستقل پائیدار اور ہمہ گیر نصب العین ہے۔ اس نصب العین کو دو لفظوں میں فلاح دنیا اور فلاح آخرت کہا گیا ہے۔ اس کی تکمیل صرف قوانین الٰہی کی متابعت سے ممکن ہے تاہم اس نصب العین کے حصول کے لئے مسلسل سعی و عمل کی ضرورت ہے اور ایسا وقت کبھی نہیں آسکتا جب جدوجہد کی ضرورت باقی نہ رہے۔ یہ اس لئے ہے کہ ارتقا کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ شاعری کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ آئیڈیل حسن ہے اور حسن ہمیشہ گریز پا ہوتا ہے۔

اسلامی معاشرہ اور اس کا نظام، مادی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی غرض ہر قسم کے اغراض و مقاصد پر محیط ہے۔ اس معاشرے کا ہر فرد خواہ وہ کسی ملک، آب و ہوا، عارضی قومیت، رنگ، النسل یا لسانی گروہ سے تعلق رکھتا ہو بنیادی طور پر ایک برادری سے وابستہ اور منسلک رہتا ہے اس ہمہ جہت ہم آہنگی کی وجہ سے اس کی عادات و خصائل، اس کے خیالات، جذبات احساسات وغیرہ ایک ہی آزاد اور عدل پر مبنی ماحول میں پرورش پاتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اسلامی ماحول جہاں کہیں بھی ہوگا اپنے افراد کی باہمی اخوت و رفاقت سے "ایک کی کمی" کو "دوسرے کی بیشی" سے پورا کرتا رہے گا اس طرح انفرادی صلاحیتوں کی نشوونما میں سعی و عمل کی یکجہتی کے ذریعے ایک حسین توازن اور اعتدال پیدا ہوتا رہے گا نیز کوئی ادنیٰ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سے ادنیٰ صلاحیت بھی بے مصرف نہیں رہ جائے گی، بلکہ معاشرے کے لئے کسی نہ کسی رنگ میں کارآمد ثابت ہوتی رہے گی۔ ضیاعِ صلاحیت (TALENT WASTAGE) کا امکان تک باقی نہ رہے گا۔ اس باہمی اشتراکِ عمل اور تعاون سے جو مستحکم اور ہم آہنگ معاشرہ وجود میں آتا ہے وہ آہنی دیوار کی طرح مضبوط بن کر وقت کے ہر چیلنج کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اُمّت کے لفظ میں ماں اور بچے کے پاکیزہ رشتے کی طرف اشارہ ہے۔ سابقہ مکاتبِ فکر نے بھی اس پاکیزہ رشتے کو بعض اداروں سے منسوب کیا ہے۔ مثلاً مادرِ وطن، مادری زبان یا الما میٹر یعنی (BOUNTEOUS MOTHER) یعنی مادرِ منعم تمام تعلیمی اداروں کے لئے یا بھارت ماتا وغیرہ۔ لیکن اس رشتے کو پوری قوم اور جماعت پر وسیع کر دینا اسلام کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اخوت کا رشتہ اس تصور سے اور بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ تاہم اخوت اور اُمّت کا رشتہ عملاً اس وقت تک مضبوط اور پائیدار نہیں ہو سکتا جب تک افراد اپنی تمام وفاداریوں کو معاشرے کے وسیع تر مفادات کے لئے وقف نہ کر دیں، اسلام کا نظامِ انفاق اس امر کی پوری پوری ضمانت دیتا ہے کہ ہر فرد اپنے معاشرے کو اس سے کہیں زیادہ لوٹا دے جو اس نے معاشرے سے حاصل کیا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معاشرے سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا، جو کچھ بھی وہ ہیں اپنی صلاحیتوں ہی کی بدولت ہیں۔ اور اپنی محنت کی طفیل ہیں۔ وہ نہ صرف ناشکرے ہیں بلکہ نافہم بھی ہیں۔ اوّل تو معاشرے نے انہیں تحفظ دیا ہے، جو اُسے پیدائش سے لے کر موت تک حاصل رہا ہے اور اب بھی حاصل ہے، پھر ہنر مندیاں عطا کی ہیں، تجربات فراہم کئے ہیں، آداب دیئے ہیں، اقدار دی ہیں، خامیاں اور کوتاہیاں دور کی ہیں، کردار کو درست کیا ہے، حوصلہ بڑھایا ہے، تخلیقی قوتوں کے اعتبار سے یہ لوگ جن امکانات کے مالک تھے ان کے مطابق ان کو پالا پوسا ہے تراش خراش کر کے ایک متعین اور واضح شکل دی ہے اور زندگی کی دشواریوں پر قابو پانے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔

ہر انسان کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے۔ کیونکہ سوچنا اس کی طبعی مجبوری ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ فلاں چیز ایسی کیوں ہے جیسی کہ وہ ہے، ایسی کیوں نہیں جیسی کہ وہ چاہتا ہے۔ کہ اسے ایسا ہونا چاہئے۔ بالفاظِ دیگر اصلاح اور تعمیرِ نو، تغیّر اور ایجاد اور ترمیم و تنسیخ و اضافہ پر، جو ارتقاء کے اَٹوٹ اجزاء ہیں، ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ وہ اپنی سوچی ہوئی تجاویز اور تصورات میں قائم کئے ہوئے منصوبوں کا عینی مشاہدہ دنیا کے آئینے میں کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ کچھ کر گزرنے کی حسرت پوری ہو جائے۔ اس کی اپنی مسرتوں میں بھی اضافہ ہو۔ اور معاشرے کے حسن میں بھی چار چاند لگ جائیں۔ یہ مواقع صرف دینی معاشرہ مہیا کر سکتا ہے جو اخوت، مساوات، حرّیت اور عدل کے عالمگیر اصولوں کو کسی وقت بھی کمزور نہ ہونے دے۔ افراد [8] آتے جاتے ہیں لیکن معاشرہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ انسان مر مٹ جاتے ہیں لیکن انسانیت زندہ رہتی ہے۔ مفرد کے لئے فنا ہے۔ مجرّد کے لئے بقا ہے۔ تاہم معاشرے کے قیام و بقا نے دوام کے لئے ضروری شرط یہ ہے کہ اقدار، رجحانات اور مہارتیں ایک نسل کے ساتھ آگے منتقل ہوتی رہیں۔ اگر کسی نئی آنے والی نسل کا رابطہ اپنی پیش رو نسل سے کہیں بھی ٹوٹ گیا تو تعلیم کا عمل رک جانے سے ایک ایسا خلا [9] (GENERATION GAP) پیدا ہو جائے گا جو کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ اسلام نے اس رابطے کو برقرار رکھنے کے لئے "ذِکر" اور "فکر" کی دو جامع اصطلاحات ہمیں دی ہیں جو روایات کی قدامت سے بھی رشتہ استوار رکھتی ہیں اور نئے افکار کی جدیدیت کی راہ میں بھی حائل نہیں ہوتیں۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

مختصر الفاظ میں "ذکر" کے معنے ہیں کسی چیز کو اپنی سوچ میں محفوظ رکھنا، یاد سے محو نہ ہونے دینا، ہر آن اور ہر گھڑی مرکزِ توجہ بنائے رکھنا۔ فکر کے معنے ہیں سوچ کو متحرک اور فعال رکھنا، جامد اور ساکن نہ ہونے دینا بلکہ عہد بہ عہد کے تقاضوں کے اثرات و عواقب پر غور و خوض کرتے رہنا۔ ذکر گویا عمارت کی بنیاد ہے جبکہ فکر اس کی اٹھان اور آرائش و زیبائش کے لوازم پورے کرتا ہے قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اختلافِ لیل و نہار میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ نیز ارشاد کہ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (۳:۲۶) یعنی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے زمانِ مُسلسل (SERIAL TIME) کی حرکتِ غیر محسوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں یہ بتایا ہے کہ وقت کا وہ ٹکڑا جسے ہم "حال" کے نام سے موسوم کرتے ہیں فی الحقیقت "عدم" ہے اور اسی لئے ایک تصور کے سوا کچھ نہیں، بلکہ اسے ایک ثانیے کے لاکھویں کروڑویں حصے کا ثبات بھی حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا مستقبل کو جسے عارضی اور ناپائیدار "حال" کی صورت اختیار کرنی ہے تعمیر و ارتقا کا راستہ صرف ماضی دکھا سکتا ہے۔ ماضی سے فکری رابطہ منقطع ہوا تو گویا خود زندگی سے تعلق ٹوٹ گیا اس اعتبار سے جدیدیت بھی ماضی ہی کا پرتو ہے۔ اس سے الگ کچھ بھی نہیں۔ ذکر اور فکر دو ایسی قوتیں ہیں جو گزرپا حال کو ماضی اور مستقبل دونوں کا اتصال عطا کرتی ہیں۔ اور "عدم" کو "وجود" میں لے آتی ہیں۔ آسان زبان میں اسے یوں کہا جائے گا کہ ضرورت اور عہد بہ عہد کے تقاضے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہونے والی قدروں میں مناسب ترمیم اور تبدیلی کر کے نئی صورت تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن تعمیرِ جدید کے اس عمل میں بھی بنیادی اصولوں سے انحراف نہیں ہونے پاتا قرآن حکیم نے جو قدریں ہمیں عطا کی ہیں وہ زمان اور مکان دونوں کی ابدیت سے ہمکنار ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں بنیادی دائمی اور ابدی حیثیت حاصل ہے۔ جو معاشرہ ان قدروں کو تحفظ دے سکتا ہے وہ خود بھی دائمی اور ابدی بن جاتا ہے اور زمانے کے ہاتھوں کبھی نہیں مٹ سکتا۔ گزشتہ صفحات میں بعض مستقل قدروں کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ دونوں اپنے وسیع تر معنوں میں ایک ایسا کامل اور بے عیب نظام پیش کرتے ہیں جو ان قدروں کے تحفظ کا ضامن ہے۔ اس نظام میں ہر فرد انفرادی طور پر اور اجتماعاً اس خصوصیت کا حامل بن جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر عمل اللہ کے قانون کی متابعت میں رونما ہوتا ہے کیونکہ اس کے روح کی پکار ہی یہ ہوتی ہے کہ "میری زندگی، میری زندگی کے طور طریقے، میرا جینا سب اللہ کے لئے ہے"۔ (۶:۱۶۳)

ہم قرآن حکیم کو اپنے ایمان اور یقین کی پوری قوت کے ساتھ اس لئے مکمل ترین ضابطۂ زندگی مانتے ہیں کہ یہ عظیم ترین ہدایت جہاں ہمیں کائنات کے باریک حقائق سے متعلق بالکل صحیح تصورات دیتا ہے یا انسانی زندگی کے اہم اور مشکل معاملات میں راستہ دکھاتا ہے یا اللہ سے متعلق اور اس کے عالمِ امر کے بارے میں یا آخرت جیسے مابعد الطبیعیاتی مسائل کو واضح کرتا ہے وہاں یہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور ہماری معاشی، تمدنی، سیاسی اور ملکی ضروریات کو بھی سامنے رکھتا ہے مثال کے طور پر ایک فرد کو اپنے لئے کیا کچھ کرنا چاہیے، اُسے گھر والوں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رکھنے چاہئیں، دوستوں، ہمسایوں، دور اور نزدیک کے رشتہ داروں، اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے، چلنے پھرنے، کھانے پینے اور بات چیت کے کیا طور طریقے ہونے چاہئیں۔ آدابِ محفل کیا ہوں، رہنے سہنے کے انداز کیسے ہوں، کاروباری اصول کس طرح کے ہوں،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

وغیرہ بظاہر یہ باتیں چھوٹی سی ہیں لیکن انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا آغاز انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ایک مکمل اور بے نقص ضابطہ حیات ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ خاندان کے سربراہ کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کو ہر قسم کے غلط کاموں سے باز رکھے۔ ارشاد ہے "تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ" (۶۶ : ۶) کہہ دو کہ گھاٹے میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو گھاٹے میں رکھا۔ خبردار! یہی تو ہے بالکل صاف اور واضح نقصان!" (۳۹ : ۱۵)۔ لہٰذا خاندان کے سربراہوں کی ذمہ داری صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کے لئے روٹی، کپڑا، مکان مہیا کرے بلکہ انہیں غلط روش پر چلنے سے بھی بچائے۔ "اَھْل" کا لفظ بیوی بچوں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں دوست اور ساتھی بھی شامل ہیں۔ "بچانے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایجابی اور سلبی دونوں طریقوں سے تعلیم دے کر اپنے متعلقین کو غلط اقدامات سے محفوظ رکھے۔ میاں بیوی کے تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جن سے دونوں کے دلوں میں "مودّت، رحمت اور سکینت" پیدا ہو۔ (۳۰ : ۲۱) اور سارے گھر کے افراد میں ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ ہر ایک کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں (۲۵ : ۷۴)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمارے شرکائے حیات اور ہماری اولادوں کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے اور ہمیں متقین کا پیشرو بنا۔" (۲۵ : ۷۴)

(۲)

عورت کو جتنے حقوق اسلام نے دیئے ہیں تاریخ انسانیت ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ کسی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قرآن حکیم "اتراہی عورت کے لئے ہے"۔ اسلام سے پہلے عورت کا مقام ادنیٰ ترین غلام سے کم سمجھا جاتا تھا۔ بعض مکاتب فکر تو اسے روح سے بھی عاری یا عام حیوانوں کی طرح کا حیوان جانتے تھے۔ افلاطون اور ارسطو جیسے حکیم جنہیں فلسفیوں کا ابوالآباء کہا جاتا ہے نہ صرف غلامی کو ضروری قرار دیتے ہیں بلکہ عورت کو بھی یہی مقام دیتے ہوئے اسے ہر گوشے میں مرد سے فروتر قرار دیتے ہیں۔ ارسطو کا قول ہے کہ "عورت کے کردار کے متعلق ہمیں بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فطرت کے پروگرام میں ایک کمی رہ گئی ہے" پلاٹس (FLATUS) کہا کرتا تھا کہ عورت کے معاملہ میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی یہ کہے کہ میں اچھی عورت کا انتخاب کروں گا۔ اس انتخاب سے ہر دوسری عورت پہلی سے بدتر نکلے گی۔ عصر جدید کا روسو جس نے یورپ کو جمہوریت سے روشناس کرایا ہے اور جو حقوق انسانی کا بڑا علمبردار مانا جاتا ہے وہ بھی کہتا ہے کہ عورت کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ مرد کی فرمانبردار اور مطیع رہے اور اس کی ناانصافیوں کو برداشت کرے۔ انیسویں صدی تک کے محققین کی رائے یہ تھی کہ زمانۂ قدیم میں مرد نے سب سے پہلے جس جانور کو گھریلو بنایا وہ عورت تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے (خود عورت ہوتے ہوئے) عورتوں کی آزادی کی تحریک کے خلاف اعلان کیا "کہ ہر وہ دانشور جو عورتوں کی اس پاگل پن اور حماقت آمیز روش کو روکنے کے لئے کچھ لکھ سکتا ہے یا کہہ سکتا ہے وہ ہمارا دست و بازو ہے" ہٹلر نے کہا عورت سے کبھی کوئی مشورہ نہ لیا جائے، اگر اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو صرف ماں سے مشورہ لو لیکن کر و اس کے الٹ۔ تورات موجودہ میں لکھا ہے کہ خدا نے آدم (مرد) پیدا کیا تو وہ تنہائی کی وجہ سے اداس اداس رہنے لگا۔ اس کا دل بہلانے کی خاطر خدا نے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس کی پسلی سے حوا کو پیدا کر دیا۔ عورت اس کے لیے کھلونے کے طور پر پیدا کی گئی۔ پھر عورت شیطان کے فریب میں آگئی اور اس نے آدم کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں عورت کی نہایت گھناؤنی تصویر کھینچی گئی ہے۔

عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ جب قرآن حکیم کا نزول ہوا اس وقت عورت کے خلاف تحقیر و تذلیل کے جذبات اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، قرآن نے پوری قوت کے ساتھ اعلان کیا کہ مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں۔ اعلیٰ درجے کی انسانی صفات اور مجد و شرف میں دونوں برابر ہیں۔ دونوں کی تخلیق ایک ہی جرثومۂ حیات (نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ) سے ہوئی ہے یہ درست ہے کہ عملی زندگی میں ان کے وظائفِ حیات میں فرق ہے لیکن یہ فرق تقسیم کار کا ہے۔ فضیلت کا نہیں، صلاحیتیں ہر لحاظ سے دونوں کی ایک جیسی ہیں۔ سورۂ احزاب کی آیتِ جلیلہ پر غور کیجیے قرآن حکیم کس طرح دونوں کو شاہراہِ حیات پر شانہ بشانہ چلتے دکھاتا ہے۔ ارشاد ہے۔

۱۔ ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں۔
۲۔ اپنی قوتوں کو سنبھال کر رکھنے والے مرد اور اپنی قوتوں کو تحفظ دینے والی عورتیں
۳۔ دعوائے ایمان کو عمل سے سچ کر دکھانے والے مرد اور سچ کر دکھانے والی عورتیں۔
۴۔ ثابت قدم رہنے والے مرد اور ثابت قدم رہنے والی عورتیں۔
۵۔ قوانینِ ربانی کے سامنے جھکنے والے مرد اور قوانینِ ربانی کے سامنے جھکنے والی عورتیں
۶۔ ایثار سے کام لینے والے مرد اور ایثار سے کام لینے والی عورتیں۔
۷۔ اپنے آپ پر ضبط رکھنے والے مرد اور اپنے آپ پر ضبط رکھنے والی عورتیں
۸۔ جنسی میلانات پر قابو پانے والے مرد اور جنسی میلانات پر قابو پانے والی عورتیں۔
۹۔ اللہ کا ذکر کثیر کرنے والے مرد اور اللہ کا ذکر کثیر کرنے والی عورتیں۔

کتنی عظیم صلاحیتیں ہیں جن کے مرد اور عورتیں یکساں اہل ہیں؛ زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جہاں قرآن حکیم نے کہا ہو کہ اس میں مرد کو تو صلاحیت حاصل ہے لیکن عورت کو صلاحیت حاصل نہیں ہے یا کم حاصل ہے۔ اعمال کی جزا و سزا میں بھی دونوں برابر ہیں۔

اور تم میں سے جو بھی اعمال صالح کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو، تو وہ جنت میں داخل ہو گا اور اس کے اعمال میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی (۴: ۱۲۴)

تقسیم کار کی رو سے تعلیم و تربیتِ اطفال کا نہایت نازک اور بے حد ضروری فریضہ عورت کے سپرد کیا گیا ہے۔ یہ اس کی طبیعت کی قدرتی لطافت، نزاکت، ممتا کے جذبے کی شدت اور تحمل، حوصلہ، عالی ظرفی اور محبت و ایثار کی وجہ سے ہے عمر کے یہی ابتدائی سال شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اہمیت رکھتے ہیں۔ "انسانیت سازی" کا یہ کام مرد قطعاً نہیں کر سکتا۔ اسے جسمانی طور پر زیادہ مضبوط بنایا ہی اسی لیے گیا ہے کہ وہ بیرونِ در محنت مشقت کر کے روزی کمائے اور بیوی بچوں کی ضروریات از قسم روٹی، کپڑا، مکان، تحفظات کی فراہمی وغیرہ کو پورا کرنے کی ذمہ داری اٹھائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فضیلت عورت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کی نیابت ہوگی کیونکہ تشکیلِ انسانیت دو مختلف سمتوں کا فریضہ ہے۔ جو عورت کے سپرد کیا گیا ہے۔ روزی کمانا خارجی سمت کا فریضہ ہے۔ جو مرد کو دیا گیا ہے۔ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (۴:۳۴) کے عربی میں معنے ہیں۔ بیویوں کو سامانِ زیست مہیا کرنے والا۔ یہ مردوں کی صفت بتائی گئی ہے، اس کے معنے عورتوں پر حاکم یا داروغہ نہیں ہیں۔ قرآن حکیم نے عورت کو جو مراعات دی ہیں ان کا پہلے کوئی تصور بھی نہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً ترکہ میں حصہ (۴:۷ - ۴:۱۱) یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ عورت کو ہر حالت میں مرد سے نصف حصہ ملے گا۔ مثلاً اولاد کے ترکہ سے ماں اور باپ کا ترکہ برابر ہے۔ کلالہ کے ترکہ سے بہن اور بھائی کا حصہ برابر ہے۔ اس کے علاوہ یہ آیات بھی دیکھئے۔

۱ اگر مرد مجرم ہو تو اسی کو اور اگر عورت مجرم ہو تو اسی کو سزا ملے گی (۲۶:۱۸۰)

۲ اسلام نے عورت کو نشأۃ ثانیہ عطا کر کے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ وہی عورت جو اپنے معاملات کو بھی وضاحت سے بیان نہ کر سکتی تھی (۴۳:۱۸) اب نہایت فصیح البیان ہو گئی۔ (۳۵-۳۱:۵۶/)

۳ جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ (۴:۳۲)

۴ بعض صورتوں میں مرد افضل ہیں اور بعض میں عورتیں (۴:۳۴)

۵ بنی آدم سب واجب تکریم ہیں (۱۷:۷۰)

۶ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اہم ترین فریضہ میں مرد اور عورت دونوں ذمہ دار ہیں (۹:۷۱)

۷ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ اسلام میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے۔ حکم یہ ہے کہ شہادت کے سلسلے میں ایک عورت کے ساتھ دوسری عورت بھی مقرر کر دی جائے کہ اگر ایک گھبرا جائے یا کچھ بھول جائے تو دوسری اسے بات یاد دلا دے (۲:۲۸۲) گواہی اسی ایک کی ہوگی، دوسری عورت گواہی نہیں بلکہ گواہی دینے والی عورت کی مدد کے لئے ہے یعنی اگر گواہی دینے والی عورت گھبرائے نہیں تو پھر دوسری عورت کو مداخلت کا حق نہیں پہنچے گا۔

اولاد کی پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کرنا انہیں قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ عربی زبان میں قتل کے ایک معنے ذلیل و خوار کر دینے کے بھی ہیں۔ صلاحیت کو ابھرنے کا موقع نہ دینا سب سے بڑا گناہ ہے۔ قرآن حکیم نے پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔

بے شک گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو بے سمجھے قتل کر دیا۔ (۶:۱۴۰)

مفلسی کے خوف سے تم اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ روزی ہم دیتے ہیں تم کو بھی اور ان کو بھی۔ یقیناً ان کا قتل کرنا خطائے کبیر ہے۔ (۱۷:۳۱) اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری از روئے تقسیم کار مرد پر عائد ہوتی ہے (۴:۳۴) لیکن ان کی کفالت کے سلسلے میں کوئی ناجائز کمائی نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی ان کی خوشنودی کی خاطر کوئی ایسے اقدامات کئے جائیں جو غلط ہوں۔ قرآن حکیم سختی سے منع کرتا ہے کہ دیکھنا کہیں تمہارے بیوی بچے تمہارے دشمن اور تمہارے لئے آزمائش نہ بن جائیں۔

"اے ایمان والو! تمہاری بیویاں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں۔ پس ان سے بچتے رہو۔ اور اگر دشمنی کا اقدام نہ ہو اور تم ہمارے حق میں انہیں معاف کر دو، انہیں بے خطا کر

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

• چھوڑ دو، انہیں اپنے انتقام سے بچالو۔ بیشک اللہ تحفظ دینے والا خاص رحمتوں والا ہے" (۶۴:۱۴)

• بیشک تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تمہیں جانچنے کے لئے ہیں، سو جہاں تک ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ سنو اور اطاعت کرو اور اپنی جانوں کی بھلائی کے لئے انفاق کرو۔ اور جس نے اپنے آپ کو شحّ نفس سے بچا لیا وہی کامیاب و کامران ہوا (۶۴ : ۱۶)

عملی زندگی میں عام اصول یہ ہے کہ فصل اسی کی اچھی اُگتی ہے جو اپنے کھیت کو بروقت سیراب کرتا ہے، صحت اسی کی بنتی ہے جو اچھی غذا کھائے۔ لیکن اقدار کی سطح کی زندگی میں محبوبیت اسی کی پروان چڑھتی ہے جو دوسروں کی سیرابی کو اپنی سیرابی پر ترجیح دے۔ گویا یہاں لینے کی بجائے دینے سے ارتقا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کا نظام نشوونما یہ ہے کہ ہر شخص دوسروں کی نشوونما کی فکر کرے اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم سمجھے۔ "شحّ نفس" اس کے بالکل برعکس ذہنیت کو کہتے ہیں۔ یہ وہ تنگ نظری ہے جو دوسروں کو آگے بڑھنے سے روکتی ہی نہیں بلکہ ہر چیز کو اپنے ہی لئے مختص کر لینے پر مجبور کرتی ہے۔ گویا اس میں حسد، خود غرضی، بخل اور حرص سب شامل ہیں۔

بڑھاپے میں انسان کے اعضاء مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اعصاب کے اندر وہ پہلی سی طاقت نہیں رہتی، مزاج بدل جاتا ہے، طبیعت میں اعتدال باقی نہیں رہتا (۳۰:۵۴) ایسی حالت میں ضروری ہے کہ جس نے عمر بھر محنت کر کے اور اپنا آرام و آسائش قربان کر کے اولاد کی پرورش کی ہے اس کو ذہنی سکون دیا جائے، اس کا سہارا بنا جائے اور اسے آرام پہنچایا جائے۔ بوڑھا آدمی اپنی تخلیق میں واپس پلٹ آتا ہے یعنی بچوں کی طرح جسمانی اور ذہنی کمزوریوں کا شکار ہو جاتا ہے (۳۶:۶۸) اس کا حافظہ بھی درست نہیں رہتا۔

• اور تم میں سے بعض پہنچ جاتے ہیں عمر کے رذیل حصے کو جہاں وہ سب کچھ نہیں سمجھتے جو پہلے سمجھتے تھے (۱۶:۷۰)

• اور تم میں سے کوئی جا پہنچتا ہے نکمی عمر تک اور وہ سمجھدار بننے کے بعد کچھ نہیں سمجھتا (۲۲:۵)

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ ایسی حالت میں ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ اگر پہنچ جائے تمہارے سامنے بڑھاپے کو ان میں سے ایک یا دونوں تو تم ان کو "اُف" تک نہ کہو۔ اور نہ ان کو جھڑکو بلکہ ان سے ادب کی بات کرو (قول کریم) ان کے آگے نیازمندی کے کندھے رحمت سے جھکا دو اور کہو اے میرے پروردگار ان پر ایسی طرح رحمت کر جس طرح انہوں نے مجھے پالا پوسا جب میں چھوٹا تھا" (۱۷:۲۳-۲۴) "اپنے والدین کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرو" (۶:۱۵۲)

• "احسان" کے معنے ہیں بگڑے ہوئے توازن کو پھر سے ٹھیک کر دینا۔ کسی کی قوت یا صلاحیت میں کمی واقع ہو جائے تو اس کی کمی کو پورا کر دینے کا نام احسان ہے۔ عدل اور احسان میں فرق یہ ہے کہ عدل اپنے ذمے کے واجبات ٹھیک ٹھیک ادا کر دینے اور اپنا حق ٹھیک ٹھیک لے لینے کا نام ہے۔ جبکہ احسان میں نگاہ واجبات پر نہیں ہوتی بلکہ توازن برقرار رکھنے پر ہوتی ہے۔ لہٰذا احسان یہ ہے کہ جتنا تمہارے ذمے ہے اس سے زیادہ دو اور جتنا تمہارا حق بنتا ہے اس سے کم لو۔ احسان ایک فریضہ ہے۔ تقاضائے فطرت انسانی ہے اس لئے یہ کسی کو زیر بار کرنا نہیں ہے، نہ ہی یہ منت لگانا ہے۔ "اُف" کے معنی ہیں بیزاری، اکتاہٹ، [illegible]، پریشانی یا نفرت کا اظہار۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

گھر معاشرے کی اولین اکائی ہے، اس اعتبار سے یہ تہذیب اخلاق کا سب سے پہلا گہوارہ ہے جو تربیت اور ضبط و تعاون گھر کے ماحول سے حاصل ہوتا ہے۔ وہی عمر بھر انسان کی سیرت پر اثر انداز رہتا ہے۔ کنبے کے افراد میں والدین اور اولاد کے درمیان اور پھر اولاد اور اولاد کے آپس کے تعلقات بہت اہم ہیں۔ اگر یہ تعلقات صحیح خطوط پر استوار نہ ہوں تو ایسے ذہنی امراض پیدا ہو جاتے ہیں جو کسی وقت پورے معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا گیا کہ آپ مخالفین سے الگ ہو کر اپنی جماعت کی تنظیم کریں تو اس کے لئے جو اصول ارشاد ہوا وہ یہ ہے کہ "مت ڈال اپنی آنکھیں ان چیزوں پر جو ہم نے ان لوگوں میں سے بعض کو دی ہیں۔ اور تو ان پر غم نہ کھا اور تو مومنین کے واسطے اپنے بازو جھکا دے (۱۵ : ۸۸)

"گھر" چھوٹے پیمانے پر ایک امت بھی ہے اس لئے امت سازی کے جتنے اصول قرآن حکیم میں بیان ہوئے ہیں یا جن میں مومنین کے آپس کے تعلقات کا ذکر آیا ہے ان سب کا اطلاق گھر کے ماحول پر ہونا چاہیئے۔ مومنین جس طرح آپس میں رحمت کا نمونہ ہوتے ہیں اسی طرح بہن بھائیوں کے درمیان بھی رحمت کی فضا قائم ہونی چاہیئے۔ اگر کسی بچے کو کوئی چیز زیادہ دے دی گئی ہے تو دوسرے بچوں میں احساس محرومی یا حسد وغیرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ والدین یا اساتذہ اس قسم کے مواقع کو بآسانی سنبھال سکتے ہیں۔ اخوت، اتحاد و تعاون، حریت اور عدل و مساوات کی تربیت جتنی گھر اور مدرسے کی چار دیواری کے اندر دی جا سکتی ہے وہ اور کہیں نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے جو ماہرین تعلیم و تربیت اس ضمن میں قرآن حکیم کی راہنمائی معلوم کرنا چاہتے ہیں انہیں تشکیل امت کے تمام قرآنی احکام و ضوابط کو یکجا کر کے ایک لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیئے۔

"بازو جھکا دینے" کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جس طرح مرغی اپنے چوزوں کو خطرے کے وقت اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے اور ان کی حفاظت کرتی ہے، اسی طرح افراد خانہ بھی ایک دوسرے کو تحفظ دیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جس طرح "بازو" قوت کا مظہر ہے اور ایسا سہارا ہے جس کی مدد سے پرندے ہوا میں اڑتے ہیں اسی طرح اس قوت اور سہارے کو آپس کی الفت، حفاظت، اتحاد، باہمی تعاون اور خدمت میں جھکا دیا جائے۔

ذوی القربیٰ کی اصطلاح بھی بڑی جامع ہے۔ اس میں وہ تمام رشتہ داریاں آجاتی ہیں جو ماں اور باپ دونوں کی اصلوں سے اولاد تک پہنچتی ہیں اور پھر بھائیوں اور بہنوں کی شاخ در شاخ سے آگے پھیل جاتی ہیں۔ قرآن حکیم ان سب قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے (۱۷ : ۲۶) اور اگر ان میں کوئی ضرورت مند ہوں تو ان کی مالی امداد کرنے کا بھی حکم دیتا ہے (۲ : ۱۷۷)، بلکہ احسان کے دائرے کو اس قدر وسیع کر دیتا ہے کہ اس میں وہ ہمسائے بھی آجاتے ہیں جو قرابت دار نہیں ہیں، نیز مسافر اور رفیق بھی آجاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ اپنے نوکروں، ملازموں اور ماتحتوں پر بھی احسان کرو (۴ : ۳۶)۔ احسان کے لفظ میں بے پناہ وسعت ہے۔ اس میں کمی پوری کرنے کا جو پہلو ہے وہ علم کی کمی، اخلاق کی کمی، سامان زندگی کی کمی، صلاحیتوں کو نشوونما کے مواقع میسر نہ آسکنے کی کمی سب کچھ شامل ہے۔ مقصد یہ کہ کسی ایک فرد کے اندر بھی کسی قسم کی کوئی کمی باقی نہ رہ جائے۔ ذرا غور فرمایئے ربوبیت عامہ کا کتنا بڑا پروگرام ان چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ معاشرتی رشتے ہیں جن کو کاٹا نہیں جا سکتا کیونکہ انہی سے اخوت کی حکمت محسوس شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہمسائیگی ہی کو پھیلاتے چلے جایئے تو پوری انسانیت اس کے دائرے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے اندر سمٹ کر آجائے گی۔ حقوق اور فرائض کے رشتوں میں اسے مضبوطی سے باندھ دیا جائے جیسا کہ قرآن چاہتا ہے تو پھر تمام انسان یک رنگ ہو کر نفس واحد بن جاتے ہیں۔ عالمگیر اخوت اور مودّت کا اس سے زیادہ بہتر اور موثر پروگرام انسانی عقل پیش نہیں کر سکتی۔

چونکہ قرآن حکیم کا واضح حکم ہے کہ انسان خواہ وہ کوئی اعتقاد رکھتا ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم، آدم کی اولاد ہونے کے ناطے سے واجب تکریم ہے اس لئے قرآن حکیم نے غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ معاملات کا حکم تو دیا ہے لیکن یہ نہیں کہا کہ ان کے ساتھ دوستی کی جائے۔ کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اہلِ ایمان ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ ان کے ساتھ دوستی اس لئے نہیں ہو سکتی کہ دونوں کے نظریات زندگی متضاد ہیں۔ قرآن حکیم انسانیت کو دو قومیتوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ جو توحید و رسالت پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرا جو اس کے انکاری ہیں۔ لہٰذا جو لوگ قرآنی نظریۂ حیات کو تسلیم نہیں کرتے ان سے ساتھ تسلیم کرنے والوں کی دوستی نہیں ہو سکتی۔ قرآن پاک اس ضمن میں اس حد تک سخت ہے کہ ماں باپ یا بہن بھائی بھی کافر ہوں تو انہیں دوست نہیں بنایا جا سکتا۔ ارشاد ہے کہ:۔

"مومنین، مومنین کو چھوڑ کر کافرین کو دوست نہ بنائیں۔ اگر کوئی یہ کام کرے تو اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ سوا اس صورت میں کہ تم ان سے بچاؤ کرنا چاہو" (۳:۲۸)

اے ایمان والو! اپنے آباؤ کو اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر سے محبت رکھیں۔ اگر کوئی تم میں سے ان سے دوستی کرے گا تو وہ ظالم ہوگا۔" (۹:۲۳)

عام مدارات، رواداری اور میل ملاقات یا خوش اخلاقی اور چیز ہے، دوستی اور چیز ہے۔ خوش اخلاقی اور حسنِ معاملہ ہر انسان سے بلا امتیاز اس امر کے کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم یکساں طور پر برتنی چاہیئے۔ غیر مسلموں کے باطل معبودوں کو بھی برا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔ (۶:۱۰۹) کیونکہ یہ عام اخلاق کے خلاف ہے۔ بلکہ غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت بھی مسلمانوں کے ذمے ہے (۲۲:۴۰) ان کے بانیان مذہب کی بھی عزت کرنی چاہیئے۔ (۲:۸۳ – ۴:۱۴۸) لیکن یہ بات ہر وقت ذہن میں رہے کہ ان لوگوں کے پاس اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا دین اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔

غیر مسلموں کو جبراً بھی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے (۲:۲۵۶ – ۹:۶ – ۱۰:۹۹) دین کی تبلیغ بھی احسن طریق سے کرنی چاہیئے اور اگر بحث کرنی پڑ جائے تو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے کرنی چاہیئے۔ (۹:۷۱) اگر ان میں کبھی کوئی جھگڑا ہو جائے تو حکم ہے کہ ان میں صلح کرا دو اور جو زیادتی کرے اس سے مؤاخذہ کرو (۴۹:۹)

جب کوئی تمہیں دعا دے تو تم اسے یا تو بہتر دعا دو یا کم از کم ویسی ہی دعا دو (۲۴:۶۱) یہی حکم دوسروں کے گھر جاتے وقت بھی ملحوظ رکھو۔ (۲۴:۲۷) بلکہ جاہلوں اور ناواقفوں کو بھی یہی دعا دو (۲۵:۶۳) یہ دعا کیا ہے؟ ساری مسلم دنیا میں اس کے لئے ایک ہی جملہ مقرر ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔ اس کے ساتھ "ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کا اضافہ کر دیئے جائیں تو اچھی بات ہے۔ اس جملے کے معنے ہیں: میں تمہاری ہر طرح سے سلامتی کا آرزومند ہوں، اس کے جواب میں "وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ" کے الفاظ سے اسی دعا کو دہرایا جاتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا گیا (اللہ کی طرف سے) کہ جب مومنین تمہارے پاس

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

آئیں تو ان سے کہو "سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ"۔ اہل جنت بھی ایک دوسرے کو "سلام" کی دعا دیں گے (۴۶:۷) یہ مزید اولوالعزمی کی آرزو کا اظہار ہے۔ بلکہ جنت میں تو ہر طرف سے "سلام" ہی کی صدائیں بلند ہوں گی۔ (۳۳:۱۳۔۱۰:۱۰۔ ۷۳:۳۹)

یہ احکام مومنین کے میل جول کے سلسلے میں ہیں۔ تاہم بعض اوقات انسان پر غیظ و غضب کا غلبہ ہو جاتا ہے اور انسان بدلہ لینے پر اتر آتا ہے تو اس سلسلے میں قرآن حکیم کی تعلیم بے مثال ہے۔ قرآن حکیم اپنے پیروکاروں کو نہایت متوازن زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ اقدام غلط ہے جس سے انسان اپنی معقولیت کھو بیٹھے یا جو اسے حیوانیت کی سطح پر پہنچا دے۔ خارجی طور پر نشہ آور چیزوں کا استعمال منع ہے اور داخلی طور پر ہوس، مال و دولت سمیٹ لینے کی غرض سے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جذبہ، بلکہ نشہ، حسد، کینہ، بغض، عناد، تنگ نظری، تعصب وغیرہ کو قاطع انسانیت قرار دیا گیا ہے۔ امراض قلب کی ان اقسام میں غیظ و غضب سب سے زیادہ مہلک ہے۔ انسان غصے میں پاگل ہو جاتا ہے۔ اچھا خاصہ سنجیدہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بھی مغضوب الغضب ہو کر چند لمحات کے لئے عقل کھو بیٹھتا ہے اور جب تک غصے کی آگ ٹھنڈی نہ ہو اس کی ذہنی حالت صحیح نہیں رہتی۔ یہ لعنت بھڑکتا شعلہ اس شعلہ صفت مخلوق کی فطرت ہے جس کو اپنی آتشیں تخلیق پر ناز ہے۔ انسان کے اندر یہ مذموم صفت اس کی حیوانی سطح کے ادنیٰ جذبات کی وجہ سے ہے جس طرح دوسری حیوانی صفت پر قابو پانے اور انہیں اعلیٰ اغراض و مقاصد میں صرف کرنے کا حکم ہے اسی طرح اس شرربار صفت کو بھی اپنے بس میں رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ شیطان کو مارا نہیں جا سکتا۔ تو اسے مسلمان تو بنایا جا سکتا ہے۔ اپنی سیرت کی پختگی اس سے تسلیم کرائی جا سکتی ہے۔ اپنے انسانی شرف کی برتری اس سے منوائی جا سکتی ہے۔ تاہم غصے کو دبا دینا یا جبراً پیچھے دھکیل دینا یعنی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے اور بہت سی نفسیاتی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جذبات کو کچلا بھی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ان کے بغیر زندگی کی تصویر بے رنگ رہ جاتی ہے۔ تاہم ان کو صحیح مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اور صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کا رخ تعمیری کاموں کی طرف موڑ دیا جائے۔ مثال کے طور پر بچوں کو چیزیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ چھینا جھپٹی اور ہاتھا پائی کر کے بھی اپنے اس جذبے کی تسکین میں چیزیں اکٹھی کرتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں اسی طرح بے لگام یا بغیر رہنمائی کے چھوڑ دیا جائے تو بڑی عمر کو پہنچ کر یہ ہوس زر میں مبتلا ہو جائیں گے اور چوری، سینہ زوری، دھونس، لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے دوسرے حربوں سے اپنے اس جذبے کی تسکین کرتے رہیں گے۔ تعلیم و تربیت کے ذمہ دار لوگوں کو چاہیئے کہ بچوں کے اس جذبے کا رخ بہتر مشاغل کی طرف موڑ دیں۔ مثلاً ٹکٹیں وغیرہ یا نوادرات جمع کرنا۔ کتابوں کی لائبریری بنا ڈالنا۔ سماجی کاموں کے لیے چندے اکٹھے کرنا وغیرہ۔ صحرائے عرب میں پانی کی کمی ہوتی ہے اگر کہیں کسی کنوئیں سے پانی نکل بھی آتا ہے تو گرمیوں میں پانی کی سطح بہت نیچے چلی جاتی ہے۔ اس کا علاج قدیم زمانے سے ہی یہ سوچا گیا تھا کہ بادیہ نشین لوگ تین تین چار چار کنوئیں پاس پاس کھود ڈالتے تھے پھر انہیں زیر زمین نالیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے تھے۔ اب اگر کسی کنوئیں کا پانی کم ہونے لگتا تو جس کنوئیں کا پانی زیادہ ہوتا اس کا پانی اس نالی کے ذریعے اس میں آ جاتا اور اس طرح تمام کنوؤں کے پانی کی سطح ہمیشہ ہموار رہتی اس عمل کو وہ کظامہ کہتے تھے۔ اس کے معنے ہیں زائد چیز کو دوسری طرف منتقل کر دینا۔ قرآن حکیم نے غصے کا علاج کظامت بتایا ہے۔ یعنی اس پست درجے کے جذبے کو بلند مقاصد کی طرف موڑ دو۔ مومنین کی صفت کاظمین الغیظ بتائی ہے (۱۳۴:۳) مومنین غصے کو

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بن نہیں جاتے بلکہ اس جذبے کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ توازن کے اعتبار سے ترازو کے اس چھلے کو بھی کفاءت کہا جاتا ہے جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کر کے باندھی جاتی ہیں۔ اسی طرح کندے کی سوئی کو بھی جو یہ بتاتی ہے کہ کونسا پلڑا بھاری ہے اور کون سا ہلکا ہے کفاءت کہتے ہیں۔ توشہ دان اَلْكَظِيمَةُ کہلاتا ہے جس میں زائد بچا ہوا کھانا رکھ دیا جاتا ہے تاکہ ضائع ہو جانے کی بجائے کسی بھوکے ضرورت مند کے کام آ جائے۔ ان معانی کے پیش نظر کاظمین الغیظ وہ لوگ ہوئے جو اپنی زائد توانائیوں کو سود مند اور تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔

غیظ و غضب کی بھڑکی ہوئی آگ کا رُخ جب برائیوں کو جلا ڈالنے کی طرف موڑ دیا جاتا ہے تو انسان کے دل میں تسکین کی ٹھنڈک آ جاتی ہے جس سے وسعتِ نظر اور بلند حوصلگی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ مخالفین سے بھی درگزر کرتا ہے اور وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (۳ : ۱۳۴) کی صفت میں آ جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (۴۲ : ۳۷) کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنی دشمن کو بھی اس کی غلطیوں کے مضر نتائج سے محفوظ رکھنے والا بن جاتا ہے اور یہ مصلحین کی منزل ہے۔

چونکہ مصلحین کا کام درستی اور اصلاح ہے۔ بگڑی کا بنانا ہے۔ خرابیوں کو دور کرنا ہے۔ اس لئے یہ تحفظات مہیا کرنے کو دوسرے اقدامات پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا طریقہ اصلاح ایجابی (POSITIVE) زیادہ اور سلبی (NEGATIVE) کم ہوتا ہے۔ ان کی تعلیم اور تربیت کا انداز بھی اس قسم کا ہوتا ہے جس سے زیر اصلاح شخص برائیوں سے بچا رہے یعنی اس سے گناہوں کا ارتکاب ہی نہ ہو۔ اگر کوئی شخص بھول چوک سے کوئی غلط کام کر بیٹھے تو قرآن حکیم نے اس کا علاج توبہ فرمایا ہے یعنی نادم ہو کر اور غلطی کا ازالہ کر کے واپس صحیح راستے پر آ جانا۔ معذرتِ طلبی اور توبہ کے اس ایجابی طریقِ اصلاح کو اسلام سے پہلے اور کسی مذہب یا مکتب فکر نے پیش نہیں کیا۔ اصلاح صرف اس وقت ممکن ہے جب غلطی کرنے والا اپنے کئے پر صرف پچھتاتا ہی نہیں بلکہ سچے دل سے اپنی غلطی کا احساس کر کے آئندہ ویسی غلطی نہ کرنے کا عہد بھی کرے اور اس عہد پر قائم بھی رہ جائے (۴ : ۶۴) لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی اس طرح کی اصلاح کر لینے کی بجائے عفو و درگزر کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی غلط روش میں اور زیادہ تنگ بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے آخری حربہ سزا ہے لیکن مقصد چونکہ ہر حال میں اصلاح ہے اس لئے حکم ہے کہ سزا جرم کی نسبت سے ہونی چاہیئے۔ اس کے بارے فرمایا ہے (۴۲ : ۴۰)

"برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ اور جو کوئی اپنی مظلومیت کا بدلہ لے تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق اودھم مچاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جس نے برداشت کر لیا اور معاف کر دیا تو بیشک یہ بڑی ہمت کا کام ہے (۴۲ : ۴۰)

یہاں ایک خاص نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ انتقام قوانینِ خداوندی کے مطابق جرم کی پاداش کا نام ہے انسان کے ذاتی جذبات کی تسکین کا نام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انتقام لینے کا حق صرف اللہ کو ہے یا حکومت الٰہیہ کو جو اللہ کے قوانین کے نفاذ کی ذمہ دار ہے، جس میں اختیار و اقتدار کا مالک انسان نہیں اللہ ہوتا ہے اور انسان صرف اللہ کے قانون کو چلانے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

والا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں منتقم صرف اللہ کو کہا گیا ہے انسانوں کو کہیں بھی نہیں کہا گیا۔ جرم کی سزا اور انتقام کے اس نعلیت سے فرق کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ انتقام مکافاتِ عمل ہے۔ جزا اور سزا ہر عمل کے اپنے اندر ہوتی ہے جیسے آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی کا جل جانا یا اچھی غذا کھانے سے صحت کا قائم رہنا۔ اللہ کے ذوانتقام ہونے کے معنے یہ ہوئے کہ اللہ وہ ہستی ہے جس کے قانون کے مطابق اعمال اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ اور مجرم کو سزا ملتی ہے۔ قانون ہر شخص کے لئے ہر جگہ پر اور ہر زمانے میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ لیکن جذبات میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ اللہ انسانوں کے سے جذبات سے پاک ہے اس لئے اس کے قوانین جزا و سزا ذاتی جذبات کی تسکین کے عنصر سے پاک ہیں۔

معاشرتی برائیوں کے سلسلے میں ایک اور لفظ "فحاشی" بھی عام مستعمل ہے عربی زبان میں فَحْشَآءِ کا واحد اَلْفُحْشُ ہے جس کے معنے ہیں حد سے بڑھ جانا، زیادتی کر بیٹھنا، گفتگو میں آداب و احترام کی حدیں پھلانگ جانا۔ قرآن حکیم یہ لفظ عدل، قسط اور قُنُوت کے مقابلے میں آیا ہے۔ عدل کے معنے ہیں کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ دینا۔ قسط کسی کے حقوق و واجبات کا پورا پورا ادا کر دینا ہے، قُنُوت کے معنے ہیں اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور انہیں صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا، نیز کامل اطاعت گزاری اور فرمان پذیری۔ لہٰذا فحش کے معنے ان تینوں کے برعکس ہوئے۔ حدود فراموشی حق تلفی، سرکشی اور نافرمانی، اللہ کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی "فحش" میں داخل ہوگی۔ اس کے علاوہ اس کے معنے ہیں ذلیل و شرمناک حرکت، فعلِ شنیعہ، آیت ۳:۱۳۴ میں اس لفظ کے یہی معنے ہیں۔

فحشاء کے ایک معنے بخل کے بھی ہیں۔ ان معنوں میں یہ لفظ ۲:۲۶۸ میں فضل کے مقابلے میں آیا ہے، لہٰذا اس کے معنے ہوں گے رزق کی کمی، رزق کی تنگی یا رزق کے خرچ کرنے میں ہاتھ روک لینا۔ مذکورہ آیت میں اس کے معنے ناجائز ذرائع سے دولت کمانا بھی ہو سکتا ہے: "شیطان تم کو تنگدستی کا وعدہ دیتا ہے اور فحشاء کا حکم دیتا ہے۔ جبکہ اللہ تم کو وعدہ دیتا ہے اپنی طرف سے تحفظات کا، فارغ البالی کا، اللہ بہت کشائش والا سب کچھ جاننے والا ہے" (۲:۲۶۸)

اب دیکھئے وہ احکام جن میں بے حیائی کی باتوں سے منع کیا گیا ہے

۱ — بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ وہ کھلی ہوں یا پوشیدہ (۶:۱۵)

۲ — اللہ نے انہیں حرام قرار دیا ہے (۷:۳۳)

۳ — مومن ایسی باتوں سے دور رہتے ہیں (۴۲:۳۷ - ۵۳:۳۲)

۴ — معاشرے میں فحش باتوں کو مت پھیلاؤ۔ (۲۴:۱۹)

اس آخری حکم میں ہر قسم کا لٹریچر، ڈرامے، سینما۔ ٹی وی۔ ریڈیو وغیرہ جن سے برائی پھیلنے کا اندیشہ ہو سب آجاتے ہیں۔ فحشاء کے قبیل ہی کی وہ برائیاں ہیں جنہیں لغویات کہا جاتا ہے۔ لغو کے معنے ہیں بے ہودہ باتیں۔ ایسی باتیں جو شرفاء کی شان کے شایاں نہیں ہیں۔ بے معنی باتیں۔ ایسی گفتگو جو بے سوچے سمجھے کی جائے ایسا کلام جن کا کوئی وزن نہ ہو۔

قرآن حکیم میں کفار کے رویئے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ اپنے ہم مشربوں کو تلقین کرتے ہیں کہ قرآن کو نہ سنو اور شور مچا دو اور بے معنی آوازیں نکالو (۴۱:۲۶) شاید تم اس طریقے سے غالب آجاؤ حق کی آواز اس طرح ہاہا کار مچانے سے نہیں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دب سکتی۔ لغویات ہمیشہ لغو ہی رہے گی۔ ہر وہ بات، ہر وہ عمل، ہر وہ نظریہ، ہر وہ تصور یا عقیدہ جو لوگوں کو قرآن پاک سے دُور رکھنے کے لیے ایجاد کیا گیا ہو "لغو" قرآن حکیم فضول بے مقصد باتوں سے منع کرتا ہے۔ حکم یہ ہے کہ ہر لغو بات اور بیہودہ کام سے پرہیز کرو (۳:۱۵۲) بلکہ لغو باتیں سنو ہی نہیں (۲۸:۵۵) اور اگر اتفاقیہ طور پر کہیں لغو باتوں سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہاں سے شریفانہ انداز سے پہلو تہی کر جاؤ اور آگے بڑھ جاؤ (۷۲:۲۵)

ہمارا آپس کا انداز کیا ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق ارشادات یہ ہیں۔

۱۔ ہمیشہ صاف، واضح اور غیر مبہم اور سیدھی بات کرو جس سے کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو اور نہ کلام ذو معنی ہو (۷۰:۳۳)

۲۔ زبان وہ استعمال کرو جو معاشرے میں شرفاء کی زبان تسلیم کی جاتی ہے (۷۲:۲۵)

۳۔ باتیں نہایت خوبصورت انداز میں کرو، اور توازن کو برقرار رکھو۔ (۵۳:۱۷-۸۳:۲)

۴۔ چیخ چیخ کر بات مت کرو (۱۹:۳۱)

۵۔ گفتگو میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھو (۱۵۲:۶)

۶۔ تصنع اور فریب کاری کی بات مت کرو۔ (۳۰:۲۲)

۷۔ حق بات کو جھوٹ کے لباس میں مت چھپاؤ، جھوٹ کو سچ کا لباس نہ پہناؤ، اور غلط اور صحیح کو غلط ملط مت کرو (۴۲:۲)

۸۔ کسی کے خلاف تہمت مت لگاؤ (۲۴:۲۳)

۹۔ پاکباز عورتوں کے خلاف تہمت لگانا قانوناً بھی جرم ہے۔ اگر تہمت ثابت نہ ہو تو اس کی سزا اسی کوڑے ہے (۴:۲۴-۳۳:۵۸)

۱۰۔ جرم خود کرنا لیکن اس کا الزام دوسرے کے سر تھوپنا سخت جرم ہے (۴:۱۱۲)

۱۱۔ شریف زادیوں کو تنگ کرنا سنگین جرم ہے۔ معاشرے کو اس کے خلاف سخت اقدامات کرنے چاہئیں (۴۰:۵۹:۳۳)

۱۲۔ ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی نہ کرو (۱۱:۴۹)

۱۳۔ ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑاؤ (۱۱:۴۹) تمسخر میں ہر وہ بات آجاتی ہے جو دوسروں کی ذلت یا تحقیر کا باعث بنے

۱۴۔ دین سے تمسخر اور استہزا کرنے والوں سے الگ ہو جاؤ (۷:۶) اور ان کی مجلسوں میں بھی نہ بیٹھو (۴:۱۴۰)

۱۵۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو (۱۲:۴۹) غیبت کسی کے متعلق اس کی غیر حاضری میں ایسی بات کہنا ہے جو اس کے منہ پر بیان نہ کی جائے۔ یہ بہت ناپسندیدہ بات ہے۔

۱۶۔ حسد کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر جلتے بھنتے رہنے کا نام ہے، یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جو کمتری کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی سے حسد نہ کرو۔ (۵۴:۴)

۱۷۔ ایک دوسرے کے بُرے نام نہ رکھو (۱۱:۴۹)

۱۸۔ حاسد لوگ بڑے نقصان رسان ہوتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچائے رکھو۔ (۱۱۳:۵)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۹۔ غلط افواہوں سے بعض اوقات بڑے سنگین واقعات اور حادثات رونما ہو سکتے ہیں اس لئے حکم یہ ہے کہ جب تک کسی بات کی خود تحقیق نہ کر لو اس کے پیچھے مت لگو (۳۶ : ۱۷)

۲۰۔ دوسروں کو ہر وقت شک کی نگاہ سے دیکھتے رہنا ٹھیک نہیں۔ دوسروں کے متعلق ہمیشہ حسن ظن سے کام لو (۱۲:۲۴-۱۲ : ۴۹)

۲۱۔ جب کسی کے خلاف کوئی بات سنو تو تمہارا ردِعمل یہ ہونا چاہیے کہ نہیں یہ بات غلط ہے یہ اس کے خلاف بہتان ہے۔ پھر اس کی بات تحقیق کرو اور تحقیق کر لینے سے پہلے اس کو آگے نہ پھیلا (۱۲-۱۵-۱۶ : ۲۴) اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ ملزم کو اس وقت تک بے گناہ سمجھا جائے جب تک اس کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے۔

۲۲۔ جب کوئی شخص شر پسند کوئی افواہ پھیلائے تو آگے پھیلانے سے پہلے تم اس کی تحقیق کر لو (۶ : ۴۹) اور اس کی اطلاع ذمہ دار حکام کو کر دو تاکہ وہ اس کی بابت تحقیق کریں (۸۳ : ۴)

۲۳۔ دوسروں کے معاملات میں یونہی ٹوہ نہ لگاتے پھرو (۱۲ : ۴۹)

۲۴۔ برائی کی نشر و اشاعت نہ کی جائے جب تک یہ یقین نہ ہو کہ اس سے مظلوم کی حق رسی ہو گی۔ مظلوم کے سوا اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کے خلاف یونہی بری باتیں کہتا پھرے (۱۴۸ : ۴)

۲۵۔ بغیر اجازت کسی کے گھر نہ جاؤ (۲۷ : ۲۴)

۲۶۔ اگر اس گھر کے اندر کوئی نہ ہو تو گھر کے اندر داخل ہونا منع ہے اور اگر اہل خانہ اجازت نہ دیں تو برا نہ مناؤ واپس آ جاؤ (۲۸ : ۲۴)

۲۷۔ اگر کسی جگہ تمہارا سامان پڑا ہو اور وہاں کوئی رہتا نہ ہو تو اس میں داخل ہونے کیلئے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ (۲۹ : ۲۴)

۲۸۔ اگر محفل میں کہا جائے کہ جگہ کھول دو تو جگہ کھول دو اور جب کہا جائے کہ محفل برخاست ہوئی تو اٹھ کر چلے آؤ (۱۱ : ۵۸)

۲۹۔ مجلس میں ناشائستہ حرکات مت کرو (۲۹ : ۲۹)

۳۰۔ اگر کوئی کھانے پر مدعو کرے تو مقررہ وقت سے پہلے نہ پہنچو، وقت پر پہنچو اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو باتیں کرنے کے لئے مت بیٹھے رہو۔ واپس چلے جاؤ۔ (۳۳:۵۳)

۳۱۔ اگر تمہیں کسی کام کے لئے بلایا جائے تو بلا اجازت وہاں سے نہ چلے آؤ (۶۲ : ۲۴)

۳۲۔ دوسروں کے ہاں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو باہر کھڑے ہو کر آواز دو۔ بلا محابہ اندر نہ گھس جاؤ (۵۳ : ۳۳)

۳۳۔ اوچھوں کی طرح اکڑ کر نہ چلو (۳۷ : ۱۷-۲۵-۱۸ : ۳۱)

۳۴۔ اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو (۶۳ : ۲۵-۱۹ : ۳۱)

۳۵۔ عورتوں کو اپنی رفتار میں حیا کا پہلو مدنظر رکھنا چاہیے۔

۳۶۔ راستہ چلتے وقت دیدے پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر نہ دیکھتے پھرو۔ شریفوں کی طرح اپنی نگاہیں قابو میں رکھو۔ انہیں بے باک نہ ہونے دو۔ مرد بھی ایسا کریں اور عورتیں بھی (۳۰-۳۱ ، ۲۴)

۳۷۔ خیانت نگاہوں کی بھی ہوتی ہے اس سے بچ کر رہو (۱۹ : ۴۰)

۳۸۔ زیب و زینت کی چیزیں حلال ہیں انہیں کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا (۳۲ : ۷)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۳۹۔ لباس ستر پوشی کے ذریعہ بھی ہے اور زینت کا موجب بھی ہے (۷:۲۶)

کھانے پینے میں کیا چیزیں حرام ہیں۔ آیت ۲:۱۷۳ میں دیکھئے۔ حلال چیزوں میں سے وہ کھاؤ جو خوشگوار ہوں (یعنی طبیعت کو اچھی لگیں۔ اور جو صحت کے لئے مفید ہوں (۲:۱۶۸) کھانے پینے میں اسراف مت کرو۔ اعتدال کے ساتھ کھاؤ (۷:۳۱ - ۱۷:۲۶) خواہ مل کر کھاؤ خواہ الگ الگ (۲۴:۶۱)۔ اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کون کون سے گھروں سے بلا تکلف کھا پی لینا چاہیئے۔ خورد و نوش کا تعلق "رزق" سے ہے۔ رزق کی پیداوار (PRODUCTION) اور اس کی تقسیم (DISTRIBUTION) کا مسئلہ موجودہ زمانے میں بہت اہم اور نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ رزق میں وہ ہر چیز شامل ہے جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے یا جو جسمانی اور روحانی نشو و نما میں ممد و مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم نے کھانے پینے کی تمام چیزوں کو رزق اللہ کہا ہے (۲:۶۰) خارجی کائنات کی تمام مخلوق علم، عقل اور اختیار و ارادے سے محروم ہے اس لئے اس کو رب العالمین کی طرف سے رزق اس کی عین ضرورت کے مطابق خود بخود ملتا رہتا ہے۔ لیکن انسان چونکہ ذی شعور اور صاحب اختیار ہستی ہے اور اللہ کی طرف سے اسے کائنات کے سنوارنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم کے عطا کردہ اصول و قوانین کے جو نظام حکومت یہ قائم کرے گا۔ رزق کی تقسیم و پیداوار کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔ یہاں ایک نکتہ قابل غور یہ ہے کہ میثاق الست میں اللہ نے جب یہ پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا نشو و ارتقا دینے والا نہیں ہوں؟ تو انسانی ذات کی گہرائیوں سے جواب آیا: بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ اس پر مطالبہ ہوا کہ بس پھر میری اطاعت کرو، میرے ہی احکام کی متابعت کرو اور میرے ہی قوانین و ضوابط کی تعمیل کرو" اس میثاق سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ حکومت الٰہیہ کا اولین فریضہ وسیع تر معنوں میں ربوبیت عامہ کا انتظام کرنا ہے اس لئے اس فریضے کو پوری طرح ادا کرنے کے بعد اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رعایا سے اطاعت کا مطالبہ کرے۔ یہ اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت شمار ہوگی۔ کیونکہ حکومت الٰہیہ اللہ اور رسول کے ارشادات کی پیروکار ہے اور خلافت علیٰ منہاج النبوت کے شکل ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کے معنوں میں ایک نکتہ یہ بھی شامل ہے۔ "انفاق" پر پیشتر ازیں قرآنی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا جا چکا ہے۔ معاشرے سے تعلق رکھنے والے احکام انفاق یہ ہیں: (۱) حصول رزق کے لئے جد و جہد کرو (۶۲:۱۰) (۲) رزق جائز طریقوں سے حاصل کرو (۲:۱۰۰) (۳) اخراجات میں میانہ روی اختیار کرو (۶:۱۴۱) (۴) نہ اسراف کرو نہ تبذیر کرو اور نہ بخل سے کام لو (۷:۳۱، ۱۷:۲۶، ۲۷، ۲۹ - ۲۵:۶۷)

ہر وہ شخص جو معاشرے میں تنہا رہ جائے، بے آسرا و بے سہارا ہو "یتیم" ہے۔ دُرِّ یتیم اس واحد موتی کو کہتے ہیں جس کا کوئی ثانی نہ ہو۔ لہٰذا تمام وہ افراد جو بے سہارا اور بے یار و مددگار ہیں یتیم کی ذیل میں آتے ہیں۔ صرف وہی نہیں جن کے ماں باپ مر گئے ہوں۔ ان تمام یتامیٰ کے بارے میں حکم ہے کہ ان کی نہ صرف مدد کرو بلکہ ان کی عزت بھی کرو (۸۹:۱۷) انہیں دھتکار دینا بہت بری بات ہے (۹۳:۹) ان کے املاک کی حفاظت کرو (۶:۱۵۲) اسی طرح حاجتمندوں سے ساتھ بھی احسان کرنا ضروری ہے (۲:۸۳) کیونکہ تمہاری دولت میں ان کا "حق" ہے (۵۱:۱۹)۔ احسان کے معنے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہ توازن کو صحیح کر دینا اور کمی کو پورا کر دینا ہے۔ حق بھیک یا خیرات نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مطالبہ کیا جاسکتا تھا۔ جبکہ بھیک طلب

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نہیں جاتی حق مانگنے والا برابر کا سربلند رہتا ہے۔ جبکہ بھیک مانگنے والے کی عزتِ نفس خاک میں مل جاتی ہے جو شخص "سائلین" کا یہ حق ادا نہیں کرتا وہ حقوق العباد میں قابلِ مواخذہ ہے "سائلین" سے بھی مراد پیشہ ور گداگر نہیں بلکہ غیور ضرورت مند ہیں۔ (۲:۲۷۳) کسی کی مدد کر کے اس کے سر پر ممنونیت کا بوجھ نہیں رکھ دینا کہ عمر بھر اس کی گردن جھکی رہے۔ (۲:۲۶۴) بلکہ اس سے تو اچھا ہے کہ انہیں خوبصورت طریقے سے جواب دے دو (۲:۲۶۳)۔ عند الضرورت ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ (۱۷:۲۶) ضرورت مندوں کی امداد کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انہیں قرض دے دیا جائے ربوا از روئے قرآن حرام ہے۔ لہذا قرض بلا سود ہوگا قرض کی واپسی کے لئے جو وعدہ کیا جائے اُسے پورا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر مقروض کی حالت ایسی نہ ہو کہ وہ قرض ادا کر سکے تو اسے مہلت دی جائے (۲:۲۸۰) اور اگر وہ ادائگی کے بالکل قابل نہ رہے تو قرض معاف کر دینا چاہیئے۔ (۲:۲۸۰)

امانتوں کو احتیاط کے ساتھ واپس کر دینا چاہیئے۔ (۲:۱۵۸)

معاملات باہمی مشورے سے طے کرنے چاہئیں (۴۲:۳۸) اس کے لئے بات چیت خفیہ بھی رکھی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ اچھے کاموں کے لئے ہو۔ (۵۸:۹)

اچھی باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔ (۵:۲) باہمی میل جول میں پیار و محبت کی فضا قائم رکھی جائے۔ لوگوں سے ترش روی کے ساتھ پیش نہیں آنا چاہیئے۔ (۳۱:۱۸) سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے۔ کہ دوسروں کو نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح کی بھی فکر کرو (۲:۴۴) جو کہو اس پر خود بھی عمل کرو (۲:۶۱) توحید پر اعتقاد رکھنے کا معنیٰ ہی یہ ہے کہ آپ کے فکر، قول اور عمل میں وحدت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو یہ توحید نہ ہوگی۔ منافقت ہوگی۔ حکم ہے کہ منافقت کبھی نہ برتو (۳:۱۶۶) اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی تم سے اچھی بات کہے تو اسے یہ جواب نہ دو کہ میاں پہلے خود عمل کر کے دکھاؤ پھر مجھ سے بات کرو۔ بلکہ چاہیئے کہ اگر بات اچھی ہے تو تم اس پر عمل کرو، اگر دوسرا عمل نہیں کرتا تو اس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ (۵:۱۰۵) اور آخری بات یہ ہے کہ تم نہ اپنے آپ کو مقدس نہ جتاتے پھرو (۵۳:۳۲)

اَلدِّین جسے اللہ تعالیٰ نے ملتِ حنیفہ کے لئے پسند فرمایا ہے دوسرے مذاہب اور مسالک سے اس لئے مختلف ہے کہ ان طریقوں میں افراد علیحدہ علیحدہ اپنی نجات کی فکر میں رہتے ہیں یعنی ان میں زندگی کا مقصد "فرد" کی نجات ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ خدا سے اپنا ذاتی تعلق قائم کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ دوسرے انسانوں سے دور ہٹتا چلا جائے گا اور اپنے زعم میں وہ خدا سے زیادہ قریب ہوتا چلا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ الشور کے بھگتوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ خانقاہوں اور حجروں میں زندگی بسر کرتے ہیں یا جنگلوں اور غاروں میں چلے جاتے ہیں اور دنیا کے دھندے دنیا داروں کے سپرد کر دیتے ہیں کیونکہ دنیا کی جاذبیتیں ان کے نزدیک قابلِ نفرت اور خدا کے راستے میں رکاوٹ ہوتی ہیں الدین کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ انسانوں کی دنیا میں بہ احسن طریق رہنا سکھاتا ہے۔ اسی لئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی رہنمائی دیتا ہے۔ ویسے یہ باتیں ہرگز چھوٹی نہیں ہیں۔ چونکہ جنت کی شاہراہ جو حزن اور خوف سے پاک زندگی کی طرف جاتی ہے۔ دنیا کی گہما گہمی کے عین وسط میں سے ہو کر جاتی ہے اس لئے انسانوں کے ساتھ روزمرہ کے روابط کو

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

صحیح رکھنے کی بات کبھی چھوٹی نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ دین کا مقصد یہ ہے کہ فطرت کی طاقتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق نوعِ انسان کی فلاح اور بہبود کے لئے استعمال میں لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں مقاصد کے لئے اجتماعی زندگی ضروری ہے خانقاہوں کے کُنجِ تنہائی میں نہ تسخیرِ فطرت کا کام ہو سکتا ہے اور نہ انسانیت کی عالمگیر فلاح کا کوئی پروگرام تکمیل پا سکتا ہے۔ افراد اور ملت کی صلاحیتیں اجتماعی نظام کے اندر رہ کر ہی ابھرتی ہیں افرادِ معاشرے کی "ذات" کی بھی نشوونما ہوتی ہے اور ملت بھی ارتقا اور استحکام کے راستے پر گامزن رہتی ہے اس طرح ایک عجیب کا دائرہ وجود میں آجاتا ہے یعنی کہ ایک طرف افراد اپنی تمام صلاحیتوں کو اجتماعی نظام کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ وہ انہیں تعمیرِ انسانیت کے کاموں میں صرف کرے۔ اور اس کے عوض میں دوسری طرف سے اجتماعی نظام ایسے انتظامات کرتا ہے جن سے ہر فرد کی صلاحیتیں بھرپور نشوونما پاتی چلی جاتی ہیں اس اعتبار سے اسلام میں نہ تو "فرد بلا جماعت" کا کوئی تصور ہے۔ اور نہ "جماعت" کا وجود مقصود بالذات ہے۔ قرآن حکیم تصور ہی اجتماعی زندگی کا دیتا ہے۔ اس کا خطاب اس کی آرزوئیں اس کے پروگرام سب اجتماعی ہیں۔ حتےٰ کہ مومنین کی دعائیں بھی انفرادی نہیں ہیں۔ جماعت کا مقصد فرد کی نشوونما ہے یعنی اس کی طبعی زندگی کی پرورش بھی اور اس کی انسانی ذات کی تکمیل بھی۔

دنیا میں نظامِ مملکت کا تصور جو اس وقت پایا جاتا ہے وہ قرآنی نظام کے مقابلے میں بہت محدود ہے ایسی تصور میں نگاہ صرف سیاسی امور پہ لگی رہتی ہے اور سیاست کے جوڑ توڑ کے چکروں میں فرد اور قوم دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآنی نظامِ اجتماعی جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے چنانچہ اَلدِّین کی بنیادی خشتِ اول ہی یہ ہے کہ

"تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور علیحدہ علیحدہ نہ ہو جاؤ" (۳ : ۱۰۲) جماعتِ مسلمین کے اندر مزید پارٹیاں نہ بنانا، جماعتیں قائم کرنا، خواہ یہ سیاسی ہوں یا کسی اور مقصد کے تحت شرک ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا بس یہ ہے ہمارا رشتہ اسلامی معاشرے کے ساتھ! اس معاشرے کے ساتھ جسے ملتِ ابراہیم حنیفاً کہا گیا ہے اور جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ یعنی مرکزِ انسانیت کی علامت کی تعمیر کے دوران اللہ سے دعا مانگی تھی (۲:۱۲۸)۔ وہ بین الاقوامی امت (امتِ وسطا) جسے اقوامِ عالم کے اعمال کا نگران بنتا ہے۔ اور جس کے اپنے اعمال کی نگرانی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمائیں (۲:۱۴۲-۱۴۳)۔ وہ بہترین اُمت جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے (۳:۱۱۰) وہ اُمت جو حق کے ساتھ ہدایت کرتی ہے (۷:۱۸۱)

یہ وہ اُمت ہے جس کا نظام ان احکام پر استوار ہوتا ہے (۷:۱۸۱)

۱۔ مومن اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور اللہ اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے۔ (۲:۲۰۷-۲۰۸ - ۹:۱۱۱)

۲۔ انسانی مملکت کے کسی قانون سے سرکشی برتنا خدا اور رسول سے خلاف جنگ ہے۔ (۲:۲۷۹)

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یہ بغاوت ہے جو نہایت سنگین جرم ہے اور شدید ترین سزا کا مستوجب (۵:۳۳)

۳۔ اے جماعتِ مومنین! خود جم کر رہو، دوسروں کی استقامت کے موجب بنو، باہمی روابط مضبوطی سے قائم رکھو اور اس طرح قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو (۳:۱۹۹)

۴۔ اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو۔ اس سے تمہیں "زندگی" ملے گی۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو فتنہ آ جائے گا، جو صرف ظالمین تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ ساری قوم اس کی لپیٹ میں آ جائے گی (۸:۲۴،۲۵)

۵۔ اللہ اور رسول (نظامِ الٰہیہ) سے خیانت نہ کرو، نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو (۸:۲۷،۲۸)

۶۔ اللہ نے مومنین کے دلوں میں الفت ڈال دی ہے۔ یہ متاع دنیا بھر کی دولت صرف کرنے سے بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ (۸:۶۳ - ۳:۱۰۲)

۷۔ تم سب حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ تفرقہ پیدا نہ کرو۔ یہ اللہ کی نعمت ہے کہ اس نے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا ہے، ورنہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اور آگ کے غار کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ سو اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی (۳:۱۰۲، ۴:۱۴۶)

۸۔ باہمی تنازعات مت پیدا کرو، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (۸:۴۶)

۹۔ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور صادقین کے ساتھ رہو۔ (۹:۱۱۹)

۱۰۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر رکوع کرو۔ (۲:۴۳)

۱۱۔ (اے رسول) ان سے کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ اسی کا اتباع کرو۔ اگر تم نے مختلف راستے اختیار کئے تو یہ تمہیں میری راہ سے دور کر دیں گے (۶:۱۵۳)

القرآن جیسے مکمل ضابطۂ زندگی کا ثبوت اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے اس میں رہنمائی موجود ہے اور رہنمائی بھی ایسی جو آسان بھی ہے اور قابلِ عمل بھی ہے۔ معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے والے چند ایک اوامر و نواہی کی فہرستیں جو ہم نے دی ہیں انہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اسلام فرد اور ملت کو ایک دوسرے کے لئے جوہر و آئینہ سمجھتا ہے۔ "فرد" کتنا ہی غیر معمولی طور پر ذہین اور فطین کیوں نہ ہو بغیر ملت کے کچھ بھی نہیں اسی طرح ملت وہی توانا اور مضبوط کہلا سکتی ہے جس کے افراد سیرت و کردار کے اعتبار سے اعلیٰ قدروں کو تحفظ دینے والے ہوں۔ مملکت کا سیاسی نظام ہو، معاشی اور معاشرتی نظام ہو یا انتظامی طریق کار ہو۔ ان تمام کا اقتدارِ اعلیٰ چونکہ افراد کی بجائے اللہ کے ہاتھ میں رہتا ہے اور ہر حکم اللہ اور رسول کے احکام کی متابعت میں صادر ہوتا ہے اسی لئے ذاتیات سے بالاتر معاشرہ ہر زاویے سے صاف ستھرا اور ارتقا کی طرف بڑھتے رہنے والا بن جاتا ہے۔ امن و سلامتی کا ضامن اس سے بہتر کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۶۔ حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

نزولِ قرآن حکیم سے پہلے کئی صدیوں تک فلسفہ اور مذہب دونوں خیر و شر کی کشمکش اور حق و باطل کی آویزش کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن انسانی عقل جس طرح دوسرے مسائل کو صرف جزواً حل کر سکی ہے اسی طرح یہ مسئلہ بھی اس سے پوری طرح حل نہیں ہو سکا۔ اس طویل عرصے میں انسانی سوچ نے جو مختلف رُخ اختیار کئے ہیں اور "شر" سے محفوظ رہنے کے جو علاج تجویز کئے ہیں ان کا مختصر سا تاریخی جائزہ کچھ اس طرح لیا جا سکتا ہے:

مگدھ دیش کا مشہور شہزادہ گوتم اگرچہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت کیلئے اعلیٰ انتظامات کئے گئے تھے تاہم یہ اتنا حساس اور رقیق القلب تھا کہ مخلوقِ خدا پر ہونے والے مظالم اور انسانوں کے مصائب و آلام کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سالہا سال تک اُس نے افلاس، بیماری، موت اور معاشرتی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والے درد اور کرب کے صدمات پر تنہائیوں میں بیٹھ کر غور و فکر کیا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانی دنیا "دکھ درد" سے بھری ہوئی ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے "خیر باد" کہہ دیا جائے اور زندگی کی دلچسپیوں سے اپنے آپ کو الگ رکھا جائے کیونکہ دنیاوی دلچسپیوں سے خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور خواہشات سے رنج و الم جنم لیتے ہیں۔ اس نے جذبات اور خواہشات سے "خالی" اور آزاد ہو جانے کی حالت کو "نروان" کا نام دیا۔ فراریت کا یہ فلسفہ جو زندگی کی "نفی" کرتا ہے اور سلبی طریقِ علاج تجویز کرتا ہے بہت مقبول ہوا اور اس نے دنیا کے دوسرے مذاہب اور مکاتبِ فکر کو بھی متاثر کیا۔

اس مذہب کے پہلو بہ پہلو اور انہی خیالات کی ہمنوائی میں ایک اور مذہب نے یہ کہا کہ انسانی رُوح جو کسی طرح اپنی اصل یعنی خدائی رُوح یا پرم آتما سے الگ ہو کر دنیا کی دلدل میں پھنس گئی ہے اور اب اس جدائی کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی اصل سے دوبارہ مل جانے کی آرزو میں تڑپ رہی ہے۔ یہ مادی دُنیا میں اسی جدائی کی وجہ سے ناخوش رہتی ہے، مصیبتوں میں گھری رہتی ہے اور تنہائی کے شدید احساس میں مبتلا رہتی ہے اس کے دوبارہ اپنی اصل سے مل جانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ مادی دُنیا سے دُور رہے، اس کی پُرکشش لذتوں سے کنارہ کش رہے اور ویدوں نے جو سخت جسمانی اذیتیں تجویز کر رکھی ہیں۔ ان میں سے گزر کر دنیا کی آلائشوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے۔

یہ دونوں مذاہب جن کے پیروکار ایک خاصی بڑی تعداد میں اب بھی موجود ہیں اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ "وجود" بذاتہٖ "شر" ہے اور اس شر سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اسے فنا کر دیا جائے۔ وجود کو فنا اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ جسم اور رُوح دونوں کو اذیت ناک آزمائشوں سے گزارا جائے تاکہ یہ حُسنِ دنیا کی طرف مائل نہ ہوں۔ اس فلسفے کو یوگا، جوگ،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ترکِ دُنیا (MYSTICISM) اور تصوّف کہتے ہیں۔ اس ویدانتی تصوّف نے بھی مذاہبِ عالم کو متاثر کیا ہے بلند سطح کے مذاہب بھی اس کے متصوفانہ عناصر سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ انسان مایوس اس وقت ہوتا ہے، جب اس کے خود ساختہ معاشرتی نظام عدل مُساوات پیدا کر کے اس کا استحصال کرتے ہیں اور اسے اپنی محنت کا بھی ثمر نہیں ملتا۔ معاشرتی عدم توازن چھینا جھپٹی کے رویئے اور غیر منصفانہ تقسیم مراعات اسے فراریت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ چنانچہ شکست خوردگی کا احساس نااُمیدی اور بے بسی کا فطری نتیجہ بن کر سامنے آجاتا ہے اور پھر یاسیت اُس وقت خاص طور پر زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتی ہے جب انسان اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا آپ منکر ہو جاتا ہے اور یہ باور کرنے لگ جاتا ہے کہ وہ مُعاند عناصر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے اور وہ اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس اعتبار سے یاسیت "اپنے آپ سے انکار" کا دوسرا نام ہے۔

ویدانتی فلسفیوں کے سامنے یہ سوال بھی غور و فکر کا موضوع بنا رہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا میں بعض لوگ تو آسودگی بلکہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں اور بعض عمر بھر افلاس اور تنگدستی میں ایڑیاں رگڑتے رہتے ہیں۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جو لوگ دنیا میں آسودہ حال دکھائی دیتے ہیں انہوں نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے تھے اور اب یہ پچھلے جنم کے اعمالِ حسنہ کے صلے میں عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی طرح جو مفلوک الحال ہیں وہ اپنے سابقہ جنم میں کئے گئے بد اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اس عقیدے کو کرم بھوگ کہتے ہیں۔ بار بار جنم لیتے رہنے کے عمل کا نام "آواگون" ہے۔ انسانی روح کئی کئی جون (قلب یا جسم) بدلتی رہتی ہے۔ اگر انسان کا کردار اس جنم میں مکر، فریب، چالاکی لالچ، طیش، وحشت، ظلم یا بے حسی وغیرہ میں نمایاں رہا ہے تو وہ آئندہ جنم میں اپنی صفات کے مطابق بندر، ریچھ، لومڑی چیتا، شیر، سانپ یا بھیڑ بکری وغیرہ کا جسم لے کر پیدا ہوگا۔ اور جسموں کے بدلتے رہنے کا عمل بیشمار جنموں تک جاری رہے گا۔ اگر کسی نے اچھے کام کئے ہیں تو اس کو بہت بڑا انعام یہ مل سکتا ہے کہ اسے بار بار کی پیدائشوں سے "نجات" مل جائے۔ اس نجات کو مکتی کہتے ہیں۔ یعنی جنموں کے دَور کا ٹک جانا یا ختم ہو جانا۔ ان کے ہاں یہی انسانی زندگی کا مقصود و مطلوب ہے!

تناسخ ارواح کا یہ خیال، جسے قدیم یونانی فلسفیوں سے مستعار لیا گیا ہے، وقت کی آزمائش پر پورا نہیں اتر سکا۔ اس کے برعکس قرآنی نظریہ یہ ہے کہ انسان کے اپنے اندر ہر وقت یہ امکان موجود رہتا ہے کہ وہ چاہے تو انسانی سطح کی بالاتر زندگی کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو اپنے اس اعلیٰ مقام سے گر کر نچلی حیوانی سطح پر آجائے۔ تمثیلی انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس لمحے وہ گر کر حیوانیت کی سطح پہ آجاتا ہے تو اسکی انسانیت کی سطح پر موت واقع ہو چکی ہوتی ہے اور جس لمحے وہ حیوانیت سے بلند ہو کر انسانی سطح پہ عود کر آتا ہے تو گویا یہ اس کا نیا جنم ہوتا ہے۔ اس طرح دنیاوی زندگی کے قدم قدم پہ وہ متعدد اموات اور متعدد حیات تازہ کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنی "انسانی ذات" کو مستحکم بنالے اور اسے حیوانی جذبات کے غلبے سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو اُسے "موت" پہ پورا قابو حاصل ہو جائے گا اور جسم کے مر جانے کے بعد بھی وہ زندہ رہ سکے گا۔ یہ حیات بعد از ممات اعلیٰ تر سطح کی زندگی ہوگی۔ اور اس کی رُوح کو مزید ارتقائی منازل کی طرف لے جائے گی۔ انسان کا جسم، یعنی اس کی مادیّت اسے حیوانی جذبات اور خواہشات کی طرف مائل کرتی ہے جبکہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس کی رُوح اعلیٰ مدارجِ حیات کی طرف بے جانے کا عزم رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے "انسانیت" کا راستہ اختیار کرنا اور حیوانی زندگی کے راستے کو ترک کرنا دراصل ایک پُرخار وادی میں قدم رکھنے کی مانند ہے، جو بڑی ہمت کا کام ہے تاہم انسان کو علم اور عقل کی جو اعلیٰ قوتیں عطا کی گئی ہیں اگر انہیں ہدایتِ ربانی کے تابع فرمان کر دیا جائے تو حیوانیت کا راستہ چھوڑ کر انسانیت کی راہ پر گامزن ہو جانا مشکل نہیں رہتا۔ اس کے لئے پہلی شرط ایمانِ کامل ہے۔ یعنی اس بات پر پورا یقین رکھنا کہ ہدایت ربانی ہر لحاظ سے صحیح اور مکمل ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی رہنمائی ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ دوسری شرط بے چون و چرا اطاعت اور استعانت یعنی صبر و صلوٰۃ ہے۔ دُنیاوی زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی دی ہوئی رہنمائی کو ملحوظ رکھنا اور اس کے سوا کسی بھی قوت کی متابعت نہ کرنا۔ وادیٔ پُرخار سے دامن بچا کر گزر جانے اور منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کو تقویٰ کہتے ہیں۔

خدا کی رُوحِ کل سے انسانی رُوح کے جزو کا الگ ہو جانے کا ویدانتی فلسفہ، جس کی جھلک مولانا روم کی مثنوی کے پہلے ہی شعر میں دیکھی جا سکتی ہے، ہمہ اوست یا وحدت الوجود کے مکاتبِ فکر کی بنیاد ہے۔ یہ فلسفہ انسان کو تصوّف کی اُن راہوں کی طرف لے جاتا ہے جو دنیاوی زندگی کی مقصدیت کی نفی کرتی ہیں۔ اور ترکِ علائق یا رہبانیت کو منزل قرار دیتی ہیں۔

بعض مفکرین نے جب یہ محسوس کیا کہ ظلم، استحصال، چوری، دھوکا فریب، ناانصافی، عدم مساوات، غارتگری وغیرہ پُرخلوص سعی و کوشش کے باوجود ختم نہیں ہو رہیں تو انہوں نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ انسان کی فطرت ہی بُری ہے۔ اس مفروضے کو اور بھی تقویت مل گئی جب عیسائیت کو منظم اور مدوّن کرنے والوں نے یہ کہہ دیا کہ ہر انسانی بچہ اپنے ابتدائی والدین کے اولین گناہ سے آلودہ ہو کر پیدا ہوتا ہے اور پیدائش سے لے کر موت تک کے عرصۂ حیات کے دوران جتنی بھی اخلاقی لغزشیں اس سے سرزد ہوتی ہیں وہ سب اسی آلودگی کی وجہ سے ہیں۔ انسان کا اس آلودگی سے پاک صاف ہونے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ راہبوں کی سی ضبطِ نفس کی کڑی مشقتوں میں زندگی بسر کرے اور گناہوں کی تلافی (ATONEMENT) (توبہ بجدِّ اعترافِ گناہ) کے ذریعے کرتا رہے۔

ایرانی اہلِ فکر و دانش نے ایک اور نظریہ پیش کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ فطرت کے اندر ہر جگہ دو مستقل اور باہم متحارب قوتیں کارفرما ہیں ایک تاریکی یعنی شر کی قوت ہے اور دوسری روشنی یعنی خیر کی قوت ہے (اہرمن اور یزدان)۔ خیر و شر کی کشمکش ان دو خداؤں کی باہمی آویزش کا نتیجہ ہے۔ ثنویت کے اس فلسفے کو مجوسیوں نے جنہیں زرتشت کا پیرو کار سمجھا جاتا ہے بحیثیت مذہب قبول کر لیا۔ آج کے دَور میں اسے جرمن فلسفی ہیگل نے "آویزشِ اضداد" کا نام دے کر آگے بڑھایا ہے۔ کارل مارکس نے اس کا اطلاق معیشت و اقتصادیات پر کر کے اشتراکیت کے نام سے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے۔ چونکہ اس جدید ترین جدلیاتی فلسفے (DIALECTICISM) کا تعلق براہِ راست خیر و شر یا حق و باطل کی معنویت سے ہے اس لئے یہاں اس کی تھوڑی سی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ "حق" عربی زبان کا ایک بڑا جامع لفظ ہے۔ اس کا ایک لفظ میں ترجمہ دُنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے معنے ہیں اس طرح موجود، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اس کے موجود، واقع اور ثابت ہو جانے سے انکار نہ کیا جا سکے۔ صحت، ثبات اور استحکام "حق" کے مفہوم کے بنیادی عناصر ہیں۔ چونکہ کوئی شئے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ٹھوس حقیقت بن کر صرف اسی وقت سامنے آسکتی ہے جب اس کی نشوونما تعمیری ہو، اس لئے اعمال کے محکم اور تعمیری نتائج کو بھی حق کہتے ہیں جو قائم اور برقرار رہتے ہیں، مٹ نہیں سکتے۔ قائم اور برقرار صرف وہی چیز رہتی ہے جو قانونِ حفظ و بقا کے مطابق ہو، یعنی اپنی اصلیت کو بھی نہ چھوڑے اور زمانے کے تقاضوں کا بھی ساتھ دے سکے۔ دوسرے لفظوں میں جو چیز علم و عقل، عدل و انصاف، واقعات و مصالح اور حکمت و دانائی کے مطابق ہو وہ حق ہے۔ باطل حق کی ضد ہے۔ لہٰذا جو چیز محض ذہنی، قیاسی، ظنی یا موہوم صورت میں رہے وہ باطل ہے۔ جس نظریے کے نتائج تخریبی ہوں یعنی جو عظمتِ انسانی کو پامال کر ڈالیں وہ باطل ہیں، اسی طرح جو نظریہ علم و عقل، عدل و انصاف اور حکمت کے اصولوں پر پورا نہ اترے یا جو ہر آن بدلنے والا ہو، وہ بھی باطل ہیں، انسانوں کے خود ساختہ معیارات اور تنہا عقل کے تراشیدہ قدریں اسی لئے از روئے قرآن باطل ہیں کہ یہ ہر دور میں بدلتی رہتی ہیں۔ اور ان میں ثبات و استحکام نہیں ہوتا۔

جرمن مفکر نے جو جدلیاتی نظریہ پیش کیا تھا وہ یہ ہے کہ ایک تصوّر سامنے آتا ہے، وہ بڑھتا اور پھلتا پھولتا ہے۔ جب وہ اپنے عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اسی تصوّر میں سے ایک اور تصوّر ابھرتا ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ اس کے پیدا ہونے سے پہلا تصور مٹ جاتا ہے اور دوسرا تصور بڑھنا اور پھلنا پھولنا شروع کر دیتا ہے۔ تاہم جب یہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس میں سے ایک اور تصور برآمد ہوتا ہے جو ان دونوں تصورات کی خصوصیات کا حامل لیکن ان کا ضد ہوتا ہے۔ پھر وہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوتا ہے جو پہلے تصورات کے ساتھ ہوا تھا اور اس طرح دنیا میں تصورات کی کشمکش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ چونکہ کسی نظریے کو استحکام نہیں ملتا اس لئے تغیر کی عملداری ختم نہیں ہوتی۔ کارل مارکس نے اس فلسفے کو اپنا لیا اور کہا کہ جدل اور کشمکش تصورات میں نہیں بلکہ نظامِ معیشت میں واقع ہوتی ہے اور انسان کی ساری تاریخ اسی گردشِ دولابی کا نام ہے۔

ہیگل کا اصل فلسفہ ہو یا کارل مارکس کا یہ ترمیم شدہ نظریہ، دونوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظریہ، کوئی تصوّر اور کوئی نظام اٹل نہیں ہے۔ قرآن حکیم اس کی سختی سے تردید کرکے کہتا ہے کہ اللہ نے جو اصولِ زندگی اور قوانین دیئے ہیں وہ اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ ان کے مقابلے میں انسانوں کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط ناپائیدار اور تغیر پذیر ہوتے ہیں کیونکہ ان میں انسانوں کی مفاد پرستیاں شامل ہوتی ہیں۔ عقلِ مفاد پرست عالمگیر سطح پر سوچ سکتی ہی نہیں، پوری انسانیت کے لئے ایک ہی فلاحی نظام کیسے وضع کر سکتی ہے۔ لہٰذا عقلی اصولوں پر وضع کردہ تمام نظامہائے زندگی باطل ہیں۔ عقل کو صحیح سمت پر ڈالنے والی وحیٔ ربانی کا قائم کردہ نظام حق ہے انسانوں کی مفاد پرستیاں اس برحق نظام کے مقابلے میں نئے نئے تصورات پیدا کرتی رہتی ہے۔ ان میں تصادم ہوتا ہے لیکن کامیابی ہمیشہ حق کے تصور کو حاصل رہتی ہے۔ عقلی تصورات روپ بدل بدل کر بار بار متصادم ہوتے رہتے ہیں لیکن ہر دفعہ انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اٹھا کر دیکھیے ملوکیت، سرمایہ داری اور پیشوائیت نے کتنے سوانگ بھرے ہیں اور حق سے ٹکر لی ہے۔ لیکن ہر تصادم کے بعد انسانی معاشرے میں حق پر مبنی تصورات غالب چلے آتے ہیں کیونکہ ان تصورات کا مقصد پوری نوعِ انسانی فلاح و بہبود ہوتی ہے اور یہی قانونِ حفظ و بقا ہے۔

مَا یَنفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ جو چیز لوگوں کی فائدے کے لئے ہے وہی زمین میں باقی رہتی ہے (۱۳:۱۷) ہر وہ چیز جو

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حفظ و بقا کے اس قانون کے خلاف ہے، باطل ہے۔ اللہ نے کائنات کے سلسلے کو یونہی عبث یا کھیل تماشا بنا کر تخلیق نہیں کیا۔ کہ یہ دائماً تغیرات کے چکر اور جدلیات کی گردش میں پھنسی رہے بلکہ اسے بامقصد پیدا کیا ہے اور مقصد پوری انسانیت کو بقا اور ارتقاء عطا کرتا ہے۔

اضداد کے جدلیاتی عمل کی نفی کرتے ہوئے ایک خیال یہ بھی پیش کیا جاتا رہا ہے کہ "خیر" اور "شر" محض اضافی اصطلاحات ہیں، جیسے ہمارے "دائیں" "بائیں" یا "اونچا نیچا" کے الفاظ ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہاں سے انسانی سوچ پھر قدیم زمانے کے "سب اچھا" اور "سب بُرا" ماننے والے نظریات کی طرف راجع ہو گئی۔ شوپن ہائر نے دنیا کو سراسر "شر" قرار دے دیا اور کہا کہ اس میں "خیر" کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس کی قنوطیت دراصل بازگشت تھی بدھ مت کی جس نے جذبات اور خواہشات کو کچل دینے اور اپنے وجود کو اذیتیں دینے کا پرچار کیا تھا۔ تاہم ان تمام انتہا پسندانہ نظریات کے ردِ عمل کے طور پر اب جدید ترین سوچ پھر اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کی طرف مائل ہو رہی ہے کہ خیر اور شر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اشیائے کائنات انسانی زندگی کے مختلف مواقع کے لحاظ سے ہمارے سامنے اچھائی یا برائی کا لبادہ اوڑھ کر پیش ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی طوفانِ باد و باراں ایسے مقام پر درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے جہاں کوئی انسانی آبادی نہیں ہے تو اسے ہم نہ اچھا کہیں گے نہ بُرا کہیں گے۔ یہی طوفان اگر انسانی بود و باش میں تباہی مچا دے تو اسے ہم یقیناً بُرا کہیں گے اسی طرح بارش رحمت اور نعمت ہے اگر اس جگہ برسے جہاں اس کی ضرورت ہے اور قہرِ الٰہی ہے اگر اس جگہ برسے جہاں اس ضرورت نہیں ہے۔ پس مخصوص موقع محل کے مطابق ایک چیز جو انسانی زندگی کے لئے مفید یا ضرر رساں ہے اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی ہو سکتی ہے۔ ہماری خارجی دنیا کی تمام چیزیں ہمارے استعمال کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان کے استعمال کی صورت ہم خود متعین کرتے ہیں۔ یہ چیزیں اپنے لئے متعین نہیں کرتیں۔ لہٰذا ان کے اچھا یا بُرا ہونے کا دار و مدار ان کے استعمال پر ہے ان کی "فطرت" پر نہیں ہے۔

جہاں تک انسانی زندگی کے مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کا تعلق ہے خیر و شر کے مسئلے کا حل چنداں مشکل نہیں ہے، ہر وہ چیز جو کسی مادی ضرورت کو پورا کرتی ہے یا انسان کی جسمانی زندگی کو آرام و آسائش مہیا کرتی ہے اچھی ہے۔ اور ہر وہ چیز جو طبعی خواہشات کی تکمیل اور جسمانی آسودگی کی راہ میں حائل ہوتی ہے بُری ہے۔ مادی نظریۂ حیات میں ان ذرائع اور وسائل کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی جن سے طبعی آسودگیاں حاصل کی جاتی ہیں کیونکہ اس میں زیادہ ضروری چیز تکمیل مقصد ہے خواہ یہ کسی بھی ذریعے سے ہو۔ لیکن جس معاشرے میں انسانی اقدار کو حیوانیت پر ترجیح دی جاتی ہے اس میں پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ذرائع تکمیل صحیح اور جائز ہوں تاکہ روحانی ارتقا کو جسمانی پرورش پر مقدم رکھا جا سکے۔ لہٰذا یہاں خیر و شر کا مسئلہ زیادہ اہم بن جاتا ہے۔

جن مذاہب اور مکاتبِ فکر کا حوالہ گزشتہ سطور میں دیا گیا ہے اُن میں شر سے چھٹکارا حاصل کرنے کو مقصودِ حیات بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نجات کا یہ سلبی اور منفی پہلو ہے۔ اسلام ہر مسئلے کو ایجابی انداز سے حل کرتا ہے اور ہمیشہ مثبت اور تعمیری پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی نئی قدر کا حصول زیادہ اہم ہے۔ چنانچہ زندگی کے ہر قدم پر اس کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تعلیم یہی ہوتی ہے کہ نئی اقدار کو مشہود بنا کر اور تجربات کی بلند تر سطحوں سے گزر کر "انسانی ذات" کو مستقبل کی حیات تازہ کے لئے تیار کیا جائے کیونکہ ماضی کی ناکامیوں پر تاسف کرتے رہنا اور اس طرح عمل سے بیگانگی اختیار کر لینا عبث ہے۔ انسان اس دنیا میں فردوس گم گشتہ کے غم میں آنسو بہانے کے لئے نہیں آیا بلکہ اسے یہاں اپنی جنت آپ تیار کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے۔ ایک ایسی جنت جس میں انسان کی تمام صلاحیتوں کو ابھرنے، نشوونما پانے اور تکمیل تک پہنچنے کا موقع مل سکے۔ لہٰذا اسے یہ خود دیکھنا اور دریافت کرنا ہوگا کہ اس کے سامنے امکانات کے کون کون سے میدان کھلے ہیں۔ اور وہ ان میں سے کن کو بہتر اور تعمیری نتائج برآمد کرنے کے لئے منتخب کر سکتا ہے تاکہ اسے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور موت کے بعد کی اعلیٰ تر سطح کی زندگی کی نعمتیں بھی مل جائیں۔ لہٰذا انسان اپنے آپ کو شکست خوردگی یا میت سے بچانا ہوگا اور اپنے جسم اور روح دونوں کو تباہ کن اذیتوں سے محفوظ رکھنا ہوگا۔ قرآن حکیم نے نجات کا جو تصور دیا ہے وہ مصائب و آلام کی نفی نہیں کرتا نہ ہی "شر" سے مذکورہ معنوں میں چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے ممکنہ صلاحیتوں کی تکمیل مراد ہے تاکہ اقدار اعلیٰ کے حصول سے "انسانی ذات" میں وسعتیں پیدا ہوں۔ انسان کے اندر جو قابل حصول امکانات رکھ دیئے گئے ہیں انہیں نشوونما دینے سے ہی انسان قد آور شخصیت بن سکتا ہے! اور اس شرف و عظمت کا حقدار قرار پا سکتا ہے جو اسے باقی تمام مخلوقات سے ممتاز و نمایاں بناتی ہے اور جو اس کے لئے آئندہ کی بلند تر سطح کی زندگی کے دروازے کھول دیتی ہے۔

"کامیاب ہوا وہ جس نے اپنی "انسانی ذات" کو نشوونما دی اور ناکام و نامراد ہوا وہ جس نے اسے مٹی میں دبا کر ابھرنے نہ دیا" (۹۱ : ۹-۱۰)

گذشتہ ابواب میں "ارتقاء" سے متعلق قرآن حکیم کی وضاحتیں جستہ جستہ پیش کی جاتی رہی ہیں۔ یہاں مختصراً قانون ارتقا کے قرآنی نقطۂ نظر کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے تاکہ خیر اور شر کی بات اور زیادہ نکھر کر سامنے آ جائے۔ از روئے قرآن جو چیزیں "زندگی" کی پست سطح پر ہیں وہ فطری قوانین کے عمل کی رو سے ارتقا پاتی ہیں۔ فطرت کو اشیا کی انفرادی بہتری میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ یہ نوع کی تکمیل چاہتی ہے۔ اگر "نوع" کی بہتری کے مفاد میں کسی انفرادی شے کو قربان کرنا ضروری ہو تو فطرت اس سے بھی گریز نہیں کرتی۔ لیکن انسانی سطح پر فطرت کا یہ قانون بدل جاتا ہے کیونکہ یہاں "فردیت" کو ابھرنا ہوتا ہے۔ انسان اور نچلے طبقات کی مخلوقات میں فرق یہ ہے کہ تمام دوسری مخلوقات کے برعکس انسان کو اختیار اور ارادے کی آزادی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ انسان قوانین ارتقا کا علم بھی حاصل کر سکتا ہے، اور اس کے پاس ایسی ذہنی اور عقلی قوتیں ہیں جو نہ صرف فطرت کی قائم مقام بن سکتی ہیں بلکہ فطرت کو پیچھے ہٹ جانا پڑتا ہے تاکہ اس باشعور ہستی کو اپنی نشوونما اور عمل ارتقا میں آپ حصہ لینے اور اسے شعوری طور پر آگے بڑھانے کا بھرپور موقع مل سکے اور اس کی آزادی میں فرق نہ آنے پائے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسانی ارتقا کے سلسلے میں خود "ارتقا" کی منزل بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ حیوانی سطح تک کی نچلی مخلوق کے ارتقا کا مقصد "ماحول سے مطابقت" پیدا کر لینا تھا۔ اب انسانی سطح پر مقصد ایک آزاد اور خود مختار

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

شخصیت کو اُبھرنا ہوتا ہے جو زندگی کی لا متناہی سطحوں کی طرف درجہ بدرجہ بلند ہوتی ہوئی آگے اور مزید آگے بڑھتی چلی جاسے۔ پہلے فطرت اپنی "اشیاء" کا سارا کام آپ کرتی تھی۔ اب انسان کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت آپ دریافت کرنی پڑتی ہے۔ اور اس سمت کی طرف بغیر کسی خارجی مدد کے آپ ہی رواں دواں رہنا پڑتا ہے۔ سمت کے انتخاب میں اب فطرت کی بجائے اس کی اپنی عقل مددگار رہتی ہے۔ اور فیصلہ کرتی ہے۔ تاہم بہت جلد انسان محسوس کر لیتا ہے کہ عقل کی روشنی مستقل نہیں ہے بلکہ یہ تو ہر وقت جھلماتی رہتی ہے اور وہ جھلماتی رہنے والی روشنی کی رہنمائی پر کلیتہً اعتماد نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں عقل صحیح نتیجے پر صرف اس صورت میں پہنچتی ہے جب اس کے سامنے حقائق کی تفصیلات مکمل اور بالکل ٹھیک رکھی جائیں۔ جہاں تک مادی دُنیا کا تعلق ہے انسان نے اب بہت علم حاصل کر لیا ہے اور عقل کے سامنے کوائف تقریباً مکمل اور ٹھیک رکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اپنی "انسانی ذات" کے بارے میں اس کی معلومات ابھی تک ناکافی ہیں۔ اور یہ ہمیشہ ناکافی ہی رہیں گی کیونکہ یہ اوزان و مقادیر کی پیمائش اور تجزیاتی طریقوں سے بالاتر ہے اور عقل کے پاس کسی چیز کے سمجھنے یا جاننے کے صرف یہی پیمانے ہیں۔ "انسانی ذات" اپنی حقیقت کو صرف انائے مطلق کی صفات لامحدود کی کسوٹی پر پرکھ کر جان سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

انائے مطلق کی صفات لامحدود ایسی ابدی صداقتیں اور مستقل قدریں ہیں جو عقل انسانی سے بلند تر مقام رکھتی ہیں۔ اس لئے عقل کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی رہنمائی کے لئے اپنے سے بالاتر وجودِ مطلق کے معیارات کو سامنے رکھے خواہ یہ اس بالاتر وجود کی ماہیت کو سمجھ سکے یا نہ سمجھ سکے۔

آخری بات یہ ہے کہ "انسانی ذات" کے ارتقا کی آخری منزل کا متعین کرنا بھی عقل کے بس کا روگ نہیں ہے البتہ عقل اتنا ضرور جانتی ہے کہ ارتقا کی یہ منزل قابل رسائی ہے بشرطیکہ دنیاوی زندگی مستقل قدر کے تحفظ میں گزرے۔

ہدایت ربانی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ "زندگی" صرف جسمانی پیکر کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اس سے بالاتر چیز ہے۔ خود جسمانی پیکر بھی اس کا ایک مقصد پورا کر رہا ہے اگرچہ خود اسے اپنے اس مقصد کا علم نہیں ہے یہ مقصد طبعی دُنیا کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا رہتا ہے اور اس اضافوں کی بدولت نت نئی صورتیں اور خاصیتیں سامنے آتی رہتی ہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ

ماّدی دُنیا مثبت ہے، تعمیری ہے، ارتقا بدوش ہے
اس لئے سراپا "خیر" ہے

(۲)

اب تک ہم نے ماّدی دُنیا کی مقصدیت کی بات کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ماّدی دنیا کو "شر" سمجھنے والے مذاہب اور مکاتب فکر غلطی پر ہیں کیونکہ کائنات کے ذرّے ذرّے سے ارتقا بدوش قوانین کی فرماں روائی ظاہر ہوتی ہے اور اس کی مثبت اور تعمیری روش اسے ہر طرح سے "خیر" ثابت کرتی ہے۔ اب انسانی زندگی کے مقاصد کا

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جائزہ لیتے ہیں۔ انسان کے سامنے جو مقصد ہے وہ ممکنہ صلاحیتوں کی نشوونما اور تکمیل، اپنے امکانات کا حصول، اور اپنی "انسانی ذات" کو بحد بشریت، الوہیاتی صفات کے ہم رنگ بنا دینا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اسے اپنی شخصیت کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے صحیح راستے کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اور پھر اس راستے پر قائم اور رواں دواں رہنے کے لئے اُسے محنت اور سعی بلیغ کرنی ہوگی۔ "شخصیت" جسم کی طرح عمل تولید کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس "چیز" کو، جو مادہ سے ماوراء ہے، قدریں ہی استحکام اور ثبات عطا کرتی ہیں اور قدریں ہی نشوونما ارتقا کی طرف لے جاتی ہیں اس کے علاوہ یہ قدروں کے ارتقا سے وجود میں آتی ہیں۔ اور خود قدروں کو تخلیق کرتی ہے۔ کائنات ساری کی ساری متحرک اور فعال ہے کیونکہ اس کے اندر کی ہر چیز کچھ نہ کچھ بن جانے کے لئے مصروف تگ و دو ہے۔ ہر چیز بن رہی ہے جو کچھ بننے کی صلاحیت اس کے اندر ہے۔ تاہم اس ساری کائنات کے اندر جو سب سے زیادہ فعال ہستی ہے اس کا نام انسان ہے اس ہستی کو بعض اعلیٰ صلاحیتوں کے علاوہ اختیار اور ارادے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ اس آزادی کا مقصد یہ ہے کہ یہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرکے بجائے بلندیوں کی طرف جانے کے پستیوں کی طرف گرتے چلے جانے کی راہ بھی منتخب کر سکتا ہے (۱۸۶ : ۷) انتخاب کرنے میں عقل اور جذبات نفس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی مخالف ہستی ہیں۔ عقل احتیاط اور تحمل کی طرف میلان رکھتی ہے۔ جبکہ جذبات بے دھڑک آگ میں کود جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ پس اس نازک مرحلے پر صرف ہدایت ربانی ہی کام آسکتی ہے، جو جذبات کو لگام دے کر عقل کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور خود عقل کی رہنما بن جاتی ہے۔

قرآن حکیم کی اس تعلیم کی روشنی میں پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ہمیں اپنے گردوپیش میں رونما ہونے والے واقعات کے تسلسل پر غور و فکر کرکے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ کائنات میں کوئی سبب بے نتیجہ نہیں ہے۔ اور کوئی نتیجہ بے سبب نہیں ہے۔ اس علم کی مدد سے ہم کائناتی نظم و ترتیب کا مفہوم سمجھ سکیں گے۔ اور دنیا کے ماحول سے مطابقت پیدا کر سکیں گے۔ ہمیں یہ بھی احساس ہو جائے گا کہ ہم بھی فطرت کے اندر تبدیلیاں لا سکنے والے مُسبّب ہیں۔ اسباب و علل کا علم ہمیں قوت بھی عطا کرتا ہے اور ذمہ داری کا احساس بھی دلاتا ہے۔ وہ عمل جو آزادانہ اختیار اور ارادے کے تحت رونما ہو یقیناً ذمہ دارانہ عمل ہے کیونکہ انسان جانتا ہے کہ جس راہِ عمل کا وہ انتخاب کر رہا ہے وہ اس کے نتائج کو بھی قبول کر رہا ہے۔ آسان لفظوں میں یوں کہیں گے کہ اُسے بخوبی علم ہے کہ اگر وہ جَو کاشت کرے گا تو جَو کی فصل کاٹے گا۔ اور اگر گندم کاشت کرے گا تو گندم کی فصل کاٹے گا۔ لہٰذا اگر کسی عمل کا نتیجہ ناخوشگوار برآمد ہوا ہے تو دانا شخص آئندہ اُس کو نہیں دہرائے گا۔ اسباب و علل کا قانون جس طرح انسان کی طبعی زندگی پر کارفرما ہے بالکل اسی طرح یہ اُس کی روحانی زندگی پر بھی عامل ہے۔ ہر عمل جو اختیار اور ارادے سے کیا جائے گا وہ رُوح کی دنیا پر بھی اثر انداز ہوگا۔ اس کی اچھی یا بُری نتیجہ خیزی کا دارومدار عمل کے اچھے یا بُرے ہونے کی نوعیت پر ہے۔ اچھے اعمال رُوح کے تانے بانے کو مضبوط بنائیں گے، بُرے اعمال اُسے کمزور کر دیں گے۔ چونکہ ہر عمل اپنے عامل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے صحیح اعمال انسان کی خودی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور ارتقا کی رفتار کو تیز تر بنا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بُرے اعمال سے ارتقا کی راہیں مسدود ہی نہیں ہو جاتیں بلکہ ان سے نچلی سطح پر گر جانے کا خطرہ بھی درپیش

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

رہتا ہے۔ انسان کی آزادی صرف انتخابِ راہ تک محدود ہے یعنی وہ چاہے تو صحیح راستہ اختیار کرے اور چاہے تو غلط راستے پر چل پڑے۔ لیکن ان راستوں پر چلنے کے نتائج کو وہ بدل نہیں سکتا۔ نہ ہی وہ ان نتائج کو برآمد ہونے سے روک سکتا ہے۔
ایک بات اور بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جو اس ساری کائنات کا اصل الحیات ہے انسان کو حکماً مجبور نہیں کرتا کہ تم فلاں راہ اختیار کرو۔ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو اختیار اور ارادے کی نعمت جو اس نے انسان کو عطا کر رکھی ہے وہ بے معنی ہو جائے گی۔ اللہ اپنا عطیہ واپس نہیں لیتا۔ یہ اس کی کمال مہربانی ہے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا انسان پر بہت بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ارض و سماوات کے نظم و نسق کو چلانے والی تمام قوتوں کو اس کے تابع فرمان کر دیا ہے۔ نیز اپنی ابدی سچائی میں نیک و بد نتائج کے اٹل ہونے کی وضاحت کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرما دیا ہے کہ کائناتی قوتوں کو جس طرح چاہو استعمال کر لو۔
لہٰذا انسانی اختیار و ارادے کے اس قدر احترام کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان جو بھی راستہ اختیار کرے گا معاون قوتیں اس کے لئے اسی راستے کو ہموار کرتی چلی جائیں گی۔ یہی مفہوم ہے ان آیات کا جن میں مذکور ہوا ہے کہ کفر اختیار کرنے والے کے کفر میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اور ایمان کا راستہ اختیار کرنے والوں کے ایمان کو مزید تقویتیں حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔ قرآن حکیم نے واضح طور پر ہر انسان کو بتا دیا ہے کہ وہ کہاں تک جا سکتا ہے۔ عمل کی دنیا میں فی الواقعہ وہ کس مقام تک جاتا ہے یہ انسان کے اپنے اختیار و ارادے پر منحصر ہے۔
"خیر و شر" سے متعلق قرآنی نقطۂ نظر کی بہتر تفہیم کے لئے یہ قدرے طویل بحث ضروری تھی۔ اس بحث کو بار بار ٹھہر ٹھہر کر اور ابدی صداقتوں کو سمجھنے کی نیت سے پڑھنے والے کے دل و دماغ کے بند دریچے کھل جائیں گے اور اگر اس نے تعصب سے کام نہ لیا تو بہت سی گرد آلود حقیقتیں بھی صاف ہو کر اپنے حسن و جمال کی پوری تابانی کے ساتھ چشمِ بصیرت کے سامنے آ جائیں گی۔ البتہ بعض ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا رہا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام ہی کیوں تخلیق کیا جس میں ایک دوسرے کی مخالف قوتیں ہمیشہ باہم متصادم رہتی ہیں۔ جن طالبانِ حقیقت نے گزشتہ سطور کو بالاستیعاب پڑھا ہے انہوں نے یقیناً سمجھ لیا ہو گا کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے تاہم مزید وضاحت کے طور پر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ساری کشمکش انسان کو عطا کی گئی محدود قوتِ اختیار و ارادہ کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ اختیار اور ارادے کی محدود آزادی کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کے سامنے عمل کی راہیں ایک سے زیادہ کھلی ہیں۔ دوسرا یہ کہ انسان آزاد ہے اس بات میں کہ ان متبادل راہوں میں سے وہ جس کو چاہے اختیار کرے۔ زندگی کی شاہراہ پر یہی وہ "چوراہے" ہیں جو انسان کو تھوڑی سی دیر کے لئے رک جانے کا، سوچنے کا صحیح اور غلط متبادل راہوں کے حسن و قبح کے موازنہ کرنے کا، دونوں پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کا، دلائل و براہین کے وزن کرنے کا اور بالآخر فیصلے پر پہنچ کر کسی ایک راستے کو منتخب کر کے اس پر چل پڑنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اگر یہ چوراہے سامنے نہ آئیں تو انسان کی ذہنی صلاحیتیں بے کار اور بے مصرف رہ کر زنگ آلود ہو جائیں گی۔ راستے کی یہی رکاوٹیں ہی تو ہیں جو خود اظہاری (SELF-ASSERTION) کے لئے چیلنج ثابت ہوتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کے نہ ہونے سے "انسانی ذات" کا حیوانیت کے ملغوبے سے ابھر کر باہر آنا اور نکھار پیدا کرنا ناممکن ہو جاتا۔
بہترین تناسب اور بہترین توازن کا نام "حسن" ہے، قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق انسان کو حسن کے اعلیٰ سانچے میں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ڈھالا گیا ہے۔ اس کے قانونِ تخلیق یعنی اس کی فطرت میں کہیں کوئی نقص اور خرابی نہیں ہے۔ جس کسی نے یہ کہا ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اوّلین ماں باپ کے گناہ سے آلودہ ہو کر پیدا ہوتا ہے تو اس نے غلط کہا ہے۔ اوّل اس لئے کہ مکافاتِ عمل کے اٹل قانون میں ہر شخص اپنے کئے کا آپ ذمہ دار ہے۔ کوئی دوسرا کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ دوسرا یہ کہ سزا اور جزا منتقل نہیں ہو سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پہاڑ کی چوٹی سے گرے کوئی اور ہڈی پسلی کسی اور کی ٹوٹے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انسان اللہ کے احکام کی نافرمانی اس لئے کرتا ہے کہ ایسا کرنا اسے وراثت میں ملا ہے قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اگر وراثت ہی کو اصل مان لیا جائے تو اوّلین جوڑے کو یہ وراثت کس سے ملی تھی؟ جب ہم پوچھتے ہیں کہ اس جوڑے نے گناہ کیوں کیا تھا تو اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ شیطان نے اسے پھسلایا اور اس نے اس مکار کا کہنا مان کر اپنے آزاد اختیار و ارادے کو غلط طور پر استعمال کر ڈالا۔ کیا اولادِ آدم کو وراثت میں صرف گناہ ہی ملا ہے، اختیار و ارادہ نہیں ملا؟ ظاہر ہے کہ گناہ یا نافرمانی اختیار و ارادے کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے اس لئے ثابت ہوا کہ وراثت میں انسان کو اختیار و ارادہ ہی ملا ہے گناہ نہیں ملا۔ اگر گناہ کرنا اس کی فطرت کا لوازمہ ہے۔ تو پھر اختیار و ارادہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ انسان فطرتاً پاک صاف ہے اور پیدائش کے اعتبار سے حسن و خوبی کے بہترین سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ اگر باشعور ہوتے ہوئے بھی اس سے گناہ سرزد ہوتے ہیں تو اس خرابی کی ذمہ داری غلط تربیت پر عائد ہے، معاشرے اور ماحول پر عائد ہوتی ہے۔ گناہ انسان کی مجبوری نہیں۔ بلکہ حسن کاری اس کی مجبوری ہے۔ سچائی کی پہچان اس کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ جھوٹ کو تو یہ پہچان ہی نہیں سکتا۔ اگر پہچان سکتا تو کبھی جھوٹ کے نزدیک تک نہ جاتا۔ اب جو جھوٹ کے دامِ فریب میں آ جاتا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ جھوٹ سچ کا لبادہ اوڑھ کر اس کے سامنے آتا ہے۔ اور یہ دھوکا کھا جاتا ہے۔ انسان کی فطرت کے احسن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنی تخلیق کے قانون کے اعتبار سے حسن و خوبی کے ساتھ مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہے، لہٰذا اس کا فرض بنتا ہے کہ اپنے قول و عمل سے انسانی معاشرے میں حسن تخلیق کرے۔ فطرت کے حسن میں اضافے کرنے اور معاشرے میں یا فطرت میں جہاں کوئی کمی رہ گئی ہے یا خامی آ گئی ہے، یا ناہمواری پیدا ہو گئی ہے، یا توازن و تناسب بگڑ گیا ہے تو اسے فوراً ٹھیک کرے۔ یاد رہے کہ عیب دار چیز کو وہی ٹھیک کر سکتا ہے جو خود عیب دار نہ ہو، فطرتاً بے نقص ہو، احسنِ تقویم میں تخلیق کیا گیا ہو۔ گناہ آلود سرشت والی مخلوق یہ کام نہیں کر سکتی۔ وہ تو اور بھی زیادہ خرابیاں پیدا کرے گی۔ حسن و خوبی کے ساتھ انسان کا رشتہ فطری اور ازلی ہے، اسی لئے الٹے سے جو کوئی بھی اس رشتے کو توڑنے کے درپے ہے وہ گویا اپنے احسنِ تقویم ہونے کا منکر ہے۔ اگر اس اشرف المخلوق کو، جسے خود خالقِ اکبر نے بہترین سانچے میں ڈھالا ہوا کہا ہے کوئی ناقص سمجھتا ہے تو اس کا خود خالق کے بارے میں کیا خیال ہو گا؟ احسن الخالقین کے بارے میں یہ تصور بھی کفر ہے کہ اس کی تخلیق کے منصوبوں میں کوئی خرابی ہے۔

قرآنِ حکیم نے "خیر و شر" کے مسئلے کا جائزہ ایک اور انداز سے بھی لیا ہے۔ یہ عظیم کتاب انسانی زندگی کے ان عملی پہلوؤں کو بھی سامنے لاتی ہے جن سے عام لوگ خیر اور شر کے تصورات کو وابستہ کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے خارجی فطرت کو لیجئے جس کے بارے میں نزولِ قرآن سے پہلے یہ اعتقاد تھا کہ یہ انسان کی دشمن ہے۔ اس کی بجلیاں خرمنِ حیات کو جلا ڈالتی ہیں۔ اس کے طوفان درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتے ہیں، اس کے سیلاب بستیوں اور آبادیوں کو تباہ کر دیتے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بس آگ، ہوا، پانی، مٹی سب موجبِ شر ہیں، کوئی چیز بھی خیر نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے پہلی بار یہ اعلان کیا کہ جب تک انسان کسی فطری قوت کے قوانین کا علم حاصل نہیں کر لیتا اُس وقت تک وہ قوت سرکش و بیباک رہتی ہے اور انسان کیلئے تباہیاں اور بربادیاں لاتی ہیں لیکن جب انسان اس قوت کے قانونِ تخلیق و عمل کو جان پہچان اور سمجھ لیتا ہے تو پھر یہ قوت دست بستہ غلام بن کر خدمت کے لیے سربسجود ہو جاتی ہے۔ اب ضرر رسانیاں منفعت بخشی میں بدل جاتی ہیں اور اس کی سرکشیاں رام ہو کر انسان کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔ فطرت کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی بیکار، خالی از حکمت یا عبث پیدا نہیں کی گئی۔ پانی جب انسانی کنٹرول میں نہیں ہوتا تو سیلاب بن کر تباہیاں لاتا ہے لیکن جب اسے ساحلوں میں مقید کر لیتا ہے تو یہ مردہ زمینوں کے لیے حیاتِ نو کا پیامبر اور زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال فطرت کے ہر مظہر کی ہے۔ جدید علوم کی ترقی نے اس حقیقت پر جس طرح مہرِ تصدیق ثبت کی ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

انسان یہ بھی نہ سمجھ سکا تھا کہ بعض بچے پیدائشی لُولے، لنگڑے، اپاہج یا اندھے بہرے کیوں ہوتے ہیں۔ صدیوں تک قیاس آرائیاں ہوتی رہیں اور بالآخر یہ باور کر لیا گیا کہ بیماریاں اور اس قسم کی معذوریاں اور تمام دوسری مصیبتیں پچھلے جنم کے گناہوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن جب علم آگے بڑھا طب نے ترقی کی تو ان عوارض و حوادث کا راز بھی معلوم ہو گیا۔ چنانچہ اب شادی سے پہلے طبی معائنے، جنین کی حفاظتی تدبیریں اور دوسرے اقدامات بہت حد تک اس بات کی ضمانت دے رہے ہیں کہ بچے تندرست اور بے عیب پیدا ہوں۔ مزید تحقیقات اور سعی و کوشش اس "شر" پر قابو پا لے گی۔

"شر" کی سب سے زیادہ کربناک صورت "درد" (PAIN) بتائی جاتی ہے لیکن ماہرین اب یہ کہتے ہیں کہ "درد" تو اللہ کی رحمت ہے۔ انسانی جسم اس قدر پیچیدہ اور پُراسرار واقع ہوا ہے کہ انسان کو خود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ مشینری کیسے چل رہی ہے۔ اور اس میں کہیں کوئی خرابی تو پیدا نہیں ہو رہی۔ یہ بتانے کے لیے کہ آپ کے جسم کی مشینری میں کہیں کوئی نقص واقع ہو گیا ہے فطرت نے ایک ترکیب بنا ڈالی ہے جسے "درد" کہا جاتا ہے۔ یہ گویا خطرے کی گھنٹی ہے جو آپ کی فوری توجہ چاہتی ہے۔ تاہم محققین مسلسل اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ جسمانی خرابی کی پیش از وقت اطلاع "درد" کی بجائے کسی اور طریقے سے ہو جائے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس میں بھی کامیابی ہو جائے گی۔

خیر اور شر کے پیدا کرنے میں اشیاء کی مقداریں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ آج تو زہر سے بھی تریاق کا کام لیا جا رہا ہے۔ تاہم ہم جانتے ہیں کہ دودھ، مکھن اور شہد جیسی صحت بخش نعمتوں کا غلط استعمال بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی آیات (۱۱۳: ۱، ۲) پر غور کیجئے جن میں "تخلیق شدہ اشیاء" کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ فطرت کی چیزیں بنفسہٖ نہ خیر ہیں اور نہ شر ہیں۔ ان کا صحیح اور غلط استعمال انہیں خیر و شر بنا دیتا ہے۔ اللہ سراپا خیر ہے، اس نے شر پیدا نہیں کیا۔ اس نے اشیاءِ فطرت میں مختلف خواص اور تاثیرات رکھ دی ہیں اور ان کے پیمانے مقرر کر دیے ہیں۔ مقررہ قوانین کے مطابق ان کا استعمال موجبِ خیر ہے اور مقررہ قوانین کے خلاف ان کا استعمال موجبِ شر ہے!

خارجی کائنات کی چیزوں کے خیر اور شر کی بحث ختم کرنے سے پہلے سورۂ نساء کی اُن دو آیات کی تشریح ضروری ہے جن کے متعلق بعض غلط سوچ رکھنے والے تضاد کا پہلو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ اچھائیاں

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور برائیاں سب اللہ کی طرف سے ہیں جبکہ دوسری آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ اچھائیاں تو اللہ کی طرف سے ہیں لیکن برائیاں انسان کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ واضح رہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے صرف عالمِ خلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عالمِ امر اور بیشمار دوسرے عالمین کے بارے میں ہم صرف وہی کچھ جانتے ہیں جو وحیٔ ربانی کے ذریعے سے ہمیں بتایا گیا ہے۔ عالمِ خلق میں جو اللہ کی تخلیق کردہ کائنات پر مشتمل ہے چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک "قانون" کے تابع ہے۔ قانون اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور اٹل ہے۔ کسی چیز کو یہ مجال نہیں کہ اپنے قانونِ تخلیق کی خلاف ورزی کر سکے۔ اشیائے کائنات کے خواص اور تاثیرات بھی اٹل قانون کی رسی سے بندھی ہوئی ہیں۔ اسباب و علل اور مکافاتِ عمل کا قانون بھی بلا استثنیٰ ہر جگہ اور ہر وقت جاری اور ساری رہتے ہیں۔ انسان کو محدود اختیار اور ارادہ دیکر اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ انسان کو کہہ دیا گیا ہے کہ یہ دنیا تمہاری دنیا ہے اس کو جس طرح چاہو استعمال میں لاؤ (اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۴۰ : ۴۱) لیکن اتنا یاد رکھنا کہ تمہارا ہر عمل اٹل قانونِ مکافات کی رُو سے ایک خاص نتیجہ مرتب کرے گا۔ ہم نے تمہارے اندر قابلِ حصول امکانات رکھ دیئے ہیں۔ اگر تم ہماری عطا کردہ رہنمائی کے مطابق عمل کرو گے تو تمہارے سامنے ارتقا کی راہیں کھلتی جائیں گی۔ اور زندگی کی خوشگواریاں قدم قدم پر تمہارا استقبال کریں گی۔ اگر تم ہماری رہنمائی کو چھوڑ کر اپنی مرضی کا کوئی راہِ عمل اختیار کرو گے تو اس کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہوگی، کیونکہ ہمارا کام اٹل ہے اور اس میں خیر و شر کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ جو تمہیں واضح طور پہ بتا دیئے گئے ہیں۔" گویا بتایا یہ گیا ہے کہ:

۱۔ موافق یا ناموافق، خوشگوار یا ناخوشگوار جو بھی نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ اللہ کے مقرر کردہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے برآمد ہوتے ہیں۔ لہٰذا خیر و شر دونوں اللہ کی طرف سے ہیں کیونکہ قانون اللہ کا ہے۔

۲۔ اللہ کے قوانین ہر چیز کو تعمیر و ارتقا کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ان قوانین کی پیروی سراسر خیر پہ منتج ہوتی ہے۔ لہٰذا اچھائیاں سب اللہ کی طرف سے ہیں

۳۔ اللہ کے مقرر کردہ قوانینِ تعمیر و ارتقا کے برعکس چلنے کا لازمی نتیجہ تخریب و اضمحلال ہے۔ جو کوئی اپنے اختیار اور ارادے سے اس برعکس راستے پر چلے گا اس کے سامنے تخریبی نتائج لازماً آئیں گے۔ یہ حقیقت صاف طور پر انسان پر واضح کر دی گئی ہے۔ اور پھر اسے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ اب جو راستہ وہ چاہے اختیار کرے۔ لہٰذا غلط راہ پر چلنے سے جو مشکلات اور مصیبتیں سامنے آئیں گی وہ انسان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہوں گی "شر" انسان کا اپنا پیدا کردہ ہے اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہے۔ اللہ خیر ہے اور انسان کے لئے بھی خیر ہی چاہتا ہے کیونکہ وہ تمام عالمین کا پروردگار، اور نشو و ارتقا دینے والا ہے اور رحیم و رحمٰن ہے

تخلیق شدہ اشیاء و کائنات کے "شر" میں ایک شر افلاس کا بھی شامل ہے یہ مصیبت اس غیر قرآنی معاشرے کی پیدا کردہ ہے جو انسانوں کے خود ساختہ اصولوں پر قائم کیا جاتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ بے انصافی، عدم مساوات اور تقسیمِ رزق کی ناہمواری ہے۔ قرآنی نظامِ معاشرت اور نظامِ اقتصاد میں ہر چیز اپنے صحیح تناسب اور توازن میں رہتی ہے، رزق متواتر گردش میں رہتا ہے۔ کوئی کسی کی محنت کا ثمر دبا نہیں سکتا۔ کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا، زندگی کی بنیادی ضروریات سب کی پوری ہوتی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

رہتی ہیں، انفرادی صلاحیتوں کو اُبھرنے کے بھرپور مواقع میسر ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی ناہمواری کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ افلاس کی مصیبت اُس معاشرے میں زیادہ سنگین صورت اختیار کر لیتی ہے جس میں طاقتور لوگ رزق کے بہتے سرچشموں پر بند باندھ کر ان کا رُخ اپنی طرف موڑ لیتے ہیں، احترام انسانیت کی قدر کو نہیں پہچانا جاتا اور باہمی اخوت و تعاون کے رشتے کاٹ دیئے جاتے ہیں۔

یہ تمام شر جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے خارجی کائنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود انسان کے اندر بھی ایک کائنات ہے جو مختلف شرور کی آماجگاہ بن سکتی ہے۔ علم، عقل، جذبات اور اختیار و ارادے کی خرابیوں کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ صلاحیتیں ہمارے ہتھیار ہیں۔ جس طرح تلوار یا آج کے جوہری ہتھیار، اگر نیک، حق پرست اور عادل اشخاص کے ہاتھ میں ہوں تو ظلم کے خلاف کمزوروں کی حفاظت کریں گے اور اگر غیر ذمہ دار وحشیوں کو دے دیئے جائیں تو یہ عورتوں، بچوں بلکہ بیماروں، بوڑھوں تک کا صفایا کر دیں گے۔ اسی طرح ان صلاحیتوں کے استعمال میں بھی خیر اور شر کے دونوں امکانات ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اشیاء کی خواص تو ہمیشہ ویسے کے ویسے رہتے ہیں، ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی تاہم وہ مقصد جس کے لئے انہیں استعمال کیا جاتا ہے وہ ان کے خیر و شر ہونے کا معیار بن جاتا ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ فرض کیا ایک شخص جسے کسی دوسرے شخص نے مکر و فریب یا چالاکی اور دھوکے سے اس کی متاع سے محروم کر دیا ہے کسی منتظم یا قانون کے پاسدار کی مدد حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ منتظم یا سراغرساں بھی اُسی طرح عقلی اور ذہنی تدابیر سے کام لے گا۔ جس طرح فریبی مکار نے اپنی عقل کو استعمال کر کے پہلے شخص کو دھوکا دے کر لوٹ لیا تھا۔ اس کے بغیر وہ مظلوم کی حق رسی نہیں کرا سکتا۔ گویا عقل کو ان دونوں نے استعمال کیا ہے۔ ٹھگ نے بھی اور منتظم نے بھی۔ لیکن ایک نے اسے "شر" کے لئے استعمال کیا ہے دوسرے نے اسے "خیر" کے لئے استعمال کیا ہے۔ عقل خود نہ شر ہے نہ خیر ہے۔ اس کے غلط اور صحیح استعمال نے اسے شر اور خیر بنا دیا ہے، اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ان مثالوں کے بعد سوال صرف اشارہ جاتا ہے۔ کہ وہ کون سی قوت یا رہنما یا ہستی یا شخصیت ضروری ہے۔ جو اشیائے فطرت کے لئے، ہماری عقل کے لئے اور دوسری قوتوں کے لئے مقاصد کا تعین کرے تاکہ نتائج تعمیری حاصل ہوں اور دُنیا آلام و مصائب سے محفوظ رہے۔ عقل انسان کا سب سے بڑا اور طاقتور ہتھیار ہے۔ یہ ایک انمول خزانہ ہے، تاہم ہے ہتھیار ہی۔ اس سے زیادہ حیثیت اسے نہیں دی جا سکتی جس طرح دوسرے ہتھیار مثلاً تلوار یا ایٹم بم وغیرہ اپنا مقصد آپ متعین نہیں کرتے اسی طرح عقل کے ہتھیار کو بھی یہ آزادی نہیں دی جا سکتی کہ یہ اپنے مقاصد آپ متعین کرے۔ اسے صحیح سمت دکھلانے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی چیز عقل سے بالاتر اور ماوراء ہو جو انسانی مسائل کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھے۔ یہ چیز وحیٔ ربانی ہے جو عقل کی رہنما بھی ہے اور اس کے منافی بھی نہیں۔ وحیٔ ربانی کی رہنمائی کا طریق کار یہ ہے کہ یہ عقل کے سامنے چند معیارات رکھ دیتی ہے جنہیں ہم زندگی کے لافانی اور غیر مبدل اصول یا اقدار کہہ سکتے ہیں۔ جب فطرت کی قوتیں، انسانی ایجادات انسانی صلاحیتیں اور انسانی عقل چاروں مل کر ان محکم قدروں کے تحفظ پر مامور ہو جاتی ہیں تو پھر انسان کا ہر عمل خیر ہی خیر ثابت ہوتا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

مستقل قدروں کو نظر انداز کر دینا حیوانی سطح پر پڑے رہنے کے مترادف ہے جس میں خیر اور شر کو مادی پیمانوں سے ناپا جاتا ہے۔ انسانی سطح زندگی پر وہ عوامل جو انسان کی رُوحانی ذات کو ارتقا دیتے ہیں اور اس کی شخصیت کو مستحکم بناتے ہیں "خیر" ہیں اور جو عوامل اس کی رُوحانی ذات کی نشو و نما میں رکاوٹ بنتے ہیں یا اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر بکھیر دیتے ہیں "شر" ہیں۔ چونکہ حیوانات اخلاقی قدروں کو نہیں جانتے اور پہچانتے اس لئے وہ معاشرہ جو حیوانی سطح زندگی سے چمٹا رہتا ہے اور اس سے بلند تر ہو کر نہیں اُبھرتا یا جو "انسانی ذات" اور اس کے احترام کا منکر ہے اس میں کوئی "اخلاق" نہیں ہو سکتا۔ اگر اس معاشرے نے چوری نہ کرنے، دھوکا نہ دینے، جھوٹ نہ بولنے، قتل نہ کرنے وغیرہ کے قوانین بھی بنا رکھے ہیں تو یہ قوانین معاشرتی قوانین کہلائیں گے۔ "اخلاقی قوانین" نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادہ پرست معاشرے میں جو شخص یہ ایمان رکھتا ہو کہ ذرائع اور وسائل غیر اہم ہیں صرف مقصد اہم اور مقصد ہی کا حصول ضروری ہے اور یہ کہ جھوٹ بولنے سے، دھوکے فریب سے عیاری اور مکاری سے، چوری سے یا قتل و غارت سے اُسے مادی مفادات حاصل ہو سکتے ہیں یا اُسے بہت زیادہ "دولت" مل سکتی ہے اور وہ اپنے جھوٹ، مکر و فریب اور چھینا جھپٹی کے طریقوں کو کامیابی کے ساتھ لوگوں سے چھپا سکتا ہے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی کسی نہ کسی طرح محفوظ رہ سکتا ہے تو وہ بغیر کسی تامل کے ان برے اعمال کا مرتکب ہوتا رہے گا۔ مادی نظریۂ زندگی رکھنے والوں کے لئے رائے عامہ کے سوا اور کوئی خوف ایسا نہیں ہے۔ جو انہیں ان بُرے اعمال سے باز رکھ سکے۔ لوگوں کا خوف اور لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کا خوف، ایسے خوف نہیں کہ ان پر عقلِ عیار قابو نہ پا سکے یا ان سے گھبرا کر انسان کو بُرے اعمال سے باز رکھ سکے۔ عقل کے پاس بڑے بڑے حربے ہر وقت موجود رہتے ہیں جن کے ذریعے یہ بآسانی ان خوفوں پر حاوی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہر وقت بدلتے رہتے ہیں اور ترمیم و تنسیخ کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ پس اگر کوئی شخص محض معاشرہ کے خوف سے تغیر پذیر معاشرتی قوانین کے خوف سے بُرے کام نہیں کرتا تو اس کے اعمال کو اعلیٰ اخلاق کا نتیجہ نہیں کہا جائے گا۔ ایسے معاشرے میں تو عدل بھی خریدا جا سکتا ہے اور رائے عامہ کو بھی دامے، درمے، سخنے، قدمے ہموار کیا جا سکتا ہے۔ قانون بھی توڑا موڑا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو اپنی "انسانی ذات" کی قدر و قیمت جانتا اور پہچانتا ہے اور اس بات پر پورے یقین کے ساتھ ایمان رکھتا ہے کہ اُس کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوگا۔ یعنی یا تو اس کی ذات کو مستحکم بنا دے گا یا اسے ریزہ ریزہ کر دے گا۔ اور وہ جو قانون ارتقا کے اٹل اور غیر متبدل ہونے پر یقین رکھتا ہے اور وہ جو تکمیل خودی اور اپنی ذات کے امکانات کے حصول کو زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ چوری نہیں کرے گا، دھوکا نہیں دے گا، ظلم اور استحصالی طور طریقوں سے اجتناب کرے گا، اور قتل و غارت وغیرہ جرائم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ بلکہ کبھی بھی ہو جائے غلط کاموں کی طرف مائل تک نہ ہو گا۔ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے سے وہ اپنی سب سے زیادہ قیمتی چیز یعنی "انسانی ذات" کو کھو بیٹھے گا۔ یہ وہ متاعِ عزیز ہے جو اسے حیوانیت سے بلند تر مقام عطا کر کے شرف و امتیاز اور حیاتِ ابدی سے سرفراز کرتی ہے۔ "اخلاق" کے معنے اس سطح پر پہنچ کر عام معنوں سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اب اس کے معنے ہو جاتے ہیں "کمتر سطح کے مادی مفادات کو اعلیٰ سطح کے مقصد یعنی انسانی ذات کے استحکام کی خاطر قربان کر دینا"۔ اسی چیز کا دوسرا نام ہے زندگی کی مستقل قدروں کا

Presented by: Rana Jabir Abbas

تحفظ خواہ اس تحفظ کے سعی و عمل میں قیمتی سے قیمتی چیز اور دلکش مادی مفادات سے بھی محروم کیوں نہ ہونا پڑ جائے۔ یہاں "خوف" کے نام کی کوئی چیز خارج سے آکر مانع عمل نہیں ہوتی بلکہ داخلی ضبط ہی راہِ راست پر گامزن رکھتا ہے۔

وہ اعمال جن کے وقوع میں انسانی ذات کی فعال شمولیت (ACTIVE PARTICIPATION) نہیں ہوتی انہیں غیر جانبدار یا (NEUTRAL) اعمال کہتے ہیں۔ ان کے اچھے بُرے ہونے کا بھی کوئی اثر انسانی ذات پر نہیں پڑتا۔ اتفاقیہ نیکیاں بھی قابلِ قبول نہیں ہیں۔ لیکن جو اعمال ارادتاً سرزد ہوں ان کی سزا جزا ناگزیر ہے۔ کیونکہ ذمہ داری کا تعلق شعور سے ہے۔" اللہ انسان سے نہ صرف ظاہر کھلم کھلا اعمال کو دیکھتا ہے بلکہ اس کے مخفی اعمال اور ان کے محرکات کا بھی علم رکھتا ہے یہاں تک کہ دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور وہ شرارتیں جو آنکھوں ہی آنکھوں میں مچلتی رہتی ہیں خالقِ لوح و سماوات کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔" انسان کے لیے معمولی سی پھسلن اور خفیف سی لغزش بھی مہلک ہو سکتی ہے۔ راہِ حیات سیدھا تو ہے لیکن بہت ڈھلوان ہے لہٰذا ہمارا کوئی بھی عمل، خواہ یہ ظاہر ہو یا پوشیدہ ہو ایسا نہیں ہے جسے غیر اخلاق (AMORAL) کہا جا سکے۔ ہر عمل یا یقینی طور پر اخلاقی (MORAL) ہے یا یقینی طور پر بداخلاقی والا (IMMORAL) ہے، اور یہ بغیر کسی استثناء کے اپنے نقوش عامل کی شخصیت پر مرتب کرتا رہتا ہے اور اسی وجہ سے قابلِ مؤاخذہ اور لائقِ احتساب ہے:

"اے آدمی تو خود ہی اپنے اعمال کا گواہ ہے، خواہ یہ کتنے ہی بہانے کیوں نہ بناتا پھرے!" (۷۵:۱۴،۱۵)

"جو کوئی بھی غلط کام کرتا ہے وہ خود اپنے خلاف کرتا ہے" (۴:۱۱۱)

"ہر نفس اپنا حساب کتاب آپ لیے پھرتا ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا ایسا نہیں جو کسی دوسرے کا بوجھ اٹھائے (۶:۱۶۵)

اس ساری بحث سے جو مسلمہ حقیقتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:

"۱ــــ انسان کے بالارادہ اعمال اس کی شخصیت کے خدوخال اور شکل و صورت کو وضع کرتے ہیں۔

۲ــــ وہ اعمال جو اس کی شخصیت یعنی اس کی "انسانی ذات" کو توانا اور مستحکم بناتے ہیں وہ اچھے یعنی "خیر" ہیں۔

۳ــــ وہ اعمال جو مستقل قدروں کے مطابق نہیں ہیں شخصیت کو توڑ پھوڑ کر کمزور بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ بُرے یعنی "شر" ہیں۔

۴ــــ انسان کو چونکہ راہِ عمل کے انتخاب کی آزادی ہے اس لئے وہ اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، اس اعتبار سے اُسے اپنے اعمال کے نتائج بھی قبول کرنا ہوں گے۔

۵ــــ ذمہ داری کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں کی جا سکتی۔ ہر ایک کو اپنا بوجھ آپ اٹھانا ہوگا۔

یہ آخری نکتہ بہت اہم ہے اکثر اوقات انسان اپنی انا پرستی یا خودداری کی وجہ سے اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور شیطان کو اپنا دفاعی حربہ بنا کر اپنی بداعمالیوں کا سارا الزام اس کے سر تھوپ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ شیطان اور ابلیس کے استعاروں کے معنے ہم کسی دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "شیطان" کا لفظ انسان کے اپنے "یکلخت بھڑک اٹھنے والے" جذبات کے تشخص کے لیے استعارہ ہے۔ بدی کی ترغیبات جو انسان کی اصلی فطرتِ صالح کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نشو و ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اقتدارِ ربانی کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے سے انکار کر دیتی ہیں اور جو زندگی کی متعلق قدروں کے راستے سے بھٹکا دیتی ہیں۔ وہ انسان پر کہیں خارج سے آکر حملہ آور نہیں ہوتیں۔ جب آدمی اپنے جذبات کا آقا بننے کی بجائے ان کا غلام بن جاتا ہے تو وہ اس روشنی کو ضائع کر دیتا ہے جو اسے جوہرِ انسانیت کی تابانی کی صورت میں عطا ہوئی تھی۔ اور اس طرح رُوحانی طور پر اندھا ہو جاتا ہے۔ جذباتیت کے جوش کے دوران جب خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو انسان جذبات کے طغیان پر قابو نہیں پا سکتا اور وحشت زدہ ہو کر جارحیت پسند (AGGRESSIVE) بن جاتا ہے جب وحشت زدگی روک دی جاتی ہے تو اس سے شکست خوردگی (FRUSTRATION) پیدا ہو جاتی ہے جو یاسیت کی انتہائی صورت ہے۔ ابلیس قرآن حکیم میں اسی یاسیت کی علامت کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ شیطان کے معنے ہیں بھڑکا ہوا، جوش میں آیا ہوا، مشتعل، غلط انداز، تیز سانپ جو فوراً مشتعل ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ چونکہ یاسیت یا احساسِ محرومی مشتعل جذبات کا نتیجہ ہے اس لئے یہ دونوں الفاظ یعنی شیطان اور ابلیس ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ اور یہ سکّہ انسانی صلاحیتوں کے خزانے کی صندوق میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ گویا یہ ایسا سکّہ ہے جو ہر لمحے رائج الوقت ہے۔ فعّال، چست و چالاک، زندہ، موقعے کی تلاش میں، تجربہ کار شکاری کی طرح ہر وقت گھات میں لگا رہتا ہے۔ اس ضمن میں ارشاداتِ ربانی دیکھیے۔

۱۔ "شیطان نے آدم اور اس کی بیوی کے دلوں میں وسوسے ڈال دیئے" (۷:۲۰)

۲۔ "ہم جانتے ہیں ان وسوسوں کو بھی جو انسان کا اپنا نفس ایجاد کرتا رہتا ہے" (۵۰:۱۶)

سورۂ ابراہیم میں بانداز استعارہ ایک معنی خیز مکالمہ شیطان اور اس کے پیروکاروں کا درمیان دیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت کے دن شیطان کے پیروکار شیطان کو مجرم ٹھہرائیں گے کہ تم نے ہمیں ورغلایا تو شیطان جواب میں کہے گا:۔

"مجھے تم پر کوئی حاکمانہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ میں نے تو تمہیں صرف آواز دی تھی اور تم میری آواز پر لبیک کہتے ہوئے خود ہی آگئے تھے۔ مجھے ملامت نہ کرو اپنے آپ کو ملامت کرو اور اپنے نفس کو مجرم ٹھہراؤ جس نے میری پیروی کی۔ (۱۴:۲۲)

کوئی تعلیمی پروگرام کارگر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم حاصل کرنے والے کے اپنے اندر تعلیم قبول کرنے کی صلاحیت اور آمادگی موجود نہ ہو۔ تعلیم کا ہر عمل اپنے آپ کو تعلیم دینے کا نام ہے (ALL EDUCATION IS SELF-EDUCATION) یعنی ہر شخص اپنا معلم آپ ہے۔ بالکل اسی طرح ہر شخص اپنا ورغلانے والا بھی آپ ہے۔ شیطان صرف آواز دیتا ہے۔ آواز پر لبیک کہنا یا اسے دھتکار دینا انسان کے اپنے اختیار و ارادے میں ہے۔ نافرمانی کی طرف آمادگی گویا شیطان کی دعوت کو قبول کر لینا ہے۔ اگر انسان خود آمادہ نہ ہو تو شیطان کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

اس اہم مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جذبات اور خواہشات، تمنائیں اور آرزوئیں انسان کے روحانی وجود کی بنیاد بھی تو ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں ترغیب و تحریص کے جال میں پھنس جانے سے انسان اپنے آپ کو بچا

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سکتا ہے؟ تصوف کہتا ہے کہ جذبات کو کچل دو۔ لیکن جس طرح ترکِ دُنیا ناممکن ہے اسی طرح جذبات سے عاری ہو کر زندگی گزارنا بھی ناقابلِ عمل ہے۔ کیونکہ جذبات کو "قتل" نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کرنا ممکن ہوتا تو یہ نہایت احمقانہ فعل ہوتا۔ زندگی کی تر و تازگی، اس کی مسرتیں اور خوشگواریاں اور ارتقا کی طرف قدم بڑھانے کا ذوق براہِ راست جذبات سے متعلق ہے جذبات اور احساسات کی حرارت نہ ہو تو انسان برف کی سِل بن جائے، بے حِس، مُردہ دل، مضمحل، بے حرکت، نڈھال اور مرجھایا ہُوا۔ قرآنِ حکیم جذبات کو دبا دینے کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ البتہ یہ ضرور حکم دیتا ہے کہ انہیں عقلیت کے نظام سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ جذبات اندھے ہوتے ہیں۔ کیوپڈ کو قدیم زمانے سے نا سمجھ طفل اور تیر کمان سے مسلح دکھایا جاتا رہا ہے اور اندھا بھی۔ جذبات نہ اپنے آپ کو روک سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی سمت متعین کر سکتے ہیں۔ لیکن جب انہیں عقل کے تابع بنا لیا جاتا ہے اور عقل بھی وہ جو ہدایتِ ربانی سے رہنمائی حاصل کرتی ہے تو پھر ہر جذبے کو ایسی انوکھی سی روشنی عطا ہو جاتی ہے جس کی مدد سے یہ انسانی زندگی کے وسیع میدان میں اپنا مقام پہچان لیتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ عقل اور جذبات دونوں کو انسان کے بہترین مفادات کی خدمت پر مامور کیا جائے اور ان سے صرف وہی کام لیا جائے جو مستقل اقدار کے استحکام اور تحفظ کا موجب ہو۔

"ذات" یا شخصیت کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ خارجی دنیا کا اثر قبول نہ کرتے ہوئے ہمیشہ غیر متغیر رہتی ہے۔ مکمل ترین ذات اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے۔ اللہ حیّ و قیّوم ہے اس لئے اس کے عطا کردہ قوانین اور قدریں بھی قائم، ثابت، مستحکم اور غیر متبدل ہیں۔ انسان کی امکانی اور نامکمل ذات جو ان کے متعلق کو اپنے لئے قابلِ تقلید نمونہ اور آئیڈیل بنا لیتی ہے اور اپنے آپ کو اس کی صفات کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیتی ہے وہ بھی اپنی محدودیت کے اندر رہتے ہوئے اپنی سیرت و کردار میں اتنا ثبات و دوام پیدا کر لیتی ہے جتنا اس کے لئے ممکن ہوتا ہے۔ اس استحکام و ثبات سے وہ نہ صرف اپنے لئے خیر کا موجب بن جاتی ہے بلکہ ہر دوسری مخلوق کے لئے بھی سرچشمۂ خیر و حسن و خوبی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ شخصیت جو مُرغِ بادنما کی طرح فضاؤں کے ہلکے سے ارتعاش سے بھی سمت بدلتی رہتی ہے اور کسی بھی اصول پر قائم نہیں رہتی وہ ان بلندیوں تک کبھی نہیں پہنچ سکتی جو "انسانی ذات" کے قابلِ حصول امکانات کی موعودہ منزل ہیں۔ وہ فرد یا قوم جس کا خدا حیّ و قیوم ہے خود بھی زندہ و پائندہ ہے قوت میں بھی مستحکم ہے اور شوکت میں بھی ثابت و فعال ہے۔ حسن و خوبی میں بھی دائم و قائم ہے اور خیر و برکت کی روانی میں بھی متحرک و فعال ہے۔ چونکہ زندگی کی عالمگیر قدریں ناقابلِ تغیر ہیں اس لئے ان کی متابعت سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ بھی دوامی پائیدار اور ارتقا بدوش ہیں۔ اسی لئے ان دائمی تعمیری نتائج کو خیرِ مطلق کہا جائے گا۔ منطقی طور پر وہ شر جو مستقل قدروں کو نظر انداز کر دینے سے پیدا ہو گا وہ مطلق شر ہو گا۔ اسلام نے اوّل الذکر کو جنّت اور مؤخر الذکر کو جہنم سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ قرآنِ حکیم نے آخرت کو "انسانی ذات" کی زندگی قرار دیا ہے جسم کی زندگی قرار نہیں دیا۔ اس لئے مطلق خیر وہ عمل ہے جس سے اس دنیا میں بھی حسنات حاصل ہوں اور آخرت کے حسنات بھی یقینی بن جائیں۔ آخرت کے حسنات کا استحقاق صرف مستحکم "انسانی ذات" کو حاصل ہے (۳۰:۱۶) موت وہ کسوٹی ہے جو "انسانی ذات" کی تخلیق کر کے اس کے استحکام کو پرکھتی ہے۔ لہٰذا موت بھی "خیر" ہے۔ "ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہو گا۔ ہم تمہاری نیکیوں اور بدیوں کا امتحان لیتے ہیں۔ ہمارے ہی پاس تمہیں لوٹ کر

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

آتا ہے۔ (۳۵ : ۱) (۲) مبارک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں اقتدار اعلیٰ ہے۔ وہ ہر چیز پہ قدرت رکھتی ہے وہ جس نے موت و حیات کو تخلیق کیا ہے تاکہ ان کے ذریعے وہ پرکھے کہ تم میں سے اچھے اعمال والا کون ہے۔ وہ بڑی قوتوں والی ذات! تحفظات دینے والی! (۶۷ : ۲)

---

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۷۔ باہمی تادیب و احتساب کا صدقہ جاریہ

مولوی جلال الدین رومیؒ (۱۲۰۷ء۔۱۲۷۳ء) نے اپنی مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے کہ حضرت بایزید بسطامی (وفات ۸۷۴ء) کے زمانے میں ایک منکرِ اسلام گبر کو کسی نیک بخت مسلمان نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ منکرِ اسلام نے اس کی باتیں سنیں، پھر سوچ کر کہا کہ اے نیک بخت مسلمان! اگر اسلام یہی ہے جو میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے نمونے میں دیکھتا ہوں تو میرے پاس اس طرح کے اسلام کی تاب و طاقت نہیں ہے اگر کوشش بھی کروں تو بھی یہ میری کوشش سے فزوں تر ہے، اور اگر اسلام وہ ہے جس کی مثال عام لوگ پیش کرتے ہیں تو اس سے تو میری کافری ہزار درجے بہتر ہے۔ کہنے کو تو یہ حکایت ہے لیکن بڑی سبق آموز باتوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ منکرِ اسلام نے الدین کے نظریاتی پہلو پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی اس کے کسی عقیدے، اصول و قانون یا ضوابط کے خلاف کوئی بات کی ہے بلکہ کہا یہ ہے کہ مجھے عملاً دو اسلام دکھائی دیتے ہیں۔ ایک خواص کا اسلام جو گلیوں اور بازاروں سے نکل کر خانقاہوں میں جا چھپا ہے اور دوسرا عوام الناس کا اسلام جسے دیکھ کر میرا کفر بھی شرم کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قبول نہیں کر سکتا۔ یہ دو اسلام کب اور کیسے وجود میں آئے اس سوال کا تعلق مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ سے ہے جس پر ابنِ خلدون سے لیکر ٹوئن بی تک کے بے شمار مؤرخین اور محققین نے کتابیں لکھی ہیں۔ مخالفین کا یہ الزام بھی اب قطعی طور پر بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تھا۔ تاریخ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ کہ اسلام کا سیلِ عالمگیر اس وقت اطراف و اکنافِ عالم پر پھیل گیا تھا جب گلیوں اور بازاروں میں عام آدمی تک عملی اور کاروباری دنیا میں چلتا پھرتا قرآن نظر آتا تھا۔ جب اخوت و مساوات اور عدل و حریت ایک ایک فرد کی سیرت و کردار کے واضح اور نمایاں خصائص تھے۔ جب زبانیں نہیں کہتی تھیں کہ ہم سے ابدی حقیقتیں سن لو بلکہ متحرک اور فعال وجود کہتے تھے کہ ہمیں دیکھو لو۔ جب دلوں کے اندھیرے غائب ہو گئے تھے، جب خود غرضیاں، گروہی لالچ اور قبائلی نفرتیں از خود محبت، رواداری اور امن و سلامتی میں بدل گئی تھیں۔ گویا فکر و عمل کی پاکیزگی تھی جسے دیکھ کر کالے، گورے، عجمی، عربی، زنگی، حبشی، ہندی، چینی، ایرانی اور خراسانی سب کے سب فوج در فوج اسلام کی عالمگیر برادری میں شامل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ محبت، اخوت، مساوات اور عدل و انصاف کا "عملی ایک اسلام" تھا جس کی آفاقیت کو محسوس کر کے کروڑوں انسان اپنے آپ امڈ پڑے تھے۔ اسلامی مساوات کے اندر کتنی قوت ہے اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایئے جس کا ذکر جناب محمود فاروقی صاحب نے اپنی ایک نشریاتی تقریر میں کیا ہے:

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عباسیوں کے عہد خلافت میں مسلمان افریقہ اور ایشیاء کی بہت بڑی طاقت بن گئے تھے ان کی فتوحات کا دائرہ ہندوستان اور چین و ترکستان اور یورپ کی سرحدوں تک وسیع ہو گیا تھا مسلمانوں کی تہذیب و ترقی نے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔

روم کی عظیم الشان سلطنت سمٹ کر قسطنطنیہ کے اطراف و جوانب میں محدود ہو گئی تھی۔ رومی دربار میں ایک بہت بڑی مشاورت منعقد ہوئی جس میں تمام رومی علاقہ کے مذہبی پیشوا۔ فوجی ماہرین اور دربار کے سیاست دان اور حکام شریک ہوئے اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کی مقبولیت کا راز معلوم کیا جائے کہ وہ کون سی بات ہے جس نے عرب کے وحشی اور جاہل قبیلوں کو اس قدر ترقی یافتہ اور طاقتور بنا دیا۔

بحث و مباحثہ کے بعد اس مجلس نے طے کیا کہ چند ہوشیار اور قابل آدمیوں کو مسلمانوں کے شہروں میں بھیجا جائے اور وہ ہر طرح کی معلومات حاصل کر کے واپس آئیں اور رومی دربار میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔ اس فیصلے کے بعد دربار اور گرجا کے چند قابل اعتماد ذہین اشخاص کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی یہ لوگ تاجروں کے بھیس میں مسلمانوں کے شہروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک مذہبی عالم اس بات کی تحقیق کے لئے مقرر تھا کہ وہ اسلام کی اشاعت اور مقبولیت کا راز معلوم کرکے آئے کہ وہ کونسی بات ہے جو عام آدمیوں کو متاثر کرتی ہے اور وہ بے اختیار اسلام کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔

یہ شخص کپڑوں کا تاجر بن کر دمشق میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک غلام تھا نہایت وفادار اور اطاعت گزار جس کے ماتحت اور بھی غلام تھے۔ جو اپنے آقا کی مختلف خدمتوں پر مقرر تھے۔ یہ لوگ دمشق پہنچے تو ایک سرائے میں ٹھہرے اور دمشق کے مسلمان تاجروں سے لین دین کرتے رہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان سے دوستی اور تعلقات بڑھاتے اور ہر بات کی ٹوہ لگاتے رہے کہ کسی طرح اپنے اصل مقصد کو حاصل کریں اور وہ راز معلوم کریں جس نے مسلمانوں کے دین کو مقبول عام بنا دیا ہے۔ جہاں تک تجارت اور کاروبار کے معاملات تھے انہوں نے دیکھا مسلمان تاجر بہت ہوشیار اور کاروباری معاملات میں بڑے باخبر رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ نہایت دیانتدار بھی ہیں۔ اور اس وجہ سے ان کی تجارت خوب پھیلی ہوئی اور منافع بخش ہے۔ رومی عالم کے ساتھ جو تاجر تھے وہ تو مسلمانوں کی تجارتی مہارت اور دیانتداری سے متاثر ہوئے۔ مگر خود وہ چونکہ تاجر نہ تھا اور ان معاملات سے واقف نہ تھا اس بات کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں

jabirabbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دیتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ تو بس تجارتی گر ہیں اصل بات کچھ اور ہے جس نے اسلام کو مقبول بنایا ہے۔

یہ رومی وفد دمشق سے قدس اور بغداد تک ہو آیا۔ بغداد پہنچ کر رومی عالم نے مسلمان اہل علم مجلسوں میں شرکت کی وہاں کے کتب خانوں کو دیکھا بھالا۔ اور مسلمانوں کی علمی ترقی اور نت نئی ایجادات سے بہت متاثر ہوا۔ علوم و فنون میں مسلمانوں کے بہت سے نظریوں اور انکشافات کو اس نے اپنے روزنامچہ میں درج بھی کر لیا۔ مگر آخر میں اس نے یہی لکھا کہ میں نے بہت سی باتیں معلوم کر لیں جو مسلمانوں کی ترقی کا سبب ہیں مگر افسوس وہ اصل بات معلوم نہ ہو سکی جس نے ان کے دین اسلام کو اس تیزی سے پھیلایا ہے۔ ان شہروں کا دورہ کر کے یہ لوگ دمشق اور وہاں سے مسلمانوں کے سرحدی شہر حمص پہنچ گئے۔ حمص میں انہوں نے اپنا باقیماندہ سامان تجارت ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب کاروباری معاملات ختم ہو گئے۔ تو مسلمان تاجر نے ان کو اپنے دستر خوان پر شریک طعام ہونے کی دعوت دی۔

رومی عالم اپنے تاجروں اور غلاموں کے ساتھ وہاں پہنچا تو میزبان نے جو بہت بڑا تاجر اور مالدار آدمی تھا۔ مہمانوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا نہ صرف رومی عالم اور اس کے ساتھی تاجروں کی عزت کی بلکہ ان کے غلاموں سے بھی اسی طرح مصافحہ اور معانقہ کیا اور ان کو بھی اسی دستر خوان پر عزت و احترام سے بٹھانے لگا یہ بات رومیوں کو بڑی ناگوار گزری۔ ان کے غلام بھی بڑے حیران ہوئے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے آقا اور غلام میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ بڑی بے عزتی اور گستاخی ہے کہ غلام آقا کی برابری کرے۔ رومیوں کے غلام تو بڑے اصرار کے باوجود دستر خوان پر نہیں بیٹھے اور اپنے آقاؤں کے پیچھے دست بستہ کھڑے رہے۔ مگر انہوں نے دیکھا کہ مسلمان تاجر کے غلام جب دستر خوان پر ہر طرح کے کھانے اور لوازمات سجا دیئے تو بے تکلف اپنے آقا کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور مزے سے کھانے میں شریک ہو گئے۔ رومی عالم کو تو بڑی وحشت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ مسلمان تاجر نے اپنے غلام کی کھائی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اٹھا لئے اور یہ کہہ کر کھانے لگا کہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے رزق کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

رومی عالم اپنے وفد کو لے کر واپس آ گیا تو اس نے دربار میں اپنے سفر کی تفصیلات پیش کیں۔ اور اس کا اعتراف کیا کہ وہ اس اصل راز کو نہ جان سکا جو اسلام کی مقبولیت کا سبب ہے۔

مگر قیصر روم نے حمص کے اس واقعہ کو دوبارہ سنا اور اس پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا میں اس راز کو پا گیا ہوں۔ سب حیرت سے دیکھنے لگے۔ مگر اس نے کہا ابھی نہیں کچھ دن بعد میں بتاؤں گا۔ کچھ دنوں کے بعد جب دوبارہ یہ مجلس بیٹھی تو سب منتظر تھے۔ کہ قیصر، آج اس راز پر سے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

پردہ اٹھائے گا۔ مگر قیصر نے اس رومی عالم سے پوچھا تمہارے ساتھ جو غلام سفر پر گئے تھے اُن کا کیا حال ہے۔ رومی عالم نے بڑی شرمندگی سے کہا :

حضور! ان میں چند بھاگ گئے ہیں۔ جن میں ان کا نگران غلام بھی شامل ہے جس پر مجھے بڑا بھروسہ تھا۔ اور معلوم ہوا کہ وہ سب مسلمانوں کے ملک میں جا کر رہنے لگے اور مسلمان ہوگئے ہیں قیصر نے کہا۔ بس یہی راز مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کی مقبولیت کا ہے۔ کہ ان کے دین میں آقا اور غلام، امیر و غریب سب برابر کا درجہ اور حق رکھتے ہیں۔ یہ نہ ہوتا تو تمہارے غلام نہ بھاگتے نہ مسلمان ہوتے۔

"ایک اسلام" کی ابتدائی صدی کی بے شمار داستانیں ایمان وعمل کی وحدت کی مثال بن کر پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہیں گھٹا چھا جانے کی وجہ سے کوئی بزاز اس لیئے دکان بند کر رہا ہے کہ اندھیرے میں گاہک کو رنگوں کی پہچان میں دھوکا کھا جانے کا احتمال ہے۔ کہیں کوئی آن دیکھے ناواقف خریدار کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے کہ وہ اسے مال کی خرابی مال بیچنے سے پہلے بتانا بھول گیا تھا۔ اور کہیں کوئی خریدار لاکھوں روپے کا مال بیچنے والے کو واپس کر رہا ہے کہ تم نے نرخ کے اچانک چڑھ جانے کی لاعلمی میں مجھے یہ مال سستے داموں دے دیا ہے۔ الغرض نور السموات والارض کی جلوہ پاشیوں سے گھر گھر منور تھا۔ گلی گلی روشن تھی اور قریہ قریہ تابان و درخشاں تھا۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی کیوں نہ رہی یہ تاریخ کا طویل اور المناک باب ہے۔ ملوکیت نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے عروج کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ قارونیت اور ہامانیت اسے تقویت دے رہی تھیں نئے نئے افکار سیلاب کی صورت میں پھیل رہے تھے۔ مختلف علوم قدیم تہذیبوں کے لبادے اوڑھے ہوئے یورش کر رہے تھے۔ یونان کے فلسفہ امثال، روما کی شہنشاہیت، ایران کی نسل پرستی، عیسائیوں کی رہبانیت، یہودیوں کی سرمایہ پرستی، ہندوؤں کی براہمنیت اور ویدانت اور کلیسائی نظام کی پاپائیت کی تیز آندھیوں نے پہلے بزم رسالت کے چراغ بجھانے شروع کر دیئے۔ پھر عمل کی روشنیاں گل کر دیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے اولیائے کرام اور صوفیائے عظام نے عافیت اسی میں دیکھی کہ اپنے اپنے الگ مراکز قائم کر کے علم وعمل کے بجھتے ہوئے چراغوں میں تیل ڈالنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب رہے لیکن ان کے جانشینوں نے کامیابیوں کا رخ ذاتی اقتدار و وجاہت کی طرف موڑ لیا۔ اور خانقاہوں کی موروثی گدیاں قائم کر کے ایک ایسے نئے نظام کی بنیاد رکھ دی جو اسلام کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ اس طرح ایک اسلام کے دو اسلام ہو گئے۔ ایک خواص کا اسلام، دوسرا عوام کا اسلام جس کی طرف اشارہ مولوی جلال الدین رومی نے اپنے حکایت میں شکر اسلام کی زبانی کیا ہے۔ اب خواص اور عوام کے ان دو اسلاموں کا باہمی رابطہ دعا اور زر و مال کے آپس میں تبادلے کی صورت میں رہ گیا۔ پہلے جو بڑے بڑے مشائخ ہوا کرتے تھے ان میں سے کوئی روئی دھننے والا ہوتا تھا، کوئی پاپوش ساز ہوتا تھا، کوئی تیلی، کوئی پارچہ باف، کوئی معمار، کوئی آہن گر، کوئی نجار، کوئی تاجر، کوئی مزدور اور کوئی کسان ہوتا تھا یعنی دیانتداری کے ساتھ محنت اور مشقت کرنے والا بھی اور علم وعمل دونوں کا مکمل نمونہ بھی۔ مگر بعد کے گدی نشینوں نے اسلاف کے طریقے چھوڑ دیئے اور بزرگوں کے مزارات کو ذریعۂ آمدنی بنا لیا۔ ان گدی والوں سے آپ آج بھی پوچھ لیں کہ حضرت آپ کا پیشہ کیا ہے تو جواب ملے گا : پیری مریدی!

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کسے خبر کہ سفینے ڈبو گئی کتنے   فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

مولوی جلال الدین رومی کی حکایت میں تو خواص اور عوام کے دو اسلام تھے جن میں سے منکر اسلام کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔ آج خود مسلمانوں کے سامنے کتنے اسلام ہیں کیا کوئی بتا سکتا ہے؟ کیا کوئی یہ بھی بتا سکتا ہے کہ جس اسلام نے ہر زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا وہ کہاں ہے؟ جس اسلام نے اس دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی کے حسنات کی خوشخبری دی تھی اُسے کہاں ڈھونڈا جائے؟ جس اسلام نے توحید کے عقیدے کو قول و عمل کی وحدت سے عملاً مربوط کر دیا تھا وہ کس گلی، کوچے بازار، مدرسے، دفتر، ادارے، شہر، گاؤں یا ملک میں دیکھا جا سکتا ہے؟ جس طرح بایزید بسطامی کے زمانے کا گبر آنکھوں دیکھی مثال چاہتا تھا اور نظریاتی اسلام کا انکاری نہیں تھا اسی طرح آج کا مسلم نوجوان بھی اسلام کو الدّین کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے یعنی وہ اس مکمل ضابطۂ زندگی کا عملی نفاذ چاہتا ہے اس کے اصولوں، قدروں، ضوابط و قوانین اور ابدی صداقتوں سے اُسے انکار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ اسلام کے بنیادی ارکان توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد میں سے کون سا رکن کمزور رہ گیا ہے یا گر چکا ہے جس کی وجہ سے مسلمان اب اتنے مضبوط اور پختہ نظام کی عمارت کو نہیں سنبھال سکے۔ آئیے ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ کر لے یعنی اس کے قلب و نظر میں تبدیلی نہ آ جائے اس وقت تک اس کی خارجی زندگی میں بھی کوئی انقلاب نہیں آ سکتا (۸ : ۵۳)۔ انسانوں کی مفاد پرستیاں ایسے تصورات اور نظریات وضع کر لیتی ہیں جو معاشرے میں ناہمواریاں اور انتشار پیدا کر کے وجہِ ہلاکت و بربادی بن جاتے ہیں۔ لہٰذا انسانوں کو خود ساختہ معیارات کے پیچھے چلنے سے روکنے اور انہیں مستقل قدروں کی متابعت پر قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے لئے ضبط اور نظم و نسق کا ایک ایسا مضبوط نظام ہو جو باہمی تادیب، احتساب اور اصلاح کے مسلسل اور غیر منقطع عمل کے ذریعے کسی کو بھی راہِ راست سے منحرف نہ ہونے دے۔ قرآن حکیم نے سابقہ اقوام کی ہلاکت و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد کر دیا ہے کہ:

"ان میں ایسے لوگ نہ رہے تھے جو دوسروں کو ملک میں فساد کرنے سے روکتے" (۱۱ : ۱۱۶)

بالکل یہی صورت نظامِ اسلام کو پیش آئی۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ اسی لئے اللہ کے ہاتھ میں رہتا ہے کہ جب کبھی آدمی نے خدا کی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی ہے بحر و بر میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہوا ہے۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور پیشوائیت چونکہ یک مقصد ہوتے ہیں اس لئے اتحاد کر کے ایک ایسے حلقے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو ہر وقت اقتدار پر اپنا قبضہ جمائے رہنے کی فکر میں رہتا ہے۔ جب تک نظامِ اسلام ایک رہا یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ فرد سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ فرد تک نظم و ضبط کا پابند تھا اور قرآنی اقدار کو ہر قیمت پر تحفظ دیتا تھا۔ اقتدار پرست حلقے کو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کسی سے اپنے "خود ساختہ" قوانین منوا سکے۔ لیکن جونہی ملوکیت نے زور پکڑا اور پیشوائیت و قارونیت کے تعاون سے بیرونی تصورات اور افکار علم الکلام کا موضوع بن گئے، شکوک و شبہات کو حصارِ ایمان میں رخنے ڈالنے کا موقع مل گیا اور اس طرح عمل میں جو پختگی تھی وہ کمزور پڑ گئی۔ اب ان تینوں کو روکنے والا کوئی نہ رہا اور پھر ہر طرف سے جو سیلاب اُمڈ پڑے ان کے آگے کوئی بند بھی نہ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com   http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ٹھہر سکا۔

روکنا اور منع کرنا بھی ایک ضروری عمل ہے اگرچہ منفی اقدام اس وقت تک مؤثر نہیں ہوتا جب تک اس کی تکمیل مثبت اور تعمیری تعلیق کی اضافت سے نہ کی جائے۔ توراتِ موجودہ میں ایک جگہ مذکور ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے ایک پیغمبر یوشع کو خدا نے خبر دی کہ میں تیری امّت میں سے ساٹھ ہزار بدکاروں کو اور چالیس ہزار نیک لوگوں کو ہلاک کردوں گا یوشع نبی بہت پریشان ہوئے۔ عرض کی: اے میرے پروردگار! تو چالیس ہزار نیک لوگوں کو بھی ہلاک کرے گا؟ وہ تو تیرے عبادت گزار بندے ہیں۔ جواب ملا "ہاں" ہلاک کردوں گا کیوں کہ یہ لوگ میری ناراضگی کے موقع پر ناراض نہیں ہوتے سرکشوں اور نافرمانوں کو روکتے نہیں، دھتکارتے نہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ کا ارشادِ گرامی ہے: "ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کرو"۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے، ظالم کی مدد کیا ہوگی۔ فرمایا: اسے ظلم کرنے سے روکو۔ یہ حکم قطعی ہے۔ کوئی مسلمان اپنی اصلاح کر کے نہ بیٹھا رہے بلکہ ایک دوسرے کو سمجھاتا رہے۔ بلکہ ایک دوسرے کی اصلاح کرتا رہے، بھائی بن کر، دوست بن کر، ہمدرد اور خیر خواہ بن کر۔

"اسلام" مذاہبِ عالم کی تاریخ میں ارتقائی عمل کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ فرقوں سے آزاد، نسلی تعصبات سے پاک اور مذہبی عقیدتوں کی جکڑبندیوں سے مبرّا ایک ایسا دین ہے جو عالمگیر سطح پر انسانیت کو زمان اور مکان کی پابندیوں سے بالاتر لے جا کر ایک نقطۂ اتحاد پر منظم کر دیتا ہے۔ اس طرح انسانوں کے ہاتھوں سے قوت و اقتدار چھین کر اس کے اصل مالک کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور اس اطاعت میں کسی آمیزش کی ذرا بھر بھی گنجائش نہیں ہے۔

تسلیم و اطاعت کے بنیادی عناصرِ ترکیبی میں سے سب سے پہلے ایمان ہے۔ ایمان کسی بات کی سچائی کو دل کے پورے سکون اور ذہن کے پورے اطمینان کے ساتھ مان لینا اور اس پر اعتماد اور بھروسہ رکھنا۔ انسانی زندگی کی پوری عمارت بعض اٹل حقیقتوں پر یقین رکھنے سے قائم رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں ریاضی کا کوئی مسئلہ حل نہ ہوگا۔ یا جب تک یہ نہ مان لیا جائے کہ زہر مار ڈالتا ہے، آگ جلا دیتی ہے، پانی ڈبو دیتا ہے وغیرہ، اس وقت انسان کی مادّی زندگی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا جس طرح مادّی زندگی کے تحفظ و ارتقا کے لئے کچھ اٹل اصول و قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح انسان کی روحانی زندگی کے لئے بھی کچھ غیر مبدّل قوانین و ضوابط مقرر ہیں جنہیں ہم بار بار مستقل قدروں کا نام دیتے آتے ہیں۔ جب تک ان مستقل قدروں کو "صداقت" کی صورت میں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ روحانی زندگی اپنے تحفظ اور ارتقا کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے گی۔ تاہم صرف "تسلیم کر لینا" ہی کافی نہیں ہے اگر ہم زبان سے ہی نہیں دل سے تسلیم کر کے بھی زہر کی ہلاکت آفرینی کا اقرار کرتے رہیں لیکن عمل اس اقرار کے خلاف کریں تو ہم ہلاک ہونے سے نہیں بچ سکتے۔ صداقتوں کا زبانی اقرار، خواہ اس کے پیچھے یقین کی پوری قوت ہی کیوں نہ ہو، کچھ فائدہ نہیں دیتا جب تک اعمال انسان کے یقین کی گواہی نہ دیں۔ کہنے کو تو سبھی لوگ کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے اور سچ بولنا اچھی بات ہے۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو دل سے اس یقین کو اپنے عمل سے بھی ثابت کرتے ہیں چونکہ قول اور عمل

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں تضاد ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو کسی پر اعتماد نہیں رہتا۔ جب باہمی اعتماد نہ رہے تو پھر دنیا کے علائق اور روابط میں خرابیاں ہی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس مثال کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ فرض کیا کوئی شخص یہ تسلیم نہیں کرتا کہ سچ بولنا اچھی بات ہے۔ اب اگر وہ اتفاق سے یا کسی مصلحت کے تحت سچ بولے گا بھی تو لوگ اس پر اعتماد نہیں کریں گے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں صورتیں خرابی کی ہیں۔ لہٰذا صحیح اصول یہ ٹھہرا کہ:-

۱۔ صداقتوں کو دل و جان سے تسلیم کیا جائے

۲۔ اپنے اس یقین کو عمل کی شہادت سے صحیح ثابت کیا جائے کیونکہ عمل اور صرف عمل ہی ایمان کو نتیجہ خیز بناتا ہے۔

عمل کا لفظ عام طور پر اس کام کے لئے جاتا ہے جو کسی ذی روح یعنی صاحب شخصیت سے ارادۃً ظاہر ہو اور محض ہنگامی طور پر سرزد نہ ہو۔ وہ کام جس کا محرک انسان کا ایمان نہیں ہوتا وہ میکانکی سطح کا کام ہوتا ہے۔ عادتاً یا رسماً یا دوسروں کی دیکھا دیکھی یا اتفاقاً یا ہنگامی طور پر رونما ہونے والے اعمال سے کسی تعمیری نتیجہ خیزی کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان میں نہ تو دل و دماغ کی رضامندی شامل ہوتی ہے اور نہ یہ شعوری طور پر بالارادہ ظاہر ہوتے ہیں۔

عمل صالح یعنی اچھا کام وہ ہے جس سے انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں نشوونما پا جائیں۔ اور جس سے پوری نوع انسانی کی ناہمواریاں دور ہو جائیں۔ جس کسی چیز کو جس حال میں ہونا چاہیئے اس کا ٹھیک اسی حال میں ہونا اَلصّلاح ہے۔ صالحین وہ لوگ ہیں جو ناہمواریاں دور کر دیتے ہیں، معاملات کو سنوار دیتے ہیں۔ عمل کے صحیح ہونے کا پہلا معیار ہی یہ ہے کہ انسان کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کو ابھارے اور پوری انسانیت کے لئے نفع بخش ہو۔ اس قسم کا عمل دوسروں کے لئے بھی نمونہ بنتا ہے اور اس بات کا یقین بھی پیدا کرتا ہے کہ دوسرے بھی اپنے اعمال کو اسی سانچے میں ڈھالیں گے کیونکہ عمل صالح کے اندر از خود یہ قوت موجود ہے کہ یہ اپنی صداقت کو زود یا بہ دیر دوسروں سے منوالے۔ رومی غلاموں کے بھاگ جانے کے واقعے میں اس قوت کا اثر آپ دیکھ چکے ہیں۔

قرآن کریم کا حکم ہے کہ صبر و صلوٰۃ سے تقویت حاصل کرو۔ صبر کے معنے استقامت کے ہیں یعنی اپنے صحیح عمل کے نتیجہ خیز ہونے کی بنا پر قائم رہنا اور اس کے لئے ہر مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ صلوٰۃ تسلیم و رضا کی آخری منزل ہے لہٰذا صبر و صلوٰۃ دونوں پر قائم رہنے سے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ صداقتوں پر یقین نہ رکھنے والے اپنی روش کو نہ بدلیں۔ ایمان اور عمل صالح یقیناً ایسی فعال قوت پیدا کر دیتے ہیں جو ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات میں حق کو باطل پر غالب رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ عمل صالح کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کوئی بھی ایسا کام نہ کرے جو اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی نشوونما میں رکاوٹ کا باعث بنے یا جس سے معاشرے میں کسی بھی قسم کی ناہمواری پیدا ہو جانے کا احتمال ہو۔ وہ اس ضمن میں بھی دوسروں کے لئے نمونہ بنے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ دوسرے لوگ اس کے طرز عمل کو اپنا کر اسی کی سیرت کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ خاص طور پر اساتذہ اور والدین کو بہت محتاط رہنا چاہیئے کیونکہ بچے ایک ایک تفصیل میں ان کی نقالی کرتے ہیں۔ اس یقین کو کہ دوسرے بعینہٖ اس کے نقشِ قدم پر چلیں گے وہ قوت مستحکم رکھ سکتی ہے جو برائی کو سختی سے رد کر دینے کے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نتیجے میں انسانی شخصیت کے اندر خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں قوتیں یعنی ایک وہ جو مثبت عمل پر ثابت قدم رہنے سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری وہ جو منفی اعمال کو شدت کے ساتھ رد کر دینے سے ابھرتی ہے مل کر ہر قسم کی ناانصافی اور ظلم کا استیصال کر دیتی ہے اور اس طرح انسان ان تمام غلامیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے صحیح معنوں میں آزاد فضاؤں میں سانس لینے لگ جاتا ہے۔

اسلام اسی خصوصیت کی بنا پر "عام مذاہب" سے بالاتر ہو کر "الدین" کی آخری ارتقائی سطح پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے پاس ایمان اور عمل صالح دونوں کے استحکام کے لئے ایک واضح اور قابل عمل نظام موجود ہے جو کسی دوسرے مکتب فکر کے ہاں نہیں ملتا۔ اور جس کے لئے حکومت سے لے کر معاشرے کے ہر فرد کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس پروگرام کو جسے قرآن حکیم کا "لازمی تعلیم کا پروگرام" کہنا چاہیئے۔ اصطلاحاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ یہ اسلام کے بنیادی ستونوں یعنی توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کو باہم مربوط اور منسلک رکھنے کا سب سے بڑا ستون ہے۔ اور اسی عظیم الشان نظام کا اہم ترین حصہ ہے جس کا اعلان یہ ہے کہ اسلام پوری انسانیت کے لئے زندہ و پائندہ دین ہے۔ اس ستون کے کمزور ہو جانے سے باقی ارکان بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔

امر کے بنیادی معنے ہیں علامت، نشانی اور رہنمائی۔ یہ لفظ مشورہ دینے اور مشورہ کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے تاہم اس کے عام معنے ہیں حکم دینا۔

معروف جانی پہچانی چیز کو کہتے ہیں۔

نہی کے معنے ہیں روکنا، منع کرنا، باز رکھنا

منکر معروف کی ضد ہے ہر وہ چیز جو پہچانی نہ جائے مثلاً عقل کی فریب کاری، عیاری، چالاکی، جھوٹ کا وہ لباس جو اسے چھپا دیتا ہے، ہر وہ بات جو اپنی ظاہری چمک دمک سے اپنی اصلیت کو چھپا لے، منکر میں شامل ہو گی۔

امر اور نہی کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اور باز رکھنا صرف وعظ و نصیحت تک محدود نہیں رکھا جا سکتا بلکہ اسے قانون کی حیثیت دیکر حکومت کے فرائض میں شامل سمجھا جائے گا۔ قرآن حکیم کا اہل ایمان کے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین پر اقتدار حاصل ہو گا تو یہ صحیح کاموں کا حکم دیں گے اور غلط کاموں سے روکیں گے۔" (۴۱:۲۲)۔ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد!

دین اسلام میں حکومت اور اقتدار کا حاصل کرنا انتہائی ضروری قرار دیا گیا ہے تو اسی لئے کہ قوت و اقتدار کے بغیر کسی بھی قانون کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ حکومت اور اقتدار کا حصول مقصود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ یہ چند اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ان چند اعلیٰ تر مقاصد میں سے بعض یہ ہیں:۔

۱۔ نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا (۲:۲۱۳)

۲۔ افراد اور معاشرے کو اللہ کے مقرر کردہ قوانین کی تعلیم دینا، علم اور بصیرت کی رو سے ان قوانین کی غرض و غایت سمجھانا اور ایک ایک فرد کے لئے اس کی طبعی اور انسانی سطح کی زندگی کی نشو و نما کیلئے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سامان مہیا کرنا (۲:۱۵۱)

۳۔ پوری انسانیت کیلئے عدل و مساوات قائم کرنا تاکہ ہر ایک کو فلاح نصیب ہو اور کوئی اس سے محروم نہ رہے۔ (۲:۱۵۶ - ۴:۱۰۹ - ۳:۱۰۹)

۴۔ صحیح آزادی عطا کرنا جو انسان کی خود ساختہ پابندیوں کو توڑ ڈالنے سے حاصل ہوتی ہے۔ (۷:۱۵۷)

۵۔ تمام مذاہب کی آزادی، ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت، نظامِ صلوٰۃ کا قیام اور پوری نوعِ انسانی کے لئے سامانِ نشوونما کی فراہمی (۲۲:۴۰)

۶۔ اس کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پروگرام جاری رکھنا تاکہ اصلاح کے عملِ مسلسل میں کہیں جھول پیدا نہ ہو جائے۔

مومنین، جن میں ہر طبقے کے لوگ یعنی مرد، عورت اور بچے بھی شامل ہیں، انسانیت کو وسعت و ارتقا دینے والے پروگراموں، منصوبوں اور عملی کاموں میں ۔۔۔ جو قوانینِ ربانی کی حفاظت کرتے ہیں ۔۔۔ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے (۵:۲) اور اس طرح لازمی تعلیم کا یہ قرآنی پروگرام تعمیری نتائج پیدا کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن حکیم نے پوری اُمتِ مسلمہ کو خطاب کر کے اس طرح ذمہ دار ٹھہرایا ہے:

۱۔ "تم کو بہترین اُمت بنا کر وجود میں لایا گیا ہے۔ پوری انسانیت کے لئے۔ تاکہ تم جانے پہچانے اچھے کاموں کا حکم دو اور ناپسندیدہ کاموں سے روکو۔ اور اللہ پر ایمان رکھو۔ (۳:۱۱۰)

۲۔ "مومنین وہ ہیں جو اللہ کی طرف رجوع رکھتے ہیں، اسی کی اطاعت کرتے ہیں، اُسی کی حمد کرتے ہیں، اُسی کی راہ میں جادہ پیمائی کرتے ہیں، اُسی کے حضور جھک جاتے ہیں اور اُسی کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔ اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کی حفاظت کرتے ہیں۔" (۹:۱۱۲)

اچھے کاموں کا حکم دینا اور بُرے کاموں سے روکنا پوری جماعت مومنین کا فرض ہے۔ تعلیم کا کوئی پروگرام مطلوبہ نتائج برآمد نہیں کر سکتا جب تک اس کو کامیاب بنانے میں معاشرے کا ہر فرد برابر کا شریک نہ ہو۔ وہ لوگ جو تعلیمِ اطفال یا تعلیم بالغان میں خصوصی دلچسپی اور مہارت رکھتے ہیں اس حقیقت کو بخوبی جانتے اور پہچانتے ہیں کہ درس گاہ اور معلم و مدرس کی حیثیت تعلیمی پروگراموں کو آگے بڑھانے میں محض ایک ایجنسی کی سی ہے جو دوسری ایجنسیوں مثلاً گھر، ہمجولی، اہلِ محلہ، معاشرے کے دوسرے افراد، مختلف پیشہ ور لوگوں، بزرگوں اور ابلاغ عامہ کے اداروں کے ماحول تک کے تعاون سے ہی تعلیمی عمل کو کامیاب بناتی ہے۔ اگر ان تمام معاون ایجنسیوں میں سے کوئی ایک بھی غیر فعال ہو جائے یا تعلیم کے مقاصد کے منافی چلنا شروع کر دے تو آنے والی نسل کی تعلیم نہ صرف ادھوری بلکہ بے حد ناقص رہ جائے گی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان تمام معاونین کا مطمحِ نظر ایک ہو، مقصدِ زندگی ایک ہو، اندازِ فکر ایک ہو، قول اور عمل ایک ہو اور سب کے سب متفق اور متحد ہو کر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں رہیں۔ اسی لئے جماعت مومنین

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کو بار بار تلقین کی گئی ہے کہ:

"تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں بٹ نہ جاؤ۔ اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تمہیں عطا کی جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اللہ نے تمہارے دلوں کو محبت کے رشتوں سے جوڑ دیا اور اب تم اس کی نعمت کی بدولت بھائی بھائی ہو تم آگ کے کنارے پر کھڑے تھے لیکن اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اسی طرح سے اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاتے رہو۔ تم میں سے ایک امت ایسی ہونی چاہیئے، جو اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے باز رکھے یہی ہوں گے وہ لوگ جو فلاح یافتہ ہوں گے ...... ان لوگوں کی مانند نہ ہو جاؤ جو آپس میں متفرق ہو جاتے ہیں اور واضح نشانیاں پا لینے کے بعد بھی اختلافات میں پڑ جاتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ (۳:۱۰۳-۱۰۵)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا میں کہ "اے اللہ میرے علم کو بڑھاتے رہیو" ایک بہت بڑی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ تعلیم ایک ایسا عمل مسلسل ہے جو عمر کے کسی مرحلے پر بھی ختم نہیں ہوتا، زندگی کے آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ چونکہ انسان کو شخصیت مکمل صورت میں نہیں ملی صرف قابل حصول امکانات (REALIZABLE POTENTIALITIES) کی صورت میں عطا ہوئی ہے اس لئے اس کے تعلیم و تربیت کے عمل کو بھی غیر مختتم بنا دیا گیا ہے۔ چونکہ قابل حصول امکانات کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ اس لئے نشوونما کا عمل عمر کے کسی بھی حصے میں آکر رک نہیں سکتا۔ اگر رک جائے تو اس سے انسانی ذات کے امکانات کی نفی ہوتی۔ مرنے سے پہلے توبہ کی قبولیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ اصلاح کے امکانات کسی بھی مرحلۂ عمر پر ختم نہیں ہوتے۔ اگر ایسا سمجھ لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ انسان کی کمزوریاں اور ناپختگیاں اس کی طبیعت پر غالب آجائیں اور وہ اپنے مقام انسانیت سے نیچے گر جائے۔ حیوانوں کی ضروریات تمام کی تمام طبعی ہیں اس لئے ان کے سدھانے کا عرصہ یا سیکھنے کی مدت بہت کم ہے۔ اس تھوڑی سی مدت میں انہیں جو کچھ سیکھنا ہوتا ہے وہ سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن انسان کے طبعی اور روحانی امکانات و تجربات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ پیر شو بیاموز۔ لیکن اس آموختن کے لئے اسے زیادہ عرصے تک تعلیمی اداروں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں کے بعد کوئی ایسا نظام ہو جو اسے ضبط اور نظم کی حدود سے باہر نہ نکلنے دے۔ دریا کی شوکت و قوت اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ کناروں کے اندر رہتا ہے۔ جونہی یہ اپنے کناروں سے باہر آیا اس کے پانیوں کو یا تو خشک ریگزاروں نے جذب کر لیا یا ہواؤں نے اڑا لیا۔ یا پھر گڑھوں نے انہیں اپنے اندر مقید کر لیا اور یہ متعفن ہو گئے نظام الصلوٰۃ اور نظام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایسے مضبوط کنارے ہیں جو اسلام کی جوئے حیات بخش کی روانی کو قوت و زندگی عطا کرتے ہیں۔

اسلام کے ارکان نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی منفعت بخشیوں سے تو کوئی غیر مسلم بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ دین اسلام

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نے ان کو لازمی تعلیم کا اہم ترین جزو بنا کر جن عظیم حکمتوں کو مشہود بنا دیا ہے وہ اوسط درجے کے علم و فہم کے آدمی کو بھی سیدھے راستے سے منحرف نہیں ہونے دیتیں بلکہ اسے روزمرّہ کی عام روش پر بھی متوازن اور متناسب رکھتی ہیں۔

ان ارکان خمسہ کو باہم مربوط و منظم رکھنے کے لئے جو باہمی اصلاح و تادیب و احتساب کا نظام دیا گیا ہے وہ اتنا مؤثر اور نتیجہ خیز ہے کہ کسی سہو یا فراموشی تک کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ نظام داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں میں پختہ رہنمائی کی ضمانت دیتا ہے اور رہنمائی بھی وہ جو ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے مل سکتی ہے، ایک خیر خواہ دوست کو دوسرے خیر خواہ دوست سے حاصل ہوتی ہے۔ پرخلوص، محبت آمیز، بے لوث اور مشفقانہ رہنمائی۔ گاہک ہے تو دکاندار، دکاندار ہے تو گاہک، اُستاد ہے تو شاگرد، شاگرد ہے تو اُستاد، افسر ہے تو ماتحت اور ماتحت ہے تو افسر، غرض ہر عاقل بالغ شخص، خواہ مرد خواہ عورت، اپنے اپنے مرتبے اور مقام پر اس قرآنی حکم اور فریضے کی تعمیل اور تکمیل میں لگا ہوا ہے۔ اعمال کی قریب ترین زاویے سے نگرانی کی جا رہی ہے لیکن غیروں سے نہیں اپنوں سے اور بغیر کسی رنج و ملال، بغض و عناد، یا انتقام کے منفی جذبات کے تحت کی جا رہی ہے۔ اصلاح، تادیب اور احتساب کو قبول بھی تشکر و امتنان کے جذبے سے کیا جا رہا ہے کیونکہ دونوں طرف سے دل صاف ہیں اور کسی کی نیت پر کسی کو کوئی شک تک نہیں پیدا ہوتا۔ کیا اب بھی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کے ارتکاب کی؛ قریب قریب ناممکن ہے کہ کوئی معاشرتی برائی باقی رہ جائے کوئی جرم واقع ہو، کوئی کسی پر ظلم کرے، کوئی اپنی حد سے آگے بڑھ جائے، کوئی کسی کا حق مارے، کوئی کسی کے درجات میں کمی کرے یا کوئی عقل اور جذبات کی دسیسہ کاریوں سے فریب کھا جائے۔

آج ہم معاشرتی برائیوں کی طغیانیوں میں اس حد تک گھرے ہوئے ہیں کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی ممکن ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ درست ہے کہ دنیا سے کوئی برائی بالکل ناپید نہیں ہو سکتی کیونکہ ابلیس انسان کو آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں، گھیرے میں لینے کے لئے ہر وقت گھات میں رہتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اٹل ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جن کا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا، غرض دنیا کا ہر عمل صرف اور صرف اللہ کے احکام و قوانین کی تعمیل کے لئے وقف ہے اُن مردانِ حُر کی سیرت و کردار کی پختگی کے سامنے ابلیس اور اس کے رفقاء صید زبوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

"ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں سب ایک دوسرے کے اولیاء ہیں (یعنی دوست، محافظ، خیر خواہ، معاون، مددگار) یہ معروف کاموں کا حکم دیتے ہیں اور ناپسندیدہ بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔ یہ الصّلوٰۃ کو قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں"۔ (۹ : ۷۱)

اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم قرآن حکیم میں کم و بیش ۳۲ مقامات پر آیا ہے۔ اسلام "انفرادی پرستش" سے بالاتر ہو کر ایک اجتماعی نظام ہے۔ اجتماعی نظام میں ضروری ہے کہ افراد کسی مرکزی اتھارٹی کے فیصلوں کے پابند ہوں۔ یہ مرکزی اتھارٹی جس نے تاریخ انسانیت میں سب سے پہلی بار نظام اسلام کو قائم کیا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تھی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اللہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اللہ ہی کے احکام و قوانین کی اطاعت کراتے تھے۔ اس اطاعت کا نام "اللہ و رسول" کی اطاعت ہے۔ اس نظام کو دینِ اکمل کی صورت میں تاقیامت جاری و نافذ رہنا تھا۔ صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دنیاوی حیاتِ طیبہ تک محدود نہیں رہنا تھا۔ اسے آگے چلنا تھا۔ چنانچہ یہ آگے چلا۔ مرکزی اتھارٹی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جانشین یعنی خلفائے راشدین قرار پائے۔ اب ان کی اطاعت بمنزلہ اطاعت "اللہ و رسول" تھی۔ کیونکہ "خلافت علیٰ منہاج النبوّت" ہی نظامِ اسلام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ اس ضمن میں خلیفۂ اول حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عہدہ خلافت سنبھالتے ہی جو پہلی تقریر کی تھی وہ بہت اہم ہے۔ آپ نے فرمایا: "اے لوگو! جب تک میں اللہ و رسول کی متابعت کرتا رہوں تم پر میری اطاعت فرض ہوگی۔ اگر میں اللہ و رسول کی متابعت نہ کروں تو تم پر میری اطاعت کرنا لازم نہ ہوگا۔"

اسلام پھر اس وقت اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ سامنے آئے گا جب اسلامی معاشرے میں ایسا نظام قائم ہو جائے گا جس میں اللہ کے احکام و قوانین کی اطاعت ایک ہی مرکزی اتھارٹی سے منسلک ہو جائے گی۔ اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی نہ چلا سکے گا۔ یہ اتھارٹی مومنین میں سے اُولی الامر بن کر ابھرے گی اور قرآنی احکام و قوانین اور اقدار و ضوابط کے عملاً نفاذ کا ذریعہ بنے گی۔ اسلامی نظامِ حکومت بحیثیتِ مجموعی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی آئینہ دار ہوتی ہے جن کا تعلق انسانوں سے ہے یعنی ان ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ضمن میں اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ لہٰذا جس نظام میں صمدیت، ربوبیت اور رحمت پائی جائے اسی کو اقتدار حاصل ہوتا ہے اور اسی کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔ یہ نظام سمیع اور بصیر اور علیم اور حکیم اور کریم اور عزیز جیسی صفاتِ قدسیہ سے منور و تاباں ہو کر اپنے ارکان کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا چلا جاتا ہے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی کمزوری کے آثار پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اگر کوئی رکن کمزور رہ گیا تو فلاحِ عمومی جس کا لازمی منطقی نتیجہ خوف اور حزن کا خاتمہ ہے، حاصل نہ ہو سکے گی اور حکومت اپنے مقصد میں ناکام رہ جائے گی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآنِ حکیم کے احکام و قوانین کے ایک ایک حرف پر عمل کر کے اور مثالی اُمت قائم کر کے ساری دنیا کو بتا دیا تھا کہ اللہ کے احکام کی تعمیل یوں ہوتی ہے۔ اب اُمتِ مسلمہ کا فرض ہے کہ اسی نظامِ محمدی کو ایک بار پھر متشکل کر کے دنیا کو دکھائے کہ قرآنی معاشرہ، قرآنی نظامِ حکومت و سیاست، قرآنی نظامِ عدالت، قرآنی نظامِ اخوت و مساوات اور قرآنی طرزِ زندگی یوں ہوتا ہے اور اللہ و رسول کی اطاعت کے کیا معنے ہیں۔ اب یہ فریضہ فرداً فرداً اور اجتماعاً ان لوگوں کا بنتا ہے جو اسلام کے دعویدار ہیں۔ مرکز سے وابستگی بھی اسی فریضے کی یاد دہانی کی علامت ہے۔

جب خانہ کعبہ کو جماعتِ مسلمین کا قبلہ مقرر کیا گیا تو وحی نازل ہوئی کہ اس طرح ہم نے تم کو "اُمّۃً وّسطاً" بنا دیا ہے تاکہ تم پوری نوعِ انسانی کے سامنے نمونہ بنو اور رسول تمہارے لئے نمونہ بن جائے (۲:۱۴۳)۔ وسطاً کے بہت سے معنے ہیں۔ ان میں سے ایک معنیٰ مرکزیت کا مفہوم لئے ہوئے بھی ہے۔ مرکز وہ مقام ہوتا ہے جو اپنے محیط کے ہر مقام سے برابر فاصلے پر ہو۔ اُمتِ مسلمہ اپنے مکمل اور بے عیب نظامِ زندگی کی وجہ سے ہر آنکھ کا محور ہے۔ چونکہ یہ نظام زمان اور مکان کی قیود سے بلند تر ہے اور ہر زمانے اور ہر مقام کے لئے مثالی ہے اس لئے تمام مکاتبِ فکر اور نظریاتِ حیات کی نگاہیں اسی نظام کی طرف لگی رہتی ہیں۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دُنیا میں کئی نظام پیدا ہوئے ہیں اور ختم ہو گئے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی دوبارہ زندہ کرنے کی تمنا نہیں کی جاتی۔ اسلام صحیح معنوں میں ۳۵ ہجری تک "اللہ و رسول" کی اطاعت کا مثالی نمونہ بنا رہا۔ پھر بعض ناگفتہ بہ حالات نے اسے اُبھرنے نہ دیا۔ تاہم یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آج چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے دوبارہ نافذ کرنے کی آرزو مُسلم اور غیر مسلم دونوں کے دلوں میں تڑپ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی عقل نے جتنے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ نظریات اور تصورات کی بنیاد پر نظام ہائے وضع کئے ہیں وہ کسی کے لئے بھی وجہِ اطمینان نہیں بن سکے۔ جب تمام سابقہ اور موجودہ نظاموں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو ہر منکرِ اسلام ہی کو ان سے بہتر پاتا ہے۔ کیونکہ نظریاتی سطح پر بھی اور عملاً نافذ ہو سکنے کی بنا پر بھی تمام ابدی صداقتوں کا سرچشمہ یہی دینِ قیم ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر جماعتِ مومنین کے ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اخلاقِ حسنہ کی انتہائی بلندیوں پر ہو اور اپنے فکر، قول اور عمل کی وحدت سے اپنے مُسلم ہونے کا ثبوت پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح افراد کو باز آفرینی کا موقع دیتا ہے اسی طرح اس کا قانونِ مہلت اقوام پر بھی نافذ العمل رہتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے تو واضح الفاظ میں تنبیہہ کر رکھی ہے کہ اگر تم اس نظام کو نہیں چلا سکو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ کیونکہ اُسے تو بہر حال اپنا نظام چلانا ہے اور دینِ اسلام کو تمام دوسرے مذاہب و ادیان پر غالب کرنا ہے۔ اللہ کے ہاں کا دن ہمارے ان کے دن کے مقابلے میں ہزار سال کا بلکہ اس سے بھی زائد ہوتا ہے۔ لہٰذا جس روش پر اس وقت قومِ مسلم چل رہی ہے اس کو چھوڑنا ہوگا اور "اللہ و رسول" کی اطاعت کو لفظاً نہیں معناً اختیار کرنا ہوگا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی جس کا اپنا عمل ناقص ہو یا جس کا کوئی بھی قول یا فعل اس کے ایمان کی عکاسی نہ کرے۔ دنیا میں پند و نصائح کی کتابوں کے دفتر کے دفتر موجود ہیں، سنہری اقوال ہزاروں اور لاکھوں کُتبوں کی صورت میں گھر گھر آویزاں ہیں۔ اچھی باتوں کی تلقین کرنے والوں کی دھواں دھار تقریروں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بُرے کاموں سے روکنے والے بھی کئی کئی منظم اداروں کی صورت میں کام کر رہے ہیں لیکن ان انتظامات کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ لوگ ان تمام باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مشاعروں کی طرح داد دے کر اور واہ واہ کے ڈونگرے برسا کر منتشر ہو جاتے ہیں اور پھر اسی روش پر چلتے رہتے ہیں جس پر چلنے کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔ اس اثر ناپذیری کی وجہ یہ ہے کہ نیکی کی تلقین اور بُرائی سے منع کرنے والے کا اپنا عمل اس کے قول کی تائید نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ مفادِ عاجلہ کی کشش اتنی زبردست اور اس کی پیش پا افتادہ لذّات کی گرفت اتنی سخت ہے کہ اگر آپ انتہائی خلوصِ دل سے بھی کسی کو بُرائی سے رُک جانے کی تلقین کریں تو سب سے پہلے وہ آپ کو یہی جواب دے گا کہ میاں تم کون ہوتے ہو ہمیں سمجھانے والے؟ جاؤ اپنی راہ لو۔ بڑے آئے ہیں نصیحت کرنے والے! لیکن اگر آپ کی سیرت و کردار کی تیز کرنیں دشمنوں کے پار اُتر جانے کی قدرت رکھتی ہیں، اگر آپ کے خلوص، محبت، ہمدردی اور نیت کی صداقت میں شدت ہے اور اگر آپ کی بے لوث

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جدوجہد کا آئینہ بے داغ ہے تو ممکن نہیں کہ آپ کا قول تو کیا ابرو سے چشم کا اشارہ بھی خالی چلا جائے۔ اسلامی نظام اپنے معاشرے کے ہر فرد کو اسی مقام پر دیکھنا چاہتا ہے اور اس نظام کے قیام کا ایک ذریعہ یہی ہے جسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مسلسل تعلیمی پروگرام کہا گیا ہے۔

اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے متعدد اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ ہر اسلامی معاشرہ اپنے مخصوص حالات کے مطابق ایسے اصول وضع کر سکتا ہے جن سے یہ پروگرام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس سلسلے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک سے ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں بھی ہے اور جو آج کے دور میں بھی موثر بن سکتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر رومی حکومت نے چاہا کہ اس قوت کو یہیں دبا دینا چاہیئے، ایک عیسائی خاندان رومی حکومت کے زیر اثر شام پر حکمران تھا۔ رومی سلطنت نے اسے اس مقصد کے لئے متعین کر دیا اور لڑائی کے لئے بڑی تیاریاں شروع کر دیں جن کی تفاصیل شامی سوداگروں کے ذریعے سارے عرب میں پھیل گئیں۔ جب مدافعت ضروری ہو گئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی فوج تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ موسم سخت گرم تھا اور سوئے اتفاق سے ملک میں قحط سالی بھی تھی لہٰذا یہ مہم "خلوص" اور "منافقت" کے درمیان آزمائش بن گئی۔ ایک طرف صحابہ کرام کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ بھی جس کے پاس تھا وہ لے کر حاضر ہو رہا تھا۔ تاہم مجاہدین کے لئے سواریاں تک بھی پوری نہ تھیں۔ دوسری طرف منافقین عجیب و غریب بہانہ سازیوں سے جنگ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی مجبوریوں کا عذر پیش کر کے جنگ سے رخصت کی اجازت مانگتے رہے۔ ان منافقین کے علاوہ ایک گروہ عرب کے صحرا نشینوں کا بھی تھا جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ایمان ابھی ان کے دلوں کی گہرائیوں میں نہیں اترا تھا۔ بعض صورتیں واقعی معذوری کی بھی تھیں۔ تاہم ایسے لوگوں کو جو جنگ میں شریک ہونے کی ہر طرح سے استطاعت رکھتے تھے اور بے وجہ بہانہ تراشی کر رہے تھے کس طرح اجازت دی جا سکتی تھی۔ مقابلہ چونکہ بازنطینی شہنشاہیت سے تھا اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تیس ہزار کا لشکر جرار لیکر شام کی طرف روانہ ہوئے۔ تبوک کے مقام پر جا کر معلوم ہوا کہ اگرچہ رومیوں میں ہلچل ضرور پیدا ہو چکی تھی تاہم فوری حملے کا ابھی کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیس دن قیام کے بعد واپس تشریف لائے۔ یہاں آپ کے سامنے پیچھے رہ جانے والوں کا معاملہ پیش ہوا۔ یہ اندازاً "اسّی" آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی معذرت پیش کی جو قبول ہوئی لیکن تین صحابۂ کرام ایسے تھے جن کے لئے وحیٔ ربانی کے حکم کا انتظار کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک کعب بن مالک تھے۔ ان کا واقعہ خلوص اور سچائی کا ایسا مرقع ہے کہ آج بھی اس کے بعض گوشے ہمارے لئے رہنمائی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ حضرت کعب کا اپنا بیان ہے کہ اس سفر میں میرا پیچھے رہ جانا نہ تو ارادتاً تھا اور نہ ہی کسی عذر کی بنا پر تھا۔ میں نے اس کے لئے تیاری بھی کر رکھی تھی۔ جس روز لشکر اسلام روانہ ہوا میں نے دل میں کہا آج کچھ کام نمٹا لوں کل چلا جاؤں گا۔ پھر ہوا یوں کہ دو تین دن اسی سستی اور ٹال مٹول میں گزر گئے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اب لشکر اتنی دُور نکل چکا تھا کہ اسے جا کر ملنا بہت مشکل تھا۔ بس میں یونہی بغیر کسی عذر کے رہتے رہتے رہ گیا۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام واپس تشریف لائے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جس طرح اور لوگوں نے حیلے بہانے بنا کر معذرت قبول کرالی ہے تم بھی ایسا ہی کرو۔ لیکن میری تو رُوح بھی کانپتی تھی کہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے غلط بیانی کروں۔ چنانچہ میں بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش ہوا اور میں نے سارا ماجرا ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم اپنے گھر میں بیٹھے رہو اور اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ اتنا بڑا جرم تھا جس کا فیصلہ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم خود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان تینوں سے بات نہ کرے۔ اور نہ ہی ان کے ساتھ بیٹھے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اب زندگی اور اس کی تمام دلچسپیاں ہمارے لئے وبالِ جان بن گئیں۔ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی۔ میرے دو ساتھی تو گھر والوں میں بیٹھ کر روتے رہے۔ لیکن میں باہر نکلتا اور نماز میں شریک ہوتا تھا۔ لیکن کوئی شخص مجھ سے بات نہ کرتا۔ کوئی میرے قریب نہ آتا۔ میں جان بوجھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قریب نماز پڑھتا اور پھر کنکھیوں سے چہرہ مبارک کی طرف دیکھتا رہتا کہ شاید نگاہِ کرم کا التفات ہو جائے۔ لیکن میری کچھ بھی پیش نہ گئی۔ سماجی مقاطعہ (SOCIAL BOYCOTT) اس قدر سخت تھا کہ ایک شام میں اپنے چچا زاد بھائی کے باغ میں چلا گیا لیکن اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا حالانکہ اسے مجھ سے بڑی محبت تھی۔ ایک دن ایک شامی سوداگر میرے پاس آیا اور مجھے ملکِ غسان کا خط دے کر کہنے لگا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا تم سے خفا ہو گئے ہیں اور باقی لوگ بھی تم سے مقاطعہ کئے ہوئے ہیں حالانکہ تمہارا بڑا رتبہ ہے۔ تم اس لائق نہیں ہو کہ اس طرح نظروں سے گرا دیئے جاؤ۔ میرے ساتھ چلو اور دیکھو کہ ہمارے ہاں تمہاری کتنی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔" شامی سوداگر کے اس پیغام پر کعب کے غم و غصّہ کی حد نہ رہی۔ اس نے وہ خط اسی قاصد کے سامنے جلا دیا اور کہا کہ تمہاری عنایات سے مجھے میرے آقا کی بے التفاتی لاکھ درجے زیادہ عزیز ہے۔ تاہم جب گھر پہنچا تو ایک اور آزمائش منتظر تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حکم پہنچ چکا تھا کہ تمہاری بیوی بھی تم سے علیحدہ رہے گی۔ چنانچہ وہ میکے چلی گئی۔ پچاس دن اسی کرب و الم میں گزر گئے۔ پچاسویں دن اسی غم میں تنہا مکان کی چھت پر بیٹھا تھا کہ کوئی شخص جبلِ سلع سے پکار رہا تھا کہ اے کعب مبارک ہو! میں سجدہ میں گر گیا۔ اللہ نے میری توبہ قبول فرمالی۔

اس واقعے میں عبرت و موعظت کے کئی تابناک اشارے موجود ہیں جنہیں اہلِ دانش و بینش بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے رُکن رکین کو مؤثر بنانے کے لئے معاشرتی مقاطعہ بھی ایک طریقہ ہے جس میں معاشرے کا ہر فرد حتیٰ کہ بیوی بھی اطاعت اللہ و رسول کا پیکر بن کر شامل ہوتا ہے اور ایمان و عمل کے دونوں اجزاء کو متصور کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں والدین کے حقوق کے بیان میں اشارہ ہے کہ اگر والدین بھی شرک میں مبتلا ہو جائیں تو ان سے کوئی واسطہ نہ رکھو" اگر وہ شرک کرنے کو کہیں تو ان کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

قطعاً اطاعت نہ کرو (۱۲۹:۲۰)۔ اسی طرح عدل گستری کے بارے میں حکم ہے کہ

ہمیشہ عدل پر قائم رہو خواہ ایسا کرنا تمہارے والدین کے خلاف ہی کیوں نہ جائے (۴:۱۳۵)

اور یہ بھی کہ

"اگر تمہارے آباء کفر کو زیادہ پسند کریں تو انہیں اپنا دوست نہ بناؤ (۲۳:۹-۲۲:۵۸)

قرآن حکیم کی تعلیم "اللہ و رسول کی اطاعت" کے سلسلے میں اسوۂ ابراہیمی پر عمل پیرا رہنا ہے جس میں باپ سے بھی برملا کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ غلط راستے پر چل رہے ہیں اس لئے میں آپ کا حکم ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں (۱۹:۴۲)

دیکھا آپ نے کہ کتنا بڑا پروگرام تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جسے عرصہ دراز سے کاٹ ڈالا گیا ہے۔ دینیات کی کتابوں میں اس اہم ترین نظام کا اِدھر اُدھر سرسری سا ذکر ملے گا تو ملے گا ورنہ نہ اسے ارکانِ دین میں جگہ دی گئی ہے اور نہ اس کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا گیا ہے۔ معاشرے میں نماز روزہ، حج، زکوٰۃ بڑی حد تک زیرِ عمل ہیں (گو ان میں سے صرف دو "زکوٰۃ اور حج" کو حکومتی سطح پر سرپرستی حاصل ہے) لیکن ان سے وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے جو ہونے چاہیئے تھے۔ یہ صرف اس لئے کہ باہمی اصلاح اور تادیب و احتساب کا لازمی ربط جو باقی تمام ارکان کو مضبوط بنانے والا تھا سہواً یا عمداً یا مصلحتاً کاٹ دیا گیا ہے۔ اگر آج اس پروگرام کو وہی حیثیت حاصل ہو جائے جو قرآن نے اسے دی ہے (یعنی حکومت سے لے کر معاشرے کے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ فرد تک ذمہ داری (۲/۴۲:۳) اور جو اللہ و رسول کی طرف سے دوسرے فرائض کو حاصل ہے تو (CHECKS AND BALANCES) کی لازمی اور عملی تعلیم کے ذریعے معاشرے کی چھوٹی بڑی خرابیاں از خود دُور ہو جائیں گی۔ ہمارے بچپن میں ہمارا اٹھنا بیٹھنا اجینا پھرنا سب غیر مسلموں کے ساتھ تھا۔ کھیل کود کے ساتھی بھی ہندو تھے۔ ہم سے کوئی اخلاقی لغزش ہو جاتی تھی تو ہمیں اپنے ہندو ہم عمر ساتھی طعنہ دیتے تھے: "اسے مسلمان ہو کر تم جھوٹ بولتے ہو؟" ان کا یہ جملہ ہم پر تازیانہ بن کر پڑتا تھا اور ہم دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر آئندہ جھوٹ نہ بولنے کا عہد کر لیتے تھے۔ کہیں کوئی بیہودگی کی بات ہوتی تو فوراً کہیں سے آواز آتی شریفوں کا یہ وطیرہ نہیں ہوتا اور بیہودگی کرنے والا فوراً سنبھل جاتا۔ اس وقت بھی، جبکہ معاشرتی برائیاں اپنے عروج تک پہنچ چکی ہیں اور آوازۂ حق نقارخانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گیا ہے، یہ پروگرام انتہائی مؤثر ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ صحیح منصوبہ بندی کے ذریعے اسے آگے بڑھایا جائے۔ سچائی کو اپنے آپ کے منوانے کے لئے دیر ضرور لگتی ہے لیکن اس کا بالآخر جھوٹ پر غالب آجانا یقینی ہے جس پروگرام کو کامیابی کے ساتھ آزمایا بھی جا چکا ہو اور جس کے فرض قرار دیئے جانے کے قرآنی احکام بھی موجود ہوں اس کے لئے پس و پیش کرنا یا اسے التوا میں ڈالے رہنا اور یہ کہ کر ٹال دینا کہ اس کے لئے ابھی حالات ساز گار نہیں ہیں اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے کسی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ایک حکم کا انکار سارے قرآن کے انکار کے برابر ہے۔" اسلام میں داخل ہوتے ہو تو پورے کے پورے داخل ہونا ہوگا۔" جزوی ایمان یا جزوی عمل کوئی معنے نہیں رکھتا۔ معاشرے کی برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ "اخوان الشیاطین" کے جیوش پر ہر طرف سے اور متحد ہو کر ہلہ بول دیا جائے۔ تاہم اس کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ صرف ایک ہی ہے کہ اپنی اچھی مثال اور اپنا اچھا نمونہ پیش کیا جائے۔

قرآن حکیم نے اوامر و نواہی کو نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں واضح طور پر بیان کیا ہوا ہے ان میں کسی مزید غور و فکر یا بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں ہے۔ غور و فکر کیا جانا ہے ان کے طریق نفاذ پر، منصوبہ بندی پر اور افراد معاشرہ کے طریق شمولیت پر۔ اگر ہم ایک منظم منصوبے کے تحت اوامر و نواہی کو مرحلہ وار ذہن نشین کرنے کا پروگرام مرتب کر لیں اور اسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہو تو اچھا رہے گا۔ مثال کے طور پر ذیل میں کچھ ایسے اوامر و نواہی دیئے جاتے ہیں جن کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ کسی چیز کو اس کے بیکار اور زائد حصوں سے پاک کر کے ایک اندازے اور پیمانے کے مطابق بنا دینے کے لئے عربی زبان میں خ۔ل۔ق کا مادہ استعمال ہوتا ہے۔ تخلیق کا لفظ بھی اسی مادے سے بنایا گیا ہے اور خلق کا بھی جس کی جمع اخلاق ہے۔ لہٰذا خلق کے معنے ہوئے ایسے اطوار و کردار جنہیں ہر قسم کی فضولیات سے پاک صاف کر دیا گیا ہو اور جن میں صحیح توازن اور تناسب ہو۔ قرآن حکیم میں مومنین کی جتنی صفات بیان ہوئی ہیں وہ اخلاق حسنہ ہی کا حصہ ہیں معاشرتی اطوار و عادات سے متعلق کچھ ارشادات قرآنی پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔ کچھ یہ ہیں۔

۱۔۔۔ لوگوں کے ساتھ نہایت عمدگی سے گفتگو کرنا (۸۳ : ۲)

۲۔۔۔ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد احسان جتلا کر اسے اذیت نہ دینا (۲۶۲-۲۶۴ : ۲)

۳۔۔۔ برائی کو بھلائی سے دور کرنا (۹۶ : ۲۳، ۵۴ : ۲۸، ۳۴ : ۴۱)

۴۔۔۔ لڑنے والوں میں منصفانہ طریقے سے صلح کرا دینا، ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑانا، دوسروں کے برے نام نہ رکھنا، بدگمانی سے بچنا، لوگوں کے معاملات کی خواہ مخواہ کرید نہ کرنا اور غیبت نہ کرنا، نیز ذاتوں اور برادریوں کو عزت و توقیر کا معیار نہ بنا لینا (۹-۱۳ : ۴۹)

۵۔۔۔ قسمیں کھا کھا کر اللہ کو اپنی ڈھال نہ بنانا (۲۲۴ : ۲)

۶۔۔۔ تنگی ہو یا آسودگی ضرورت مند کی حاجت روائی ہر حال میں کرنا (۱۳۴ : ۳)

۷۔۔۔ ناپ تول پورا رکھنا، اللہ کے ساتھ کئے عہد کو نبھانا (۱۵۲ : ۶)

۸۔۔۔ قطع رحمی سے بچنا (۲۲ : ۴۷)

۹۔۔۔ شرمگاہوں کی حفاظت، امانتوں کی حفاظت، وعدوں کی حفاظت اور اپنی گواہی کی حفاظت (۳۲-۲۹ : ۷۰)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۰۔ برائی کو برائی سمجھ کر محض رسمی طور پر چھوڑ نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ اس کے خلاف دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہونے چاہیئں (۶:۱۲۱)

یہ حسن اخلاق کی چند موٹی موٹی باتیں ہیں۔ تحقیق کرنے والوں کو روزمرہ کی زندگی سے متعلق قرآنی ارشادات کو ترتیب دے دینا چاہیئے۔ اخلاق حسنہ کی جامع فہرست مرتب کرنے کے لئے قرآن حکیم کی مستقل قدروں کو بھی سامنے رکھنا ہوگا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ سے بھی استفادہ کرنا ہوگا جنہیں خود قرآن پاک نے خلق عظیم کہا ہے (۶۸:۴)

---

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۸- وہ منفی قوّتیں جو "انسانی ذات" کی نشوونما میں حائل رہتی ہیں

انسان کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ اطاعت کا راستہ اختیار کرے یا نافرمانی کی راہ کا انتخاب کرے۔ تسلیم و رضا کو پسند کرے یا بغاوت اور سرکشی کا علم بلند کرے۔ ہم اللہ کے قوانین کے خلاف وہ باغیانہ رویہ اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے پست جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ جذبات یعنی اُس کی پسندیدگیاں، ناپسندیدگیاں، اس کی محبتیں، لغزشیں اور اس کی خواہشات و احساسات اُس کی ذاتی اغراض کو مشتعل کر دیتی ہیں اور انسان باہمی محبت، تعاون، ایثار اور عالمگیر وحدت و اخوت کے فطری نظام کے خلاف ہو جاتا ہے۔ حُسن و خیر و خوبی سے جونہی رُوگردانی ہوئی خواہشات نفسانی کی اندھا دھند پیروی شروع ہو گئی اس نازک مرحلے پر عقل پر بھی جو مفاداتِ عاجلہ سے پرے دیکھ ہی نہیں سکتی اور اپنے آقا کی وفادار رہتی ہے، انسان کی دوست اور رہنما بن کر خدمت کے لئے حاضر ہو جاتی ہے اور پھر دوسرے انسانوں کا استحصال کرنے کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا شروع کر دیتی ہے تاکہ حرص و ہوس کو تسکین حاصل ہو۔ چونکہ یہ صرف مادی مفادات اور عیش پا افتادہ نفعے کو پہچانتی ہے اس لئے یہ انسان کو آسان اور مختصر قریبی راستے دکھاتی رہتی ہے۔ شیطان اور ابلیس کو ہم نے ایک ہی سکّے کے دو رُخ کہا تھا۔ شیطان منکوس ذہنیت کا عملی پہلو ہے اور ابلیس[1] معکوس ذہنیت ہے۔ قصۂ آدم میں سجدے سے انکار، سرکشی، تکبّر، حسد، جھوٹ، اور انتقام کا جذبہ سب ابلیس کی طرف سے ہے لیکن اس کے بعد جب آدم کی لغزش کا ذکر آتا ہے تو اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ وہ انداز عمل ہے جس سے ابلیسانہ ذہنیت کام کرتی ہے۔ ابلیس اور شیطان (نا امیدی اور سرکشی) وہ سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں جو "انسانی ذات" (خودی) کی تکمیل کی راہ میں حائل رہتی ہیں۔ اگر انسانی ذات ان موانع پر غالب آکر اپنے استحکام کا ثبوت دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب اس کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور اگر موانع اس پر غالب آ

---

[1] لفظی معنے بہت دور پھینکا ہوا اور وہ جو یکدم بھڑک اُٹھے
[2] لفظی معنے محروم، مایوس، نا امیدی،

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ہیں تو یہ کمزور رہ کر اپنی نچلی حیوانی سطح زندگی پر ہی دب کر رہ جاتی ہے۔ اور ارتقا حاصل نہیں کر سکتی۔ آدم کے ساتھ ابلیس کا لگا رہنا ضروری بھی ہے کیونکہ جب تک رکاوٹیں نہ ہوں خودی کے استحکام کا امتحان نہیں ہو سکتا۔ ندی کی روانی کو تیز تر بنانے کے لئے کناروں کی رکاوٹیں اور رستے کی ٹھوکریں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو پانی وسیع میدانوں میں جذب ہو جائے، اور ندی کی موت واقع ہو جائے۔ ایسے رستے تلاش کرنا جن میں ٹھوکریں نہ ہوں (مسلک خانقاہیت) اپنی روانی کو اپنے ہاتھوں ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ چونکہ جذبات اور خواہشات مرتے دم تک انسان کے ساتھ ہیں اس لئے ابلیس نے کہا تھا کہ جب تک آدم اس دنیا میں موجود رہے گا میں بھی اس کے ساتھ چمٹا رہوں گا اور اس پر اس کے دائیں بائیں سے آگے پیچھے سے حملہ کروں گا۔ تاہم قرآنی معاشرہ میں ابلیسیت کسی پر غالب نہیں آسکتی: "یقیناً میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔" (۱۵: ۴۲)۔ ذکر و فکر، مغفرت اور توبہ (جن کی تشریح سابقہ صفحات میں آچکی ہے) ابلیسی حملوں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ ابلیسیت جن چھ برائیوں سے عبارت ہے وہ ہیں (۱) گستاخی ۲۔ حسد ۳۔ نافرمانی ۴۔ انانیت یعنی تکبر ۵۔ مکاری ۶۔ دعوتِ مبارزت۔ ان سب برائیوں کا سرچشمہ مایوسی اور اشتعال ہے۔ ان برائیوں کے علاوہ جن برائیوں کو قرآن حکیم نے شیطانی اعمال کہا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ بغاوت (۱۹: ۴۴)

۲۔ وہ افعال جو غصے میں بے سوچے سمجھے اندھا دھند سرزد ہوں (۲۸: ۱۵)

۳۔ وہ افعال جو پست خواہشات کے دباؤ کے تحت عمل میں آئیں (۲۰: ۲۱-۳-۲: ۱۵۴، ۲: ۲۶۸)

۴۔ عالمگیر امن و سلامتی اور فلاح انسانیت کے قوانین خداوندی کے خلاف مکر و فریب کی چالیں اور سازشیں۔ (۱۷: ۶۴ - ۴: ۱۲۰ - ۲۸: ۲۴ - ۲۷/ ۲۴: ۱۷)

۔۔۔ معکوس ذہنیت (PERVERTED MENTALITY) اپنا اظہار کس کس طرح کی کجروی یا بے راہ روی سے کرتی ہے اس کے لئے بہت سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں مثلاً ظلم، عدوان، بغی، اثم، ذنب، جرم، معصیت وغیرہ۔ تاہم ان سب کا سرچشمہ ہے اللہ کا انکار، اس کے قوانین کا انکار اور انسان کا اپنے آپ سے انکار۔ اس کے لئے ایک جامع اور بلیغ الفاظ "کفر" آتا ہے۔ آیئے پہلے اس لفظ کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ کفر کے لفظی معنے چھپانے اور ڈھانپ دینے کے ہیں۔ جو شخص ہتھیاروں میں اتنا ڈوبا ہوا ہو کہ اس کا بدن تک چھپ جائے اسے کافر کہتے ہیں۔ رات بھی کافر ہے کیونکہ اس کی تاریکی چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ کسان بیج کو مٹی سے ڈھانپ دیتا ہے اس لئے یہ بھی کافر کہلاتا ہے۔ ان معانی کے اعتبار سے کافر اس شخص کو کہا جائے گا۔ جو ٹھوس صداقتوں کو پردے میں رکھنا چاہے، جو اللہ کی بتائی ہوئی حقیقتوں کو پوشیدہ رکھے اور انہیں سامنے نہ آنے دے، یا جو انسانی صلاحیتوں کو خواہ یہ اس کی اپنی ہوں، اولاد کی ہوں، شاگردوں کی ہوں یا دوسرے انسانوں کی ہوں چھپائے، نشوونما سے روک دے اور انہیں ظاہر نہ ہونے دے یا انہیں اُبھرنے نہ دے۔ اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے بھی "کافر" کا لفظ کسی گالی کا مترادف نہیں ہے بلکہ اسے یوں سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر آپ کوئی انجمن بنائیں اس کے اغراض و مقاصد وغیرہ اچھی طرح لوگوں پر واضح کر دیں تو جو لوگ آپ کی انجمن میں شامل ہو جائیں گے وہ ممبر کہلائیں جو شامل نہیں ہوں گے وہ نان ممبر ہوں گے۔ یہ آپ کی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

انجمن کے دائرے سے باہر رہنے والے ہوں گے۔ اسلامی معاشرے کو برضائے دل اختیار کرنے والے مومن ہیں جو اس دائرے میں آنے سے انکار کر دیتے ہیں وہ کافر ہیں، یعنی نان ممبرز۔ کُفر کے معنے چونکہ انکار کے ہیں اس لئے ہم ان لوگوں کو کافر نہیں کہہ سکتے جن تک اسلام کی دعوت پہنچی ہی نہیں یا جن کو اسلامی نظام حیات کے بارے میں صحیح اطلاعات تفصیلاً نہیں بتائی گئیں۔ کفر اور ایمان محض اعتقادی چیزیں نہیں ہیں جو انسان کے ذہن تک محدود رہ جاتے۔ ان کا تعلق انسان کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ہے۔ قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق اللہ کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرے اس کے مطابق زندگی کے تمام معاملات کا فیصلہ کرنا ایمان ہے اور اس کے خلاف کرنا کفر ہے۔ (کفر کے مقابلے میں عمل صالح آیا ہے ۳۰:۴۴)۔ صحیح راستے کی پیروی چھوڑ کر (۲:۳۸) غلط راستہ اختیار کر لینا (۲:۳۹) تباہیوں میں جا گرنا ہے (۲:۳۹) ان تباہیوں کے لئے قرآنِ حکیم نے "عذاب" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلط روش کا لازمی نتیجہ ہیں جو صحیح راستے پر چلنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں کُفر کا لفظ شُکر کے مقابل آیا ہے۔ شُکر کے معنے ہیں کسی چیز سے بھرپور فائدہ اُٹھانا، کسی ضرورت کو پورا کر لینا یا نمایاں ہو جانا۔ اللہ کی نعمت کو استعمال میں نہ لانا اسے ضائع کر دینا کفرانِ نعمت کہلاتا ہے اسی طرح نوعِ انسانی کی عام بھلائی کی چیزوں کو روک لینا یا مفادِ عامہ کے لئے استعمال میں نہ آنے دینا بھی کفران ہے۔ اسلام اور اس کا نظامِ معاشرت کفرانِ نعمت کو پسند نہیں کرتا شکرانِ نعمت کو پسند کرتا ہے۔

چونکہ دین کے قبول کرنے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے اس لئے اسلام مستقل قدروں کے برضا و رغبت تسلیم کرنے اور انہیں دنیاوی زندگی کے ہر شعبے میں عملاً نافذ کرنے کا نام ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے قوانین کی مکمل اطاعت کی جائے، تمام متنازعہ امور و مسائل کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر اللہ کے احکام کے مطابق فیصل کیا جائے اور ہر قسم کے حالات و واقعات میں صرف انہی کو ملحوظ رکھا جائے۔ لہٰذا ہر وہ بات جو اس عمل کے خلاف ہو گی کفر ہو گی۔ اگر کوئی لوگ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو وہ کافر ہیں (۵:۴۴)

> کہہ دیجئے کہ صداقت تمہارے ربّ کی طرف سے آچکی ہے جو کوئی چاہے اسے قبول کرے، جو کوئی چاہے اس کا انکار کر دے (۱۸:۲۹) ہم نے اسے سمع اور بصر اور پھر ہم نے اسے صحیح راستہ بھی دکھا دیا۔ اب اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کفر کرتا ہے یا شکر کرتا ہے۔ (۷۶:۲۳)۔

لوگ کفر کی روش کیوں اختیار کرتے ہیں، قرآن حکیم نے اس کی بہت سی وجوہات بتائی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ کوئی آدمی بلا سوچے سمجھے صداقت کا بس یونہی انکار کر دیتا ہے پھر وہ اپنی بات پر اڑ جاتا ہے کہ ایک دفعہ جب انکار کر بیٹھا ہوں تو بس اب انکار پر قائم رہوں گا، اقرار کیسے کروں۔ یہ گویا اس کی انا کا مسئلہ بن جاتا ہے جس کے زیر اثر وہ صداقت کا مسلسل انکار کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک دفعہ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کے خلاف اب کیسے کوئی اور بات کی جائے۔ ایسے لوگوں کا صحیح راستے کی طرف پلٹ آنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر مرتبہ انکار اس کے کفر کو اور زیادہ گہرا کرتا چلا جاتا ہے، پھر اپنے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے وہ اپنے ہی جیسے دوسرے لوگوں کا گٹھ جوڑ کر لیتا ہے۔ اس طرح کا قائم شدہ متحدہ محاذ حق و صداقت کے خلاف کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی حق کے قبول کر لینے سے باز رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ دشمنی برائے دشمنی اور محض ضد اور اکھڑ پن کی وجہ سے یہ کفر کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ یہ دل رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ سوچتے سمجھتے نہیں، آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھ دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھ سنتے نہیں۔ یہ تو حیوانوں کی طرح ہیں۔ نہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ! (۷:۱۷۹)

صداقت کا جان بوجھ کر انکار کرتے رہنے سے انسان کی وہ صلاحیتیں جو حق و باطل میں امتیاز کرتی ہیں آہستہ آہستہ عقل و فہم سے بھی اثر قبول کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور کفر و انکار کی عادی بن جاتی ہیں۔ یہ صورت نہ صرف حسن و خوبی اور نیکی کے پہچان سکنے سے اپنی ذات کی قوتوں کا انکار ہے بلکہ انتہائی ناشکری بھی ہے

جو کوئی اللہ کی توحید کا منکر ہے اُسے لالچ، حرص، توہمات اور اس طرح کے بہت سے دوسرے خداؤں کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے، بلکہ فنون لطیفہ، علم، حکمت، عقل، ہنرمندی، علمی دسترس یہاں تک کہ نسلی فخر، مقام پیدائش کی محبت۔ دولت، دنیاوی اقتدار اور بعض اوقات تو روحانی ترقی بھی اس کے خدا بن جاتے ہیں۔ ان بتوں کی وہ پوجا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح اپنی ہی ملکیت چیزوں، اپنے خادموں اور غلاموں اور اپنی تخیلاتی مخلوق کی غلامی اختیار کر لیتا ہے، کیا اس طرح حیوانی سطح زندگی پر پڑے رہنا، زندگی کی بلند تر شاہراہ پر چل سکنے کے لیے اپنے آپ سے منکر ہو جانا اپنے شرف و امتیاز پر پردہ ڈال دینے کے مترادف نہیں ہے؟ آخرت کی بلند ترین زندگی کا انکار تو گویا اپنی آزادی کو کھو دینا ہے کیونکہ اس روش میں موجودہ دنیاوی زندگی کے بہت سے خداؤں کی غلامی لازمی ہو جاتی ہے۔ اور غلامی بھی ایسے خداؤں کی جو ایک حقیقی خدا کے مقابلے میں بالکل غیر حقیقی اور محض خیالی خدا ہیں!

قرآن حکیم انسان کی دنیاوی زندگی کو اس کی روحانی زندگی سے یا مذہبی زندگی کو بھی اور معاشرتی زندگی سے الگ نہیں سمجھتا۔ اس زمین پر اس کی تمام تر زندگی مذہبی زندگی ہے اگر وہ حسن و خوبی اور نیکی کو زندگی کے ہر قدم پر پیش نظر رکھتا ہے۔ ہر خیال، ہر قول اور ہر عمل جس سے ان مثالی معارج نظر کو تقویت ملتی ہے اور جس سے اس دنیا کی حسنات اور آئندہ کی زندگی کی حسنات حاصل ہو سکتی ہیں اچھا ہے اور نیکی شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا توازن اور تناسب کی شناخت کو کھو دینا یا بلند تر مقاصد کے مقابلے میں پست مفادات اور فوری لذائذ کو ترجیح دینا سب سے بڑا نقصان ہے جو کفر کی روش اختیار کرنے سے لاحق ہوتا ہے۔

ابھی ہم نے بہت سے ایسے خداؤں کا ذکر کیا تھا جنہیں ہماری عقل مفاد پرست، جذبات سرکش سے مغلوب ہو کر ہمارے لئے تراشتی رہتی ہے اور ہمیں ان کی اطاعت پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حیوانات اپنی جبلتوں کی تعمیل میں مجبور و ناچار ہوتے ہیں اور ذاتی خواہشات کی تسکین کے علاوہ اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مطلق حاکمیت میں کسی بھی دوسری چیز کو صاحب اختیار سمجھ کر اُسے اُلوہیاتی قدروں میں دخیل بنانا شرک کہلاتا ہے یہ ایسا جرم ہے جو کبھی معاف

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیوں ہے یہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ پہلے اس لفظ کے لغوی معنے دیکھ لیجیے۔ شرک کے بنیادی معنے ہیں چمٹے رہنا، خلط ملط ہو جانا یا کسی کا ساتھی بن جانا۔ "مُشَارَکَۃ" اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے یہ کسی شخص کو دوسرے شخص یا اشخاص کے ساتھ کسی کام میں شامل ہو جانے، مل جانے یا ساجھی بن جانے کو کہتے ہیں۔ کسی کی بہن یا بیٹی سے شادی کر کے اُس خاندان سے رشتہ داری پیدا کر لینے والا بھی شریک کہلاتا ہے، شکاری کا وہ جال جو سب پرندوں کی شرکت قید کا سبب بنتا ہے اَلشَّرَکُ ہے۔ اسی طرح وہ چھوٹے چھوٹے راستے بھی جو بڑی شاہراہ سے پھوٹ کر لق و دق صحراؤں میں گم ہو جاتے ہیں اور کسی منزل تک نہیں جاتے اَلشَّرَکُ کہلاتے ہیں۔ دین اسلام صراط مستقیم ہے یعنی بالکل سیدھا، متوازن اور ارتقا پذیر شاہراہ جو ایک واضح اور متعین منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس شاہراہ کو کاٹ کر ادھر ادھر کے چھوٹے چھوٹے راستے نکالنے رہنا، ہر ان منزل کو فریب دے کر گمراہی، کجروی بلکہ بے راہ روی کی طرف مائل کرنے کے مترادف ہے۔ ان راہوں پر چلنے سے سمت بدل جاتی ہے۔ ایک ٹولی ایک راہ پر دوسری کسی اور چھوٹے راستے تیسری اس سے مختلف کسی اور طرف تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے اور انجام کار کوئی بھی منزل تک نہیں پہنچ پاتا کیونکہ اصل اور بڑی شاہراہ ایک اور صرف ایک ہے دوسری کوئی نہیں۔ اور نہ ہی اس کے متوازی کوئی اور شاہراہ ہے۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے راستے دین اسلام کی سیدھی شاہراہ سے نکالتے رہنا شرک ہے۔

غیر خدائی طاقتوں کو (مثلاً علم کی طاقت کو، جذبات کے دباؤ کو، خواہشات کی قوت کو، نسل، وطن اور رنگ وغیرہ کے امتیاز کو، یا دنیاوی اقتدار کو یا اپنی ہی عقل کو) اتنا قوی اور معتبر سمجھ لینا کہ ایک اللہ کی اطاعت کرنے کی بجائے انسان ان مفروضہ خداؤں کے متابعت شروع کر دے تو یہ ان باطل خداؤں کو اللہ کا ہمسر تسلیم کر لینا ہے اور اللہ کی قوتوں میں ان خداؤں کو شریک مان لینا ہے۔ لہٰذا یہ شرک ہے۔ عبودیت صرف ایک کی اختیار کی جا سکتی، ایک سے زائد آقاؤں کی اطاعت ذلت و خواری ہے۔ محبت بڑی غیور ہوتی ہے، ذرا بھر بھی شرکت برداشت نہیں کر سکتی۔ محبت کیا ہے؟ رضائے محبوب پر اطاعت ابدوئے چشم ہی کا دوسرا نام ہی تو ہے۔ لہٰذا جو اختیارات اللہ کے ہیں ان کے سا بہر حکم کا حامل کسی دوسری چیز یا شخص کو تصور کر لینا شرک ہے۔ اسی طرح اللہ کے حق ملکیت میں دوسروں کو بھی ساجھی اور حصہ دار بنا لینا شرک ہے۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ شرک کیوں ناقابل معافی جرم ہے چند باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ انسان کو اشرف المخلوق بنا کر تخلیق کیا گیا ہے۔ "ذات" یا "شخصیت" یا اللہ کی ہے یا پھر انسان کو عطا کی گئی ہے یہ شرف اور امتیاز اور کسی مخلوق سماوی وارضی کے پاس نہیں۔ اللہ کی "ذات" مکمل ترین ذات ہے۔ "انسانی ذات" میں قابل حصول امکانات ہیں۔ لہٰذا اس سے بہتر اور بلند تر مخلوق اور کوئی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ کائنات کی ہر چیز (حتیٰ کہ ملائکہ بھی) انسان کے آگے سجدہ ریز ہے، اس کے تابع فرمان ہے۔ تیسری بات یہ کہ انسان سب کے سب برابر ہیں، ان میں فضیلت اور برتری کی بنیاد صرف تقویٰ ہے، چوتھی بات یہ کہ ابن آدم خواہ کہیں بھی آباد ہو، کسی بھی نسل اور رنگت سے تعلق رکھتا ہو واجب تکریم ہے۔ ان چار باتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد منطقی طور پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسان کو کسی اور بھی صورت میں اپنا "محکوم" بنائے۔ یعنی کسی چیز کو کسی شخص کو اور کسی غیر مرئی قوت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اگر کوئی قوت ایسا کرے گی تو اس سے ان چاروں باتوں کی نفی ہو جائے گی۔ اور ایک

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اللہ کے اعلیٰ اقتدار اور حاکمیت میں شرکت لازمی ہو جائیگی۔ حکم، اقتدار اور مالکیت اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ وہی رب الناس ہے، مالک الناس ہے، الٰہ الناس ہے اس حقیقت کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر خود انسان کی چیز یا شخص یا قوت کے آگے سوائے مالک و خالق کے جھک جائے یا اسکی محکومیت اختیار کرے یا اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے لگ جائے یا اپنے آپ کو اس سے کمتر سمجھنے لگ جائے خواہ وہ چیز یا شخص یا قوت کتنی ہی بڑائیوں نہ ہو تو وہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے اور اس طرح وہ نہ صرف اللہ کے کلی اختیار اور کلی اقتدار کا منکر ہوتا ہے بلکہ اپنی مذکورہ عظمتوں پر بھی پردہ ڈال دیتا ہے۔ یہ دہرا "انکار" پوری انسانیت کی توہین اور تذلیل ہے اسی لئے سب سے بڑا جرم ہے۔

شرک کرنے سے اللہ کے مالکِ کل اور احکم الحاکمین ہونے میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس سے خود انسان اپنے مرتبۂ انسانیت اور شرف و امتیاز کے اعلیٰ مقام سے گر جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم اپنی امیدیں سورج، چاند، تاروں سے یا کائناتی قوتوں سے یا ارضی مخلوق سے وابستہ کریں جنہیں اللہ نے انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے تو یہ فعل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی فاتح اپنے مفتوحین کی غلامی اختیار کر لے۔ اگر ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کی محکومیت کا طوق گلے میں ڈال لیں تو یہ اللہ کی عطا کردہ نعمت مساوات و تکریم کو ٹھکرا دینے کے مترادف ہوگا۔ اگر ہم اپنی ہی ملکیہ چیزوں مثلاً علم، عقل اور جذبات و خواہشات وغیرہ کے حلقہ بگوش ہو جائیں تو غلاموں کی غلامی قبول کر لینے سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم پتھروں، درختوں، جانوروں یا عناصرِ فطرت کے حضور دست بستہ ہو کر کھڑے ہو جائیں ان سے مرادیں طلب کریں یا ان سے امیدیں وابستہ کریں تو اس سے زیادہ قبیح فعل اور کیا ہو سکتا ہے۔

علم اور عقل کا منتہائے کمال یہ ہے کہ محسوسات سے آہستہ آہستہ دامن چھڑاتے چلے جائیں۔ اور عالم تجرید میں داخل ہو جائیں۔ وہ علم ناپختہ ہے اور وہ عقل ناقص ہے جو مقرون اشیاء کے گرد گھومتا رہتا ہے اور ان سے الگ ہو کر تجریدات کی طرف قدم نہیں بڑھاتا۔ مقرون سے مجرد تک سفر ہی تو علم و دانش کی جولانگاہ ہے۔ صحیح علم وہی ہے جو چشم بصیرت سے غیر مرئی حقائق کا ادراک کر سکے۔ شرک اس صحیح علم کو واپس مقرون اشیاء کی طرف دھکیل دینے کا عمل ہے لہٰذا اس وجہ سے بھی قابلِ مذمت ہے۔

اللہ کی ذات ربّ العالمین ہونے کی حیثیت سے رحمٰن اور رحیم بھی ہے۔ یعنی انتہائی شفیق، حد درجہ مہربان اور بہت زیادہ محبت کرنے والی ہستی۔ اللہ اپنی چھوٹی بڑی ہر مخلوق سے پیار کرتا ہے۔ انسان کو تو اس نے احسن تقویم بنا کر تخلیق کیا ہے وہ یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی یہ اشرف مخلوق شرک میں مبتلا رہ کر اپنی ذلت و رسوائی کا سامان آپ پیدا کرتی رہے۔ انسان کو شرک کے قعرِ ذلت سے نکالنے کے لئے انبیائے کرام کا سلسلہ جاری کیا جو ایک اللہ کی عبودیت اختیار کرنے کی عملی تعلیم دیتے رہے۔ جب شرک کی تمام ممکنہ صورتیں سامنے آ چکیں اور توحید خالص کا علم تکمیل تک پہنچ گیا تو قرآن حکیم کے اندر ماضی حال اور مستقبل کی تمام تعلیمات کو آخری ارتقائی شکل دیکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ اس کتاب مبین کی صداقت اور حقانیت پر ایمان لانے کے بعد اگر کوئی حقیقت سے شرک کا بھی مرتکب ہوتا ہے تو اس کا یہ ارتکاب ناقابلِ معافی جرم ہے۔ اللہ کو ہرگز ایسا قول و عمل منظور نہیں جو انسان سے اس کا مقامِ انسانیت چھین لے اور اسے جانوروں، درختوں بلکہ پتھروں سے بھی نچلی سطح پر لے آئے۔ لہٰذا کوئی مومن

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

مشرک نہیں ہو سکتا اور کوئی مشرک اپنے شرک پر اصرار کرتے ہوئے مومن نہیں بن سکتا۔ مومن اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۶۳ : ۳) اسی طرح غیر خدائی قوتوں پر بھروسہ کرنے والے اور شیطانی اقتدار کے آگے جھک جانے والے مشرک ہیں (۱۰۰، ۹۹ : ۱۶) فرقہ بندی کو بھی قرآن حکیم نے شرک قرار دیا ہے کیونکہ اس میں آخری سند کسی نہ کسی انسان کی قرار پا جاتی ہے۔ (۳۱ : ۳۰)۔ (۱۳ : ۴۲)

شرک کو ظلم بھی کہا گیا ہے۔ ظلم کے بنیادی معنے ہیں کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، مقررہ حد سے آگے بڑھ جانا، کسی چیز کو اس کے اپنے اصلی مقام پر نہ رہنے دینا خواہ کمی کر کے، زیادتی کر کے، اپنی جگہ ہٹا کر خواہ صحیح وقت سے آگے پیچھے کر کے یعنی اس طرح توازن اور تناسب بگاڑ دینا۔ ان مفاہیم کے اعتبار سے تاریکی بھی اس کے معنے ہیں اور حدیں توڑ کر کسی چیز کو بے جگہ رکھ دینا بھی اس کے معنے ہیں۔

دوسروں کے حق کو دبا لینا، دوسروں کی چیزیں زبردستی چھین لینا، کسی کے واجبات کم کر دینا، حقوق انسانیت میں کسی بھی شکل میں کمی کر دینا، حدود شکنی اور تجاوز سب ظلم کی مختلف شکلیں ہیں۔ تاریکی کے مفہوم کے لحاظ سے ظلم کے معنے ہوں گے اس جگہ سے روشنی کو معدوم کر دینا جہاں روشنی ہونی چاہیئے۔ روشنی کی صورتیں کیا کیا ہیں ان کو سامنے رکھیئے تو واضح ہو جائے گا کہ انسان کہاں کہاں ظلوماً جہولاً ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چونکہ اندھیرے میں چیزیں اپنے مقام سے ادھر اُدھر ہو جاتی ہیں اس لئے ہر قسم کی زیادتی کو، چیزوں میں کمی کرنے کو، قدروں کے گھٹانے بڑھانے کو، خود لینے اور دوسروں کے حقوق و واجبات پورے نہ کرنے کو ظلم کہا جاتا ہے۔ چند مزید قرآنی ارشادات یہ ہیں۔

۱۔۔۔ یتیموں کا مال ظلم سے کھا جانے والے اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں (۱۰ : ۴)

۲۔۔۔ وحی کو افترا کہنا ظلم اور جھوٹ ہے (۳۷ : ۷)

۳۔۔۔ دوسروں کا مال کھا جانے والے ظالم ہیں۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا (۳۰ : ۴)

۴۔۔۔ ننانوے دنبیوں والا غریب کی ایک دنبی چھیننا چاہے تو یہ ظلم ہوگا (۲۴ : ۳۸)

۵۔۔۔ محض دنیاوی زندگی کے مفادات کو مقصود بنا لینا ظلم ہے (۱۱۶ : ۲)

۶۔۔۔ ظالم دوسروں کی محنت پر تن آسانی سے زندگی گزارتا ہے (۱۱۶ : ۱۱)

۷۔۔۔ آسمانی دعوتِ انقلاب (قرآن) کی مخالفت ظلم ہے (۱۱۷ : ۱۰، ۱۰۳ : ۷، ۲۷ : ۷)

۸۔۔۔ اپنے ہی جذبات کا اتباع کرنے والا ظالم ہے (۲۹ : ۳۰)

۹۔۔۔ غیر خداوندی قوتوں کی حکومیت اختیار کرنے والے ظالم ہیں (۲۲، ۲۳ : ۴۷)

۱۰۔۔۔ خدا کے خلاف افترا کرنا بہت بڑا ظلم ہے (۹۳ : ۲)

۱۱۔۔۔ غلط نظریۂ زندگی ظلم ہے (۲۷ : ۱۴)

۱۲۔۔۔ اللہ کی مساجد کی آبادی کے رستے میں روک پیدا کرنا ظلم ہے (۱۱۴ : ۲)

ٔ افترا اپنی طرف سے بات بنا کر دوسرے سے منسوب کر دینے کو کہتے ہیں۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۱۳۔ شہادت کا چھپانا (یا اللہ کی طرف سے جو علم حاصل ہوا سے چھپانا) ظلم ہے (۲:۱۴۰)
۱۴۔ اختلافات پیدا کرنا ظلم ہے (۴۳:۶۵)
۱۵۔ کسی بے گناہ کو پکڑ لینا ظلم ہے (۱۲:۷۹)
۱۶۔ حدود اللہ سے تجاوز کرنا ظلم ہے (۲:۲۲۹)
۱۷۔ کفار یا دشمنوں سے دوستداری رکھنے والے ظالم ہیں (۹:۲۳، ۶۰:۹)
۱۸۔ قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار کرنے والے ظالم ہیں (۲:۲۵۴)
۱۹۔ منافقت ظلم ہے (۲۴:۴۹،۵۰)
۲۰۔ مترفین ظالم ہوتے ہیں (۲۱:۱۱-۱۵)
۲۱۔ کسی مُربّی سے خیانت کرنا ظلم ہے (۱۲:۲۳)
۲۲۔ قومیں ظلم کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ (۶:۴۷)۔ (۸:۵۴)
۲۳۔ اہل جہنم نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا (۴۳:۷۶)
۲۴۔ قانون کی خلاف ورزی یا لغزش بھی اپنے آپ پر ظلم ہے (۴:۶۴)
۲۵۔ اُمت مسلمہ کے تین طبقے ہیں۔

۱۔ اَلسَّابِقین فی الخیرات
۲۔ مُقتصد اور
۳۔ اپنے آپ پر ظلم کرنے والے (۳۵:۳۲)

۲۶۔ غلط معاشرے میں بیٹھے رہنا اور وہاں سے ہجرت نہ کرجانا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے (۴:۹۷)
۲۷۔ اللہ کے سوا اوروں کو سرپرست بنا لینا ظلم ہے (۱۰:۱۰۶-۴۲:۸،۹)
۲۸۔ اللہ انسانوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے (۲:۲۵۷) اور طاغوت انہیں روشنی سے تاریکی کی طرف لے جاتا ہے (۲:۲۵۷)
۲۹۔ ظالمین ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں (۶:۱۳۰)
۳۰۔ ظلم کی وجہ سے پورا معاشرہ لپیٹ میں آجاتا ہے (۸:۲۵)

گزشتہ سطور میں ندی کی مثال پیش کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ اس کے کنارے اس کی روانی اور تیزی کو قوت و استحکام عطا کرتے ہیں۔ اگر ندی اپنے کناروں سے باہر آجائے تو اس کا پانی میدانوں میں پھیل جائے گا۔ خشک ریت اسے جذب کرے گی اور ندی کی قوت و شوکت اور روانی بلکہ زندگی تک ختم ہو جائے گی۔ بالکل یہی صورت انسان کی رُوحانی زندگی کی ہے۔ افراد اور اقوام کی شوکت و سطوت اور آزادی و استحکام کا دارومدار بھی چند حدود و قیود کے اندر رہنے پر ہے۔ عربی زبان میں حد اور پیمانے سے باہر ہو جانے کو طغیٰ کہتے ہیں۔ پانی کا مقررہ اندازے سے بڑھ کر سواحل سے باہر ہو

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جانا طغیانؔ ہے۔ یہیں سے طاغوت کا لفظ نکلا ہے جس نے معنے ہیں وہ غیر خدائی قوت جو کسی کو سیدھی راہ سے بہکا کر غلط راستوں پر ڈال دے اور اللہ کے قوانین سے سرکشی اختیار کرے۔ سرکشی شیطانی خاصیت ہے شیطان جن چھ برائیوں کا سرچشمہ ہے ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے (یعنی گستاخی، حسد، نافرمانی، تکبر، مکاری یا جھوٹ اور دعوتِ مبارزت) یہ تمام زمائم راہِ راست سے ہٹ جانے اور کناروں کو توڑ کر باہر نکل جانے کا نتیجہ ہیں۔ اسی ضمن میں ایک اور لفظ "معصیت" بھی غور طلب ہے۔ اونٹ کے اس بچے کو الْعَاصِیْ کہتے ہیں جو ماں کے پیچھے چلنے کی بجائے اِدھر اُدھر نکل جاتے۔ جو لوگ اللہ کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں وہ صحیح راستے پر چلتے ہیں اور فوز و فلاح کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ حدود و قیود توڑ کر صحیح راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی تباہ کن روش اختیار کر لینے کی وجہ سے کبھی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ لق و دق صحراؤں کے بے آب و گیاہ میدان ان کی زندگی کے پانی کو جذب کر لیتے ہیں اور ان کا نام و نشان تک بھی باقی نہیں رہتا۔ سرکشی اور نافرمانی کی یہی روش معصیت ہے۔

سورۃ البقرہ میں عِصْیَانؔ کے ہم معنی ایک اور لفظ اِعْتِدَاءؔ بھی استعمال ہوا ہے (۲:۶۱) اَلْعِدَیٰ اجنبی لوگوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ اس مادے میں دوری کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی دوری کا اور افتراق کی وجہ سے عَدُوّؔ دشمن کو کہتے ہیں۔ عَدْوٌؔ کے اصل معنے ہیں حد سے بڑھ جانا، باہمی مطابقت اور ہم آہنگی کا نہ ہونا۔ اگر یہ عدمِ مطابقت رفتار کے اعتبار سے ہو تو اسے عَدْوٌؔ کہتے ہیں۔ دلی کیفیت کی بنا پر ہو تو یہ عَدَاوَۃؔ ہے اور اگر عدل و انصاف میں افتراق کی وجہ سے ہو تو اسے عُدْوَانؔ کہیں گے۔ اس کے معنے بزور اور بدترین طریقے سے حدود پھلانگ جانا بھی ہے۔ جب بیماری ایک سے دوسرے کی طرف بڑھ جائے تو ہم اسے متعدی کہتے ہیں۔ اِعْتِدَاءؔ اور عِصْیَانؔ سرکشی اور نافرمانی اور حدود فراموشی کے اعتبار سے ہم معنی ہیں۔

جو شخص قرآنی اقدار و احکام سے سرکشی اختیار کرتا اور نافرمان رہتا ہے۔ وہ فی الحقیقت حقوقِ انسانیت کی بھی حد شکنی کرتا ہے کیونکہ وہ اُن چیزوں کو کم کر دیتا ہے جو دوسروں کا حق بنتی ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ بزعم خود اپنی ملکیتوں میں اضافہ کر دیتا ہے یہ اس کی کج فہمی ہے۔ دنیاوی اشیا کی تعداد اور مقدار تو شاید بڑھ جائے گا لیکن اس فعلِ شنیعہ سے اس کی اپنی ذات میں جو کمی واقع ہونی لازمی ہے اور جو واجبات اس نے دوسروں کے کم کر کے دوسروں کے ارتقا کو روکا ہے اس کا مداوا نہیں کر سکتا۔ حقوق اور واجبات کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے سلسلے میں مومن کے لئے انتہائی لازمی ہے۔ کہ وہ عدل و حیاۃ کا دامن کسی بھی صورت میں نہ چھوڑے۔ اُسے تو دنیا کے اندر حسن و خوبی کو واپس لانا ہے جہاں کہیں بھی یہ چھین لی گئی ہے یا جہاں کہیں بھی اس میں نقص واقع ہو گیا ہے۔ چیزوں کے اپنے اصل مقام سے اِدھر اُدھر ہو جانے سے بے ترتیبی اور بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے، توازن بگڑ جاتا ہے، تناسب خراب ہو جاتا ہے اور ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس ابتری کی کیفیت کے لئے قرآن حکیم نے فساد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ الفاظ کے معنے ان کے اضداد کے ذریعے بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔ فساد کی ضد صلاح آتی ہے لہٰذا پہلے صلاح کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے تاکہ فساد کے لفظ کی گہرائی اور وسعت سامنے آ جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ قرآن حکیم میں ایمان کے ساتھ بکثرت عمل صالح کا ذکر آیا ہے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

صلاح کے معنے ہیں

۱۔۔۔ نقائص کا دُور کرنا اور کمی کو پورا کرنا (۲۱: ۹۰)
۲۔۔۔ امن اور سلامتی
۳۔۔۔ اشیاء کو اپنی صحیح جگہ پر رکھنا
۴۔۔۔ جن چیزوں کا توازن یا تناسب بگڑ گیا ہے اُن کو دوبارہ درست کرنا (۱۲۰:۹)
۵۔۔۔ صحت اور تندرستی (۷: ۱۹)

صحیح عمل وہ ہے جو انسان کی خفتہ تعمیری صلاحیتوں کو بیدار کرے اور جو اسے زندگی کی ارتقا پذیر راہوں پر چلنے کے قابل بنا سکے، یہ عمل عدم توازن کو دُور کر کے معاشرتی زندگی کے حُسن کو قائم و برقرار رکھتا ہے۔ وہ اعمال جو محض مشینی انداز سے وقوع پذیر ہوتے ہیں ارادے کے تحرک اور ذوقِ فعالیت سے عاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے کوئی تعمیری نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ ایمان بھی جو محض زبانی اقرار تک محدود رہ جاتا ہے، عمل صالح کا محرک نہیں بنتا۔ لہٰذا ہر صحیح عمل کو قرآن حکیم کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی معیار نہیں ہے۔ انفرادی سوچ کا فیصلہ شدہ عمل بھی صحیح ہونے کی ضمانت نہیں دے سکتا جب تک عقل وحیٔ ربانی کی متابعت اختیار نہ کرے۔ قرآن حکیم نے ہمیں اعمال صالح کی کوئی جامع اور مانع فہرست بنا کر نہیں دی کیونکہ ایسا کرنے سے انسانی اختیار اور ارادے کی آزادی فعال نہ رہ سکتی۔ قرآن حکیم نے یہ کہکر ہمیں صحیح اور یقینی رہنمائی دے دی ہے کہ جو اعمال صلاح کے مذکورہ معانی کے مطابق ہیں وہ درست ہیں اور جو ان کے خلاف ہیں وہ غلط ہیں یہ چیک اس لئے رکھی گئی ہے کہ انسانی اختیار و ارادہ بدلتے ہوئے حالات اور ارتقا کے نت نئے تقاضوں کے مطابق مندرجہ صدر حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود آزادانہ فیصلہ کرے کہ کون سے اعمال صالح اور کون سے غیر صالح ہیں۔ جب ایمان اور عمل صالح دونوں ہم آہنگ ہو کر سامنے آتے ہیں تو اس کا نتیجہ سیرت و کردار کی بلندی اور پاکیزگی میں برآمد ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک آگے بڑھ جائے (عُدوان) یا کوئی ایک پیچھے رہ جائے (اِثم) تو نتیجہ "فساد" ہوگا اور دنیا میں ابتری ناہمواری بے ترتیبی، بدنظمی اور عدم توازن کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ پس "فساد" کے معنے ہیں بے ترتیبی، بدنظمی، اُونچ نیچ، ہر چیز کا زیر و زبر ہو جانا، غیر واضح صورتِ حالات، بگاڑ، تخریب، شکست و ریخت وغیرہ۔ قرآن حکیم نے یہ لفظ جن معنوں میں استعمال کیا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔۔۔ لاقانونیت اور امن و سلامتی میں خلل (۱۷: ۴)
۲۔۔۔ معاشی ناہمواریاں (۲۷: ۸۵-۱۴: ۸۵ - ۲۶: ۱۸۳-۲۹: ۳۶)
۳۔۔۔ یتامیٰ کے معاملات درست نہ کر سکنا (۲: ۲۲)
۴۔۔۔ جارحیت کا انسداد نہ کر سکنا (۲: ۲۵۱)
۵۔۔۔ صداقت کو تسلیم کرنے سے انکار اور لوگوں کو بھی اللہ کی راہ پر چلنے سے روکنا (۱۶: ۸۸)
۶۔۔۔ وسائل سے بڑھ کر خرچ کرنا (اسراف و تبذیر) (۲۶: ۱۵۱-۱۵۲)
۷۔۔۔ اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدوں کو توڑ ڈالنا اور بنی نوع انسان کو فرقوں اور پارٹیوں میں منقسم کرنا (۱۳: ۲۵-۲: ۲۷)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۸۔ قارون کی سرمایہ دارانہ ذہنیت (۲۸ : ۷۷)

۹۔ ملوکانہ سیاست جو

ا۔ لوگوں کو مخالف گروہوں میں تقسیم کئے رکھتی ہے۔

ب۔ نااہل لوگوں کی قدر افزائی کرکے آگے لے آتی ہے اور

ج۔ قابل اور لائق اشخاص کو پیچھے دھکیل دیتی ہے (۲۸:۴ ۔ ۲۷ : ۳۴)

۱۰۔ اللہ اور رسول (یعنی قرآنی نظام معاشرت وریاست کے خلاف بغاوت

۱۱۔ فصلوں اور انسانی نسل کو تباہ کر دینا اور

۱۲۔ اعلیٰ ترین انسانوں کو ادنیٰ ترین بنا دینا (۲۷ : ۳۴)

۱۳۔ چوری (۸ : ۳۷)

۱۴۔ جنگوں کے لئے مشتعل کرنا (۵ : ۶۴)

۱۵۔ اگر حق و صداقت لوگوں کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جائے تو کائنات کی بدنظمی کی جو صورت ہوگی (۲۳ : ۷۱)

۱۶۔ اگر بہت سے خدا ہو جائیں تو کائنات کی بدنظمی کی جو صورت ہوگی (۲۱ : ۲۲)

۱۷۔ کم تولنا، کم ماپنا، لوگوں کے واجبات روک لینا، معاشی اونچ نیچ پیدا کرنا، محنت کا معاوضہ کم دینا اور لوگوں کا مال ہضم کر جانا (۲۶ : ۱۸۳ ۔ ۷ : ۸۵)

۱۸۔ دوسروں کے حقوق کو غصب کر لینا (۲ : ۶۰)

حدود شکنی اور نظم و ضبط کے قوانین توڑ ڈال کے لئے فسق اور فجور کے الفاظ بھی قرآن حکیم نے استعمال کئے ہیں پھلوں کے اوپر پتلا سا لیکن بہت مضبوط چھلکا ہوتا ہے جو اندر کے گودے کے لئے حفاظتی دیوار یا فصیل کا کام دیتا ہے اس حفاظتی دیوار کے اندر رہ کر پھل اپنے ارتقائی مدارج طے کرتا ہے اگر گودا سرکشی کر کے اس بیرونی دیوار کو توڑ کر باہر نکل آئے تو پھل کبھی پختگی اور ارتقاء کے مقام تک نہیں پہنچ سکے گا۔ قرآن حکیم سے پہلے کے ادب میں فسق کا لفظ "خول میں سے باہر نکل آنے" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن حکیم ایک ایسا معاشی اور معاشرتی نظام قائم کرتا ہے جس کے اندر رہ کر ہر فرد کو نشو و ارتقاء کے مساوی مواقع ملتے ہیں اور طریق معاشرت باہمی اشتراک عمل، تعاون، ایثار، اخوت اور محبت پر استوار رہتا ہے۔ لہٰذا جو کوئی فرد یا گروہ سرکشی کر کے اس نظام کی حفاظتی فصیل کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے اُسے قرآن حکیم نے فاسق کہا ہے۔ مثلاً یہ وہ ہے جو

ا۔ اللہ کے میثاق کو کاٹ ڈالتا ہے اور جن روابط کے جوڑنے کا حکم اللہ نے دے رکھا ہے یہ انہیں توڑ کر زمین پر "فساد" پھیلانے کا موجب بنتا ہے (۲ : ۲۶ ، ۲۷)

ب۔ جن معنوں میں ظلم کی اوپر وضاحت کی گئی ہے اُن میں ظلم کے کسی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

فعل کا ارتکاب کرتا ہے (۲: ۵۹)

ج۔ جو ایمان نہیں لاتا اور کفر کی زندگی کو بسر کرتا ہے (۲: ۹۹)

د۔ معاشرتی نظم و ضبط کے قوانین سے فرار کی راہیں ڈھونڈتا ہے (۳: ۸۱)

ھ۔ جو قوانین شکنی کرتا ہے اور جرائم کا ارتکاب کرتا ہے (۵: ۳)

پھل کی حفاظتی دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ بھی سارے پھل کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے اس لئے فسق ناقابل معافی جرم ہے۔ اس کی کچھ مزید شکلیں یہ ہیں:۔

۱۔ اپنے نشوونما دینے والے رب کے احکام کی نافرمانی (۱۸: ۵۰)

۲۔ کفر و انکار (۴۶: ۲۰ - ۲: ۹۹)

۳۔ اللہ کی آیات کا انکار و تکذیب (۶: ۴۹)

۴۔ اللہ کی تنبیہات کو بھول جانا (۷: ۱۶۵)

۵۔ لوط کے لوگ جو گھناؤنا جرم کرتے تھے (۲۹: ۳۴، ۲۱: ۷۴)

۶۔ قسمت کے کھیل مثلاً لاٹری وغیرہ اور بت پرستی (۵: ۳)

۷۔ حرام اشیاء کا کھانا (۶: ۱۴۶)

۸۔ وحی کے مطابق فیصلے نہ کرنا (۵: ۴۷)

۹۔ منافقت (۹: ۶۷)

۱۰۔ تہمت طرازی (۲۴: ۴)

۱۱۔ حق کی خلاف ورزی (۴۶: ۳۵)

۱۲۔ اللہ کو فراموش کر دینے سے خود فراموشی کا مرتکب ہونا (۵۹: ۱۹)

۱۳۔ جھوٹی گواہی دینا (۵: ۱۰۸)

۱۴۔ اللہ اور رسول پر والدین، بھائیوں، بہنوں، رشتہ داروں، دولت اور جائیداد کو ترجیح دینا جب جہاد کے لئے بلایا جائے (۹: ۲۴)

۱۵۔ لوگوں کے دلوں کو سیدھے راستے سے پھیر دینے کی کوشش کرنا (۶۱: ۵)

۱۶۔ بری نیت سے توہین آمیز نام رکھنا (۴۹: ۱۱)

دوسرا لفظ فجور ہے جو عام طور پر فسق کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کے معنے ہیں پھٹ جانا، پھاڑ دینا، حد توڑ کر باہر نکل جانا، کناروں سے باہر بہہ نکلنا، شگاف، دراڑ وغیرہ۔ اللہ نے ازراہ عنایت انسان کو شخصیت جیسی انتہائی قیمتی چیز عطا کی ہے۔ گو یہ ہر اعتبار سے ناپختہ اور نامکمل ہے۔ اسے خود انسان کو اپنے ہاتھوں سے پختگی اور تکمیل دینی ہے اور اس کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ شخصیت کے عناصر یعنی عقل، علم، جذبات و احساسات اور اختیار و ارادے کو وحی ربانی

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے تابع رکھا جائے اور اس کی رہنمائی میں اسے نشو و ارتقا دی جائے۔ جب شخصیت یا انسانی ذات (جسے قرآن حکیم نے نفس کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے) اللہ کی مرضی میں پوری طرح ڈوب جاتی ہے تو یہ مجتمع ہو کر مضبوط، توانا اور مستحکم بن جاتی ہے۔ لیکن جب انسان وحی ربانی کی متابعت چھوڑ کر جذبات کے پیچھے چل پڑتا ہے تو یہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ شخصیت کے اس طرح غیر مجتمع ہو کر پھوٹ جانے اور بکھر جانے کو "فجور" کہا جاتا ہے

معاشرتی تنظیموں کے سلسلے میں تین طرح کے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک وہ جو دل کے پورے خلوص کے ساتھ ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خوب سوچ سمجھ کر ان سے باہر رہنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو صرف اپنی چند اغراض و مفادات کے پورا ہونے کے لئے شامل ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس تیسری قسم کو منافقین کہا ہے۔ جب تک ان کے مفادات پورے ہوتے رہتے ہیں یہ تنظیم میں شامل رہتے ہیں۔ جونہی انہیں کہا جاتا ہے کہ "نقصان" میں بھی شرکت کرو اور ایثار سے کام لو تو یہ فوراً تنظیم سے باہر ہو جاتے ہیں۔ عربی زبان میں اُس سُرنگ کو جس کے دونو مُنہ کھلے ہوں نفق کہتے ہیں۔ لہٰذا مُنافق وہ ہوا جو کسی تنظیم میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس سے باہر نکلنے کا راستہ کدھر سے کھلا ہے۔ قرآن حکیم ایسے لوگوں کو بدترین قرار دیتا ہے اور مومنین کو ان سے ہوشیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔ ایک واضح اور کھلم کھلا دشمن سے بچاؤ تو ممکن ہے لیکن جو دشمن آستین میں پل رہا ہو یا جو اندر ہی اندر جڑیں کھوکھلی کر رہا ہو اس سے بچ کر رہنا بہت مشکل ہے۔ قرآن حکیم نے منافقت کو قلب کی بیماری کہا ہے۔ جب کبھی انسان کی زبان اس کے دل کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یا جب کبھی اس کا قول دل کے صحیح جذبات اور خیالات کا اظہار نہیں کرتے یا جب کبھی انسان کے اعمال اپنے محرکات کی تکذیب کرنے لگ جاتے ہیں یا جب کبھی جھوٹ اور سچ آپس میں مل جاتے ہیں یا جب کبھی انسان کے ایمان اور رویے میں فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے تو دل کی اس بیماری کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کی تباہی ہمیشہ انہی منافقین کی زیر زمین کارروائیوں کی بدولت آئی ہے۔ قرآن حکیم کی رُو سے منافقین وہ ہیں جو:-

۱۔ لوگوں کو وہ کچھ ظاہر کر کے جو وہ نہیں ہوتے دھوکا دیتے ہیں (۴:۱۴۲—۲:۸-۱۰—۹:۴۵—۵:۴۱)

۲۔ ان کی ظاہری شکل اور گفتگو انتہائی دلکش ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت یہ بدترین دشمن ہوتے ہیں (۶۳:۴-۲:۲۰۴)

۳۔ خیرات صدقے پر اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھیں (۴:۳۸-۲:۲۶۴)

۴۔ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ سے اونچے ہو جائیں گے۔ حتےٰ کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اس انداز سے کہ لوگ انہیں دیکھیں۔ (۴:۱۴۲)

۵۔ اجتماعی قومی کاموں میں چندہ نیم دلی سے دیتے ہیں۔ بلکہ لوگوں سے بھلائی بھی کرتے ہیں تو ان پر منت چڑھا کر اور رنجیدہ خاطر بنا کر کرتے ہیں (۲:۲۶۳-۹:۵۴)

۶۔ حوصلہ شکن افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں (میدان جنگ میں) وہ دائرے سے باہر رہ کر سازش کرتے ہیں۔ اور دائرے کے اندر رہ کر مرکز کے نزدیک ترین پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیشہ ذاتی قربانی دینے سے گریز کرتے ہیں اور کبھی خطرات میں نہیں پڑتے۔ ان کا کام شکوک و شبہات پیدا کرتے رہنا ہے۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کتابیات

۱۔ قرآن حکیم ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب ، شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ...... لاہور
مع تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی شائع کردہ تاج کمپنی ...... لاہور

۲۔ تفہیم القرآن مولانا ابو الاعلیٰ مودودی شائع کردہ ادارہ ترجمان القرآن ...... لاہور

۴۔ روشنی شائع کردہ شعبہ مطبوعات پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کراچی ۱۹۷۷ء

۵۔ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں۔ جی۔ اے پرویز شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام گلبرگ ...... لاہور

۶۔ لغات القرآن " " " " " " " ...... لاہور

۷۔ تبویب القرآن " " " " " " " ...... لاہور

۸۔ کتاب التقدیر " " " " " " " ...... لاہور

۹۔ شاہکار رسالت " " " " " " " ...... لاہور

۱۰۔ خطبات مدارس۔ سلیمان ندوی

۱۱۔ مفردات القرآن۔ امام راغب اصفہانی

۱۲۔ تصوف میر ولی الدین

۱۳۔ اسماء الحسنیٰ سلطان منصور پوری

۱۴۔ اصل و اصول شیعہ ...... رضا کار بک ڈپو۔ لاہور

1. Allamah Abdullah Yusuf Ali, The Holy Qur'an, Translation and Commentary, Muhammad Ashraf, Lahore.
2. Khalifah Abdul Hakeem, Islamic Ideology, Institute of Islamic Culture, Club Road, Lahore.
3. Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.
4. Erich Fromme, To have or To Be,
5. A.C.Campbell, A Psycnological Study of Religion.
6. Whitehead, Adventures of Ideas.
7. Whitehead, Science in the Modern World.
8. William Moore, Life of Muhammad.
9. Julian Huxley, Religion without Revelation.
10. Joad, God and Evil.
11. Old and New Testaments.
12. Hartwig Hirschfield, New Researches in the Composition and Exegeses of the Holy Qur'an.
13. Nehru, The Discovery of India.
14. Sir John Hamilton, Universal Encyclopaedia.
15. Parwez, Islam, A Challenge to Religion,
16. W.M.Urban, Humanity and Deity.
17. Sorley, Moral Values and The Idea of God.
18. Whittaker, Introduction to Psychology.
19. Harper and Row Publishers, The Science of Behavior Psychology.
20. The Science of Interpersonal Behavior.

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

"ڈاکٹر مہر عبدالحق"

اتحاد بین المسلمین کی اساس

(توحید ربانی کا عملی نفاذ)

لاَ اِلٰہ گوئی، بگو از روئے جان | تا ز اندامِ تو آید بوئے جان
مہر و مہ گردد ز سوزِ لا اِلٰہ | دیدہ ام این سوز را در کوہ و کہ
این دو حرفِ لا اِلٰہ گفتار نیست | لاَ اِلٰہ جز تیغِ بی زنہار نیست

زیستن با سوزِ او قہاری است
لاَ اِلٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اِتحادِ بَینَ المُسلمِین کی اَساس

(توحیدِ ربّانی کا عملی نفاذ)

کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج ہمیں اُس عظیم قوم کو پھر سے متحد ہو جانے کی بات کہنی پڑ رہی ہے جس نے پوری انسانیت کو نفسِ واحد کا لقب دے کر ابنِ آدم کی تکریم کا درس دیا اور ملتِ بیضا کو مستقل قدروں کی بنیاد پر اُستوار کر کے دُنیا کو "قومیت" کے صحیح ترین مفہوم سے روشناس کرایا۔ یہ ضرورت اس لئے پیش آ رہی ہے کہ لمحۂ موجود کا اسلامی معاشرہ یکجہتی کی بجائے بہت سے خود پیدا کردہ تضادات کا شکار ہو چکا ہے۔ طبقات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ مادّی مفادات متصادم ہو رہے ہیں۔ تنظیم و تقسیم نے رقابتیں پیدا کر دی ہیں۔ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے آپ کو معاشرتی رُتبے کے اعتبار سے دوسروں سے یا تو بہت ہی بلند اور افضل سمجھتے ہیں یا بہت ہی پست اور فروتر جاننے لگے ہیں۔ اس سے ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مصنوعی امتیازات کا رنگ گہرا اور نمایاں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ زر و مال کی فراوانی کو شرافت اور تکریم کا معیار بنا لیا گیا ہے۔ صاحبِ اقتدار سفید فام قوموں میں تعصبات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اعلیٰ ہوٹلوں، تفریح گاہوں، ذرائع سفر، حتیٰ کہ ہسپتالوں اور تعلیمی درسگاہوں میں بھی کالی یا ملیح رنگت کے لوگوں کا داخلہ بند ہے۔ ان میں صرف یورپ اور امریکہ کے گورے ہی جا سکتے ہیں۔ غلطی سے کوئی دوسرا چلا جائے تو وہ پٹتا اور گالیاں کھاتا ہے۔ اس مسلسل اور متواتر رویّے سے اسلامی معاشرہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اگرچہ ہمارے نوجوانوں میں درگزر اور رواداری کی اسلامی روایات ابھی تک برقرار ہیں تاہم ان میں تشدّد پسندی کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہر شخص خواہ وہ گلی میں ہو یا گھر کے اندر ہو، بازار میں ہو یا دفتر، مدرسہ اور مسجد وغیرہ میں ہو، جارحیت کا شیدائی بنتا جا رہا ہے۔ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتا ہے، بات بات پر طیش میں آ جاتا ہے، ہر دوسرا شخص اُسے غاصب دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ماں باپ، بہن بھائیوں اور دوستوں پر سے بھی اُس کا اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ اپنائیت کی جگہ غیریت نے لے لی ہے اور پھر اس کے لئے غیر کا وجود برداشت کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

مغرب کی ثقافتی یلغاروں کی بنیاد چند مفروضہ فضیلتوں پر ہے۔ ان کی ظاہری چکا چوند سے ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں خیرہ ہوتی جا رہی ہیں۔ منفی تہذیب کی یورش کا سدِّباب کرنے کے لئے ہماری طرف سے کوئی مؤثر اقدامات نہیں ہوئے تو یہ نوجوان اعصابی تناؤ کے مریض بن چکے ہیں۔ ہر نوجوان، اپنے آپ پر مشتمل، ایک تن تنہا جزیرہ ہے، ساری دُنیا سے منقطع، الگ تھلگ، سپاٹ اور بے کیف! وہ اب ایسی منقطع اکائی ہے جو سوچنے اور فکر کرنے کے عمل سے بھی گھبراتا ہے، بلکہ اس نعمت سے تقریباً محروم ہو چکا ہے۔ وہ تدبّر کو خشک اور لاحاصل شغلہ سمجھتا ہے اور اسی وجہ سے محنت سے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

بھی دور بھاگتا ہے اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے سہل الحصول قسم کی کامیابیاں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کی کشمکش میں حصّہ نہ لینے کے باعث وہ سطحِ آب پر تنکے کی مانند تند و تیز لہروں کے رحم و کرم پر بہتا چلا جا رہا ہے۔ چونکہ ذاتی سوچ سے محروم ہے اور دوسروں کی سوچ سے مرعوب ہو کر انہی کے راستوں پر چلنے میں اپنی نجات سمجھتا ہے۔ اس لئے بے ذہن انسانوں کے مجمعے کی طرف لپکتا ہے، بے فکروں کی ٹولی میں اپنی اَنا کی تسکین تلاش کرتا ہے اور صاحبِ فکر، اہلِ علم و دانش نیز عمل طلب کرنے والے جہاندیدہ بزرگوں سے گھبراتا ہے۔ "اپنی نظر" کھو بیٹھنے والا یہ نوجوان سوچ بچار سے تہی دامن ہو کر کھوکھلے نعروں کا گرویدہ ہو گیا ہے اور تخریب کاری میں لذّت محسوس کرنے لگا ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے ذہین اور ہونہار مگر فریب خوردہ نوجوان ہماری آنکھوں کے سامنے باطل نظریات کی طوفانی لہروں میں غرق ہو رہے ہیں اور ہم ساحل پر کھڑے تماشائی بن کر ان کے ڈوبنے کا نظارا کر رہے ہیں۔ ہمارے قریب مُشتبہ شکل و صورت اور پُر وقار وضع قطع کے ایسے لوگ بھی صف در صف موجود ہیں جنہیں منصبًا ان ڈوبتے ہوؤں کو بچا لینے پر مامور کیا گیا تھا، مگر یہ آپس کے بے بنیاد جھگڑوں اور بے مقصد آویزشوں میں ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ کسی کو ان ڈوبنے والوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ لینے کی فرصت بھی نہیں ہے بلکہ انہیں نہ اپنی سُدھ بُدھ ہے نہ سمندر کی تلاطم خیزیوں کا علم ہے اور نہ کسی کی غرقابی کا کوئی دُکھ ہے۔ اُفقِ مغرب سے پئے بہ پئے سر بفلک موجیں رقص کرتی ہوئی آ رہی ہیں اور نوجوانوں کی ٹولیوں کی ٹولیوں کو اپنی آغوش میں اُٹھا کر لے جا رہی ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ ان کے پاس "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا جو حفاظتی سامان تھا وہ اس کا صحیح استعمال بھول چکے ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ ڈوبنے والوں اور ان کے بچانے والوں کے زاویۂ نگاہ، اندازِ فکر اور طبعی میلانات بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے ہیں یا کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت انہیں مختلف بلکہ متضاد بنا دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ملوکیت (جس کا ذکر قرآنِ حکیم نے فرعون کے علامتی استعارے سے کیا ہے)، سرمایہ داری (بعلامتِ قارون) اور عسکری و نیم مُلائی پیشوائیت (بہ علامت ہامان) دینِ برحق کے خلاف اسی قسم کی مذموم سازشیں کرتی رہتی ہیں۔ الغرض عصرِ حاضر کا اوّلین اور اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اور ایک منظّم عملی جہاد کا جذبہ پیدا کر کے عالمِ اسلام کے نوجوانوں کو جدید جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکالا جائے اور آہوئے رم خوردہ کو تعلیم و تلقین و ترغیب کے دانشمندانہ طریقوں سے پھر سوئے حرم لایا جائے۔ اِن طریقوں میں سب سے زیادہ اہم اور مؤثر طریقہ باہمی احتساب و تادیب کا طریقہ ہے جسے قرآنِ حکیم نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لازمی تعلیم کا بنیادی ستون بنا کر حکومتِ اسلامیہ کا فریضہ قرار دیا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ عظیم انقلاب کے بعد اسلامی جمہوریۂ ایران نے اس ارشادِ ربّانی کے عملی نفاذ کو اوّلیت دی ہے اور اس کے متوقع نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ اسلامی جمہوریۂ ایران اس پروگرام کو اور زیادہ فعال بنائے گی اور عالمِ اسلام کی دوسری مملکتیں اپنے اصلاحی پروگراموں میں اسے سرِ فہرست رکھنے پر سنجیدگی سے غور کریں گی۔

اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے ہم سب مسلمان ہیں اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ہمارے پریشان اور مضطرب

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

گرویدۂ تہذیبِ مغرب نوجوان بھی مسلمان ہیں اور اپنی ذہنی کشمکش اور عقل و خرد کی راہِ گم گشتگی کے باوجود مسلمان ہیں. لیکن معدودے چند لوگوں کے سوا، جنہوں نے سعیٔ بلیغ کرکے اسلام کو قلب و نظر کی گہرائیوں میں اتار لیا ہے، باقی سب اس لئے مسلمان ہیں کہ یہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے اور اسلامی رسوم و رواجات کے ماحول میں پرورش پاتے رہے. مبادیات کے ظواہر کے علاوہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے. نوجوانوں کی مستعار نظریات سے اثر قبول کرلینے کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ تعلیم و تعلّم کی ذمہ دار ایجنسیوں مثلاً والدین، اساتذہ، علماء، دانشوروں، ذرائع ابلاغ، معاشرے کے جہاندیدہ افراد، عام کاروباری لوگوں اور ہم عمر ساتھیوں نے غفلت برتی اور نئی نسل کو سطحی اور سرسری معلومات تک محدود رکھا۔ اس طرح کی غفلت کے تین پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ بچہ جب عمرِ شعور کو پہنچ جاتا ہے تو معلمین فرض کرلیتے ہیں کہ متعلّم فلاں چیز بھی جانتا ہے اور فلاں چیز بھی جانتا ہے۔ حالانکہ اسے کسی نے کبھی کچھ نہیں بتلایا ہوتا اور اب عمرِ شعور کو پہنچ کر وہ از خود پوچھنے سے شرماتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، اتنا بڑا ہوکر اسے معمولی سی فلاں بات کا بھی علم نہیں ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تعلیم دینے والی ہر ایجنسی یہ کہنے لگ جاتی ہے کہ فلاں بات بتانا میرا کام نہیں فلاں دوسری ایجنسی کا کام ہے۔ یعنی والدین اساتذہ پر چھوڑ دیتے ہیں، اساتذہ علماء کا فریضہ سمجھتے ہیں، علماء دانشوروں اور بزرگوں پر ذمہ داری ڈال دیتے ہیں اور اس طرح بچہ جوانی تک پہنچ کر بھی بعض اہم معلومات سے محروم رہ جاتا ہے۔ تیسرا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تمام تعلیمی ایجنسیاں یہ کہنے لگ جاتی ہیں کہ بچہ جب جوان ہوجائیگا تو فلاں فلاں بات اُسے خود بخود معلوم ہوجائیگی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خاصی بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اکثر لوگ بہت سی باتوں میں کورے رہ جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ حصولِ علم ایک مسلسل، متواتر اور جاری عمل کا نام ہے جو آخری دم تک ختم نہیں ہوتا۔ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی دعا "رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا" (۲۰:۱۱۴) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، ورنہ مدینۃ العلم کو، جس کا دروازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسی بلند پایہ، اعلیٰ اور ارفع شخصیت ہو اُسے یہ آرزو کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ الغرض جب طاغوتی قوتوں نے دیکھا کہ دنیا بھر کا مسلم نوجوان علم و شعور میں ناپختہ ہے، اپنے شعائر کی حکمت سے ناواقف ہے، دین کی اصطلاحات کو صرف بالائی، ظاہری اور سطحی حد تک جانتا ہے اور فرائض کو بھی صرف عادتِ مستمرہ کے طور پر ادا کرتا ہے، ان کی غرض و غایت سے نابلد ہے تو انہوں نے مفسدہ پردازیوں کے کئی محاذ کھول دیئے۔

چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری روزِ اوّل سے ہی جاری ہے۔ قوم المسلمین کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے جو حربے پچھلے چودہ سو سال سے استعمال ہورہے ہیں ان کا مختصر سا جائزہ لینے کے لئے بھی کئی دفتر درکار ہیں۔ پہلے لڑائیوں اور صلیبی جنگوں کو آزمایا گیا۔ (یہ سلسلہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اب بھی جاری ہے) اور اس طرح توحید کے پرستاروں کے وجود ہی کو دُنیا سے ختم کرڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں ناکامی ہوئی تو مسلمانوں پر معاشی اور اقتصادی زبوں حالی مسلّط کردی گئی۔ لیکن جب یہ عظیم قوم فقر و فاقہ کی کڑی آزمائشوں میں بھی کامیاب اور کامران رہی اور ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط اور ناقابلِ شکست ثابت ہوئی تو اس کی راہوں میں مکر و فریب کے دام ہائے تذویر بچھائے جانے لگے۔ اب ایسی عیارانہ پالیسیاں بنائی جانے لگیں جن سے اس آہوئے حرم کے دل میں اپنے آپ ذوقِ نخچیری پیدا ہوجائے۔ ان پالیسیوں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

کے وضع کرنے پر یہودی سرمایا پانی کی طرح بہایا گیا۔ وہ قومیں جو بزعم خود بڑی مہذب اور متمدن ہیں اس سرد جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہی ہیں۔ مکیاؤلی کی مقصد پرستی استحصالی ذہنیت کو ابھار رہی ہے۔ مارکسی جدلیت کے انکار فرڈیت (Individualism) کے شعلوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ یہ وہ فکرِ ابلیسی جس کے تحت فرد اور معاشرہ دونوں ایک دوسرے سے منقطع ہوکر اپنی قوت اور شوکت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجاتے ہیں۔ سائنسی آلات اور ایجادات میں برتری حاصل کرنے کا شوق تعمیر کی بجائے تخریب کی طرف رواں دواں ہے۔ مہلک سے مہلک تر ہتھیاروں کی تیاری اور فراہمی میں اور انہیں ترقی پذیر قوموں کے ہاتھوں بیچنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا خبط مادہ پرستی کے بے مثال فلسفے کو ہر لمحے آگے بڑھا رہا ہے۔ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے روحانی قدروں کی آنکھ عارضی طور پر خیرہ ہوگئی ہے۔ ابلاغِ عامہ اور نقل وحمل کے جدید ترین اور تیز رفتار ذرائع نے مذہب اور اخلاقیات پر پے در پے حملے کرکے کفر والحاد اور لادینیت کو عام کر دیا ہے اور بے حیائی کی باتوں کو پھیلا دیا ہے۔ گویا مغرب کی نفسیاتی جنگ نے اہلِ اسلام کو مغلوب بنانے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور فرعون، قارون اور ہامان پھر زندہ ہوکر ایک دوسرے کی دستگیری اور پشت پناہی کر رہے ہیں۔ یہ دائرہ مذموم (Vicious Circle) مکارانہ چالوں، دھوکے فریب اور عیاریوں کے مختلف بھیس بدل بدل کر توحید کے پرستاروں کے اندر فکری انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ ثقافتی یلغاریں ان کی تازہ ترین مثال ہے۔

ہم مسلمان ہیں اور عقیدہ توحید ہماری حیاتِ اجتماعیہ کا اصل الاصول ہے۔ آیئے بطور اعادہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے، مسلمین کون ہیں، ان میں اخوت کا رشتہ کیسا ہے، قوم اور اسلامی قومیت کا تصوّر کیا ہے اور وحدتِ ملی کے عناصر ترکیبی کیا ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی فلاح اور تعمیر وارتقاء کے لئے جو مکمل، بے عیب اور دائمی ضابطۂ حیات مقرر فرمایا ہے اُسے اَلْاِسْلَامُ کا نام دیا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳:۱۹): بے شک "دین" اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ اس دین کے اختیار کرنے والے مُسلمین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ دائمی مکمل اور آخری آئینِ حیات کے طور پر جانتے، پہچانتے اور مانتے ہیں اور اس پر صدقِ دل سے عمل کرتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: (اے نبی) تم اپنی لوگوں کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ پس وہی فرماں بردار ہیں۔" (۳۰:۵۳)

سلام، اسلام، مُسلم وغیرہ الفاظ کا مادہ س۔ل۔م ہے جس کے بُنیادی مفاہیم پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ ان کی نمایاں صفات آٹھ ہیں:

(۱) سلامتی اور عافیت (۲) بے عیب اور بے نقص ہونا (۳) ارتقاء (۴) اطاعت (۵) صلح وصفائی اور نظم وضبط (۶) اعتدال وتوازن (۷) تکمیل اور بار آوری (۸) حسن وزیبائی۔

ہمارے نوجوانوں کو دیکھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے سوا اور کوئی مذہب، کوئی نظریہ اور کوئی طریقِ حیات بیک وقت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

ان آٹھ صفات پر حاوی نہیں ہے۔ اسی طرح دین کا لفظ بھی جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے اور یہ بہت سے معنوں پر محیط ہے۔ مذہب اور الدین میں جو فرق ہے اس کی وضاحت بھی پہلے کی جا چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ اہل تحقیق کے نزدیک اس لفظ کے مختلف معنے یہ ہیں:

غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، نظم و نسق، فیصلہ، جزا و سزا، اطاعت و فرمانبرداری، حساب، تدبیر، عادت، روش، ملت۔

امام راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اَلدِّیْنُ کے معنی طاعت و جزا کے آتے ہیں اور بطور استعارہ دین بمعنی شریعت بھی آتا ہے۔

قرآن حکیم میں یہ لفظ ان تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ بقرہ (۲/۱۳۱-۱۳۲) میں رب العالمین کے احکام و قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کو اَلدِّیْنُ کہا گیا ہے۔ پھر ۳:۱۸ میں اسی کو اَلْاِسْلَامُ کہا گیا ہے۔ گویا احکام خداوندی کی کماحقہٗ اطاعت ہی اسلام اور دینِ برحق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں حیاتِ اجتماعیہ کے نظم و نسق کے سلسلے میں جتنی اصطلاحات رائج ہیں مثلاً نظامِ معاشرہ، ضابطۂ زندگی، قانونِ حکومت، آئینِ مملکت، طریقِ عدل، طرزِ حیات وغیرہ ان سب کا مفہوم اَلدِّیْن کے جامع لفظ میں موجود ہے اور اسی وجہ سے یہ مذہب یا دھرم یا مت یا ریلیجن وغیرہ سے مختلف ہے۔

اسلام کے مندرجۂ بالا آٹھ بنیادی مفاہیم اور اَلدِّیْن کے ان معانی کو اکٹھا کر لینے سے دینِ اسلام کے معنی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ

اسلام ایک ایسا آئینِ حیات ہے جس سے افراد کی ممکنہ صلاحیتوں کو نشوونما ملتی ہے، ایک کی صفت دوسرے کے کام آتی ہے اور اس طرح جمعیتِ انسانی کی تمام کمیاں پوری ہو جاتی ہیں۔

یہ وہ طرزِ حکومت و اقتدار و مملکت ہے جس سے انسان زندگی کے تمام خطرات و خدشات اور ہر قسم کے خوف اور حُزن سے محفوظ اور مامون ہو جاتا ہے

یہ ایک ایسا نظم و نسق ہے جس سے ہر فرد ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ امن و سلامتی کا محافظ بن جاتا ہے یعنی خود بھی امن میں رہتا ہے اور دوسروں میں بھی امن برقرار رکھتا ہے۔

یہ ایک ایسی اطاعت ہے جو معاشرے کو پوری ہم آہنگی کے ساتھ لے چلتی ہے اور کوئی ایسا غلط کام نہیں کرنے دیتی جس سے کہیں کوئی اشتعال پیدا ہو۔

یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو قانونِ خداوندی کے آگے سرنگوں کرا دیتا ہے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اور ہر شخص کو اسے بطیبِ خاطر قبول کر کے اس سے مکمل متابعت کراتا ہے
اور اس طرح اس کے کردار اور سیرت میں توازن اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے
اور اس کا ہر عمل تعمیری نتائج کا حامل بن جاتا ہے اور یوں ایک طرف اُس کی
" ذات " کی نشو و نما ہوتی ہے تو دوسری طرف معاشرے کے اندر حُسن و زیبائی
پیدا ہو جاتی ہے۔

الغرض اسلام "طاعت و جزا" کا وہ سیدھا راستہ ہے، وہ متناسب و متوازن اور بلندیوں کی طرف لے جانے والی شاہراہ ہے اور وہ صراطِ مستقیم ہے جو فلاحِ انسانیت کی تمام خوشگواریوں اور سعادتوں کی طرف بالیقین لے جاتی ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جنہوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کو علامت بنا کر حیاتِ اجتماعیہ کو پہلی بار مرکزیت کا تصوّر دیا از روئے قرآن حَنِیْفًا مُّسْلِمًا تھے۔ یہی وہ نام ہے جو دینِ اسلام کے متبعین کے لئے خود اللہ پاک نے تجویز فرمایا ہے۔ جس قوم میں مندرجۂ بالا صفات عملاً متشکل ہو جائیں وہ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً ہے۔ اس اُمّت کے ہر فرد کیلئے لازمی قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا زندہ و پائندہ پیغام بن جائے اور اس کے قول و عمل سے ساری کائنات کی فضا سَلٰمًا سَلٰمًا کے حیات افروز نعروں سے گونج اُٹھے۔ اس دینِ قیّم کے سوا اور کوئی ضابطۂ حیات قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ انسان ہر دوسرے نظامِ زندگی کے اتباع سے خسارے میں رہے گا۔ (۴۸ : ۳) یہ نظام پوری نسلِ انسانی کے لئے منتخب اور مقرر کیا گیا ہے اور اسی نظام پر چلنے والوں کو مُسلمین کہا گیا ہے۔ اس اعتبار سے دُنیا میں صرف دو قومیں آباد ہیں۔ ایک وہ جو دینِ اسلام کے رشتۂ اخوت میں منسلک ہے۔ دوسری وہ جو خود ساختہ اور نِت نئے نظریات کی پیروکار ہو کر متواتر اور مسلسل ذہنی انتشار میں مبتلا رہتی ہے۔

نزولِ قرآن سے پہلے نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے تمام ممالک کے انسانوں کی حالت حیوانوں سے بھی بدتر تھی۔ قدیم مصری تہذیب، دجلہ اور فرات کی وادی، ایران، یونان، رُوم، یورپ، چین، سائبیریا، ہندوستان اور بنی اسرائیل اپنے عروج کی عظمتوں کو قصۂ پارینہ کے افسانوی اور نیم دیو مالائی ادب میں دفن کر چکے تھے۔ اِن کے زوال و انحطاط کے تذکرے تاریخ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ رابرٹ بریفو کی کتاب "دی میکنگ آف ہیومینیٹی" گبن کی کتاب "ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" سے مزید معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ عربوں کی حالت زار کا نقشہ بھی بیشمار کتابوں کے ذریعے آنکھوں کے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ پوری دُنیا کی تاریکیوں کا سرسری سا جائزہ لیا جائے تو وہ اس طرح سے ہوگا کہ مذہبی سطح پر کہیں بھی ایک خُدا کا تصوّر موجود نہیں تھا۔ انسان کی پیشانی اپنے ہاتھوں سے بنائی گئی مٹی یا پتھر کی مُورتیوں کے آگے جُھک رہی تھی۔ حیوانوں، دریاؤں، پہاڑوں، درختوں، جانوروں اور زمین و آسمان کی مختلف چیزوں کے حضور رگڑی جا رہی تھی۔ یعنی انسان نے اپنے شرف اور امتیاز تک کو ادنیٰ ترین مخلوق کے حوالے کر چکا تھا۔ کائنات کے ذرّے ذرّے سے خوفزدہ اور ہراساں ہو کر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اپنی

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حقیقت سے بے خبر اور اپنے بلند مرتبے سے ناآشنا پیشوائیت اور خانقاہیت کی لعنت میں بری طرح پھنس چکا تھا۔
افلاطونی فلسفہ ہر حقیقت کو خواب اور خیال کا لباس پہنا رہا تھا۔ بدھ مت کی مایوسیوں اور ناامیدیوں نے زندگی کے گل و گلزار کو اداسیوں کا پُرخار جنگل بنا دیا تھا۔ آواگون (تناسخ ارواح) کے عقیدے نے انسان کے ارادے اور اختیار کی نفی کر کے اس دُنیا کو اندھا کنواں بنا دیا تھا۔ جہاں کہیں کسی نتیجے کا سبب آنکھوں سے اوجھل رہ جاتا تو کوئی نہ کوئی خدائی اختیارات کا مالک بن بیٹھتا تھا۔ تمدنی اور سیاسی حالت پر نظر ڈالیں تو ہر طرف شخصی حکمرانوں کے فولادی پنجے زندگی کی ہر رمق کو اپنی گرفت میں لاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ذات پات کی تقسیم نے انسانی وحدت اور تکریم کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ ارسطو ایسا دانا و زیرک شخص بھی غلامی کو معاشرتی زندگی کا ضروری جزو قرار دے رہا تھا۔ سرمایہ داری کی خباثتوں کو مذہبی تائید حاصل ہو چکی تھی۔ اخلاق کی دُنیا کی طرف دیکھو تو شرم و حیا ایک طرف منہ چھپائے کھڑی دکھائی دیگی۔ فحاشی کی کوئی شکل ایسی نہ تھی جسے جائز نہ سمجھا گیا ہو۔ شاہی محل تو خیر جیسے تھے سو تھے مقدس عبادت گاہیں بھی شرمناک افعال کے اڈے بن چکی تھیں۔ قصہ کوتاہ۔ امن و امان کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جور و ستم اور ظلم و وحشت کو سکۂ رائج الوقت سمجھا جاتا تھا۔ فرد فرد کے خون کا پیاسا تھا، قومیں قوموں کو چر رہی تھیں۔ رنگ، نسل اور وطن خداؤں کی طرح پوجے جاتے تھے۔ نفسا نفسی کے عالم میں انسانیت سسکیاں لے رہی تھی۔ تاریخ نے اس تاریک زمانے کو عہد جاہلیت کا نام دیا ہے۔ متفرق اور منتشر ہو کر جمعیت سے کٹ جانے والے لوگوں کو جو تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچے ہوئے لوگوں کے لئے کہا اور ارشاد کیا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں اُلفت ڈال کر انہیں بھائی بھائی بنا دیا اور مکمل تباہی سے بچا لیا۔ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ کا ترجمہ یہ ہے: "اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور بکھر نہ جانا۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس مہربانی کو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی اور تم اس کی اس نعمت کی وجہ سے بھائی بھائی بن گئے۔ حالانکہ تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ اللہ نے تمہیں بچا لیا۔۔۔۔" اس آیت جلیلہ اور چند دوسری آیات سے بلا شک و شبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسلم برادری بمنزلہ "اخوت" اسلام کا سب سے بڑا سماجی نصب العین ہے۔ کیونکہ اسی کی بنیاد پر عالمگیر مساوات، عدل اور آزادی کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ "اخوت" کے معنی تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔
جب تک اس طرح کی اخوت، جو خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہے، ہماری عملی زندگی میں اچھی طرح رچ بس نہیں جاتی اسلام مکمل طور پر حقیقتِ ثابتہ نہیں بن سکتا۔ مسلمین حلقۂ اخوت میں ایک ہی کھونٹے سے بندھے ہوئے ہیں اور لاکھ زور لگانے کے باوجود اس بندھن سے نہیں نکل سکتے۔

اسلامی اخوت کا یہ بندھن رنگ، نسل، وطن اور زبان کے رشتوں سے نہیں بلکہ ایک مقصدیت کے معیار سے پہچانا جاتا ہے۔ اخوان اور اعداء میں تمیز کرنے کے دو ہی پیمانے ہیں، کفر اور ایمان۔ ایمان رکھنے والے، خواہ وہ کسی رنگ، نسل، ملک یا زبان سے تعلق رکھتے ہوں، آپس میں بھائی بھائی ہوں گے اور اس کے برعکس وہ لوگ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے روگردانی کرتے ہیں اور قرآنی اصطلاح میں کفر کے مرتکب ہوتے ہیں وہ خون کے رشتے کے لحاظ سے باپ، بھائی یا بیٹے ہی کیوں نہ ہوں، رفاقت کے لائق نہیں ہیں جو کوئی ان کے ساتھ دوستی رکھتا ہے ظالم ہے۔

باپوں اور بھائیوں کو رفیق مت بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

میں متعدد مقامات پر قوم یومنون، قوم یذکرون، قوم عابدین، قوم العالمین، قوم الضآلین، قوم یعلمون، قوم یفقہون،
قوم یوقنون، قوم یعقلون، قوم الکافرین، قوم المجرمین، قوم المسرفون، قوم الظالمین، قوم یشکرون، قوم الخاسرین،
قوم المکذبین اور قوم المفسدین کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ دراصل "قوم" بہت ہی کثیر المعنی لفظ ہے۔ آیئے پہلے اس کے
لفظ کا مادہ ق۔ و۔ م ہے۔ قامَ قیاماً کے معنی ہیں کھڑ

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

"اے ایمان والو! اپنے باپ ...
سے زیادہ عزیز رکھیں۔ اور جو کوئی بھی ان سے رفاقت کریں
ہیں۔" (۹:۲۳)

اس کے علاوہ یہ تنبیہہ بھی کی گئی ہے کہ

کہہ دو اے محمدؐ (ان سے) کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں
اور عشیرت (یعنی قبیلہ، کنبہ، ساتھ رہنے والے، رفیق اور ساتھی) اور اموال
جو تم نے کمائے ہیں، اور سوداگری جس کے بند ہو جانے سے تم ڈرتے ہو، اور
حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ
میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ تم پر
اپنا امر بھیجے گا۔ اللہ قومِ الفاسقین کو رستہ نہیں دیتا۔" (۹:۲۴)

اس ارشادِ عالیہ میں تمام دنیاوی رشتوں کو اللہ اور اللہ کے رسول کی راہ میں اور جہاد میں قربان کر دینے کا حکم ہے۔ جو کوئی ایسا نہیں کرتا وہ فاسق ہے۔ فاسق وہ ہے جو دائرۂ حق سے باہر نکل جاتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں فسق کا لفظ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے لئے استعمال ہوا ہے (۵:۳) آیت جلیلہ نمبر ۲۶، ۲:۲۷ میں تشریح کر دی گئی ہے کہ فاسقین وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد باندھ کر اسے توڑ دیتے ہیں اور جس رشتے کو جوڑنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ گزشتہ اوراق میں کئی ایسے رشتوں کا ذکر کیا جا چکا ہے جن کے جوڑنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دے رکھا ہے لیکن ہم انہیں دانستہ یا نادانستہ توڑ کر فسق کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان رشتوں میں سب سے بڑا اخوتِ اسلامی یعنی اتحاد بین المسلمین کا رشتہ ہے کیونکہ باقی رشتے اسی ایک رشتے کی مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ یہ رشتہ کاٹ دیا جائے تو پھر ذاتی اور نجی رشتے رہ جائیں گے جو رہبانیت کی ذیل میں آتے ہیں جس کی دینِ اسلام میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محولہ بالا آیت میں ان فاسقین کو زمین پر فساد برپا کرنے والے کہا ہے۔ بہت باریک نکتہ ایک اور یہ بھی ہے کہ جو لوگ اسلامی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے بھی گریز کی راہیں نکالتے ہیں قرآنِ حکیم کے نزدیک وہ بھی فاسق ہیں۔ (۳:۸۱) اسی اعتبار سے مومن اور فاسق ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہٰذا دائرہ حق سے باہر نکل جانے والے، وحدتِ ملی کے رشتے کو کاٹ ڈالنے والے اسلامی معاشرے کے اندر رہ کر بھی گریز کی راہیں نکالنے والے اور ظالمین و کافرین، خون کے رشتے کے باوجود بھائی نہیں کہلا سکتے۔

جس آیت (۹:۲۴) کو ہم نے اوپر درج کیا ہے اس میں فاسقین کو "قوم" کہا گیا ہے۔ اسی طرح قرآنِ حکیم

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

دائم اور ثابت رہنا ... جس کے ذریعے زندگی قائم رہے

سہارا

... ہونا۔ متوازن ہونا۔ علم اور استوار ہونا۔ ہے۔ رُک جانا۔ کسی جگہ پر ٹھہر جانا۔ بارونق ہونا۔ قَوَامٌ وہ سامان ہے ... یا ... جس سے زندگی کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ قِوَامٌ وہ چیز ہے جس پر کسی معاملے کا دارومدار ہو یا جس کے سہارے کوئی معاملہ گزارہ کر سکے یا اتنی روزی جو انسان کو کھڑا رکھ سکے۔ قَامَۃٌ آدمی کا قد ہے یعنی اُس کے کھڑے ہو جانے سے اُس کی جو اونچائی یا لمبائی بنتی ہے۔ قِیمَۃٌ کسی چیز کا بدل ہے۔ یعنی ایک چیز کے بدلے اُس کے برابر کی کوئی چیز جو ترازو کی ڈنڈی کو سیدھا اور متوازن رکھے انہی معنوں سے مَقَامٌ، مُستَقِیمٌ، تَقوِیمٌ، قَوَامٌ وغیرہ کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں۔ قَیُّومٌ قائم بالذات ہستی ہے جو اپنے قیام کے لئے کسی دوسری چیز کی محتاج نہ ہو۔ لیکن خود اس کے بغیر کسی دوسری چیز کا قیام ممکن نہ ہو۔

قرآنِ حکیم میں لفظ قوم کی مختلف صورتیں (مثلاً اَلْقَومِ۔ قَومٌ۔ قَومًا۔ قَومِہٖ وغیرہ) ۳۸۳ مقامات پر آئی ہیں۔ ہر جگہ قوم کا لفظ انسانوں کی اُن جماعتوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو فکری اور نظریاتی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ چنانچہ جہاں قومِ نوحؑ۔ قومِ لوطؑ۔ قومِ موسیٰؑ۔ قومِ ابراہیمؑ۔ قومِ یونسؑ۔ قومِ ہودؑ اور قومِ صالحؑ سے مُراد اِن پیغمبرانِ عظام کے متابعت کرنے والے ہیں وہاں قومِ فرعون سے مُراد وہ قوم ہے جو فرعون کی پیروکار ہے۔ اسی طرح قومِ عاد و ثمود، قومِ لوطؑ اور قومِ صالحؑ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ہدایتِ ربّانی کے منکر ہونے کی وجہ سے اور ہادیانِ برحق کی مخالفت کے سبب گرفتارِ عذاب ہیں۔ چنانچہ ایک طرف ایمان رکھنے والوں، یقین رکھنے والوں، غور و فکر کرنے والے علماء اور راہِ راست پر چلنے والے عبادت گزاروں کے لئے قوم کا لفظ آیا ہے تو دوسری طرف انکار کرنے والوں کو فاسقوں، جاہلوں، اور ظالموں کیلئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا قوم کا لفظ ایسے لوگوں کے لئے یا لوگوں کے ایسے گروہوں اور طبقوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کسی ایک خاص روش پر قائم ہوں یا ایک ہی عادت، مزاج، افتادِ طبع یا رویے کا اظہار کرتے ہوں مثلاً ہم یہ بھی کہہ دیتے ہیں افیونیوں کی قوم بھی عجیب قوم ہے۔ وغیرہ۔ اس طرح کہنے سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے کہ ان لوگوں کا رویہ اس قسم کا ہے جو افیون کھانے کی عادت کی وجہ سے ایک خاص طبقہ بن جاتے ہیں۔ ہم پیالہ، ہم نوالہ، ہم مشرب، ہم مسلک وغیرہ الفاظ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ روش یا رویہ دو قسم کا ہوتا ہے یا صحیح یا غلط، یا پسندیدہ یا ناپسندیدہ۔ صحیح روش حق کی روش کہلائے گی، مستقل۔ قائم۔ غیر مبتدل۔ غلط روش باطل کی روش ہوگی، عارضی، ناپائیدار اور ہر لمحے بدلتے رہنے والی۔ ایک نور و ہدایت کی روش دوسری بے راہ روی اور ظلم کی روش ہے۔ نور و ہدایت کی روش منزل تک پہنچا دے گی کیونکہ اس میں روشنی بھی ہے اور صحیح رہنمائی بھی ہے۔ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی روش کسی منزل تک نہیں لے جائے گی۔ قرآنِ حکیم نے قوم کا وسیع تر معنوں میں عام لوگوں کیلئے استعمال کیا ہے پھر لوگوں کو دو واضح گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

جو انبیائے کرام کی متابعت میں راہِ راست پر گامزن رہتا ہے اور دوسرا وہ ہے جو رسولانِ عظام کی مخالفت کرتا ہے اور قوانینِ خداوندی کی پیروی کرنے کی بجائے خود ساختہ اصولوں پر گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ انسانیت کی اس تقسیم کے علاوہ اور کوئی تقسیم از روئے قرآنِ حکیم صحیح نہیں ہے۔ رنگ، نسل، ذات، وطن، پیشے وغیرہ کی گروہ بندی "قومیت" کے زمرے میں نہیں آتی۔ اسے شعوب اور قبائل وغیرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے تاکہ ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے۔ اس سلسلے میں ارشادِ ربانی یہ ہے:

"اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے بنایا۔ اور تمہارے شعوب اور قبائل بنائے تاکہ تم پہچانے جاؤ۔ تحقیق اللہ کے نزدیک واجب تکریم وہ ہے جو تم میں سے تقوے والا ہے۔ بیشک اللہ علیم اور خبیر ہے" (۴۹:۱۳)

قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک امت ہے۔ ایک عالمگیر سوسائٹی ہے۔ اسے امن اور سلامتی کے دائرے میں آکر ایک نسلی وحدت بن کر رہنا چاہیے۔ تاہم باہمی تعارف کی غرض سے ہم نے اس کے مختلف قبائل اور شعوب بنا دیئے ہیں۔ ہندی، افغانی، چینی، پاکستانی، ایرانی، ترکی، عربی، جاپانی، تورانی، انگریز، فرانسیسی، جرمن وغیرہ، اسمائے نسبتی کا استعمال اسی طرح ہے جس طرح ہم پہچان کی آسانی کے لئے اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ یہ تقسیم کسی برتری یا فوقیت کی بنا پر نہیں ہوتی اور نہ ہی اُن پر قائم رہ کر برہمن، کھشتری، ویش اور شودر تا ابد ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ ارشادِ ربانی کے مطابق بنی آدم صرف آدم کی اولاد ہونے کی بنا پر واجب تکریم ہے۔ (۱۷:۷۰) اور تکریم کے اعتبار سے سب ایک جیسے ہیں۔ تاہم ان میں فضیلت کا معیار تقویٰ ہے جس طرح ہم کسی ملک کو صوبوں میں صوبوں کو قسمتوں میں، قسمتوں کو ضلعوں وغیرہ میں یا شہروں وغیرہ کو محلوں میں تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ افراد کی پہچان اور جگہ مکان کے تعین میں آسانی رہے، بالکل اسی طرح عالمگیر برادری کو بھی تعارف کے مقصد کے پیشِ نظر رکھ کر تمدنی اکائیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس وقت متمدن ممالک قرآنِ حکیم کی اس مسلمہ صداقت کی طرف آہستہ آہستہ آ رہے ہیں۔ تاہم ان میں رنگ اور وطن کی برتری کے تعصبات ابھی تک باقی ہیں۔ گو حسب و نسب اور پیشوں وغیرہ کے امتیازات ختم ہو چکے ہیں۔ ان ممالک کے باشندوں میں آبائی رشتہ صرف شخصی ناموں کے ایک جزو کی حد تک موجود ہے اور اس میں بھی تفاخر کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا۔ روس، چین، جاپان، امریکہ اور یورپ شعوب اور قبائل کے آسمان سے تو گرے لیکن وطنیت کی کھجور میں اٹک گئے۔ بعض یہاں سے گرے تو رنگ، زبان اور نسل کی دلدل میں پھنس گئے۔ تاہم یہ شعور بھی پیدا ہو رہا ہے کہ کسی طرح ان عذابوں سے چھٹکارا حاصل ہو۔ برٹرینڈ رسل کے ہم خیال لوگ ایک ایسے عالمگیر نظامِ اخوت کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو بنی نوعِ انسان کو گروہی تعصبات سے نکال کر امتِ واحدہ بنا سکے کیونکہ انھوں نے اچھی طرح جان لیا ہے کہ بقائے باہمی اور امن و سلامتی کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ قبائل اور شعوب سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ اُسی حد تک درست ہے جس کا تعین قرآنِ حکیم نے کر دیا ہے۔ اس حد سے تجاوز کر کے وسیع تر تمدنی، ثقافتی اور نظریاتی دائرے میں ان کا داخلہ ان کی الگ حیثیت کو ختم کر دیتا ہے۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

قرآنِ حکیم نے انسانی گروہ کے لئے سِبط اور حِزب کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ سبط کے اصلی معنے کسی چیز کی زیادتی کے ہیں۔ اَلسِّبْطُ وہ درخت یا جھاڑی ہے جس کی جڑ تو ایک ہوتی ہے لیکن اس کی شاخیں بہت زیادہ پھیل جاتی ہیں۔ یہیں سے اس کے معنے نسل اور خاندان کے ہو گئے [illegible] بڑھتا گیا اور پھر اولاد گویا شاخیں بن گئیں۔ اَلسِّبْطُ پوتے اور نواسے دونوں کے [illegible] لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہی لفظ یہود کے قبیلے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اَسْبَاطٌ کا لفظ حضرت اسحٰقؑ کی اولاد کے لئے مخصوص ہے۔ جبکہ قبائل کا لفظ بنی اسمٰعیل کے لئے مستعمل تھا۔ عربوں نے یہ تخصیص اس لئے رکھی تھی کہ اولادِ ابراہیم کی دونوں شاخوں میں امتیاز ہو جائے۔ قرآنِ حکیم میں حضرت موسیٰؑ کی قوم کیلئے اَسْبَاطٌ کا لفظ آیا ہے (۷:۱۶۰) اسی طرح اولادِ حضرتِ یعقوبؑ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے (۲:۱۳۶) اہلِ عرب جس طرح عربوں کو جَعْدٌ کہتے تھے اسی طرح عجمیوں کو اَلسِّبْطُ کہتے تھے۔

اَلْحِزْبُ پانی پر اُترنے کی باری کو کہتے ہیں۔ لوگوں کی جماعت، فریق یا گروہ بھی حزب ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ان کے دِل اور اعمال ایک دوسرے سے ملتے ہوں خواہ وہ خود کبھی ایک دوسرے سے ملے ہوں یا نہ ملے ہوں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ اُن میں سختی اور شدت پائی جائے قرآنِ حکیم نے حزب کے مندرجہ بالا معنوں کے لحاظ سے (۵۸:۲۲) میں حزب اللہ اور (۵۸:۱۹) میں حزب الشیطان دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے حزب اللہ سے مُراد وہ لوگ ہیں جو قوانین الٰہیہ پر سختی سے کاربند رہتے ہیں خواہ وہ دُنیا کے کسی حصّے میں ہوں اور ایک دوسرے سے ملے ہوں یا نہ ملے ہوں۔ حزب الشیطان وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات کے مطابق عمل نہیں کرتے بلکہ خود ساختہ نظریات اور انسانوں کے مرتب کردہ اصول و قوانین کی پابندی کرتے ہیں خواہ اِن کا تعلق کسی بھی مُلک، خطۂ ارض، قبیلے یا گروہ سے ہو اور خواہ وہ ایک دوسرے سے کبھی ملے ہوں یا نہ ملے ہوں۔ ایسے نظریات کے پرکھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کا ماخذ اور منبع ڈھونڈ نکالا جائے۔ اگر آخری سَنَد کسی انسان پر ختم ہوتی ہو تو نظریہ باطل ہے اور قابلِ قبول نہیں ہے خواہ آخری سند کا انسان کتنا ہی پاکدامن، بزرگ و برتر کیوں نہ ہو۔ اگر آخری سند وحیٔ ربانی تک پہنچتی ہے جو ہدایت کا آخری اور مکمل ترین سرچشمہ ہے تو وہ نظریہ صحیح اور قابلِ قبول ہے۔

قرآنِ حکیم قوموں کی تشکیل نظریۂ حیات یا زندگی کے نصب العین کی بنیادوں پر کرتا ہے۔ وطن، نسل، رنگ، زبان، شخصیت پرستی وغیرہ کے خود ساختہ اصولوں پر نہیں کرتا۔ سورۂ مومن میں احزاب اُن پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے مل کر حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے خلاف جنگ کی تھی۔

"پارٹی" (PARTY) انگریزی زبان کا لفظ ہے جو (PART) بمعنی جدا ہونا یا الگ کئے گئے حصّے سے ماخوذ ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام نے وحدتِ ملّت کا جو مستحکم نظام متشکل کیا ہے اس میں دُوئی کی گنجائش نہ عقائد میں ہے اور نہ تشکیلِ جماعتِ مسلمین میں ہے۔

باطل دُوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانِ حق و باطل نہ کر قبول

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ ہم حقیقتِ مطلقہ کے طور پر جانتے ہیں کہ چھ اور چار، دس ہوتے ہیں۔ یہ دائم قائم اور ثابت حق ہے۔ باطل اسے قبول نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ چھ اور چار سات ہوتے ہیں لیکن حق اٹل ہے وہ اپنے مؤقف سے سرِمُو بھی انحراف نہیں کریگا۔ باطل دُوئی پسند ہے اس لئے حق کو اپنے اٹل مؤقف سے ہٹانے کیلئے یہ ترکیب [illegible] بات نہیں آٹھ مان لیتے ہیں۔ آیئے مفاہمت کرلیں۔ نہ تمہاری بات نہ میری بات! چھ اور چار کا مجموعہ نو تسلیم کرلیتے ہیں۔ کیا حق باطل کی یہ بات مان لیگا؟ اسی کو مندرجہ بالا شعر میں شرکت میانۂ حق و باطل کہا گیا ہے۔ حق اسے کبھی قبول نہیں کرسکتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کفارِ مکہ بلکہ اپنے خاندان والوں نے یہ پیشکش کی تھی اور کہا تھا ایک سال تم ہمارے بتوں کی پوجا کرلو۔ ایک سال ہم تمہارے خدائے واحد کی پرستش کریں گے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پرعزم جواب وہی تھا جو آپؐ نے اپنے چچا حضرت ابوطالبؓ کو دیا تھا کہ یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند ہی لاکر کیوں نہ رکھ دیں میں اعلائے کلمۃ الحق پر ثابت قدم رہوں گا۔ ہمارے ہاں دُوئی پسندی بھی مغرب کی ثقافتی یلغاروں کے ذریعے آئی ہے۔ ہم اسلام کی چھتری کے نیچے ہر وہ کام کرنے لگ گئے ہیں جو قرآنی احکام کے منافی ہیں۔ پارٹی بازی بھی اسی کا ایک شاخسانہ ہے۔ دینِ اسلام میں علیحدگی اور تفریق کے تمام امتیازات کو یہاں تک کہ خون کے رشتے کو بھی نظریاتی وحدت میں دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لئے جماعت کے اندر کوئی اور جماعت نہیں بن سکتی۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے نہایت واضح الفاظ میں فرقہ بندی کو شرک قرار دے دیا ہے۔ جب دین کے اندر مختلف ٹولیاں پیدا ہوجائیں تو فکر و نظر کی ہم آہنگی قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو راہِ راست پر اور ہر دوسرے فرقے کو غلط راستے پر سمجھنا شروع کردیتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"تم اُن لوگوں میں سے نہ ہوجاؤ جو شرک کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو دین کے اندر گروہ بندیاں کرتے ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔"

(۳۲ : ۳۰)

حقیقت یہ ہے کہ جب تک الدّین کا اجتماعی نظام برقرار رہتا ہے کسی کو فرقہ سازی کی جرأت نہیں ہوتی جب حیاتِ اجتماعیہ کا یہ نظام عملاً باقی نہیں رہتا بلکہ صرف عقیدے تک محدود رہتا ہے تو الدّین اپنے بلند مقام سے نیچے گر کر مذہب کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور انفرادی یا ذاتی پوجا پاٹ کی چیز بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنالیتا ہے اور افراد میں یک نگہی، یک مقصدیت اور ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔ قوم اگر گروہوں، پارٹیوں یا مختلف الخیال جماعتوں اور جمعیتوں میں بٹ جائے بلکہ جماعتوں میں بھی اندرونِ خانہ افتراق ہو تو ہیئت اجتماعیہ کی قوت و شوکت اجزائے پریشاں میں منتشر ہوجاتی ہے۔ اس صورتحال کا علاج ایسے مضبوط اسلامی نظامِ حکومت کے قیام میں ہے جو ملّت کی ازسرِنو شیرازہ بندی کرسکے۔

باطل کی قوتوں کا مقابلہ صرف یقین کی طاقت ہی کرسکتی ہے۔ یقین کمزور پڑجائے یا منظم نہ رہے تو اس کی قوت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

مدافعت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ جس قوم کو قرآنِ حکیم نے قوم یُوقنون ہونے کا اعزاز بخشا تھا، اُس کے یقین کے چاند ستارے ماند پڑ گئے ہیں۔ جسے قومِ یعقلون کا نام دیا گیا تھا اُس کے عقل و خرد کے فانوس اب چراغ سحری بن کر ٹمٹما رہے ہیں۔ جسے قومِ یعملون کا لقب عطا ہوا تھا اُس کے عمل اور سیرت اور کردار [illegible] جسے قومِ صالحین کے لقب سے نوازا گیا تھا اُس کے [illegible] صالحیت کے مشعل بردار [illegible] ہو چکی ہیں۔ ہیں جسے قومِ یعلمون کی سند عطا کی گئی تھی اُس کے علم و آگہی کے قمقمے بجھ گئے ہیں۔ جسے قومِ یفقہون کا مرتبۂ عالی بخشا گیا تھا اُس کے تفقہ اور تدبر کی ضیا پاشیاں ختم ہو چکی ہیں۔ جسے قومِ یذکرون کا اعلیٰ اور ارفع مقام عنایت ہوا تھا اُس کے ذکر و فکر کے آفتاب و مہتاب غروب ہو چکے ہیں جسے قومِ یومنون کی خلعتِ فاخرہ مرحمت فرمائی گئی تھی اُس کے ایمان کی کرنیں نور اور حدت و تمازت سے محروم ہو چکی ہیں اور جسے قومِ مسلمون بنا کر امنِ عالم کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا وہ بطلِ الحاد کی تاریکیوں میں سلامتی کی پناہ گاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔!

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ اس کا جواب مسلمانوں کی تاریخ سے معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن وہ بھی صرف جزوی طور پر، کیونکہ تاریخ اُن خفیہ ریشہ دوانیوں کو، اندرونی اور بیرونی سازشوں کو، دلوں کے اندر وسوسے پیدا کر دینے والی زیرِ زمین تحریکوں کو اور ذہنی طور پر مفلوج بنا دینے والی نفسیاتی جنگ کے در پردہ تحریکوں کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے یا انہیں اپنے دائرہ عمل سے خارج سمجھتی ہے جو قوم مسرفون، قوم الظالمین، قوم مفسدین اور قوم فاسقین کی جانب سے جنگی ہتھیاروں کے طور پر ان کے خلاف استعمال ہوتی رہتی ہیں اور تیقن کی بنیادوں کو متزلزل کر کے نوجوانوں کے ذہنوں کو تذبذب کا شکار بناتی ہے۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لئے ایک مثال یوں پیش کی جا سکتی ہے کہ فرض کیا کہ آپ کو کسی شخص یا چیز سے حد درجہ محبت ہے۔ آپ کی محبت کا جذبہ حدت، شدت اور تلاطم کے مراحل سے گزر کر اب آپ کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ آپ کی ہر سانس میں رچ بس گیا ہے۔ آپ کے ہر قول و عمل سے اسی کے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں آپکی زندگی کا ہر لمحہ محبوب دلنواز کے ذکر میں گم رہتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کا "رقیب روسیاہ" آپ کو محبوب سے جدا کرنے کے لئے کیا کیا چالیں چلے گا، کیا کیا تدبیریں اختیار کریگا اور کیسے کیسے منصوبے بنائے گا۔ اس پر ذرا سوچیئے۔ اُس کا پہلا کام تو یہ ہے کہ وہ عقلی دلائل کے مختلف حربے استعمال کر کے آپ کے جذبۂ عشق کو باطل قرار دے، اُسے جنون کہے اور دماغ کا اختراع ثابت کرے۔ اس کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ آپ کے محبوب کی ذات اور صفات کو ہدفِ تنقیص بنا کر آپ کے دل میں شکوک و شبہات پیدا کر دے۔ اس کے بعد تیسرا کام اس کا یہ ہوگا کہ وہ آپ کے محبوب کے مقابلے میں کسی ایک یا متعدد "حسیناؤں" کو زیادہ سے زیادہ دلفریب اور جاذبِ نظر بنا کر آپ کے سامنے لا کھڑا کرے۔ یا پھر حسن کے معیارات ہی کو بدل ڈالنے کی کوشش کرے تاکہ آپ کی پیوستگی آہستہ آہستہ علیحدگی سے بدلنی شروع ہو جائے۔

ابھی ہم نے حق و باطل کی بات کی تھی۔ اسے ذہن میں رکھیئے تو واضح ہو جائیگا کہ عشق کو دوام اور ثبات کی دولت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

عطا کی گئی ہے جبکہ ہوس کو تغیر آشنا بنایا گیا ہے۔ عشق میں وحدت ہے جبکہ ہوس میں کثرت ہے۔ عشق شہادت کا مقام حاصل کرکے ہمیشہ زندہ رہتا ہے جبکہ ہوس موت کی پُر پیچ راہوں میں بھٹکتی رہتی ہے۔ حق و باطل کی یہ جنگ عشق اور ہوس یا ثبات اور تغیر کے درمیان جاری رہتی ہے۔ باطل قوتیں اسے وسوسوں کی جنگ بناکر صدور الناس کے میدان میں لے آتی ہیں اور بیک وقت متذکرہ بالا چاروں محاذ کھول دیتی ہیں اور قسم قسم کے حربوں سے ذہنوں کو ماؤف، مضمحل اور منقلب کر ڈالتی ہیں۔

عصر حاضر کے مشرقی ذہنوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص، انہی طریقوں سے سہل انگار، آرام طلب اور عیش کوش بنا دیا گیا ہے۔ اب یہ تحقیق و جستجو، غور و فکر اور محنت و مشقت سے دور بھاگتا ہے۔ بنی بنائی چیزوں کا دلدادہ ہے، بیرونی لیبل کا گرویدہ ہے۔ سعی و عمل کے ذریعے کسی نتیجے پر خود پہنچنے کی بجائے دوسروں کے پیش کردہ افکار کو بسر و چشم قبول کر لیتا ہے۔ لکھے ہوئے الفاظ کی اتھارٹی کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیتا ہے۔ پچھے دار تقریروں کے لفظی حسن پر جھوم جھوم جاتا ہے۔ مگر معنویت تک پہنچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ خوشنما، تیز اور تیکھے چٹوں کے فقروں اور جملوں کے نعرے بنا لیتا ہے لیکن ان کے مضمرات اور مآل و عواقب سے بے خبر رہتا ہے۔ سطحیت اس کے مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ اس لئے اب یہ حکمت کی گہرائیوں تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ شکر کے بیرونی خول کا فریفتہ ہے اس لئے اندرونی زہر قاتل کو پہچان ہی نہیں سکتا۔ ایسے ذہن کی بالیدگی کو مخصوص انداز و طرز و ادا دینے کے لئے ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلی ویژن، وی سی آر، سینما، اخبارات و رسائل، ناول، ڈرامے، افسانے، نظمیں اور ابلاغ عامہ کے تمام وسائل اپنی جملہ صلاحیتوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

ابلیسی حکمتِ عملی کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر کسی قوی الجثہ اور مضبوط اعصاب کے دیو ہیکل پہلوان کو مغلوب کرنا ہو تو اُسے بھوک اور پیاس کی زنجیریں پہنا دو اور اسے اس عذاب میں اس حد تک مبتلا رکھو کہ وہ ہر قسم کی خوراک برضا و رغبت قبول کرنے لگ جائے۔ محرومی خود اتنی شدید نہیں ہوتی جتنا اس کا احساس اسے شدید بنا دیتا ہے۔ اس احساس کو بار بار دہرانے اور مختلف انداز و اسالیب سے بالتکرار سامنے لاتے رہنے سے اس کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جھوٹ بولو، بار بار بولو اور اس تیزی سے بولتے چلے جاؤ کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگ جائیں یا کم از کم حق و صداقت ہی میں شک کرنے لگ جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جھوٹ کے طرفدار ثالث بن کر مفاہمت کے رستے نکالنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح صداقتوں کا قدم ڈگمگا جائیگا۔ جھوٹ کی اس مہم میں قومِ مفسدین ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے مادی وسائل اور اس کا اقتدار اور تغلب اپنی پوری تیزی کے ساتھ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں تاکہ حق و صداقت کے پرستاروں کو غفلت اور فرض ناشناسی کے جرم کی سزا مرگِ مفاجات کی صورت میں دے سکیں۔

توحید اُمتِ مسلمہ کی اجتماعی زندگی کا بنیادی ستون ہے۔ اسی کے سہارے ہمارے اعمال و افعال اور ہمارا تشخص اور سیرت و کردار کی عمارت قائم ہے۔ اس عقیدے کی پختگی میں تھوڑی سی خامی بھی رہ جائے

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

تو اسلام کی ساری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ قوم الکافرین اس بات کو اچھی طرح جانتی پہچانتی اور سمجھتی ہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اسی عقیدے پر ضرب لگانے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے عقائد و نظریات پیش کر کے نوجوانوں کو گمراہ کرتی رہتی ہے (ان فاسد عقائد و نظریات میں سے چند ایک کی طرف اشارہ آئندہ سطور میں کیا جائے گا) اس مفسدہ پرداز قوم کو معلوم ہے کہ دُنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد اور ناقابلِ تقسیم اکائی بنانے والا عقیدہ صرف توحید کا عقیدہ ہے جو کلمۂ طیبّہ کی صورت میں آئیڈیالوجی بن کر ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے۔ بلکہ جو ان کے افکار و خیالات پر ہی نہیں عملی زندگی پر بھی محیط اور حاوی ہے۔ اسے اس بات کا بھی علم ہے کہ توحید کا عملی فلسفہ نسلی امتیازات کے بُتوں اور مُلک و وطن کے خود تراشیدہ خداؤں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ مزید براں یہ عقیدہ زمین کے ہر چھوٹے بڑے خطّے کے مسلمانوں کو ایک قوی ترین قوم بنا دیتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس عظیم قوم کی طاقت کو توڑنے کے لئے کوئی بھی حربہ کارگر نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ توحید کے محکم عقیدے اور لائحہ عمل کو مختلف نظریات کی آلودگیوں سے ناخالص بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر جو پہلا فلسفہ ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں اتارا جانے لگا وہ یہ تھا کہ مادہ ہی وجودِ حقیقی ہے۔

میکیاوُلی نے، جس کا پورا نام NICCOLO DE BARRARDO MACHIAVELLI (۱۴۶۹-۱۵۲۷) ہے کہا تھا کہ معاشرہ خدا کی مشیّت سے نہیں بلکہ قدرتی اسباب کے تحت آگے بڑھتا ہے۔ تاریخ کو چلانے والی قوّت مادی مفادات اور اقتدار ہی کی قوّت ہے۔ لہٰذا سیاسی کشمکش میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے وسائل اور ذرائع کا استعمال بشمول ظلم۔ عیاری۔ مکاری۔ جھوٹ وغیرہ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہیں تاکہ حکمران طبقے کا دبدبہ قائم رہے۔ گزشتہ اوراق میں ہم یہ حقیقت بار بار دہراتے رہے ہیں کہ اقتدار کی ہوس کے ہمیشہ سے تین ہی رُوپ رہے ہیں، یعنی ملوکیت، سرمایہ پرستی اور پیشوائیت۔ یہ تینوں ہر زمانے میں بھیس بدل بدل کر نئے نئے انداز سے جلوہ گر ہوتے ہیں اور باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل سے باعث "فسادِ آدمیت" بنتے ہیں۔ میکیاوُلی کا مشورہ چونکہ ان تینوں کی مرضی کے عین مطابق تھا، تاہم اس پر کھلے بندوں عمل کرنا ذرا مشکل تھا۔ اس لئے بعد کے آنے والے مادیئین نے علمی رنگ دے کر اسے فلسفے کی شکل دے دی۔ چنانچہ ان کے سب سے بڑے مفکرین کارل مارکس، لینن، اینجلز وغیرہ نے انہی بنیادوں پر جدلیت اور مادہ پرستی کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس طرح ہوسِ اقتدار کی جڑیں ایک نئے انداز سے پھر مضبوط ہو گئیں۔ اگرچہ یہ عمارت اب منہدم ہو چکی ہے تاہم اس کا گرد و غبار ابھی تک بہت سے اذہان کو چمٹا ہوا ہے۔ اس فلسفے نے مفروضہ آزادیوں کا سبز باغ دکھا کر انسان کو پہلے سے بھی زیادہ غلامیوں کے شکنجے میں جکڑ دیا۔ خدا کی بجائے ملکیت کی پرستش ہونے لگی۔ مذہب کی جگہ مادیت کے عقائد نے لی۔ انسانی جذبات، احساسات، تخیلات اور تصورات سب کے سب پیداواری صلاحیتوں کے پیمانے سے ناپے تولے جانے لگے اور خود انسان مشین بلکہ اس سے بھی کمتر مخلوق بن کر رہ گیا۔

اس فلسفے کے مطابق کائنات میں جتنے مظاہر رونما ہوتے ہیں، جتنی اشیاء موجود ہیں اور ان میں جو بھی اصول

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

یا قوانین کارفرما ہیں ان سب کی لامحدود کثرت اور ان کے مجموعے کا نام مادّہ ہے جو اپنا وجود ٹھوس اجسام کی لامتناہی اشکال و صور، مختلف النوع خواص، باہمی روابط، حرکت و عمل، پھر ردِّ عمل کے ذریعے ثابت کرتا ہے۔ اس لیے مادّہ ہی اصل کائنات ہے، رُوح اور شعور وغیرہ اس کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا ابدی اور ازلی ہے اور خدا نے اسے پیدا نہیں کیا بلکہ یہ اپنے آپ زمان و مکان میں لامحدود ہو کر نمودار ہو گئی ہے۔
لازوال ہے

اس مادّی نظریے کی رُو سے دُنیا کے وہ حوادث جنھیں ہم شعور کی مدد سے محسوس کرتے ہیں چند ناقابلِ تجزیہ ذرات کے عمل اور ردّعمل سے رونما ہوتے ہیں۔ بلکہ خود شعور اور انسان ذہن بھی مادّے ہی کے افعال اور اسی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں لہٰذا مادّہ وجودِ مطلق ہے۔ باقی ہر چیز مادّے ہی کا مظہر ہے جدید تحقیق کی رُو سے جن ذرات کو ناقابلِ تجزیہ کہا جاتا تھا اب ان کے ایک ایک جز کو الگ الگ جانا اور پہچانا جا چکا ہے۔ اب مادّے کی مستقل بالذّات شے کی حیثیت باقی نہیں رہی جو کسی مکان مطلق میں واقع ہو جب مکان مطلق ہی کا ادراک نہیں ہو سکتا تو پھر مادّے کو وجودِ حقیقی کیسے تسلیم کیا جائیگا۔ مادّہ زمان و مکان میں واقع ہے تو پھر لامحدود کیسے ہُوا؟ لامحدود تو زمان اور مکان کو ہونا چاہیئے جو اسے اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی مسلّمہ ہے کہ مادّہ اقدارِ اعلیٰ کی تخلیق نہیں کر سکتا کیونکہ ان کا سرچشمہ عقل و شعور سے کہیں دُور واقع ہے۔ نیز اس کا تعلق مادّی زندگی سے نہیں ہے۔

مادہ پرستی کا ایک اور مکتبِ فکر کہتا ہے کہ اصل حقیقت تو مادہ ہے جو ایٹموں سے مرکب ہے۔ ان ایٹموں کی تشریح علم طبیعات کے اصُولوں سے کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ موجوداتِ عالم اُن تمام قوانین کے پابند ہیں جو مادّے کو تبدیل کرتے ہیں یا ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس ساری پابندی کا مطلب یہ ہے کہ سب اشیاء مادی ہیں اور ان کی اصلیت بھی وہی ہے جو مادّے کی ہے۔ چنانچہ ذہن اور شعور بھی مادے ہی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا کوئی بالاتر ذہن بھی ممکن ہے جو مادّے کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہو؟ اگر ممکن ہے تو کیا یہ ذہن مزید ارتقا پذیر ہو سکتا ہے یا ہمیشہ کے لئے جامد اور ساکن ہی رہے گا؟ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اس قسم کے بالاتر ذہن کے امکان کی نفی کرتا ہے اس کی رُو سے انسان اپنے ذہن اور شعور سمیت پابندِ محض بن کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ ایک عام پتھر اور انسان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اس سارے کارخانۂ قدرت میں ایک اتفاقی یا حادثاتی اکائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ گویا فطرت کے بے مقصد مظاہر اور اندھی قوتوں کا بے تعلق سا تماشائی ہے۔

ایک اور لادینی مکتبِ فکر اس عالمِ رنگ و بُو کی ماہیت زمان و مکان کے لامتناہی سلسلے کو سمجھتا ہے حالانکہ زمان اور مکان دونوں ہمارے اپنے ہی ذہن کی تجریدات ہیں اور محض اضافی یا اعتباری ہے مستقل بالذّات نہیں ہیں۔ چونکہ ان تجریدات کے بغیر کائنات کا تصور مشکل تھا۔ اس لئے انسانی ذہن نے اپنی سہولت کی خاطر انہیں وضع

Contact : jabir.abbas@yahoo.com

http://fb.com/ranajabirabbas

jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

کرلیا ہے۔ زمان ماضی حال اور مستقبل کے مجموعے کا نام ہے اور یہ تینوں تصوّرات محض اضافی ہیں۔ ماضی گزر چکا ہے، مستقبل کو ابھی پیدا ہونا ہے اور حال ان دونوں کے درمیان ایک رابطہ سا بنا ہوا ہے حالانکہ خود اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ ہر آن یہ مستقبل سے نکل کر ماضی بنتا چلا جا رہا ہے، اس میں ذرا بھر بھی ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ اس کے طلوع اور غروب کے درمیان کوئی وقفہ ہی نہیں ہے جو اس کے وجود کو ثابت کرے۔ پھر یہ بات بھی عجیب ہے کہ کرۂ ارض پر ایک ہی لمحہ کہیں حال ہے کہیں ماضی [illegible] ہے اور [illegible] مستقبل ہے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ ہم ماضی اور مستقبل دونوں کو حا[illegible] ہی کے حوالے سے جانتے اور پہچانتے ہیں جس کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر حال ہی کا وجود ثابت نہ ہو تو ماضی اور مستقبل کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ "زمان" جو محض ایک ذہنی تصوّر ہے کائنات کی اصل یا بنیاد نہیں بن سکتا۔

اب رہی "مکان" کی بات تو مکان (SPACE) کی حیثیت بھی زمان (TIME) کی حیثیت سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ فاصلے سب کے سب فرضی، اضافی اور اعتباری ہیں اور ہماری اپنی وضع کردہ اکائیوں کے محتاج ہیں۔ ہم کائنات کو اجسام کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اجسام کیا ہیں؟ ہندسی اشکال ہیں جو لمبائی، چوڑائی، گہرائی یا اونچائی کے بغیر تصوّر میں نہیں آ سکتیں۔ کوئی چھوٹی چیز اس لئے چھوٹی ہے کہ اس سے بڑی چیز کوئی اور بھی موجود ہے۔ اسی طرح کوئی بڑی چیز اس لئے بڑی ہے کہ اس سے کوئی چھوٹی چیز موجود ہے۔ گویا ہم چھوٹے کو بڑے کی اضافت سے اور بڑے کو چھوٹے کی نسبت سے پہچانتے ہیں۔ نزدیکی اور دوری کا تصوّر بھی اسی اعتبار سے محض اضافی ہے اور حدِ نظر کا محتاج ہے۔ شکلیں اور صورتیں حجم اور جسامت کی مدد سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان سب کا تصوّر "خط" کے بغیر ناممکن ہے۔ خط کیا ہے؟ ایک ذہنی تجرید ہے یا ایک فرضی سا فاصلہ ہے جو نقطوں کے تسلسل سے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ نقطوں کا ٹھوس وجود ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی نہ لمبائی ہے نہ چوڑائی ہے نہ گہرائی یا اونچائی ہے۔ جس چیز کا وجود حدودِ اربعہ یا ابعادِ ثلاثہ کے معنوں میں نہ ہو اسے آپ عدم کہتے ہیں۔ اب خود ہی فیصلہ کیجئے کہ جس چیز کی بنیاد ہی عدم پر ہو یا جو محض اضافی ہو یا صرف تصوّراتی ہو اسے کائنات کی اصل اور بنیاد کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ قرب قرب نہیں ہے بُعد بُعد نہیں ہے اور زمان و مکان ہمارے اپنے ہی ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس لئے یہ بھی کائنات کی اصل یا کنہ نہیں بن سکتے۔

کائنات کی ایک توجیہہ کو ذہنی توجیہہ کہا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے "ذہن" کو اصل حقیقت مان لیا گیا ہے جو توانائی (ENERGY) ہونے کی وجہ سے ہر وقت فعّال رہتا ہے۔ عالمِ طبیعی اس فعال ذہن یا توانائی کا عکس یا مظہر ہے۔ اس نظریے کی رُو سے کسی خارجی شئے کا علم اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے ذہن کے ذریعے ہمارا حافظہ، تخیل اور قوّتِ فیصلہ اس کی توثیق نہ کر دے۔ خارجی عالم کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ یہ صرف ذہن کا کرشمہ ہے اور اسی سے وابستہ ہے۔ گویا عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

اس نظریے کے مطابق وہ چیز جو شعور میں نہیں آ سکتی گویا ہے ہی نہیں۔ ذہن کے بغیر عالم کا ربط و ضبط

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

قائم نہیں رہ سکتا۔ فطرت کے غیر منظم طومار میں ربط اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ذہن اس کو تصورات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس طرح "ذہن" مظاہرات فطرت کو نہ تو ایک دوسرے سے علیحدہ تصور کرتا ہے اور نہ اپنے سے جدا سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے جو تصور اُبھرتا ہے وہ ہمہ اوست کی سرحدوں سے جاملتا ہے اور اُسی فلسفے کی ایک شاخ بن جاتا ہے جسے افلاطون نے عالم امثال کی صورت میں پیش کیا تھا۔

افلاطون سے لے کر سگمنڈ فرائڈ، ژونگ، ژاں پال سارتر تک کے تمام لادینی فلسفیوں کے افکار کا احاطہ اس مختصر سے باب میں محال ہے۔ مختلف مقامات پر ہم پیشتر ازیں ان کا تجزیہ پیش کر چکے ہیں۔ یہاں چند ایک نظریات کو مکرر اس لئے سامنے لایا گیا ہے کہ مسلم نوجوان ان کی سحر آلودگیوں سے متأثر ہو کر عموماً شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور خدا کے وجود کے بارے میں متذبذب ہو جاتے ہیں۔ اس بے یقینی کی کیفیت میں یہ کوئی پائیدار تعمیری کام بھی نہیں کر سکتے جو ان کی اپنی ذات کے علاوہ ملک اور قوم کو بھی ارتقا دے سکے۔

قانونِ تغیر اور حرکت ارادی زندگی کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر ہر چیز مُردہ، جامد اور ساکن رہتی ہے۔ عملِ ارتقاء میں بھی یہی دو عناصر یعنی حرکت ارادی اور قانون تغیر کارفرما رہتے ہیں۔ لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ وہ فرق یہ ہے کہ اگر ہم اپنے ارادے سے نیچے چلے جائیں یا اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف چل پڑیں تو باوجود حرکت اور تغیر کے ہم ارتقاء حاصل نہیں کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ "ارتقاء" متوازن اور متناسب راستے پر آگے بڑھتے رہنے اور بلند ہوتے چلے جانے کا نام ہے۔ کائنات کے اندر یہ جو تبدیلی اور حرکت ہر وقت جاری ہے یہ محض مشینی انداز کی نہیں بلکہ اس سارے نظام کے پیچھے ایک قوت ارادی بھی کام کر رہی ہے۔ اس حرکت، تنوع، کثرت اور تغیر و تبدل کا مقصد بھی ہے۔ لیکن جس چیز کا ادراک کوئی آنکھ نہ کر سکے جو قرب اور بُعد اور زمان و مکان وغیرہ کے تمام اعتبارات سے پاک ہو، اس کی اصل اور کنہ تک کون پہنچ سکتا ہے۔ ذات حق تعالیٰ ماورائے عقل تو ہے لیکن منافیٔ عقل نہیں ہے۔ اس لئے اسے صرف یقین یا ذوق صحیح ہی پا سکتا ہے۔ خدا کے وجود کا اقرار کئے بغیر کائنات کے سمجھنے کی کوئی دوسری صورت ہے ہی نہیں۔ آپ عقل و دانش کو جتنا چاہیں چکر دیں بالآخر آپ کو اقرار کا یہی ایک راستہ اختیار کرنا پڑیگا کیونکہ صرف توحید کا عقیدہ ہی ان نظریاتی پیچیدگیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔ کسی بالاتر ہستی پر یقین رکھنا تقاضائے فطرت ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ توحید پر کامل ایمان رکھنے سے انسان لاکھوں دوسرے خداؤں کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور آزادی ہی میں انسان کی اپنی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

توحید کا عملی پہلو یہ ہے کہ ساری کائنات کو نقشِ واحد جان کر انسان کو اس کا مرکزی نقطہ مان لیا جائے کیونکہ تمام دوسری مخلوقات میں سے صرف یہی ایک ہستی دانا و بینا "اقدار" کی حامل ہو سکتی ہے اور جو تعمیر و ارتقاء کی امانت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا سکتی ہے۔ اگر ذاتِ باری تعالیٰ کو انسان بالکل الگ تھلگ سمجھ لیا جائے یا اسے انسان سے بالکل الگ تھلگ سمجھ لیا جائے یا اسے انسان پر کلیتہً محیط اور مسلط بنا دیا جائے تو دونوں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

صورتوں میں انسان مایوسی کا شکار ہو جائیگا اور اس کے قوائے عملیہ بالکل بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔ توحید کے عقیدے میں "غیریت" اور "عینیت" دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ اسی وجہ سے انسان اپنے اختیار اور ارادے، قوتِ فیصلہ اور فعالیت کی صفات کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ اگر یہ قدرت نہ ہوتی تو انسان یا تو عدم محض ہوتا یا پھر پتھر کی طرح جامد اور ساکن ہو کر رہ جاتا اور اپنی ممکنہ صلاحیتوں کو استعمال نہ کر سکتا۔ توحید پر ایمان رکھنے سے اب یہ تو نہ کلی طور پر مجبور ہے اور نہ مطلقاً آزاد ہے۔ چنانچہ یہی اس کی حیثیت اسے پیہم سعی و عمل پر آمادہ اور پُر امید رکھتی ہے۔ اگر توحید پر ایمان نہ رکھا جائے تو اوّل تو انسان کا کوئی عمل اس کا اپنا عمل نہیں ہوگا اور اگر اسے اس کا اپنا عمل فرض کر بھی لیا جائے تو یہ غیر مؤثر اور بے نتیجہ ہوگا۔ توحید کے عقیدے نے اس کے افعال اور اعمال کو با مقصد بنا رکھا ہے اور انہیں بے جان مشین کا سا عمل بننے نہیں دیا۔

طاغوتی قوتیں توحید کے اس فعّال پہلو کو اپنے مفادات سے متصادم سمجھتی ہیں۔ انہیں ایسا سمجھنا بھی چاہیئے کیونکہ توحید ہی مساوات، عدل اور احترامِ آدمیت کی ضمانت دے سکتی ہے اور یہی بات ان کے احساسِ تفوّق کو ضربِ کاری لگانے والی ہے۔ اس سے انہیں استحصال اور استیلا کی اجازت نہیں ملتی۔ چنانچہ جو لوگ توحید پر ایمان نہیں رکھتے یا جو لوگ اس فعّال عقیدے کو عملی دنیا سے خارج کر دیتے ہیں ان کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اس سے پیدا ہونے والی عالمگیر قوت کو باطل نظریات کی نشر و اشاعت کے ذریعے کمزور بناتے رہیں اور اس حلقۂ اخوت کو مضبوط نہ ہونے دیں جس کے ساتھ قوم مسلمین کا ہر فرد بندھا ہوا ہے۔ توحید کی بقا میں ان کی فنا ہے لہٰذا وہ فنا ہونے سے بچنے کے لئے فکری انتشار پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابلاغِ عامہ کے ذرائع اس قسم کی، بظاہر بے ضرر لیکن حقیقتہً الدین کی وحدت کو پارہ پارہ کر دینے والی، باتیں پھیلا دیتے ہیں کہ :-

۱۔ مذہب، انسان اور خدا کے درمیان ایک ذاتی یا نجی قسم کا تعلق ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں جو شخص جس طرح چاہے خدا کو خوش کرے، اسے ناراض کر کے منالے، کسی کو اس سے کیا۔

۲۔ تمام مذاہب ایک جیسے ہیں کیونکہ سب نیکی کی تلقین کرتے ہیں مثلاً چوری نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، کسی کو تکلیف نہ دو، قتل نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا کسی ایک مذہب سے خواہ یہ اسلام ہو یا کوئی اور، وابستگی رکھ لو۔ بلکہ اچھا یہ ہے کہ تمام مذہبوں سے اچھی اچھی باتیں لے لو اور کسی ایک مذہب کا لیبل اپنے اوپر نہ لگاؤ۔ یہ دقیانوسی چیز ہے جو جدیدیت اور ترقی کی راہ میں حائل رہتی ہے۔

۳۔ مذہب اخلاقیات ہی کا نام ہے جسے مختلف لوگوں نے اپنے اپنے حالات کے مطابق وضع کر لیا تھا۔

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

۴۔ مذہب کو اخلاقیات اور خدا کی پرستش تک محدود رہنا چاہیئے۔ اس کا تعلق تجارت، سیاست، معیشت اور زندگی کے دوسرے کاروبار سے نہیں ہونا چاہیئے۔ زندگی کے ان دوسرے شعبوں کے اپنے الگ اصول ہیں جن میں مذہب کو دخل دینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

۵۔ ہر شخص آزاد ہے، خدا کو مانے یا نہ مانے، اس کے احکام پر عمل کرے نہ کرے۔ بلکہ عمل نہ ہی کرے تو اچھا ہے کیونکہ ان فرسودہ باتوں نے انسان کو دُنیاوی لذتوں سے محروم کر رکھا ہے۔

۶۔ زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ کھاؤ، پیئو، عیش کرو۔ مذہب اور اخلاقیات پابندیاں عائد کرنے لگیں تو انہیں توڑ تاڑ کر ہر مقصد کے حصول کے لئے ہر طریقے کو جائز بلکہ ضروری سمجھو۔ کسی اصول یا قانون یا ضابطے وغیرہ کی غلامی اختیار نہ کرو۔

واضح رہے کہ یہ باتیں کوئی نئی نہیں ہیں۔ ہر زمانے میں اسی انداز سے سامنے آتی رہی ہیں۔ موجودہ دور میں ان پر جدیدیت یا علم یا فلسفے یا سائنس کا خول چڑھا گیا ہے جو بظاہر بڑی چمک دمک والا ہے۔ مذہب اور الدین کا فرق گزشتہ اوراق میں تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے۔ اسلام "الدین" ہے جو مکمل ضابطۂ حیات انسانی ہے اور زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔ جو کوئی بھی امن وسلامتی کے اس دائرے میں داخل ہوتا ہے پورے کا پورا داخل ہوتا ہے۔ ثنویت یا دہرے معیارات نے کر داخل نہیں ہوتا۔ اتحاد بین المسلمین کی اساس توحید اور صرف توحید ہے جو ہماری آئیڈیالوجی بن کر ہمہ وقت ہماری زندگی کے ہر عمل میں رواں دواں رہتی ہے۔ لہٰذا جو کوئی بات بھی ہمیں توحید کے عقیدے سے ہٹانے والی ہوگی وہ اتحاد بین المسلمین کو متزلزل بنا دینے والی سازش ہوگی۔ دُنیا کی عظیم ترین سلطنت ایران میں "ملوکیت" کے خلاف جو کامیاب انقلاب لایا گیا ہے یہ پوری اُمتِ مسلمہ کے لئے چشم کُشا ہے۔ اس انقلاب کے بعد "اسلامی جمہوریۂ ایران" کے نام سے آزاد اور خود مختار حکومت وجود میں آئی ہے جس نے گزشتہ دس سالوں میں قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس اسلامی جمہوریہ کے بانی مبانی اور اسلامی انقلاب کے رہنما جناب آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ الموسوی الخمینی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وصیت نامہ میں اسی "توحید کی اساس" کا ذکر کرتے ہیں:

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

is the divine ideology in the extended sense of the word and the idea of the unity of God in its lofty magnitude, which is the foundation and the final goal of the earthly world and of the invisible, the idea of which is fully crystalized in the Muhammadan faith, and which was the goal of all leading prophets (A.S.W) and is something without which man will not attain absolute perfection or find re-union with the Absolute Glory and the infinite beauty of his Divinity" (Page 90 - 91)

ایرانی قوم سے خطاب کرتے ہوئے اُسے یاد دلاتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر تکلیفیں اٹھاتا ہے، مصیبتیں جھیلتا ہے، قربانیاں پیش کرتا ہے اور جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ ایرانی قوم کس اعلیٰ اور ارفع مقصد کو لے کر کھڑی ہوئی؟ کیا مطمحِ نظر اس کے سامنے تھا جس کے لئے اس نے جان ومال کا نذرانہ پیش کیا۔ یہ وہی مقصد تھا جس کی خاطر اس کائنات کی تخلیق کی گئی ہے، یعنی توحید حق وتعالیٰ کا وسیع تر معنوں میں عملی نفاذ! غائب اور حاضر دُنیاؤں کا مقصد اُولیٰ بھی یہی ہے، اُن کی اساس بھی یہی ہے اور ان کی آخری منزل مقصود بھی یہی ہے۔ دینِ اسلام نے اس مقصد کی پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور پیغمبران علیہم السّلام نے بھی اسی توحید کے عملی نفاذ کی جدوجہد کی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کے بغیر انسان نہ مقام کاملیت تک پہنچ سکتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کے حسن وجمال کی حضوری میں کوئی درجہ پا سکتا ہے۔ توحید کے اسی کلمۂ پاک کی بدولت "خاکیوں" کے مراتب بلند ہوئے اور انہیں اللہ کی سلطنت میں "نوریوں" کا تقدس نصیب ہوا۔ اس مقامِ علیّا پر اور کوئی غائب یا حاضر مخلوق فائز المرام نہیں ہو سکی۔

بانی جمہوریہ اسلام ایران امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ توحید اور صرف توحید کے عملی نفاذ کے ذریعے دُنیائے اسلام کی مختلف اکائیوں میں اتحاد اور اتفاق پیدا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ بنیاد ہے جو نسل، وطن، زبان وغیرہ کے امتیازات ختم کر کے اخوت کا جذبہ ابھار سکتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

" Let the Ulama and preachers in Muslims states call on their Government to rid themselves from dependence on big foreign powers and to come to an understanding with their own people, which assures them victory. Let them call on the nations for unity and for discarding racism, which is against Islam. Let them shake a brotherly hand with their brothers and once this spirit of brotherhood has became a matter of fact between all Muslims Governments and Muslims nations you will see that Muslims are the greatest power on each. Let us hope to writness this brotherhood and this equality between Muslims nations, God willing " (Page 58, 59)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

اسلامی بھائی چارے کو عملی شکل میں پیش کرنے کی خاطر فرمایا کہ تمام مسلمان حکومتوں کے علماء اور مبلغین متفق ہو کر اپنی اپنی حکومتوں کو تلقین کریں کہ وہ غیر ملکی بڑی طاقتوں پر انحصار کرنا چھوڑ دیں اور اپنے لوگوں سے مفاہمت کی فضا پیدا کریں۔ اسی میں ان کی کامیابی اور نصرت کا راز ہے۔ وہ اپنی حکومتوں کو اس اتحاد کی دعوت دیں اور نسل پرستی کو چھوڑ دینے کی تلقین کریں کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ مسلمان، افراد ہوں یا قومیں، سب آپس میں بھائی ہیں پس انہیں برادرانہ مصافحہ کر کے اپنی اخوّت کو پکّا کر لینا چاہیے جب ایک دفعہ یہ جذبۂ اخوت حقیقت کا رنگ اختیار کرے گا اور تمام مسلم حکومتیں اور قومیں اس رشتے سے بندھ جائیں گی تو آپ دیکھیں گے کہ اس زمین پر مسلمانوں سے بڑی اور کوئی طاقت نہ ہو گی۔ انشاءاللہ مسلم قوموں کے اندر یہ اخوّت اور یہ مساوات بہت جلد مشہور ہو جائے گی۔

"اسلام" اور "اسلامی حکومت" اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا انعام اور عطیہ ہے۔ ان کے قیام کا لازمی نتیجہ برکت اور خوشحالی ہے جو دُنیا میں بھی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اگلی دُنیا میں بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ اسی نظام کی بدولت ظلم اور ناانصافیاں، جبر و استحصال اور بدعنوانیاں ختم ہو سکتی ہیں اور اسی نظامِ اسلامی پر چل کر فلاحِ آدمیت کے عظیم مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کے عملی نفاذ سے نہ صرف افراد کی نجی زندگی کے ہر پہلو کو سدھارا جا سکتا ہے بلکہ معاشرے کے سماجی، مادّی، روحانی، ثقافتی، سیاسی، عسکری اور اقتصادی استحکام اور عروج مل سکتا ہے کیونکہ ان دونوں کے لئے رہنما اصول موجود ہیں۔ وصیت نامہ صفحہ ۱۹ - ۲۰ پر ارشاد ہوا ہے۔

"Islam and the Islamic Govenment are divine entitles, the fulfilment of which guarantee prosperity in his world and solvation in the hereafter in the optimum form. It is capable of nullifying injustices, tyrranies, ravages and corruption and of helping humanity attain its lofty goal. It is an ideology which, unlike irreligious ideologies, has guidelines for and oversees every aspect of the private life of the people as well as the social, material, spiritual cultural, political, military and economic system of the society without overlooking any point, however trivial it may seem, in connection with the eduaction of men, and the society and their material and spiritual progress, reminding man of stumbling blooks and impediments on the road to perfection and offering solutions to these problems" (Page 19 - 20)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

○ دُنیائے اسلام پر مغربی لادینی طلقوں نے جو ثقافتی یلغار کر رکھی ہے اس کا احساس بھی آپ کو بڑی شدت سے تھا۔ چنانچہ فرمایا:

" In the face of the vast propaganda against Islam and the Ulma, especially during the present century, of the bulk of the devisive institutions by publicists and silver-tongued people in the print media and in pubic meeting disguised as experssions of nationalistis sentiments; of the bulk of the factions poerty and derisive witticism, of the number and vairety of quarters for prostitution, gambling, immoral amusements, drinking and narcotics, unimect at attracting the generation.... towards corruption." (Page 18)

الغرض اسلامی جمہوریۂ ایران اس وقت واحد مثال ہے جسے دُنیا بھر کی مسلم حکومتیں اپنے سامنے رکھ کر تعمیر نو کا فریضہ بڑی خوبی کے ساتھ سر انجام دے سکتی ہیں۔ بعض مغرب زدہ عناصر مخالفت کریں گے لیکن ان کی تربیت بھی اگر انہی خطوط پر کی جائے جن کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے اور توحید ! ۔۔ حالی کے عقیدے کے عملی پہلو کو اُجاگر کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ نوجوانوں کے سینے نورِ حق سے منوّر نہ ہوں اور جدید جاہلیت کے اندھیرے چھٹ نہ جائیں۔ فکر و عمل کی جو آزادی' اور صحیح آزادی نہ کہ بے راہ روی' اسلام دے سکتا ہے وہ کوئی اور نظریہ، مذہب، مکتبِ فکر یا طریقِ حیات نہیں دے سکتا۔ یہ ایک حقیقتِ ثابت ہے جو کل بھی صحیح تھی، آج بھی صحیح ہے اور آئندہ تا قیامت صحیح رہے گی۔

اسلامی جمہوریۂ ایران میں " فلاسفی آف اسلام" (بزبان انگریزی) کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنفین نہایت بلند پایہ شخصیات ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسین بہشتی سپریم کورٹ ایران کے چیف جسٹس اور ڈاکٹر محمد جواد باہنر وزیر اعظم تھے۔ یہ مذکورہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تخلیق، تاریخ اور تقدیرِ انسانی کی بنیاد ہے نیز یہ وہ ماخذ و منبع ہے جس سے ہماری تحریک (یعنی انقلابِ ایران کی تاریخ ساز تحریک) ہمارے افکار و خیالات اور ہماری ذمہ داری اجزا پاتی ہے۔ ذمہ داری اس بات کی کہ اسلام تمام مسلم ممالک میں پھلے پھولے اور دُنیا کے تمام حصوں میں پھیل جائے۔ یہ وہ پیغام ہے جو امام خمینی (رحمۃ اللہ علیہ) دُنیا کے تمام مسلمانوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔" (صفحہ ۲۱، ۲۰)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

گزشتہ صفحات میں ہم نے اشارہ کیا تھا کہ توحید پر ایمان رکھنے سے انسان نہ تو کُلی طور پر مجبور ہو جاتا ہے اور نہ مطلقاً آزاد بن جاتا ہے۔ پابندی میں آزادی اور آزادی میں پابندی یا دوسرے لفظوں میں محدود آزادی اور محدود پابندی کی حیثیت نہ ہوتی تو انسان کبھی پیہم سعی و عمل میں مصروف نہ رہ سکتا اور نہ ہی پُر اُمید ہو کر ارتقاء کی طرف آگے بڑھ سکتا۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے "کائنات اور اس کے خالق" کے باہمی رشتے کی تفصیل سامنے رکھنی ہوگی۔ تخلیقِ کائنات کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۶:۸۲)

(ترجمہ) اُس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو کہے اُس کو "ہو جا" تو وہ اسی وقت ہو جائے۔

ذرا غور کیجئے کہ کُن یا "ہو جا" کا حکم کس کو دیا جا رہا ہے؟ کیا وہ چیز پہلے سے موجود ہے؟ اگر موجود ہے تو اسے موجود ہو جانے کا حکم تحصیلِ حاصل ہے اور اگر وہ چیز پہلے سے موجود نہیں ہے تو عدم محض کو خطاب کرنا باطل ہو جاتا ہے۔ یعنی جو چیز ہے ہی نہیں اُسے حکم کیسے دیا جا سکتا ہے! اس مشکل کا حل صرف اس طرح ممکن ہے کہ باور کر لیا جائے کہ وہ شئے جس کو ارادۂ الٰہی خارجاً اور ظاہراً موجود کرنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کے ذہن اور علم میں پہلے سے موجود ہے اگرچہ خارجاً معدوم ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ شئے تخلیق سے پہلے حق تعالیٰ کی معلوم ہے۔ علمِ الٰہی میں ثابت ہے اور ذاتِ حق تعالیٰ پر عارض اور مندرج ہے۔ اس شئے کی ماہیت، حقیقت اور خواص اور شکل و صورت وغیرہ کا علم بھی اُسی ذاتِ کبریا کو ہے۔ چنانچہ یہ "صورتِ علمیہ" ہر وقت معلوماتِ حق میں موجود رہتی ہے اور یہی امرِ کُن کی مخاطب ہے۔ یہ علمی صورت امرِ ربی کی تعمیل کرتی ہے تو مرتبۂ علم سے (جسے آپ باطن کہہ دیں) نکل کر عین یا ظاہر میں آجاتی ہے اور اپنے قانونِ تخلیق (یعنی فطرت) کے تقاضوں کے مطابق نمودار ہو کر مخلوق بن جاتی ہے۔ (ویسے عالمِ امر کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں۔ یہ مفروضہ بھی صرف تفہیم کے لئے ہے)

قائم بالذات ہستی صرف اللہ کی ہے۔ جن صورِ علمیہ کی ہم بات کر رہے ہیں وہ تخلیق سے پہلے بھی خالق کی محتاج تھیں اور تخلیق کے بعد بھی حد۔ مقدار۔ وزن۔ کیمیت وغیرہ کی محتاج ہیں۔ یہ اپنے آپ، بغیر کسی سہارے کے، قائم نہیں رہ سکتیں۔ دوسری بات یہ کہ جس طرح نقش نقاش نہیں بن سکتا، اسی طرح ذہن اور ذہنی صورت بھی کسی طرح ایک نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی شان احدیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ صفت باری تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔

چونکہ مخلوق حد، مقدار، وزن وغیرہ سے ماورا نہیں ہے اس لئے یہ خارج کی محتاج ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان احتیاجات سے پاک ہے۔ اس لئے اسے اپنے وجود اور قیام کے لئے کسی خارج کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ زمان و مکان دونوں کا خالق ہے اس لئے ان دونوں سے بالاتر ہے وہ مطلق بے حد اور بے حد مطلق ہے۔ کوئی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی وہ تمام وجودی صفات یعنی علم۔ حیات۔ ارادہ۔ قدرت

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

سماعت ۔ بصارت اور کلام سے متصف ہے ۔ جبکہ باقی تمام مخلوقات فی نفسہٖ عدمیہ صفات رکھتی ہے یعنی ان میں جہل ۔ موت ۔ اضطرار ۔ عجز ۔ صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ کی کیفیت ہے ۔ اگر کسی مخلوق ، مثلاً انسان کے اندر علم ۔ حیات ۔ ارادہ وغیرہ کسی قدر دکھائی دیتی ہیں تو وہ اوّل تو بے حد ناقص نامکمل اور قلیل سی ہیں پھر یہ اُسے مستعار دی گئی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں ۔ یہ صفات بھی حد، مقدار، وزن وغیرہ کی اُسی طرح محتاج ہیں جس طرح ان کی حامل مخلوق ہے ۔ لہٰذا ان کا ہونا نہ ہونا کوئی خاص اہمیّت نہیں رکھتا ۔ جس چیز کا وجود ذاتی نہ ہو وہ عدم ہے ۔ پس سب سے پہلے خالق اور مخلوق کے درمیان اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے یعنی

۱۔ کوئی مخلوق ، حد ، مقدار ، تعیّن کے بغیر ہے ہی نہیں ، جبکہ ذاتِ حق بے صورت ہے اور اشکال کے ان تمام لوازم سے مُبرّا ہے ۔

۲۔ خلق کا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے ۔ اس کا جو وجود مادّی آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے وہ عدم اضافی ہے کیونکہ یہ صرف ثابت فی العلم ہے ۔ جبکہ ذاتِ باری تعالیٰ قائم بالذّات ہے

۳۔ خلق کی تمام صفات وجودیہ نہیں عدمیہ ہیں یعنی مخلوق میں علم نہیں جہل ہے ، حیات نہیں موت ہے ، ارادہ نہیں اضطرار ہے ، قدرت نہیں عجز ہے ، سماعت ، بصارت اور کلام کی بجائے بہرے ، اندھے اور گونگے ہونے کی کیفیت ہے جبکہ خالق کی تمام صفات وجودیہ ہیں ۔

۴۔ مخلوق کے اندر جو بھی صفات ہیں وہ امکانیہ ہیں ۔ یعنی اپنے آپ نہیں عطا کردہ ہیں ۔ جبکہ خالق کی تمام قابلیات امکانیہ ہونے سے پاک ہیں بلکہ ہیں کیونکہ وہ فعال حقیقی یا فعل بالذات ہے ۔

ان باتوں کے جان لینے کے بعد جب آپ نے یقین کر لیا کہ ذاتِ حق مالکِ کُل ہے یعنی وہ حاکم ہے ہم محکوم ہیں ، وہ رَب ہے ہم مربوب ہیں ، وہ مولیٰ ہے ہم عبد ہیں ، وہ عالم ہے ہم معلوم ہیں ، وہ خالق ہے ہم مخلوق ہیں تو پھر آپ کو اس بات پر بھی یقین ہو جاتا ہے کہ عبد ہمیشہ عبد رہے گا خواہ وہ کتنا ہی بلند اور برتر کیوں نہ ہو جائے (عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ) اور رب ہمیشہ رب ہی رہے گا خواہ وہ کتنا ہی نیچے اُتر آئے (یہ بات محض بطور دلیل کہی گئی ہے ورنہ عیاذاً باللہ ذات باری سے متعلق صعود و نزول کا تصور ہی کفر ہے) جب عبد کو اپنی عبودیت پر کامل یقین ہو جاتا ہے تو وہ اپنی حیثیت کا جائزہ لیتا ہے ۔ اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہے اور اپنی ممکنہ صلاحیتوں کا وزن کرتا ہے ، اندازہ لگاتا ہے اور امتحان کرتا ہے ۔ اس مرحلے کو خودشناسی ، اندرون بینی یا خودنظری (INTROSPECTION) کہتے ہیں ۔ اس عمل کے ذریعے اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ تو تمام صفات حیاتیہ سے تہی دامن ہے ۔ یہاں تک کہ اُس کا وجود بھی اس کا اپنا نہیں ہے بلکہ عطا کردہ ہے ۔ اپنی صفات کا بھی وہ صرف وصول کنندہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔ یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں اُس کی اپنی نہیں ہیں ۔ اسے مستعار دی گئی ہیں ۔ لہٰذا وہ " فقیر " ہے جب کہ

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حق تعالیٰ غنی ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر

گویا اپنی ذات کے عرفان سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا بھی عرفان ہو گیا۔ بالفاظ دیگر انسان کی اپنی تلاش اپنی ممکنہ صلاحیتوں کے جائزہ لینے ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کو اپنے "خالی ہاتھ" ہونے کے یقین سے حق تعالیٰ کے غنی ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس عرفان کے حاصل ہو جانے سے انسان کو اپنے اعمال و افعال کی عمارت کھڑی کرنے کے لئے ایک محکم اساس مل گئی۔ اب اس پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ جو چیزیں اللہ کے لئے ہیں وہ ہمارے لئے اصالتاً نہیں ہیں اور جو چیزیں ہماری ہیں وہ حق تعالیٰ کی نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر ہم اپنی چیزیں مثلاً جہل، موت، اضطرار وغیرہ حق تعالیٰ سے منسوب کر دیں تو یہ دو طرفہ کفر ہوگا، یعنی اپنا بھی انکار اور اللہ تعالیٰ کا بھی انکار۔ اور اگر حق تعالیٰ کی چیزیں خلق سے منسوب کر دیں تو یہ شرک ہوگا۔ پس حق تعالیٰ کی چیزیں حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرنا "توحید" ہے اور یہی وہ راسخ عقیدہ ہے جو انسان کے لئے اس دار العمل میں مکمل آزادی کی ضمانت ہے!

اس آزادی سے انسان کے دل میں ایک نیا عزم اور نیا یقین جاگ اٹھتا ہے جس سے اس کی آنکھوں میں امید کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے اور تحقیق و تجسس کی نئی منزلیں نگاہوں کے افق پر ابھرنے لگتی ہیں۔

سنسار میں حسن بھی ہے قبح بھی ہے لیکن صرف ہمارے آپ کے ذہنی اعتبار سے ہے۔ فی نفسہٖ نہ کوئی اچھائی اور برائی کا انحصار چیز کے طریقہ استعمال پر ہے۔ توحید کا عقیدہ تمام اعتبارات اچھے کا اور برائی کو اچھائی میں تبدیل کرنے کا ایک بہت بڑا معیار

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas
jabir.abbas@yahoo.com

Presented by: Rana Jabir Abbas

رائج اور عقلی مقاصد شکن ہو جاتے ہیں۔ انسان پھر مقاصد کی تخلیق اور تکمیل میں مصروف ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اس بات پر یقین ہوتا ہے کہ زندگی بامقصد ہے اور اس کی اپنی تخلیق بھی ایک عظیم منصوبے کا حصہ ہے۔ اس طرح تحقیق اور تجسس کی نئی منزلیں اس کے ذہن کے افق پر ابھرنے لگتی ہیں۔ وہ کائنات کی تعمیر کو اپنا مطمع نظر بنا لیتا ہے۔ پھر محبت، اخوت اور باہمی تعاون اس کا لائحہ عمل بن جاتے ہیں اور اس طرح ایک عالمگیر برادری وجود میں آجاتی ہے جس کا ہر فرد نسل، رنگ، علاقائی حدود اور زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت اور عالمگیر معاشرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ توحید کے عقیدے کے فعال ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ریاضیاتی عدد کی صورت میں "ایک" شمار کرنے کے علاوہ اسے ساری کائنات کے نظامِ ربوبیت میں زندہ و پائندہ واحد حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جائے اور اسے زندگی کے ہر شعبے اور فعل و عمل کے ہر دائرے میں جاری و ساری سمجھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو گنتی کی حد تک "ایک" جاننا اور اس کی وحدانیت کو کاروبارِ حیات اور مشاغلِ زندگی میں عملاً تشکیل نہ کرنا توحید کے صحیح عقیدے کے منافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ اگر آپ اللہ کے ایک ہونے پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ وحدت آپ کی سوچ، قول اور عمل کو بھی ایک بنا دے، گھر کے اندر بھی وحدتِ فکر و عمل کا نمونہ پیش کرے اور دنیا کے کاروبار میں بھی اسی وحدت کی روح کارفرما ہو، یعنی کسی عمل سے تضاد یا ثنویت کا اظہار نہ ہو۔

jabir.abbas@yahoo.com

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

رائج اور عمرانی مقاصد ممکن ہو جاتے ہیں۔ انسان پھر مقاصد کی تخلیق اور تکمیل میں مصروف ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اس بات پر یقین ہوتا ہے کہ زندگی بامقصد ہے اور اس کی اپنی تخلیق بھی ایک عظیم منصوبے کا حصہ ہے۔ اس طرح تحقیق اور تجسس کی نئی منزلیں اس کے ذہن کے اُفق پر اُبھرنے لگتی ہیں۔ وہ کائنات کی تعمیر کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیتا ہے۔ پھر محبت، اخوت اور باہمی تعاون اس کا لائحہ عمل بن جاتے ہیں اور اس طرح ایک عالمگیر برادری وجود میں آجاتی ہے جس کا ہر رکن نسل، رنگ، علاقائی حدود اور زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت اور عالمگیر قوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ توحید کے عقیدے کے فعال ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ریاضیاتی عدد کی صورت میں "ایک" شمار کرنے کے علاوہ اسے ساری کائنات کے نظامِ ربوبیت میں زندہ و پائندہ واحد حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جائے اور اسے زندگی کے ہر شعبے اور فعل و عمل کے ہر دائرے میں جاری و ساری سمجھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو گنتی کی حد تک "ایک" جاننا اور اس کی وحدانیت کو کاروبارِ حیات اور مشاغلِ زندگی میں عملاً پیش نہ کرنا توحید کے صحیح عقیدے کے منافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ اگر آپ اللہ کے ایک ہونے پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ وحدت آپ کی سوچ، قول اور عمل کو بھی ایک بنا دے، گھر کے اندر بھی وحدتِ فکر و عمل کا نمونہ پیش کرے اور دنیا کے کاروبار میں بھی اسی وحدت کی روح کارفرما ہو۔ یعنی آپ کے کسی فعل سے تضاد یا ثنویت کا اظہار نہ ہو۔

چیست ملت ای کہ گوئی لا الٰہ با ہزاراں چشم بودن یک نگہ
اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکیست خیمہ ہای ما جدا دلہا یکیست
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب یک نگر شو تا شود حق بی حجاب
یک نگاہی را بچشمِ کم مبیں! از تجلی ہای توحید است ایں

ملتی چوں می شود توحید مست
قوت و جبروت می آرد بدست
(اقبالؒ)

Contact : jabir.abbas@yahoo.com http://fb.com/ranajabirabbas

Presented by: Rana Jabir Abbas

حق تعالیٰ غنی ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر

گویا اپنی ذات کے عرفان سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا بھی عرفان ہو گیا۔ بالفاظ دیگر انسان کی اپنی تلاش اپنی ممکنہ صلاحیتوں کے جائزہ لینے ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کو اپنے "خالی ہاتھ" ہونے کے یقین سے حق تعالیٰ کے غنی ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس عرفان کے حاصل ہو جانے سے انسان کو اپنے اعمال و افعال کی عمارت کھڑی کرنے کے لئے ایک محکم اساس مل گئی۔ اب اس پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ جو چیزیں اللہ کے لئے ہیں وہ ہمارے لئے اصالتاً نہیں ہیں اور جو چیزیں ہماری ہیں وہ حق تعالیٰ کی نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر ہم اپنی چیزیں مثلاً جہل، موت، اضطرار وغیرہ حق تعالیٰ سے منسوب کر دیں تو یہ دو طرفہ کفر ہو گا، یعنی اپنا بھی انکار اور اللہ تعالیٰ کا بھی انکار۔ اور اگر حق تعالیٰ کی چیزیں خلق سے منسوب کر دیں تو یہ شرک ہو گا۔ پس حق تعالیٰ کی چیزیں حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرنا "توحید" ہے اور یہی وہ راسخ عقیدہ ہے جو انسان کے لئے اس دار العمل میں مکمل آزادی کی ضمانت ہے! اس آزادی سے انسان کے دل میں ایک نیا عزم اور نیا تیقن جاگ اٹھتا ہے جس سے اس کی آنکھوں میں امید کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے اور تحقیق و تجسس کی نئی منزلیں نگاہوں کے افق پر ابھرنے لگتی ہیں۔

دنیا میں حسن بھی ہے قبح بھی ہے لیکن صرف ہمارے آپ کے ذہنی اعتبار سے ہے۔ فی نفسہٖ نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ بری ہے۔ اچھائی اور برائی کا انحصار چیز کے طریقہ استعمال پر ہے۔ توحید کا عقیدہ تمام اعتبارات اضافات و عوامل کی اچھائی برائی کے جانچنے کا اور برائی کو اچھائی میں تبدیل کرنے کا ایک بہت بڑا معیار اور وسیلہ ہے۔

علاوہ ازیں ذات باری تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانا اور ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا بھی توحید کا لازمہ ہے۔ ان صفات کے ذریعے ذات واجب تعالیٰ اور بندے کے درمیان تقرب پیدا ہوتا ہے کیونکہ صفات کا علم اور ادراک تو ممکن ہے لیکن ذات کا علم انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کائنات کے اندر جو کچھ ظاہر ہے وہ اور جو کچھ ظاہر نہیں ہے پوشیدہ ہے دونوں سمجھنے کے لائق ہیں۔ توحید کے انوار تجلی ان کو واضح اور روشن کر دیتے ہیں انسان عظیم ہیں لیکن صرف وہی انسان جو اپنی حقیقت کو پہچان سکتا ہو، جو اپنی صلاحیتوں اور اہلیتوں کا جائزہ لے سکتا ہو، جو اپنے آپ پر حقیقت کی نظر ڈال سکتا ہو، جو اپنی ذات اور صفات کو سمجھ سکتا ہو اور جو اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا سکتا ہو۔ لہٰذا اپنی شناخت کرنا یعنی اپنی صفات کو پہچاننا انسان کا فرض اولین ہے جس نے اپنی قوتوں کا اندازہ لگا لیا، دونوں جہاں اس کے زیر نگیں آ گئے۔ تاہم یہ "کلیہ" افراد کی بجائے اقوام پر زیادہ صادق آتا ہے۔ اسی سے قوموں کے اندر جذبۂ آزادی ابھرتا ہے، انقلاب کی روح بیدار ہوتی ہے افکار کی سمت بدل جاتی ہے، قلب و نظر کے زاویے میں تبدیلی آ جاتی ہے اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

الغرض جب خالص توحید کا عقیدہ فعال بن کر انسانی عمل پر جلوہ ریز ہوتا ہے تو انسانی ذہن میں اخلاقی قدریں

Contact : jabir.abbas@yahoo.com
http://fb.com/ranajabirabbas